سالنامہ

جنوری ۱۹۸۸ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

سالنامہ

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

سرورق:
سعادت علی خان

کتابت: محمود سلیم، محمد عبدالرؤف، مسعود انور۔

تزئین: طالب خوندمیری

منیجر اعزازی (بمبئی):
فیاض احمد فیضی

فی پرچہ: ۶ روپے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے
غیر ممالک سے: ایک سو پچاس روپے

طباعت:
دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد [illegible]

خط و کتابت کا پتہ:۔
شگوفہ ۳۱ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱۔

فون آفس: 557716
فون مکان: 521064

(فہرست)

غیر مستقل کالم

ایسی کی تیسی (تنقید)

چھوڑن (منظومات)

اردو کے منفرد مزاح نگار

مجتبیٰ حسین

کے فن اور شخصیت کا بھرپور جائزہ

ماہنامہ **شگوفہ** حیدرآباد کا

ایک یادگار اور دستاویزی

مجتبیٰ حسین نمبر

معتبر ادیبوں اور ناقدوں کے سیر حاصل مضامین!
خاکے، تصاویر، مجتبیٰ حسین کے نام ادیبوں کے خطوط!!
مجتبیٰ حسین کی بہترین تخلیقات کا انتخاب!!!

چند لکھنے والے:

شمس الرحمن فاروقی ۔ پروفیسر وحید اختر ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ۔ پروفیسر قمر رئیس ۔ پروفیسر مغنی تبسم
پروفیسر شمیم حنفی ۔ عمیق حنفی ۔ اختر حسن ۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۔ ساحر ہوشیارپوری ۔ [illegible]
پروفیسر سوزدکی تاکیشی (جاپانی) ۔ دلیپ سنگھ ۔ فکر تونسوی ۔ یوسف ناظم ۔ وجاہت علی سندیلوی
زبیر رضوی ۔ نریندر لوتھر ۔ بلراج ورما ۔ ڈاکٹر شہریار ۔ ظفر پیامی ۔ رفعت سروش ۔ مسیح انجم
پرویز یداللہ مہدی ۔ رضا نقوی واہی ۔ علی باقر ۔ محمود سعیدی ۔ نکار پاشی وغیرہ
—— سرورق : مجتبیٰ حسین کا کیری کیچر (آرٹسٹ: طالب خوندمیری)

شگوفہ کے سالانہ خریداروں کے لیے رعایتی قیمت ۴۰ روپے

ضخامت: ۳۹۲ * قیمت: ۵۵ روپے

ہماری جمہوری آزادی

جمہوریت
سماج واد
سیکولرزم
انصاف
آزادی
یکسانیت
اخوت
اتحاد
سالمیت

ہمیں اس آزادی کے حصول کے لئے کیا کرنا ہے اس کا انحصار بہت کچھ اُن بنیادی وجوہات پر ہے جن پر گاندھی جی تمام عمر زور دیتے رہے ہیں —— جیسے کہ اعلیٰ اخلاق، صدق دلی اور مقصد میں ثابت قدمی، قوت برداشت، تعاون اور محنت —— میں عوام کو فقط اتنا ہی تجویز کرسکتا ہوں کہ ہم ان بنیادی خصوصیات کی بنا پر اپنی جمہوری آزادی کی حفاظت کریں اور ڈر اور نفرت کو اپنے دل و دماغ سے نکال کر ہمیشہ اپنے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی بہتری کا خیال کریں۔

•

— جواہر لال نہرو

• —— امن و امان اور ترقی کے لئے ہماری مضبوط بنیادیں

اعترافِ خدمات کرنے والوں کی خدمات کا اعتراف

مجتبیٰ حسین

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں آج کی یہ تقریب سعید میری خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں منعقد کی جا رہی ہے اور آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ اردو طنز و مزاح کے فروغ کے لیے میری خدمات کتنی گراں قدر، بیش بہا، لاقیمت اور لاثانی ہیں۔ مجھے اپنی لازوال خدمات کے بارے میں اچھی طرح اندازہ ہے کہ انھیں رہتی دنیا تک نہ صرف یاد رکھا جائے گا بلکہ ادب کی تاریخ میں اُن کا حال سیاہ روشنائی کے نہ ملنے کی صورت میں کم از کم سنہرے حروف میں تو ضرور لکھا جائے گا سچ تو یہ ہے کہ آپ میری خدمات کے اعتراف کے لیے یہاں خواہ مخواہ ہی جمع ہو گئے ہیں کیوں کہ جب میں خود اپنی خدمات کا اعتراف کر رہا ہوں تو میری خدمات کے اعتراف کے لیے آپ کیوں اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں؟

حضرات! میری سچی باتوں کو سن کر آپ کے دلوں پر جو کچھ بیت رہی ہے اس کا بھی مجھے اندازہ ہے۔ اصل میں سارا قصور ذریعہ اظہار کا ہے۔ اگر میں شاعر ہوتا اور اپنی کسی غزل کے مقطع میں اپنے تعلق سے یہ ساری سچی باتیں کہہ دیتا تو آپ ناک بھوں چڑھانے کے بجائے داد کے ڈونگرے برساتے۔ شاعر کو تو کھلی چھوٹ ہوتی ہے کہ وہ مقطع میں بزعم خود خدائے سخن بن جائے اور تعلّی کے ذریعہ اپنی خدمات کا کھلے بندوں اعتراف کر لے جب کہ مزاح نگار کے پاس ایسا کوئی حربہ نہیں ہوتا۔ حضرت فراق گورکھپوری نے اپنی غزل کے ایک مقطع میں اپنا جلسۂ اعترافِ خدمات خود منعقد کیا تھا اور اپنے ہم عصروں کو آنے والی نسلوں کی نظر میں صرف اس بنا پر خوش بخت اور قابلِ رشک قرار دیا تھا کہ انھوں نے حضرت فراق گورکھپوری کو دیکھا تھا اور ان سے باتیں کی تھیں۔ ہم خود حضرت فراق کے عصرِ آخر کے ہم عصروں میں شامل رہے ہیں اور اس کے بعد وہ دو تین نسلیں بھی آ چکی ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی فراق گورکھپوری اپنے مقطع میں کر گئے تھے۔ اب ہم ان نئی نسلوں سے اکثر کہتے ہیں کہ میاں ہماری تعظیم و تکریم کرو کہ ہم نے فراق کو دیکھا تھا اور ان سے باتیں کی تھیں۔ اس کے جواب میں نئی نسل ہم سے پوچھتی ہے "کون فراق، کیسا فراق، کس کا فراق، کیا کام کرتے تھے؟ کیا شعر تو نہیں کہتے تھے؟ اور اگر وہ اچھے شعر کہتے تھے تو آپ نے انھیں دیکھا ہی کیوں تھا؟ اپنی بینائی کی صحت

کا کچھ تو خیال رکھئے۔

اصل قصّہ یہ ہے کہ وقت کا جلسۂ اعتراف خدمات اپنے طور پر کہیں منعقد ہوتا رہتا ہے اور یہی جلسہ اصلی ہوتا ہے۔
میری آپ سے گزارش ہے کہ میرے اس جلسہ اعترافِ خدمات کو چند حیدرآبادی احباب کے عملی مذاق پر محمول کریں تو زیادہ مناسب ہے۔ چار پانچ مہینے پہلے میرے دوست حمایت اللہ دہلی آئے تھے تو انھیں کسی ذریعہ سے اچانک یہ اطلاع ملی کہ مجھے مزاح نگاری کرتے ہوئے پورے پچیس برس بیت گئے پھر کیا تھا میرے سر ہو گئے کہ وہ میرا جشن منائیں گے۔ مدیرِ شگوفہ مصطفےٰ کمال کے ذریعہ بھی مجھ پر دباؤ ڈالا گیا۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ میں اپنی موت آپ مرنا چاہتا ہوں نہ کسی غیر کو اس معاملہ میں حصّہ دار بننے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ پھر میں نے انھیں یاد دلایا کہ بیس بائیس برس پہلے حیدرآباد میں نوجوانوں کا ایک ایسا گروہ اُبھر آیا تھا جس نے حیدرآبادی شاعروں کے جشن منانے کا بیڑہ اُٹھایا تھا۔ ان نوجوانوں کے کام میں کچھ ایسی تاثیر اور نیت میں کچھ اتنا خلوص تھا کہ جس کسی شاعر کا جشن مناتے، وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات تو شاعر کے جشن اور اُس کے چہلم میں بڑی مشکل سے سات آٹھ ہفتوں کا فرق باقی رہ جاتا تھا۔ کیسے کیسے قادر الکلام شاعروں کو ان نوجوانوں نے جشن کے ذریعہ ٹھکانے لگایا اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے۔

میں نے حمایت اللہ کو یہ بات یاد دلائی تو کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے "آپ جشن کے لیے یا مرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو چلئے ہم آپ کی سلور جوبلی ہی مناتے ہیں۔"

میں نے کہا "چند برس بعد ہم جس زبان کی برسی منانا شروع کریں گے اس زبان میں لکھنے والے کسی ادیب کی سلور جوبلی منانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

کبھی کبھی معقول بات بھی حمایت اللہ کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ بولے "سلور جوبلی نہ سہی، جلسۂ اعترافِ خدمات ہی رکھ لیتے ہیں۔" یوں حمایت اللہ میری قیمت کو بھاؤ تاؤ کے ذریعہ سو روپے سے گھٹا کر ایک روپے تک لے آئے۔ سودا ایک سیدھے سادے جلسہ اعترافِ خدمات پر طے ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس کا حال بیان کرتے ہوئے خود مجھے شرم سی آرہی ہے کیوں کہ اس فیصلے کے بعد حمایت اللہ بیمار رہنے لگے۔ اور اب تک بیمار ہیں، ایک اور صاحب جو اس جلسۂ اعترافِ خدمات میں پیش پیش رہنے والے تھے کچھ ایسی پریشانیوں میں گھر گئے کہ اب درگاہوں کے پھیرے لگاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔ ایک اور صاحب ٹریفک حادثہ میں زخمی ہو گئے۔ ایک لکھ پتی دوست کا کاروبار کچھ ایسا ٹھپ ہوا کہ پچھلے دنوں مجھ جیسے آدمی سے سو روپے اُدھار مانگتے ہوئے پائے گئے۔ وعدہ کر گئے ہیں کہ میرے جلسہ اعترافِ خدمات کے بعد یہ سو روپے واپس فرما دیں گے مگر مجھے ان روپیوں کی واپسی کی توقع نہیں ہے کیوں کہ شاعر کے جشن اور ایک مزاح نگار کے جلسۂ اعترافِ خدمات میں اتنا تو فرق ہونا ہی چاہیئے۔ کبھی کبھی قدرت منتظمین کا اپنی یک طرفہ کا بھی تو ساتھ دیتی ہے۔ یوں بھی جب کسی کی خدمات نہیں ہوتیں اور آپ اُس کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بیڑہ اٹھاتے ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر "اعترافِ خدمات" اور "اعترافِ جرم" میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔
مبادا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری مزاح نگاری کے پچیس سال پورے ہو جانے پر میرے دوستوں کا [illegible]

یہ سب کچھ پیش آئے گا تو واللہ مزاح نگاری نہ کرتا۔ کیوں کہ میری مزاح نگاری کا مقصد ایذا رسانی یا کسی کی دل شکنی ہرگز نہیں ہے، میں نے زندگی بھر اپنی دل شکنی کے سوائے کسی اور کی دل شکنی نہیں کی۔

یادش بخیر! پچیس برس اور کچھ مہینے اوپر کی بات ہے۔ ۱۲ راگست ۱۹۶۲ء کا دن تھا۔ ساڑھے دس بجے دن کا وقت تھا۔ میں روزنامہ "سیاست" میں اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے پہونچا تو اخبار کے ایڈیٹر جناب عابد علی خاں اور اخبار کے جائنٹ ایڈیٹر جناب محبوب حسین جگر نے جو میرے بڑے بھائی بھی ہیں، حکم دیا کہ میں اس اخبار کا مزاحیہ کالم لکھوں۔ شاہد صدیقی اپنی رحلت کے ذریعہ مزاحیہ کالم نگاری کے میدان میں جو خلا پیدا کر گئے تھے اُسے پُر کرنے کی ذمہ داری مجھ ناچیز کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ سوچا تھا کہ کچھ دن اس خلا میں بھٹکنے کے بعد یا تو میں خود راہ راست پر آجاؤں گا یا پھر ادارہ کا انتظامیہ ہی راہ راست پر آجائے گا۔ مگر بعد کو یہی مزاح نگاری جی کا جنجال بن گئی۔ پھر یہی میری شناخت ٹھہری۔ یہی ذریعہ عزت بھی بنی اور آج ذریعہ رسوائی بن رہی ہے۔ یہاں اس بات کا موقع نہیں ہے کہ میں وہ سب کچھ بیان کروں جو پچھلے پچیس برسوں میں میرے ہاتھوں مزاح نگاری پر اور مزاح نگاری کے ہاتھوں مجھ پر بیتی ہے۔ صرف دو واقعات سنانے پر اکتفا کرتا ہوں جو لوگ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روزانہ مزاحیہ کالم نگاری ایک کڑی آزمائش کا نام ہے۔ اچھے اچھوں کا کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے۔ بائیس برس پہلے کی وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میری چھ سالہ بیٹی اچانک اس دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ علی الصبح مٹی کا قرض مٹی کو سونپ کر قبرستان سے واپس ہوا۔ ابھی ہاتھوں سے قبر کی مٹی بھی اچھی طرح نہیں جھاڑی تھی کہ مزاحیہ کالم لکھنے بیٹھ گیا۔ کالم چھپا تو لوگوں نے اس کالم کی بے حد تعریف کی۔ سُبحان اللہ۔ ماشاءاللہ۔ میں حیرت میں پڑ گیا۔ لوگوں کو ان حالات سے واقف کرانے کی کوشش کی جن میں، میں نے یہ کالم لکھا تھا۔ پھر یہ بھی کہا "بیٹی تو روز روز نہیں مرتی لیکن اخبار کے کالم کو ہر روز زندہ رکھنا پڑتا ہے"

اس کے جواب میں لوگوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسا کہنا چاہتے ہوں "خدا کرے تیری بیٹی ہر روز اسی طرح مرتی رہے اور ہمیں تیرے دلچسپ کالم پڑھنے کو ملتے رہیں"

اس واقعہ کے بعد اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ مزاح نگاری دراصل اپنے اور دوسروں کے دُکھ کو کبھی خوبصورتی کے ساتھ چھپانے، کبھی اُسے اُجاگر کرنے، درد کے چہرے پر خوشگواری کا مکھوٹا چڑھانے اور ناگوار زندگی کو گوارا بنانے کا نام ہے۔ مزاح نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کا باظرف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے میری مزاح نگاری کا یہ نصب العین سا بن گیا کہ آنکھوں میں قہقہے اور ہونٹوں پر آنسو سجاتے چلے جاؤ۔ سچا مزاح وہی ہے جو سچے غم کو اپنی ذات میں انگیز کر لینے کے بعد طلوع ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ سناتا چلوں۔ یہ بھی بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں فرضی نام سے مزاحیہ کالم لکھتا تھا۔ ایک دن میں "سیاست" اخبار کے دفتر جانے کے لیے ایک رکشا میں سوار ہوا اور رکشا والے سے اخبار کے دفتر چلنے کو کہا تو اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ "سیاست" میں کام کرتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو اُس نے پوچھا "اس اخبار کا مزاحیہ کالم کون لکھتا ہے؟"

میں نے جھوٹ موٹ ہی اپنے ایک صحافی دوست کا نام بتا دیا۔ رکشا والے نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا "صاحب! سالا بہت زبردست لکھتا ہے۔ پرسوں سالے نے رکشا والوں کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا۔ بڑا مزہ آیا۔ اُس نے پھر کالم نگار کو ایک موٹی سی گالی دی اور کہا "صاحب! میری تعریف اُس تک پہونچا دینا۔ اُس نے ہمارا مذاق بھی اُڑایا اور ہمارے دِل کی بات بھی کہہ دی۔ سچ مچ بڑا لطف آیا"

رکشا والے کی یہ تعریف میرے لیے سچی اور معتبر اس لیے نظر آئی کہ اس میں ایک موٹی گالی بھی شامل تھی۔ اُس کی تعریف اُن ناقد حضرات کی تعریف کی طرح نہیں تھی جو کسی ادیب کی تعریف بھی کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ادیب کو موٹی گالی دے رہے ہیں۔

ان دو واقعات کو سُنانے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مزاح نگاری کے تئیں میرا رویّہ اور تعریف و توصیف کے سلسلے میں میری پسند اور ناپسند آپ پر واضح ہو جائے ورنہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور میری مزاح نگاری کیا ہے۔

حضرات! میرے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ مجھے اب اپنی زبان کھولنی نہیں چاہیئے۔ کروڑوں برس پرانی دُنیا میں اگر میں نے پچیس برس تک اُردو میں مزاح نگاری کی ہے تو کون سا کمال کیا ہے۔ حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے اس لیے محبّت کرتا ہوں کہ وہ کسی کی خدمات کا اعتراف کرنے پر تُل جاتے ہیں تو اعتراف کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حیدرآبادی پہلے تو کسی کو بہت اونچائی تک اچھال دیتے ہیں اور جب وہ نیچے آنے لگتا ہے تو سب کے سب دور ہٹ جاتے ہیں۔ میں اُس دن کے خیال سے ابھی سے گھبرانے لگا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ حیدرآباد میری کمزوری اس لیے ہے کہ یہیں میں نے مزاح نگاری شروع کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اب میں اپنے آپ کو بے شہر سا محسوس کرتا ہوں۔ دہلی والے مجھے حیدرآبادی سمجھتے ہیں اور حیدرآبادی اب مجھے دہلی والا سمجھتے ہیں۔ ایک مزاح نگار کے ساتھ قدرت کا یہ مذاق تو ہونا ہی تھا۔

آپ میرے بارے میں چاہے کچھ بھی کہیں اور میری خدمات کا چاہے کتنا ہی اعتراف کیوں نہ کریں میں آپ کے اعتراف پر ایمان لانے والا نہیں ہوں۔ مجھے اس وقت ایک مغربی ادیب کی بات یاد آرہی ہے جس نے لگاتار چالیس برس تک لکھنے کے بعد کہا تھا "چالیس برس تک متواتر لکھنے کے بعد ایک دن میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ مجھے لکھنا بالکل نہیں آتا لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں اس عرصہ میں ادیب کی حیثیت سے خاصا مشہور ہوگیا تھا۔ میں لکھنا نہیں چاہتا مگر لوگ مجھ سے زبردستی لکھواتے تھے۔" میری پچیس سالہ مزاح نگاری کے بارے میں بھی میری رائے کچھ اسی طرح کی ہے۔ جب میں نے اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تھا تو بے سروسامانی میرے ساتھ تھی اور اب ایک بے اطمینانی میرے ساتھ ہے۔ میں اس بے اطمینانی کو باقی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ سفر میں کچھ نہ کچھ تو اپنے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اس سفر میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہ سوال بھی میرے لیے اتنا اہم نہیں ہے بس اتنا اطمینان ضرور ہے کہ اس عرصہ میں اپنی بساط بھر کوشش یہ کی کہ اپنی خوش دلی اور خوش مذاقی میں اوروں کو اور اوروں کی خوش دلی اور خوش مذاقی میں اپنے آپ کو شامل رکھا۔ سماج کے تئیں اتنا ہی ایک کام میرے بس میں تھا جو میں نے کیا ہے۔

مجھے یہ اعتراف ضرور ہے کہ اس سفر میں مجھے بے شمار چاہنے والے ملے۔ کئی محسن اور کرم فرما ملے جن میں سے بعض آج کی محفل میں بھی موجود ہیں۔ میں ان سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنے پر اُتر آؤں تو شاید میری زندگی کے اگلے پچیس برس اسی میں بیت جائیں۔ اسی لیے میں افراد کی بجائے ان اداروں کا شکریہ ادا کرنا مناسب سمجھتا ہوں جن کا میری مزاح نگاری سے راست تعلق رہا ہے۔

سب سے پہلے تو میں ادارہ "سیاست" کا ممنون ہوں کہ میں نے اس اخبار سے اپنی مزاح نگاری کا آغاز کیا تھا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے بارے میں آج تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ میرے حق میں کمبل کی حیثیت رکھتا ہے یا ریچھ کی۔ کیوں کہ میں اسے چھوڑنا چاہتا ہوں اور یہ مجھے نہیں چھوڑتا۔ چاروناچار میں اور زندہ دلانِ حیدرآباد پچھلے پچیس برسوں سے مزاح کے دریا میں ایک دوسرے کی جان بچاتے ہوئے بہتے چلے جارہے ہیں۔ ادارہ "شگوفہ" کا ممنون ہوں کہ اُس نے میرے بارے میں مجھ سے زیادہ ضخیم نمبر شایع کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں بھی نمبری ادیب ہوں۔ میں اپنے ناشر حسامی بک ڈپو کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو اصل میں دینی اور مذہبی کتابوں کے ناشر ہیں۔ میں عرصہ تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر میری کتابوں کو دینی کتابیں سمجھ کر چھاپتے ہیں۔ ایک دن اس موضوع پر اس ادارہ کے منتظمین سے بات ہوئی تو میری خوش فہمی رفع ہوئی اور یہ انکشاف ہوا کہ وہ طنز و مزاح کے فروغ کو دین کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں اور طنزیہ و مزاحیہ کتابوں کو بھی دینی کتابیں ہی تصور کرتے ہیں۔ ادارہ ٹائمس آف انڈیا کا شکریہ بھی واجب ہے کہ ہندی میں میرے سارے مزاحیہ مضامین کی اشاعت اسی گروپ کے ہندی رسائل میں ہوتی ہے۔

حضرات! میں اجتماعی طور پر آپ سب کا ممنون ہوں کہ آج آپ نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو اُردو کے معاشرے میں ایک ادیب کے ساتھ اُس کے مرنے کے بعد کیا جاتا ہے گویا اس طرح آپ نے مجھے جیتے جی مرنے کا مزہ لُوٹنے کا موقع عطا کیا ہے، اپنی ہی آنکھوں کے سامنے اپنی ہی خدمات کے اعتراف کے ڈرامے کو دیکھنے کی سعادت بھلا کسے نصیب ہوتی ہے۔ میں کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں۔ آپ سب حضرات کی محبتوں کے ذکر کے سلسلہ کو اور بھی دراز کرنے کو جی مچلنے لگا ہے لیکن اس سلسلے کو اب تھوڑا سا بھی دراز کروں گا تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں جذبات سے مغلوب ہوجاؤں گا اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ کہیں میری آنکھوں میں آنسو نہ اُمڈ آئیں۔ یہی ایک شئے آپ نے کبھی میری آنکھوں میں نہیں دیکھی ہے اور نہ میں اسے آپ کی آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری مزاح نگاری کا بس یہی ایک مسلک ہے۔ بہت پہلے میرے دوست مخمور سعیدی نے میرے بارے میں ایک شعر کہا تھا' اُسے سُناکر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔

شعر
خود سے مل کر بہت اُداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے

مُضطر مجازؔ (حیدرآباد)

نیا سال مبارک

(۱)

شانوں پہ نئی شال، نیا سال مبارک
تو دورِ حسن کا ہے مال، نیا سال مبارک

انسٹھ ہو صنعت کا کہ پیڑ ہو زمیں کا
داماد کا ہے مال، نیا سال مبارک

اولاد کی اولاد کی اولاد بھی خوشحال
فرزند خوش اقبال، نیا سال مبارک

ہو شہر کی بلڈنگ کہ دیہات کا مزرع
جا رہا آتے ہیں ہر مال، نیا سال مبارک

بھائی ہے جنیوا میں تو امریکہ میں بھتیجے
لندن میں ہے سسرال، نیا سال مبارک

ہر دن کہ ہے دن عید کا ہر رات ہے شبرات
ہر مہ، مہِ شوال، نیا سال مبارک

اچھائی کی، تعمیر کی، انصاف کی، سچ کی
اُلٹی ہوئی ہر چال، نیا سال مبارک

ملیانہ کی گلیاں کہ بنارس کی ہوں گلیاں
پی۔ اے۔ سی کو ہر سال نیا سال مبارک

اب تیرے لیے مشورہ ہے ایک ہی مضطر
لکڑی کی لگا ٹال، نیا سال مبارک

(۲)

تہران میں بھونچال، نیا سال مبارک
ایتھوپیا میں کال، نیا سال مبارک

بیروت پہ بم، بصرہ پہ یہ مدت کا ہے راج
کابل ہے زبوں حال، نیا سال مبارک

دجلہ میں بہا خون تو لنکا میں لگی آگ
فانہ میں کھنچی کھال، نیا سال مبارک

اس سال بھی ممکن ہے کہ اُس سال کے مانند
جوتوں میں بٹے دال، نیا سال مبارک

اس سال بھی ہر سر پہ اُسی طرح مسلط
رنگین سا ہے جنجال، نیا سال مبارک

اس سال بھی جم جائے گی ہر سال کے مانند
یو۔ این۔ او کی چوپال، نیا سال مبارک

اس سال بھی تقریر کا چمکائیں گے جادو
ابلیس کے دلال، نیا سال مبارک

اس سال بھی وہ داشتۂ پیرِ فرنگی
شیطان کی ہے ڈھال، نیا سال مبارک

اس سال بھی ہر سال کی مانند ہی مضطر!
یاروں کو بہر حال نیا سال مبارک!

دھواں ہی دھواں

یوسف ناظم

جب سے سگریٹ کی ڈبیا پر اور اس کے اندر کی ہر سگریٹ کے سرے پر یہ لکھا جانے لگا ہے کہ "سگریٹ صحت کے لیے مُضر ہے"، اُس وقت سے سگریٹ کی تجارت سب سے زیادہ منافع بخش تجارت ہو گئی ہے اور سگریٹ کی قیمت میں جتنا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سگریٹیں اتنی ہی زیادہ بکنے لگی ہیں۔ ہمارے یہاں مُضرِ صحت چیزیں تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر استعمال کی جاتی ہیں اور اگر کوئی چیز مضر نہیں ہوتی ہے تو اسے کوشش کر کے مُضر بنایا جاتا ہے اور سگریٹ کو 'یو' سرٹیفکٹ حاصل ہے۔ اس پر کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ صرف بالغوں کے لیے ہے اس لیے ایسے بچّے بھی جنھوں نے ابھی ابھی آٹھویں درجے میں قدم رکھا ہے نہایت مُستعدی کے ساتھ سگریٹ نوشی کا کام انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ نئی نسل واقعی بہت تیز ہے۔ کسی کام میں دیر نہیں کرتی۔ اس سے زیادہ عمر کے بچّے جو اپنی عمر کے دوسرے دہے کی پہلی سیڑھی پر اپنا پہلا قدم رکھتے ہیں صرف سگریٹ نہیں پیتے۔ یہ کام تو وہ بہت پہلے کر چکے اور ان سے بڑی عمر کے بچّے جن کی مسیں بھیگنی شروع ہونے والی ہوتی ہیں کاروان کا ساتھ دینے کی خاطر گردِ کارواں حاصل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اِس گرد کو بھی وہ گردِ کارواں سمجھتے ہیں اور اپنی رفتار میں تیزی پیدا کرتے ہیں تاکہ قافلے سے بہت زیادہ پیچھے نہ رہ جائیں۔

سگریٹ کی تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں رہی ہے۔ یہ بہت بچکانہ چیز ہے اس لیے اسے پرائمری ایجوکیشن کے نصاب میں ڈال دیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے مضامین بالکل الگ ہیں۔ سگریٹ صحت کے لیے مُضر ہے اس جملے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہمارے یہاں جس کسی کی بھی صحت خراب ہے اُس کا سبب سگریٹ نوشی ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ سب لوگ سگریٹ کہاں پیتے ہیں لیکن سگریٹ نہ پینے والے لوگوں کی صحت کی خرابی کے لیے بھی معقول انتظامات کیے گئے ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ زیادہ مضرت رساں چیزوں کی پیکنگ پر یہ نہیں لکھا جاتا کہ یہ چیز صحت کے لیے مُضر ہے۔ لوگوں کو خود بھی تو کچھ معلومات حاصل کرنے چاہئیں۔ انتظامیہ ہی کیوں چھپائی اور روشنائی پر روپیہ خرچ کرتا رہے۔ اتنے پیسوں میں تو اور کئی مُضرِ صحت چیزیں تیار کی جا سکتی ہیں۔

اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ خوب صورت اشتہار اگر کسی چیز کے چھپتے ہیں تو وہ سگریٹ ہی کے چھپتے

ہیں۔ ان اشتہاروں میں کچھ نوجوان لڑکے ہوتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ ان کی گرل فرینڈ ہوتی ہیں جنھیں عام طور پہ کزن کہا جاتا ہے۔ لڑکیاں، ان لڑکوں کے ساتھ رہتی ہی اس لیے ہیں کہ یہ لڑکے سگریٹ پیتے ہیں ورنہ اِن میں اور کون سی خوبی ہوتی ہے کہ لڑکیاں اِن کے پیچھے پیچھے پھریں۔ لڑکے بھی لڑکیوں کی اس کمزوری سے واقف ہوتے ہیں کیوں کہ آخر انھوں نے دُنیا دیکھی ہے۔

پچھلے کچھ سالوں سے جو سگریٹیں بن رہی ہیں ان کا قد پہلے کی سگریٹوں کے مقابلے میں ایک آدھ انچ زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پہلے کی سگریٹیں، کوتاہ قد ہونے کی وجہ سے صحت کے لیے اِتنی مُضر نہیں تھیں جتنی کہ انھیں ہونا چاہیئے تھا۔ اب ہر سگریٹ سے زیادہ کش لیے جاسکتے ہیں۔ قیمت وصول کی جاتی ہے تو ظاہر ہے اس کا بدل بھی پورا دیا جانا چاہیئے۔ یہ ایمان داری کا تقاضا ہے۔ ان سگریٹوں کو کنگ سائز کہا جاتا ہے۔ یہ عنوان ہمیں پسند آیا۔ ہم نے ایسے کِنگوں کی تصویریں بھی دیکھی ہیں جو پستہ قد تھے، لیکن پھر بھی کنگ تھے کیوں کہ جہاں تک اِن لوگوں کا تعلق ہے اِن کا پستہ قد ہونا رعایا کو کبھی بُرا نہیں لگا۔ اُن کا کنگ ہونا کافی تھا۔ ویسے کنگ کا مفہوم عام طور پہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قد و قامت کے لحاظ سے بھی اونچے درجے کی چیز ہوگا۔ کنگ کا یہ لفظ ریفریجریٹر بنانے والی کمپنیوں نے بھی اپنا لیا ہے اور ان کے یہاں سب سے بلند و بالا ریفریجریٹر کنگ سائز ریفریجریٹر ہوتا ہے۔ اِس میں کئی دن کا باسی کھانا رکھا رہتا ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو دُنیا میں اب کنگ رہ ہی کتنے گئے ہیں۔ گِنتی کے ایک یا دو۔ لیکن اِن کی وہ شان نہیں رہی ہے جو پہلے زمانے کے بادشاہوں کی ہوا کرتی تھی۔ اب بادشاہوں کو قانون قاعدے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ اگر شاہی خاندان کا کوئی فرد غیر شاہی حرکت کرتا ہے تو اس شخص کو تختِ شاہی پہ قدم نہیں رکھنے دیا جاتا۔ ہونا بھی یہی چاہیئے قاعدہ بنا ہے تو اس کی پابندی کرو ورنہ قاعدے بناؤ ہی مت۔ بہت سے لوگ تو بس قاعدے ہی بناتے رہتے ہیں اور جہاں ان کی پابندی کا سوال آیا۔ اس کے لیے خوبصورت طاق بنے ہوتے ہیں۔ پابندی انہی طاقوں میں طاق شدہ حالت میں رکھی رہتی ہے۔ پابندی تو مُضرِ صحت چیزوں کے استعمال کے معاملے میں کی جاتی ہے۔

سگریٹ پینے کا محاورہ یا ترکیب بھی لغوی اعتبار سے غلط ہے۔ سگریٹ کوئی مشروب تو ہے نہیں کہ گلاس میں اسے ڈالا اور پی گئے۔ سگریٹ کا تو دُھواں پیا جاتا ہے اور وہ بھی پورا نہیں۔ اس کا ایک کش لینے کے بعد جتنا دھواں داخلِ دفتر ہونے سے بچ جائے وہ ناک یا مُنہ کے ذریعہ عوام الناس کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے ٹرین کے وہ ڈبّے جن پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہاں سگریٹ نوشی منع ہے، اِسی دھوئیں سے بھرے رہتے ہیں۔ مسافروں سے تو بھرے ہوتے ہی ہیں۔ ڈبّے میں اتنے مُسافر ہوتے ہیں کہ ان کے بیچ میں سے دھواں تک گزر نہیں سکتا۔ اِس دھوئیں کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جن مسافروں کو کھانسی نہیں ہوتی وہ بھی کھانسی میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ ایک ٹکٹ میں سفر بھی اور کھانسی بھی۔

سگریٹ کے اس دھوئیں کو جو سگریٹ نوش شخص اپنے جسم میں داخل کرتا ہے ڈاکٹر نکوٹین کا نام دیتے ہیں شکر ہے کہ یہ نام بڑا نہیں ہے ورنہ علم طب میں عام طور پہ دس بارہ اور پندرہ حرفی الفاظ کا طریقہ رائج ہے جن الفاظ کو سُن کر مریض خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ نکوٹین کی بجائے اگر کوئی طول طویل لفظ تجویز کیا جاتا تو شاید

سگریٹ نوش شخص تھوڑا بہت پریشان ہوتا۔ یہ نکوٹین بہرحال بہت قیمتی اور پوشیدہ چیز ہوتی ہے۔ اسے سگریٹ کی مدد سے تلاش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں بھی سگریٹ بنتے ہیں اور شکل و صورت میں بالکل ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے کہ باہر کے ملکوں کے بنے ہوئے سگریٹ ہوتے ہیں۔ ان سب کا نمونہ ایک ہی ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے محب وطن لوگ عام طور پر وہ سگریٹ پیتے ہیں جو باہر سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی اتنے ہی مضر ہوتے ہیں جتنے کہ مصنوعات ملکی لیکن باہر کے ملکوں کے سگریٹ خریدنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ صحت کی خرابی میں بیرونی ہاتھ کا دخل معلوم ہوتا ہے۔ ان سگریٹوں کی قیمت بھی ذرا زیادہ ہوتی ہے لیکن کوئی حرج نہیں۔ غریب ملکوں کے لوگوں کو ہمیشہ قیمتی چیزیں ہی خریدنی چاہئیں۔

نکوٹین یوں تو اچھی چیز ہے لیکن اس کی خرابی یہ ہے کہ اس کے جمع ہونے میں کافی وقت لگتا ہے۔ کئی سال تک سگریٹیں پینی پڑتی ہیں۔ ۴۰ سگریٹوں کی حد تو ٹھیک لیکن اگر آدمی ۴۰ سگریٹ یومیہ کے اسکور سے آگے بڑھ جائے تو اسے سگریٹ پینا نہیں سگریٹ پھونکنا کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا اعزاز ہے۔ اگر آپ اسے اعزاز نہیں کہنا چاہتے تو امتیاز کہہ لیجئے۔ یہ لفظ بھی بُرا نہیں ہے۔ سگریٹ پھونکنے والے کا درجہ سگریٹ پینے والے شخص کے مقابلے میں بلند ہوتا ہے۔ جس کسی شخص کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں پیلی ہو جائیں (یہ بھی ہاتھ پیلے کرنا ہوا لیکن اس کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو کنواری لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کا ہوتا ہے) اور گال اندر کی طرف چلے جائیں جسے آسان لفظوں میں پچک جانا کہتے ہیں تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ شخص برسوں سے روزانہ ہاف سنچری بناتا ہے اسے سگریٹ پینے کی اتنی مشق ہوتی ہے کہ یہ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا سکتا ہے۔ اتنے بڑے حلقے کہ ہوائی قلعے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہی قلعے ان کی آنکھوں کے گرد بھی پڑے ہوتے ہیں اور اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آنکھیں گہنا جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اسے سگریٹ ترک کرنے کا مشورہ اس لیے نہیں دیتے کہ اگر اُس نے سگریٹ پینا واقعی ترک کر دیا تو اُس کی وفات کی ذمہ داری ڈاکٹر کے سر ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ روزانہ پچاس سگریٹیں پینے والے اشخاص انفرادی طور پر اتنا ہی دھواں خارج کرتے ہیں جتنا کہ ایک ریلوے انجن سے خارج ہو سکتا ہے۔

جو سگریٹ بہت زیادہ ضخیم ہو اُسے سگریٹ نہیں سگار کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ورقی سموسے کی طرح ہوتا ہے لیکن اس کا حلیہ ذرا الگ ہوتا ہے۔ اسے دیاسلائی دکھائی جائے تو یہ سموسہ آہستہ آہستہ فنائی ہونے لگتا ہے۔ سگار کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا رنگ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس پر کسی قسم کی تحریر طبع نہیں ہو سکتی۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس کا دھواں زیادہ تلخ اور گاڑھا ہوتا ہے۔

سگریٹ کا دھواں تو ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، سگار کے دھوئیں میں [illegible] تحلیل ہو جاتی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ سگار پینے سے آدمی کے جسم میں نکوٹین نام کی کوئی چیز داخل نہیں ہوتی کیونکہ سگار کی تیاری میں ہیشتر [illegible] استعمال نہیں کی جاتی۔ سگار پر بھی اگر کاغذ خرچ کیا جانے لگے تو اخبارات اور رسائل کو شاید ہی کاغذ کا کوٹا [illegible] کیا جا سکے۔ آج کل سارے کام کوٹے کے حساب سے چلتے ہیں۔ سگار کی [illegible]

پڑتی ہے کہ ایک سگار کو ۲۳ مرتبہ جلانا پڑتا ہے۔ اس میں ایندھن زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ سگار پینے والے لوگ اسے جلانے کے لیے اتنا ہی پٹرول استعمال کرتے ہیں جتنا ۲۵ کیلو میٹر سفر کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ سگار قدرے متمول لوگوں کی علامت ہے۔ دولت مند ملکوں کی امداد پر زندگی گزارنے والے لوگوں کو سگار ہی پینا چاہیے، قرض بڑھتا ہے۔

دھواں پینے کا ایک ذریعہ اور ہے اور وہ ہے پائپ ۔۔ پائپ اپنی کاری گری کے اعتبار سے بہت خوبصورت فرنیچر ہوتا ہے۔ مینی فرنیچر۔ اس کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی اوکھلی بنی ہوتی ہے جسے ایک خاص قسم کے ریشے دار تمباکو سے پُر کیا جاتا ہے۔ اسے بڑے پیار سے تھپکنا بھی پڑتا ہے۔ یہ اوکھلی جس ڈنڈی سے جڑی ہوتی ہے اُس میں دھویں کی رفت کے لیے ایک راستہ بنا ہوتا ہے۔ سُرنگ نما راستہ۔ اسے آپ یک رُخی راستہ کہہ سکتے ہیں۔ اِس ڈنڈی کے رسیدی کنارے یعنی ریسیونگ اینڈ پر کاری گر کو اپنا کمال دِکھانا پڑتا ہے کیوں کہ اسی کنارے کے توسط سے پائپ بردار شخص اپنا دھویں کا راشن حاصل کرتا ہے۔ کچھ لوگ ہونٹوں کی مدد سے اور کچھ لوگ دانتوں کی مدد سے پائپ پیتے ہیں (ہونٹ اور دانت دونوں اپنے ہونے چاہئیں)

سگریٹ کی ڈبیا پر سب کا حق ہوتا ہے۔ یہ غریب کی بھابی ہوتی ہے۔ سگار بھی دوسروں کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ یہ ذرا وزنی ہوتا ہے اِس لیے کم لوگ ہی اسے قبول کرتے ہیں اور پائپ کے کسی دوسرے کو دینے دِلانے اور پِلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِس لیے اِن مُضرِ صحت اشیاء میں پائپ ہی سب سے عمدہ شئے ہے۔ بس اس کا نام ہمیں پسند نہیں۔ کسی پائپ لائن کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔

پائپ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ بُجھا ہوا پائپ بھی محفل میں اِتنا ہی نمایاں اور لائقِ دید ہوتا ہے جتنا کہ شعلہ پوش پائپ۔

اگر کسی شخص کا پائپ کھو جائے تو اس کا باضابطہ ماتم کرنا پڑتا ہے۔ پائپ مردوں کا زیور ہوتا ہے اور زیور اگر کھو جائے تو ظاہر ہے افسوس کرنا ہی پڑے گا۔ اپنے پرس اور پائپ کی حفاظت میں لوگ جی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ پائپ کھو جائے تو اِن کے سینے سے دھواں اُٹھتا ہے۔ ▲▲

رضا نقوی واہی

اکیسویں صدی میں آبادی گھٹاؤ مہم

آبادی کا دباؤ بڑھا جب زمیں پر   نسخے تمام ہو گئے ناکام سربسر
سیلاب و قحط و جنگ و وبا سب تھے بے اثر

نسبندی و نرودھ یا لوپ یا فرقہ واریت   پچھلی صدی میں کر نہ سکے جب مدافعت
آبادی اور تیز بڑھی کینسر صفت

اربابِ حلّ و عقد نے آخر یہ طے کیا   آدم نے کی تھی خلد سے ہجرت کی ابتدا
اکیسویں صدی میں ہو ہجرت سوئے خلا

تھا حسنِ اتفاق کہ اس دور کا بشر   پہنچا تھا ایک جست میں دنیا سے چاند پر
سوچا گیا کہ بوجھ زمیں کا گھٹے اُدھر

شق القمر کا معجزہ تھا اک اشارہ یہ   تسخیرِ ماہتاب کا آئے گا مرحلہ
ہوگا وسیع عظمتِ انساں کا دائرہ

بے آب و بے گیاہ تھی لیکن وہ سرزمیں   موجود اُس کرہ پہ ہوا بھی نہ تھی کہیں
اک دشتِ بے پناہ تھا وہ اور کچھ نہیں

ٹکنولوجی کو لایا گیا پھر بروئے کار   بھیجے گئے ربوٹ کے دستے سوئے مدار
کمپیوٹروں نے ڈھانک دیا چاند کا دیار

مشہورِ روزگار تھی بوفورس کمپنی   کک بیک کے اصول پہ جو کاربند تھی
اس کاروبار پر وہی مامور ہو گئی

پتھر پہ دوب جمنے کی مشہور تھی مثل   اس کی بنا پہ تجربہ گہہ میں ہوا عمل
علمِ کیمسٹری نے کیا مسئلے کو حل

آلاتِ برقیہ نے گھٹاؤں کو موڑ کر   بھیجا سمندروں سے خلا میں سوئے قمر
بارش کی پہلی بوند پڑی ماہتاب پر

چلنے لگے خلائی جہازوں کے کارواں بھنڈار اور کیسیں کا زمیں سے گیا جہاں
روئیدگی نے پہلے پہل لیں جماہیاں

تیار کیمیا سے ہوئیں ایسی چادریں حدت کو آفتاب کی جو معتدل کریں
ذی روح ہستیاں نہ تمازت سے جل مریں

پیدا ہوئے وہاں پہ جب آثارِ زندگی ماحول خفتہ ہو گیا سرشارِ زندگی
چلنے لگا زمیں کی طرح کارِ زندگی

بستی بسائی جانے لگی ماہتاب پہ بھیجے گئے خلائی بسوں سے وہ اہلِ شر
اربابِ اقتدار کو رہتا تھا جن سے ڈر

تھے حزبِ اختلاف کے جو لوگ بھی جہاں چھاپہ پڑا تھا کانوں پہ ان سب کے ناگہاں
بھیجا حکومتوں نے اُنھیں سوئے آسماں

نقاد و شعر ساز و فسانہ نویس بھی آبادی جن کی چاروں طرف بے شمار تھی
پُشتِ زمیں تھی بوجھ سے جن کے دبی ہوئی

ایسے تمام لوگوں کو ویزا دیا گیا جنگی لیول پہ کام یہ پورا کیا گیا
آبادی کے نظام میں ٹھہراؤ آ گیا

پہنچے جو ماہتاب پہ انساں کے قافلے زور آوروں نے ایسے علاقے ہڑپ لیے
زرخیز و خوش گوار جو تھے ہر لحاظ سے

کمزور کا جو حال تھا روئے زمیں پر ارضِ قمر پہ جا کے ہوا اور خستہ تر
ان کو وہاں بھی مل نہ سکا گھاٹ ہو کہ گھر

مطلق نہ فرق آیا بشر کی سرشت میں سب جانتے ہیں اس نے کیا جو بہشت میں
یعنی کبھی تمیز نہ کی خوب و زشت میں

قابیل نے فساد کا بویا تھا جو تخم اس کے قلم کو لے کے گئے چاند پر بشر
ہونے لگا وہاں بھی تماشائے جنگ و شر

چنگیز اور ہلاکو و ہٹلر کے جانشیں استعمار کا لیے ہتھیار آتشیں
رو کے ہوئے ہیں سائنس اُڑانے پہ ہے زمیں

اک لفظِ کن سے خلق ہوئی تھی جو کائنات اک چھچھوری دھماکے کی زد میں ہے اس کی ذات
اکیس ویں صدی میں نہ دم توڑ

مسیح انجم

گلشن، پنخ اور کرکٹ فیوز

گاڑی بان اپنی گاڑی میں دو بیل باندھتا ہے۔ گاڑی کی سیدھی جانب کے بیل کو "گلشن"* کہتے ہیں اور بائیں جانب کے بیل کو "پنخ"۔ "گلشن" ذرا تیز گام ہوتا ہے، اور "پنخ" قدرے کمزور۔ اگر "پنخ" بالکل ہی پنخ قسم کا ہو تو "گلشن" پر گاڑی کا لوڈ (LOAD) بڑھ جاتا ہے، اور گاڑی کی رفتار سست ہو جاتی ہے لیکن گاڑی بہر حال لڑکھڑاتی، سنبھلتی، کسی نہ کسی طرح منزلِ مقصود کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس "گلشن" اور "پنخ" دونوں کے دونوں تیز قسم کے ہوں (جو عموماً نہیں ہوتے) تو گاڑی کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔ پتہ نہیں، راستے میں کب کوئی گڑھا یا کھڈ آ جائے، اور گاڑی اُلٹ جائے۔ خواہ کچھ ہو، ہوشیار گاڑی بان "گلشن" کو "پنخ" کی جگہ اور "پنخ" کو "گلشن" کی جگہ باندھنے کی غلطی کبھی نہیں کرتا!

ازدواجی معاملات میں بھی شوہر کی حیثیت "گلشن" کی سی ہے، اور بیوی کی حیثیت "پنخ" کی۔ اگر "پنخ" بالکل ہی پنخ قسم کی ہو تو "گلشن" کو گلچھرے اُڑانے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ چنانچہ ہوشیار شوہر "پنخ" کو "گلشن" بننے کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ اور نہ "گلشن" بنانے کی حماقت کرتا ہے۔ اگر "پنخ" از خود "گلشن" بننے کی کوشش کرے تو گھر میں "پنخ پنخ" شروع ہو جاتی ہے۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ ہماری بیگم ذرا پنخ قسم کی واقع ہوئی ہیں۔ لیکن ادھر جب سے ہم کالونی میں رہنے لگے ہیں، ان کا سابقہ "گلشن" قسم کی بیویوں سے پڑا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ ہم انھیں "پنخ" سے "گلشن" بنائیں۔ چنانچہ ان کی روزانہ کی "پنخ پنخ" سے عاجز آ کر ایک دن ہم نے کہہ ہی دیا کہ "بیگم! جہاں تم نے ربع صدی "پنخ" بن کے طور پر گزاری ہے، وہیں پر کچھ چند سال اسی ڈھب پر گزارتے میں کیا حرج ہے؟ تم نہیں جانتیں کہ "گلشن" بننا اور "گلشن" بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں پیسہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے اور محنت بھی بہت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اور تم تو اس معاملے میں ایک دم پنخ ہو!"

بولیں "آپ کو تو بس باتیں بنانا آتا ہے "گل شن" بنانا نہیں آتا۔ ٹی۔ وی۔ لا دو، میں ٹی۔ وی دیکھ دیکھ کر خود

---

* تلنگانہ میں اسے "گمتاد" کہتے ہیں۔

بھٹی سے بن جاؤں گی۔"!

بیوی کی ہٹ پر ہمیں ایک دانا کا قول یاد آیا:

"جو شخص عورت کی خواہش کے رُخ کو بزورِ قوت بدلنا چاہتا ہے وہ پرلے درجے کا بیوقوف ہے!"

پھر تو ہم بیوی سے گھبرا کر بازار سے ایک ٹی۔ وی اقساط پر خرید لائے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹی۔ وی کے ساتھ ساتھ کرکٹ فیور (CRICKET FEVER) بھی ہمارے گھر میں داخل ہوگا۔ ہم نے تو صرف ٹی۔ وی سٹ خریدا تھا، کرکٹ فیور نہیں خریدا تھا۔ بلکہ "ریلائنس ورلڈ کپ" کے مقابلوں نے اس فیور (FEVER) کو ہمارے گھر کا پتہ بتا دیا تھا۔ یوں بھی ہمارے گھر میں کرکٹ فیور کو پھیلانے کے لیے ایک نہیں، تین کھلاڑی موجود ہیں جو گلی کے "نکڑ کرکٹ کلب" یعنی این سی سی (N.C.C) کے لیے کھیلتے ہیں، اور ایک اوور (OVER) میں جھگڑے کے اوسط سے جھگڑے زیادہ اور رن (RUN) کم بناتے ہیں بشکر ہے کہ گھمسان کے رن کی نوبت نہیں آتی۔ ذرا ان تین کھلاڑیوں کا حال بھی سن لیجئے! ـــــ ان میں سے ایک وکٹ کیپر ہے جس کے پاس گلوز نہیں ہیں۔ اور وہ فیلڈنگ کے وقت اپنی ہوائی چپلوں کو ہاتھوں میں پہن کر وکٹ کیپنگ کرتا ہے۔ اس سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ "میاں! یہ بھی کوئی وکٹ کیپنگ کا طریقہ ہے؟" تو وہ جواب دیگا کہ "یہ بات آپ انڈیا کے مشہور وکٹ کیپر کرمانی صاحب سے پوچھئے! وہ تو بچپن میں اپنے ہاتھوں میں اینٹیں پکڑ کر وکٹ کیپنگ کیا کرتے تھے!"

دوسرا اسپین بولر ہے جو سڑک پر چلتے وقت بھی گگلی بولنگ کی مشق کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ حالتِ نیند میں بھی وہ اپنے ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔ گویا ہر وقت ایکشن میں رہتا ہے۔

تیسرا بزعم خود ایک مایہ ناز فیلڈر ہے، جس کا شاید ہی کوئی پتلون صحیح وسلامت رہا ہو۔ ان کے پاس پیڈ (PAD) تو کجا، کیپ (CAP) تک نہیں ہے، جس کی تلافی وہ کپڑے کی تھیلیوں سے کر لیتے ہیں۔ نتیجتاً بازار کو جاتے وقت سودے کی تھیلیوں کو ان کے سروں پر ڈھونڈنے کی نوبت آتی ہے۔ یہ ہے ہمارے گھر کا کرکٹ بیک گراؤنڈ! اور ایسے بیک گراؤنڈ میں ہم ٹی۔ وی کے ساتھ ساتھ کرکٹ فیور بھی خرید کر لائے۔

وہ بیوی جس نے اپنا بچپن صرف ایک "انڈور گیم" "پہچیسی" کھیلنے میں بتایا تھا اور جو بدیسی کھیلوں اور انگریزوں کو کوسنے میں ماہر سمجھی جاتی تھی، ٹی۔ وی کے آتے ہی کرکٹ میں دل چسپی لینے لگی اور اس دل چسپی کو ریلائنس ورلڈ کپ کے مقابلوں نے اور بھی ہوا دی۔ پھر کیا تھا۔ امورِ خانہ داری کی جگہ کرکٹ نے لے لی، اور ایک مثالی گھر اچھے خاصے کرکٹ کلب میں تبدیل ہوگیا۔ بچے نیند سے بیدار ہوتے ہی اسکول جانے کی تیاریاں کرنے کی بجائے کرکٹ پریکٹس میں مگن رہنے لگے، اور بیگم کرکٹ کی باریکیوں پر غور کرنے میں مصروف!

پہلے جب صبح ہوتی تھی تو "سنج" کو "گلشن" کے ناشتے کی فکر ہوتی تھی۔ لیکن اب بیگم روزانہ ناشتہ میں پراٹھے اور آملیٹ کی بجائے کرکٹ کی اصطلاحات پیش کرنے لگیں۔ ہماری بیگم کو کرکٹ کی صرف ایک اصطلاح "باؤنڈری" یاد تھی۔ کیونکہ انہی دنوں گھر کی باؤنڈری وال کی تعمیر کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ظاہر ہے، صرف ایک اصطلاح کے سہارے کرکٹ جیسا گھنٹوں کھیلا جانے والا کھیل سمجھا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ بیگم نے کرکٹ کی مزید اصطلاحوں کو جاننے اور ان کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں تنگ کرنا شروع کیا۔ ـــــ یہاں کیوں نہ ہم یہ اعتراف کرلیں کہ کرکٹ کے بارے میں ہماری معلومات صرف "چھکا" "چوکا" "باؤنڈری" اور "سنچری" تک ہی محدود ہیں۔ جب بھی ہم نے ٹی وی کھیل دیکھا

تو ایک سو تین (۱۰۳) تھا۔ ہمارے منہ سے بے اختیار نکل گیا "اف وہ ایک سو تین!"
اس پر برخوردار نے پوچھا "ڈیڈی، اسکور کیا ہے؟"
ہم نے جواب دیا "ایک سو تین"!
"پاپا" رن ریٹ (RUN RATE) ابھی تک نہیں بڑھا! حیرت ہے!
ہم نے اس کی بحرانی حالت کو تاڑ کر کہا "چلو بیٹا! ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں!"
وہ بولا "ذرا اس میچ کو تو ختم ہونے دو! پھر اس کے بعد غور کریں گے!"

جب اس نے لنچ کا مطالبہ کیا تو بیگم نے اس کی خدمت میں ایک سیب پیش کیا۔ سیب چونکہ لال تھا اس نے اس کو کرکٹ بال سمجھا۔ اور پھر اس نے اس زور سے بالنگ کی کہ سیب ہماری بیگم کی پیشانی کو چاٹتا ہوا "سر پر" کھا کر ہماری طرف اچھلا تو ہم نے فوراً کیچ لے لیا۔ ہم نے جھٹ دوڑ کر بیگم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہاں "بیچ" پر ایک گومڑا سا ابھر آیا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے صرف "گگلی" پھینکی تھی۔ اگر فاسٹ بولنگ کی ہوتی تو یقیناً ہماری بیگم کی مڈل اسٹک یعنی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوتی۔ تب بیگم کو پتہ چلا کہ کرکٹ کتنا خطرناک کھیل ہے۔ اور "بیچ" سے "گلشن" بننے میں کیا کیا دشواریاں ہیں!

ورلڈ کپ کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے بیرونی ممالک کے جو کھلاڑی آئے تھے ان کے اکثر نام ہماری بیگم کی زبان پر چڑھتے ہی نہیں تھے۔ یاد رکھنا تو دور کی بات ہوتی۔ وہ آخر وقت تک آسٹریلیا کی ٹیم کے کپتان ایلن بورڈر کو "لال بارڈر" ہی کہتی رہیں۔

ورلڈ کپ، سیمی فائنل کے موقع پر جب بیگم نے انگلینڈ ٹیم کے لحیم شحیم اور اونچے قد کے فاسٹ بولر گلیڈ اسٹون اسمال (جن کا نام اصولاً بلیک اسٹون بگ ہونا چاہیے تھا) کو دیکھا تو پوچھا "یہ کون ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟"

اس غیر ضروری سوال پر ہم نے اپنی بیگم کو آج کی نسل یعنی اولاد سے رجوع کیا۔ اس پر منجھلے صاحبزادے نے فرمایا "پلیز ڈیڈی! ممی کو ہم سے پوچھنے کے لیے کیوں کہہ رہے ہیں؟ وہ بات کو ذرا دیر سے سمجھتی ہیں۔ اور ہم فاسٹ ہیں۔ وہ ہم کو فالو نہیں کر پائیں گی۔ اور پھر یہ تو کرکٹ ہے۔ کبڈی کا کھیل نہیں ہے۔ فیلڈ پوزیشن سمجھانی پڑتی ہے۔ "تھرو" کا اینگل سمجھانا پڑتا ہے۔ ممی کو یہ تمام باتیں سمجھاتے سمجھاتے تک ادھر اوور OVER ختم ہو جائے گا۔ اور ہمارا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔"

پھر تو "بیچ" نے اپنا رخ زیبا "گلشن" کی طرف پھیرا (یعنی ہماری طرف پھیرا) اس وقت گلیڈ اسٹون اسمال بال کو اپنا تھوک لگا رہے تھے۔ بیگم نے حیرت سے پوچھا "وہ گولے کو تھوک کیوں لگا رہا ہے؟"
ہم نے کہا "وہ تھوک نہیں، مسکہ لگا رہا ہے۔ گولے کو پھسلا رہا ہے تاکہ بیٹس مین کو آؤٹ کر سکے۔"
بولیں "کھنکار کے کیوں نہیں تھوکتا؟"

ہم نے کہا "کھنکارنا انگریزی تہذیب کے خلاف ہے۔ انگریز شور و غل کو پسند نہیں کرتے۔ وہ بڑی خاموشی سے اپنا کام کر جاتے ہیں۔ حتی کہ انقلاب بھی لاتے ہیں تو اس کے پیچھے خاموشی کی ڈپلومیسی کام کرتی ہے۔"

اتنے میں بیگم کا ذہن گلیڈ اسٹون اسمال کے چہرے کی طرف گیا جن کا رنگ ذرا کیا، بہت ہی کالا تھا اور حبشیوں کے زمرے میں آتا تھا۔ بیگم نے فرمایا "اسمال کا رنگ تو دیکھو! لگتا جامنی ہے! بالکل حبشی گرہ"

معلوم ہوتا ہے !"

وہ تو اچھا ہوا کہ ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے ۔ اگر ہم مع اپنی اہلیہ فیلڈ پر ہوتے اور اسمال یہ ریمارکس سن لیتے تو وہ اسپورٹس مین اسپرٹ کو بالائے طاق رکھ کر فوراً ایک زوردار بولنسر ہماری طرف پھینکتے ۔ لیکن گمان غالب ہے کہ ممدوح اسپورٹس مین اسپرٹ سے مغلوب ہو کر فوراً حیدرآبادی انداز میں آداب بجالاتے !

ورلڈ کپ اسی سیمی فائنل کا ذکر ہے کہ ہمارے ملک کے کھلاڑی یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے جا رہے تھے ۔ اور ہم کفِ افسوس مل رہے تھے ۔ چوتھے نمبر پر ایک کھلاڑی میدان میں داخل ہوا ۔ "پچ" کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنی بیاٹ چہرے کے قریب لائی ۔ ہونٹ ہلائے ۔ بیاٹ پر کچھ پڑھ کر پھونکا ۔ کریز پر پہنچنے کے بعد گارڈ لیتے ہوئے گلے میں پہنی ہوئی اپنی زنجیر کا جائزہ لیا ۔ زنجیر کے ساتھ کچھ لٹک رہا تھا ۔ ہمیں یوں لگا جیسے وہ اپنی تعویذ سے کچھ مشورہ کر رہا ہے ۔ ہم اس کی توہم پرستی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ بیگم نے پوچھا "ابھی ابھی وہ اپنی بیاٹ پر کیا پھونک رہا تھا ؟ کیا بیاٹ پر پھونکنا بھی کرکٹ کے قواعد میں داخل ہے ؟"

ہم نے سمجھایا "وہ پھونک نہیں رہا تھا بلکہ بیاٹ پر کچھ دم کر رہا تھا تاکہ دم شدہ بیاٹ سے "چوکے" اور "چھکے" نکلیں اور فیلڈروں کے چھکے چھوٹ جائیں ! جب وہ دوسرے ہی اوور میں کلین بولڈ ہو گیا تو ہماری بیگم نے بولر کو روایتی انداز میں کوسنا شروع کیا :

" خدا گونے کو غارت کرے !"

ہم نے بیگم کو ٹوکنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اب بات کھیل اور تفریح کے جذبے سے نکل کر قومیت اور طرفداری کے حدود میں داخل ہو گئی تھی ۔ جب کبھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے تو ہم انجان بن جاتے ہیں ۔ اور ہمارے اس طرح انجان ہو جانے کو ہمارے دشمن غداری کے مترادف قرار دیتے ہیں ۔

ورلڈ کپ مقابلوں کے دوران ہمارے گھر میں سری لنکا کا ایک کھلاڑی جس کا نام "ماہناما" تھا بہت پاپولر ہوا ۔ کیونکہ ہم اردو رسالے اور ماہنامے منگوایا کرتے ہیں ۔ جب کمنٹیٹر نے سری لنکا کے کھلاڑی "ماہناما" کے نام کا اعلان کیا تو بیگم نے جھٹ پوچھا "یہ کونسا ماہنامہ ہے ؟"

ہم نے مسکرا کر جواب دیا "مزاحیہ ماہنامہ "شگوفہ" !"

خدا خدا کرکے ورلڈ کپ مقابلے اختتام کو پہنچے اور آسٹریلیا کی ٹیم فائنل جیت کر گولڈ کپ اپنے ساتھ لے گئی ۔ اس کے ساتھ ہی کرکٹ فیور جو وبائی شکل اختیار کر گیا تھا قابو میں آ گیا ۔ لیکن ہماری بیگم کی فرمائشات پر قابو نہ پایا جا سکے ۔ اب تو وہ ماشاء اللہ کرکٹ کی کچھ کچھ اصطلاحات غلط موقع پر بولنے بھی لگی ہیں ۔ ہماری بیگم اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے کرکٹ کی اصطلاحات پر قابو پا لیا ہے ۔ چنانچہ ہم نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا "اچھا یہ بتائیے کہ "فالو آن" کسے کہتے ہیں ؟" — وہ بولیں "یہ تو بہت آسان ہے ! آگے بڑھیے !"

"اچھا تو "گگلی" کے بارے میں کیا خیال ہے ؟" ہم نے بات آگے بڑھائی ۔

"وہ تو ایک دم "گلی" ہے ، آگے بڑھیے !" — ہم نے کہا "آؤٹ !"

[illegible] آؤٹ !"

مفلس قارونی
(پارسی شاکی)

دامادی مُبارک

مُبارک ہو تجھے گھوڑے پہ چڑھنا
مُبارک ہو عقد کے دو بول پڑھنا!
مُبارک درد کی منزل پہ بڑھنا
مُبارک کرب کی سولی پہ چڑھنا
تری نیندوں کی بربادی مُبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مُبارک

خدا رکھے تری بانکی جوانی!
نیا اب موڑ لیتی ہے کہانی!
پلائے گی تجھے دن رات پانی!
کرے گی اب جو تجھ پر حکمرانی!
تجھے اک ایسی شہزادی مُبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مُبارک

نواسوں کو مبارک تیرے نانی
مُبارک بھانجوں کو اک مُمانی
بہن اور بھائیوں کو بھابھی جانی
بھتیجوں کے لیے چچی سہانی
ترے پوتوں کو ہو دادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

اکڑ تیری نہ اب ہرگز چلے گی
نہ کوئی بات بیگم کی ٹلے گی
نہ گھر میں دال اب تیری گلے گی
تری ہر شام رو رو کر ڈھلے گی
تجھے ہر صبح فریادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

تو اب فرمائشوں سے تنگ ہوگا
دُکھوں سے زرد تیرا رنگ ہوگا
جو تجھ کو دیکھ لے گا دنگ ہوگا
جو اب ہے وہ نہ تیرا ڈھنگ ہوگا
گیبرڈین کی جگہ کھادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

کہاں پہلی سی اب وہ تیز گامی
کہاں ہوگی یہ طرزِ خوش کلامی
بنے گا ہر بشر اب تیرا حامی
مُبارک ساس کی تجھ کو غُلامی
خُسر کی تجھ کو دامادی مُبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مُبارک

بہن اور بھائی اور ماں باپ چھوٹے
جو رشتے تھے پُرانے سب وہ ٹوٹے
مقدر ہائے پیارے تیرے پھوٹے
تو اب روئے کہ سینہ اپنا کوٹے
تجھے ہر لمحہ فریادی مُبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مُبارک

پھریں گے خوب تیرے گھر میں بچے
ہر اک محراب میں ہر در میں بچے
ہر اک صندوق ہر بستر میں بچے
کبھی گھر میں کبھی دفتر میں بچے
مُبارک خانہ آبادی مبارک
مرے ہمدم تجھے شادی مبارک

[illegible] عبداللہ [illegible]
(بمبئی)

"اِمکانی"

(ڈاکٹروں، نرسوں، اور دل کے مریضوں سے معذرت کے ساتھ)

نوٹ :- اس مضمون کے کردار، واقعات اور مقامات بڑی حد تک فرضی ہیں صرف ہارٹ اٹیک راقم الحروف اور مسیح انجم اصلی ہیں

تین سال اُدھر کی بات ہے، لیکن لگتا ہے جیسے کل ہی کا قصہ ہو۔ شام بھی سہانی تھی اور سماں بھی رنگین کیونکہ غریب خانے کے دیوان خانے میں حیدرآباد کے نامور مزاح نگار اور خاکسار کے یارِ غار مسیح انجم تشریف فرما تھے اور وقفہ وقفہ سے لگی اپنی اکلوتی سائیکل کی طرف نہایت ہی پدرانہ شفقت کے ساتھ دیکھتے ہوئے زندہ دلانِ حیدرآباد کے عالمی جشن مزاح کے تعلق سے نت نئے انکشافات فرما رہے تھے کہ اچانک خاکسار کے اعضائے رئیسہ دغریبہ میں وقت سے پہلے ہی عالمی جشن مزاح، شروع ہو گیا، پہلے تو پیٹ میں درد کی ایک لہر اٹھی کرکٹ کی تیز رفتار گیند کی صورت، پھر پلک جھپکتے میں اس کا حجم پھیل کر فٹ بال کی شکل میں ڈھلا اور پھر ابتداء میں اُٹھنے والی درد کی لہر نے سینے میں پہنچ کر یکایک اپنی چھتری کھول دی اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے اس فانی بینک سے ہماری سانسوں کا "اکاؤنٹ کلوز" ہو گیا۔

درد نے کھول دی سینے میں جب اپنی چھتری ؛ میں بھی الفاس کا ڈوبا ہوا سرمایہ تھا

اور پھر جس وقت دوبارہ آنکھ کھلی، سفید براق لبادے میں ملبوس فرشتے کو اپنے اوپر جھکا ہوا پایا، گویا منکر نکیر تشریف لے آئے تھے، اس سے پہلے کہ وہ اپنے انٹرویو کا آغاز کرتے ہم نے فوراً کلمے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس، کلمے تو یاد نہیں آئے، یہاں بے شمار فلمی مکالمے اور لاتعداد فلموں کے سپرہٹ گانے ضرور یاد آئے کہ عمر کا بڑا حصہ اسی دشت کی سیاحی میں گزرا تھا، چنانچہ اپنی شرمندگی اور ندامت پر پردا ڈالنے کے لیے فرشتے صاحب کی خدمت میں با آواز بلند سلام کا نذرانہ پیش کیا "السلام علیکم یا منکر نکیر ...!" جواب میں منکر نکیر نے مسکرا کر فرمایا "یہ منکر نکیر نہیں آپ کا فیملی ڈاکٹر ہے جسے آپ اپنا فرینڈ، فلاسفر اور گائیڈ سمجھتے ہیں"! ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ پر ہم نے سٹپٹا کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا تو جملہ افرادِ خاندان کے ہمراہ مسیح انجم کو بھی اپنا "گھر لو" کیے ہوئے پایا، ہم نے مارے خوشی کے کپکپاتے ہوئے لہجے میں ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کیا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ابھی زندہ ہوں" [illegible] ... وہ مسکراتے ہوئے بولے "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ پورے ڈیڑھ منٹ تک غائب رہنے کے باوجود آپ [illegible] عالم بالا تک پہنچ جانے میں مزید کسی کی [illegible]

آگئی جو بات صرف ایک معمولی جھٹکے عرف ہارٹ اٹیک پر ٹل گئی!" بیوی صاحبہ نے فوراً ڈاکٹر صاحب کا جملہ اُچک کر فرمایا۔
"یہ میری ہی نیکیاں تھیں ڈاکٹر صاحب، جس نے انھیں بچالیا لیکن اب ان کا معقول علاج ہونا چاہیئے، میری نیکیاں آخر انھیں کب تک بچاتی رہیں گی؟" ہم نے بیوی صاحبہ کے طنز کی تاب نہ لاکر مسیح انجم کی طرف دیکھا لیکن وہاں بھی مطلع "تشویش ناک حد تک فکر آلود" تھا، ایسی منحنی صورت بنائے کھڑے تھے جیسے ان کے ہاتھوں کے طوطے، کبوتر، فاختے، کوّے، سبھی کچھ اُڑ چکے ہوں، نظریں ملتے ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں شکایت کی "پرویز جی! جانے کی اتنی جلدی کیوں مچا رہے ہو، کم سے کم عالمی جشنِ مزاح تو بخیر و خوبی ہوجانے دو، پھر چلے جانا۔!" مسیح انجم کو "مسیحائی" کی جگہ "جراحی" پہ آمادہ دیکھ کر، ہم نے دیگر افرادِ خاندان کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ وہاں بھی مطلع مختلف نہیں تھا، ہر شخص ایسی نگاہوں سے ہمیں گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "برخوردار، تمہاری ذات سے ہمیں ایسی امید ہرگز نہیں تھی ارے تم تو بیوی کی اجازت کے بغیر، بیت الخلاء بھی نہیں جاتے، یہ اتنی دُور "نامعلوم خلاؤں" میں جانے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کیسے کرلیا۔؟" سبھی کو ہماری ذات سے گلہ تھا اور ہمیں اپنے دل ہی سے کہ جس نے پچھلے چالیس برس کے عرصۂ حیات میں ہر دکھ سکھ میں متواتر ساتھ دینے کے بعد آج پہلی بار "ہاتھ" دینے کی کوشش کی تھی، اتنی لمبی رفاقت، سے اچانک "رقابت" کی بو آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے آلات سمیٹتے ہوئے مقطع ارشاد فرمایا۔ "ہوشیار ہوجائیے خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے، یہ پہلا پہلا جھٹکہ تھا جو صرف دل کو چھو کر نکل گیا، لیکن جھٹکۂ ثانی، سرطیہ آپ کے خون کو پانی اور وجود کو فانی، ثابت کرسکتا ہے لہٰذا فوراً کسی ماہرِ امراضِ قلب، سے رجوع ہوجائیے۔!"

کہتے ہیں ڈاکٹر کی وارننگ، اور پولیس کے وارنٹ، سے مفر ممکن نہیں، پولیس کے وارنٹ سے تو ہم بفضلِ تعالیٰ محفوظ تھے البتہ ڈاکٹر کی وارننگ ٹل چکی تھی لہٰذا اگلے ہی دن ہمیں شہر کے سب سے مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ، کے پرائیوٹ نرسنگ ہوم اسپتال میں پہنچادیا گیا۔!

فاضل ہارٹ اسپیشلسٹ کی امپورٹیڈ ڈگریوں کا لمبا چوڑا سلسلہ زلفِ جاناں کی طرح دراز تھا اور فیس کسی سود خور سیٹھ کی توند کی طرح تگڑی، جسے صرف دو نمبر کا کاروبار کرنے والے نمبری حضرات ہی جھیل سکتے تھے، ہم جیسے مفلس نادار افراد کے حق میں کہ جن کا نمبر سرکاری راشن کی دکانوں میں بھی مشکل ہی سے لگتا ہے، ڈاکٹر موصوف کی بھاری بھرکم فیس کا بوجھ برداشت کرنا ایک اور ہارٹ اٹیک، جھیلنے کے مترادف تھا، جسے ہمیں یوں برداشت نہیں کرنا پڑا کہ فاضل ڈاکٹر کو نہ "فیس" کی شکل میں زکوٰۃ دینے کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کے بدلے میں کچھ نادار مریضوں کو "زکوٰۃ کھاتے" میں دیکھ لیا کرتے تھے، اور ہمارے فیملی ڈاکٹر نے ہمارا نمبر بھی "زکوٰۃ کھاتے" میں لگا دیا تھا۔ اسپتالِ ہٰذا کا نقشہ بھی "ہالی وُوڈ" کی کرائم فلموں، کے ویلن کے خفیہ اڈّے کے خطرناک سیٹ، اور ماحول کی ہو بہو نقل تھا یعنی حدِ نظر تک دلفریب اور بھیانک، علاوہ ازیں، اسپتال ہٰذا کے دیگر اسٹاف کے انتخاب میں بھی غالباً صرف اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ہر کارکن کریہہ صورت، "تنگ مزاج، اور شقی القلب" ہو، چنانچہ کوئی اسٹاف ممبر سیدھے منہ بات کرتا نظر نہیں آیا، اب رہے مریض تو ہر مریض یوں اپنے ہاتھوں سے دل کو تھامے ہوئے تھا جیسے کہہ رہا ہو ؎

ساغر کو ذرا ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔ ہم اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے، تماشائے اہلِ مطلب، دیکھ رہے تھے کہ اچانک فاضل ڈاکٹر کے خصوصی "چیمبر" کا بیرونی بلب، روشن ہوا جو غالباً اس بات کا سگنل تھا کہ اگلے مریض کو، کوچۂ یار سے "شوئے دار" کی طرف بھیجا جائے۔ چنانچہ باہر اسٹول پہ بیٹھا ہوا، "بیڑی بردار" چپراسی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، بیڑی کو ہونٹوں

سے الگ کر کے کان کی آڑ میں اُسے اس طرح لٹکایا جیسے کان دھرا ایش ٹرے ہو، پھر چیمبر کا دروازہ کھول کر ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہم نے اس کے ایش ٹرے نما کان کی طرف حیرت سے دیکھا، جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے بیڑی سے یا باتوں سے، ہمارے اندر داخل ہوتے ہی کم بخت نے اس پھرتی سے دروازہ بند کیا جیسے چیمبر کا نہیں زندگی کا دروازہ ہم پہ بند کردیا ہو ۔۔!

چیمبر میں قدم رکھتے ہی جس چیز نے ہمارے پیروں میں خوف و ہراس کی بیڑیاں ڈال دیں وہ فاضل ڈاکٹر کی ذات والا صفات نہیں بلکہ ہڈیوں کا وہ قدِ آدم ڈھانچہ تھا جو ایک کونے میں اس صفائی کے ساتھ دیوار کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا کہ لگتا تھا جیسے چیمبر میں آنے والے ہر ذی روح سے ابھی آگے بڑھ کر مصافحہ، بلکہ معانقہ کرکے اس کی روح قبض کر لے گا، یوں محسوس ہوا جیسے ہم فاضل ڈاکٹر کے چیمبر میں نہیں بلکہ غلطی سے کسی "ڈیتھ چیمبر" (DEATH - CHAMBER) میں آگئے ہیں۔ چیمبر ہذا میں "پنجر ہذا" کی موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ فاضل ڈاکٹر اپنی فاش غلطیاں کو بھی کارنامہ سمجھ کر ان کی نمائش کرنے سے نہیں ہچکچاتے، مذکورہ ڈھانچہ یقیناً موصوف کے ہاتھوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچنے والے کسی بدنصیب مریض کی "باقیات الصالحات" تھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے نشست سنبھالی، فاضل ڈاکٹر نے پہلے تو ہمیں ٹٹولنے والی نظروں سے کھنگالا پھر سکتے میں کھڑے ہوئے ڈھانچے کی طرف دیکھا، پھر اپنی وحشت زدہ آنکھیں ہماری خوفزدہ آنکھوں میں گاڑتے ہوئے پھسپھسائے ۔ "ڈاکٹر، ڈاکو، اور ڈکیٹر سے کچھ بھی چھپانا خود اپنی جانِ عزیز کو مستقل خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے، اسی لیے اپنی رودادِ قلبی، تفصیل سے سنائیے!" یہ نادر شاہی حکم صادر کرکے موصوف نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں، ہم نے اپنی رودادِ دلِ وحشی سنانی شروع کی اور پھر ختم بھی کردی مگر فاضل ڈاکٹر نے آنکھیں نہیں کھولیں، ہم نے گھبرا کے سوچا کہیں ہماری رودادِ قلبی سن کر موصوف کی حرکت قلب تو بند نہیں ہوگئی، چنانچہ ہڑبڑا کر انھیں پکارا۔ "ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے آنکھیں کھولیے!"

موصوف نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور بولے "گھبرائیے مت میں ابھی زندہ ہوں آپ آگے کہیے!" ہم نے جھنجھلا کر گلا کیا۔ "آگے بس یہی کہنا ہے، جو ہم نے داستان اپنی سنائی آپ کیوں سوئے؟"

بولے ۔ "میں سو نہیں گیا تھا، فلیش بیک، میں کھو گیا تھا، برسوں پہلے، ایک اور مریض نے ہو بہو ایسی ہی داستان سنائی تھی ۔!"

ہم نے حیرت سے پوچھا "کس مریض نے؟"

جواب میں چیمبر ہذا میں کھڑے ہوئے "پنجر ہذا" کی طرف اشارہ کرکے بولے "اس مریض نے!"

ہم نے سٹپٹا کر سوال کیا "یہ اسی مریض کا ڈھانچہ ہے؟"

بولے ۔ "ہاں، پنچھی اُڑ گیا، پنجرہ چھوڑ گیا ۔!"

اس انکشاف پر ہم بُری طرح تھرّا کر رہ گئے۔ موصوف نے بے پروائی سے آگے کہا "خیر چھوڑیے اس قصے کو اور یہ بتلائیے حالیہ عرصے میں آپ کے گھر یا دفتر میں انکم ٹیکس کا چھاپہ تو نہیں پڑا؟"

ہم نے ہڑبڑا کر جواب دیا "جی نہیں ۔!"

چہرا بگاڑ کر بولے "پھر یقیناً آپ خود انکم ٹیکس کے دفتر گئے ہوں گے؟"

ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب میرے ہارٹ اٹیک کا انکم ٹیکس والوں سے کیا تعلق؟"

بولے۔ "لگتا ہے آپ اخبار پابندی سے نہیں پڑھتے۔ اپنے ملک میں ہارٹ اٹیک کی وبا کو عام کرنے میں انکم ٹیکس والوں کا بڑا ہاتھ ہے، خیر، ویسے آپ کرتے کیا ہیں؟"

عرض کیا۔ "قلم کا مزدور ہوں، لکھتا لکھاتا ہوں!"

چونک کر بولے۔ "پھر ضرور جدید شاعری کرتے ہوں گے؟" ہم نے فوراً انکار میں گردن ہلائی تو بولے۔ "پھر یقیناً جدید افسانے لکھتے ہوں گے؟"

"جی نہیں"۔ ہم نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا، مایوس لہجے میں بولے۔ "تعجب ہے، نہ آپ جدید شاعری کرتے ہیں نہ جدید افسانے رقم کرتے ہیں، اس کے باوجود آپ کو ہارٹ اٹیک ہوا؟"

ہم نے وضاحت کی۔ "دراصل میں طنز و مزاح لکھتا ہوں!"

چونک کر بولے۔ "یہ تو اور بھی تعجب کی بات ہے، طنز و مزاح نگار حضرات تو دوسروں کے ہارٹ اٹیک کا سبب بنتے ہیں اور آپ۔۔۔" بقیہ جملہ ادھورا چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور دیوار سے لگے ٹرالی نما، اسٹریچر، کی طرف اشارہ کرکے حکم صادر فرمایا "لیٹ جائیے اس پر!" اسٹریچر، موصوف کے سرکردہ و مُردہ کارہائے نمایاں عرف "پنجر ہذا" کی عین بغل میں تھا، ہم کپکپاتے، تھرتھراتے "جل تو جلال تو" کا دل ہی دل میں ورد کرتے ہوئے ڈھانچے کے پہلو میں لمبے لمبے لیٹ گئے۔ فاضل ڈاکٹر نے ایک عدد ہتھوڑی نما اوزار سنبھالا پھر اس کی مدد سے ہمارے مختلف اعضاء کی جانچ پڑتال شروع کردی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر عضو کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا سوائے دل کے۔ ہم نے حیرت سے کہا۔ "بجلی یہاں میرے دل پر گری ہے اور آپ اُسے گھٹنے اور ٹخنے کے آس پاس ڈھونڈ رہے ہیں!"

رازدارانہ لہجے میں بولے۔ "یہ ڈاکو، ڈاکہ ڈالنے کے بعد جائے واردات پر کبھی نہیں رُکتا، یہ دل کا معاملہ ہے جناب کوئی دل لگی نہیں ہے!" اتنا کہہ کر اپنے ٹیبل کا رُخ کیا اور پھر "انٹرکام" پر کسی کو فوری اپنے چیمبر میں طلب کیا۔

چند ثانیوں کے بعد دروازہ جو کھلا تو ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، یوں لگا جیسے موت کے چیمبر میں یکایک حیات تازہ کا زندگی بخش جھونکا در آیا آنے والی ہستی کا تعلق اسپتال ہذا کے نرسنگ اسٹاف سے تھا لیکن خلاف توقع نہ تو کرخت صورت تھی نہ ہی تنک مزاج دکھائی دیتی تھی البتہ شکل و صورت کے اعتبار سے یگانہ کے اس مصرع کی تعریف میں آتی تھی ؎ شہیدِ بہشت تھا مگر دستِ بخیل کا دیا۔ تاہم شباب کے باب میں ترس نہیں کسی اسمگلر کا بیگ تھی ایک دم لبالب اور مالا مال۔ عمر کے حساب سے "اگرچہ برس پندرہ ہوں یا کہ سولہ کا سن" کی قیامت خیز منزل کو آٹھ دس برس پیچھے چھوڑ آئی تھی، اس کے باوجود اُمنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کا اچھا خاصا اسٹاک، ہنوز اس کے کھاتے میں باقی تھا۔۔۔ ہماری تمام تر توجہ نرس پر مرکوز دیکھ کر فاضل ڈاکٹر نے اکھڑ لہجے میں فرمایا۔ "کپڑے اتار دیجئے!"

ہم نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کس کے؟"

چٹاک سے بولے۔ "آپ کے اپنے، اور کس کے!"

ہم نے نرس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے عذر پیش کیا۔ "جی شرم آتی ہے!"

گمبھیر لہجے میں بولے۔ "معالج، معشوق اور مرشد سے کیسی شرم، کیسا پردا! چلئے اتاریئے کپڑے۔۔۔

لگتا ہے، جلدی کیجئے؟ اس وضاحت پہ ہم نے شرماتے لجاتے نرس سے نظریں چراتے ہوئے اس طرح کپڑے اتارے، جیسے شرمیلی دلہنیں سہاگ رات کو ایک ایک کر کے اپنے گہنے اتارتی ہیں۔ نرس ہماری بوکھلاہٹوں سے محظوظ ہوتی رہی پھر اس نے ہمارے کپڑے پنجر ہذا پر ٹانگ دیئے تب ہمیں وہاں اس کی موجودگی کا ایک اور جواز سمجھ میں آیا کہ بوقت ضرورت یہ پنجر ہینگر کا بھی کام دیتا تھا۔۔۔!!

E. C. G نکالنے کے بعد موصوف نے ہمیں خون کا معائنہ کروانے اور ایکسرے نکلوانے کی ہدایت فرمائی بلکہ ایک پرچی بھی ہمارے ہاتھ میں تھما دی اور پھر ہمیں چیمبر میں اکیلا چھوڑ کر خود نرس کو لیے ہوئے باہر نکل گئے، اب ہمارے سامنے سب سے بڑا مرحلہ تھا اپنے کپڑوں کے حصول کا جو پنجر ہذا کے قبضہ میں تھے، کسی طرح اپنی تمام ہمت یکجا کر کے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے پنجر پر لٹکے اپنے کپڑے کھینچنے کی کوشش جو کی تو کپڑوں کے ساتھ ڈھانچہ بھی ہماری آغوش میں اس طرح سمٹ آیا جیسے ہندوستانی فلموں میں ہیروئن بھوسے کے تھیلے کی طرح ہیرو کی باہوں میں سمٹ آتی ہے، اس غیر متوقع جھٹکے پر ہماری چیخ نکل گئی جسے سن کر بڑی برادر، چپراسی اندر گھس آیا لیکن اندر کا منظر دیکھ کر اس کے ایش ٹرے نما کان کھڑے ہو گئے، ہمیں ڈھانچے کے ساتھ ہم آغوش پا کر وہ اسٹنٹ فلموں کے ہیرو کی طرح دہاڑ کر بولا۔ ”اوئے ناہنجار! ایک بے جان بے زبان ڈھانچے پر یہ اتیاچار دن دہاڑے بلات کار (Rape)

ہم نے گھگھیا کر کہا۔ ”میں بے قصور ہوں بھائی، اس نے میری عزت پر حملہ کیا ہے، پلیز مجھے اس کے پنجے سے چھڑاؤ۔۔۔!“ ہماری درخواست پر چپراسی اپنی ہنسی نہیں روک سکا، آگے بڑھ کر ہمیں پنجر ہذا کے شکنجے سے رہائی دلائی پھر بولا۔ ”بڑا ہی مردود ڈھانچہ ہے سالا،

”جانتے ہو کس کا ہے؟“

ہم نے گڑبڑا کر پوچھا۔ ”کس کا۔۔۔؟“

بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیوی کا۔۔۔“ یہ تازہ جھٹکہ، اسپتال ہذا میں وقفہ وقفہ سے لگنے والے دیگر جھٹکوں کے تابوت میں کیل ثابت ہوا، چپراسی کا یہ انکشاف اگر سچ تھا تو فرعون کے بعد فاضل ڈاکٹر کی پہلی بیوی، دنیا کی دوسری ہستی اور پہلی عورت تھی جسے مرنے کے بعد بھی نہیں بخشا گیا بلکہ بغرض عبرت اس کے ڈھانچے کو تا قیامت یا کم از کم تا قیام اسپتال ہذا محفوظ کر دیا گیا تھا۔۔۔!!!

اگلے چار روز تک ایکسرے ڈپارٹمنٹ اور شعبۂ بلڈ ٹسٹ میں ہمارے اعضائے رئیسہ و خبیثہ کی اندرونی صورت حال اور خون کے ابال و اچھال کی مختلف مشینوں کی مدد سے جانچ پڑتال ہوتی رہی اور خدا کا شکر کہ اتنے ذہنی و جسمانی جھٹکوں کے بعد بالآخر مرض کی اصلی جڑ پکڑ میں آ گئی، جس فتنے کو فاضل ڈاکٹر ہمارے سر سینے گھٹنے اور ٹخنے کے آس پاس تلاش کرتے رہے تھے وہ اصل میں زائد چربی، کی صورت خون میں شامل ہو کر ہماری رگوں میں تھا دا گھوم پھر رہا تھا، گیا پچھلے کچھ عرصے سے ہمارا لہو اکیلے ہی رگوں میں دوڑنے پھرنے کا قائل نہیں رہا تھا بلکہ اس شاعرانہ مشورے پہ پوری طرح عمل پیرا ہو چکا تھا۔ ؎

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو تھوڑی سی چربی بھی ساتھ لے کے چلو

تمام رپورٹوں کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ہمارے فاضل ڈاکٹر کے ہونٹوں پہ ایسی مفکل مسکراہٹ نمودار

ہوئی جو عموماً کسی اندرونی خوشی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ موصوف نے صرف مسکراہٹ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اچانک ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "مبارک ہو، پہلے پہلے ہارٹ اٹیک کے طفیل اب آپ بھی بڑے آدمیوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں، لہٰذا اب آپ کو بھی ان تمام احتیاطی تدابیر پر سختی سے عمل کرنا ہے جو ہر بڑے آدمی کا مقدر ہے، بالخصوص کھانے پینے کے معاملے میں مکمل پرہیز لازم ہے یوں سمجھیے 'اب تک آپ صرف کھانے کے لیے جیتے رہے ہیں، اب جینے کے لیے کھائیے۔" اس انکشاف پر ہمارے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر ہمدردانہ لہجے میں بولے "میں جانتا ہوں غذا میں اگر تھوڑی سی لذت اور باتوں میں ذراسی غیبت نہ ہو تو زندگی بڑی بے مزا اور بے کیف ہو جاتی ہے مگر یہ مت بھولیے بڑا آدمی کہلانے میں بھی بڑی لذت ہوتی ہے لہٰذا آج سے تمام مرغن اور چکنی چیزوں بلکہ چکنے چہروں کو بھی اپنے حق میں زہر سمجھیے، خاص طور سے مسکہ، بالائی اور انڈے کی زردی کو بیدردی سے اپنے "مینو کارڈ" سے قلم زد کر دیجیے تاہم ان کے دیگر استعمال پر کوئی پابندی نہیں ــــ!" ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "دیگر استعمال یعنی ؟"

مسکرا کر بولے۔ مسکہ کھانے سے روکا ہے' لگانے سے نہیں بالائی نوش فرمانے پر پابندی ہے، بالائی آمدنی بڑھانے پر کوئی روک نہیں' انڈے کی زردی بے شک آپ پر حرام ہے مگر ساقط البحر شاعروں اور ابن الوقت لیڈروں پر انڈے پھینکنے کی ہرگز ممانعت نہیں۔" اس دلچسپ وضاحت کے بعد آگے بولے: "ایک بات اور گرہ میں باندھ لیجیے۔ آج کے بعد سے ریڈیو اور ٹی۔ وی پر خبریں سننا اور اخبار پڑھنا ایک دم ترک کر دیجیے، یاد رکھیے آدمی جب تک حالاتِ حاضرہ سے غیر حاضر رہتا ہے بے خبری میں مارے جانے سے بھی محفوظ رہتا ہے۔" اس تاکید اور تلقین کے بعد دواؤں کا ایک لمبا چوڑا نسخہ اعمال نامہ کی صورت ہمارے ہاتھ میں تھما کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "آدمی کی موت چاہے طبعی ہو یا دل کی لائی ہوئی تباہی یعنی ہارٹ فیل کے نتیجہ میں واقع ہوئی ہو، شرفا، کا دستور ہے کہ مرحومین کو 'جنت مکانی' کے لقب سے یاد کرتے ہیں، لیکن جو لوگ ہارٹ اٹیک کے جھٹکے کے باوجود بچ جاتے ہیں انھیں میں 'جنت امکانی' کہتا ہوں غالباً اب آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ 'جنت مکانی' اور 'جنت امکانی' میں صرف الف کا فرق ہے، خدا آپ کی عمر دراز کرے' اب آپ بھی صرف 'الف' پر ٹکے ہوئے ہیں اور آپ کا الف پرہیز اور احتیاط ہی پر ٹکا رہ سکتا ہے۔ لہٰذا میرے مفید مشوروں پر اس وقت تک سختی سے عمل کیجیے جب تک کہ دوسرا اٹیک نہیں ہو جاتا ــــ!" اتنا کہہ کر فاضل ڈاکٹر نے ہماری طرف سے نظریں پھیر لیں اور ڈھانچے کی طرف پیار سے دیکھنے لگے، یہ غالباً اس بات کا سگنل تھا کہ ہم وہاں سے روانگی ڈال لیں۔ جیسے ہی ہم خیمے سے باہر نکلے بیڑی بردار چپراسی سے مڈبھیڑ ہوئی، اس کے ہونٹوں میں بدستور بیڑی بھی سلگ رہی تھی اور طنزیہ مسکراہٹ بھی، ہم دونوں کی تاب نہیں لا سکے اور کنی کاٹ کر آگے بڑھے ہی تھے کہ کم بخت نے الوداعی تحفے کے طور پر یہ فلمی مکھڑا ہماری طرف اچھال دیا۔ ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
ترا وجود ہے اب صرف داستاں کے لیے

آخر میں اتنا اور عرض کر دیں صاحبو! خدا گواہ ہے نہ تو ہم موت سے ڈرتے ہیں نہ ہمیں جینے کی ہوس ہے بلکہ جھٹکۂ اولیٰ کے بعد جھٹکۂ ثانی کے اسی طرح منتظر ہیں جس طرح شعراء حضرات مصرعِ اولیٰ کے

[illegible]

(بمبئی)

ذکر اُن ...... چوہوں کا

یہ جان کر آپ لوگوں کو یقیناً خوشی ہوگی کہ بمبئی شہر میں جتنی آبادی انسانوں کی ہے تقریباً اتنے ہی چوہے یہاں بستے ہیں اور ان کی ایک چوتھائی تعداد میں کتے یہاں موجود ہیں یعنی یہاں ہر چار افراد پر بھونکنے کے لئے ایک کتا موجود ہے اور ہر شخص کے کھانے میں اپنا حصہ چرا لے جانے کے لئے ایک عدد چوہا تیار بیٹھا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس شہر میں ہر کتے کی قسمت میں چار آدمی لکھے ہیں جب کہ ہر چوہا صرف ایک آدمی کا حقدار ہے۔ پس ثابت ہوا کہ چوہا کتے سے زیادہ خوش قسمت جانور ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فیملی پلاننگ کا اثر جتنا کتوں پر پڑا ہے اتنا چوہوں اور انسانوں پر نہیں پڑا۔ خیر انسان تو ازل سے ہی عاشق مزاج اور بچوں کا شوقین رہا ہے مگر ادھر نصف صدی سے چوہے بھی کچھ لاپرواہ اور کھلنڈرے ہو گئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب چوہوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے اور اس پر روک لگانا ضروری ہو گیا ہے تو وہ طاعون کی وبا پھیلا کر گاؤں کے گاؤں چٹ کر جایا کرتے تھے۔ آبادی کم کرنے کا سہرا چوہوں کے سر بندھے یہ ارباب حکومت و سیاست سے دیکھا نہیں گیا، اس لئے انھوں نے چوہوں کے وبا پھیلانے پر پابندی لگا دی اور کم کرنے کے لئے خود جارحانہ اقدامات کا نیا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔

انسان اور چوہا لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے چوہے ہر جگہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ عالیشان بنگلے، تنگ و تاریک محلوں کی عمارتیں، گندی گلیاں اور جھونپڑ پٹیاں، بازار، دفتر اور چھوٹی ہوٹلوں کے کچن، غرض ہر وہ جگہ جہاں کوئی انسان ہے وہاں چوہے خود بخود دوڑتے نظر آئیں گے۔ عام طور پر چوہوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن ایک جگہ ایسی ہے جہاں چوہا ہر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اس جگہ کا نام ہے سائنسی لیباریٹری۔ انسانوں کی فلاح کے لئے [illegible] [illegible] [illegible] ہیں۔

[illegible] لیباریٹری میں یہ [illegible] کوشش کر رہے تھے کہ [illegible] [illegible] میں [illegible]

[illegible]

دوسری طرف ایک چوہیا بٹھا دی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک چوہا اس تجرباتی پنجرے میں چھوڑ دیا۔ چوہا [illegible] مکئی کے دانے کی طرف لپکا۔ دوسری بار فاضل پروفیسر نے گیہوں کا دانہ رکھا، چوہے نے اسی دانے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد چاول اور جوار کا دانہ رکھا گیا۔ چوہا، چوہیا سے بے نیاز کھانے کی طرف ہی مائل رہا، اس لئے کہ بھوکا تھا۔ پروفیسر نے اپنا سینہ پھلایا اور طلبہ سے کہا۔ "دیکھا، جب پیٹ خالی ہو تو جنسی بھوک باقی نہیں رہتی!" ہمیشہ کی طرح پچھلی صف میں ایک ذہین طالب علم موجود تھا اس نے آواز لگائی۔ "سر! آپ چوہیا کو تو بدل کر دیکھ لیجئے۔"

لیکن چوہیا بدلنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اس لئے آدمی دل بہلانے کیلئے اپنی خوراک اور اپنی غذا بدلتا رہتا ہے۔ لذیذ اور ذائقہ دار کھانوں کا شوقین ہو جاتا ہے۔ کچھ اپنا غصہ شاعری، ادب، آرٹ، مصوری اور موسیقی پر نکالتے ہیں اور اپنی بھڑک مٹاتے رہتے ہیں۔ کچھ اپنا غم شراب میں ڈبوتے ہیں، کچھ خودکشی کر لیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جب سمندری جہاز ڈوبنے لگتا ہے تو سب سے پہلے چوہے اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اسی لئے مصیبت کے وقت کوئی ساتھ چھوڑ دے اور کامیابی کے موقع پر اس طرح جان کو آ جائے جیسے ہمیشہ سے وفادار نمک خوار رہا ہو تو بے اختیار چوہوں کی یاد آتی ہے۔ بارہ برس پہلے ایک مشہور سیاسی نیتا نے اسی طرح بہت نام کمایا تھا اور اپنا نام تاریخ میں محفوظ کر لیا تھا۔ یوں بھی ہماری تاریخ مختلف قسم کے چوہوں سے بھری پڑی ہے۔

چوہے اور پہاڑ کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ روزانہ ہزاروں لوگ تیشۂ فرہاد لئے پہاڑ کھودتے ہیں مگر ایک آدھ ہی دودھ کی نہر نکالنے میں کامیاب ہوتے ہیں، باقی لوگوں کو پہاڑ کی کھدائی کے بعد نکلنے والے چوہے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں سے نکلنے والے چوہے کبھی محاورے اور تاریخ میں جگہ بناتے ہیں۔ محاوراتی چوہے کبھی کبھی پیٹ میں بھی دوڑتے ہیں۔ ہم نے چوہوں سے بھی زیادہ مریل ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ایک ساتھ دو آدمیوں کا کھانا تناول فرما لیتے ہیں پھر بھی ان کے پیٹ میں چوہے دوڑتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ شاعر بن جاتے ہیں تاکہ پیٹ بھر کھانا نہ ملے تو جی بھر کر داد ہی حاصل کریں اس لئے کہ آج کل لوگ جھوٹی تعریفوں کے معاملے میں تو فراخدلی برتتے ہیں مگر بچا کھچا کھانا سنبھال کر فرج میں رکھ دیتے ہیں۔

کسی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ ہماری اور آپ سب کی پیدائش سے قبل یعنی ۱۸۳۶ء کی بات ہے پٹنہ کے گورنر سر رابرٹ کا انتقال ہو گیا۔ اس زمانے میں بھی برگزیدہ حضرات اس لئے گورنر بنا دیئے جاتے تھے تاکہ انتقال سے قبل کچھ عرصہ خود بھی آرام و آسائش کے ساتھ رہیں اور دوسروں کے اطمینان میں بھی خلل نہ ڈالیں۔ گورنر موصوف کے آنجہانی ہونے کے دوسرے دن گورنر ہاؤس کے صدر دروازے سے ایک چوہا عین اس وقت باہر نکلا جس وقت گورنر موصوف روزانہ رات کو چہل قدمی کے لئے نکلا کرتے تھے۔ صدر دروازے پر موجود سپاہی ذرا مذہبی اور روشن خیال تھا اس نے اس عقیدے کے تحت کہ یہ چوہا سر رابرٹ کی روح ہے اس کو فوجی سیلوٹ داغ دیا۔ اس کے بعد پورے پچیس برس یعنی ۱۸۶۱ء تک ایک چوہا ہمیشہ اسی وقت شام کو صدر دروازے سے باہر نکلتا تھا اور اس کو باقاعدہ باعزت طریقے پر سیلوٹ کیا جاتا تھا۔ خیر یہ تو انیسویں صدی کی بات ہے اس لئے قابل درگذر ہے۔ آج کل ایسا نہیں ہوتا۔ اب کوئی چوہا بلکہ گورنر ہاؤس سے ہی کیوں نہ نکلے، کوئی اسے سلام نہیں کرتا۔ ہاں شیروں کی عزت مارے ڈر کے سبھی کرتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی کسی شیر کو حکومت یا حالات نے چوہے میں تبدیل کیا، لوگ سلام کی بجائے اس کا استقبال دل ہی دل میں

ے کرتے ہیں۔ اگر کسی بے خبر نے غلطی سے اس سابقہ شیر اور حالیہ چوہے کو سلیوٹ کر بھی دیا تو وہ سلیوٹ موصوف کے دل پر
گھونسہ کی طرح پڑتا ہے۔ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ دنیا بھر کے سلیوٹ و سلام کے جواب میں شیر اپنی گردن [illegible]
ت سے شیر جب اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو چوہے میں تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ اسی لئے عقل مند بیویاں اپنے
شوہروں کے پرس میں اپنی حالیہ تصویر رکھ دیتی ہیں تاکہ وہ ہر جگہ عجز و انکسار کا نمونہ بنے رہیں اور اونچی پیشانی سے پرہیز کریں۔

ہم نے بچپن میں ایک بدھو چوہے کی کہانی پڑھی تھی جس میں اس چوہے نے پہلی بیوقوفی یہ کی تھی کہ سوتے ہوئے شیر
کے جسم کو پلے گراؤنڈ سمجھا تھا، وہاں اچھل کود مچائی تھی اور اسے جگا دیا تھا۔ شاید اس چوہے نے وہ مقولہ نہیں سنا تھا کہ سوتے
ہوئے شیر کو جگانا دانشمندی نہیں ہے۔ دوسری غلطی چوہے نے یہ کی کہ وہ شیر کے غصے کو اصلی غصہ سمجھا تھا اور اس سے
جان بخشی کی التجا کی تھی۔ اس احمق کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ شیر کبھی کہیں چوہوں کا شکار کیا کرتے ہیں۔ تیسری حماقت اس سے
یہ سرزد ہوئی کہ کچھ عرصہ بعد جب اس نے شیر کو شکاری کے جال میں پھنسا دیکھا تو اس کا دل چوہانیت کے جذبے سے سرشار ہو گیا
اور اس نے اپنے نوکیلے دانتوں سے جال کتر کر اپنے نام نہاد محسن کی جان بچالی۔ آجکل کے چوہے بہت ہوشیار اور ڈپلومیٹ
ہو گئے ہیں۔ اول تو وہ شیروں کے قریب جاتے نہیں، انہیں دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ شیروں کی کسی بات کا برا
نہیں کرتے۔ پیار بھری مسکراہٹ میں بھی انہیں خود غرضی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ شیروں کو مصیبت میں
گھرا دیکھ کر ہمدردی نہیں کرتے، خوشی کے شادیانے بجانے لگتے ہیں۔ شیر تو بہت دور کی بات ہے، آجکل کے چوہے دوسرے
چوہوں کی جان بھی نہیں بچاتے۔ وہ اس بات کو بخوبی جان گئے ہیں کہ ان کی قسمت میں چوہوں کی موت مرنا ہی لکھا ہے۔ آج
نہیں تو کل کوئی بڑا جانور یا انسان انہیں چٹ کر جائے گا۔ آجکل کے چوہے آدمی یا بلی کے چنگل میں پھنسنے کے بعد رحم کی
درخواست بھی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ موت صرف ایک بار آتی ہے اور اپنے وقت پر آتی ہے، پھر اس سے کیا ڈرنا؟ کم از کم
اس معاملے میں تو انسان چوہے سے سبق حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ اسے سبکی محسوس نہ ہو۔ انسان کو سوچنا چاہئے کہ جب اس نے
چیونٹی جیسی حقیر و فقیر جاندار سے زندگی کا درس لینے میں سبکی محسوس نہیں کی تو ہم چوہے سے کیوں شرمائیں؟

چوہا بے زبان ہونے کی حد تک خاموش اور کم آمیز جانور ہے اور اسی لئے زیادہ خطرناک ہے۔ ایسے لوگ جب کچھ کام
کرتے ہیں اس کا انجام خطرناک ہوتا ہے۔ کتے کو ایک پتھر مار دیجئے تو وہ فوراً آپ کو ڈانٹ دے گا۔ دوسرا پتھر مار دیجئے تو غرا
آگے بڑھ کر دوبارہ ڈانٹ دے گا۔ اس کے بعد تیسرا اور آخری پتھر مارنے کی ہمت کسی میں نہیں رہ جاتی۔ آخر بلیوں کے سامنے
چوہا انگلش کون گھمائے گا۔ لیکن اگر آپ کچن میں کسی چوہے کو ڈانٹ دیں تو اس وقت تو وہ سہم کر چلا جائے گا مگر اگلی صبح
ہونے سے پہلے وہ ایسا انتقام لے گا کہ دوسرے دن آپ ایک پالتو بلی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔

بلی اور چوہے کا رشتہ کچھ اتنا عجیب و غریب ہے کہ یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ اس دنیا میں پہلے پہل کون آیا؟ بلی یا [illegible]
[illegible] ہے دونوں ساتھ ساتھ وجود میں آئے ہوں تاکہ کھیل اور تماشے کے طور پر چوہا بلی کا کھیل ایجاد کر سکے۔ [illegible]
[illegible] اور پنیروں کو بطور غذا پسند ہے کیونکہ اس قدر پسند ہیں [illegible]
[illegible] کہ گوشت اور دودھ ایک ساتھ استعمال کرنا مضر ہے۔ حالانکہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ ایک [illegible]
[illegible] دودھ [illegible] سے اتفاق کر لیا [illegible]
[illegible] بلی نہ صرف [illegible] کی سلامتی [illegible] اس کی صحت [illegible] ہوتی۔

یوں تو تمام چوہے ہم شکل اور ہم رنگ ہوتے ہیں مگر کچھ گنتی کے چوہے سفید بھی ملتے ہیں جو قسمت کے دھنی ہوتے ہیں۔ جہاں سیاہ چوہوں کی قسمت میں نفرت، ظلم اور تشدد لکھا ہوتا ہے، سفید چوہوں کو لوگ بڑے شوق سے پالتے ہیں۔ انھیں حسینوں کی قربت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ یہ ذکر ساؤتھ افریقہ کا نہیں ہے، دنیا میں ہر جگہ لوگ اپنی جمالیاتی حس کی بناء پر یہ امتیاز برتنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے ہاں بھی گوری رنگت کی لڑکیوں کو شادی، عشق اور گھر سے بھاگنے کے پیغامات روز ہی ملتے ہیں مگر دوسری قسم کی لڑکیوں کو دیکھنا تو درکنار، لوگ ان کے لئے سیٹی بجانا بھی تضیع اوقات اور [illegible] بے لذت سمجھتے ہیں۔

چوہوں کو عام طور پر بزدل سمجھا جاتا ہے لیکن ہم نے بہادر چوہے بھی دیکھے ہیں۔ یہ بلی کی غیر موجودگی میں اس کے خلاف میٹنگیں برپا کرتے ہیں۔ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے سوال پر گرما گرم بحث کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب بلی بی تشریف لاتی ہیں تو بہادری کے ساتھ اس کے سامنے جا کر ڈٹ جاتے ہیں تاکہ بلی کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑے۔ جیسے ہی بلی ان کو لقمۂ تر بنانے کے لئے منہ کھولے آگے بڑھتی ہے یہ اس کے منہ میں بے خطر کود پڑتے ہیں۔

اس کے برخلاف بہادر لوگ اگر کسی چیز سے ڈرتے ہیں تو چوہے سے۔ بڑی دیر سے دوستوں کو اپنی شجاعت اور دلیری کے قصے سنا رہے ہیں اتنے میں کہیں سے کوئی چوہا آنکلا اور صاحب بہادر دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے، چوہا بے چارہ انگشت بدنداں رہ گیا۔ اسی طرح سے گھر کی مالکن، شوہر نامدار کو جھاڑ پلا رہی ہیں کہ بازار سے ہری مرچ لانا کیوں بھول گئے اور سعادت مند شوہر بھیگی بلی بنے بیوی کی تقریر سن رہے ہیں۔ اتنے میں چوہے نے صوفے کے پیچھے سے سر نکالا اور تو تلوار بیوی ایک چیخ مار کر شوہر کے گلے لگ گئیں اور فرمانے لگیں "کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ چوہا مارنے کی دوا لے آئیے، مگر آپ کو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔"

مگر آجکل کے چوہے بھی، اتنے اسمارٹ ہو گئے ہیں کہ کانونٹ میں پڑھنے والے بچوں کے بھی کان کترنے لگے ہیں۔ اب چوہے، چوہا مار دواؤں کے پاس بھٹکتے تک نہیں، جب تک کہ انھیں یقین نہ ہو جائے کہ وہ دوائیں نقلی ہیں اور چوہا پکڑنے والے پنجرے کو دیکھ کر آجکل چوہے قہقہہ لگاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے اواخر میں بھی انسان اتنا دقیانوسی طریقہ اپنائے ہوئے ہے۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ چوہوں کی شرارتوں کو درگذر کرتے رہنا چاہیے اور انھیں مارنے کی ترکیب نہیں کرنی چاہیے اس لئے کہ زندہ چوہے کو برداشت کرنے سے زیادہ مشکل کام مردہ چوہے کو ٹھکانے لگانا ہے۔ عام طور پر چوہے گھر کے کسی پوشیدہ گوشے میں پہنچ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں اور کئی دنوں تک ان کے انتقال کی خبر نشر نہیں ہو پاتی۔ وہ تو جب گھر کے اندر، لوکل ٹرین کے دوسرے درجے کے کھچاکھچ بھرے ہوئے کمپارٹمنٹ سے نکلنے والی بو آنے لگتی ہے تو گھر کے مکینوں کے چہرے سے چوہے کی موت کے اندیشے سے غمزدہ ہو جاتے ہیں۔

مغربی جاوا، انڈونیشیا چوہوں کا گھر ہے۔ وہاں کی انسانی اور چوہائی آبادی کا تناسب کچھ اتنا غیر متوازن ہے کہ ایک آدمی کے حصے میں کئی درجن چوہے آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سڑکوں پر آدمی کم اور چوہے زیادہ نظر آتے ہیں اور اب تو ایسا ہونے لگا ہے کہ آدمی بھی چوہوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ انسانوں کو ان کی اصلی حالت میں واپس لانے کی خاطر وہاں کی حکومت نے چوہوں کو بطور کرنسی استعمال کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اب وہاں عارضی شناختی کارڈ بنوانے کی فیس پانچ مرے ہوئے چوہے، شادی کا پرمٹ لینے کے لئے دس چوہوں کا نذرانہ، طلاق کے پرمٹ کے لئے [illegible]

قسمت پھوڑنے کی اجازت کے لئے پچیس پچاس بوسوں کی بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے تب جاکر مطلوبہ اجازت نامہ حاصل ہوتا ہے جو رشوت کہلاتا ہے (رشوت کے علاوہ تحفے قبول نہیں کئے جاتے) اسی لئے وہاں کے لوگ شادی کے دوسرے دن سے ہی پچاس بوسے جمع کرنے کی مہم پر لگ جاتے ہیں تاکہ جلد از جلد طلاق کا پرمٹ اور طلاق کی خوشی میں گھر میں پارٹی دینے کا اجازت نامہ بیک وقت حاصل کرلیں۔

——

روشن لال روشن (بنارسی)

"پیروڈیاں"

"برق" کو پا بہ حنا باندھتے ہیں"
لوگ لیڈر کو گدھا باندھتے ہیں!

دور کیا خاک غریبی ہو گی!
"وہ" بھی اِک اپنی ہوا باندھتے ہیں"

اِس گرانی سے رہائی معلوم!
"اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں"

وہ تو ننگے ہی پھرا کرتے ہیں
"مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں"

کام رشوت سے ہوا کرتا ہے
"لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

وہ ہتھیلی پہ جماتے ہیں دَہی!
"آبلہ پر بھی حنا باندھتے ہیں"

بات "وہ" کام کی کرتے ہی نہیں
"ہم" بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں"

سادہ پرکار ہیں لیڈر روشن
"ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں"

"سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے"
ہرگز کبھی کسی سے محبت نہیں مجھے!

"سو پشت سے ہے پیشۂ آبا" یہ لیڈری
"کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

بیوی کو اور بیوی کے بچوں کو چھوڑ کر
"ہرگز کبھی کسی سے محبت نہیں مجھے"

کیا کم ہے یہ مقام کہ جورو کا ہوں غلام
"مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے"

بیگم کا حکم ٹال سکوں اک ذرا سی دیر
"یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے"

میں جانتا ہوں یہ کہ میں نمروش ہوں حضور
"سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے"

چاہے تمھیں کا باپ مری کھال کھینچ لے
"مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے"

عادت اگر جو ہوتی تو کہتا میں جھوٹ ہی
"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"

میری مُونچھیں

آج کل میری مونچھیں ہر جگہ موضوعِ بحث بنی ہوئی ہیں۔ خاندان اور خاندان سے باہر خصوصیت کے ساتھ ادبی حلقوں میں کہیں نہ کہیں اس تعلق سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ جیسے یہ بھی ادب کا یا سماج کا کوئی اہم اور نازک مسئلہ ہے جس پر غور و فکر ہونا ہی چاہیئے۔ ورنہ غضب ہو جائے گا۔ خواتین چہ میگوئیاں کرتی ہیں۔ اور دبی دبی مسکراہٹوں کے ساتھ اپنے اپنے شوہروں کو دیکھتی ہوئی اطمینان کا سانس لیتی ہیں، جیسے دعا کرتی ہوں، اے دو جہاں کے مالک! ہمارے شوہروں پر عاتق شاہ کی مونچھوں کا سایہ نہ ڈال!

پہلی بار مجھے مونچھوں کی طاقت کا احساس ہوا۔ اگر تھوڑا بہت اندازہ پہلے ہوتا تو میں اب تک اس کی کئی فصلیں کاٹ چکا ہوتا۔ اور اس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن اب مطمئن ہوں۔ دیر سے ہی سہی مگر جاگا تو ہوں۔

میری مونچھیں، میری اپنی ذاتی اور اوریجنل مونچھیں ہیں۔ ورنہ اکثر مونچھیں مانگے تانگے کی ہوتی ہیں۔ جیسے کوئی کسی میلے ٹھیلے سے خرید کر اپنے چہرے پر چپکا لے۔ یا کسی امریکی یا انگریز ایکٹر کی ہو بہو نقالی اس طرح کہ چارلی چپلن باقی رہ جائے اور خود کا وجود غایب ہو جائے۔ آدمی کو آدمی بن کر زندگی گزارنا چاہیئے۔ کسی سرکس کا مسخرا بن کر نہیں۔ ورنہ سرکس کا مسخرا بھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی اور سرکس کی باؤنڈری کے باہر ایک سنجیدہ اور باوقار انسان کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ دوسری بحث ہے کہ آدمی کو انسان بننے تک کتنی بار جی جی کر مرنا اور مر مر کر جینا پڑتا ہے!

بات مونچھوں سے شروع ہو کر کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ آج کل میری مونچھیں شناساؤں اور دوستوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ وہ کبھی زیرِ لب مسکراہٹوں کے ساتھ اور کبھی حیران، پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے افسوس اور دکھ کا اظہار کر رہے ہوں کہ ہائے، اچھا خاصا آدمی کس طرح مونچھوں کی دام میں آگیا!

چنانچہ اسی حیرت کا اظہار میری ایک دوست افسانہ نگار نجمہ نکہت نے ایک ادبی محفل میں کیا۔ مجھے دیکھتے ہی پہلے تو وہ آنکھیں جھپکائیں اور منہ کھول دیا۔ اور پھر قریب آکر بولیں، عاتق شاہ ـــــ آپ؟ ـــ جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

میں نے کہا، جی ـــ یہ میری ہی مونچھیں ہیں۔ کوئی اور نہیں!

کہنے لگیں، اُف، آپ کی یہ مونچھیں ؟

میں نے کہا، جی ہاں ۔

اس کے بعد وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کرسکیں

دوسری بار ایک اور ادبی محفل میں انھوں نے اپنے اس نصف فقرے کو دہرایا۔ اور میں نے اپنی اسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ لیکن تیسری بار جب انھوں نے پھر اسی نقرے کو دہرانا چاہا تو میں نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا۔ "بی بی! اب خدا کے لیے میری مونچھوں کو نظر نہ لگائیے!"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایسی ہی ایک ادبی محفل کا ذکر ہے۔ میرے دوست سری نواس لاہوٹی تیز تیز چلتے ہوئے میرے قریب آئے۔ اور با آواز بلند کہا، اب آپ بغداد کے چور نظر آرہے ہیں میں با آواز بلند میں نے فوری جواب دیا، لاہوٹی بھائی! آپ بجا فرمارہے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی چوروں، غنڈوں، اور سود خوروں کا اتہ پتہ لگانے کے لیے بھیس بدلنا پڑتا ہے۔ اور وہی کام میں کررہا ہوں۔ کوئی اعتراض ہے آپ کو؟

میرا خیال ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں کوئی یہ نوٹس ہی نہیں لیتا کہ کس نے مونچھیں چھوڑ دی ہیں اور کس نے اپنی گھنی داڑھی منڈوادی ہے۔ اور نہ اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ فلاں ابن فلاں نے اپنی قمیص پر گہرے سُرخ رنگ کے یا کالے رنگ کے بٹن کیوں ٹنکوائے جب کہ قمیص کا رنگ سرمئی ہے!

میری دانست میں اس کی بڑی وجہ وہ بے پناہ فرصت ہے جو ہمیں نصیب ہے۔ اور جب فرصت ہو تو پڑوس کی اُس گرہست خاتون کے بارے میں بھی بات کی جاسکتی ہے جسے نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ کبھی سُنا۔

یہی مونچھیں کوئی پانچ چھ سو سال پہلے ہوتیں تو واقعی بڑی بات تھی کیونکہ اس زمانے میں مونچھیں شجاعت، بہادری، حوصلہ، شرافت نفسی اور خودداری کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔ جان چلی جائے لیکن کسی کے سامنے مونچھ نیچی نہ ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ مونچھوں کے قدردان سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور سخت معاشی بحران میں لوگ اپنی اپنی مونچھوں کے ایک دو بال کو کسی ساہوکار کے یہاں رہن رکھواتے۔ اور میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی اصل کے ساتھ معہ سود رقم دے کر حاصل کرلیتے۔ کہاں وہ دن۔ اور کہاں یہ لیل و نہار۔

لیکن یہ خبر سُن کر جی خوش ہوگیا کہ اب بھی بعض ایسے ملک ہیں جہاں اِن گھنی اور نکیلی مونچھوں کی قدر کی جاتی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے امیر احمد خسرو کا کہنا ہے کہ امریکہ میں عام طور پر عورتیں ایسی گھنی مونچھوں پر اپنی جان دیتی ہیں۔ خیراتہ ندیم نے بیچ میں ٹوکا، اور کہا، اب کچھ مت کہیئے۔ ورنہ عاتق شاہ امریکہ چلا جائے گا۔

دوستوں میں صرف صلاح الدین نیر ہی وہ واحد دوست ہیں جنھوں نے میری مونچھوں کا خیر مقدم کیا۔ اور بے ساختہ داد دی جیسے کسی اچھی غزل کے مقطع یا مطلع کی دی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی مشورہ بھی دیا کہ میں خضاب کا استعمال شروع کردوں۔ کیوں کہ مونچھوں میں جو سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے ہیں وہ اچھے نہیں لگتے۔ میں نے کہا، بھائی، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ سفیدیاں ہی تو عمر کی کہانی ہیں۔ اور میں انھیں کالا کرکے خود کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض بوڑھے سر پر کالک لگاکر جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں!

نیر کے علاوہ میرے ایک مزاح نگار دوست [illegible] ساتھ ایک

فوجی کی طرح اٹن شن ہو کر میری گھنی گھنی مونچھوں کو سیلوٹ کیا۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، داڑھی اور مونچھ کا وہ قدیم تعلق ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ بات میں نے اپنی مونچھوں سے شروع کی تھی لیکن بیچ میں داڑھی آگئی۔ کوئی بات مت کہہ دیجئے، کبھی کبھی بات میں بات نکل آتی ہے۔ اور اچھے بھلے آدمی سے بھی ایسی سہو ہو جاتی ہے۔ معاف کر دیجئے۔

جی ہاں میری مونچھیں آج کل بڑا اہم موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ویسے احباب اور چاہنے والوں نے حسب حیثیت اور حسب توفیق مجھے مختلف اعزازات سے نوازا بھی۔ مثلاً شاعر حمایت اللہ نے مجھے میجر کہا تو ڈاکٹر مصطفےٰ کمال نے کرنل اور طالب خوندمیری نے برگیڈیر لیکن چندر سری واستو نے مجھے آنریری "فیلڈ مارشل" کا ٹائیٹل اس وقت عطا کیا جب میں سو فیصد کلین شیو تھا۔ بعد میں اس کی قانونی توثیق سید عبدالقدوس، اڈوکیٹ نے کی۔ اور آج کل وہ اسی ٹائیٹل سے مخاطب کرتے ہیں "ہلو فیلڈ مارشل"

ڈیموکریسی میں اور وہ بھی ایک پارلیمنٹری ڈیموکریسی میں کسی کو فیلڈ مارشل کہنا ایک گالی سے کم نہیں لیکن جب قدوس، علی ظہیر اور ڈاکٹر مصطفےٰ کمال مجھے اس ٹائیٹل سے مخاطب کرتے ہیں تو میں قطعی بُرا نہیں مانتا۔ کیونکہ فیلڈ مارشل کے لفظ کو میرے دوست جن معنوں میں میرے نام کے ساتھ استعمال کرتے ہیں وہ اس مفہوم سے قطعی مختلف ہے جو عام طور پر لیا جاتا ہے۔ ویسے مزید وضاحت کے لیے آپ چاہیں تو میرے ان دوستوں سے مل سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ ترقی پسندیت اور جدیدیت کی بحث کو نہ چھیڑیں۔ ورنہ فیلڈ مارشل ایک طرف رہ جائے اور تینوں دوست دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ اور تقسیم کسی بھی سطح پر ہو بہر حال اچھی بات نہیں۔

شاعر دل میں مظفر مجاز میرے اُن دوستوں میں سے ایک ہیں جنھیں میری مونچھیں پسند ہیں۔ ان کے خیال میں میری مونچھیں میرے جلال کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن میری مونچھوں کا خوشگوار اثر مظفر مجاز کی صحت پر پڑا۔ لیکن اس کے برعکس بہت سے ادیب، شاعر اور دوست ایسے بھی ہیں جن کی عام صحت پر میری مونچھوں کا بُرا اثر ہوا۔ ان میں سے بعض دن بدن اندر ہی اندر گھلتے جا رہے ہیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ میں اپنے تمام چاہنے والے دوستوں سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔ اور میری مونچھوں کو برداشت کرلیں۔ جب میری بیوی برداشت کرلیتی ہے تو انھیں بھی اسے گوارا کرلینا چاہیے۔ محبت کا تقاضہ یہی ہے۔

مونچھ سے کئی فائدے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹرینوں اور بسوں میں سفر کے دوران نشست آسانی سے مل جاتی ہے۔ راہ چلتے ہوئے کسی بھی ٹیکسی یا آٹو کو رکوانا ہو تو مونچھ کا اشارہ کافی ہے۔ مونچھوں کی بدولت کسی اجنبی شاپنگ سنٹر میں قدم رکھتے ہی مالک یا منیجر اپنا کاؤنٹر اور نشست چھوڑ کر سر، سر کہتا ہوا آگے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ اور بہت ہی مناسب داموں اچھی اشیاء مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کبھی شام کو کسی ٹھنڈی سڑک پر گزر ہو جائے تو کانسٹبل سے لے کر سب انسپکٹر اٹن شن ہو کر سلوٹ کرتے ہیں۔ مگر کیوں ہے تو بھائی میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیجیے۔

اپنی ذات کے علاوہ میری مونچھوں سے کسی کو فائدہ پہنچا ہیں میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میری مونچھیں "لا اینڈ آرڈر" کو باقی رکھنے میں ایک مثبت رول ادا کر رہی ہیں۔ جب جس گلی کوچے سے میں گزرتا ہوں وہاں ادھر ادھر جھانکتے ہوئے بچے مجھے دیکھ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔ میرے خاندان، میرے محلے اور میری گلی میں ناٸش

پنے اپنے روتے ہوئے بچوں کو میری مونچھوں کا حوالہ دے کر چپ کرا دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح اکثر شوہر نامدار اپنی اپنی بیویوں کی نت نئی فرمائشوں سے زچ ہو کر یہ کہتے ہیں، چپ رہو، ورنہ میں عاشق شاہ کی طرح مونچھیں چھوڑ لوں گا!

۵۵

علامہ اقبال اپنے دوست اور لاہور کے مشہور بیرسٹر و لیڈر چودھری شہاب الدین کے بارے میں یہ لطیفہ سنایا کرتے تھے ۔

ایک دن لاہور کے بھنگیوں اور بھنگنوں نے ہڑتال کر دی۔ اس پر چودھری صاحب نے ان سب کو ٹاؤن ہال کے میدان میں جمع کرنے کا حکم دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو چودھری صاحب ان سے مخاطب ہوئے۔ "بہنو اور بھائیو"۔ ابھی وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ ایک بھنگن کا بچہ رونے لگا۔ اس پر بھنگن نے اپنے بچے سے کہا "ارے چپ ماموں ماریں گے"!

سید نصرت، آرکیٹکٹ
(کویت)

کار برائے فروخت

کیا آپ اخبار پڑھتے ہیں؟

آپ کا جواب یقیناً ہاں میں ہوگا کیونکہ اس وقت جبکہ آپ حسب ذیل سطور پڑھنے جارہے ہیں اخبار آپ کے ہاتھ میں موجود ہے اور ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے اس مضحکہ خیز سوال پر ہنس بھی رہے ہوں۔ دراصل ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ اخبار سے آپ کسی قسم کا کام بھی لیتے ہیں یا نہیں کیونکہ اکثر حضرات کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اخبار سے اپنی روزمرہ زندگی کے بہت سارے چھوٹے بڑے کام یوں نکالا کرتے ہیں کہ "آم کے آم گٹھلیوں کے دام" والا محاورہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً بارش کا موسم ہے اور راہ چلتے ہوئے اگر آپ اتفاق سے اپنا چھاتہ گھر بھول گئے ہوں تو یکایک بارش شروع ہوجانے پر اخبار کو سر پر اوڑھ لیا جاسکتا ہے اور گرمی کے موسم میں اس سے پنکھا جھلنے کا کام لیا جاسکتا ہے کبھی کبھی تو کچھ لوگ زمین پر بچھا کر اس پر گھڑی دو گھڑی آرام بھی لیتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ پھر اکثر حضرات (خصوصاً ڈیروں میں رہنے والے بیچلرز) تو اس بات پر متفق بھی ہیں کہ ایک اچھا اخبار (صرف کاغذ کی کوالٹی کے اعتبار سے) دسترخوان کا ایک بہترین نعم البدل ہوتا ہے۔ ورق ورق اسے پر بچھیے پھر بچھایئے سیر ہو کر کھایئے اور استعمال کے بعد توڑ موڑ کر پھینک دیجیے (گویا یہ اظہار خیال کیا جارہا ہو کہ ایڈیٹر کی رائے سے ہم قطعی متفق نہیں ہیں!)

برصغیر کے اکثر شہروں میں تو یہ بچوں کی کتابوں اور کاپیوں پر ایک حفاظتی جلد" باندھنے سے لیکر ردی کی دکانوں پر مناسب داموں فروخت کرکے آمدنی کے معقول ذرائع پیدا کرنے کے بھی کام آتا ہے اور جب کسی ردی کی دکان سے یہ لفافوں اور تھیلیوں کی شکل میں کرانہ کی دکان سے ہوتا ہوا پھر سے گھر میں آجاتا ہے تو اکثر گھر کی بیبیاں اس کو پانی میں بھگو کر اور کچھ دوسری چیزیں ملا کر ایک ایسا لیپ تیار کرلیتی ہیں جو گھر کی دیواروں، الماریوں اور فرش وغیرہ کو لیپنے پوتنے کے کام آتا ہے۔ یورپ میں اس کے استعمال کا طریقہ قطعاً غیر شاعرانہ قسم کا ہوتا ہے اور صبح صبح کوئی گورا صاحب حوائج ضروری سے فراغت کے لیے جب اخبار سمیت کسی حمام میں گھستا ہے تو گھنٹے آدھ گھنٹے بعد یوں برآمد ہوتا دکھائی دیتا ہے کہ اس کے چہرے پر تو اطمینان اور کشادگی کے جذبات

ہویدا ہوتے ہیں لیکن نقل سے اخبار غائب نظر آتا ہے۔

ہماری دانست میں تو اخبار کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ آپ نہ صرف اپنے گمشدہ کتے بلیوں کو ڈھونڈنے کا کام لے سکتے ہیں بلکہ اپنے فرضی یا سپوتوں کی گمشدگی کی اطلاع بھی اس میں درج کرواسکتے ہیں یا پھر اگر آپ کے پاس کوئی ایسی استعمال شدہ چیز موجود ہے جس سے آپ چھٹکارہ پانا چاہتے ہوں (زندہ اجسام کو چھوڑ کر) تو اخبار کے کالم آپ کی یہ مشکل آسان کرنے کے لیے حاضر ہیں۔ اب یہی دیکھئے نہ کہ ہمارے ہاں عرصہ سے ایک شورلیٹ کار زیرِ استعمال تھی اور ہم اسے گزشتہ ۶۵ برسوں سے اس بُری طرح استعمال کررہے تھے کہ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ ہماری اکلوتی اور واحد شریکِ حیات کے بعد ہماری زندگی میں ایک نہایت ہی اہم اور ضروری مقام حاصل کرتی جارہی ہے لیکن متواتر استعمال سے جب اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہونے شروع ہوئے اور وقتاً فوقتاً چرچرا کر وہ احتجاج بھی کرنے لگی تو ہم نے سوچا کہ اب وہ وقت آچلا ہے کہ اس کے داغِ مفارقت دے جانے سے قبل ہی اس سے کنارہ کشی بہتر ہے ویسے بھی مثل مشہور ہے کہ جب کبھی ریس کا گھوڑا لنگڑا ہوجاتا ہے تو اسے گولی مار کر ہلاک کردیا جاتا ہے اور ہماری کار ۶۵ برس کے مسلسل استعمال سے نہ صرف بوڑھی کھوسٹ ہوچکی تھی بلکہ اسے دیکھ کر تو بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے چاروں ٹائرس اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوں اور کسی بھی وقت بغیر کسی نوٹس کے اس کا چراغِ سحری گل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے "برائے فروخت" کے کالم میں ایک اشتہار چھپوایا اور دل ہی دل میں یہ پروگرام بنایا کہ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ہم اپنی شاعری کا ایک خوبصورت مجموعہ شائع کروائیں گے کیونکہ ادھر کچھ عرصہ سے ہم پر دھڑا دھڑ غزلوں کا نزول سا ہورہا ہے لیکن ان کا المیہ یہ ہے کہ اسے سن کر ہم خود اپنے آپ کو داد دے لیتے ہیں کیونکہ جب کبھی انہیں کسی رسالے یا اخبار کو بہ غرضِ اشاعت روانہ کیا گیا تو ہمیشہ یہی جواب ہاتھ لگا کہ ہماری شاعری چونکہ نئے اقدار کی ترجمانی کرتی ہے اور اس میں صرف ابہام ہی ہوتا ہے اور یہ ایک عام قاری تو کیا ناقدین کی بھی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے اس لیے اسے شائع نہیں کیا جاسکتا۔

خیر صاحب! اخبار میں اشتہار شائع ہوا۔ (ایک فرضی نام اور آفس کے فون نمبر کے ساتھ کیونکہ بیگم صاحبہ سے رقم کو بچانے کے لیے احتیاط کا یہی تقاضہ تھا) پہلے دن ہمیں خصوصی فون ملے ایک صاحب نے پوچھا کیا آپ اپنی کار فروخت کررہے ہیں! ہم نے جواب دیا "جی ہاں ارادہ کچھ ایسا ہی ہے" بولے "آخر ایسی بھی کیا مجبوری ہے جو آپ اپنی کار فروخت کررہے ہیں" ہم سٹپٹائے یہ سراسر ہماری معاشیات پر ایک کاری ضرب لگانے والی بات تھی کچھ دیر سوچ کر ہم نے کہا دراصل بات وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہماری کار اب کافی پرانی ہوچکی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے فروخت کرکے کوئی نئی کار خریدلیں" پوچھا گیا "ہر پرانی چیز کے تعلق سے آپ کا یہی نظریہ

ہے ہم نے جواب دیا "یقیناً" پھر پوچھا گیا آپ کی شادی کو ہوئے کتنا عرصہ ہو رہا ہے " ہمارے منہ سے بے ارادہ نکل گیا "دس سال (حالانکہ ہماری شادی کے عرصہ سے کار کی خرید و فروخت کے معاملے میں کوئی مطابقت نہیں تھی) آواز آئی اپنی بیوی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"؟ اس پر ہم انہیں ایک غیر پارلیمانی قسم کی گالی سے نوازنے ہی والے تھے کہ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔ ایک صاحب نے کار کے متعلق فون پر ہم سے بہت سارے سوالات کیے کہ ماڈل کون سا ہے کس رنگ کی ہے کیا ڈھنگ ہیں اور ٹائر کتنی بار پنکچر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ اور ان کو ساری تفصیلات بتلاتے ہوئے ہمیں یوں لگا جیسے ہم اپنی کار کی اسم نویسی پڑھ رہے ہوں اور اس کا شجرہ حسب نسب بیان کر رہے ہوں۔ ہماری ساری باتیں سننے کے بعد موصوف بولے "آپ کی کار کا ماڈل تو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے اور اب اس قسم کی کاریں کسی کار قبرستان کے لیے ہی مناسب لگتی ہیں ویسے اگر آپ اُسے تول کر سودا کرنا چاہیں تو براہ کرم یہ بتائیں کہ فی کلو کس حساب سے فروخت کریں گے" ہم نے بھی جواب تک ان کی اس ساری بکواس سے تنگ آ چکے تھے ترکی بہ ترکی جواب دیا "تول کر تو نہیں البتہ ناپ کر آپ ہماری کار خرید سکتے ہیں اور یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ایک صاحب نے قیمت سن کر کہا "کیا آپ اتنی ساری رقم بالاقساط لینا پسند کریں گے"؟ ہم نے کہا "جی" تو بولے "میں اپنی زندگی کے سارے کام استالمنٹ بیسس (اقساط کی بنیاد) پر ہی انجام دیتا ہوں حتیٰ کہ میں نے اپنی شادی بھی بالاقساط کی ہے" ہم نے حیرت سے پوچھا "وہ کس طرح" تو بولے "دراصل میں نے گھوڑے جوڑے کی رقم اپنی سسرال سے مانگی تھی وہ اتنی زیادہ تھی کہ اسے یکمشت ادا کرنا میرے سسر صاحب کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ وہ مذکورہ رقم مجھے بالاقساط ادا کرتے رہیں گے اور جس دن یہ رقم پوری ہو جائے گی میں بارات لیکر ان کے گھر پہنچ جاؤں گا" یہ سن کر ہم نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا "اب موت کے بارے میں آپ کا کیا پروگرام ہے" تو کھٹ کی سی ایک آواز آئی اور فون بند کر دیا گیا۔

ایک اور صاحب نے قیمت سن کر ناک بھنوں چڑھاتے (ہم نے فون پر تو یہ منظر نہیں دیکھا البتہ محسوس ضرور کیا) بھرائی ہوئی سی آواز سے بولے "بہت زیادہ قیمت ہے" اگر آپ اس قیمت کو ۱/۲ تک گھٹا دیں تو میں کار خریدنے کے لیے تیار ہوں" ہم نے جواب دیا "آدھی قیمت میں تو ایک سکنڈ ہینڈ رکشہ کا بھی ملنا دشوار ہے ویسے اگر آپ کو کار کی خریداری کا اتنا ہی شوق ہے تو آدھے پیسے دیکر آدھی کار ہی خرید لیں باقی آدھی کار ہم کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیں گے" اس کے بعد کوئی اور فون بھی آتے اور ہوتے رہے تا آنکہ ہمارا مطلوبہ گاہک ہمارے جال میں پھنس گیا اور اس نے کار کی تمام تفصیلات سننے کے بعد اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اب ایسے میں اسے اپنے گھر پر بلانا خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ اس طرح بیگم کو ہمارے منصوبہ کا پتہ چل جاتا چنانچہ ہم نے انہیں ایک آسان سا پتہ یہ سمجھایا کہ شام کو ہم اپنی کار سمیت مرغاب کے علاقہ میں واقع ہوٹل ایمان کے پاس

ملیں گے پھر اپنی شناخت کے بارے میں یہ بھی کہا کہ چونکہ وضع قطع کے اعتبار سے ہم ایک شاعر نظر آتے ہیں اس لیے انہیں ہم کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی پھر شام کے وقت ہم اپنی کار سمیت ہوٹل ایران کے قریب پہنچ گئے اور گاہک موصوف کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک صاحب لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہوٹل کے پچھواڑے پھیلی گئیں میزوں کی طرف آئے اور ادھر اُدھر کچھ تلاش کرتے ہوئے سیدھے ایک ایسی میز کی جانب لپکے چلے گئے جہاں ایک معروف نیم مقامی شاعر دو چار سامعین کو گھیرے ہوئے ترنم سے اپنی نئی غزل سنا رہے تھے اور سامعین چائے پیتے پیتے واہ واہ کی بھی چسکیاں لے رہے تھے موصوف پہ شاعر کی نظر پڑتے ہی ان کا ترنم کچھ اور تیز ہو گیا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے اس شعر پہ آپ کی توجہ چاہتا ہوں اور قبل اس کے کہ ان کا شعر ہمارے گاہک کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا تا ہم فوراً ان کے پاس پہنچے اور انہیں بہ مشکل تمام شاعر کی گرفت سے نکال کر کہا، آپ کو دراصل ہماری تلاش ہے اور ہم ہی وہ باکار آدمی ہیں جو اپنی کار آپ کے ہاتھ فروخت کر کے آج سے بے کار ہو جائیں گے" یہ سن کر بولے ہاں ہاں میں آپ کو ہی تلاش کر رہا تھا لیکن اک ذرا سی غلطی سے ایک خالص شاعر کے ہتھے چڑھ گیا تھا" اس گفتگو کے بعد کچھ افہام و تفہیم کے بعد کار کا سودا طے پا یا اور ہم نے ایک مناسب رقم اپنی جیب میں اڑس کر شاداں و فرحاں اپنی کار پہ ایک الوداعی نظر ڈالی کچھ دیر کے لیے ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے اندر ہی اندر کوئی ہار کی طرح محسوس رہا ہے اور وہ بھی ہماری بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح ہمیں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو: ع

ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے
مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم

تیسرے دن بھی اخبار میں اشتہار چھپا اور کچھ فون بھی آتے لیکن جواب میں ہم نے ایک مسرت بھرے لہجے میں انہیں اپنی کار کے فروخت ہو جانے اور بہت جلد ہماری شاعری کا مجموعہ منظرِ عام پر آنے کا مژدہ سنایا۔ پھر میں ایک محترمہ نے فون کیا ہم نے کہا "فرمایئے" آواز آئی "آپ کی کار فروخت ہو گئی؟" ہم نے جواب دیا۔ الحمدللہ بِک گیا" کتنے دینار میں یہ فروخت ہوئی تو ہم نے کہا "محترمہ یہ سوال کرتے ہوئے آپ شاید بھول رہی ہیں کہ ایسے نجات کو ہی چھپایا جاتا ہے اور اس کی مجاز بھی ہیں پھر بھلا میں آپ کو یہ کیوں بتاؤں کہ ہم نے کار کتنے میں فروخت کی ہے"!

سنی ان سنی کرتے ہوئے بولیں "سنا ہے کہ آج کل سونے کا دام کافی کم ہو گیا ہے اور میں نے سنا ہے کہ اس

رقم سے پانچ دس تولہ سونا خرید لوں" ہم نے جواب دیا "محترمہ خود خرید لیجئے لیکن پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ میاں اور بیویوں کی طرح اس مذہبی پن کا اظہار کیوں کیا جا رہا ہے"! تو ذرا ترش قسم کا جواب ملا "اپنی بجو کی آواز بھی نہیں پہچانتے آپ"؟ اب کی بار ہم نے اپنی بجو یعنی عرف عام میں ہماری بیگم کی آواز صاف طور پہ پہچان لی دراصل بیوی کی آواز میں جب تک کھنکھناہٹ اور تحکمانہ پن نہیں ہوتا۔ آپ یہ بالکل تمیز نہیں کر سکتے کہ کون بول رہا ہے بیوی یا محبوبہ؟ خیر! اب ہم بڑے سٹ پٹائے کہ بیگم کو اس بات کی بھنک کس طرح پڑ گئی حالاں کہ ہم نے اشتہار میں اپنا نام بھی نہیں دیا تھا اور منصوبہ یہ تھا کہ کار فروخت ہو جانے کے بعد جھوٹ موٹ ان سے یہ کہہ دیا جاتا کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ اب استعمال کے قابل نہیں رہی ہے۔ پھر جب غور کیا تو پتہ چلا کر بھلے ہی ہم نے اپنا نام اشتہار میں نہیں دیا تھا لیکن آفس کا جو فون نمبر اس میں درج تھا اسے بیگم بخوبی جانتی تھیں اور کار کی تفصیلات سے تمام تر ہماری ہی کار کی نشان دہی ہوتی تھی۔ اور گمان غالب ہے کہ بیگم کو ضرور ہم پر شک گزرا ہوگا اور اسی شک کی بنیاد پر انہوں نے اپنی آواز قدرے بدل کر ہم سے یہ اگلوا لیا کہ ہم نے کتنے دینار میں اسے فروخت کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہا کہ بیگم کو ساتھ لیے سونے کی دکان پہ جائیں اور سونا خرید کر ان کی اس رال کو پونچھیں جو سونے کے چڑھتے اترتے دام دیکھ دیکھ کر اکثر و بیشتر ان کے منہ سے بہنے لگتی ہے۔ سونا پا کر بیگم تو نہال ہو گئیں لیکن کتاب چھپوا کر سب میں سرخرو ہونے کا ہمارا سارا نشہ یکلخت ہرن ہو گیا اور ہمارے ہاتھوں اردو کی ایک عظیم خدمت بس ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)
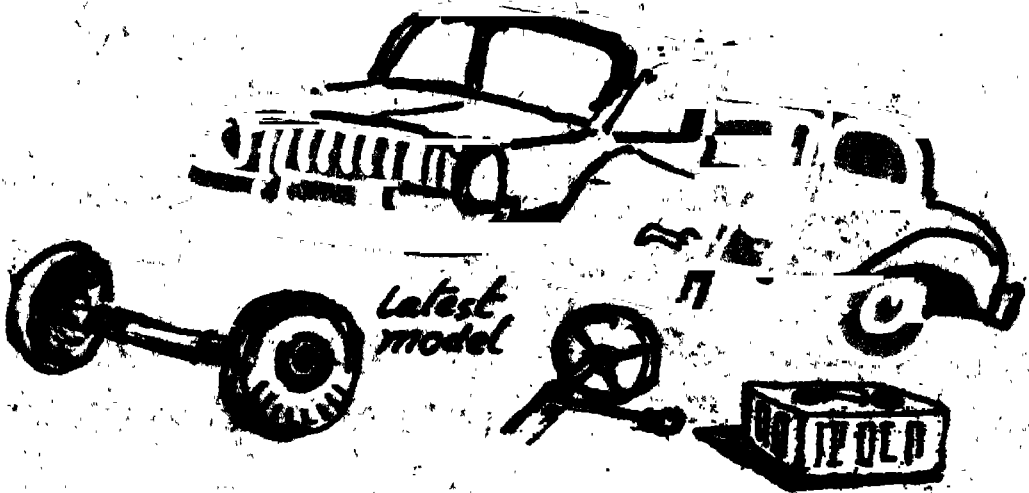
چلو پھر بھگتو

آگیا پھر سے نیا سال، چلو پھر بھگتو
سارے بھگتے ہوئے جنجال، چلو پھر بھگتو

پھر نئے ٹیکس لگائے گا بجٹ اب کے برس
پھر سے پھینکے گا نئے جال، چلو پھر بھگتو

تیل، شکر بھی دکھانے لگے اپنے بھاؤ
سر پہ ہے شامت اعمال، چلو پھر بھگتو

پھر سے کرسی پہ بٹھاؤ اسے بادیدۂ نم
نیتا چلتا ہے نئی چال، چلو پھر بھگتو

کیسۂ زر اسے رو رو کے دیا تھا تم نے
اب اڑھانی ہے اسے شال، چلو پھر بھگتو

قحط و سیلاب چلے آتے ہیں جس کے ذمے
آنے والا ہے وہ بھونچال، چلو پھر بھگتو

ہو گیا اپنی حکومت کا خزانہ خالی
سر پہ منڈلاتی ہے ہڑتال، چلو پھر بھگتو

ایک طوفان اٹھا تھا، تو بلا کچھ پانی!
پڑ گیا پانی کا پھر کال، چلو پھر بھگتو

ہاشمی پھر سے ہوا پھرتی ہے قینچی لیکر
کٹنے والے ہیں پر و بال، چلو پھر بھگتو

سید نظام

سالِ نو مبارک

ہے دعا میری۔ رہیں مسرور۔ فیوچر برائٹ ہو
اور بزنس آپ کا۔ امپرو و۔ ڈے اینڈ نائٹ ہو

کامیابی ہو میسر آپ کو ہر ہر قدم
آپ کی تدبیر چاہے رانگ ہو یا رائٹ ہو

آپ کو ہر کام میں آسانیاں ہی ہوں نصیب
اور دشمن کا ہمیشہ قافیہ ہی ٹائٹ ہو

ہوں اُجالے آپ کی قسمت میں ایوولوشن سدا
آپ کے بڈ روم میں اک مرکیوری لائیٹ ہو

ہندو مسلم اور سکھ عیسائی سب مل کر رہیں
اے خدا! آپس میں کوارل ہو نہ کوئی فائٹ ہو

رول اک ایسا بنے تا عمر ڈیوٹی پر رہیں
ہاتھ میں رشوہ ہو چاہے ویک اینڈم سائٹ ہو

ناشتے میں دس پراٹھے ہوں میسر کم سے کم
پھر بھی ہلکی ہو غذا۔ اور ڈائیٹ ایکدم لائیٹ ہو

انگلیاں ہوں پانچ گھی میں سر کڑھائی میں سرمنہ
مختصر یہ کہ مبارک سال ایسی ایٹ ہو
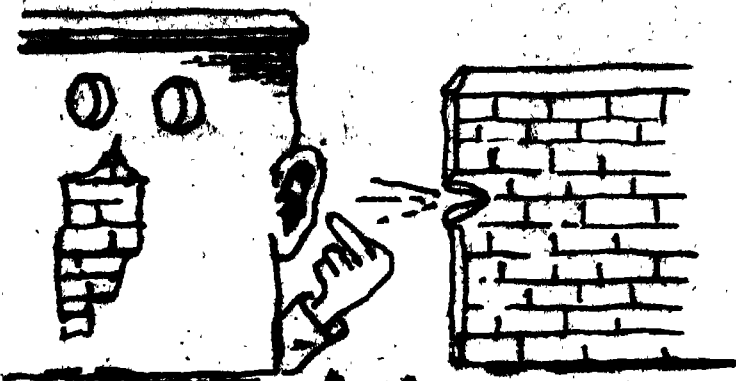
بانو سرتاج
(چندرا پور)

دیواریں

دیواریں بہت سی قسموں کی ہوتی ہیں۔ اب انہی دیواروں کو لے لیجئے جن کے درمیان بیٹھ کر ہم یہ مضمون لکھ رہے ہیں یعنی وہ دیواریں جن پر مکان کی چھت قائم اور ہماری زندگی بھی قائم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ماڈرن زمانے میں دیواروں کے بغیر کسی کا گزر ممکن نہیں کیونکہ غاروں اور درختوں پر رہنے کا فیشن اب رہا نہیں۔ گو کئی لوگ اب بھی فٹ پاتھوں کے اوپر، پلوں کے نیچے، پائپوں کے اندر اور گھروں کے باہر بھی رہتے ہیں مگر ہمارے خیال میں رہائش کی سب سے مناسب جگہ مکان ہی ہے۔ مکان جو دیواروں کا مرہون منت ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ہم جس دیوار یا جن دیواروں کی بات کر رہے ہیں وہ مکان کی نہیں احاطے کی دیواریں ہیں۔ جب ہم چھوٹے تھے تب ہمارے محلے میں بہت اونچی اونچی دیواروں سے گھری ہوئی ایک جگہ تھی۔ اُن دیواروں کے اندر مکان ہونے کا علم ہمیں کافی عرصے بعد ہوا۔ کیونکہ باہر سے صرف دیواریں ہی نظر آتی تھیں۔ ہم بچوں کو بیحد اشتیاق تھا اس کے اندر کے اسرار جاننے کا۔

کچھ بڑے بچے کہتے تھے کہ وہ ہاتھیوں کے رہنے کی جگہ ہے تبھی تو دیواریں اتنی اونچی ہیں مگر ہمارا کہنا تھا کہ ہاتھیوں کو جب لباس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو پردے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ ۔ ۔ آس پاس کوئی درخت بھی نہ تھا جس پر چڑھ کر اندر کا جائزہ لیا جا سکتا۔ قریب تھا کہ اسرار حل ہوئے بغیر رہ جاتا کہ کسی بڑے نے انکشاف کیا کہ ان دیواروں کے اندر ایک حویلی کے کھنڈر ہیں جن میں بھوتوں کا بسیرا ہے۔ ہم سب بچوں کو خاصی ناامیدی ہوئی۔ بے انتہا خوف بھی محسوس ہوا بھوتوں سے یہ معلوم کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی کہ اس حالت میں انھیں پردے کی کیا ضرورت ہے؟

پھر دیواریں ہمارا ہابی بن گئیں۔ جہاں کوئی غیر معمولی دیوار دکھائی دی ہم نے اس کے بارے میں تحقیق کرنے کا عزم کیا۔ آس پاس والوں سے سوالات پوچھے اور اکثر نادم ہوئے۔ جیسے ایک مرتبہ ہم سفر کر رہے تھے سات گھنٹوں کے سفر کے بعد ہمیں دور بہت دور ایک اونچی دیوار نظر آئی۔ ہم نے شہر محترم سے دریافت

کیا۔ . . " وہ دیوار کیسی ہے ؟"
جواب ملا " ہوگی کیسی ؟ جس شہر میں ہم جا رہے ہیں اس کی فصیل ہے ۔"

ذیل میں دیواروں پر کی گئی ہماری تحقیق کا خلاصہ پیش ہے ۔ واضح رہے کہ یہ مشاہدات ریل کے سفر کے دوران کئے گئے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ریل کی پٹریاں کافی اونچائی پر بنی ہوتی ہیں اور اُن ریلوں میں سفر کرتے ہوئے نہ صرف دیواریں بلکہ دیواروں کے اندر کا بھی منظر بہت کچھ نظر آتا ہے (پھر سفر کرنے کے بعد کچھ بکھیں گے نہیں تو کسی کو معلوم کیسے ہوگا کہ ہم نے سفر کیا ہے)

دیوار عمارت بنانے کے لیے بنائی جاتی ہے، عمارت کے گرد بنائی جاتی ہے یا خالی خالی زمین کو گھیر کر بنائی جاتی ہے۔ اکثر یہ شہر کے گرد بھی بنائی جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے گرد بھی بنائی جاتی ہے . . . .
کم از کم ہندوستان میں اس کی مثال موجود ہے شہنشاہ اکبر نے رقاصہ انارکلی کے گرد دیواریں کھڑی کر کے تاریخ میں ایک نئی مثال قائم کی۔ خیر جو بھی ہو، مقصد سبھی دیواروں کا ایک ہوتا ہے یعنی درمیان کی چیز کو محفوظ رکھنا۔ (انارکلی دیوار میں چنوائی نہ جاتی تو آج اُس کے نام سے کوئی واقف نہ ہوتا۔)

زیرِ گفتگو دیواریں یعنی احاطے کی دیواریں چار قسم کی ہوتی ہیں۔ کم اونچی، اونچی، زیادہ اونچی اور بہت زیادہ اونچی۔

کم اونچی دیوار بنائی تو عام سائز کی جاتی ہے مگر وقت کے گزرنے کے ساتھ یا تو سامنے کی سڑک اونچی ہو جاتی ہے یا لوگ دیواروں کے اندر بنگلہ اونچی بنیادوں پر بنا دیا جاتا ہے۔ یہ دیوار ابتداء میں چاہے جو مقصد رکھتی ہو بعد ازاں اس مقصد کی تکمیل نہیں کرتی۔ وہ دکھاوے اور فیشن کی چیز بن جاتی ہے۔ وہی صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والی بات۔

اونچی دیوار کی تعمیر کے مقاصد مختلف مگر مبہم سے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا کہ دیوار مکان کی حفاظت کے لیے تعمیر کی گئی ہے یا امارت کا رعب ڈالنے کے لیے۔

بہت اُونچی دیوار پُرانے زمانے کی وہ چار دیواری ہے جو خواتین کو خواتینِ خانہ بنائے رکھنے کے لیے تعمیر کی جاتی ہے۔ اس کے اندر پرندوں کے سوا کسی کو پر مارنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ (یہ اور بات ہے کہ پرندوں کو کیا پڑی کہ وسیع آسمان چھوڑ کر وہاں پر مارنے جائیں) اندر والوں کو باہر کی خبر نہ لگنے دینا ان دیواروں کا اول و آخری مقصد ہوتا ہے۔ ربڑ کی پٹی کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو ان دیواروں کے اندر نہیں جھانکا جا سکتا۔

بہت زیادہ اونچی دیوار کہیں دکھائی دے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے اندر ضرور کوئی شہر آباد ہے۔ زمانہ قدیم میں ملک ہندوستان کی خواتین ہی میں نہیں، مردوں میں بھی پردے کا رواج تھا۔ خصوصاً بیرونی حملہ آوروں سے سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ شہر کے گرد لمبی چوڑی دیوار بنام فصیل کھڑی کی جاتی تھی۔ حملہ آوروں کے شہر کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملتے ہی مردوزن، شاہ و سپاہ پردے میں ہو جاتے تھے اور حملہ آوروں سے بات چیت فصیل کے باہر انجام پاتی تھی جس میں چنندہ افراد حصّہ لیتے تھے۔

پردہ داری کے علاوہ فصیل کے دوسرے مقاصد بھی تھے۔ سپاہی جنگ کے موقع پر فصیل پر کھڑے ہو کر تیر نیزے بندوقیں وغیرہ چلاتے تھے۔ جھانسی کی رانی کے زمانے میں، رانی کی خاتون سپاہ نے دشمنوں پر

م پانی ڈالنے کا کام فصیل کے اُوپر ہی سے انجام دیا تھا۔ (جھانسی کی رانی یا دوسری بھی کوئی رانی ہو سکتی
ہے۔ ہماری تاریخ کی واقفیت بس یوں ہی سی ہے۔ ویسے بھی یہ منظر ہم نے ایک فلم میں دیکھا تھا۔) شہنشاہ
فصیل کا استعمال اکھاڑے کے بطور کرتا تھا۔ ہم نے پڑھا ہے کہ وہ روزانہ دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر فصیل
دوڑتا تھا۔ (آدمیوں کو بغل میں کیوں دباتا تھا؟ کیا حشر ہوتا تھا اُن آدمیوں کا؟ . . . یہ سوالات خارج
بحث ہیں۔)

ہمارے شہر میں بھی (شہر کے گرد بھی) فصیل ہے۔ اس شہر کی جنتا اس کا استعمال محرم، گنپتی، رام لیلا، میلاد وغیرہ کے جلوسوں اور مورچوں کو دیکھنے، اور سیلاب کا نظارہ کرنے کے لیے کرتی ہے۔

دیواروں کی تعمیر کے وقت اکثر بے حد مزے دار واقعے ہوئے ہیں۔ جیسے ملک چین کے باسیوں نے ایک مرتبہ دیوار بنانی شروع کی اور اس کام میں اتنے منہمک ہوئے کہ دیوار بناتے ہی چلے گئے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دوسرے والوں نے انھیں روک دیا ورنہ اُن کی دیوار خدا جانے کہاں تک پہنچتی۔ اب بھی جب کبھی کسی ملک میں دیوار ی جاتی ہے تو دیوارِ چین کو ضرور دھیان میں رکھا جاتا ہے کہ دوبارہ کہیں اتنی بڑی دیوار نہ بن جائے۔ ویسے ے خیال میں اس دیوار کی شہرت کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ اس میں سمنٹ اور گارے کے ساتھ ساتھ انسانی سموں کی چنوائی بھی ہوتی تھی۔

دیواریں مختلف ڈیزائنوں کی بنائی جاتی ہیں۔ یہ ڈیزائن اکثر باہر کی طرف بنائے جاتے ہیں تاکہ باہر سڑک سے گزرنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا ہو۔ کچھ دیواروں میں ڈیزائن اندر کی طرف ہوتے ہیں۔ باہر ں کے لیے خوش ہونے کا کوئی موقع نہیں رکھا جاتا۔

کچھ دیواریں زمین سے کچھ اوپر تک تو بالکل دیوار جیسی سیدھی سپاٹ ہوتی ہیں مگر جیسے دوپٹے میں جھالر۔ ساڑی میں بارڈر لگا دیتے ہیں ویسے ہی دیوار میں اوپر کی جانب مختلف ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ گول گنبد ٹ کے پاٹ، کنگورے وغیرہ . . . . راجستھان کے شہروں میں جابجا مہارانا پرتاپ اور سنت میرابائی کی تازہ کرنے کے سامان ہیں۔ یعنی پارکوں کی دیواروں پر ڈھال تلوار اور اکتارے سجائے ہوئے ہیں۔ سجاوٹ کی سجاوٹ . . . دیش کے بہادر سردار اور سنت کی عظمت کو نذرانۂ عقیدت بھی۔ ایک پنتھ دو کاج اسی کو کہتے ہیں۔

کچھ دیواریں عجب عجب ڈیزائنوں کی ہوتی ہیں۔ انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یا تو اینٹیں کم پڑ گئی تھیں عمارت کی ایک طرف کی نظر کمزور تھی یا معمار کی بالا پرواہ تھا یا مزدور جھکّی تھے کہ کہیں کام کیا کہیں نہ کیا۔ ہم ایک مرتبہ نئی بن رہی کالونی میں گئے۔ کسی عزیز سے ملنا تھا۔ اُس کے بنگلے پر پہنچے تو دیکھا کہ گیٹ کی دونوں طرف کی اروں میں ایک ایک تکونا حصہ باہر نکلا ہوا ہے۔ ہمیں گمان ہوا کہ یکے بعد دیگرے گیارہ بچوں کی پیدائش کے ر اُن کی آنکھیں کھل گئی ہیں اور وہ خاندانی منصوبہ بندی کے اتنے زبردست حامی ہو گئے ہیں کہ اپنے مکان دیوار کے ذریعے پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ مگر نظر سامنے والے بنگلے پر جو گئی تو دیکھا کہ سامنے والے بنگلے کے طے کی دیواریں دونوں طرف دو دو مثلث ہیں۔ حیران ہو کر عزیز سے ماجرا دریافت کیا تو بولے "جب ے احاطے کی دیوار تعمیر ہو رہی تھی تب اتفاقاً ایک مزار دریافت ہو گیا۔ مزار کی بے حرمتی نہ ہو اس لیے ہم مزار اندر کی طرف لے کر دیوار اس طریقے سے بنوا دی۔ ایک طرف کی دیوار میں آیا ہوا فرق بدنما لگتا اس

لیے دوسری طرف کی دیوار بھی ویسی ہی بنوا دی۔"

"اور وہ سامنے والے بنگلے کی دیوار؟" ہم نے اشارہ کیا۔

ہمارے وہ عزیز قہقہہ لگا کر بولے "وہ صاحب ہمیشہ دوسروں سے بازی مار لے جانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہماری دیوار کو جو اس طرح بنتے دیکھا تو سمجھے یہ کوئی جدید ڈیزائن ہے۔ اپنی دیواروں میں دونوں طرف ڈیزائن بنوا دیئے۔ کچھ اور بڑھا کر۔"

غضب کی مقابلے کی اسپرٹ تھی ہمیں یاد آیا کہ نوشیروانِ عادل نے بھی کسی بڑھیا کی جھونپڑی کو بچانے کے لیے اپنے محل کی دیوار ترچھی کر دی تھی۔ اگر اس زمانے میں اِن لوگوں کی سی مقابلے کی اسپرٹ ہوتی تو آج کوئی بھی محل سیدھی دیواروں والا نہ ہوتا۔ سب ٹیڑھے ترچھے، مڑے تڑے ہوتے۔

احاطے کی دیواریں مختلف کاموں کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ ان پر اُپلیاں تھاپی جاتی ہیں۔ ہم نے اچھی اچھی دیواروں کا ان اُپلیوں کی وجہ سے خانہ خراب ہوتے دیکھا ہے۔ اُپلیاں اس خوبی سے تھاپی جاتی ہیں کہ پتہ ہی چلتا کہ دیوار کہاں ہے؟ (اور اُپلیاں کہاں نہیں ہیں)

احاطے کی دیوار کا دوسرا ہمہ گیر استعمال جھونپڑپٹیوں کی تعمیر میں ہوتا ہے۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے ویسے ہی غریبوں کو ان دیواروں کا سہارا ہوتا ہے۔

احاطے کی دیواروں کا سب سے بامعنی اور بڑے پیمانے پر استعمال ہم نے ایک ڈاکٹر کو کرتے دیکھا وہ ڈاکٹر پتہ نہیں کس میدان کے ہیں مگر کام وہ مشاطہ کا کرتے ہیں یعنی رشتے جوڑتے ہیں۔ گویا یہ کام رشتے توڑنے سے کہیں بہتر ہے مگر اشتہار دیکھ کر یہ قطعی احساس نہیں ہوتا کہ اس ہمہ گیر پبلسٹی کا کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔ ورنہ جموں سے حیدرآباد تک، بڑودہ سے بہار تک اور مدراس سے کلکتہ تک کی دیواروں پر یہ اپیل نہ لکھی ہوتی کہ رشتے ہندوستان کے اور بیرونی ممالک کے ہمارے پاس ہیں۔ ایک بار مِل تو لیں!

◘◘

نریندر لوتھر

فٹ نوٹ

کتابیں دو قسم[1] کی ہوتی ہیں۔

ابھی تک ہم نے جتنی کہانیاں، مضمون، خاکے اور کتابیں لکھی ہیں، وہ فٹ نوٹ[2] سے پاک ہیں۔ کیوں کہ ہم کہتے ہیں کہ فٹ نوٹ[3] سے پڑھنے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے[4]۔ فٹ نوٹ[5] کے بغیر کوئی مضمون عالمانہ نہیں لگتا۔ اس لیے ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ ایک آدھ مضمون ایسا بھی لکھیں جس میں مناسب تعداد میں فٹ نوٹ[6] ہوں۔ تاکہ علمی دنیا میں ہماری علمیت کی دھاک جم جائے اور پڑھنے والوں[7] پر واضح ہو جائے کہ ہم کتنے عالم فاضل قسم کے مصنف[8] ہیں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو ہمارے تمام آئندہ مضامین میں فٹ نوٹ[9] بکثرت پائے جائیں گے۔

ایک بار ہمیں ایک بڑے اہم امتحان کے لیے بین الاقوامی قانون کی ایک کتاب جو دو جلدوں[10] میں تھی پڑھنے کو کہا گیا ہر جلد ایک ہزار صفحوں پر مشتمل تھی۔ یعنی کتاب کے جملہ دو ہزار صفحے بنتے تھے۔ ہم ایسی کتاب کو پڑھنے کے خیال سے ہی کانپ اٹھے۔ جب کانپنا کچھ کم ہوا تو ہم اس کتاب کے درشن کرنے لائبریری میں گئے۔ کتاب کو کھول کے دیکھا۔ مصنف نے ہر صفحہ پر کم سے کم پندرہ فٹ نوٹ[11] دیئے تھے۔ ان میں سے بیشتر فٹ نوٹ[12] میں گزشتہ فٹ نوٹ[13] کا حوالہ دیا گیا تھا۔

---

[1] ایک وہ جن کے فٹ نوٹ ہوتے ہیں۔ دوسری وہ جو فٹ نوٹ کے بغیر ہوتی ہیں۔ یہ دوسرے مضامین پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ عموماً تحقیقی ادب فٹ نوٹ کے بغیر ہوتا ہے۔

[2] یہ انگریزی کا لفظ ہے۔ متن میں اگر کسی لفظ یا اصطلاح کو سمجھانا ہو یا کوئی حوالہ دینا ہو یا ویسے ہی پڑھنے والے کو مرعوب کرنا ہو تو صفحے کے نچلے حصے میں ایک خط کھینچ کر اس کے باہر وضاحت دی جاتی ہے۔ جیسی یہ۔ اگر ایک صفحہ پر ایک ہی فٹ نوٹ ہو تو اس کے لیے ستارہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً * یا کراس مثلاً × یا ●۔ لیکن اگر ایک سے زیادہ فٹ نوٹ ہوں تو اس کے لیے ہندسے استعمال کرنا پڑتا ہے جیسا کہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

[3] ایضاً

[4] جیسا کہ اب آپ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

[5] دیکھو نمبر ۲

[6] ایضاً۔ یا نمبر ۲

[7] اس مضمون کے پڑھنے والے بھی شامل ہیں لیکن فٹ نوٹ والے مضامین اکثر ہی جیسی چیزیں پڑھنا پڑتا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ پر)

کئی صفحوں پر تو صرف ایک ہی سطر کا متن تھا۔ باقی جگہ فٹ نوٹس[13] سے اٹی پڑی تھی۔ کئی صفحوں پر ایک ہی فٹ نوٹ[14] جاری رہتا ہے جسے پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم نے جب اس صورتِ حال کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ کتاب کا ٹھوس متن تقریباً دو سو صفحوں سے زیادہ نہیں تھا۔ نتیجتہً ہم نے وہ کتاب دو دن کے اندر ختم کر لی۔ اس کارنامہ سے ہمارے مطالعہ کی رفتار اور وسعت کا دبدبہ ساری یونیورسٹی[15] میں پھیل گیا۔

یہاں اس کتاب کے بارے میں تفصیلات[16] بتانے کی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ کہ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھا[17]

---

[8] مصنف وہ شخص جو کچھ لکھتا ہے۔ جو چیز لکھی جائے اسے تصنیف کہتے ہیں۔ اسی حلیے اور ملتے جلتے تلفظ والا دوسرا لفظ ہے "تنصیف"۔ اس کا مطلب ہے دو برابر حصّوں میں بانٹنا۔ تنصیف کرنے والے کو قینچی کہا جاتا ہے۔ جیسے "ادھار محبت کی قینچی ہے"۔ ایک بار ایک بندر نے دو جھگڑالو بلیوں کے لیے ایک روٹی کی تنصیف کی کوشش کی تھی لیکن چوں کہ اس کی نیت صاف نہیں تھی اس لیے ناکام رہا اور بندر ہی رہا۔ قینچی نہ کہلا سکا۔ پس ثابت ہوا کہ تنصیف کے لیے صاف نیت ضروری ہے۔ مصنف کے لیے کوئی ایسی شرط نہیں۔

[9] ملاحظہ ہو نمبر۱ یا نمبر۳ یا نمبر۲

[10] جلد اول اور جلد دوم

[11] دیکھئے نمبر۵

[12] ایضاً

[13] مکرر ایضاً۔ مرحبا

[14] جمع فٹ نوٹ کی۔ واحد کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو نمبر۲۔

[15] واحد اس اصطلاح کی جو نمبر۱۳ میں مذکور ہے۔

[16] ایک ایسے ادارے کا نام جس میں نوجوانوں کو اسکول کی تعلیم کے بعد پچھلے زمانے میں چھ سال اور آج کل چار سال تک رکھا جاتا ہے اس دوران اُن کے والدین لڑکوں کے لیے روزگار اور لڑکیوں کے لیے "ور" ڈھونڈتے ہیں۔ اور طالب علم ایک دوسرے کو۔

[17] پھر بھی جو اصحاب اس کتاب کے بارے میں اور جاننا چاہتے ہوں اُن کے لیے عرض ہے کہ یہ کتاب ہم نے ایم۔ اے کے امتحان کے بعد پڑھی تھی۔ اس کا نام جہاں تک ہمیں یاد ہے۔ اور ہمیں کافی یاد ہے۔ تھا۔ بین الاقوامی قانون (انگریزی میں) کیونکہ کتاب انگریزی میں تھی اس لیے ظاہر ہے کہ کتاب کا نام اور مصنف کا نام بھی انگریزی میں ہی ہوگا۔ یہ تو بنیادی بات ہے اور سب کو معلوم ہونی چاہیئے۔ کتاب کا پورا نام تھا INTERNATIONAL LAW اور مصنف کا ادھورا نام تھا OPPENHEIMER اس نام کے بچے ہمیں یاد نہیں لیکن کتاب کا نام اور مصنف کا اتنا نام ہی کافی ہے۔ عام لائبریری میں آپ کو یہ کتاب نہیں ملے گی کیونکہ یہ عام کتاب نہیں لیکن بیشتر یونیورسٹی لائبریریوں میں اس کا ہونا ضروری ہے خاص کر اگر اس یونیورسٹی میں قانون پڑھایا جاتا ہو۔ ہمیں شروع میں مصنف کے نام کے بارے میں کچھ کنفیوژن تھا۔ اس مصنف کا ہم نام ایک امریکی سائنس دان بھی تھا۔ اس نے امریکہ میں ایٹم بم بنانے میں کافی حصّہ لیا تھا۔ اس کے بعد اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ اُس نے بم بنانے کے طریقہ کا راز دشمن کو دیا۔ اس کی وجہ سے اس کو پھانسی ہوئی۔ ویسے امریکہ میں 'پھانسی' نہیں ہوتی بلکہ 'بجلی کرسی' ہوتی ہے۔ مجرم کو ایک آہنی کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے اور اس میں بجلی کا شاک لگایا جاتا ہے۔ اس سے مجرم مرجاتا ہے۔ کئی مفکروں کا خیال ہے کہ یہ مارنے کا طریقہ پھانسی سے زیادہ مہذب ہے۔ ایک بار موت کی سزا دیئے جانے والے مجرموں سے یہ پوچھا گیا کہ دونوں طریقوں میں سے کون سا زیادہ مہذب ہے۔ امریکہ کے ایک مجرم نے جواب دیا "بکواس بند کرو"۔ ہندوستان میں مجرم نے جواب دیا۔ "دونوں غیر مہذب ہیں۔ ازراہ مہربانی مجھے رہا کر دو"۔ یہ جواب سُن کر اس مجرم کی سزا پھانسی سے بدل کر عمر قید کر دی گئی۔ ابھی حال ہی میں اس قیدی نے پھانسی کے

(سلسلہ صفحہ پر)

فٹ نوٹ صرف علمی مقالوں اور مضامین میں ہی لکھے جاتے ہیں۔ خالص لٹریچر میں ان کا استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ روایت اتنی مضبوط ہے کہ جارج برنارڈ شا نے بھی جسے فٹ نوٹ لکھنے کی اشد ضرورت تھی کبھی انھیں استعمال کرنے کی ہمت نہیں کی۔ لیکن اُس نے اپنی ضرورت کے لیے ایک دوسرا راستہ نکالا اس نے دیباچے لکھنا شروع کیے جو اس کے ڈراموں سے بھی طویل ہوتے۔ اس طرح ایک مدرسہ فکر شا کے دیباچوں کو فٹ نوٹ لکھنے کا بدل مانتا ہے۔

پھندے سے خودکشی کرلی۔ اس لیے اُس کو اس رائے دہی یا سزا کی تبدیلی سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ یہ بات تو اُسے اُس وقت سوچنی چاہیے تھی جب اُس نے اُس جرم کا ارتکاب کیا جس کے لیے اُسے یہ سزا ملی لیکن بیشتر مجرم جرم کرتے وقت سوچتے نہیں، اس وقت ان کی مت ماری گئی ہوتی ہے۔ جیسے بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا "جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا، اسے آدمی نہ جانیے گا۔ خدا کے خوف سے قانون کا خوف زیادہ ضروری ہے۔ لیکن عام آدمی کو مختلف جرموں کی سزا کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں کچھ بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور ہمارے نصاب میں سبق آموز سبق بھی شامل ہوں۔ اگر سبق پڑھتے وقت طلباء کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں تو وہ ایسے کام نہیں کریں گے جن کی سزا کے بارے میں پڑھ کر دوسرے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ قدرت نے رونگٹے بنائے ہی اس لیے ہیں کہ وہ مناسب موقعوں پر کھڑے ہوجائیں اور اس طرح انسان کو وارننگ دے دیں۔ کئی بار یہ رونگٹے صرف زیادہ سردی کی وجہ سے بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس وقت صرف آپ کو سردی سے آگاہ کرنا ہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال گرم کپڑے پہن کر ٹھیک کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب رونگٹے خوف یا دہشت سے کھڑے ہوتے ہیں تو کپڑوں کے اندر بھی کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سردی سے کھڑے ہوئے رونگٹوں اور دہشت کی وجہ سے کھڑے رونگٹوں میں فرق سمجھ لینا مناسب ہے نہیں تو خواہ مخواہ کنفیوژن پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور ممکن ہے کہ کئی لوگ سردی سے بھی ڈرنا شروع کردیں۔

ہاں۔ اس کتاب یعنی 'اوپن ہائیمر کا بین الاقوامی قانون' کی ضخامت جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا اُس وقت یعنی تقریباً چالیس برس پہلے دو ہزار صفحے تھی۔ ان پچھلے چالیس برسوں میں اس قانون میں کافی ترمیمات اور اضافے ہوئے ہیں اور یقیناً اس سے کتاب کی ضخامت میں بھی اضافہ ہوا ہوگا۔ حالانکہ اس کا مصنف مر چکا ہے۔ (بجلی کی کرسی سے نہیں بلکہ کتاب کی ضخامت سے۔ بجلی کی کرسی سے مرنے والا شخص دوسرا تھا حالانکہ دونوں کا نام ایک ہی تھا۔ طالب علم کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے۔ اس فرق کا ذکر ہم بار بار نہیں کریں گے۔ بلکہ بجلی کی کرسی سے مرنے والے اوپن ہائیمر کا نام ہم کبھی دوبارہ نہیں لیں گے۔ اس لیے اب کے بعد جب کبھی اس کا نام آیا تو ہماری مراد مصنف سے ہی ہوگی نہ کہ اس دغاباز سے) لیکن ایسی کتابوں کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ ان کا مصنف چاہے مرجائے یہ کتابیں زندہ رہتی ہیں اور مصنف کا کوئی بیٹا یا عموماً بیٹی (جو الیکٹرا کامپلیکس" کا شکار ہوتی ہے اور جو اپنے والد کی شخصیت سے اتنی دبی رہتی ہے کہ شادی بھی نہیں کراتی) یا اس کا کوئی ہونہار اور گرویدہ شاگرد وقتے فوقتے کتاب کو دہرا کر شائع کرتے رہتے ہیں۔ کئی بار وہ شاگرد مصنف کی بیٹی سے شادی بھی کرلیتا ہے تاکہ وہ یہ نیک کام بغیر خلل کے جاری رکھ سکے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس کتاب کو کیسے دہرایا اور اپ ٹو ڈیٹ کیا گیا۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب ابھی بھی ملتی ہے اور ذہین طلباء ابھی بھی اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس وقت اس کتاب کی ایک ایک جلد کا وزن ایک کیلو تھا۔ یہ بات بھی قابلِ تعریف ہے کہ مصنف نے دونوں جلدوں کا وزن برابر رکھا تھا کیونکہ دونوں جلدیں ایک ہی ہاتھ میں اٹھانا ناممکن تھا۔ ہم نے ایک بار ایسا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہے۔ اس کتاب کو دو ہم وزن جلدوں میں شائع کرتے وقت مصنف نے طالب علموں کی صحت کا خیال بھی رکھا تھا۔ [illegible] دونوں جلدیں بطور ڈمبل ورزش کرنے کے کام بھی لائی جاسکتی تھیں۔ ہم نے پندرہ دن تک [illegible] استعمال کیا۔ ہوسکتا ہے کہ اب ان کا وزن ڈیڑھ ڈیڑھ کیلو ہوگیا ہو یا ممکن ہے (مسلسل)

فٹ نوٹ[۱۵] مضمون کا پائیگاہ ہوتا ہے اور ہر بادشاہ کے لیے پائیگاہ ضروری ہوتا ہے۔ فٹ نوٹ کے کئی فائدے ہوتے ہیں۔ وہ مضمون کو مختصر رکھنے میں بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ مضمون ہی لیجیے۔ کُل ملا کے چند سطور ہوں گی۔ تقریباً ایک صفحہ۔ لیکن کیا مجال کہ اس میں کسی عملی یا تاریخی نکتہ یا نقطۂ نظر وضاحت طلب رہ گیا ہو۔ وضاحت کے لیے تشریح کے لیے، تفصیل کے لیے، مصنف کی علمیت کی نمائش کے لیے فٹ نوٹ بڑی کارآمد ایجاد ہے۔ وہ مضمون کو دو حصّوں میں بانٹ دیتا ہے لکیر کے اوپر کا مضمون اور نچلا مضمون۔ ایک خلاصہ دوسرا تفصیل، ایک شعر، دوسرا تشریح۔ آپ چاہیں تو صرف 'اوپری' مضمون ہی پڑھ لیں اور چاہیں تو نچلا حصّہ۔ گویا جہاں تک نظر اٹھائیں مضمون ہی مضمون۔ اوپری مضمون آپ کو چھوٹے راستے سے، سیدھی سڑک سے، ریل کی پٹڑی پر سے منزل پر لے جاتا ہے نچلا مضمون آپ کو سڑک سے ہٹ کر کھیتوں، پہاڑیوں، وادیوں، آبشاروں کی سیر کراتا ہے۔

کہ کتاب کی تیسری جلد بھی چھاپ دی گئی ہو۔ اُس وقت اس کتاب کی قیمت غالباً پانچ سو روپے تھی۔ اب ظاہر ہے دو چار ہزار روپے تو ہو گئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ کلاسیک چیزوں کی قیمت عمر کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

[۱۳] یعنی ہمت بڑھی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "حوصلہ افزائی" ہوئی۔ لیکن آج کل رجحان آسان زبان کی طرف ہے خاص طور پر اردو میں۔ اگر وہی فارسی والی زبان لکھی جائے جو پہلے لکھی جاتی تھی تو بہت سے پڑھنے والے اسے سمجھ نہیں پائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ جو چند لوگ اب اُردو پڑھتے ہیں وہ بھی پڑھنا چھوڑ دیں۔ اگر پڑھنے والے ہی نہ رہے تو لکھنے والے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ عجب کہ وہ کوئی اور کام مثلاً رکشا چلانا یا بھیک مانگنا شروع کر دیں گے۔ اس لیے واضح ہو کہ ایسی زبان جان بوجھ کر لکھی گئی۔ اُمید ہے اس سے دوسرے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

[۱۴] ملاحظہ ہو نمبر ۳ صفحہ ایک

[۱۵] خالص لٹریچر کیا ہے۔ یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔ بہتر ہوتا کہ ہم صرف لٹریچر ہی کہتے۔ خالصیت کا نکتہ نہ اُٹھاتے۔ لیکن ہر موضوع کا اپنا لٹریچر ہوتا ہے۔ جیسے قانون کا، اقتصادیات، سماجیات، سیاسیات کا۔ ہر وہ مضمون یا موضوع جو 'یات' پر ختم ہوتا ہے اس پر لٹریچر ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم صرف 'لٹریچر' کا لفظ استعمال کریں تو اس کا مطلب فکشن یا افسانوی ادب جس میں ناول افسانے اور ڈرامے شامل ہیں، ہوگا۔ اس صنف میں فٹ نوٹ لکھنے کا رواج نہیں کیوں کہ پرانے زمانے میں فٹ نوٹ کا آئیڈیا کسی کو سوجھا نہیں۔ مثلاً آپ کالی داس کا کوئی بھی ڈرامہ پڑھ لیجیے کہیں بھی کوئی فٹ نوٹ نہیں ملے گا۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ آپ کالی داس کو پڑھ نہیں پائیں گے کیوں کہ وہ سنسکرت میں لکھتا تھا اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کو سنسکرت نہیں آتی۔ ہم بھی سنسکرت نہیں جانتے۔ اسی لیے بلا جھجک ہم نے آپ کو کالی داس کے پاس بھیج دیا۔ خیر کوئی بات نہیں آپ سوفوکلیس یعنی SOPHOCLES کے ڈرامے پڑھ لیجیے۔ وہاں بھی فٹ نوٹ ندارد۔ یہ ڈرامے یونانی زبان میں ہیں۔ غالباً یہ بھی آپ کو نہیں آتی۔ اچھا تو الف لیلیٰ پڑھیے۔ عربی نہیں آتی؟ اس کا ترجمہ تو اردو میں ہو چکا ہے۔ اور ہم نے بھی یہ اردو میں ہی پڑھی تھی۔ چلیے سعدی اور حافظ کے کلام کو ہی چھان لیجیے۔ آپ فارسی سے بھی ناواقف ہیں؟ خیر کوئی مضائقہ نہیں فٹ نوٹ کی تلاش تو ان پڑھ لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی گورکھا چوکیدار کو کہہ دیں کہ یہ کتاب پکڑو۔ اور دیکھو اس میں کوئی فٹ نوٹ تو نہیں گھس گیا۔ گورکھا لوگ ماہر چوکیدار ہوتے ہیں۔ وہ ضرور فٹ نوٹ ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہم ہمیشہ انھیں کو اس کام پر لگاتے ہیں۔ خیر اگر یہ ریسرچ آپ خود کرنا چاہتے ہیں تو شیکسپیر کو دیکھ لیجیے۔ آپ کو انگریزی تو آتی ہوگی۔ صرف شیکسپیر کے ڈراموں کے خلاصوں اور تشریحوں میں آپ کو نہ صرف فٹ نوٹ بلکہ نوٹ بھی مل جائیں گے۔ دور کیوں جائیں۔ اردو میں ہی منشی پریم چند، کرشن چندر، منٹو، بیدی، کسی کو پڑھ لیجیے۔ اگر آپ اتنا دور بھی نہیں جانا چاہتے تو ہمارے مضامین ہی پڑھ لیجیے۔ قصہ کوتاہ لٹریچر میں فٹ نوٹ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اگر میر اور غالب نے اپنی غزلوں کے

(مسلسل ۹۹)

اگر آپ مسافر ہیں اور جلدی میں ہیں تو چھوٹے راستے سے جائیے۔ اگر آپ ٹورسٹ ہیں اور جلدی میں نہیں تو آرام سے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے نچلے مضمون کے راستے منزلِ مقصود پر پہنچیے۔ "اوپرلا" مضمون خضرِ راہ ہے۔ نچلا مضمون ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ فٹ نوٹ کے ذریعہ مصنف آپ کے ساتھ گپ شپ کرسکتا ہے آپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل سکتا ہے۔ آپ سے چھیڑ چھاڑ کرسکتا ہے جو ایک مجرّد مضمون میں ممکن نہیں۔ فٹ نوٹ گویا مضمون کے شادی شدہ ہونے کی علامت ہے۔

اور آخری بات یہ فٹ نوٹ آپ کو چائس CHOICE دیتا ہے۔ ایک اہم حقیقت یہ چائس آپ کی آزادی کے لیے، آپ کی ذہنی نشوونما کیلئے، بلکہ آپ کی بقا کیلئے ضروری ہے۔ فٹ نوٹ زندہ باد۔

نیچے فٹ نوٹ دیئے ہوتے تو اُن کے کئی دیوان ہوتے اور بیشمار پروفیسروں اور محققوں کو اُن کے کلام کی شرح لکھ کر نام اور پیسہ کمانے کا موقع نہ ملتا۔ غالب کے موجد مالک رام سے پوچھ لیجیے۔

[۲۱] بیسویں صدی کے پہلے نصف کا مشہور انگریزی دیباچہ نگار مقدمے باز اور سوشلسٹ مبلغ۔ اس کو نادر شاہ یا رضا شاہ جیسے بادشاہوں کے ناموں سے کنفیوز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے طرفین کو اپنی اپنی قبر میں تکلیف ہوگی کیونکہ وہ شہنشاہیت اور سامراجیت کے خلاف تھا اس لیے اُس نے اپنے نام کے آخری حصّے سے "بانڈ" حذف کردیا تھا اور اپنا نام شاہ کی بجائے صرف شا لکھتا تھا۔ اُس نے ہر دیباچہ کے ساتھ عموماً ایک ڈرامہ بھی لکھا کیونکہ اس کی داڑھی شیکسپیر سے بھی لمبی تھی اس لیے اسے وہم ہوگیا تھا کہ وہ شیکسپیر سے بھی بڑا ہے۔ لیکن شیکسپیر نے اپنی داڑھی کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

[۲۲] ملاحظہ ہو نمبر ۱۶ وغیرہ [۲۳] دیباچہ جسے مقدمہ بھی کہتے ہیں۔ کئی لوگ اس کو پیش لفظ کہتے ہیں۔ کئی مصنف کسی اور عنوان کے تحت دیباچہ لکھتے ہیں۔ کئی مقدمہ دوسروں سے لکھواتے ہیں لیکن جارج برنارڈ شا ہمیشہ اپنا مقدمہ خود لڑا کرتا تھا اور جب اُن کے حریف میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے (یا کھڑے ہوکر بھاگ جاتے!) تب بھی وہ لڑتا اور لکھتا رہتا اسی لیے اسکے دیباچے بڑے طویل ہوتے۔ ان کو پڑھ کر اس کے ڈراموں کو پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ [۲۴] ملاحظہ ہو نمبر ۲۲ وغیرہ وغیرہ!

[۲۵] ملاحظہ ہو پچھلے صفحہ پر نمبر ۱۴

[۲۶] ایضاً [۲۷] مکرر ایضاً [۲۸] ایضاً۔ ایضاً

[۲۹] اس کے بعد اس اصطلاح کی مزید وضاحت نہیں کی جائیگی۔ اب تک تو یہ کند سے کند دماغ شخص کے بھی سمجھ میں آجانا چاہیئے

[۳۰] چائس یا چوائس CHOICE یعنی چننے کا اختیار۔ دوسرے لفظوں میں فرمائش کی تکمیل۔ صدیوں سے کئی فلاسفروں نے "چائس کی ششش و پنج" کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے۔ مثلاً قرونِ وسطیٰ کا ایک فلسفی برنولی BERNOULI تھا جس کا کہنا تھا کہ اگر ایک بھوکے گدھے کے سامنے برابر فاصلے پر دو گھاس کے گٹھے رکھ دیئے جائیں تو گدھا بھوک سے مرجائے گا کیونکہ وہ یہ فیصلہ نہیں کرپائے گا کہ کس گٹھے کو کھایا جائے۔ وہ اس لیے کہ دو گھاس کے ایک گٹھے کو جو ہر لحاظ سے دوسرے کے برابر ہے اور برابر فاصلہ پر ہے ترجیح نہیں دے پائے گا۔ یعنی چائس نہیں کرپائے گا۔ اس کا جواب ایک شخص نے یہ دیا کہ گدھا بھوکا نہیں مرے گا کیونکہ وہ فلاسفر نہیں۔ وہ چپکے سے ایک گٹھا کھا جائے گا اور اس سے بھی اس کی بھوک ختم نہ ہو تو دوسرا بھی کھا جائے گا۔ بیسویں صدی میں کرکے گارڈ (KIRKEGAARD)، آندرے ژید ANDRE GIDE علاوہ ازیں SARTRE وغیرہ نے بھی چائس کی ششش و پنج کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ (اُن کے نظریوں کی وضاحت کے لیے مزید فٹ نوٹس کی ضرورت ہوگی اور فی الحال ہمارے پاس اس شئے کا اسٹاک ختم ہوگیا ہے) لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ چائس چننے کا اختیار ہے۔ رضا ظاہر کرنے کا موقع ہے اور اسی حق سے انسان کی شخصی آزادی عبارت ہے۔

مختار یوسفی

"آج کل"

وہ ہوگئی زیادہ ہی چالاک آج کل !
رکھتی ہے بند دل کا سدا لاک آج کل

لڑکوں سے تیز ذہن ہیں کالج کی لڑکیاں
یہ بات ہو رہی ہے خطرناک آج کل

چرچے تھے جس کی شرم و حیا کے گلی گلی
وہ شاعرہ ہے بزم میں بے باک آج کل

سر درد ہے بخار ہے یا دوسرا مرض
بہنے لگی ہے ناک سے کیوں ناک آج کل

ارجنٹ تار بھیجا ہے میں نے اسی لیے
کچھوے کی چال چلنے لگی ڈاک آج کل

ہے لاٹری کا فیض زباں اس کی کھل گئی
اونچے سروں میں کرتی ہے جو ٹاک آج کل

برحق ہے کہیئے اس کو اگر رستم زماں
جو روپیہ جو جمائے رکھے دھاک آج کل

دو بیویوں کے درمیاں مختار یوں پھنسے
باتوں کا ان کی ختم ہے اسٹاک آج کل

غزل

ان پڑھ بھونگیری

اپنی محفل میں تو مرشد کو کبھی آنے دیں گے
وجد آئے تو زمانے میں نہ جانے دیں گے

بے دھڑک ان کو اگر لاری چلانے دیں گے
ماں کو ABID یہ یونہی رونے رلانے دیں گے

ساٹھ بڈھوں کے اگر چانس ملے ڈنر پر
وہ چکن لے لیں گے اور ہم کو ٹھانے دیں گے

آپ تبلائیں ہر اک روپ کنود کو کب تک
گھوڑے جوڑے کی چتاؤں میں جلانے دیں گے

انٹری ٹیکس کو فی الفور اٹھا لو ورنہ
گیہوں کپڑے یہ اندر کبھی نہ آنے دیں گے

مشورہ یہ ہے کہ داماد کو حد میں رکھنا
ورنہ یہ آپ کو کبھی گھر میں نہ آنے دیں گے

حیدرآباد کی سڑکوں سے گزرنے والو
تم کو اللہ میاں دوزخ میں نہ جانے دیں گے

اپنے حملوں سے نہ باز آئیں اگر دسترخوان
نوجواں لڑکے کبھی بڈھوں کو نہ کھانے دیں گے

تو اشاروں سے اگر کام نہ لے لے ان پڑھ
عقل کے اندھے نہ پھر آنکھ لڑانے دیں گے

شکیل اعجاز (اکولہ)

پہلے ڈاکٹر پھر بیماری

ڈاکٹر ——— ایسا لفظ جس کے سنتے ہی ایک ایسا شخص نظروں میں گھومنے لگتا ہے جو خوش شکل اور خوش پوش ہے۔ بااخلاق اور بامروت ہے۔ فرشتوں کی طرح مہربان، صاف ستھرا اور پاکیزہ جو ہمیں تکلیفوں کے تپتے جھلستے صحرا سے نکال کر گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے۔ جہاں ہم بہتے ہوئے شفاف پانیوں میں پاؤں لٹکا کر زندگی سے عشق کرنے لگتے ہیں۔ کون ہے جو ڈاکٹر کے احسان تلے دبا ہوا نہ ہو وہ ہماری سب سے پہلی اور سب سے آخری ضرورت ہے وہ خود تو صاف ستھرا اور نفاست پسند ہوتا ہی ہے اپنے آس پاس کا ماحول بھی شیشوں جیسا رکھتا ہے۔ کسی بچے نے جب ایک دھلا دھلایا صاف ستھرا مکان دیکھا تو اپنی امی سے بولا کتنا صاف ستھرا مکان ہے بالکل دواخانہ لگتا ہے۔ لیکن ہاں کچھ دواخانے گندے غلیظ بھی ہوتے ہیں اور کچھ ڈاکٹر ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں ڈاکٹر کہتے ہوئے کوفت ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو ڈاکٹر تو نہیں کہلاتے لیکن علاج ضرور کرتے ہیں یہ جاسوسی ناول کے کرداروں کی طرح پُراسرار ہوتے ہیں اور انہیں لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جنھیں پہلے سے یقین ہو کہ ضرور فائدہ ہوگا۔ یعنی جیب میں پیسے اور دل میں یقین ہونا ضروری ہے" ورنہ مریضوں کو بیماری کے حوالے کر دیا جائے گا۔

طریقۂ علاج بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ مثلاً دمہ کا علاج پورے برس میں صرف ۸ رجون کو ہوگا وہ بھی راتوں رات۔ یہ لوگ مریضوں سے بہت دور کسی مقام پر واقع ہوتے ہیں یعنی مریض اکولہ میں ہے تو یہ حیدرآباد میں ہوں گے۔ اگر قریب ہوں گے بھی تو ایسی جگہ جہاں سڑک ختم ہونے کے بعد میلوں دور کا کچا راستہ ہوگا۔ جس میں گرم ریت یا کیچڑ سے ہو کر گزرنا پڑے گا۔ اس آزمائش سے مریض کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب فائدہ یقینی ہے۔ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے اور دیہاتوں میں اب بھی یہ رواج ہے کہ گھر میں بڑے بوڑھوں کو بھی ساتھ رکھا جاتا ہے جو ڈاکٹر سے کم نہیں ہوتے۔ ان کے علاج کے طریقے طلسماتی طرز کے ہوتے ہیں ان سے آپ بھی مستفیض ہوتے ہوں گے اس لیے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ بس یاد کیجیے وہ بھلاویں سے بچوں کی نظر اتارنا۔ گرمیوں میں گیلے کپڑے اور جھاڑو سے دھوپ اتارنا وغیرہ۔ یہ گھریلو ڈاکٹر سردرد، کھانسی، زکام اور دوسری بیماریوں کا بھی آسانی سے علاج کر لیتے ہیں۔ باہر کی دوائیوں میں اب تک معروف نسخہ طلسمات اور امرت انجن بین نام سے

سمجھوتہ کرپاتے ہیں گھر میں کوئی بچہ پڑھ لکھ کر اچھا ڈاکٹر بن جائے اور پھر کسی دن اس کے سر میں درد ہو تو دادی امّاں بازار کی دوائی کھانے نہ دیں گی۔ اپنے ہاتھ سے ادرک وغیرہ کا سفوف بنائیں گی جو ہر حال میں ڈاکٹر صاحب کو کھانا پڑے گا ورنہ دادی امّاں کی لکڑی ہمیشہ ان کے قریب رہتی ہے۔

کہتے ہیں سونا آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے۔ اسی طرح مریض مسلسل بیمار رہے تو ڈاکٹر بن جاتا ہے ہمارے ایک شناسا بچہ دسی ڈاکٹر کے فیملی مریض تھے۔ دواخانے میں بیٹھے رہتے۔ ڈاکٹر کے نسخوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے۔ وہاں سے کچھ کتابیں بھی پڑھ لیتے۔ اب وہ اتنے تجربہ کار ہو گئے ہیں کہ اپنے مشوروں سے اچھے اچھوں کو بیمار کر لیتے ہیں۔ یہ بھی غنیمت ہے ورنہ بعض کسی ایسے ڈاکٹر کی تلاش میں قریہ قریہ دردر بھٹکتے رہتے ہیں جو ان کو کسی بڑی بیماری میں مبتلا بتادے۔ اس قسم کے مریض عموماً یوں گفتگو کرتے نظر آئیں گے ـــــــــــ

"ابھی وہ کوئی ڈاکٹر ہیں برسوں میں بہت پرامید ہو کر گیا اور انھوں نے کہہ دیا کہ کوئی بیماری نہیں ہے بس ہڈی میں بخار ہے۔ ان کی دوائیوں سے خیر وہ بخار بھی نکل گیا لیکن اصل بیماری تو جڑ میں موجود ہے۔ لیکن اب کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا وہ پیسے بھلے خرچ ہو جائیں۔ علاج تو اطمینان بخش ہوگا۔"

یہ لوگ پہلے اپنے شہر کے تمام ڈاکٹروں سے پھر دوسرے شہروں کے ہر ڈاکٹر سے بیمار ہوتے پھرتے ہیں اور جب معجونِ مرکب بن جاتے ہیں تو دم کھینچ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

پولیس مجرموں کو پکڑنے کے جتنے نئے طریقے نکالتی ہے جرم کرنے کے طریقے اس سے کہیں زیادہ نکل آتے ہیں بیماریوں کے جس قدر علاج نکل رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہر ہاسپٹل پہلے سے زیادہ صحت مند اور ناقابلِ تسخیر۔ تبھی تو متعدد لوگ کہتے ہیں کہ بیماریاں ڈاکٹروں کی وجہ سے بڑھ رہی ہیں (حکومت شاید اس سے اتفاق کرتی ہے وہ اس بات پر زور دے رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر دیہاتوں میں جا کر دواخانے کھولیں۔ کیونکہ وہاں مریضوں کی تعداد تشویشناک حد تک کم ہے۔ ڈاکٹروں کے قدموں کی برکت سے وہاں مریض بڑھیں گے تو دوائیوں کی کھپت بھی بڑھے گی۔ "پہلے ڈاکٹر پھر بیماری" کے اسی فلسفہ کا اثر ہے کہ دنیا کے بڑے ملکوں میں اور ہر ملک کے بڑے شہروں میں چونکہ نفسیاتی معالج بھی ہوتے ہیں اس لیے وہاں نفسیاتی مریض بھی پائے جاتے ہیں۔ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں جہاں نفسیاتی ڈاکٹر نہیں ہوتے یہ ڈاکٹر جادوگر کی طرح ہوتے ہیں دوائیوں سے علاج نہیں کرتے مریضوں سے الٹے پلٹے کرتب کرواتے ہیں مثلاً کسی کو رات میں ڈراؤنے خواب آئیں تو اسے نصیحت کی جاتی ہے کہ رات میں کالا برقعہ اوڑھ کر راہ چلتوں کو ڈرایا کرے جنسی امراض میں مبتلا کسی نوجوان کو مشورہ دیا جاتا ہے ساڑی بلاؤز پہنا کرے اور چھت سے الٹا لٹک کر چمگادڑ کو غور سے دیکھا کرے۔

ڈاکٹروں کے مختلف شوق ہوتے ہیں کسی کو چشمہ لگانے کا کسی کو بار بار ہل اسٹیشن جانے کا کسی کو شطرنج
کی عبادت کرنے کا۔ بہت ڈھونڈنے پر چند ایک ایسے بھی نکل آئیں گے جنھیں مریضوں کے علاج کرنے کا شوق ہوتا
ہے۔ ڈاکٹروں اور مریضوں کی ملی بھگت سے ایک تیسری جماعت وجود میں آتی ہے جو عیادت کرنے والوں کی ہوتی ہے
کچھ لوگوں کو عیادت کرنے کا اتنا شوق ہوتا ہے کہ اپنے خیر خواہوں تک کے بیمار پڑنے کی آرزو کرتے ہیں۔ کسی کے
اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کی خبر سنی اور خوشی سے دل اچھلنے لگا۔ کسی کے دل میں اترنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ
اس کے دکھ میں شریک ہوجائیں چنانچہ ملازمین اپنے باس کے، اور عاشق اپنی معشوق یا اس کے والدین کے بیمار
پڑنے کو مہینوں ترستے رہتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست بھی عیادت کرنے میں کسی سے کم نہیں۔ لیکن ان کا انداز
عیادت نرالا ہے۔ عیادت کرنے کے لیے خصوصاً فرصت نکالنے کی بجائے، فرصت کے اوقات میں سے عیادت
کا وقت نکالتے ہیں۔ اگر اس دوران مریض صحت یاب ہوجائے تو ہزار کام چھوڑ کر پہلے اس سے جھگڑنے جائیں گے
"تم سے کہا تو تھا کہ اتوار کو آرہا ہوں"۔ ان کا بس چلے تو یوں رقعے بھجوائیں کہ فلاں دن تک بیمار ہی رہو میں ملاقات
کے لیے آرہا ہوں۔

بعض لوگ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے مبالغہ آمیز باتیں پھیلا دیتے ہیں اکثر سنا جاتا ہے کہ اب ڈاکٹر مریضوں
سے زیادہ ہوگئے ہیں ہر گلی کوچے اور نکڑ پر ایک ڈاکٹر نظر آتا ہے حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے جتنے لوگ دواخانے
کھول کر بیٹھے ہیں ان میں سے کئی تو صرف نام کے ڈاکٹر ہیں انھیں ڈاکٹروں میں شمار کرنا غلطی ہے۔ یہ لوگ میڈیکل کالجوں
میں بھاری ڈونیشن دے کر اور بعد میں مزید رشوتیں کھلا کر ڈگریاں لے لیتے ہیں اور زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔
(سچ ہے جب دنیا کی آبادی بڑھ جاتی ہے تو خدا توازن کے اسباب بھی پیدا کر دیتا ہے)۔

ایک مشاعرے کے اناؤنسر نے صحیح فرمایا تھا کہ بکریاں اور بیل روزانہ لاکھوں کی تعداد میں ذبح ہوتے
ہیں لیکن ان کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آتی جبکہ کتے بلیاں قصائیوں سے بالکل محفوظ ہیں پھر بھی بیل اور بکریوں سے بہت
کم ہیں۔

[illegible] ڈرائیونگ لائسنس بھی ان لوگوں کو دیتے جارہے ہیں جنھیں اگر گاڑی اسٹارٹ کرنا آتا ہے
تو بند کرنا نہیں آتا غرض ڈاکٹر اور ڈرائیور کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے ہیں۔ چونکہ آبادی کم کرنے کا کام ہی
ہو کسی مقصد پر بہت سارے ڈپارٹمنٹ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ سنا ہے اب اس میں پولیس
ڈپارٹمنٹ بھی شامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ سوچ سمجھ کر آبادی کم کرتا ہے ناتجربہ کاری یا بداحتیاطی کے باعث نہیں۔
ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ڈرائیونگ لائسنس میں اتنا [illegible] فرق ہے کہ لائسنس بغیر کسی پریشانی کے مل جاتا
ہے اور سرٹیفکیٹ کے لیے تین چار سال کی جان لیوا ریگنگ برداشت کرنی پڑتی ہے۔

ان دنوں اسپیشلسٹ کا رواج عام ہو چلا ہے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ۔ آئی اسپیشلسٹ وغیرہ وغیرہ۔ ایک سڑک پر سارے اسپیشلسٹ پہلے ہی دواخانے لگا چکے تھے نئے ڈاکٹر کی خبر سنی تو بہت خوش ہوئے کہ اب اس کے لیے کیا رہ گیا ہے لیکن وہ ڈاکٹر چالاک تھا اس نے بڑا سا بورڈ آویزاں کر دیا "ہر مرض کا اسپیشلسٹ"۔ ڈاکٹر کا خوب صورت اور صحت مند ہونا ضروری ہے جن دواخانوں کے کمپونڈر ڈاکٹر سے زیادہ خوبرو ہوتے ہیں وہاں ڈاکٹر کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے اور لوگ انھیں کمپاؤنڈر یا مستقل مریض سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسے ڈاکٹر جو خود شناس ہوتے ہیں اور وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتے، خود کا علاج دوسروں کے پاس کرواتے ہیں جیسے بعض ہوٹل مالک کسی اور ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی تونگر کسی جانوروں کے ڈاکٹر کو اپنا فیملی ڈاکٹر کہے تو حیرت نہ کیجیے گا۔ کیونکہ کروڑپتی لوگ انسانوں سے زیادہ کتوں پر دھیان دیتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر کتوں، بلیوں اور مرغیوں کا ہی نہیں، کھٹملوں اور مچھروں کا بھی علاج کر ڈالتے ہیں۔ ان میں جو مساوات پسند ہیں، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں یا تو کھٹملوں کو بھی صحت مند بنا دیں گے یا کتوں کو بھی ختم کروا دیں گے۔

سرکاری دواخانوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے تعلقات کے بارے میں خواہ مخواہ کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں جو تحقیق کرنے پر سراسر سچ اور بے بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔ (اگر آپ نرس ہیں تو آپ کو چھوڑ کر)۔ ان سرکاری دواخانوں میں مریضوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس طرح۔ ایک آدمی اپنی بیمار بیوی کو ہسپتال میں بھرتی کروانے گیا تو ہیڈ نرس نے اندر پتہ چلانے کے بعد عورت سے کہا کہ زنانے میں کوئی پلنگ خالی نہیں ہے۔ مردانے میں ایک پلنگ خالی ہے تمہارا آدمی بھرتی ہو سکتا ہے۔ کر لوں؟

ہمارے چچا مرحوم کہا کرتے تھے کہ جس دواخانے کے بازو کفن دفن کے سامان کی دوکان ہو اس ڈاکٹر سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد سے کاروبار چلاتے ہوں۔

حلیمہ فردوس
(بنگلور)
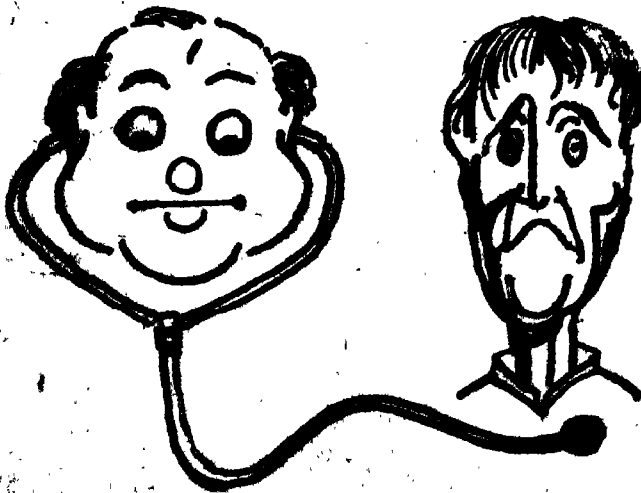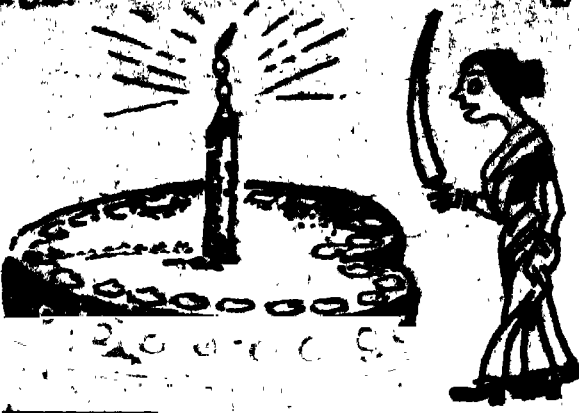
ہم نے منائی سالگرہ

گرہیں جب پڑ جاتی ہیں تو ان کا کھلنا بڑا مشکل ہوتا ہے "کھل جا سم سم" کا طلسماتی نقرہ بھی کام نہیں کرتا. جب دو دل مل جاتے ہیں تو رشتہ کو مستحکم کرنے کے لیے گرہ لگانا لازمی ہو جاتا ہے. خواہ اس گرہ کا اقرار گواہوں اور قاضی صاحب کے درمیان ہو یا آگ کے پھیرے لے کر. بات تو ایک ہی ہے. دو دلوں کے ملنے پر جب گرہ لگ جاتی ہے تو اس کا سلسلہ تا حیات جاری رہتا ہے. یہی نہیں بلکہ ان گرہوں میں اضافہ بھی ہو تا جاتا ہے. شادی تک تو صرف تاریخ پیدائش پر سالگرہ منائی جاتی ہے لیکن شادی کے بعد مجازی خدا یا نصف بہتر کی سالگرہ کا بوجھ بھی نازک کاندھوں پر آجاتا ہے. ان نازک کاندھوں کو سیدھا کرنے کے لیے اکثر لوگ شادی کی دوسری سالگرہ اور بچے کی پہلی سالگرہ ایک ساتھ مناتے ہیں. مگر ایسی ملٹی پرپز سالگرہ منانے سے والدین بڑے خسارے میں رہتے ہیں. دوست و احباب کی طرف سے کھلونے منے میاں کو ملتے ہیں اور ممی پاپا منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں لیکن چالاک والدین قمری حساب سے بیٹے کی سالگرہ مناتے ہیں اور نو دس دن بعد شادی کی سالگرہ۔

تاریخ پیدائش کچھ بھی ہو لیکن سالگرہ منانے کا پورا حق اور پوری آزادی آپ کو حاصل ہے. بالائی آمدنی پر گزارہ کرنے والا شخص پانچ بچے بھی ہوں تو ہر ایک کی سالگرہ بڑے دھوم دھام سے مناتا ہے. ہر سالگرہ پر بچوں کے دوستوں سے زیادہ والدین کے دوست اور احباب جمع ہوتے ہیں اور تحفے بھی بچوں سے زیادہ والدین کو ہی ملتے ہیں. پڑوسیوں کو مرعوب کرنے کا یہ ایک آسان نسخہ ہے اس سے بچوں کی دل بہلائی کا سامان بھی میسر آتا ہے. ایسے موقعوں پر صرف پچاس روپیہ کا کیک کاٹ کر پورے پانچ سو روپے کے تحفے حاصل کئے جا سکتے ہیں لیکن ایک شریف اور غریب شخص تین بچے بھی ہوں تو تینوں کی سالگرہ ایک ہی دن مناتا ہے تاکہ بچوں میں اس بات پر جھگڑا نہ ہو کہ ہماری سالگرہ پھیکی رہی تو میری سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی گئی. ایسی مدلی جیسی سالگرہوں پر تحفے تحائف کا سوال ہی نہیں اٹھتا صرف والدین کا ایک پیار ہی ان کے لیے قیمتی ہوتا ہے. ایسے بچے اگر ذہین ہوں تو زندگی میں بہت ترقی کرتے ہیں ورنہ دوستوں کی سالگرہ کا اہتمام دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں. دور حاضر میں محمود و ایاز کا فرق صرف سالگرہوں کی بدولت ہی ظاہر ہوتا ہے.

ہماری ایک پڑوسی وقار النساء کو صرف تین سال سے اپنی اکلوتی صاحبزادی کی سالگرہ منانے کا شوق چرایا ہے

پورے اہتمام کے ساتھ سالگرہ مناتیں اور اپنے وقار کا پورا خیال رکھتیں لیکن محلے والوں نے دیکھا کہ مسلسل تین سال سے کیک پر صرف اٹھارہ بتیاں ہی جلائی جا رہی ہیں تو ایک بہی خواہ نے کیک کاٹنے سے پہلے مزید چار موم بتیوں کا کیک پر سجا دیا۔ اس پر وقار النساء چراغ پا ہوگئیں (کوئی چراغ کو دیکھ کر چراغ پا ہو جائے تو بھلا بھی لگتا ہے۔ موم بتیوں کو دیکھ کر چراغ پا ہونے کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی) محترمہ نے جواب دیا کہ آپ کی اس حرکت سے میرے وقار کو ٹھیس لگی ہے یہ سن کر انھوں نے جواب دیا کہ محترمہ آپ شاید اپنی بیٹی کی عمر بھول رہی ہیں اب وہ ماشاء اللہ سے اکیس برس کی ہوگئی ہے۔ یہ سنتے ہی وقار النساء پر بجلی گر پڑی پھر بھی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر محفل میں اعلان کیا کہ سا تھیو مسلسل تین سال سے جلائی گئی اٹھارہ بتیوں کا مطلب یہ تھا کہ سرکاری اصول کے مطابق میری بیٹی شادی کے قابل ہوگئی ہے صد افسوس کہ آپ لوگوں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ جب تک آپ پہل نہ کریں گے تب تک سالگرہ کے کیک پر صرف اٹھارہ بتیاں ہی جلا کریں گی۔ وقار النساء کو کیا معلوم کہ اس جہیز و نذرانے کے دور میں کوئی اٹھارہ بتیوں کا معمہ کیا سمجھے جب کہ اس بے حس دور میں اٹھارہ سالہ کئی دوشیزائیں جہیز کے لیے زندہ جلائی جاتی ہیں اور ان کے والدین سالگرہ منانے کا نہیں مرحومہ کی برسی منانے کا حق رکھتے ہیں۔

ہماری ایک اور ساتھی کو شادی کی سالگرہ منانے کا بڑا شوق ہے مگر مشکل یہ ہے کہ پہلے انھوں نے رجسٹرڈ میرج کی بعد میں نکاح کیا ہیں اُن کی شادی کی دونوں تاریخیں یاد ہیں لیکن وہ ویجیٹیرین ساتھیوں کو رجسٹرڈ ڈیٹ پر مدعو کرتی ہیں اور نان ویجیٹیرین کو قمری تاریخ پر۔ اُن کا خیال ہے کہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کچھ تو بہانے چاہئیں۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ اپریل کا پہلا دن اور مہینے کے آخری دن سالگرہ کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں۔ اس لیے والدین چاہتے ہیں کہ یہ گھڑیاں ٹل جائیں اور بچہ پہلی تاریخ نہ سہی پندرہ تاریخ تک بھی پیدا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں یہ یاد رہے کہ وقت اور تاریخ پر اجارہ داری تو صرف نرسوں کی ہوتی ہے۔ پچھلے زمانے میں دایہ صحیح وقت نہ سہی صحیح تاریخ پیدائش تو بتلاتی تھی۔ وقتِ واحد میں مشترکہ خاندان میں دو تین بچوں کی ولادت ہوتی اور والدین بھول جاتے کہ کس دن کونسا بچہ پیدا ہوا ایسی غلطیوں کے باوجود نجومی صحیح زائچے نکال لیتے تھے۔ آج جب کہ سب حساب کتاب کمپیوٹرائز ہو چکا ہے۔ نرس گھنٹوں کے ساتھ ساتھ منٹوں اور سیکنڈوں کا حساب بھی بتا دیتی ہے پھر بھی نجومی زائچہ نکالنے سے گھبراتے ہیں۔ بھلا ہو اُس اصول پرست نرس کا جس نے میرے بیٹے کی تاریخ پیدائش ۲۱ اکتوبر لکھی حالانکہ وہ ۳۱ اکتوبر کی رات بارہ بجنے میں صرف پانچ منٹ کی کسر باقی تھی کہ دنیا میں آگیا۔ اپنی سہولت کے مطابق اس کی سالگرہ ہم پہلی نومبر کو ہی مناتے ہیں لیکن پیدائشی صداقت نامہ ہمیشہ ہمیں منہ چڑاتا نظر آتا ہے۔ ایک دن ناسازیٔ طبیعت کی بنا پر ہم رخصت پر تھے۔ بچے کالج جا چکے تھے اور شوہر دفتر۔ بستر پر لیٹے لیٹے بیزار ہونے لگے تو ہم نے ریڈیو کھولا اور یہ گانا ہمارے کانوں سے ٹکرانے لگا "ہم بھی اگر بچے ہوتے ...... HAPPY BIRTHDAY TO YOU" یہ گانا سنتے ہی ہماری آنکھوں میں آنسو آگئے سوچنے لگے کہ وہ بھی کیا دن تھے جب امی خوبصورت کپڑے پہناتیں اور ہم بڑا سا کیک کاٹ کر سہیلیوں میں تقسیم کرتے اب وہ بات کہاں پچاس سال کے ہوگئے ہیں وہ چاؤ چونچلے کون کرے۔ اُلٹو پلٹو کا ذکر سن کر ہمیں بھی پھر سے گڑیا رانی بننے کی خواہش ہوئی کیلنڈر پہ نظر ڈالی تو حسنِ اتفاق یہ کہ ہماری تاریخ پیدائش ہم سے آنکھیں مار رہی تھی پھر بھی ہم نے اپنے صداقت ناموں پر نظر ڈالی (بھلا پچاس کے پیٹھے میں کسے اپنی تاریخ پیدائش یاد رہتی ہے؟) اور مطمئن ہو گئے۔ سیدھے باورچی خانے کا رُخ کیا نہ چاول تھے نہ شکر۔ دل جل کر خاک ہو گیا۔ مہینے کا آخری

ہفتہ اور ہفتہ کا آخری دن یعنی فروری کی ۲۸ تاریخ جو سال میں صرف ایک بار آتی ہے۔ سوچا تھا کہ [illegible] منائیں گے مگر یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی اس کا نشہ اُترا تھا کہ پوسٹ مین نے تہنیت نامہ تھما دیا۔ جی خوش ہوا کہ تہنیت نے ہمیں برسوں بعد یاد کیا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ منزلِ شباب کی پہلی منزل کباب پر کیسے یاد آ گئی تحریر پڑھی تو پتہ چلا کہ اس نے پچیسویں سالگرہ پر جو کارڈ بھیجا تھا وہ پچاسویں سالگرہ پر ملا ہے ہم یہ سوچتے رہ گئے کہ "اور بھی عنایتیں ہیں ڈاک خانے کی"!

ماجرا اک کھڑی دعوت کا

ماہر بہاری، رانچی

اک کھڑی دعوت کا سنئے آنکھوں دیکھا ماجرا
ساتھ دعوت نامہ کے میں بھی وہاں موجود تھا

شہر میں جب منعقد اک مجلسِ شعری ہوئی
شاعروں کو منتری نے دعوت ظہرانہ دی

شہر سے کچھ دور عالیشان ہوٹل میں جناب
شاعروں کو کار سے لایا گیا با آب و تاب

خوبصورت ہال میں شاعر اکٹھے ہو گئے
سب کے سب فاعلاتن فاعلن میں کھو گئے

ایک گھنٹہ بعد دسترخوان چنوایا گیا!!
مختلف اقسام کا کھانا وہاں لایا گیا!!

میہمانوں کو جو تھا اب میزباں کا انتظار
جانب در ٹکٹکی باندھے تھے ہو کے بے قرار

دفعتاً اک شور اُٹھا لو منسٹر آ گئے!
ہر طرف موصوف کے چمچے وہاں پہ چھا گئے!

پھر کہا موصوف نے دست مبارک جوڑ کر
کیجئے بھوجن مہاشے سب تکلف چھوڑ کر

سنتے ہی چمچوں نے ہر جانب سے ہلا بول کر
شاعروں کے پہلے قبضہ کر لیا خود میز پہ

ایک ہی حملے میں کھانا ختم سارا ہو گیا
اور میں اپنے "انویٹیشن کارڈ" کو تکتا رہا

حالت ہے غیر جواب میز بان کی
... نہ جانے مہمان کی

جب تک ادا نہ اصل مع سود ہو جناب
کیوں کر لگے نہ ڈر مجھے صورت سے خان کی

اُدھم مچا یا پی کے وہ یاروں نے رات بھر
بنیاد ہل گئی مرے پکے مکان کی!

غفلت کی گر یہی رہی حالت تو دیکھنا
میت ہی یاں سے اُٹھے گی اردو زبان کی

کیا سادہ لوح لوگ ہیں ایٹم کے دور میں
محبوب باتیں کرتے ہیں تیر و کمان کی!

غزلیں

محبوب ماٹبھوری

(بلاسپور ایم پی)

زرد رُخساروں پہ ہے رنگِ شباب آیا تو کیا؟
کر کے میک اَپ آئینے کو اُس نے شرمایا تو کیا؟

زندگی بھر ایک اک قطرے کو ہم ترسا کیئے
بعد مرنے کے گھڑوں بھر بھر کے نہلایا تو کیا؟

کر دیا ہم نے تو عرضِ مدعا کر ہی دیا
اس نے ہم کو دور سے ٹھینگا بتلایا تو کیا؟

زندگی بھر تُو نے دوزخ ہی میں رکھا جیتے جی
بعد مرنے کے ہمیں جنت میں بلوایا تو کیا؟

زندگی بھر تشنہ لب ساقی مجھے رکھنے کے بعد
اب لبِ دم قطرۂ مے مُنہ میں ٹپکایا تو کیا؟

مُرغ و ماہی کی پلیٹیں صاف ساری کر چکے
دال دلیہ کھاتے محبوب یاد آیا تو کیا؟

کبھی پسّو، کبھی کھٹمل، کبھی مچھر مارد
کاٹنی ہو شبِ فرقت تو برابر مارد

صرف تقریر سے بہلائے جو لیڈر تم کو
اس کے منہ پر سڑے انڈے و ٹماٹر مارد

بھوت اُتر جائے گا اک آن میں اُن کے سر سے
جوتیاں جتنی پرانی ہوں، اُٹھا کر مارد

خون کا رشتہ ہے کیا چیز بھلا دو یکسر
بے دھڑک بھائی کے تم سینے میں خنجر مارد

کیا خطا مجھ سے ہوئی ہے یہ بتا دو بیگم
بے سبب یوں نہ مجھے ہاتھ اُٹھا کر مارد

دل نہیں سینے میں اُس شوخ کے اک پتھر ہے
رام ہونے کا نہیں، جتنا بھی تم سر مارد

ہنس پڑیں گے تم پہ نہ محبوب یہ سننے والے
ڈینگ تم مارو مگر سوچ سمجھ کر مارد!

احمد عثمانی۔ مالیگاؤں

آج کل دنیا میں کسی بھی کام کو روکنے کا ایک آسان نسخہ تلاش کر لیا گیا ہے۔ اس آسان نسخے سے آپ ہر چیز کو روک سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کو ہوائی جہاز روکنا ہو تو روک سکتے ہیں۔ ریل گاڑی کو روکنا ہو تو روک سکتے ہیں۔ کسی مشین کو چلنے سے روکنا ہو تو بڑی بات نہیں صرف ایک لفظ سے رک سکتی ہے۔ کسی بلڈنگ کا ابھرتا ہوا سر بھی کچلا جا سکتا ہے۔

ایک چمکیلی کار ایک ہی جگہ پڑی پڑی سڑ گئی۔ ہم نے ایک جان کار سے پوچھا کہ بھئی اتنی اچھی کار تھی۔ یہ کار پڑے پڑے سڑ گل رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جانکار نے ہمیں الفراط سمجھ کر صرف اتنا جواب دیا: جناب اس کار پہ اسٹے ہے ہماری اوندھی کھوپڑی میں کچھ بھی نہ سمایا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کار مٹی میں مل گئی۔ اور اسٹے کی بات بھی ہمارے ذہن سے اتر گئی۔ کہ نہیں سمجھ میں آنے والی بات آدمی جلدی بھول جاتا ہے۔ سو ہم بھی بھول گئے۔

ہمارے پڑوس میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کو سوجھی کہ ان کا گھر آر سی سی کا ہو اصولوں نے فوراً ہی پرانی دیواریں گروانا شروع کر دیں اڑوس پڑوس کھلا ہو گیا۔ اب دیواریں دوبارہ اٹھانے پر معاملہ طول پکڑ گیا۔ سیٹھ صاحب اپنا گھر کشادہ کر کے اڑوس پڑوس کے گھروں کو تنگ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو تو تو میں میں ہوئی۔ بعد کیا معاملہ عدالت میں پہنچا جہاں سے ایک فریق نے اسٹے حاصل کر لیا۔ اب صاحب نوبت یہ تھی کہ اڑوس بھی کھلا پڑوس بھی کھلا اور سیٹھ جی کا خانہ برباد بارش کا موسم کالے کالے بادلوں کے روپ میں آ کر اُمنگ ڈال رہا تھا۔ آخر سیٹھ جی نے سمجھوتہ کیا اپنے نکلے اور اسٹے اٹھانے کا بار بھی سیٹھ جی کو اُٹھانا پڑا۔ پڑوسیوں کی دیواریں مفت میں بنوائی پڑیں لوگوں نے حال احوال دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسٹے کا کمال ہے کہ روپے پیسے والے سیٹھ جی کنگال چیک کے پیر چھونے لگے اور روپیہ پیسہ بھی الگ خرچ کیا۔

ہمارے ایک بھیا ہیں۔ ان کو سیاست میں بڑا دخل ہے۔ جہاں ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے وہ فوراً اس پر اسٹے لگا دیتے ہیں۔ اب تو وہ اسٹے بھیا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اگر کوئی صرف بھیا کہتا ہے تو ان کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ لیکن اگر کوئی اسٹے بھیا کہتا ہے تو ان کی تصویر مبارک سب کے سامنے متحرک ہو جاتی۔

اسٹے کا کھیل بھی بڑا انوکھا ہے۔ ایک بار بھیا کسی کمیٹی کے چیرمین بنے۔ مخالف نے زیریں عدالت سے اسٹے لا دیا۔ بھیا نے عدالت عالیہ سے اسٹے آرڈر لیا۔ مخالف نے اس سے بھی بڑی عدالت سے اسٹے لیا۔ بھیا نے اسٹے

STAY ...

بھی بڑی عدالت سے بخشش لیا۔ اس طرح یہ چیرمین کی کرسی پر بیٹھا اور آدھا چھ ماہ تک مالک رہا، کبھی بھیا چیرمین ہوتے تھے کبھی چیرمین نہیں ہوتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ صبح بھیا اُٹھے تو چیرمین بن کر اٹھے اور رات میں سوئے تو صرف بھیا تھے چیرمین کا نام چھلا اتر چکا تھا۔

اِسٹے کو آج کل کی سیاست میں بڑا دخل ہے۔ اگر آپ کو کسی شخص کو کسی جگہ سے بے دخل کرنا ہو تو فوراً اسٹے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ایکبار ہوا یوں کہ چیرمین کے چناؤ کے وقت ایک کمیٹی کے ممبر کو ووٹ ڈالنے سے روکنا بہت ضروری تھا۔ وکیلوں سے پہلے ہونے والے چیرمین اِسٹے بھیا کے پاس پہنچے مدعا بیان کیا۔ بھیا نے کہا یہ کوئی مشکل کام ہے۔ آپ اگر کہیں تو میں ایسا اِسٹے لاؤں کہ اڑتا ہوا ہوائی جہاز فضا میں ہی معلق رہے۔

اِسٹے بھیا سے لوگوں نے کہا ہوائی جہاز کو تو آپ معاف فرمائیں اور اُسے فضا میں اڑنے دیں۔ لیکن مذکورہ ممبر کو معلق کر دیں۔ یعنی یوں کہ وہ ممبر بھی رہے۔ اور ووٹ بھی نہ دے سکے۔ بھیا نے چٹکی بجائی۔ اس کا مطلب تھا کہ مذکورہ ممبر کا کام تمام ہوا۔ چیرمین کا چناؤ ہوا۔ اور جو صاحب چن کر آنا چاہتے تھے۔ وہ چن کر آئے اب چاہے یہ کھیل سال دو سال جاری رہے یعنی اِسٹے اُٹھے یا بیٹھے۔ اِسٹے کی یہ اٹھک بیٹھک ہر شہر میں چند مخصوص لوگوں کو اچھی لگتی ہے۔ اور وہ ایسے وکیل کے اِردگرد رہتے ہیں جو فوراً ہی اِسٹے لائے۔

ایک بار میاں بیوی میں جھگڑا ہوا میاں نے بچوں کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور بیوی کو گھر کے باہر ہانک دیا۔ کسی ستم ظریف نے محترمہ کو مشورہ دیا کہ شوہر نے نہ صرف آپ کو گھر کے باہر ہانک کر آپ کی توہین کی ہے بلکہ بچوں کو چھین کر ماں کی توہین کی ہے۔ اس بنیاد پر فوراً عدالت سے رجوع ہو کر شوہر نامدار کے خلاف بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر اِسٹے لے آئیے آپ کو انصاف کے ساتھ ساتھ آپ کے بچے بھی مل جائیں گے۔ شوہر کی ماری اور ممتا کی ماری محترمہ سیدھی عدالت پہنچیں اور شوہر نامدار کے خلاف بچوں کو رکھنے کا اِسٹے خود ہی لے کر مع پولس کے آدھمکیں اور خود ہی شوہر نامدار کو اِسٹے بجوا دیا۔ اور بچوں کو بغل میں داب کر چلتی بنیں۔ ہم بچپن میں اِسٹے بجوانا سنتے تھے تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ کوئی آلۂ موسیقی ہے۔ لیکن بہت بعد میں معلوم ہوا کہ نہ تو یہ آلۂ موسیقی ہے نہ ہی کسی دھات کا بنا ہوتا ہے۔ یہ تو صرف لفظ ہوتا ہے جسے کاغذ پر منتقل کر کے عدالت کی مہر کے ساتھ دوسرے کو سونپ دیا جاتا ہے اور اسی سونپنے کے عمل کو اِسٹے بجوانا کہتے ہیں۔ اور اب حال یہ ہے کہ آپ کے کانوں میں تان ضرور پڑے گی کہ بھئی فلاں نے فلاں کے خلاف اسٹے بجوا دیا۔

ایک سیاسی ورکر ہمیشہ صحت مند و توانا رہتے تھے۔ نہ وہ کچھ کام کرتے تھے نہ ان کا کوئی کارخانہ چلتا تھا بہت دنوں بعد ان کے ذریعہ معاش کا پتہ چلا کہ جہاں کہیں کوئی کارخانہ یا مکان بنتا وہ وہاں اِسٹے بیٹھا دیتے جب لوگ ان کو سمجھاتے بجھاتے تو اپنی محنت اور اسٹے بیٹھانے کا خرچ وصول کر کے اِسٹے اٹھا دیتے۔ اس طرح ان کی جیب ہمیشہ گرم رہتی اور پیٹ بھرا رہتا۔ اور آج کل بہت سے سیاسی ورکروں اور کام چور لوگوں نے اِسٹے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں بیٹھا دیتے ہیں۔ اور مٹھی گرم ہونے پر اٹھا دیتے ہیں۔

شفیقہ فرحت (بھوپال)

غیر مستقل مستقل کالم

چلتے چلتے

چلتے چلاتے یعنی سکریٹریٹ سے کہ جو ہر بندۂ سرکار کا قبلہ و قبلہ نما ہے، لوٹتے وقت ایک مزار پر نظر پڑے گا۔ جب ہم ہمارے تھے سمت قبلہ تب بھی یقیناً یہ مزار اسی جاہ و جلال کے ساتھ اسی جگہ ہوگا۔ اور اس کے مکین مکرم اسی طرح اپنے گوشۂ عافیت میں آرام فرمارہے ہوں گے مگر ہم جیسا V.O.P (V.T.P نہیں) ارتھات Very - Ordinary Person - جب کسی سرکاری دفتر کا رُخ کرتا ہے تو دائیں بائیں دیکھنے کا ہوش اور حوصلہ کب ہوتا ہے۔

پھر شہر بھوپال کا سکریٹریٹ بنا بھی سب سے اونچی پہاڑی پر ہے۔ کیوں نہ ہو — صوبے کی راجدھانی جو ہے —!

پہلے کہتے تھے — "تال تو بھوپال تال"

اب کہتے ہیں

شہر تو بھوپال شہر

اور پہاڑ تو وندھیا پہاڑ

اونچا پہاڑ — اونچا شہر (اور نیچا بھی —!)

اونچی باتیں — اونچے کام (زبان بندی اور حدِ ادب شرط ہے —!)

اونچے لوگ — یہاں سے اٹھ کر سرکاری درباری پھرے لیس دلّی کی بساط پر ہی فٹ ہوتے ہیں۔ اور ایسے کر جاتے نہ ہلیں۔ مثلاً —————؟

اب آپ خود سمجھدار ہیں۔ بس نگاہ روبرو۔ یعنی بلندی کی جانب۔

تو حضور اس اونچی پہاڑی پہ چڑھتے وقت ہم مزارِ مقدس کو بھی فراموش کر گئے۔ اس وقت [illegible] پہ [illegible] طاری تھی (حیف صد حیف —)۔ اچھا ہوا کہ یہ وقت حشر تک کی نیند اور آرام کا ہوتا ہے ورنہ [illegible]

سے مزید لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ ورنہ یوں نظر انداز کئے جانے پر کچھ تو غصّے کا اظہار کرتے۔ اور ہمارے ساتھ حضرتِ کلرک کا وعدۂ فردا بھی نہ آتا۔ عالی یا اعلیٰ افسر کی بات تو چھوڑیئے ــــ!

ــ خیر تو اس وعدۂ فردا کے نشۂ سہ آتشہ سے سرشار ہم پہاڑی اُتر رہے تھے۔

کہ بعض آثار مسرت انگیز ہوتے ہیں اور بعض غم آمیز ــ!

اترتے اُترتے ہماری نظر اس مزار پر بھی پڑی (زہے نصیب!) سکون و سرور میں اضافہ ہوا کہ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ویسے تو بھوپال میں سال کے باروں مہینے کہیں نہ کہیں تازگی، سرسبزی اور شادابی کا راج رہتا ہے۔ اور حفظِ ماتقدم کے طور پر لوگوں نے گھروں پہ ہرا رنگ کروانا شروع کر دیا ہے ــــ (ہائے شکستِ بہارِ نظارہ ــ!) کہ آنکھوں کو جلتی دھوپ میں ٹھنڈک تو ملے۔

پھر یہ تو مزار شریف تھا۔ گھنے شاداب، سبز پیڑوں کے جھنڈ کے بیچ بنا ہوا۔ سبز رنگ کا ــ اردگرد کاغذی ہری جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ اور دو بڑے بڑے ہرے بینر (Banner) بھی پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مگر اس سبزے میں ہماری نگاہ اب بھی نہیں اُلجھ رہی تھی۔ کہ وہ تو وہاں ہر قدم پہ دامن کش ہے۔

نظر جس نے روک تھی بلکہ پکڑلی اور جکڑ لی تھی۔ وہ تھا رسم الخط اور زبان۔ (ماسٹروں اور محبانِ ملک و ملت کا بنیادی۔ ابدی اور اقتصادی مسئلہ ــ!)

"بہ زبانِ ہندی" بہ لباسِ ناگری مزار شریف کا اسم مبارک اور عرس مبارک کے سلسلے میں ہدایات و معلومات درج تھیں۔ ظاہر ہے سرکاری دفتر کے احاطے سے لگے مزار کی زبان بھی سرکاری ہی ہوگی۔

لہٰذا اب یہ مزار اُردو کا مزار کہلانے لگا۔ عرفِ عام میں بھی، عرفِ خاص میں بھی۔

اور جو ذرا ترچھی نظر سے دیکھیں تو ہندی کا مزار بھی تعبیر ہو سکتا ہے کہ نوشتۂ تقدیر ہندی میں ہی تو ہے۔ مگر گویا اہلِ علم و اہلِ ادب دونوں نے اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے بلا تفریق مذہب و ملت ہر علم و فن اور ہر زبان کے مقبرے تعمیر کر دیئے ہیں۔ اور سب کچھ پورے خلوص سے دفن کر رہے ہیں۔

تو آیئے۔ چلتے چلتے ہم آپ فاتحہ ہی پڑھ دیں ــ!

اور اگلی مرتبہ اُردو ہندی کے دوسرے پُرشکوہ مقبروں اور سمادھیوں کی سیر کریں گے۔ ــ

نسیم سلطانہ (بھوپال)

ہرفن مولا

کیسی عجیب بات، بلکہ عجیب نقرہ ہے، اس کی تانیث کرنا سخت مشکل ہے، سب سے بڑی بات ان کے مولا ہونے کی ہے۔ اس لیے نام مذکر سہی، لیکن خدارا انھیں مذکر ہرگز نہ سمجھیے گا۔ اچھی بھلی ساڑی باندھے نظر آئیں گی۔ کبھی کبھی شلوار کرتے تو بھی شرف ملبوسیت عطا کرتی ہیں۔ آستینوں میں سانپ پل جایا کرتے ہیں، اس لیے ان کا استعمال غیر ضروری سمجھتی ہیں۔ بالوں نے اُلجھنے کی ادا سیکھی ہے۔ اس لیے ان سے بھی بے نیاز رہتی ہیں۔ یہ بے نیازی قدرتی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے بھلے بال دیئے ہیں، مگر وہ انھیں بالائے بام رکھنے کے حق میں نظر آتی ہیں۔

کسی کے شوہر غریب کی بے چارگی کا ذکر کرنا، غیر اخلاقی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس سے درگزر کیجئے کہ وہ بالکل بھی نیز ذاتی وغیرہ وغیرہ معاملہ ہے۔ ہاں مگر ہم اپنی کس مپرسی (جسے وہ مزاج پرسی کہتی ہیں) کی شکایت تو کر ہی سکتے ہیں۔

ہماری ان کی ملاقات ابھی سلور جوبلی تک تو نہیں پہنچی، البتہ ابھی اس کے پھلنے پھولنے کے دن ہیں۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن۔ لیکن ہمیں یوں لگتا ہے جیسے یہ ساتھ تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اپنے سارے کام چھوڑ کر ان کی لسانیات سے نو نو بچوں پر شفقت کی بارش ہونے لگتی ہے۔ کالونیٹ زدہ بچوں کو اردو کے فوائد بتائے جائیں گے۔ اسماعیل میرٹھی تو خیر معمولی درجہ کی کتابیں ہلیا کر گئے ہیں، چنانچہ وہ خود بچوں کا ادب تخلیق کرتی ہیں۔ اور حالات حاضرہ سے انھیں آگاہ کرتی رہتی ہیں۔ اور یہ عمل زیادہ خطرناک ہے خلوص بے جا پیشک کرنے والا کا قرب!! جس کے نتیجہ میں بارہ بجے تک بیٹھ کر ان کا ہوم ورک کروائیے کیونکہ موصوفہ دن ڈھلے آتیں اور رات ڈھلے تک ٹھہرتی ہیں۔ اور کہ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو ان کی اس عشقیہ پابندی نے ہم کو تاکوں چنے (اگر ممکن ہوسکے تو) چبوا دیئے۔ اور پھر ان ترانیاں سنئے اور نکر نکر دیکھے جائیے۔ آج فلاں و فلاں ایم ایل اے کی پول بھری محفل میں کھنچائی کر دی۔ فلاں منسٹر کو کیا آڑے ہاتھوں لیا۔ فلاں و فلاں ایڈیٹر کی تو آج دھول نکال دی۔ مشکل تو یہ ہے کہ ان آتش بیاں کے پاس کس سے بیٹھا جائے ہے۔ ان کی وہ باتیں جو شہر میں آج تک کبھی کسی نے سنی بھی اور نہ

خدا کسی کو سنوائے، جب تک ہمارے گوش گزار نہ ہو جائیں بچنا مشکل ہے۔ (آتش فشاں سے بچنا شاید ممکن ہو ان سے نہیں)

برسبیل تذکرہ آپ نے کسی ڈاکٹر یا حکیم کا ذکر کیا۔ ۔ ۔ وہ ٹھہریں ڈاکٹر ــــ یہ الگ بات ہے کہ تین سال بعد چھوڑ دیا۔ کیونکہ انھیں یہ پیشہ نہایت فضول لگنے لگا۔ اس لیے اسے چھوڑ چھاڑ شادی کرلی۔ بہرحال مفت طبی مشورہ لیجیے اور فیس دینے سے بچیئے۔ مال بچا، جان کی پرواہ کسے ہے۔

مزاج کی ہیں پارہ، کسی ایک پہلو قرار نہیں، ہم لوگ تو انھیں بیگم پارہ کہتے ہیں۔ شادی کے بعد بیگم پارہ دو چار سال تو قرار سے رہیں، بلکہ نہایت بیقرار۔ اس کے بعد ان کی بن آئی۔ ۔ ۔ ۔ موصوفہ نے بی۔اے میں داخلہ لے لیا۔ جیسے تیسے دو سال انھیں دو صدیاں لگے، بی۔اے سے گزر گئیں۔ ۔ ۔ اب خیال آیا ایل ایل بی کرنے کا۔ اِتنا تو ان کا تجربہ، ہم تو بڑے مرعوب رہتے۔ موصوفہ نے ایل ایل بی میں بھی داخلہ لے کر چھوڑ دیا۔ کونسا انھیں نوکری کرنا تھی۔

اس بار پراپرٹی ٹیکس اچانک دوگنا ہو کر آگیا، موصوفہ کے قریبی عزیز کارپوریشن میں موجود تھے۔ ہم نے سوچا موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن کارپوریشن والوں نے ان کی سفارش پر ٹیکس اور دوگنا کردیا۔ لیجئے ــ "دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کردیا"

شامت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی۔ چنانچہ کرایہ داروں سے مکان خالی کروانے کے لیے موصوفہ نے کچھ داؤ پیچ بتائے۔ پچھلی برسات میں میونسپل والوں نے ان کا مکان مخدوش کہہ کر تڑوا دیا تھا۔ اور اب نیا مکان بنوا رہی تھیں، کہ چوگنا کرایہ نیز پگڑی بھی وصول کریں۔ ان کے بتائے ہوئے داؤ پیچ ہم نے بھی استعمال کر ڈالے۔ ۔ ۔ لیکن فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ ۔ ۔ پگڑی تو کیا ملتی۔ ہماری تو خوب پگڑی اچھالی گئی۔ بائیں بازو والا مکان نیلام کرنا پڑا۔ اور ہم بھائی بہنوں میں لڑائی ہوئی وہ الگ کہ باپ دادا کی جائیداد کو ہم نے یوں مٹا دیا۔

کپڑوں کی تراش خراش میں محترمہ زبردست ماہر ہیں۔ اور جثہ کے اعتبار سے بھی اللہ میاں ان پر بڑے مہربان ہیں۔ اسی لیے اتنا پھر بتلا ہی بھی ہے۔ جو دھان پان ہوں وہ سمجھیں کہ ان کی مثال تو لی۔ مگر وہ تو بے مثال ہیں۔ یا صرف دھان اور یا صرف پان۔ اتنی نہیں کہ بس ــ!! ہم نے بھی شاید شامتوں کو خریدنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ ہرچند کہ دماغ نے کہا کہ آزمودہ را آزمودن جہل است۔ ۔ ۔ لیکن دل نہ مانا۔ فارن ریٹرن کپڑا انھیں پکڑا دیا۔ فارن ریٹرن یوں کہ اس پر مہر تو ہندوستان کی ہی تھی۔ لیکن آیا تھا حج کی زیارت گاہ سے۔ اس مبارک کپڑے کو ہم نے باوضو ہو کر انھیں پکڑا دیا۔ ۔ ۔ اور دو دن بعد خود دل پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ابھی دل ہمارے پاس تھا۔ انھوں نے تو اپنی ہی ناپ کا کرتا سی دیا تھا۔ جس میں ہماری محض آستین آسکتی تھی۔ اور اس میں تو آستین تھی ہی نہیں۔ مسکرا کر بولیں "میں تو سمجھی تھی آپ کی دونوں بچیوں کی فراکیں سینا ہے۔ ۔ ۔!!"

تب سے آج تک ہم برابر توبہ کئے جا رہے تھے۔ کہ اب ان کی باتوں میں نہ آئیں گے اور اگر آگئے تو پھر پھڑ پھڑا کر اُڑ جائیں گے۔ مگر اُڑنے سے پیشتر ہی ہمارے پَر کتر ڈالے گئے۔ ساری عمر نثر میں باتیں کرتے رہے کبھی کسی استاد کی استادی نے یوں نہیں ستایا۔ جیسے کہ اس بار۔ وہ بھی ہوا یوں کہ ہم نے ذرا موڈ میں آکر ایک آدھ غزل موزوں کرلی۔ بس جناب ادھر ہماری مشقِ سخن، ادھر ان کی مشقِ ستم، سخن وروں کا ستم کشی سے پرانا ناتا ہے مطلع ابھی تو ہم غزل کہہ کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ موصوفہ تشریف لے آئیں۔ لا ــ کوئی تو سخن شناس ہاتھ آیا۔ ۔ ۔ کچھ تکہ

محترمہ پیدائشی شاعرہ ہیں۔ اور ہم میں یہ جراثیم ابھی ابھی در آئے ہیں۔ شاید یونین کاربائیڈ والی گیس کا اثر ہے سو ہم نے ایک نہایت زہریلی سی غزل کہی لیکن جب دوسری غزل اُڑنے کے لیے پر تول رہی تھی، انھوں نے جھٹ سے ریورس گیر میں ڈال کر گاڑی پلٹا دی۔ ہم نے بریک لگایا۔ انھوں نے آگے آنے کا راستہ دیا۔۔ ۔ دوڑی دوڑی کا بیل استاد امیر صاحب قزال سمرقندی آفندی کے یہاں لے کر گئیں۔ استاد محترم پانی کی قلت کے پیدائشی شکار تھے۔ کبھی انھوں نے ایک عدد شیروانی سلوائی ہوگی یا ان کے سسرال کی ہوگی۔ وہ آج بھی زیب تن کئے ہوئے تھے۔ لیلیٰ پیاری تو لیلیٰ کا کتا بھی پیارا ۔!!

لیلیٰ کی بکریوں نے آنگن کو زعفران زار بنا رکھا تھا۔ آنگن میں چھایا ہوا بیری کا درخت، ذوقِ نظر کو پتھروں سے ڈرا رہا تھا۔

دری پر ایک عدد چاندنی بھی بچھی تھی۔ جو عاشق کے چاک دامن سے بنائی گئی تھی اور اب شبِ تاریک کی لے پالک لگ رہی تھی استاد محترم گاؤ تکیہ سے ٹیکے بیٹھے اک ادائے شاعرانہ سے پان چبا رہے تھے اور چشمہ سر پر لگائے عالم بالا کی سیر کرتے جاتے تھے۔ خیر ہم لوگ اس سیر میں مخل ہوئے۔ اپنے حاضر خدمت ہونے کی غایت بتائی۔ عینک عالم بالا سے نیچے اتری۔۔ ۔ پہلے انھوں نے ہمارا حیشہ دیکھا۔ ہماری بھرکم تن و توش پر نظر ڈالی۔ بکھرے بالوں کی جگہ نہایت سلیقے سے گندھی چوٹی نظر آئی۔ واپسی کی فکر میں بار بار ہماری نظر گھڑی پر پڑتی رہی۔۔ ۔ پھر ہم سے ہماری غزل سنانے کی فرمائش کی۔۔ ۔ ہمارے ہاتھوں میں ہر چند کہ طوطے نہ تھے، پھر بھی اڑ گئے۔ ڈائری نکال دھیمی سی آواز میں ڈرتے ڈرتے ایک شعر یوں پڑھا جیسے کہ ماسٹر کو اگر غلط جواب دے دیا تو سب کے سامنے ڈانٹ پڑے گی۔۔ ۔ یا سزا ملے گی۔ جیسے تیسے غزل مکمل کی۔۔ ۔ لیکن استاد محترم کو ہم میں کوئی ادا شاعرانہ نظر نہ آئی۔ نہایت بے نیازانہ فرمایا۔ "ابھی مشقِ سخن کرتی رہیے" اور پھر بیگم پارہ سے بولے۔۔ ۔ واللہ آپ اپنی کوئی نئی چیز ضرور سنائیے۔ اب تو آپ ماشاء اللہ بیحد منجھ گئی ہیں۔ موصوفہ نے بغیر ڈائری نکالے پڑھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ دیکھ کر پڑھنے میں فنِ شعر کی توہین ہوتی ہے۔ ؎

خاکساروں سے خاکساری ہے ؛ انکساروں سے انکسار نہیں
تم جو آؤ تو روشنی کر لیں ؛ ورنہ بجلی کا اعتبار نہیں
دلبری اختیار کھوتی ہے ؛ ورنہ ہم کو تو اعتبار نہیں
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب تو دل کا بھی اعتبار نہیں

اور استاد محترم جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں۔ سر پہ پیر ہم رکھ نہیں سکتے تھے مگر رکھنا پڑے۔ بہت سے کام نہ کر سکنے کے باوجود کئے جاتے ہیں۔ اس لیے ہم سر پہ اپنے ہی پیر رکھ کر بھاگے۔۔ ۔ بھاگتے بھاگتے خیال آیا کہ چلو لائبریری چل کر کوئی اخبار، رسالہ کچھ تو پڑھا جائے۔

اخاہ، مزہ آگیا۔ آج کے اخبار میں محترمہ سے انٹرویو لے کر چھاپا گیا تھا۔ فلاح و بہبود کمیٹی کی سرگرم رکن بھی۔ اور اب تو انھیں الیکشن لڑنے کے لیے ٹکٹ بھی ملنے ہی والا ہے (خبر گرم ہے ۔) ہم نے نہایت [illegible] سے انٹرویو پڑھا۔۔ ۔ تمام تفصیلات پڑھیں۔ دوبارہ پڑھیں۔۔ ۔ پہلی بار کم دوسری بار زیادہ [illegible] آیا۔

شاید یہ ہمارے اندر کا جسد بول رہا تھا۔ یہ تو کہیں پڑھا بھی نہیں — یہاں کسی یونیورسٹی کا حوالہ ہے۔ آزادی کی جدو جہد میں کبھی انڈر گراؤنڈ بھی نہیں ہوئیں . . . پھر بھی یہ سب ؟ بلکہ ان کے کہنے کے مطابق یہ خود کو اللہ کی دین سرفروش سمجھتی ہیں مگر آزادی کے بعد کی۔ ان کی ایک فاخرانہ غزل بھی اس سلسلہ کی ہمیں یاد آئی۔

— "مجھے ہے فخر کہ میں نے غلام دیکھے ہیں" —

پھر بھلا ہم حیران کیوں نہ ہوتے اور غصہ بھی کیوں نہ آتا۔ شام کو تشریف لائیں۔ ہم نے انٹرویو چھاپے جانے کی مبارکباد دی۔ مسکراتی رہیں۔ پھر بعض غلط فہمیوں کی طرف دھیمے دھیمے لہجہ میں اشارہ کیا۔ مسکراہٹ کا زاویہ بتیس ڈگری سے پھیل کر ساٹھ ڈگری تک جا پہنچا۔ لیکن انڈر گراؤنڈ ہونے والی بات نے ہمیں ہتھے سے اکھاڑ دیا۔

— ارے تو آپ اتنا ناراض کیوں ہوتی ہیں ؟ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں دنیا اس مشہور نام سے جانتی ہے۔ ورنہ ہمارا نام تو مکھن بالو ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ یہ ہمارا قلمی نام ہے۔ اتفاق دیکھئے اتنی مشہور ادیبہ نے مجھے بھی ادیبہ بنا دیا۔" —

اللہ جسے چاہے عزت دے

ہم نے سوچا، اس نام کی برکت سے بہتی گنگا میں ہم بھی ہاتھ دھو لیں، بہت دن سے ہمیں ورغلائے ہوئے تھیں، ہمارے شہر عزیز میں مدت سے کوئی ماہانہ رسالہ نہیں نکلا اور وہ بھی خواتین کا رسالہ۔ نہ ہمیں تجربہ تھا نہ زمت بیگم پاشاہ، شہریں اس فن میں بھی طاق۔ بقول ان کے، ان کے شوہر نے ان کی تربیت کچھ اسی طرح کی تھی کہ وہ کسی کام میں بندھنہ تھیں۔ چنانچہ صحافت کا بھی انھیں خاصہ تجربہ تھا۔ عملی ذمہ داری تو ظاہر ہے کہ وہی لیتیں، ہمیں تو ان کے نام کے زیر سایہ اپنا نام بھی چھپا ہوا دیکھنے کا کیسا ارمان تھا، یہ تو راز کی بات، لیکن بغیر بتائے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں۔ پہلا مرحلہ تھا۔ رسالہ کے نام کا۔ وہی طے نہیں ہو رہا تھا۔ خاتون، خاتون مشرق، بانو وغیرہ وغیرہ تو نکل ہی رہے ہیں، اب ہم کیا نام رکھیں۔ سوچتے رہے۔ خوب سوچا . . . آخر کار ایک نام سمجھ میں آیا . . . محترمہ . . . اتفاق رائے کی ابھی نوبت نہ آئی تھی۔ رجسٹریشن وغیرہ کی بھاگ دوڑ تو انھیں کو کرنا تھا۔ لیکن !! مشکل تو پہلے ہی مرحلہ پر آئی۔ یہ نام انھیں قطعی پسند نہ آیا۔ کیونکہ اس کے بعد کسی نہ کسی کا نام لگانے کو جی چاہتا ہے۔ صرف 'محترمہ' میں تو ایک طرح کا ادھورا پن ہے۔ اور یہ نام کس کا لگے۔ یہ اتنا بڑا سوالیہ نشان تھا کہ دو سال گزر گئے۔ گزرتے چلے گئے۔

ہمیں خیال آیا — محترمہ اندرا گاندھی، کیسا رہے گا ؟ بولیں خالص کانگریس کی آواز ہو جائے گا۔ جن دادی اور جن مورچہ والے تو اپنے رسالہ میں کوئی مضمون ہی نہ دیں گے۔ کوئی آفاقی نام ہی سمجھ میں نہ آسکا۔ "مدر ٹریسا" عیسائیت کی علم بردار۔ مذہب کی چھاپ تو لگانا ہی نہیں ہے۔

آئیڈیا تقریباً ڈراپ کر دیا گیا، لیکن شاید صرف ہم نے۔ ایک دن نہایت ہی دھیمی آئیں کہیں کہیں سے چھلکنے والے قرطاس و بعض کو گود ریج پرائی سے پھر شب تاریک میں بدل کر، بھنوؤں کو دو آتشہ بنائے، کم کم مسکراتی، پرس جھلاتی، مختصر سی ناک سکوڑتی، چیونگ گم چبائے جاتیں۔ باتیں جاری تھیں۔ ہم تو اس رسالۂ مرحوم سے مایوس ہی ہو چکے تھے جو بن کھلے ہی مرجھا چکا تھا۔ مگر وہ ہار ماننے والی نہ تھیں۔ ایک عدد نام بھی لائیں۔ چبا چبا کر (چیونگ گم) بولیں۔

"کچھ تو جدت ہونا چاہیئے نا" ہم نے جھٹ سے اقرار کرلیا کہ ہم خود ایسے قدامت پرست کہاں ہیں۔
بولیں اس رسالہ کا نام "فیشن زدہ" رکھ لیں ؟

ابھی ابھی ہم جو جی جان سے رسالہ نکالنے کے لیے ایکٹو رول ادا کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، اچانک ہارٹ فیل کے مریض نظر آنے لگے۔ ہماری اچانک بگڑتی حالت کے پیش نظر مفت طبی امداد دینا قرار پایا۔ مال تو تھا ہی نہیں، جان کے ڈر سے ہم فوراً ہوش میں آگئے۔ اور برسوں کے بیمار دکھائی دینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن بیماری کو زیادہ طول دینا بھی خلاف مصلحت تھا۔ اس لیے لمبی سی جماہی لے کر نیند کا اعلان کر دیا تب کہیں اگلے دن اسی وقت تک کے لیے ہمیں معذور سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

اب ہوا یہ کہ ان کی سنگت میں ہم بھی اپنے آپ کو ماہر اعظم سمجھنے لگے ہیں۔ جمال ہم نشیں در من اثر کرد۔ اور تو اور اب آپ ہمیں ادبی گورکھ دھندوں سے کھینچ کر سیاست میں دیکھئے۔ سیاست کہ فیات خود معجون مرکب ہے۔ اور اللہ نے چاہا تو دوست، دشمن نصیب ہمیں بقدر ظرف اب کے الیکشن میں ووٹ بھی ضرور دیں گے۔ جیتنے کا ارادہ تو ہے، نہ بھی سہی تو اپنی سرکار کسی کا دل توڑتی نہیں۔ استعفیٰ بھی دیدیں تو سودا گھاٹے کا نہیں۔ اگر ادھر سے مایوسی ہوئی تو ان کے پاس بہت سے مجرب نسخے ہیں۔ مطلب صرف شہرت کا حصول ہے۔ تجریدی آرٹ کی بیش بہا تصویروں کا خزانہ ہمارے پاس ہے۔ جو اکثر و بیشتر ہمارے بچوں نے بنا بنا کر پھینک دی ہیں۔ بس عنوان دینے میں ہماری ذاتی ذہانت (جو کسی گوشہ میں سو رہی ہے)! سے کام لینا پڑے گا!

یہ اور ایسے بہت سے گر انھوں نے تیار رکھے ہیں!

غالب حیدرآبادی —— اب کے برس

بڑھ گیا اور تمس اب کے برس
غم کے عفریت نہ ٹوٹیں اب کے برس

بارہ گھنٹوں کا تھا اک پل گیا سال
سو برس کا ہے برس اب کے برس

حشر یہ پہلے سے سوا پانی کا
بڑھ گئی اور ہوس اب کے برس

اشک پیپوں میں بھرے جاتے ہیں
دیکھیے حرص و ہوس اب کے برس

سارے آہوئے ختن سوکھ گئے
اور سوکھیں گے فرس اب کے برس

نشہ آور ہوں ببولوں کی جڑیں
بھے نکلے کانٹوں سے بھی رس اب کے برس

رقص طاؤس نہ قمری کے وہ گیت
ہر طرف مور و مگس اب کے برس

شہر لوگاں سوں "ہو" کیوں کر آباد
دستِ حاکم میں ہے نس اب کے برس

کوئی جھگڑا ہے نہ دنگا فساد
خوب ہے کنجِ قفس اب کے برس

زور گانجے کا رہا پچھلے سال
پی کے نکلیں گے چرس اب کے برس

استری انجمنیں ہیں ہر سو
اور بن جائیں گی دس اب کے برس

سبزہ و گل تو کجا گلشن میں
خار ہے اور نہ خس اب کے برس

سر منڈاتے ہی پڑیں گے اولے
اور بھڑکے گی اُمس اب کے برس

بھاگ کیوں اب نہ لٹیروں کے کھلیں
بن گیا چور عسس اب کے برس

کسی میزان میں پھر تل تل کر
ہوں گے تقسیم حصص اب کے برس

ایک "بوفورس" ہی کیا کتنے ہی
ہوں گے مشہور قصص اب کے برس

رکھ نہ محدود گلوں تک خود کو
کھینچ کانٹوں سے بھی رس اب کے برس

پانی والوں کو ملے گا پانی
پیاسے جائیں گے ترس اب کے برس

خوب چمکیں گے لہو پی پی کر
جنم بھومی کے کلس اب کے برس

دیکھ ہشیار سنبھل کر غالب
کسی چکر میں نہ پھنس اب کے برس

جہانگیر انس
(رانی پور، بہار)

منصوبہ سازی

عظیم مفکر ایکس۔ وائی۔ زیڈ کے بقول "اگر آپ کی زندگی کی پتنگ کسی منصوبہ کی ڈور سے نہیں بندھی ہے تو سمجھ لیجئے آپ میں اور کٹی پتنگ میں کوئی فرق نہیں۔ آندھی اور طوفان کی بات دور رہی، ہوا کا معمولی جھونکا آپ کو کہاں سے کہاں لے جائے گا یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں یا کچھ بننا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس کا منصوبہ بنائیے۔ اگر کچھ نہیں کرنا چاہتے اور کچھ نہیں بننا چاہتے تو اس کے لیے بھی آپ کو منصوبہ بنانا پڑے گا۔ کیونکہ منصوبہ کے بغیر آپ ایک قدم نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے کھسک سکتے ہیں۔ منصوبہ وہ پتوار ہے جو آپ کی زندگی کی کشتی کو کھیتا ہے۔ منصوبہ زندگی کی گاڑی کا پٹرول ہے۔ خواہ اجتماعی زندگی ہو یا انفرادی منصوبہ بندی کے بغیر لنگڑی، لولی اور اپاہج ہے۔ عوام تو عوام ہیں منصوبہ کی بیساکھی کے بغیر سرکار کی گاڑی بھی ایک قدم آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے کھسک سکتی ہے۔" غالباً اسی لیے آج اکثر بلکہ بیشتر لوگ منصوبہ سازی کے مفید مشغلے میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے بیش قیمت وقت کا بہترین استعمال منصوبہ سازی سمجھتے ہیں تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکیں تو کم از کم پیچھے ہی کھسک سکیں۔

میں نے اکثر منصوبہ سازوں کو دیکھا اور بھگتا ہے۔ دیکھنے اور بھگتنے میں جو نمایاں فرق ہے اس سے آپ بھی ناواقف نہ ہوں گے۔ دیکھنے کا جہاں تک سوال ہے اگر آنکھیں روشن ہوں تو آدمی ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیکھتا ہی رہتا ہے۔ بعض لوگ تو تاریک آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ آپ نے ان اندھے دوستوں کا قصہ ضرور سنا ہوگا جنھوں نے ہاتھی کا نظارہ کیا تھا۔ اس دنیا میں ایک سے ایک قابل دید چیزیں اور منصوبہ سازوں سے بھی بڑے عجائبات موجود ہیں۔ اس لیے منصوبہ سازوں کو دیکھنا کوئی اہم بات نہیں، اہم بات ہے انھیں بھگتنا۔ اگر آپ کو کسی منصوبہ ساز کو بھگتنا پڑا ہوگا تو انھیں بھگتنے کی اہمیت بلکہ اذیت سے بخوبی واقف ہوں گے۔ صبح آپ بستر پر ہی ہوتے ہیں کہ دروازے پر سائیکل کی گھنٹی بغیر فل اسٹاپ کے بجنے لگتی ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ مسٹر "م" کے علاوہ کوئی دوسرا اس قسم کی غیر شاعرانہ حرکت نہیں کر سکتا۔ آپ روشن دان سے جھانک کر دیکھتے ہیں۔ آپ کا خیال صحیح ثابت ہوتا ہے۔ مسٹر "م" تصویر انتظار بنے گھنٹی کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہیں۔ آپ اپنے فرزند سے کہتے ہیں جاکر کہہ دو کہ "ابا گھر پر موجود نہیں ہیں۔" آپ کا فرزند دروازہ کھول کر کہتا ہے کہ "ابا نے کہا ہے کہ ابا گھر پر موجود نہیں ہیں۔" اپنے فرزند کی عقل پر ابھی آپ ماتم بھی نہیں کر پاتے کہ مسٹر "م" [illegible]

آواز سنائی دیتی ہے "ارے میاں، میں قرض مانگنے نہیں آیا ہوں اور نہ ہی نیا ہوں کہ میری ملاقات آپ کی رسوائی کا سبب بن جائے گی" مسٹر "م" کی گرجدار آواز سن کر آپ کا فرزند سہم جاتا ہے اور بیوی کے ہاتھ سے چائے کی کیتلی گر جاتی ہے۔ بیوی کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ ڈرے سہمے باہر آتے ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مسٹر "م" برس پڑتے ہیں۔ آپ بکری کی طرح ممیاتی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کرتے ہیں۔ صلح صفائی کے بعد مسٹر "م" کہتے ہیں "بھئی میں نے رات کو ایک منصوبہ بنایا ہے۔ سوچا عملی جامہ پہنانے سے پہلے آپ سے مشورہ لے لوں کیونکہ عقلمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ کوئی بھی کام شروع کرنے سے پہلے کسی عقلمند سے مشورہ کر لینا چاہیئے۔" آپ لاجواب ہو کر خاموش رہتے ہیں۔ آپ کی خاموشی کو رضامندی سمجھ کر وہ اپنا منصوبہ بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ اپنا کلیجہ تھام کر ان کا منصوبہ سنتے اور انھیں چائے ناشتہ سے نوازنے پر مجبور ہیں۔ اپنا منصوبہ "الف" تا "ے" بیان کر کے وہ آپ کی طرف داد طلب نگاہوں سے اور آپ رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا ہے۔ آپ ان سے معذرت کر کے دفتر کی راہ لیتے ہیں۔ شام کو آپ کے دفتر سے آنے کے قبل سے ہی مسٹر "م" ایک نیا منصوبہ لے کر حاضر رہتے ہیں۔ کیونکہ پچھلے منصوبے میں انھیں کچھ خامی نظر آگئی ہے۔ یہ سلسلہ گردش ایام کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے۔ اور آپ اپنی فطری شرافت کے طفیل منصوبہ ساز مسٹر "م" کو جھیلتے رہنے پر مجبور ہیں بصورت دیگر آپ پر غیر اخلاق اور خود غرض ہونے کی مہر لگ جائے گی۔

اپنے ایک منصوبہ ساز دوست سے جان بچانے کے لیے تو میں تین دفعہ مکان تبدیل کر چکا ہوں اور چوتھے مکان کی تلاش کر رہا ہوں۔ کرائے کا مکان تلاش کرنا کتنا مشکل کام ہے اس کا صحیح اندازہ داماد تلاش کرنے والوں کو ہی ہوتا ہے۔ داماد تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی شکل میں مل جاتا ہے کیونکہ بڑے بزرگوں کا کہنا ہے کہ کوئی بھی بیٹی بغیر "جوڑے" کے پیدا نہیں ہوتی۔ ہر بیٹی کا جوڑا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے تلاش کرنا شرط ہے۔ لیکن کرائے کے مکان کے سلسلے میں کسی دانشور، مفکر یا لیڈر نے یہ نہیں کہا ہے کہ ہر خواہش مند کے لیے کرائے کا مکان کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے تلاش کرنا شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ کرائے کا مکان تلاش کرتے کرتے جوان سے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور مکان کے بجائے قبر کی جگہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ کرائے کا مکان تلاش کرنے کی سزا مجھے اپنے منصوبہ ساز دوست کو جھیلنے سے آسان معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میں نیا مکان تلاش کر کے نہایت ہی خاموشی سے منتقل ہوتا ہوں کہ میرے منصوبہ ساز دوست کو اس کی بھنک بھی نہ لگے لیکن سرکاری جاسوس کتے کی طرح سونگھتے ہوئے وہ نئے مکان تک پہنچ جاتے ہیں اب تو مجھے یہاں تک یقین ہو گیا ہے کہ سرکاری جاسوس کتا دھوکہ کھا سکتا ہے لیکن میرے منصوبہ ساز دوست دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ پھر بھی میں نئے مکان میں منتقل ہونے کے لیے مجبور رہتا ہوں کم از کم چند دنوں کے لیے تو ان سے چھٹکارا مل ہی جاتا ہے اور آپ تو یہ جانتے ہی ہیں کہ راحت کا چند لمحہ بھی اذیت ناک صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

میرے ایک واقف کار تو اپنے جھوٹ رفتار نت نئے منصوبہ سازی کے طفیل باضابطہ طور پر "علامہ منصوبہ" بن گئے ہیں اور اب اپنے اصلی نام علامہ گرگٹ کے بجائے علامہ منصوبہ کے نام سے ہی جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ نئی پود علامہ منصوبہ کو پیدائشی علامہ منصوبہ سمجھتی ہے لیکن پرانے لوگ جو "دریائی غذا" کھانے، حوادث زمانہ یعنی حیوان صفت انسانوں کی حیوانی خصلتوں پر قربان ہونے، ماہ و سال کے زہر آلود خنجر اور حضرت ملک الموت کی عدم توجہی کے سبب محفوظ اور زندہ سلامت ہیں اور اب آثار قدیمہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں کہ علامہ منصوبہ نقلی چہرے کا نام ہے۔

اصل چہرے کا نام علامہ گرگٹ ہے جو نقلی چہرے کے پیچھے اس طرح روپوش ہے جس طرح اسمگلنگ جرم [illegible]
قانون کی نگاہوں کے سامنے ہنستے ہنستے بھی کاغذ کے پہرے توڑوں کے طفیل فائل میں [illegible] سے روپوش
درج ہوتے ہیں۔ "قلم بدگوار" قسم کے ایک بزرگ کا حلفیہ بیان ہے کہ علامہ منصوبہ کی حقیقت علامہ گرگٹ سے
بھی بڑھ کر ہے۔ یعنی علامہ منصوبہ کی طرح علامہ گرگٹ بھی مصنوعی غول ہی تھا جو ان کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے
کی فطرت کے سبب دورِ حاضر کے "ڈسکو" کی طرح مشہور ہو گیا تھا اور ان کا اصلی چہرہ علامہ گرگٹ کی گرد میں روپوش
ہو گیا تھا جس طرح بڑے اسمگلروں اور بڑے مجرموں کی فائل پولیس اسٹیشن کے ریکارڈ روم میں فائلوں کے انبار
میں روپوش ہو جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ منصوبہ سازی سے سہل اور خوشگوار کوئی دوسرا فعل نہیں۔ زندگی کے ایام کو خوشگوار بنانے کے لیے اس سے بہتر اور کم خرچ بلکہ بغیر خرچ کا کوئی نسخہ نہیں۔ اس کی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نہ آخری منزل۔ آپ چاہیں تو پلک جھپکتے ہی ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی بلند اور براعظم ایشیاء سے لمبا چوڑا منصوبہ بنا سکتے ہیں، آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں۔ پہاڑ سے دودھ کی نہر نکال سکتے ہیں، فلک بوس عمارت تعمیر کر سکتے ہیں۔ امریکی حکومت کی مسند صدارت پر رونق افروز ہو سکتے ہیں، ملکۂ حسن کے سر کا تاج بن سکتے ہیں، محمد علی کلے کو پچھاڑ سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اگر آپ کسی ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہیں، اگر آپ کے دل کو اپنی ناخلف اولاد سے کوئی صدمہ پہنچا ہے یا اگر آپ اپنی محبوبہ کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہیں، اگر آپ اپنے دوستوں کے رویے سے نالاں ہیں تو اسے بھولنے کا واحد علاج منصوبہ سازی ہے۔ ان کے خلاف آپ کوئی منصوبہ بنانا شروع کر دیجئے۔ اس کی روشن کرن آپ کے تاریک دل کو منور کر دے گی۔ غم کی خاردار جھاڑیوں میں خوشیوں کے خوشبودار پھول کھل اٹھیں گے۔ آپ کا قد بلند ہو جائے گا۔ آپ خود کو دوسروں سے برتر محسوس کرنے لگیں گے۔

سائنسدانوں کے ایجادی نظریات سے قطع نظر دور اندیشوں، دانشوروں اور مفکروں کی متفقہ رائے ہے کہ منصوبہ سازی ایک آسمانی فعل ہے۔ اس دنیا کا وجود خدا کی منصوبہ سازی کا ہی مظہر ہے۔ منصوبے کے تحت ہی حضرت آدم کو شجرِ ممنوعہ کھلایا گیا اور انسان کے پیچھے شیطان مسلط کیا گیا۔ چرندے، پرندے، درندے، انسان غرض تمام مخلوقات کو خدا نے ایک ضابطہ منصوبہ بنا کر اس کے تحت پیدا کیا۔ جمادات، نباتات، سمندر، پہاڑ وغیرہ خدا کے بنائے ہوئے منصوبے کے ہی منہ بولتے پیکر ہیں۔ اس کائنات کا سب سے بڑا منصوبہ ساز خدا ہے۔

کہتے ہیں کہ آزادی کے طفیل اجتماعی حالات میں ہی نہیں بلکہ انفرادی زندگی میں بھی بہت سی خوشگوار (بعض کے نزدیک ناخوشگوار) تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ محمود اور ایاز بقول شاعر ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

پہلے دودھ میں پانی کی ملاوٹ ہوتی تھی لیکن آزادی کے بعد اسے فرسودہ فعل سمجھ کر ترک کر دیا گیا اور پانی میں دودھ ملانے کی آزادانہ روش کا رواج دیا گیا۔ آزادی کے چمتکار نے رشوت کو تحفہ اور بے حیائی کو فیشن بنا دیا۔ اس سے قطع نظر [illegible] غلامی میں [illegible] محض [illegible] داخل تھیں تدبر آزادی میں [illegible] شامل ہیں منصوبہ سازی کی حقیقت بلکہ عادت بن چکی ہے۔ [illegible] غلامی میں ہی ہمارا محبوب مشغلہ منصوبہ سازی تھا اور بعد آزادی بھی ہمارا محبوب مشغلہ منصوبہ سازی ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو ہماری آزادی بجائے منصوبہ سازی کا ہی مرہونِ منت ہے اور اس وقت تک ہم آزادانہ

جب تک منصوبہ سازی ہمارا شیوہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد ہماری عزت مآب [illegible] سرکار نے پہلی عارت پنچ سالہ منصوبہ نامی کی بنائی اب یہ عمارت سرکار کی محنت اور خدا کے فضل و کرم سے سات منزلہ ہو چکی ہے۔ ایک جھوٹ سے دس جھوٹ جنم لینے کی بات کو کچھ لوگ مبالغہ سمجھتے ہیں لیکن اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ پنچ سالہ منصوبہ کے بطن سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں ننھے منصوبے جنم لے چکے ہیں ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔ تعلیمی منصوبہ، صنعتی منصوبہ، زراعتی منصوبہ، خاندانی منصوبہ، یہ منصوبہ، وہ منصوبہ . . . .

خاندانی منصوبہ بندی پر یاد آیا دو بچوں کا باپ بننے کے بعد خاندانی منصوبہ بندی کے مشہور نعرہ "ہم دو ہمارے دو" سے متاثر ہو کر ایک صاحب نے اپنی نس بندی بہ الفاظ دیگر آپریشن کرا لیا۔ چند مہینوں کے بعد بیوی نے انھیں یہ خوشخبری سنائی کہ "آپ تیسرے بچے کے باپ بننے والے ہیں"۔ انھیں سخت حیرت ہوئی کہ آپریشن کے بعد بھلا میں تیسرے بچے کا باپ کیسے بن سکتا ہوں۔ دوڑے ہوئے ڈاکٹر کے پاس گئے اور اسے سخت سست کہنے لگے جب وہ اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ چکے تو جہاں دیدہ ڈاکٹر نے نہایت سنجیدگی سے کہا "دیکھئے جناب میں نے آپکا آپریشن کیا ہے تمام اہلِ محلہ کا نہیں۔" سنا ہے کہ موصوف اب خاندانی منصوبہ بندی سے تائب ہو کر تیسرے بچے کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

منصوبہ سازی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی اکثر سرکاریں اپنے بیش قیمت وقت کا زیادہ حصہ منصوبہ سازی جیسے مفید اور کارآمد کام میں صرف کرتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ تمام محکمے دن رات نت نئے منصوبہ سازی میں مصروف رہتے ہیں ہر سرکار کے پاس باضابطہ طور پر ایک محکمۂ منصوبہ سازی بھی ہوتا ہے تاکہ اس کی منصوبہ سازی مہم میں کہیں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

اگر آپ کو پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اناج نہیں ملتا تو آپ گھبرائیے مت، سرکار کا محکمہ اناج، اناج کی فراہمی کے لیے منصوبہ سازی میں منہمک ہے۔ اگر آپ کو تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا میسر نہیں تو صبر کیجئے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے سرکار کا محکمہ پوشاک پوشاک مہیا کرنے کی منصوبہ سازی میں دن رات ایک کیئے ہوا ہے۔ اگر آپ غریبی کی چکی میں پس رہے ہیں تو بھلا اس میں سرکار کا کیا قصور ہے سرکار تو "غریبی ہٹاؤ" کی منصوبہ سازی میں مصروف ہی ہے۔ نوکری، چینی، تیل، پانی، روشنی، سڑک، سواری غرض کہ تمام ضروریات زندگانی سے آپ کو مستفید کرنے کے لیے سرکار کی مختلف وزارتیں اور مختلف محکمے کے اربابِ حل و عقد غیر ملکی شراب پی پی کر اور ملکی پھل کھا کھا کر منصوبہ سازیاں میں مصروف ہیں۔ "دیر آید درست آید" کے اگر آپ قائل نہیں تو چولہے بھاڑ میں جائیے سرکار کا کیا بگڑتا ہے سرکار تو اس بات کی قائل ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔

فسادات ہوتے ہیں۔ اخبار میں شاہ سرخیوں میں شائع ہوتا ہے "یہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہوا ہے"۔ رہنماؤں کے بیانات جاری ہوتے ہیں "اس کی منصوبہ بندی بہت پہلے سے ہو رہی تھی"۔ ریڈیو چیختا ہے "یہ بسیویں کا منصوبہ بند کا نتیجہ ہے"۔ عوام میں چہ میگوئیاں ہوتی ہیں "یہ سب ایک منصوبہ کے تحت ہوا ہے"۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں اس میں بُرائی ہی کیا ہے؟ فساد خواہ منصوبہ بند طریقے سے ہو، منصوبہ بندی کا نتیجہ ہو یا کسی غیر معمولی واقعہ یا حادثہ کا رہینِ منت، فساد ہی رہے گا شطرنج یا کرکٹ کا کھیل نہیں بن جائے گا۔ حالانکہ شطرنج یا کرکٹ کا کھیل بھی بغیر منصوبہ بندی کے ممکن نہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے کہ آپ کے ملک میں کم از کم ایک منصوبہ پر عمل درآمد ہوتا ہے خواہ . .

فسادی کیوں نہ ہو۔

آپ نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ "بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں بھی سبحان اللہ"۔ سرکار کا تو کام ہی منصوبہ سازی ہے کیونکہ منصوبہ سازی کو الگ کر دیا جائے تو پھر سرکار کا کام ہی کیا رہ جائے گا لیکن وہ پرائیویٹ ادارے جو عمل کے دعویدار ہیں وہ بھی تو دن رات منصوبہ سازی میں مبتلا رہتے ہیں اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آئے تو انجمن ترقی اردو، اردو اکادمیوں اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔

منصوبہ سازی ذہنی بالیدگی کی علامت ہے۔ ایک نئی دنیا، ایک نئے ماحول اور ایک نئے سماج کی تعمیر و تشکیل منصوبہ سازی کے بغیر ممکن نہیں۔ منصوبہ بندی کے بغیر کوئی عملی قدم اٹھانا ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں تیر چلانا یہی وجہ ہے کہ آج ہر شخص منصوبہ سازی میں لگا ہوا ہے۔ میں نے تو یہ مضمون ایک باضابطہ منصوبہ کے تحت ہی لکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسے ایک خاص منصوبہ کے تحت ہی پڑھیں گے کیونکہ منصوبہ بندی یا منصوبہ سازی مجھے بھی عزیز ہے اور آپ کو بھی ــــ اور آخر میں مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس دنیا کی منصوبہ سازی کم نہ ہوگی افسوس ہم نہ ہوں گے!

△△

"غزل کیسے ہو"

نٹ کھٹ عظیم آبادی

دال روٹی کا ہو پھیرا تو غزل کیسے ہو
روز بیگم سے ہو جھگڑا تو غزل کیسے ہو
گھر ہو میدانِ وغا کا تو غزل کیسے ہو
سر پہ جھاڑو کا ہو سایہ تو غزل کیسے ہو
روز بگڑا رہے معدہ تو غزل کیسے ہو
ہو اجابت نہ خلاصہ تو غزل کیسے ہو
رات ہے مشقِ سخن کے لیے موزوں لیکن
اٹھ کے رونے لگے بچہ تو غزل کیسے ہو
چین سے بیٹھ کے کچھ فکر کا موقع تو ملے
آئے سر پہ کبھی سالا تو غزل کیسے ہو
کھا گئی میری جوانی کو معاشی الجھن!
پاس آئے نہ وہ پیرا تو غزل کیسے ہو
رات بھر خرخرہ بیگم کا بجائے باجا
دن کو دفتر کا ہو پھیرا تو غزل کیسے ہو
درِ محفل پہ کھڑے رہتے ہیں استاد حضور
دیں نہ اجرت سے جو حصہ تو غزل کیسے ہو
شعر کہنے کے لیے چاہیے [illegible]
[illegible] تو غزل کیسے ہو

غزل

شاطر گورکھپوری

جاناں کی ڈانٹ سے نہ پتا کے شراب سے
ڈرتا ہوں میں تو صرف حسینوں کے باپ سے

بلی کی طرح لاکھ وہ گزریں دبا کے پاؤں
میں سونگھ لیتا ہوں انھیں قدموں کی چاپ سے

پہلے تو ماں کی کوکھ سے لیتی تھی یہ جنم
تہذیب ڈھل کے آتی ہے اب ورکشاپ سے

اللہ بچائے ہم غم جاناں کے ماروں کو
ملا کی پھونک جھاڑ سے پنڈت کی جاپ سے

تھوڑی سی لفٹ دی جو ذرا وقتِ گفتگو
وہ بدزبان "تم پہ" اُتر آیا "آپ" سے

ملتے کہاں ہیں شیخ جی اب خانقاہ میں
فرصت کہاں بچارے کو طبلے کی تھاپ سے

شک ہو تو آکے شہر محبت میں دیکھئے
دل کی ٹرین چلتی ہے آہوں کی بھاپ سے

سازِ گلو پہ جب بھی غزل چھیڑتا ہوں میں
الّو بھی جھوم اُٹھتے ہیں میری الاپ سے

شاطر بس اپنی دُھن میں چلے جا رہا ہوں میں
مجھکو کوئی غرض ہے نہ پُن سے نہ پاپ سے

○

قطعات

(۱)

سب سمجھتے ہیں کہ اک اخلاص کا پیکر ہیں ہم
کم ہیں جو یہ جانتے ہیں فتنۂ محشر ہیں ہم
فارٹی ٹو[42] تک تو نمبر دس میں اپنا نام تھا
فارٹی سیون[47] سے پولیٹیکل سفرر ہیں ہم

POLITICAL SUFFERER

(۲)

یہ کہہ دے جاکے کوئی ڈارون سے
کہ تھیوری آپ کی مہمل ہے استاد
یہ انساں خصلتاً الّو نہ ہوتا
جو ہوتا فطرتاً بندر کی اولاد

THEORY.

ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی

اِن سے ملیئے: یہ ہیں اعداد

"ایک" خاندانِ اعداد کا باوا آدم ہے۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں مکمل۔ اپنے وجود کی تکمیل کے لیے اس میں کسی دوسرے عدد کی شمولیت کی ضرورت نہیں۔ یہ بنیادی عدد ہے۔ باقی اعداد اسی سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ جہاں ابتدا کی علامت ہے وہیں انتہا کا نشان بھی ہے — — — — — — — — یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ "ازل" اور "ابد" کی شروعات پہلے حرفِ تہجی سے ہوتی ہے جو شکل میں ہو بہو عدد "۱" (ایک) کی طرح ہے جس کے علامتی معنی اکیلا کے ہیں۔ تاج محل کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے کہ اس جیسی عمارت دوسری نہیں۔ والدین اکلوتے بچے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ کوئی بھی غلطی پہلی مرتبہ قابلِ معافی سمجھی جاتی ہے۔ پہلی دھار کی شراب اور پہلی نار کا جواب نہیں۔

ایک تنہا ہے۔ تنہائی کا اپنا مزہ ہے۔ عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی تنہائی نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں لیکن کہاوتوں کی بھی اپنی سچائی ہے کہ ایک چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ یا یہ کہ ایک انار سو بیماروں کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم ایک کو اکیلا چھوڑ کر کہ اسے تنہا رہنے کی عادت سی ہے، آگے بڑھتے ہیں اور عدد دو کی ... کرتے ہیں۔ ایک سے پہلے دو، اس فرد ... نے عدد دو کو جنم دیا۔ محبت، عداوت، لگاوٹ، تفاوت، ... مصالحت، بغاوت، شجاعت، تجارت اور ملامت کے لیے دو ہوں تو بات بنتی ہے۔ دو انسانوں کی ذہنی ہم آہنگی کا اظہار مقصود ہو تو کہیئے وہ دونوں ایک اور ایک گیارہ ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کا نعرہ ہے "پہلا ابھی نہیں دو کے بعد کبھی نہیں" دو کے بارے میں دو دو باتیں ہو گئیں اب ملیئے تین سے۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں ... زندگی کی گرداب ... دے رہی ہے۔ وہ دن لد گئے جب عاشق نامراد دونوں جہاں کہیں محبت میں ... تھا۔ اب ایسے ... جہاں ہارنے چلے گئے وہ تینوں جہاں کہیں گے اس کا جذبۂ عشق ہے خام ... محبت کرنیوالوں کو جدا کرنے والا۔ دو کو تلاش کرنے والا تیسرا شخص فلمی زبان میں ولن ہوتا ہے ... منظر میں ... چال کی یہ کہاوت کہ "تین تیرہ نو اٹھارہ" بڑی معنی خیز معلوم ہوتی ہے ...

تیسرے شخص کی موجودگی میں بنا کام بگڑ جاتا ہے۔ بعض معاملات میں تین کا عدد فیصلہ کن واقع ہوتا ہے۔ [illegible] تین مرتبہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ تیسری عدالت سپریم کورٹ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔ دوسرے چند معاملوں میں بھی اس عدد کی اہمیت مسلّم ہے۔ جادوگر اپنا منتر تین بار پڑھتا ہے۔ خاص انعامات ہوتے ہیں تین۔ امریکہ میں تین بار عدم قتل کردیا جاتا ہے۔ تین بڑا ماہر RUNNER ہے۔ تمام دوڑنے والے اس کے بعد دوڑتے ہیں۔ [illegible] سے آگے نکل جانا کسی بھی دوڑنے والے کے لیے ممکن نہیں۔ وقت جو کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ گھڑی کی تین سوئیوں پر انحصار کرتا ہے۔ ان میں سے ایک سوئی بھی گم ہو جائے تو وقت پر بُرا وقت آجائے گا۔ تین بار اپنی لنگراتا ہے۔ اور آجایئے عدد چار پر۔ چار انجمن آرائی کا ماہر ہے۔ جہاں چار یار جمع ہو جاتیں، محفل جم جائے گی۔ یہ اجتماعی تخریبی قوت بن کر ابھرتا ہے یا تعمیری، اس بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں تو سب بس ایک ہی جذبے میں سرشار ہوتے ہیں کہ جو چار کی وہی یار کی۔ جب چار یار پاس نہ ہوں تو آدمی خود کو بے چارہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ زندگی چار دن کی ہے۔ اس لیے تنگئ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم چار کا قصّہ یہیں ختم کرتے ہیں اور پانچ سے ملاقات کرتے ہیں۔ پانچ کا عدد تقدس لیے ہوئے ہے۔ آرٹسٹ اسے انسانی دل کی علامت کی طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دل ایک مندر ہے جہاں بھگوان بسیرا کرتا ہے۔ اس کی شکل پیپل کے پتے کی سی ہے۔ سادھو سنتوں نے [illegible] درخت کے سائے میں تپسیا کرنے کو ترجیح دی۔ "پنچ" میں پرماتما بستے ہیں۔ پانچ دریاؤں نے پنجاب کو پنجاب بنایا ورنہ یہ دو آبہ بھی ہو سکتا تھا۔ پانچ دریاؤں نے پنجاب کو سرسبز و شاداب کردیا اور پنجابیوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں تر بہ تر ہو گئیں۔ مسلمان پر پنج وقتہ نماز فرض ہے پانڈوؤں نے کوروؤں کی شکست فاش دے کر عدد پانچ کو اتحاد کی قوت کی علامت بنا دیا۔ حواس ہیں پانچ۔ نہیں صاحب ہم تین پانچ نہیں کر رہے ہیں ہم مانتے ہیں کہ چھٹی حس بھی کوئی چیز ہے۔ اپنے حواس بجا رکھیئے اور ملیئے عدد چھ سے۔

چھ متنازعہ عدد ہے۔ مگر کرکٹ میچ میں جو کھلاڑی چھکا لگاتا ہے اسے مَردوں کا مَرد سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو بچہ دو برس تک ماں کا دودھ پیتا ہے۔ مگر چھٹی کے دودھ کی اپنی اہمیت ہے۔ ششماہی امتحان طلباء کو سالانہ امتحان کے لیے تیار کرتا ہے۔ عدد ۲ سے اس کا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ ان دونوں اعداد کو آمنے سامنے رکھ کر (۲۶) انسانوں کے مزاجوں کے تضاد کو بخوبی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ سات آرام طلب ہے۔ جب دیکھئے لیٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ہے بڑا گنی۔ اس نے سنگیت کو سات سُر دیئے، زندگی کو موسیقیت بخشی۔ دھنک کی خوبصورتی اِسی کے دم سے ہے۔ ایک بھی اگر کم ہو جائے تو دھنک اپنی کشش کھو بیٹھے۔ حاتم طائی کی شہرت میں "سات سوالوں" کا بڑا حصّہ ہے۔ آٹھ کا عدد پنڈت نہرو کے اس قول کی تفسیر ہے کہ آرام حرام ہے۔ ہمیشہ پہرے دار کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ عموماً چار اور چار آٹھ ہوتے ہیں۔ عدد نو اپنی مثال آپ ہے۔ ۹ کا پہاڑہ شروع سے آخر تک پڑھتے جایئے اور آنے والے اعداد کو جمع کرتے جایئے تو حاصل جمع نو ہی آتا ہے۔ جیسے نو دو نے اٹھارہ (۹=۸+۱) یہ بڑا استاد عدد ہے۔ اس نے بیوپاریوں کو یہ بنیادی بات سمجھائی کہ نو نقد نہ تیرہ ادھار۔ عدد "نو" نے مجرموں کو سمجھایا کہ موقع ملے تو نو دو گیارہ ہو جانا چاہیئے۔ [illegible] سبق پڑھایا کہ نو من تیل ہوتے پر ہی ناچنا چاہیئے۔

عدد دس کی ساری قوت صفر میں ہے۔ جو بظاہر بے بضاعت معلوم ہوتا ہے۔ صفر کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہو تو عدد دس کو دیکھئے۔ صفر تنہا کچھ بھی نہیں لیکن جب ایک سے جڑتا ہے تو ایک سے [illegible]

ذہنیت اور فکر کی طاقت کا لوہا مان کر اس کے آگے پانی بھرنے لگتے ہیں۔ موتیوں کے ہار کو لے لیجئے۔ محقق [illegible] اس دور کو آپ فراموش نہیں کر سکتے جس نے موتیوں کو پرو کر ہار کی شکل عطا کی۔ اس کے بغیر ہار کا تصور بھی ممکن نہیں۔ یہی حال صفر کا ہے جو عدد نہ ہوتے ہوئے بھی ۹ اعداد سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہیں تو صفر دنیا کو ہندوستان کی دین ہے!

□□

"خوشہ لان جودھپور" کا خصوصی جلسہ

"راجستھان اردو اکیڈیمی" جے پور اور "خوشہ لان جودھپور" کے مشترکہ تعاون سے لاچو میموریل کالج آف سائنس جودھپور میں ایک بزم مزاح کا اہتمام کیا گیا۔ جلسہ کے مہمان خصوصی عالیجناب منظور داس ماتھر سابق منسٹر مالیات حکومت راجستھان تھے۔ صدارت جناب خداداد مونس (ممبر مجلس عاملہ راجستھان اردو اکیڈیمی) نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض خوشہ لان جودھپور کے سیکریٹری جناب مدن موہن ماتھر نے انجام دیئے۔ خوشہ لان جودھپور کے صدر جناب پروفیسر پریم سروپ سریواستو اور راجستھان اردو اکیڈیمی کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی اس تقریب کے مہمانان خصوصی تھے۔

خوشہ لان جودھپور کے صدر نے سامعین کو جودھپور کی انجمن مزاح کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد سے روشناس کروایا۔ اس خصوصی بزم مزاح کے پروگرام کا آغاز خداداد مونس کے مقالے بعنوان "جے پور کے ادبی نوادرات" سے ہوا۔ ڈاکٹر عثمانی نے جے پور کے مزاح گو شعراء کا ذکر کیا اور غالب کی ایک مشہور غزل کا ترجمہ راجستھانی زبان میں بقلم یوسف جھنجھنوی) پیش کیا۔ اس تقریب میں اردو، ہندی، اور راجستھانی زبان کے مزاح نگاروں نے اپنی تخلیقات نظم و نثر اور لطیفہ بازی سے فضا کو خوشگوار بنا دیا۔

"خوشہ لان جودھپور" کی تشکیل اپریل ۱۹۸۵ء میں عمل میں آچکی تھی، اور یہ عالمی مزاح کانفرنس منعقدہ بہ اہتمام زندہ دلان حیدرآباد فروری ۱۹۸۵ء کی ایک تجویز (ہر ریاست میں ایک بزم مزاح قائم کیے جانے کی) کی فوری تعمیل میں کیا گیا تھا۔ اب تک اس انجمن مزاح کی پندرہ نشستیں ہو چکی ہیں۔ ممبران کی کل تعداد چالیس ہے۔ عہدے داران کے اسمائے گرامی ہیں:

سرپرست : جسٹس بی۔ پی۔ بیری
پروفیسر وی۔ وی۔ جان
بانی نائب صدر : سابق [illegible] سمپت راج سنگھی
بانی جنرل سیکریٹری : جگت پرکاش ماتھر آر۔ اے۔ ایس
سیکریٹری : پروفیسر مدن موہن ماتھر
خازن : دیو شدر ناتھ گرگ

پتہ: سی۔ 205 کملا نہرو نگر، جودھپور - 342008

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
(تروپتی)
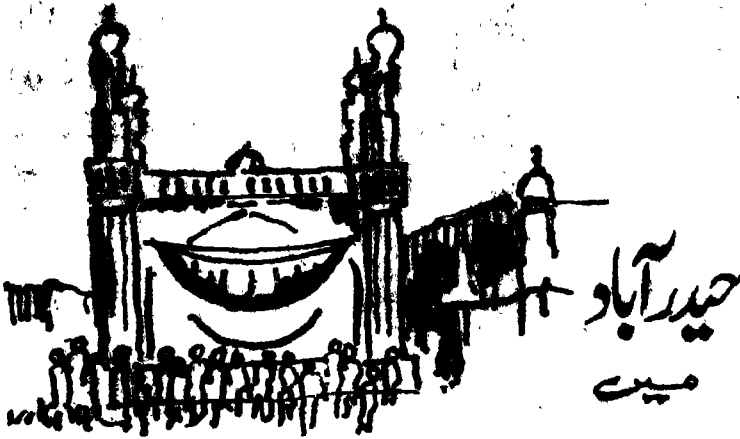
حیدرآباد میں طنز و مزاح آزادی کے بعد

حیدرآباد میں طنز و مزاح کے لئے فضاء ہمیشہ سازگار رہی۔ کبھی طنز کے لئے زیادہ اور کبھی مزاح کے لئے۔ ۱۹۴۷ء تک سیاسی منظرنامہ گھٹن کا شکار تھا۔ سربراہِ مملکت مطلق العنان تھے اور ہر سمت ایک مخصوص فضاء چھائی ہوئی — لہٰذا طنز و مزاح کا عنوان سیاست بھی کم ہی اور سیادت بھی! عموماً معاشرتی موضوعات ہی پر ہمارے طنز و مزاح نگاروں نے قلم اٹھایا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء تک حیدرآباد میں طنز، کیفیت اور کمیت، ہر دو زاویوں سے کم رہا اور مزاح کا پلّہ بھاری۔ فرحت اللہ بیگ، عظمت اللہ خاں، تمکین کاظمی، آوارہ، قاضی عبدالغفار، عصمت اللہ بیگ، صادق، جہاں بانو نقوی، آصف جہاں بیگم، ناکارہ، مرزا شکور بیگ، احمد حسین بیکتا اور ابراہیم جلیس جیسے ممتاز فنکار ملتے ہیں۔ ان میں ابراہیم جلیس نے تو بعد میں بھی لکھا اور خوب لکھا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد حیدرآباد سے ان کا تعلق برقرار نہیں رہا۔

۱۹۴۷ء بلکہ حیدرآباد کے تعلق سے ۱۹۴۸ء کہیئے۔ ۱۹۴۸ء سے حیدرآباد میں صرف نظامِ حکومت نہیں بدلا۔ معاشرت، ادب، صحافت اور تعلیم کے آداب بھی تبدیل ہونے لگے۔ گہرے منظر پھیکے ہوئے اور پھیکے منظر گہرے اور پس منظروں کو وسعت حاصل ہوئی۔ شاہی کی قدغن نہ رہی، جمہوری قدریں عام ہوئیں اور اظہارِ رائے کی آزادی ملی۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء کے بعد کے حیدرآباد کے بارے میں آپ خواہ کوئی رائے رکھیں، اپنے ناک نقشے اور خد و خال کے اعتبار سے یہ ایک نیا حیدرآباد تھا اور اس میں پیدا ہونے والا ادب نئے آب و گل سے برگ و بار لاتا اور نئے تقاضوں کا حامل نظر آتا ہے۔

ادب کے لئے لیکن خاص طور پر طنز و مزاح کے لئے اپنے اطراف و اکناف کی زندگی اور ماحول کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ان سے باخبری اور آگہی کے بغیر کوئی طنز و مزاح نگار اپنے فن سے انصاف نہیں کر سکتا۔ زندگی ایک پل ثبات نہیں، وہ ہر دم متغیر ہے۔ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار ان بے ثباتیوں، تغیرات اور تبدیلیوں کا نہ صرف مشاہدہ کرتا بلکہ انھیں محسوس بھی کرتا ہے۔ انھیں اپنی فکر کا جزو بناتا اور اپنے نظریہ کی تشکیل میں ان سے مدد لیتا ہے۔ ممکن ہے اور فنکار زندگی سے بے نیاز ہو کر زیست کر لیتے ہوں، اپنے

خیالوں کی دنیا بسا لیتے ہوں لیکن مزاح نگار سے ایسا ممکن نہیں۔ وہ اس دنیا سے فرار حاصل نہیں کر سکتا، اسی میں سانس لیتا اور اسی کو آباد کرتا ہے۔ یہی اس کی تقدیر اور یہی اس کی تدبیر ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد، حیدرآباد کے پس منظر میں خوشگوار اور ناخوشگوار طرح طرح کے واقعات تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کی باقیات، تقسیم ہند، ملک کی آزادی، سقوطِ حیدرآباد ــــــ اور پھر معاشی ابتری، کساد بازاری، ٹوٹتے بکھرتے اور بچھڑتے خاندان، تہذیبی قدروں کا زوال، فرقہ وارانہ فسادات، لسانی نقشے میں تبدیلی، اردو کا دیس نکالا، یہ اور ایسی کئی باتیں!

ــــــــــ ان حالات میں لوگ پاک مذہبی اور معاشرتی سطحوں پر اصلاحی تحریکات شروع کر دیتے ہیں۔ احیاء پسندی کے نام پر بھی سرگرمیاں جاری ہوتی ہیں اور کچھ سیاستداں اپنی مقصد براری کے لئے تہذیبی، اخلاقی اور سیاسی، کیا کچھ بازآباد کاری کے لئے تقریریں کرتے، بیان بازی میں معروف رہتے اور دم دلاسے دیتے ہیں جو اول بھی لیکن بالآخر تو یقیناً کھوکھلے ثابت ہوتے ہیں۔ یوں حیدرآباد میں بھی ہوا لیکن ایسے روبہ انحطاط معاشرے میں جہاں ہر قدر روبہ زوال ہو طنز و مزاح کے امکانات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ طنز وہ نہیں جو راست ہو کیونکہ طنز راست اور دو ٹوک ہو تو شعور پند ناصح بن جاتا اور مزاح جب بلاواسطہ ہوتا ہے اس کی سرحدیں پھکڑپن سے مل جاتی ہیں بلکہ ایسے مزاح نگار سرکس کے مسخرے لگتے ہیں۔ طنز کو مزاح کی جگہ میں چلنا چاہیئے تو مزاح کے لئے بھی طنز کو ہم رکاب رکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہر دو صورتوں میں طنز و مزاح راست نہ ہو بالواسطہ، اشارتی انداز میں اور کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے کی طرح ــــ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کا بڑا حصہ، رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس، ابراہیم جلیس اور ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی اور دلاور فگار وغیرہ کی بیشتر تخلیقات اسی ذیل میں آتی ہیں۔

حیدرآباد میں طنز و مزاح نگاروں کی کمی نہیں لیکن بالخصوص آزادی کے بعد تو اُن کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، ہوتا بھی ہے اور یہ تو شائد اصولِ فطرت ہے کہ جب تعداد میں اضافہ ہوتا ہے تو معیار عموماً محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی طنز و مزاح نگاروں کی تعداد فزوں ہونے کے باوجود ان کا معیار کچھ ایسا اونچا نہیں، بالعموم اوسط اور کہیں کہیں تو اوسط سے قدرے زیادہ! اور میں یہ صرف نثر کی حد تک عرض کر رہا ہوں۔ شاعری میں تو طنز و مزاح کا معیار اوسط سے کم، بے حد کم۔ کہیں کہیں تو پھکڑپن کا سا ــــ اس کی وجہ شائد یہ ہو کہ ہر فنکار بجائے اس کے کہ کسی عالی معیار کو اپنا مقصود بنائے اپنے ہی معیار کو وہ جیسا بھی ہے اونچا اور حرفِ آخر تصور کرتا ہے۔ اور جس طرح مشاعرہ باز شاعر، مشاعروں میں اپنی مقبولیت کی خاطر ادبی، علمی اور فنی معیارات سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں اور شہرت و مقبولیت کی خاطر سستی اور کم عیار شاعری پر قانع ہوتے ہیں۔ بیشتر طنز و مزاح نگار بھی عام ادبی جلسوں وغیرہ میں اپنی مقبولیت پر مفتخر ہیں ــــ ملک کی اردو اکیڈیمیاں اور دیگر اداروں کو خدا سلامت رکھے کہ جیسی تیسی کتابوں کی اشاعت کے لئے بھی نہ صرف جزوی مالی اعانت حاصل ہو جاتی ہے بلکہ اشاعت کے بعد انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے۔ اس طرح تیسرے اور چوتھے درجے کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہو یا نہیں ایسے درجے کی کتابوں کی اشاعت تو افزوں ہو ہی جاتی ہے۔ ہو بھی رہی ہے۔

طنز و مزاح نگار، حیدرآباد کے فنکار زندگی کے مختلف طبقوں اور معاشی و معاشرتی سطحوں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہاں رنگارنگی اور بوقلمونی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کے مختلف رنگوں کی کجیاں، ناہمواریاں اور بے ڈھنگا پن قارئین کے سامنے ہیں۔ بنیادی طور پر طنز و مزاح جن کا مزاج ہے اور جن طنز و مزاح نگاروں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ان کی گرفت کا اندازہ

یا، جن کے پاس اُردو کی ادبی روایات کا شعور ہے اور جو زبان و بیان پر قابو رکھتے ہیں و نیز جن کو معاشرے کا درد ہے اور معاشرتی اصلاح کے خواہاں ہوتے ہیں اُن کے ہاں طنز و مزاح نکھر گیا ہے، دلکش اور دلچسپ بھی محسوس ہوتا ہے اور مؤثر کا بھی۔ اس ۔ سے قطع نظر جنھوں نے زندگی کا یوں ہی سا مطالعہ کیا، اُردو ادب کی روایات سے بھی ایسے واقف نہیں اور زبان و بیان رموز سے بھی آگاہی نہیں رکھتے، اُن کے ہاں اِدھر اُدھر کوئی چنگاری ملتی ہو تو اور بات ہے ورنہ سب کچھ برائے نام ہے اور پھر ایسے صاحب بھی ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو غالباً اس لئے اختیار کیا کہ طنز و مزاح نگار کہلائیں، لوگوں کو ہنسائیں اور چونکہ طنز و مزاح کے باعث عوام میں آسانی سے مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے اس لئے شہرت پالیں۔ سچ تو یہ ہے ایسے افراد کی تحریروں "سے" نہیں، ایسے افراد کی تحریروں "پر" ہنسی آتی ہے۔ ان کی تحریروں کو رسائل میں بھی جگہ مل جاتی ہے، یہ اسٹیج پر بھی آجاتے ہیں اور جیسی تیسی ہی کتب بھی شائع کر لیتے ہیں لیکن طنز و مزاح سے اُن کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور تکلف برطرف! اُردو دنیا میں کئی ایسے لکھنے والے زیادہ ہیں اور حیدرآباد میں بھی ـــــ ظاہر ہے ایسے افراد کو قبولیت حاصل ہو جائے ان کو علمی و ادبی زاویوں سے طنز و مزاح نگاروں کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکے گی۔

طنز و مزاح میں زبان کا لطف لینا ہو تو رشید قریشی کے مضامین پڑھئے۔ زبان کے استعمال پر اُن کے جیسا ملکہ آج کے طنز و مزاح نگاروں میں تو کیا کسی کو حاصل ہے اُن کے ہمعصروں میں بھی بہت کم کے حصہ میں یہ دولتِ بیدار آئی ہے۔ خوبصورت، شستہ اور دھلی دھلائی زبان، کلاسیکی اندازِ بیان، لسانی قدروں کا رچاؤ، سارے نوک پلک درست۔ اور زبان و بیان کے رموز و آداب سے واقف! حیدرآباد کی تہذیب، یہاں کے طور طریقوں اور رسم و رواج کو اگر کسی نے دردمندانہ انداز میں، اپنائیت اور شائستگی کے ساتھ طنز و مزاح کا عنوان بنایا ہے تو وہ رشید قریشی ہیں۔ بے جوڑ شادیوں، جہیز، شادی بیاہ کے ایسے ہی موضوعات اور دیگر رسم و رواج پر رشید قریشی نے بڑے اچھوتے انداز سے قلم اٹھایا ہے اور پھر اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وظیفہ یاب زندگی کو جن نت نئے پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں وہ واقعی دلچسپ ہے۔ یہاں وہ، اپنے مضامین کے ہیرو، گویا آپ ہیں۔ سچ بھی یہی ہے کہ مزاح نگار کو اپنے مزاح کا ہیرو، خود آپ ہونا چاہیئے یعنی وہ اپنے مزاح کا نشانہ خود اپنی ذات کو بنائے اور اپنی ذات کے پردے میں دوسروں کو ـــ یہ ایک آرٹ ہی نہیں فنکار کی وسیع النظری، کشادہ قلبی اور عالی ظرفی کی علامت بھی ہے اور ایسا ہی مزاح بالعموم کامیاب ہوتا ہے۔ یوں قاری مصنف پر ہنستا ہے لیکن فنکار چونکہ اپنی ذات کے ـــــ پردے میں دوسروں کو نشانہ بنا رہا ہے تو گویا وہ فنکار پر نہیں اپنے آپ پر ہنس رہا ہے۔ رشید قریشی اسی وجہ سے اس نوع کے مضامین میں بہت کامیاب ہیں۔ وہ اپنی ذات پر ہنسنے کا ہنر جانتے ہیں۔

غیر معمولی احتیاط، ضرورت سے زیادہ رکھ رکھاؤ اور زبان و بیان پر خصوصی بلکہ حد سے فزوں توجہ کے باعث رشید قریشی کے مضامین میں کہیں کہیں کچھ زیادہ ہی سنجیدگی اور متانت آگئی ہے۔ ایسے ہی مواقع پر ان کا مزاح جہاں تہاں دب سا جاتا ہے اور بسا اوقات قاری / سامع لطف اندوز نہیں ہوتے۔ میں یہ عرض نہیں کر رہا ہوں کہ وہ اپنی تحریر کے ان اوصاف کو ترک کر دیں۔ ہاں وہ اپنے اسلوب کو نکھاریں لیکن زبان و بیان کو قدرے شگفتہ اور لچکدار بنائیں۔ جہاں جہاں اُن کے مضامین میں ایسا ہوا ہے، مزاح طرفگی کا حامل، کچھ اور دلنواز ہو گیا ہے۔ میں یہاں بس ایک اقتباس پیش کروں گا:

" آج گھوڑ دوڑ کا موسم ہے۔ گھوڑ دوڑ کا میدان مرکز کا میلان رہتا ہے۔ سبھی گھوڑے سکندرِ اعظم کے گھوڑے رخش کی طرح چاق و چوبند اور برقیلے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص اپنا پسند

> کے گھوڑے کی سفارش کرتا ہے اور اس ایقان کے ساتھ جیسے خود گھوڑے نے اپنی
> کامیابی کا راز اس کے کان میں پہنچایا ہو ۔"

زندہ دلانِ حیدرآباد کے سرپرست بھارت چند کھنہ نے مزاح نگاری کی ہے لیکن ایسی سنجیدگی اور احتیاط کے ساتھ کہ اُن کی تحریروں پر بسا اوقات انشائیوں کا گمان ہوتا ہے ۔ "اُلقلی پنجابی" اور " حیدرآباد ۔ امریکہ ۔ حیدرآباد " جیسے مضامین پڑھ کے "اُن" انشاپردازی کی داد دینے کو جی چاہے گا ۔ بات یہ ہے کہ انشائیہ نگاری اور طنز و مزاح ایک ہی تصویر کے دو رُخ نہیں بلکہ ایک ہی منظر کے دو حصے ہیں ۔ تاہم انشائیہ اور طنز و مزاح کے اپنے اپنے امتیازی پہلو بھی ہیں کہ ان دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ طور پر شناخت کی جاسکتی ہے ۔ مزاح نگار عموماً انشائیہ نگار ہوتا ہے لیکن انشائیہ نگار کے لئے مزاح نگار ہونا ضروری نہیں ، انشائیہ غیر مزاحیہ اور سنجیدہ بھی ہوسکتا ہے ۔ ہمارے بیشتر فنکاروں نے تحریر تو کئے انشائیے لیکن اُن پر چسپاں کردیا لیبل طنز و مزاح کا ۔ بھارت چند کھنہ کے مضامین کے مجموعہ " کیا نام نہ ہوگا " میں بیشتر انشائیے ہیں ۔ مزاح سے اُن کا تعلق واجبی واجبی سا ہے ۔ یہ اور یہ بات ہے کہ اُن کا شمار عمدہ انشائیوں کے ذیل میں کیا جاسکتا ہے ۔ ایک اور بات ذہن نشین رہے کہ طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری جو متوازی چلتے ہیں اُن کو متوازی ہی چلنے دیا جانا چاہیئے ۔ اس میں دونوں کی آبرو ہے ۔ فنکار کو اس ضمن میں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے ۔ اگر طنز و مزاح پر انشائیہ نگاری غالب آجائے تو وہ اچھا انشاپرداز بن جائے ۔ طنز و مزاح نگار نہیں بن پاتا ۔ اچھا ہونے نہ ہونے کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا ۔

بھارت چند کھنہ کے ہاں بھی انشائیے زیادہ ہیں اور عمدہ انشائیے ! لیکن بعض مضامین میں انھوں نے طنز و مزاح کی قوسِ قزح بھی کھلائی ہے کہ ساتوں رنگ نکھر گئے ہیں ۔ بھارت چند کھنہ کا سیاسی شعور ، اُن کے ہمعصر مزاح نگاروں کے مقابلے میں تیز ہے ۔ میں یہاں اُن کے مضامین سے اس سلسلے میں صرف ایک اقتباس پیش کروں گا ۔ امریکہ کے کبھی کے وزیرِ خارجہ مسٹر ہنری کسنجر کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " یہ ایک پاسنجر ٹرین ہے جو امریکہ سے چلتی ہے اور سوئز نہر سے گذرتی ہوئی
> چین چلی جاتی ہے ۔ "

وہ اصحاب جو ہنری کسنجر کی سیاست ، نہر سوئز کے بارے میں اُن کی حکمتِ عملی اور اُن کے خفیہ دورۂ چین کے بارے میں جانتے ہیں ، اس فقرے کی داد دیں گے ۔

اور اب دو ایک اقتباسات ، جو مزاح کے اچھے نمونے ہیں :

> " فرمانے لگے کہ آپ اس شخص کی تعریف کر رہے تھے جو دوسرا جنم لینے کا
> زندۂ جاوید ثبوت ہے کیونکہ ایک جنم میں انسان بیوقوفی کے اتنے اونچے
> درجے پر ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتا ۔"

> " نصیر احمق مردود (ایک شاعر) نے بی ۔ اے بن کر اس بات کا ثبوت
> دیدیا کہ اس نے بالآخر انگریزی زبان کے پہلے دو حروف پر عبور کامل حاصل
> کر لیا ہے اور وہ بھی اُلٹی طرف سے ۔"

خواجہ عبدالغفور نے اُردو میں طنز و مزاح کو ایک نئی جہت دی۔ لطیفہ گوئی ہمارے معاشرے میں قدیم سے ہے اور
لیفوں کی حیثیت سے وہ اپنی اکائی اور انفرادیت رکھتے ہیں یا بعض مزاح نگاروں نے جہاں تہاں لطیفوں کا سہارا لے کر اپنے
مضامین کو پُرلطف بنانے کی سعی کی، ظاہر ہے اول درجے کا مزاح تو اس طرح پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن خواجہ عبدالغفور نے لطیفوں
رنہ یہ کہ بطور اکائی استعمال کیا اور نہ اپنے مضامین میں دو چار لطیفوں سے کام لیا بلکہ اُن کا تو کاروبار ہی لطیفوں کا مرہونِ منت
ہے۔ وہ اپنے سارے مضمون میں صرف اور صرف لطیفوں سے کام لیتے ہیں یا یوں کہیئے وہ لطیفوں کی مالا پرو تے رہتے ہیں۔ بعض
لہ اُن کے ہاں لطیفے یوں جانِ مضمون ہو جاتے ہیں کہ انھیں مضمون سے جدا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ ایک آرٹ ہے۔
واجہ عبدالغفور کو اس طرح لطیفے جمع کرنے (اور بلاشبہ بہت انھیں گھڑنے بھی پڑے ہوں گے) میں کتنی دقت ہوتی ہوگی۔
یفوں کے انتخاب اور اُن کے مضمون میں استعمال کا طریقہ تو کوئی خواجہ صاحب سے سیکھے۔ لطیفوں کے اس استعمال کی وجہ سے اپنے
ب مضمون میں زینداولتھر نے خواجہ عبدالغفور کو "شہنشاہِ لطیفہ" سے موسوم کیا تو رشید قریشی کے الفاظ میں وہ "لطیفوں کی پھلواری"
ہ۔ ہاں ایک ہی لطیفے کو جہاں۔ وہ دو چار جگہوں پر کہیں نام بدل کر اور کہیں واقعہ میں تھوڑی سی تبدیلی کرکے استعمال کرتے ہیں،
بیت اُوب جاتی ہے۔

لطیفے بالعموم واقعات کے مرہونِ منت ہوتے ہیں لیکن کبھی واقعات کے باوجود الفاظ کے اُلٹ پھیر اور بات میں بات پیدا
نے سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے اُس سے لطیفے خوشگوار اور دلآویز ہو جاتے ہیں۔ ایسے لطیفہ گو یا لطیفہ نگار کم ہی ہوتے ہیں۔
جہ عبدالغفور کے ہاں لطیفوں میں یہ بانکپن بھی ہے اور بعض لطیفے تو واقعی دلچسپ ہیں۔ دو، ایک سناتا چلوں،

"ایک معمر خاتون بتا رہی تھیں کہ سلیم نامی شخص تھے اُن سے زبردست پیار جتایا تھا مگر
جب اُن کی شادی مجبوری کے تحت اُس سے نہ ہوسکی تو اُس نے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ مرجائیگا
سننے والوں میں سے کسی نے پوچھا، "تو پھر کیا ہوا؟ اُس نے خودکشی کر لی؟"
جی نہیں۔ خودکشی تو نہیں کی مگر کم بخت مرا ضرور۔ میری شادی کے کوئی (۲۰) سال بعد!"

-۲-

"ہماری دسویں سالگرہ پر بڑا اہتمام کیا گیا۔ ایک بڑا سا کیک اور دس موم بتیاں
آرڈر کی گئیں۔ چونکہ ہمارے بہت سارے دوست آرہے تھے ہم نے فرمائش کی کہ ایک موم بتی
اور دس کیک منگوائے جائیں!"

لطیفوں سے قطع نظر خواجہ عبدالغفور کے ہاں مزاح نہ ہونے کے برابر ہے۔ انھوں نے اس سمت شاید توجہ بھی نہیں کی ہو۔ اُن کے
مین پڑھتے جائیے یا تو لطیفے ملیں گے یا اُن لطیفوں کے مابین تسلسل پیدا کرنے کے لیے دو، ایک جملے۔ طنز و مزاح اس سے ہٹ کر
ہی۔ اُن کے کئی مضامین کے مطالعے کے بعد میں ایسا ایک ہی اقتباس پیش کرسکتا ہوں،

"طعام خانے یا بھٹیار خانے ایسی جگہ ہیں جہاں سے صفائی کوسوں دور ہوتی ہے۔ پاکیزگی
اور طہارت سے وہ ایسے مُبرّا ہوتے ہیں جیسے آج کل کے ہپّی۔"

خواجہ عبدالغفور نے طنز و مزاح پر تحقیقی اور تالیفی کام بہت کیا ہے اور یہی اُن کا کارنامہ ہے۔
یوسف ناظم کے مضامین سننے سے نہیں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ...

انی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید کے نتیجے میں وہ بمبئی میں مقیم ہیں لیکن جامعہ عثمانیہ کے باعث حیدرآباد سے انھیں خاص ہے بلکہ میں یہ کہوں کہ حیدرآباد اُن کی کمزوری ہے ۔ یوسف ناظم ، جامعہ عثمانیہ کے طالب علم اس دور میں رہے جو جامعہ عثمانیہ کا عہد زریں تھا ۔ حیدرآباد ہی میں نہیں ، ساری اُردو دنیا میں نکہتوں اور روشنیوں کا دور ! یوسف ناظم نے اس دور کے حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کی یادوں کو آج بھی اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے ۔ اُن کے بعض مضامین تو اچھی خاصی حیدرآباد ڈائرکٹری لگتے ہیں ۔ حیدرآباد کے محلے ، اشیاء ، ادارے ، افراد ، بازار اور غذائیں اُن کے مضامین میں جیتے جاگتے ملتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے طنز سے کام کم ہی لیا ہے لیکن مزاح کی چاشنی سے اپنے مضامین کو پرلطف بنادیا ہے ۔ مخدوم محی الدین کے بارے میں اُن کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

" مخدوم بڑی ملٹی پرپز قسم کی اشیاء میں سے ہیں ۔ وہ شاعر بھی ہیں اور لیڈر بھی ۔
عاشق بھی ہیں اور محبوب بھی ۔ خادم بھی ہیں اور مخدوم تو خیر ازل ہی سے ہیں ۔ وہ اس
ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی طرح ہیں جس میں ہر شخص کو اپنے مطلب کا سامان مل جاتا ہے ۔ "

لیکن یوسف ناظم کے ہاں طنز کی بھی کمی نہیں بلکہ طنز و مزاح کے نہایت متوازن اور معتدل امتزاج کے باوجود ، کسی حد تک اُن کے ہاں طنز زیادہ ہی ہے اور طنز پیدا ہوتا ہے غور و فکر سے ۔ یوسف ناظم نے اپنے مضامین میں غور و فکر سے خاصا کام لیا ہے وہ اپنے قارئین سے بھی غور و فکر کے متقاضی ہوتے ہیں ۔ ان کے مضامین سے لطف اندوز ہونا ہر کہہ و مہہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے ، قارئین کی بھی علمی حیثیت ہونی چاہیئے ۔ یوسف ناظم کہتا ہے جتنا وقت لکھنے پر صرف کرتے ہیں ۔ اس سے زیادہ کیا لکھیں ؟ اور کیسے لکھیں ؟ — غور کرنے پر صرف کرتے ہیں ۔ یوسف ناظم کے یہاں وہ جو ایک آمد کی کیفیت ملتی ہے وہ یوں ہی نہیں ، ذوق و شوق اور ایک عمر کی مشق و مزاولت کے بعد ہاتھ آتی ہے ۔ اسی باعث اُن کا فن بھی چلتا چلاتا نہیں بڑا گہرا اور کاری ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی تو بے رحم بھی ! کسی تکلف اور پاس و لحاظ کے بغیر وہ وار کر جاتے ہیں ۔ یہی اوصاف طنز نگار کی فکری وسعت ، اس کے غیر معمولی معاشرتی شعور اور اپنے فن پر اعتماد کی غمازی کرتے ہیں ۔ اس طرح فن تہہ دار معنویت کا حامل ہوتا ہے ۔ بات آج کی تعلیم اور نظام تعلیم کی ہے لیکن کتنی اور کیسی گہرائی لئے ہوئے :

" کچھ لوگ شوقیہ بھی علم حاصل کیا کرتے تھے کہ چلو کوئی اور مصروفیت نہیں ہے تو
علم ہی حاصل کرو ۔ اب شوقیہ تعلیم کا زمانہ ختم ہوگیا ۔ یہ لازمی تعلیم کا زمانہ ہے ۔
شوقیہ تعلیم سے عالم پیدا ہوتے تھے ، لازمی تعلیم سے ملازم پیدا ہوتے ہیں "

یہاں تذکرہ غالب کے دو تخلص اور اُردو کے ناموں کا ہے ۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُردو کے ناموں کا اس قدر معنی خیز استعمال کسی اور نے بھی کیا ہو ۔ ماہرین لسانیات اور اُردو تحریک کے قائدین بھی ۔ بات تلخ سہی لیکن ہے برحق :

" مرزا نوشہ نے بھی اس لئے دو تخلص چنے تھے ۔ غالب فارسی کے لئے اور اسد ریختہ
کے لئے ۔ مرزا نوشہ نے فارسی والوں کی ناقدری کی وجہ سے اپنا فارسی تخلص بھی ریختہ
میں شامل کردیا (اس زمانے میں اُردو کو ریختہ کہا جاتا تھا حالانکہ وہ ریختہ تو اب ہوئی ہے "

اس نوعیت کے اقتباسات یوسف ناظم کے مضامین میں اور کئی مل جائیں گے لیکن اُن کے فن کی وجہ امتیاز اُن کے وہ جملے ہیں جو قول محال سے کم نہیں ۔ ایسے جملے مختصر لیکن اپنے اندر معنی و مفہوم کی پہنائیاں لئے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے اعلیٰ

طنز نگیستری اور بصیرت افروزی کی وجہ سے اُردو کے طنزیہ ادب میں مقام بنا لیتے ہیں۔ یہ یوسف ناظم کی [illegible] کا ثبوت ہے۔ میں حکایت یوسف دراز کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے چند جملے درج کرتا ہوں۔

" اچھا ہوا کہ ایک ہفتہ میں پورے سات دن ہوتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دو، دن کم ہوتے تو کوئی بھی شش و پنج میں مبتلا ہو جاتا۔"

" پچھلے زمانے کے لوگوں کو ٹیکس دینا نہیں پڑتا تھا پھر وہ مر کیوں گئے۔"

" زیادہ بولنا خطرناک ہے۔ اچھا خاصا آدمی لیڈر بن جاتا ہے۔"

" زبان صرف عورتوں کو عطا ہوئی ہے اس لئے ہر شخص کی صرف مادری زبان ہوتی ہے۔"

" ڈاکٹر اب شراب نہیں، شعر سے توبہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

ہمارے طنز و مزاح نگاروں نے شاعری اور بالخصوص جدید شاعری کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا ہے اور ندرت کے ساتھ۔ اس سلسلے میں نئے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ یوسف ناظم نے شاعروں کو تو نشانہ بنایا ہی ہے، مختصر افسانہ بھی ان کے تیر سے بچ نہ سکا۔ بات میں بات پیدا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ مختصر افسانے کو انہوں نے کیا سے کیا کر دیا۔

" دو صفحے کے افسانے افواہوں کی طرح عام ہو گئے ہیں۔ کوئی رسالہ اٹھا لیجئے، اس میں دو صفحوں والا افسانہ ضرور ہوگا۔ گویا افسانہ نگار نے پڑھنے والوں پر بڑا کرم فرمایا ہے۔ حالانکہ دو صفحوں والا افسانہ تو اور بڑا ہوتا ہے۔ اسے پڑھ کر تو پوری کوفت بھی نہیں ہوتی۔ یہ افسانہ آدھے سر کا درد پیدا کرتا ہے اور آدھے سر کا درد، پورے سر کے درد سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

غرض اُردو طنز و مزاح نگاروں میں یوسف ناظم کی مرتبت بلاشبہ صفِ اول کے لکھنے والوں میں [illegible] ممتاز ہے۔ یوسف ناظم کی ایک معرکہ آرا تحریر " ایک پردیسی کا سفرنامۂ ہندوستان " ہے۔ وطنِ عزیز کی سیاست، [illegible]، تجارت، علم، تہذیب اور ادب کوئی چیز ایسی نہیں جس کو طنز و مزاح کا موضوع نہ بنایا گیا ہو۔ خاص طور پر بمبئی اور [illegible] کی زندگی اس سفرنامے کی زد میں ہے۔ یہ سفرنامہ تو مکمل طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

نریندر لوتھر اگر اور کچھ نہ لکھتے، " حیدرآباد کا جغرافیہ " ہی لکھے ہوتے تو اُن کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں بھی ہوتا اور جغرافیہ میں بھی۔ حیدرآباد کے بارے میں کئی مضامین، کئی زاویوں سے لکھے گئے ہیں لیکن یہ نریندر لوتھر کا اپنا زاویہ ہے۔ انہوں نے اپنی عینک اور اپنے انداز سے حیدرآباد کو دیکھا ہے۔ یہاں کے موسموں، ذرائع آمد و رفت، افراد، عمارتوں، محلوں، علمی اداروں، بولی جانے والی زبانوں، اس کی تاریخ اور اس کے جغرافیہ کے بارے میں ایسی اپنائیت اور وابستگی سے طنز و مزاح کام میں لایا گیا ہے کہ مصنف کے قلم کی داد دینی پڑتی ہے۔ نریندر لوتھر کے قلم میں ایک روانی بھی ہے اور ٹھہراؤ سا بھی۔ اور

وہ ان دونوں سے کام لینا خوب جانتے ہیں۔ "حیدرآباد کا تعارفیہ" اس کی عمدہ مثال ہے۔ گفتگو ہے وہ پوری روانی سے لیکن ایک ایک جملہ سوچ کر، سنبھل سنبھل کر ضبطِ تحریر میں لا رہے ہیں، خواہ طنز کیسا ہی ہو، خواہ مزاح کیسا ہی ہو، ان کے اپنے حدود ہیں اور وہ ان حدود کو نہیں پھلانگتے۔ میں یہ کہوں تو شاید اعتراض نہ ہو کہ نریندر لوتھر کے فن کی ساری خوبیاں (جی ہاں، صرف خوبیاں) ان کے اس مضمون میں سمٹ آئی ہیں کہ حیدرآباد کی خوبیوں ہی کو نہیں اس کی خامیوں کو بھی انہوں نے اس انداز سے صفحۂ قرطاس پر پیش کیا ہے کہ وہ خامیاں محسوس نہیں ہوتیں۔ وہ طنز و مزاح کو صرف تبصرے کی حیثیت سے اور برائے نام سامنے نہیں لاتے بلکہ اپنی شخصیت کا جزو بنا کر پیش کرتے ہیں کہ قاری بھی اس کو اپنی ذات کا حصہ پاتا ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ "حیدرآباد کا تعارفیہ" ــــ سارا مضمون نقل کر دوں لیکن آپ میں سے شائد ہی کوئی باذوق ہو جس نے اس کا مطالعہ نہ کیا ہو اور پھر یہ مضمون کچھ مختصر بھی نہیں اس لئے گریز کرتا ہوں، البتہ چند ایک اقتباسات پیش کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا۔ یہاں کی بسوں کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے :

"بسوں کے رکنے کا سسٹم مسافر کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہے۔ روڈ کارپوریشن نے جگہ جگہ اسٹانڈ بنائے ہیں۔ ان کو کہا تو جاتا ہے بس اسٹانڈ لیکن یہ ہوتے اصل میں پبلک اسٹانڈ ہیں۔ لوگ یہاں کھڑے رہتے ہیں، بس یا تو اس سے کچھ پہلے یا اس سے کچھ فاصلے پر آگے رکتی ہے۔ مسافروں کو وہاں تک بھاگ کر بس پکڑنا پڑتی ہے۔ اس جبری کسرت کی وجہ سے حیدرآباد کی جنتا کی صحت دوسرے شہروں کے رہنے والوں سے بہتر ہے۔"

نریندر لوتھر واقعات کے سلسلے میں توڑ مروڑ سے کام نہیں لیتے۔ واقعات وہی ہوتے ہیں اور حقائق بھی اپنی جگہ رہتے ہیں صرف نریندر لوتھر کا اندازِ بیان ہوتا ہے جس سے طنز و مزاح کا رنگ چوکھا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی ہنرمندی کے ساتھ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور جملوں کا دروبست کچھ ایسا ہوتا ہے کہ مزاح کی پھلجھڑیاں چھٹنے لگتی ہیں۔ حیدرآباد کے تعلق سے اُن کے اسلوب کی طرفگی ملاحظہ ہو :

"حیدرآباد کا محلِ وقوع بہت ہی عمدہ ہے۔ ایک طرف شمال، دوسری طرف مشرق، تیسری طرف مغرب اور چوتھی طرف جنوب ہے۔ سب سے زیادہ جنوب ہے۔ اس لئے بھی اسے دکن کہا جاتا ہے۔ وقوع کے مقابلے میں یہاں محل زیادہ ہیں۔ محلاتِ شاہی میں چار محل، چومحلہ اور فلک نما زیادہ مشہور ہیں۔"

اور یہاں گفتگو حیدرآبادیوں کی ملنساری اور خوش طبعی کی ہے جب کہ بن آئی ہے گورنروں پر :

"یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور خوش طبع ہیں۔ برتاؤ میں بڑے سلیقہ شعار ہیں۔ ایسے لوگ گورنر اچھے بنتے ہیں۔ اس لئے یہاں کے کئی معزز شہری گورنر بنا کر دوسرے صوبوں کو برآمد کئے جاتے ہیں۔ سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، رام کرشنا راؤ، سری نگیش، علی یاور جنگ، گوپال ریڈی اور اکبر علی خاں یہیں سے گورنر بن کر گئے۔ یہاں کے بنائے ہوئے گورنر اتر پردیش میں خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔"

(رنگا ریڈی غالباً اس مضمون کی تحریر تک گورنر نہیں بنے تھے ان کا نام رہ گیا)

حیدرآباد کے موسموں کے بارے میں بھی سنتے چلیں:

"یہاں زیادہ تر موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔ ویسے یہاں گرمیوں میں کڑاکے کی گرمی پڑتی ہے سردیوں میں سردی بھی خوب ہو جاتی ہے۔ برسات کے موسم میں جھڑی بھی اچھی لگتی ہے۔ باقی سال موسم معتدل رہتا ہے۔"

نریندر لوتھر نے اپنے اس مضمون کے پہلے ہی پیراگراف میں لکھا ہے کہ:

"طویل عرصہ سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ مضمون اس امید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی۔"

یہ تو انداز بیان ہے ورنہ حیدرآباد پر اس زاویہ سے واقعی ایسے جامع اور مستند مضمون کے بعد کسی اور مضمون کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جائے گی۔ حق تو یہ ہے کہ کوئی طنز و مزاح نگار اب اس عنوان کی طرف دیکھے بھی نہیں کیونکہ اس نوعیت کا اس سے بہتر مضمون لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس مضمون میں نریندر لوتھر نے اپنی آواز پالی ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے نریندر لوتھر کے اور مضامین نہیں پڑھے ہیں کہ بس اسی ایک مضمون سے اقتباسات دیتا چلا جا رہا ہوں۔ "بند کواڑ" اور "مزاج پرسی" جیسے مجموعوں کے اُن کے مضامین بھی اپنی شگفتگی اور اچھوتے پن کی وجہ سے غیر معمولی وقعت رکھتے ہیں۔ مزاح کا پلڑا اُن کے ہاں وزنی ہونے کے باوجود کہیں کہیں طنز کے وار بڑے کاری ہو جاتے ہیں۔ ہمارے انتظامیہ خصوصاً محکمہ سیول سپلائز پر اُن کا طنز:

"ایک صاحب ہیں جو چیونٹیوں کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جہاں بھی انھیں چیونٹیوں کا کارواں ملتا ہے وہ اپنے تھیلے سے آٹا نکال کر اُن پر پھینکتے جاتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ اس طرح شاید وہ ثواب کمانا چاہتے ہیں لیکن پتہ چلا کہ وہ راشن کے آٹے سے چونٹیوں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

حیدرآباد والے مضمون سے ایک اور اقتباس۔ ہماری گھریلو زندگی، خواتین کی پابندیٔ وقت پر کتنا دلآویز چوٹ ہے کہ بے ساختہ 'واہ' نکل جاتی ہے۔

"حیدرآباد میں اور خاص کر اردو کے تعلق سے جو جلسے ہوتے ہیں وہ اتنی تاخیر سے شروع ہوتے ہیں کہ ہماری بیگم بھی تیار ہو کر وقت پر پہنچ جاتی ہیں۔"

آخر میں اُن کے دیگر مضامین سے اسی تعلق سے چند اچھے جملے، لطیف طنز کے حامل اور بس۔

"صبح اُٹھنے پر مرد سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور عورت زبان۔"

"مجھے تو اپنی بیوی کو نہ صرف کمائے ہوئے پیسے پیسے کا بلکہ گنوائے ہوئے وقت کے پل پل کا حساب دینا پڑتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین نے اپنے مضمون "میں مزاح نگار کیسے بنا" میں لکھا ہے۔

"مزاح نگار تو آدمی کے بچہ کی حیثیت میں پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں سماج کے بے ہنگم اصول اور ناہمواریاں

ڈھانچے کی اونچ نیچ اُسے ہنسنے اور لوگوں کو ہنسانے پر مجبور کرتی ہے۔ میں (۲۵) برس سماج کے
بے ہنگم پن کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان اصولوں کے خلاف اپنا قہقہہ
بلند کرنا چاہیئے تو تب میں نے قہقہہ لگایا۔ آدمی کو سوچ سمجھ کر قہقہہ لگانا چاہیئے۔ میں تو سمجھتا ہوں
کہ سچا قہقہہ وہی ہوتا ہے جس کے آگے قہقہہ لگانے والے کا سارا شعور ایک ڈھال کی طرح
کھڑا ہو جائے۔"

مجتبیٰ حسین کا فن یہی ہے۔ سماج کے بے ہنگم پن، سماجی ڈھانچے کی اونچ نیچ، ناآسودگی، معاشرتی عدم توازن، تہذیبی بحران، توہمات، معاشی انتشار، اخلاقی گراوٹ، ادبی بے راہ روی، مذہب کے نام پر استحصال، بے مقصد تعلیم اور وہ سب کچھ جس کو دیکھ کر ایک محبِ وطن اور سچا انسان شرمسار ہوتا اپنی گردن جھکا لیتا ہے، فنکار اپنے جذبات کے اسلوب پر قابو نہیں رکھتا، مشتعل ہو جاتا ہے۔ کوئی مشتعل ہو کر تند، تلخ اور ترش سنانے لگتا ہے اور کوئی اس تندی، تلخی اور ترشی کو ضبط کر کے قہقہہ لگاتا ہے۔ یہ عالی ظرفی کی علامت ہے۔ طنز و مزاح نگار اگر صرف طنز و مزاح پیدا کرنا نہیں چاہتا اور اپنے فن سے کچھ معاشرتی اصلاح کا خواہاں بھی ہوتا ہے تو وہ ضبط کا دامن نہیں چھوڑتا۔ مجتبیٰ حسین نے بھی یہی کیا ہے۔ اس کا زندگی کا مطالعہ گہرائی کا حامل ہے۔ وہ افراد اور اداروں کے صرف حرکات و سکنات ہی پر نگاہ نہیں رکھتا۔ ان کے درون میں جھانکتا، اُن کے باطن کا جائزہ لیتا، اُن کے داخل کو ٹٹولتا اور اُن کے بیچ کو پرکھتا بھی ہے۔ اور یہ سب کچھ بڑی ہمدردی، بڑی اپنائیت بڑے رکھ رکھاؤ اور بڑے سلیقے سے۔ مجتبیٰ حسین اپنے موضوع سے کچھ اتنے اور ایسے قریب ہو جاتے ہیں کہ موضوع اپنے سارے اسرار ان پر اُگل دیتا ہے۔ اُن کو رازدار بنا لیتا ہے۔ اور جب مجتبیٰ کا فنکار جاگتا اور اپنے ہاتھ میں قلم لیتا ہے تو تکلف برطرف وہ کسی رو رعایت کے بغیر، دو ٹوک انداز میں سب کچھ کاغذ پر منتقل کر دیتا ہے۔ مجتبیٰ صداقت سے کام لیتے ہیں اور حقیقت نگاری کرتے ہیں لیکن فنکارانہ انداز میں اور تمام چابکدستی کے ساتھ۔ اس وجہ سے ان کے مضامین میں ایک تہہ داری ملتی ہے۔ یہ بات مجتبیٰ کے خاکوں میں بھی ہے جن میں کہیں کہیں طنز و مزاح سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن جن میں سے کئی شخصیت نگاری کے اعلیٰ نمونے اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے دلآویز مرقعے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے مزاح کی تخلیق برائے مزاح نہیں کی ہے بلکہ ایک مقصد کو ملحوظ رکھ کر۔ اس لئے بادی النظر میں اُن کے یہاں مزاح اور مزاح ہی محسوس ہوتا ہے لیکن کچھ غور فرمایئے۔ مزاح کی حیثیت تو ایک کیپسول کی ہے، اصل چیز تو طنز ہے جس سے فنکار اپنا کام کرنا چاہتا ہے اس لئے آپ اس قہقہہ پر مت جائیے جو مجتبیٰ لگاتا ہے بلکہ اس قہقہہ کے محل میں پوشیدہ طنز کو محسوس کیجئے جو حاصلِ قہقہہ ہے۔ یہی مجتبیٰ کا آرٹ ہے۔ انہوں نے طنز و مزاح کو ایک نئی سمت دی ہے یقین ہے وہ اس کو منزل سے بھی ہمکنار کریں گے۔

مجتبیٰ حسین نے آج سے لگ بھگ (۲۰) سال قبل ایک مضمون لکھا تھا، "سندباد جہازی کا سفرنامہ"۔ اس کے بعد انہوں نے تا حال بہت کچھ لکھا، خود بھی مشرق و مغرب کے سفر کئے اور اپنے بھی سفرنامے لکھے لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سندباد جہازی کا سفرنامہ آج بھی مجتبیٰ حسین کے فن کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ ایک کامیاب مزاح پارہ ہے تو کامیاب تر طنزیہ! یہ مضمون اگرچہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر تحریر کیا گیا ہے لیکن اس میں فسادات سے کہیں زیادہ ہندوستان کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کو بے رحمی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ کیسے غضب کے طنز ہیں اور کیسے شگفتہ انداز۔

ہیں۔ وہ مختصر سے اقتباسات:

"میرے قیام و طعام کا یہاں کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا لیکن بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ہندوستان میں خود اہلِ ہند کے قیام و طعام کا مستقل بندوبست نہیں ہے۔ وہ تو بس سارے ملک کو ایک سرائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور آخر میں سرائے کا کرایہ بقائے میں رکھ کر اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

"میں نے ان درویشوں کو ہندوستان آنے کا کوئی مقصد نہیں بتلایا تھا کیونکہ اہلِ ہند کسی مقصد کے بغیر زندگی گذارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ فن پارے میں زندگی مزاح سے نہیں طنز سے آتی ہے اور یوں بھی مزاح نکھرتا طنز سے ہے بلکہ میں تو یہ بھی عرض کروں گا کہ طنز سے فنکار کو ادب میں مرتبت حاصل ہوتی ہے اور مزاح سے مقبولیت۔ (یہاں طنز سے نہ خالص طنز مراد ہے اور نہ مزاح سے خالص مزاح۔ بلکہ طنز سے مراد وہ فن پارہ ہے جس میں طنز کا تناسب زیادہ ہو اور مزاح سے مراد وہ فن پارہ ہے جس میں مزاح کا تناسب زیادہ ہو)۔ ہمارے مشاعرہ باز شاعروں کی طرح طنز و مزاح نگار بھی مقبولیت اور شہرت کے چکر میں طنز و مزاح نگار نہیں صرف مزاح نگار بنتے جا رہے ہیں، بہت سوں کے ہاں تو پھکڑپن بھی در آرہا ہے، در آچکا ہے۔ اس طرح آپ "واہ واہ" تو حاصل کر لیں گے، تالیاں بھی بجوالیں گے لیکن ادب کے ایوان میں باریابی نہیں ہوگی، اپنی جگہ نہیں بنا سکیں گے۔ مجتبیٰ حسین نے طنز سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے، وہ تو مزاح کو صرف تجارتی اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ "اُردو کا آخری قاری" اُن کا لاجواب مضمون ہے۔ "جنگلی" "قصہ آرام کرسی کا" "ڈائرکٹر کا کتا" اور "شاعروں کی حکومت" وغیرہ جیسے کئی مضامین بھی۔ مضمون "شاعروں کی حکومت" میں شاعری اور شاعروں پر تو طنز ہے ہی لیکن دیکھئے اور کون کون اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں:

"ملک کے سارے بڑے عہدوں پر شاعر حضرات فائز ہو گئے۔ جو شاعر معذور اور اپاہج تھے انہیں یا تو سفیر بنا کر باہر بھیج دیا گیا یا پھر مختلف ریاستوں کے گورنر بنا دیئے گئے۔"

اور یہ اقتباس:

"جب شاعروں نے دیکھا کہ ملک میں عام بے چینی پھیل رہی ہے تو انھوں نے سوچا کہ اس بے چینی کو دور کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ شاعری میں سوشلزم کو رائج کیا جائے۔ یوں بھی سیاستدانوں کے زمانے میں بھی سوشلزم کے معاملے میں صرف شاعری کی جاتی تھی۔ سیاستدان جب سوشلزم کا ذکر کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خوبصورت نظم سنا رہے ہوں۔ شاعروں نے سوچا کہ جب سیاستدان سوشلزم کے سلسلے میں صرف شاعری کرتے تھے تو پھر ہم کہ جو شاعر ہیں شاعری میں سوشلزم کیوں نہ کریں۔ وہ جانتے تھے کہ سوشلزم ہمارے ملک کے عوام کی سب سے بڑی کمزوری ہے طاقت نہیں۔ بالخصوص حکمرانوں کے لئے سوشلزم سے کئی فائدے پہنچتے تھے۔ سوشلزم کے ذریعہ تاجروں کو پرمٹ جاری کئے جا سکتے تھے۔ سوشلزم کے ذریعہ "بلیک منی"

> کو بڑھاوا دیا جا سکتا تھا۔ مالدار اصحاب میں دولت کی مساویانہ تقسیم کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ بُرے کام کر کے نیک نامی حاصل کرنے کے لئے "سوشلزم" ہی موثر ذریعہ تھا۔"

حاقق شاہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔ اسی انشائیہ نگاری کے باعث جہاں اُن کے افسانے نکھرتے ہیں اُدھر اُن سے طنز و مزاح کا رنگ بھی چوکھا ہو جاتا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو اُن کے افسانوں اور طنز و مزاح دونوں پر انشائیہ نگاری غالب آ جاتی ہے۔ طنز و مزاح کے ساتھ زبان و بیان کا لطف لینا ہو تو حاقق شاہ کو پڑھئے۔ انشائیہ نگار کو لکھنا آتا ہے اور جس کو لکھنا آ ہے اس کو موضوع کی قید نہیں۔ موضوع اہم ہو کہ غیر اہم، چھوٹا ہو کہ بڑا، انشائیہ نگار اس کو پُروقار بنا دیتا ہے۔ حاقق شاہ کا کمال بھی یہی ہے کہ بظاہر انتہائی غیر اہم، معمولی اور نظر انداز کئے جانے والے موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہوئے وہ اُن کا نصیبہ جگا دیتے ہیں۔ اُن کی انشائیہ نگاری کے باعث یہی موضوعات بے حد اہم، غیر معمولی اور ناقابلِ نظر انداز ہو جاتے ہیں اور یوں وہ اپنے مضامین میں ایک دنیا اور ایک دنیا کے مسائل سمیٹ لیتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ اس موضوع کی ذات میں بھی کائنات کے اتنے پہلو پوشیدہ تھے۔ آم، بھینس، گھر کا کتا، بھوت، گوشت کی دکان، ساڑی، گندی نالی، چوزہ، گھونس۔ یہ اور ایسے کئی موضوعات کے بارے میں ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ بھلا یہ بھی ادب کے موضوعات ہو سکتے ہیں؟ جی ہاں! حاقق شاہ کے قلم سے پوچھئے ان موضوعات کو چھو کر اُن کے قلم نے کیا کیا جادو نہیں جگائے۔ لیکن یہ صرف انشائیہ نگاری ہی کا کمال نہیں، زندگی اور زمانے کے مطالعے اور اُن پر غور و فکر کا حاصل بھی ہے۔ حاقق شاہ اِن موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے اطراف و اکناف کے ہزاروں مسائل پر روشنی ڈالتے جاتے ہیں۔ کسی کے بارے میں طنز سے کام لیا اور کسی کو مزاح میں ٹال دیا لیکن مجموعی طور پر اُن کے ہاں طنز کو بالادستی حاصل ہے۔ عنوان ہے "گھونس" غور فرمائیے انہوں نے کیا لکھا، ہاں کیا کچھ نہیں کہہ دیا:

> " گھونس صرف زمین کو کھودتی ہی نہیں بلکہ سرنگیں بھی بچھاتی ہے۔ ان سرنگوں میں بارود نام کی کوئی شئے نہیں ہوتی بلکہ چلتے پھرتے انسانوں کے لئے وہ بند قبریں ہوتی ہیں جس میں جانے کے بعد وہ زندہ دفن ہو جاتے ہیں۔ نمازِ جنازہ اور فاتحہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی! ہر کھنڈر، تباہ شدہ حویلی اور خستہ حال عمارت کے پیچھے کوئی نہ کوئی گھونس چھپی رہتی ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے۔
>
> لیکن گھونس سے اس کی ذات پات اور مذہب کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ گھونس صرف گھونس ہی ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا کے زیر اثر بھی گھونس گرم ملکوں میں کالی ہوتی ہے اور سرد ملکوں میں گوری۔"

اُن کے ایسے مضامین سے اور اقتباسات بھی دیئے جا سکتے ہیں لیکن میں "گندی نالی" کا یہ جملہ پیش کروں گا کہ انہوں نے کس طرح کیسی بات پیدا کی ہے۔ کس قدر معنی خیز۔ سنئے:

> " جمود خواہ پانی میں ہو یا ادب میں، عفونت اور تعفن کو پیدا کرتا ہے۔"

پرویز یداللہ مہدی کے مضامین اپنی بے ساختگی، بے نیازی اور ایک مخصوص قسم کے لاابالی پن کی وجہ سے دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، وہ بہت کھل کر لکھتے ہیں اور بڑے رواں دواں انداز میں لکھتے ہیں کبھی کبھی اُن کا انداز چلتا چلاتا بھی ہوتا

بن زبان پر قابو ہے اور موضوعات اُن کے سامنے کے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے۔ گھریلو، سماجی، سیاسی، معاشی اور ادبی وغیرہ۔ وہ اپنی بات کے تانے بانے کچھ اس طرح ملاتے جاتے ہیں کہ نئے نئے نکات سامنے آتے ہیں، نئے نظر پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح دونوں سے کام لیا ہے اور ان دونوں کو معاشرتی اصلاح کے مقصد کے لئے کام میں لایا ہے۔ خاص طور پر "جوڑی کے غلام" جیسے مضامین میں انھوں نے جہیز کی رسم کے خلاف نہایت اچھوتے انداز میں لکھا ہے۔ مزید برآں سیاستدانوں کے انھوں نے جو بخیے ادھیڑے ہیں یہ بھی اُن کا انداز ہے۔ اس سلسلے میں "کنپٹی کے تالے" ایک اچھا مضمون ہے۔ ہار و کس کا ترجمہ کنپٹی کے تالے کرتے ہوئے انھوں نے سیاستدانوں کی خوب خوب خبر لی ہے۔ یہ سنئے:

"لیڈروں کی طرح تالے بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں جو مال و متاع کی حفاظت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ تالے یوں تو تالی یا چابی یا عرف کنجی کی مدد سے کھولے اور بند کئے جاتے ہیں لیکن بعض تالے تو آزاد اُمیدوار جیسے ہوتے ہیں یعنی جس طرح آزاد اُمیدوار تھالی کے بیگن کی طرح آخری وقت کسی کے حق میں بھی دستبردار ہو جاتے ہیں اسی طرح یہ تالے بھی صلح پسند اور حلیم الطبع ہوتے ہیں کہ کوئی بھی انھیں کسی بھی چابی سے کھول سکتا ہے۔"

اور آخر میں یہ تبصرہ بھی:

"بعض تالے چابی سے اس طرح بے نیاز ہوتے ہیں جس طرح آج کی بیشتر لڑکیاں دوپٹے سے بے نیاز ہیں"

پرویز یداللہ مہدی نے ڈرامے بھی لکھے ہیں بہت زیادہ۔ اُن کے ڈراموں کا مجموعہ "تو تو میں میں" شائع ہو چکا ہے۔ اور ادھر ان کا ایک ناول "چہ خوب" قسط وار چھپ چکا ہے۔ چونکہ میں نے اپنے موضوع کے تحت ڈراموں اور ناول وغیرہ کو شامل نہیں کیا ہے اس لئے ان کے بارے میں فی الوقت معذرت چاہتا ہوں۔ تاہم اس احساس کے ساتھ کہ اظہر افسر کے طنزیہ و مزاحیہ ڈرامے بھی ہیں اور ان کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیز غلام جیلانی، مصطفےٰ علی بیگ، بھارت چند کھنہ، جاوید کمال اور برق آشیانوی کے بھی چیدہ چیدہ ڈرامے شائع ہوئے ہیں ــــ ہاں یہ ایک بات کہوں گا کہ من حیث المجموع اردو میں ڈراموں کا موقف ایسا محکم نہیں۔ مزاحیہ ڈراموں میں بھی معمولی سطح کا مزاح ملتا ہے، طنز کم ہی۔ ریڈیائی ڈراموں کا بھی یہی حال ہے۔

برق آشیانوی کی مزاح نگاری پر جب بھی اُن کی انشائیہ نگاری، غیر ضروری طور پر غالب آجاتی ہے، مزاح کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے ورنہ جہاں وہ انشائیہ نگاری کو اس کے حدود میں رکھتے ہوئے طنز و مزاح کا حق ادا کرتے ہیں اُن کے ہاں مزاح کے کنول کھلنے لگتے ہیں۔ برق آشیانوی نے زیادہ تو لکھا ہی ہے لیکن بہت خوب بھی لکھا ہے۔ وہ ہمارے معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے کے فن سے واقف ہیں۔ اطراف و اکناف کو دیکھا بھالا ہے۔ بصارت نہیں، بصیرت سے بھی کام لیا ہے اور لاکھ باتوں کی ایک بات تو یہ کہ طبیعت شگفتہ پائی تھی اس لئے ہر موضوع کو یوں نکھار دیتے کہ وہ مسکرانے لگتا۔ نثر اور نظم دونوں اصناف کو آزمایا اور کامیاب رہے۔ اُردو ادب کے شستہ اور مہذب ذوق کے باعث اُن کی تحریروں اور اندازِ بیان سے وزن و وقار محسوس ہوتا ہے۔ غالب اُن کا محبوب شاعر ہے اور محبوب موضوع بھی۔ چنانچہ غالب کے اشعار کی تشریح کرتے ہوئے نئے نئے دلچسپ پہلو نکالے ہیں اور زندگی کے اہم اور عام موضوعات کی یوں تحلیل و تعبیر کی ہے کہ صفحات قہقہہ بداماں ہو گئے ہیں۔ وہ لطیفوں اور واقعات کا سہارا نہیں لیتے۔ بات میں بات کچھ ایسی پیدا کر دیتے ہیں اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے کچھ یوں کام لیتے ہیں کہ فضا ہی تبدیل ہو جاتی ہے

اُن کا طنز و مزاح زبان و بیان کی جادوگری ہے۔

کرکٹ نے آج ہماری معاشرتی زندگی میں اپنی وقعت سے خود اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے دن بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ برق آشیانوی نے غالب کو بھی کرکٹ دکھا دیا اور اب کرکٹ کے بارے میں مرزا غالب کا تبصرہ سماعت فرمائیے۔

"تھوڑی دیر تک مرزا صاحب خاموشی سے کھیل دیکھتے رہے۔ اس کے بعد بولے : میاں، ہمیں کچھ ایسا لگتا ہے دو آدمی کھیل رہے ہیں اور باقی گیارہ آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ بھی کھیل رہے ہیں۔"

اور اب طنز کی ایک مثال،

"آج سے پینتیس برس پہلے بے پردہ خواتین کا ایسا کال تھا جیسا کہ آج پردہ نشین خواتین کا۔"

یہ ہے خالص مزاح :

"دوسری چھتری کو سنبھال کر رکھنے کی احتیاط ہم نے اس حد تک دکھائی کہ بارش میں بھی بغیر چھتری کے دفتر جانے لگے۔"

مسیح انجم نے طنز و مزاح میں اپنا مقام بتدریج ، بڑی لگن اور محنت سے بنایا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر یہ احساس ہوگا یہ شخص زندگی میں صرف تماشائی نہیں رہا تماشا بھی بن گیا۔ ایسے فنکاروں کے ہاں عام طور پر طنز ہی نہیں زہرناکی بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن مسیح انجم نے غالباً اس زہر کو پی لیا اور اپنے قارئین کو صرف شہد و شکر سے نوازا۔ اُن کے ہاں طنز کے مقابلے میں مزاح زیادہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے :

"جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے میں خالص طنز کو پسند نہیں کرتا البتہ خالص مزاح کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مٹھاس کسے پسند نہیں ؟ اگر طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی ہو تو پھر کیا کہیے۔"

چنانچہ طنز و مزاح کے اس خوشگوار امتزاج نے جس میں مزاح کا پلّہ گراں ہی ہے، مسیح انجم کے فن کو سنوار دیا ہے۔ عصری حسیت نے اُن کے طنز و مزاح کو اور حقیقت پسندانہ اور زندگی دوست بنا دیا ہے۔ اپنے موضوعات پر مسیح انجم کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ وہ عصری مسائل کی سمت ہماری توجہ کچھ اس طرح مبذول کراتے ہیں کہ ہم نہ صرف ہنستے ہیں بلکہ کچھ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور طنز و مزاح نگار جب اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو سمجھئے اُس نے اپنا مقام پا لیا لیکن مجھے یقین ہے مسیح انجم ہر اک مقام سے آگے مقام ہے اپنا ، سمجھتے ہوئے ایک نئے مقام کی سمت گامزن ہوں گے اور ہوتے رہیں گے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "سائیڈ سے چلئے" کے بعد "در پردہ" اور پھر "چنانچہ" میں ان کا فن رو بہ ترقی رہا ہے۔ ہاں "در پردہ" کے بارے میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس کے مشمولات میں زیادہ تر انشائیہ نگاری بلکہ کہیں کہیں تو ٹھیٹ مضمون نویسی کا احساس ہوتا ہے۔ دو ایک جگہ تو افسانہ نگاری کا بھی۔ "تاک جھانک" تو افسانہ ہے ہی ـــــ ویسے اُن کے اچھے طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں "پرانا سینما گھر" پرانی فلم اور ہم بے چارہ"۔ "اخبار بینی اور ہوٹل"۔ "مدیر شگوفہ اور سکنڈ ہینڈ اسکوٹر"۔ "بیڈی مینڈ عید"۔ "دستر خوان کے شیر + شعر"۔ "پونتہ"۔ "داڑھ کی یادیں"۔ "داد حاصل کرنے کے طریقے" اور "ستار چشتی پر خاکہ" لائق ذکر ہیں۔ "داڑھ کی یادیں" کا یہ اقتباس :

"پیدائش سے لے کر موت تک ہر انسان کے ساتھ کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے اور اگر کبھی غائب بھی ہو جائے تو پھر اچانک یوں نمودار ہوگی جیسے بیوی اپنے میکے جا کر لوٹ آئی ہو۔"

"ستارہ چشتی" کے بارے میں اُن کے مرقعے سے :

"جب پرندوں اور جانوروں کے پالنے کے شوق کا ذکر آہی گیا تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ کبوتروں کے تعلق سے اُن کی معلومات نہایت وسیع ہیں اور اس معاملے میں اُن کی حیثیت ایک "اتھاریٹی" کی سی ہے۔ اُن کے مکان میں آپ کو مختلف نسل اور مختلف قسم کے کبوتر "غٹرغوں غٹرغوں" کرتے نظر آئیں گے۔ اب تو وہ باضابطہ جدید شاعری کرنے لگے ہیں۔"

میں نے عرض کیا ہے کہ مسیح انجم کے ہاں طنز کم ہے لیکن بعض جگہ اُن کے طنز کے وار بڑے کاری اور شدید ہیں کہ اُن کے معاشرتی شعور کی پختگی آئینہ ہو جاتی ہے۔ یہ اقتباس :

"اتنے میں میری نظر ایک لیڈر پر پڑی۔ وہ اپنی کار میں کہیں جا رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا کہ اُن کے پاس اُردو کا ایک دسترخوان ہے۔ جب بھی وہ یہ دسترخوان بچھاتے ہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ الکشن کے دن آگئے ہیں۔"

"کاغذی پیرہن" کی خالق ڈاکٹر رشید موسوی ہیں۔ شستگی، شائستگی، رکھ رکھاؤ، نکھری ستھری اور تہذیبی قدروں سے صرف اُن کی شخصیت ہی عبارت نہیں اُن کی تحریر میں بھی یہی اوصاف جلوہ گر ہیں۔ اوروں ہی کو نہیں خود رشید موسوی کو بھی اس کا احساس ہے کہ "بھلا مرثیہ اور عزاداری کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کرنے والے کے مزاج میں مزاح نگاری کے جراثیم کہاں سے حلول کر گئے۔" لیکن سچ پوچھئے تو رشید موسوی کے مضامین میں مزاح بے حد کم ہے اور جہاں بھی ہے لطیف انداز میں تبسم زیر لب کی طرح۔ ہاں انھوں نے طنز سے کچھ زیادہ ہی کام لیا ہے۔ اس طنز کے سلسلہ میں بھی بقول ان ہی کے "طنز کے پردے میں آپ کو اپنے گھر بار اور زندگی کی ایسی تلخیاں نظر آئیں گی جن کے بارے میں ہر روز آپ سوچ تو لیتے ہیں مگر اُن کو دور نہیں کر پاتے۔" رشید موسوی کے اس طنز کا نشانہ گھریلو معاشرت بھی ہے، دفتریت بھی اور شعر و ادب بھی۔ انھوں نے جہاں بھی ناہمواریوں کو محسوس کیا بے ترتیبی کو پایا اس کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ نئی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں :

"نئی شاعری اور قدیم عمارتوں میں سب سے نمایاں اور مشترک خصوصیت مایوسی کی فضا ہے۔ مقبروں کی طرح جدید شاعری میں زندگی کے نشان ناپید ہوتے ہیں اور اُداسی طاری ہوتی ہے۔ نئے شاعر کی آواز گنبد میں کھڑے کسی انسان کی آواز ہے جو لوٹ کر صرف اُسی کو سُنائی دیتی ہے۔"

اپنے مضمون "کُتے" میں انھوں نے خاص طور پر اونچے طبقے کی معاشرت پر گہرے طنز سے کام لیا ہے تو "پھر کیا کرے کوئی" میں دفتریت پر شدید طنز ہے۔ وہ دفتریت جس کی وجہ سے ہم اور آپ پریشان ہیں۔ "چادر گھاٹ کا پُل" میں طنز کی ہلکی رو کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔ ویسے "مالن بی" اور "اللہ کے نام پر" بھی ڈاکٹر رشید موسوی کے اچھے مضامین ہیں۔

محمد برہان حسین کے ہاں طنز و مزاح کا انداز بڑا تیکھا ہے، بڑا طرحدار، لیکن انھوں نے مزاح سے کام کم ہی لیا ہے، طنز ملا زیادہ اور پھر طنز بھی کیسا کہ آرپار ہو جائے۔ ہمارے سماجی مسائل کا انھوں نے بڑی جرأت مندی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ اس معاملے میں رو رعایت کے قائل نظر نہیں آتے۔ اپنے ہوں کہ پرائے، قریبی ہوں کہ دور کے، سب اُن کے طنز کے تیر و نشتر کا شکار بنتے ہیں۔ تذکرہ مچھلی کا ہے اور دیکھئے والد محترم کیسے زد میں آتے ہیں :

مچھلی کے بارے میں ہمارے خیالات اور جذبات نفرت اور محبت پہ مشتمل تھے، کیونکہ والدہ کو مچھلی کے

> تام سے نفرت تھی اور والد صاحب نے مچھلی کے شکار کے لئے جتنا وقت گل ڈال کر ندی کے بیچ کی چٹان پر بیٹھ کر گذارا ہے، اگر وہ صرف جا در اوڑھ کر اتنا عرصہ وہاں بیٹھے رہتے تو آج شہر کے سب سے بڑے بزرگ مانے جاتے :

اس طرح "خودکشی" عصری معاشرت پر اچھا تبصرہ ہے۔ "رسم اجراء" میں انہوں نے اگر ہمارے ادبی معاشرے میں جاری ایسی رسموں کا مذاق اڑایا ہے تو بزرگوں کی ریسرچ" میں ہماری ادبی تحقیق پر عمدہ طنز ہے۔ خصوصاً اخبارات کے کالموں میں جس طرح کی تحقیقی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ "اگر فردوس بروئے زمیں است" ان کا معرکہ کا مضمون ہے۔ ہمارے معاشرے کی دکھتی رگوں کو انہوں نے کچھ ایسی بے رحمی سے چھیڑا ہے کہ کہا نہیں جاسکتا۔

طنز و مزاح نگاروں نے شاعروں کی تو خبر لی ہی ہے۔ برہان حسین نے تنقید نگاروں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ اپنے مضمون "رسوا ورنگلی، مشہور تنقید نگار" میں انہوں نے ناقدین کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ وہ جب اپنے بھائی سے سوال کرتے ہیں کہ تنقید نگار کو تنقید کون سکھاتا ہے تو بھائی جان کا جواب ملاحظہ ہو :

> "مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھاتا ہے ؟ یہ لوگ (یعنی تنقید نگار) شروع سے ہی بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب کوئی عورت بچے پیدا نہیں کرسکتی تو ساس بن کر بہو کے ہر اچھے کام پر تنقید کرنے لگتی ہے اس طرح جب کچھ لوگ خود کوئی اچھی نظم، مضمون یا کہانی نہیں لکھ سکتے تو تنقید نگار بن جاتے ہیں۔"

سمجھ میں نہیں آیا کہ جب کوئی عورت بچے پیدا نہیں کرسکتی تو ساس کیسے بن گئی۔ شائد ایسے مواقع کے لئے طنز و مزاح کو سفلی عمل سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عمل پورا نہ ہو تو عامل خود اس کا نشانہ بن جاتا ہے۔ یہاں بھی کچھ یہی ہوا ہے۔

ایم۔ اے۔ حنان کے ہاں بھی وہ جراثیم ہیں جو شستہ اور شگفتہ مزاح کی تخلیق کا سبب ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ وہ محابا نہیں لکھتے اور نہ ہر موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں بلکہ ایسے ہی موضوعات پر جن سے اُن کو جذباتی وابستگی ہوتی ہے ان کا شعر و ادب کا مطالعہ بھی ہے اور جس دنیا میں رہتے ہیں اس کو برتتے بھی ہیں چنانچہ جہاں اُن کے مضامین روانی اور سلاست سے عبارت ہیں اُن کے موضوعات قارئین کے جانے پہچانے۔ ان دنوں جب کہ عام طور پر واقعات کو گھڑ کر حقائق کو بگاڑ کر یا اِدھر اُدھر سے لطیفوں کو اکٹھا کر کے مزاح کی "تخلیق" کی جاتی ہے۔ حنان نے خود کو ان چیزوں سے بچائے رکھا ہے۔ حنان کا لب و لہجہ بے حد دھیما ہوتا ہے اور طنز ہو کہ مزاح دیر اور دور تک پڑھنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ بجلی کا وقت بے وقت غائب ہونا، ان دنوں معمولاتِ زندگی میں داخل ہے۔ حنان نے اس خصوص میں مزاح کی کیسی چھلجھڑی چھوڑی ہے پڑھئے اور داد دیجئے۔

> "ہمارے ایک دوست جو حال ہی میں سمندر پار سے لوٹے ہیں اور جن کے ہاں سارے کاروبار بجلی سے انجام پاتے ہیں کل ہی کہہ رہے تھے کہ میاں تمہارے یہاں کا بجلی کا انتظام اس قدر ناقص ہے کہ کھانا پکانا اور دیگر کام بجلی سے انجام دینا تو دور رہا متوالیشن ہونے پر ایک انڈا تک ابال کر نہیں کھا سکتا۔ ایک بار کوشش بھی کی لیکن سخت ناکامی ہوئی۔ اس دوران یوں بجلی آتی جاتی اور غائب رہی کہ اس کوشش میں کئی دن گزر گئے اور جب پہلے برتن کا ڈھکن اٹھایا تو نیلے چوزے

انڈہ کی بجائے ایک جیتا جاگتا مرغی کا بچہ نکل آیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے قریب قریب آبدیدہ ہو کر صحن کی ایک جانب اشارہ کیا جہاں دو چار صحت مند چوزے دانہ چگنے میں معروف تھے :"

ان دنوں کتابوں کے گٹ اپ، اُن کی ظاہری حیثیت پر مواد سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ سرورق خوبصورت ہو، کتابت دلکش ہو، طباعت عمدہ ہو، کاغذ نفیس ہو اور رنگ دلآویز ۔ غالباً کسی کتاب کو یہ سب کچھ ٹھیک ڈھنگ سے نصیب نہ ہوا۔ ایک قاری کے تاثرات یوں تھے اور :

"دوسرے نے سرورق کے بارے میں اپنے مشتعل جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ سرورق خوبصورت ہونا تو کجا نہایت بدشکل اور تکلیف دہ ہے۔ کیا آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ آج کل کتابوں کی فروخت کا انحصار دیدہ زیب ٹائیٹل پر ہوتا ہے اور بعض اوقات تو حسین سرورق بڑے نام کو بھی بگل دے جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ ایک مصنف کی کتاب کے سارے ایڈیشن بک گئے اور کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں۔"

ملاحظہ کیا آپ نے طنز و مزاح دونوں نے کام کیا، نشانہ کسی کا خطا نہ گیا۔

نئے لکھنے والوں میں ایک اہم نام سید نصرت کا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے سید نصرت کے مضامین کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن اُن کے مضامین یقیناً اتنے ضرور ہوں گے کہ مجموعہ شائع ہو سکے۔ سید نصرت کے موضوعات اگرچہ وہی ہیں جو دیگر طنز و مزاح نگاروں کے، لیکن موضوعات کے تعلق سے ان کا رویہ کچھ اُن کا اپنا ہی ہوتا ہے جو کبھی رشید احمد صدیقی کی یاد دلاتا ہے تو کبھی مشتاق احمد یوسفی کی۔ وہ واقعات سے طنز و مزاح کم ہی پیدا کرتے ہیں۔ لطیفوں کی پیوند کاری بھی اُن کے یہاں نہیں۔ نہ وہ اُچھل کود، جو آجکل کے کئی مزاح نگاروں کا خاصہ ہے۔ سید نصرت کی مزاح نگاری زبان کے شگفتہ اور تہہ دار استعمال پر منحصر ہے۔ وہ بات میں بات پیدا کرتے ہیں کہ بات بن جاتی ہے اور جب بات بن جاتی ہے تو اور کیا چاہیئے۔ انھوں نے جا بجا ادبی زندگی کو بھی نشانہ بنایا ہے اور تہذیبی و گھریلو زندگی کو بھی۔ اُن کے ہاں مزاح بھی لطافت کا حامل ہے اور طنز بھی موج تہہ نشین کی صورت میں۔

شادی شدہ زندگی اور بیوی ہمارے طنز و مزاح نگاروں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ فرق یہی ہے کہ کسی نے بڑی لطافت اور نزاکت کے ساتھ نشانہ بنایا اور کسی نے سرکس کے مسخروں کا انداز اختیار کر لیا یا پھبتیاں کسنے لگے۔ سید نصرت یہاں بھی زبان کے فنکارانہ استعمال سے کام لیتے ہیں اور انداز اتنا سیدھا سادا، دھیما اور خنک کہ کچھ نہ پوچھیئے لیکن ضرب کاری! مضمون "گریوں بھی رونا رہا" کا اقتباس ہے :

"رونا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جسے وہ پیدا ہونے سے پہلے سے لے کر ملک الموت سے ہاتھ ملانے تک بے تحاشہ استعمال کرتا ہے۔ رونے کی بنیادی وجہ ایک بچے کے پاس بھوک، نوجوان کے پاس شادی شدہ زندگی اور بوڑھے کے پاس یادِ ایامِ جوانی ہوتی ہے ۔"

"لاری چچا" ہے تو اُن چچا کے بارے میں جو اپنی لاری کی وجہ سے لاری چچا مشہور ہوئے لیکن لاری چچا کے بارے میں لکھتے ہوئے سید نصرت نے یہاں وہاں طنز و مزاح کے پہلو نکال ہی لئے کہ بیوی بے چاری بھی زد میں آجاتی ہے، اور ساس بھی ۔

"چچا نے اس لاری کا سودا ایک ایسے شخص سے کیا تھا جو ذہنی طور پر اکثر بیمار اور پریشان
رہا کرتا تھا اور ایک ماہر نفسیات نے اُسے یہ مشورہ دیا تھا کہ چین آرام اسی صورت میں میسر آسکتا
ہے جب کہ ہر اس چیز سے چھٹکارا حاصل کرے جو اُس کی ذہنی پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے چنانچہ
اس شخص نے سب سے پہلے اپنی بیوی کو طلاق دی پھر ساس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اس کے بعد
اونے پونے داموں میں لاری، لاری چچا کے ہاتھوں فروخت کر کے سیٹی بجاتا ہوا جیل چلا گیا۔"

سید نصرت کا ایک اچھا مضمون "کرکٹ بھاشا" ہے جس میں انہوں نے ان دنوں، کرکٹ سے جنون کی حد تک پہنچی ہوئی
دلچسپی سے فنکارانہ انداز میں فائدہ اٹھایا ہے اور واقعات یا لطیفوں سے نہیں کرکٹ کی اصطلاحات ہی استعمال کرتے ہوئے
مزاح پیدا کیا ہے۔ اور کامیاب رہے ہیں۔ سید نصرت سے اُردو طنز و مزاح کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

رؤف رحیم کو لکھنا شروع کئے کچھ ایسا عرصہ نہیں گذرا لیکن انہوں نے اپنا انداز بنا لیا ہے وہ شاعری سے بھی شوق
کرتے ہیں جب کہ نثر نگاری میں اُن کے جوہر زیادہ نمایاں ہوئے ہیں اور آئندہ بھی اس کے امکانات روشن ہیں۔ وہ صاف ستھری
زبان لکھتے ہیں اور انداز تحریر سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ان کے حق میں یہ بھی نیک شگون ہے۔ وہ نئے لکھنے والوں ہی میں شمار نہیں
ہوتے ان کے موضوعات بھی نئے ہیں جیسے فسادات اور ٹھٹ۔ فسادات جو دو، تین برس قبل تک چند برسوں کے لئے ہمارے
شہر کا مقدر بن چکے تھے اور جس کے نتیجے میں کرفیو نے ہماری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ رؤف رحیم کے علاوہ عابد معز وغیرہ نے
بھی کرفیو کو اپنا موضوع بنایا ہے اور بڑے دھڑکتے دل کے ساتھ۔ رؤف رحیم نے دیکھئے کیسے کیسے پہلو نکالے ہیں۔ عام آدمی پر
اس کے کیا اثرات ترتیب پائے، کرفیو نے کس کو کیا دیا:

> "بہر حال عید اور تہوار میں جو خوشی نصیب ہوا کرتی تھی اب اُس کی جگہ خوف نے لے لی
> ہے۔ "دیپاولی" میں دیپ جلتا ہے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں گھر بھی نہ جل جائے۔ پٹاخہ چھوٹتا
> ہے تو دل دہل جاتا ہے کہ یہ دستی بم نہ ہو۔ جمعۃ الوداع آتا ہے تو سوچنا پڑتا ہے کہ یہ آخری
> جمعہ تو نہیں۔ خیر!"

یہی نہیں اس مضمون کا نقطۂ عروج تو یہ ہے:

> "کرفیو میں پولیس کی طلایہ گردی اور گدھوں کی آوارہ گردی کا نہ جانے کیا سمبندھ ہے۔ سڑکوں
> پر صرف یہ دونوں دکھائی دیتے ہیں۔"

فیروز حیدر نے کچھ زیادہ مضامین نہیں لکھے لیکن وہ ہمارے اُن لکھنے والوں میں ہیں جو طنز و مزاح کی بڑی اچھی صلاحیتیں
رکھتے ہیں یقیناً انہیں اس طرف اور توجہ دینی چاہئے۔ ان دنوں جب کہ تیسرے درجہ کا طنز و مزاح ہمارے رسائل کا مقدر بنتا جا رہا
ہے اور جو کتابیں آرہی ہیں وہ بھی ایسی ہی ہیں۔ فیروز حیدر کے مضامین پڑھتے ہوئے تالیف قلب ہوتی ہے کہ فرحت اللہ بیگ،
پطرس اور رشید احمد صدیقی کی اپنے فن سے ریاضت رائیگاں نہیں گئی۔ وہ روشنی مدھم نہیں ہوئی، اُجالا پھیلے گا۔ فیروز حیدر
کو زبان و بیان پر قابو ہے اور وہ الفاظ کے مزاج آشنا لگتے ہیں۔ موضوعات خواہ کیسے ہی ہوں اُن کو برتنے کے فن سے وہ
واقف ہیں۔ "نئی فلم، نئی تھیٹر، پہلا دن" پڑھئے، بلاشبہ ایک اچھے مزاح پارہ سے آپ لطف اندوز ہوں گے۔ اور ادھر جو
غیر مقدمی تقاریب اور جلسوں جلوسوں کی ریل پیل ہے۔ یہ جو جلسوں کی صدارت کا مضحکہ خیز شوق ہے، ہماری ادبی بلکہ عوامی

زندگی کا افسوسناک پہلو بھنا چاہیئے۔ ایک صاحب جو صدارت کے شوقین ہیں، خیر مقدمی تقاریب کے خواہشمند حضرات کی آرزوؤں کی تکمیل کرتے ہیں اور یہ اُن کا کاروبار سا ہے۔ فیروز حیدر ان ہی کی زبانی کہلواتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ تان کہاں ٹوٹتی ہے۔

"ابتداء میں انھیں صرف صدارت کا شوق تھا لیکن جب سے انھیں خیر مقدمی جلسوں کا چسکہ لگا ہوا ہے میرا دھندہ چمک گیا ہے اور اَب تو یہ حال ہے کہ اُن کے عزیزوں میں سے کسی نے بُش شرٹ سلوایا تو خیر مقدم، کسی نے چپل خریدی ہو تو خیر مقدم۔ اور تو اور پرسوں جب اُن کے بیٹے کو نوکری سے نکال دیا گیا تو بھی انہوں نے خیر مقدمی جلسہ کروایا اور آج اُن کے بیٹے کی شادی کی خوشی میں خیر مقدمی جلسہ ہے تم بھی ساتھ چلو۔ ہم نے کہا۔ شادی کے موقع پر خیر مقدمی جلسہ کیوں یہاں تو تعزیتی جلسہ کروانا چاہیئے۔"

ارشد علی خان پر مشتاق احمد یوسفی کا اثر واضح ہے۔ اپنے مضمون "موتگ" میں انہوں نے اس خصوص میں اشارہ بھی کیا ہے۔ وہ زبان بڑی اچھی استعمال کرتے ہیں، جملوں کا دروبست چست ہوتا ہے، اندازِ تحریر متوازن اور لہجہ میں ایک ٹھہراؤ اور قرار، سنبھل سنبھل کر اور اس احساس کے ساتھ کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لکھنے کی کیفیت اور تو اور اُن کا کردار "مرزا" بھی مشتاق احمد یوسفی کے "مرزا" کی یاد دلاتا ہے۔ ارشد علی خاں کے مضامین اونچے درجے کی اور عمدہ مزاح کے حامل ہوتے ہیں۔ "ابہام اور ہم" "فنِ عروض" "کرایہ دار" "آر۔ ایم۔ پی" "شوق ہر رنگ" اور "مرنا اگر ایک بار ہوتا" ارشد علی خاں کے اچھے مضامین ہیں۔ ظاہر ہے یہ علمی و ادبی ذوق رکھنے کا نتیجہ ہے کہ جہاں تہاں وہ بڑے بانکے فقرے بھی تراش لاتے ہیں۔ میں زیادہ نہیں بس ایک دو فقرے درج کروں گا۔

"یار تم بھی الہامی آدمی ہو! اگر چاہو تو جھوٹ پیغمبری کا دعویٰ باآسانی کر سکتے ہو۔"

"تمہیں سمجھانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھی کافی نہیں ہوں گے۔"

حبیب ضیاء نے بھی مزاح نگاری کی طرف توجہ دی ہے۔ "دکنی زبان کی قواعد" اور "مہاراجہ کشن پرشاد، حیات اور ادبی کارنامے" جیسی کتابیں بھی انہی کی ہیں۔ پتہ نہیں یہ احساس کہاں تک درست ہے لیکن لگتا یہی ہے کہ حبیب ضیاء کا مزاج تحقیق کا زیادہ اور مزاح کا کم ہے۔ ان کے ہاں طنز و مزاح پر سنجیدگی اور متانت کی چادر تنی رہتی ہے کہ لطف اندوز ہونا کم ہی ہوتا ہے۔ اور پھر آمدکی کمی۔ آج کے معاشی اور معاشرتی طور پر اوسط طبقے کی زندگی، ان کی کامیابیاں، اُن کی محرومیاں اور زندگی کرنے کے لئے اُن کی مساعی وغیرہ، حبیب ضیاء کے موضوعات ہیں۔ اُن کی نگاہ تیز ہے جب اُن کی قوتِ احساس میں بھی یہی تیزی اور شدت پیدا ہوگی تو ان کے مضامین مزہ دیں گے۔ ویسے "دسترخوان کی شہزادیاں" مزاح کے ذیل میں اور "آٹو والے" اور "بدیسی مال" اُن کے گوارا مضامین ہیں۔ "بدیسی مال" کا موضوع ان دنوں بیرونِ ملک جانے والے اور یہاں اُن کے رشتہ دار ہیں۔ حبیب ضیاء نے طنز کو کام میں لایا ہے لیکن اس ضمن میں اُن کا کچھ اور دلچسپ مضمون ہے "بچہ باہر گیا ہے" جس میں ان دنوں باہر خصوصاً مشرقِ وسطیٰ جانے والوں اور یہاں اُن کے عزیزوں اور احباب پر اتنے حقیقت پسندانہ طنز ہیں کہ حبیب ضیاء تھوڑی بہت داد وصول ہی کر لیتے ہیں۔

لیئق صلاح نے اپنے مضامین کے مجموعہ "سنی سنائی" میں لکھا ہے "ہمارا اور مزاح کا تعلق پیدائشی ہے"۔
لیکن اُن کے مضامین پڑھنے سے اس کا کچھ زیادہ اظہار نہیں ہوتا۔ ہاں زبان و بیان کی شگفتگی سے ان کے مضامین پیراستہ ضرور ہیں۔ ان کے ہاں بے حد لطیف مزاح ملتا ہے۔ لیئق صلاح نے بالعموم دکنی اُردو کے الفاظ، محاوروں اور تلفظ سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے "سنی سنائی" کے مقدمہ میں حیدرآباد کے مزاح نگاروں سے شکایت کی ہے کہ "وہ اپنی مقامی بولی اور مقامی لہجے کا استعمال اپنی تحریروں میں کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں شمالی ہند کے اکثر قاری ان مضامین سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو پاتے"۔ یہ شکایت درست بھی ہے اور نہیں بھی۔ اس لئے کہ مقامی بولی، مقامی محاوروں، اصطلاحات اور تلفظ کا استعمال بڑے بڑے فنکاروں نے بھی کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ یہی اُن کی امتیازی خصوصیت بھی قرار پائی ہے۔ اُدھر مغربی زبانوں کے فنکاروں میں والٹر اسکاٹ اور وِٹمن کی تحریروں میں مقامی رنگ سے کس کو انکار ہے اور خود ہمارے ہاں رشید احمد صدیقی اپنی "علی گڈھ زندگی" کی وجہ سے "بدنام" ہیں اور یوسف ناظم کے ہاں بھی حیدرآباد کا مقامی رنگ ہے لیکن بھرپور اور دلآویز۔ اصل بات یہ ہے کہ زبان و بیان اور موضوعات کے ساتھ یہ مقامی رنگ کس قدر باہمگر ہوتا ہے اور معنویت کا حامل؟ یہ تو فنکار کا رویہ ہے کہ وہ ہنرمندی سے مقامی رنگ کو بھی آفاقیت عطا کر دیتا ہے۔ ورنہ دیکھا یہ بھی گیا ہے کہ آپ لاکھ عالمی امن کی باتیں کرلیں سلیقہ نہ ہو تو محلہ کا فساد بھی روک نہیں سکتے۔ بہرکیف لیئق صلاح دکنی اُردو کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے میں کہیں کہیں کامیاب بھی ہیں۔

رشید الدین نے روزمرہ کی زندگی کی وارداتوں کو طنز و مزاح کے پیرایہ میں اچھوتے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہے جو اُن کے مترجم ہونے کا نتیجہ بھی ہے۔ اُن کی تحریر میں سادگی ہے۔ لیکن لطیفوں کے استعمال کے باعث ان کی سحرکاری پر ضرب پڑتی ہے۔ اُن کے مجموعہ مضامین "خواہ مخواہ" کے کئی فن پارے دلچسپ ہیں۔

بشیر انور بھی ہیں جن کا قابلِ ذکر مضمون "جائیں تو جائیں کہاں" ہے۔ مشرقِ وسطیٰ جانے والوں، نئے دولتمندوں پیٹرو ڈالر کمانے والوں اور اُن کے مسائل کو بشیر انور نے طنز و مزاح کا عنوان بنایا ہے۔ میں اُن کے مذکورہ مضمون ہی سے یہ اقتباس سناتا چلوں:

> "اپنے یہاں تو لڑکے نوکری کا اور لڑکیاں شادی کا انتظار کرتے کرتے بوڑھے ہو جاتے تھے۔ پڑوسی ملک میں پیٹرول کیا نکل آیا کہ ساری قدریں بدل گئیں۔ اب لڑکیاں دولہا کے انتظار میں بوڑھی نہیں ہوتیں بلکہ اپنے بوڑھے دولہا کا انتظار کرتی ہیں"۔

عابد معز نے "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ گویا شہر حیدرآباد کی زندگی کی نبض پر اُن کا ہاتھ ہے۔ اس کے علاوہ بھی اُن کے مضامین ہیں لیکن موضوعات و مسائل وہی جس سے ہماری زندگی دوچار ہے۔ اس نوع کے مضامین عموماً اسی وقت کامیاب ہوتے ہیں جب طنز کی کارفرمائی زیادہ ہو لیکن عابد معز کے ہاں طنز ابھی بھرپور نہیں ہاں "شیطانی چکر" وغیرہ میں انہوں نے ڈاکٹروں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے، اور "انگلش میڈیم اسکول" میں بے سوچے سمجھے انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے بطور اپنانے والوں پر طنز ہے۔ "مظلوم کے مشورے" میں شوہر کی شخصیت کو دنیا میں بہت مظلوم قرار دیتے ہوئے گویا کامیاب ازدواجی زندگی کے مشورے دیئے گئے ہیں۔ ممکن ہے اس میں اُن کے شخصی تجربات بھی شامل ہوں۔

ہاشم علی اختر نے اپنی بے پناہ انتظامی مصروفیات کے باوجود جتنا بھی لکھا، خوب لکھا اور جس موضوع کو بھی ہاتھ لگایا

اُس سے انصاف کیا۔ خاص طور پر زندہ دلانِ حیدرآباد کی پندرھویں سالانہ تقاریب میں اُن کی تقریر (جو شائع ہو چکی ہے) دلآویز اور نکتہ رس ہے۔

احسن علی مرزا نے پیشۂ صحافت سے وابستگی کی وجہ سے زندگی کے نشیب و فراز کو پیمانۂ امروز فردا میں ناپا اور جب بھی موقع ملا صحافت کے علاوہ طنز و مزاح کی سمت بھی توجہ دی۔ "زہر خند" پڑھیے احسن علی مرزا کے طرزِ تحریر کی ستائش کرنی پڑے گی۔

طالب خوندمیری نے شاعری میں طنز و مزاح کا جادو جگایا ہی ہے کبھی کبھی اپنے قلم کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے مضامین بھی لکھے۔ اُن کے مضمون "ڈائننگ ٹیبل سے آگے" کو میں اشاریتی فن پارہ کہوں گا۔ ہماری تہذیبی، سیاسی اور ادھر قومی اور گھریلو زندگی پر انہوں نے خوب خوب وار کئے ہیں۔

زینت ساجدہ کی شگفتہ مزاجی اُن کی تحریر میں بھی جھلکتی ہے۔ زبان و بیان کا رچاؤ، خوش سلیقگی اور دھیا اور فرحت بخش طنز اور دل آسا مزاح سے زینت ساجدہ کام لیتی ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح کے متعلق اب تک جتنا بھی لکھا ہے مجموعہ کی شکل میں شائع ہو جائے تو یہ بھی وقیع ہوگا۔

اور ادھر ایک اسے۔ نعیم نیاز حجت کے طنز و مزاح کے حامل مضامین میں "حیدرآباد کا پرسوں" "ہم زلف" اور "جیمس بانڈ سے بروک بانڈ تک" دلچسپ ہیں۔

رؤف خیر نے بھی طنز و مزاح کی طرف توجہ دی۔ "سگ گزیدہ" پڑھیے۔ و نیز مظہر الزماں خاں کا "بھگوان کا مشورہ" محمد رضی الدین معظم کا "بُرے پھنسے بردکھاوے میں جاکر"، سید علی خوندمیری کا "فٹ پاتھ ہیر کٹنگ سیلون" ملک فیاض کا "پُل صراط" اقبال شیدائی کا "بھاگم بھاگ" مرزا مقبول بیگ کا "آسیب والی" محمد یوسف مڑکی کا "قصّہ ہمارے بیک ورڈ ہو جانے کا" نجمہ علی اکبر کا "جلسہ گاہ اور ہم" سید محمود حسین کا "مزاج پُرسی" اور فضل جاوید، احمد جلیس اور ڈاکٹر منان کے بھی بعض مضامین قابلِ ذکر ہیں

جیلانی بانو، اختر حسن، عوض سعید، طاہر قریشی، فاطمہ عالم علی خاں، صفیہ اریب، اسحٰق ایوبی، حاجی بشیر نعیم زبیری، فرید سحر، اور عابدہ محبوب وغیرہ نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کم ہی لکھے ہوں لیکن اُن کے افسانوں، انشائیوں اور عام مضامین میں شگفتہ نگاری اور طنز و مزاح کی جھلکیاں مل ہی جاتی ہیں۔

میں نے یہاں زبان و بیان، فن اور قواعد کی سمت توجہ نہیں دلائی ہے لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمارے بیشتر طنز و مزاح نگاروں کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے میں بھی مانتا ہوں، ایک اچھے ادیب کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اچھا قواعد داں بھی ہو اور زبان و بیان کا پارکھ بھی لیکن فن، زبان و بیان اور قواعد سے غفلت برتنے کا بھی کسی ادیب کو حق نہیں پہنچتا۔ ورنہ ظاہر ہے آپ کچھ دیر کے لئے لوگوں کو ہنسا لیں لیکن ادب میں مستقل طور پر ہی کیا تا دیر بھی اپنی جگہ نہیں بنا سکیں گے۔ رشید قریشی نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے چودھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے صحیح کہا تھا:

> "دراصل مزاح نگاری کو بچوں کی ہنسی سمجھا جا رہا ہے۔ ادبی محاسن یا فنی نکات پر دھیان دیتے ہوئے مزاح پاروں کی تخلیق کی طرف کوئی مائل ہی نہیں ہوتا۔"

آزادی کے بعد، حیدرآباد میں طنز و مزاح کا یہ جائزہ مکمل نہ ہوگا اگر میں یہاں کے مزاح گر کا ذکر نہ کروں۔ جی ہاں! میں مزاح گر ہی کہوں گا، ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کو۔ جن کے "شگوفہ" نے جو زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان بھی ہے کئی اصحاب کو طنز و مزاح نگاری پر مائل کیا، کئی نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ جنھوں نے اپنے قلم رکھ دیئے تھے اُن کے ہاتھوں میں پھر قلم تھمایا۔ طنز و مزاح کے موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کی ادبی اعانت کی۔ اپنے رفقاء کے تعاون سے طنز و مزاح کے جلسوں اور تقاریب کا انعقاد کیا، کانفرنسیں بلائیں۔ نہ جانے کتنی کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی اور "شگوفہ" کے بھاری بھرکم اور ضخیم خصوصی نمبر شائع کئے۔ غرض اب تو ایک کارواں بن گیا ہے اور کچھ ایسا کہ اُردو ادب کی تاریخ میں حیدرآباد کے طنز و مزاح نگاروں کا حصہ بہت زیادہ، غیرمعمولی اور وزن و وقار کا حامل ہوگا۔

— —

دے کے خط...

(مراسلے)

جناب واہی کے دو خط

▪ پٹنہ۔ ۲۶ دسمبر ۸۷ء

عزیزی زندہ باد ــ! کیا شاندار 'مجتبیٰ حسین نمبر' نکالا ہے۔ روح خوش ہوگئی۔ آج صبح سویرے 'سنیل کمار تنگ' سیوان سے آئے اور آپ کے خط کے ساتھ یہ خوبصورت تحفہ دے گئے۔ مجھے اس کا شدت سے انتظار تھا۔ دیکھتے ہی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی دل سے آپ کے لئے دعا نکلی۔ واقعی یہ آپ کا زبردست کارنامہ ہے کہ اتنا ضخیم نمبر اتنی کم مدت میں نکالا اور تقریباً سارے اہم فنکاروں سے مضامین حاصل کر لئے۔ میں نے ابھی صرف فہرست پر نظر ڈالی ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ کس مضمون سے مطالعے کا سلسلہ شروع کروں، ہر مضمون کی سرخی اپنی جانب مجھے کھینچ رہی ہے۔ اور اس وقت میرا حال اُس بچے جیسا ہو رہا ہے، جو مٹھائیوں کی دوکان پر کھڑا للچائی نظروں سے انواع و اقسام کی مٹھائیاں دیکھ رہا ہو اور فیصلہ نہیں کر پاتا ہو کہ کس مٹھائی پر پہلے ہاتھ مارے۔ بہرحال خدا آپ کو زندہ و سلامت رکھے۔

• پٹنہ۔ ۳۰ دسمبر ۸۷ء

مجتبیٰ، خوش رہیئے۔ مجتبیٰ حسین کی تقریب رونمائی کے موقع پر آپ نے شگوفہ کے دستر خوان پر جو انواع و اقسام کے کھانے چنوائے۔ ان میں انتہائی مرغن ڈشیز کے ساتھ ساتھ پرہیزی پکوان اور چٹنی سلاد تک سبھی کچھ موجود ہے۔ ایک ذہین اور خوش ذوق داروغۂ مطبخ کا رول ادا کرتے ہوئے آپ نے نہ صرف مستند و ماہر ادبی باورچیوں سے بلکہ نومشق مگر ہونہار کاریگروں سے بھی پکوان تیار کرائے ہیں۔ مثلاً جہاں ایک جانب ڈاکٹر وحید اختر جیسے رند مشرب نے مغلئی خوانِ نعمت اور مولانا علی ناصر سعید طبقاتی (آغا سروش) جیسے پرہیزگار عالم دین نے خالص لکھنوی قلاقند سے دستر خوان کو زینت بخشی، وہیں یونس فہمی اور انیسہ سلطانہ نے دکنی آدابِ ضیافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اسی طرح سرور مرزائی (مرحوم) کی تیار کردہ اشتہا انگیز چٹنی اور سمیع جلیل کے منظوم سلاد نے اپنا اپنا حق ادا کیا ہے۔ میں نے یہاں نمونتاً یا مثالاً صرف دو چار باورچیوں کا ہی نام لیا ہے، ورنہ اس دستر خوان پر چنی گئی ہر ڈش ماہرینِ فن کی کفگیر بکف اعلیٰ صلاحیت کی غماز ہے۔ ذائقہ کے لحاظ سے ہر پکوان اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہے۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ادبی برادری کی جانب سے، یہ کارنامہ انجام دینے کے صلے میں آپ کو اس صدی کا "نعمت خانِ عالی" اور شگوفہ کے خاص نمبر کو "نعمت خانہ" کا خطاب دیا جانا چاہیئے۔

چلتے چلتے ایک اعتراف کرتا چلوں۔ میری نظم "تبصرہ نگاری" کا ایک مصرعہ ہے ؎

پڑھ کے لکھا تو تبصرہ کیسا؟

لیکن میں خلاف روایت ایک عام قاری کی نظر سے مجتبیٰ حسین نمبر کی ایک سطر پڑھنے کے بعد ہی ذہن پر جو نقوش مرتب ہوئے ان کا نچوڑ اوپر کے چند جملوں میں قلم برداشتہ لکھ گیا۔

رضا نقوی واہی ۔ پٹنہ

٭ ٭ ٭

▪ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے کامیابی سے اور شاندار پیمانے پر انعقاد کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں، دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد منظور احمد، اوکی چوبی (امریکہ)

٭ ٭ ٭

▪ حیدرآباد میں قیام کے دوران مجھے کسی لمحہ غیریت کا احساس نہیں ہوا۔ خصوصاً آپ کا حسن اخلاق ہر زاویۂ نظر سے سنیل کمار تنگ نواز ثابت ہوا۔ میں جو وہاں سے اپنا پن

کی خوشبو ذہن میں لایا تھا وہ دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی ہے میں اکثر ادبی حلقہ میں خصوصاً آپ کے اور عموماً حیدرآباد کے اراکین کے اندازِ کرم کا تذکرہ کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں نے اس سرزمین کی مٹی میں انسانیت کے ذرّوں کو اخلاق کے مہتاب میں چمکتے دیکھا ہے۔

سنیل کمار تنگ، سیوان

-٥- -٥- -٥-

■ میسور میں اُردو اکیڈیمی کی جانب سے (جس میں محترم لئیق صلاح کا بڑا ہاتھ تھا) شبِ مزاح منایا گیا۔ جناب مجتبیٰ حسین مہمان خصوصی تھے۔ ایک بات قابل ذکر رہی کہ حیدرآباد، کرناٹک کے مزاح نگار (حلیمہ فردوس، منظور وقار، فاروق نشتر اور میں) کامیاب رہے۔ اور یقیناً اس کامیابی کا سہرا شگوفہ کے سر جاتا ہے کہ آپ لوگوں کی کوششوں سے کل ہند سطح پر مزاح کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بے صبری اور جذبۂ برداشت کے فقدان کی وجہ سے فسادات ہو رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں مزاح آدمی میں صبر اور برداشت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کی موجودہ گھٹی گھٹی فضاء میں مزاح کو عام کرنے کی ضرورت ہے

رؤف خوشتر۔ بیدر

-٥- -٥- -٥-

■ "ظرافت" کا ایک خصوصی شمارہ "پاکستان میں فکاہیہ ادب کے چالیس سال" (۵۰۰) صفحات کی کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں آپ کے مفید مشوروں اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ فی الحال ہمارے ذہن میں اس شمارہ کے چار حصے ہوں گے۔ (۱) فکاہیہ کالم (۲) فکاہیہ شاعری (۳) فکاہیہ مضامین (۴) انشائیے۔ سب کے مشوروں کی روشنی میں اس پروجیکٹ کو آگے بڑھایا جائے گا تاکہ یہ کتاب مستند اور معتبر ہو سکے۔

ضیاء الحق قاسمی
مدیر "ظرافت" کراچی

پھر ملیں گے اگر خدا لایا .... (اداریہ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سلور جوبلی تقاریب کے سوونیر اور مجتبیٰ حسین نمبر کے بعد نئے سال کی سوغات، ایک اور خصوصی شمارہ سالنامہ کی صورت میں آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ یہ پہلا سالنامہ ہے جس میں فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا کے مضامین شریک نہیں ہیں۔ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر جناب عبدالکریم ماہر بھی اس مہینے انتقال کر گئے۔ موصوف شگوفہ کے ہمدردوں اور مستقل قارئین میں سے تھے اور شگوفہ سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے انتقال پر ملال پر ہم ان کے فرزند جناب شاہد علیم (سب ایڈیٹر سیاست) اور دیگر پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

- مجتبیٰ حسین نمبر کی اشاعت پر ملک کے تمام ادبی حلقوں کی جانب سے پسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اکثر ادبی رسالوں اور معتبر روزناموں نے تبصرے شائع کئے اور خاص طور سے ایک ادیب کی شخصیت و فن کے مکمل جائزہ کو ادبی صحافت کا ایک تاریخ ساز اقدام قرار دیا گیا۔ آئندہ بھی انشاء اللہ اس نوعیت کے خصوصی نمبروں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مجتبیٰ حسین نمبر سالانہ خریداروں کو خصوصی رعایت کے ساتھ ارسال کیا جائے گا۔

کتابت: محمد عبدالرؤف - مسعود انور
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
قیمت فی پرچہ: [illegible] روپیہ ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے
عرب ممالک سے: ایک سو پچاس روپے
خط و کتابت کا پتہ: [illegible] کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون آفس 557716 فون مکان: 521064

کشمیری قوام

اِس ہتھیلی کے چھوٹے بڑے (فہرست)

مجتبیٰ حسین
(دلی)

س۔ ف۔ اعجاز

[کلکتہ میں "موسم بدل رہا ہے" کی تقریب رونمائی میں پڑھا گیا]

"موسم بدل رہا ہے" کی اشاعت پر میں اپنے دوست ن۔ س۔ اعجاز کو مبارکباد دوں گا ہی لیکن اس سے پہلے میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے اُن کا دلی شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہ یہ کتاب شائع نہ کرتے تو میرے کلکتہ آنے کی سبیل کیوں کر نکل سکتی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اردو کا ادیب اور شاعر ذرا سی بھی شہرت پالے تو اپنے پلے سے کرایہ ادا کر کے سفر کرنے کو اپنے اُوپر حرام کر لیتا ہے۔ اُس کے پاس ذوقِ سفر تو اُس کا اپنا ہوتا ہے لیکن سفر کے دیگر لوازمات حتیٰ کہ سامانِ سفر تک دوسروں کا ہوتا ہے۔ پھر آدمی کو اعزازی زندگی گزارنے کی لت پڑ جائے تو معاملہ کچھ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ ہمیں اردو کے ایک شاعر کی یاد آ گئی جنھوں نے اپنی حقیقی بھتیجی کی شادی میں شرکت کی تو نہ صرف آنے جانے کا کرایہ وصول کیا بلکہ اس مبارک و مسعود موقع پر سہرا پڑھنے کا اتنا ہی معاوضہ لیا جتنا وہ عام مشاعروں میں لیا کرتے ہیں۔

کلکتہ میں تیسری مرتبہ آ رہا ہوں لیکن اسے دیکھنے کا شرف پہلی مرتبہ حاصل کر رہا ہوں۔ ایک بار ٹوکیو جاتے ہوئے پلین میں بیٹھے بیٹھے اس کا دیدار کیا تھا۔ لیکن یہ دیدار بھی کوئی دیدار ہوا۔ دوسری مرتبہ کچھ یوں ہوا کہ مجھے پٹنہ سے حیدرآباد جانا تھا۔ دوستوں نے کہا پٹنہ سے حیدرآباد جانے کا آسان راستہ یہ ہے کہ پہلے کلکتہ چلے جاؤ۔ وہاں چار پانچ گھنٹے رُکو اور ایسٹ کوسٹ ایکسپریس پکڑ کر حیدرآباد چلے جاؤ۔ میں نے سوچا تھا کہ چار پانچ گھنٹوں میں جتنا کلکتہ بھی دکھائی دے جائے اسے دیکھ لوں۔ سو میں نے محترم ا۔ س۔ ملیح آبادی اور ظ۔ اوگانوی صاحب کو خطوط لکھے کہ میں کلکتہ آ رہا ہوں۔ (میں یہ صراحت بھی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ا۔ س۔ ملیح آبادی اور ظ۔ اوگانوی سے یہاں میری مراد احمد سعید ملیح آبادی اور ظفر اوگانوی سے ہے جب سے ماہنامہ "انشا" کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز سے میری ملاقات اور "انشا" کے نائب مدیر جی۔ ایم۔ جگنو سے میری خط و کتابت کا آغاز ہوا ہے میں اکثر ناموں کے ساتھ نہ جانے کیوں ایسا سلوک کرنے لگا ہوں۔ وہ یوں کہ خطوط پر پتہ لکھتے ہوئے کا تجربہ کو ک۔ پیدا اور بیاکنی اپدم کو م ک۔ لیدم لکھنے لگا ہوں) خیر! اس مسئلہ پر الگ سے روشنی ڈالوں گا۔ فی الحال تو اپنے دوسرے سفرِ کلکتہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اکتوبر ۱۹۸۵ء کی ایک صبح کو پٹنہ اسٹیشن پہ پہنچا۔ بہت دیر تک پلیٹ فارم

پر ا.س. ملیح آبادی صاحب اور ظ. ادگانوی صاحب کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ نظر نہیں آئے تو پچاس پیسے کے چھ سکّے یکے بعد دیگرے ہوڑہ اسٹیشن کے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ میں ڈالے۔ ہمیشہ غلط نمبر سے میرا سابقہ پڑا۔ بلکہ ایک رانگ نمبر والے نے تو شائد بنگلہ زبان میں گالیاں تک دیں وہ تو اچھا ہوا کہ میں بنگالی نہیں جانتا اسی لیے بے مزہ نہیں ہوا۔ تھک ہار کے اس نتیجہ پر پہنچا کہ نہ صرف کلکتہ کے ٹیلی فون دہلی کے ٹیلی فونوں سے ملتے جلتے ہیں بلکہ یہاں کے باسی بھی دہلی کے باسیوں سے کم نہیں ہیں۔ سامان کو حفاظت گھر میں رکھ کر ہوڑہ اسٹیشن کے باہر آیا۔ سوچا کہ کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہی کلکتہ کے درشن کروں گا مگر معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کو میری آمد کی اطلاع پہلے سے مل چکی ہے (حالانکہ میں نے انھیں کوئی خط نہیں لکھا تھا)۔ سو اس دن انھوں نے ہڑتال کر رکھی تھی۔ چار و ناچار زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسے رکشا میں بیٹھا جسے ایک آدمی کھینچ رہا تھا۔ ہوڑہ کے پل کے دو چار پھیرے لگائے۔ پھر ہُگلی کے کنارے بیٹھ کر دریا میں کنکریاں پھینکنے کا جو سلسلہ شروع کیا تو دو چار گھنٹے اسی میں نکال دیئے۔ پچاس پیسے کا ایک اور سکّہ جو ٹیلی فون بوتھ میں ضائع ہونے سے بچ رہا تھا اُسے بھی ہگلی کی نذر کیا کہ یہاں کسی رانگ نمبر سے ملنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ پھر ایک تمنا یہ بھی تھی کہ لاکھوں انسانوں سے آباد اس شہر کو اپنی بھی کوئی نشانی دیتے جائیں۔ چنانچہ ہگلی میں میرے پچاس پیسے اب تک پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے میں نے تو لندن کی ٹیمز، پیرس کی سین، نیویارک کی ہڈسن، ماسکو کی مسکاوا، لینن گراڈ کی نیوا ندی میں بھی اپنا سرمایہ اسی طرح مشغول کر رکھا ہے۔ غریب آدمی کے پاس جب کچھ بھی نہیں ہوتا تو وہ اپنی محنت کی ارزانی اور جذبوں کی فراوانی کو اسی طرح غرقِ آب کرتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔ چار پانچ گھنٹوں بعد جب میں ہوڑہ سے روانہ ہوا تو غالب کے شعر کا مطلب اس کے پورے تناظر کے ساتھ سمجھ میں آ گیا کہ کلکتہ کے ذکر کے ساتھ غالب کا سینہ تیروں سے کیوں چھلنی ہو جاتا تھا۔ گاڑی جب رفتار پکڑ رہی تھی تو ایک ریلوے کراسنگ کے پاس مجھے ایک موٹر میں ایک صاحب نظر آ گئے جو احمد سعید ملیح آبادی صاحب سے بہت مشابہ تھے۔ میں نے فوراً اپنا ہاتھ ہلایا۔ اُن صاحب نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔ پتہ نہیں وہ صاحب احمد سعید ملیح آبادی تھے بھی یا نہیں۔ میں نے بعد میں اُن سے تصدیق بھی نہیں چاہی۔ مجھے تو اس وقت احمد سعید ملیح آبادی کی نہیں بلکہ ایک ایسے ہاتھ کی حاجت تھی جو کلکتہ سے مجھے وداع کرنے کے لیے ہوا میں لہرائے۔ تو یہ تھی روداد میرے دوسرے سفر کلکتہ کی۔

اب میرے تیسرے مگر اصل میں پہلے سفر کلکتہ کی داستان کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ دہلی میں اُردو کے ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقاریب کے دوران میں ایک نوجوان سے اچانک ملاقات ہو گئی۔

بولے "میں ف. س. اعجاز ہوں۔ کلکتہ سے اردو کا ایک رسالہ "انشاء" نکالتا ہوں"۔

یوں رسالہ اور رسالے کے مُدیر دونوں کا پہلی بار دیدار نصیب ہوا۔ ف. س. اعجاز کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا۔ البتہ "انشاء" کا علم پہلی بار سُنا تھا۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے۔ انھوں نے آہستہ سے پوچھا۔

"اعجاز تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ ف اور س کیا ہے؟"

میں نے کہا "ف سے فارسی اور س سے سنسکرت۔ یہ اپنی شاعری میں ان دونوں زبانوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں"۔

میرے دوست نے کہا "یار! یہ ن. م. راشد سے ہی پریشان تھے۔ اب ایک ف. س. اعجاز بھی آ گئے"۔

میں نے کہا "تم یقین کرو۔ ن۔م۔ راشد کی وجہ سے میں اردو کے حروف تہجی کی ترتیب بھول چکا ہوں "م" سا حرف ہمیشہ "ن" سے پہلے آتا ہے لیکن محض ن۔م۔ راشد کی مقبولیت کی وجہ سے میں نے "ن" کو ہمیشہ "م" سے پہلے رکھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اب "ف" کے بعد "ق" نہیں "س" کا حرف آیا کرے گا"۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں وہ جب بھی نظر آئے اپنا رسالہ کسی نہ کسی کو دیتے ہوئے نظر آئے۔ کانفرنس کے ایک ڈنر میں کھانے پر چھینا جھپٹی کے دوران میں آمنا سامنا ہوا تو مجھ سے پوچھا۔

"آپ کبھی کلکتہ آئے ہیں؟"

میں نے کہا "دو مرتبہ آچکا ہوں"۔

پوچھا "قیام و طعام کہاں تھا؟"

میں نے کہا "پہلی مرتبہ تو قیام و طعام ہوائی جہاز ہی میں رہا۔ دوسری مرتبہ ہوڑہ کے پل پر قیام رہا۔ طعام کی نوبت البتہ نہیں آئی"۔

میں نے سفر کی تفصیل سنائی تو بولے "آپ کو کلکتہ آنا چاہیئے"۔

میں نے کہا "اب کلکتہ آنے کی حاجت نہیں رہی کیوں کہ دہلی میں ش۔ زماں یعنی شمس الزماں سے تقریباً روز کا ملنا جلنا ہے۔ کلکتہ کی وہ ساری ہستیاں جو کلکتہ میں ہم جیسوں سے منہ چھپاتی پھرتی ہیں وہ دہلی میں شمس الزماں کے کمرہ پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ کلکتہ شہر کا حال چال بھی ان سے معلوم ہو جاتا ہے۔ خاصا اچھا شہر ہے۔ جہاں بھی رہیے آباد رہے احمد سعید ملیح آبادی اپنا "آزاد ہند" اور وسیم الحق صاحب اپنا "مشرق" مجھے بھیجتے رہتے ہیں۔ اب کلکتہ آکر کیا کروں؟"

اس ابتدائی ملاقات کے بعد وہ کلکتہ واپس چلے گئے۔ "انشاء" میرے پاس پابندی سے آنے لگا۔ ایک دن ان کا خط آیا کہ وہ "انشاء" کا احمد سعید ملیح آبادی نمبر نکال رہے ہیں۔ فوراً خاکہ روانہ کیجئے۔ میں کاہل اور سست آدمی ہوں۔ اور اگر کسی ایسی شخصیت کا خاکہ لکھنے کا مرحلہ درپیش ہو جس کا میں بے حد احترام کرتا ہوں تو اور بھی سست اور کاہل الوجود بن جاتا ہوں۔ ابتداء میں اپنی خاموشی سے ان کے صبر کا امتحان لینا چاہا لیکن انھوں نے میری خاموشی کو اپنے جبر کے ذریعہ توڑنے کا نسخہ آزمایا۔ یعنی اب کی بار اپنے رفیق جی۔ ایم۔ جگنو کو مجھے یاد دہانی کرانے کے کام پر مامور کر دیا۔ اب جو جگنو صاحب کے خط آنے لگے اور ان کے تقاضوں کے تیور دیکھے تو احساس ہوا کہ یہ وہ جگنو نہیں جو صرف رات کو چمکتا ہے بلکہ یہ وہ جگنو ہے جو دن میں بھی چمکنے کی اہلیت رکھتا ہے خطوں سے بات نہیں بنی تو کلکتہ سے ٹرنک کالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالآخر میں نے جگنو کو نہیں بلکہ جگنو نے مجھے پکڑ لیا۔ جیسے تیسے میں نے احمد سعید ملیح آبادی کا خاکہ لکھا اور اب تک شرمندہ ہوں کہ ان کا جس طرح کا خاکہ مجھے لکھنا چاہیئے تھا وہ میں نہیں لکھ سکا۔ اس خاکہ میں ان کی شخصیت اس طرح روشن نہیں ہو سکی جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی۔ یوں سمجھیے کہ جگنو کی چمک میں آپ انھیں جتنا دیکھ سکتے ہیں اتنا ہی دکھا پایا۔ مگر ایک بات مجھ پر یہ واضح ہو گئی کہ ف۔ س۔ اعجاز دھن کے پکے آدمی ہیں۔ کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر کر کے رہتے ہیں۔ جس پابندی سے وہ "انشاء" نکال رہے ہیں اتنی پابندی سے تو کوئی عابد عبادت بھی نہ کرتا ہوگا۔ میں نے ایک بار ان سے کہا "انشاء" سے مجھے یہ شکایت ہے کہ یہ اردو کا رسالہ نہیں لگتا۔"

بولے "وہ کیسے؟"
میں نے کہا "ہر مہینہ پابندی سے جو آجاتا ہے۔ بھیا! اُردو کا رسالہ ہے اسے اتنی پابندی سے نہیں نکالا کرتے۔ آپ اردو قارئین کی عادت بگاڑ رہے ہیں۔ میں اردو کے ایسے کئی ماہناموں سے واقف ہوں جو سال میں ایک مرتبہ نہایت پابندی سے اپنا شمارہ شائع کرتے ہیں۔ آپ تو اپنے اداریوں میں مالی مشکلات کا بھی ذکر نہیں کرتے۔ یہ تک نہیں بتاتے کہ آپ نے اردو کی بے لوث خدمت کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ لیا ہے۔ رسالہ کا نکالنا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ اس کے مدیر کا سر سے کفن باندھنا۔ اسی لیے تو اردو صحافت میں اب سر کم اور کفن زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ اردو کے بعض رسالوں میں چھپنے والے مواد کو دیکھ کر یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اُن کے مدیروں نے واقعی سر سے کفن باندھ لیئے ہیں۔ اگر سر سے کفن بندھا نہ ہوتا تو انھیں یہ پتہ تو چل جاتا کہ وہ اپنے رسالے میں کیا چھاپ رہے ہیں۔ اردو کی خدمت کرنے کا یہ جانبازانہ اور سرفروشانہ طریقہ اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ اب رسالہ نکالنے کا خواہشمند پہلے اخبار کا ڈیکلریشن نہیں لیتا بلکہ بازار سے پہلے ایک کفن لے آتا ہے۔"
میری اس بات پر وہ یوں شرما کر رہ گئے جیسے انھیں اپنی اس کوتاہی کا شدت سے احساس ہو رہا ہو۔
ایک بار "انشاء" میں میرا ایک مضمون چھپا۔ اس کے ردِ عمل کے طور پر میرے پاس ایسے ایسے مقامات سے قارئین کے خطوط آئے جہاں "انشاء" کے پہنچنے پر تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی مگر ملک کے ٹرانسپورٹ سسٹم کی ترقی نے مجھے ضرور حیرت زدہ کر دیا کہ یا خدا ان مقامات پر بھی اب بسیں اور ٹرینیں جانے لگی ہیں۔ "انشاء" بھی تو آخر ٹرینوں اور بسوں میں ہی جاتا ہوگا۔ سبحان اللہ کیا ترقی کی ہے اپنے ملک نے بھی۔
ابتداء میں "انشاء" کا مزاج بنا نہیں تھا مگر اب رفتہ رفتہ بنتا جا رہا ہے۔ بس ایک شکایت مجھے یہ ہے کہ رسالہ کے سرورق پر اکثر اوقات کسی یورپی حسینہ کی یا یورپ کے کسی منظر کی تصویر چھاپ دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "انشاء" کا تازہ شمارہ بہار کے عصری ادب کے لیے مخصوص ہے اور اس کے سرورق پر انگرڈ برگمن کی تصویر چھاپ دی گئی ہے۔ انگرڈ برگمن جیسی عظیم اداکارہ کی صلاحیتوں سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے مگر اُس کی اداکاری سے بہار کے عصری اردو ادب کا کیا رشتہ ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ پرسوں کی بات ہے اردو کے ایک استاد نے جو مخطوطات اور متقدمین کے کلام میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں، اس تصویر کے بارے میں جب مجھ سے دریافت کیا تو میں نے یونہی ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ بہار کی ایک خاتون افسانہ نگار کی تصویر ہے۔ اب یہ روز مجھ سے اس خاتون افسانہ نگار کا نام اور پتہ پوچھنے کے لیے آجاتے ہیں۔ راز دارانہ انداز میں یہ تک پوچھ چکے ہیں کہ موصوفہ کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ گویا اب مخطوطات سے اُن کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب کوئی مجھے بتلائے کہ میں انھیں کیا بتلاؤں۔
"انشاء" کا ذکر شاید یہاں نہیں ہونا چاہیئے تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ "انشاء" ف۔س اعجاز کے وجود اور اُن کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔
اسے ف۔س۔ اعجاز کی محبت نہ کہوں تو اور کیا کہوں کہ جب بھی دہلی آتے ہیں تو مجھے ضرور یاد کرتے ہیں۔ ایک بار آئے تو اپنی نظموں کا مجموعہ "مالک یوم الدین" مجھے دے گئے۔ جاتے جاتے کہنے لگے اگلا

شعری مجموعہ بھی جلد ہی آنے والا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اگلے مجموعہ کا نام بلاشبہ "ایاک نعبدو ایاک نستعین" ہوگا۔ وہ سچ مچ کمال کے آدمی ہیں۔ جو بات بھی کرتے ہیں اُس میں ندرت اور جدت کی گنجائش ضرور رکھتے ہیں۔

ڈیڑھ دو مہینہ پہلے دہلی آئے تو بولے "آپ کو کلکتہ آنا ہے"۔

میں نے کہا "اب آکر کیا کروں گا۔ جتنی کنکریاں ہُگلی میں پھینک سکتا تھا وہ میں نے پھینک دی ہیں"۔

بولے "آپ کو میرے شعری مجموعہ کی رسمِ اجراء انجام دینی ہے"۔

میں نے کہا "میں اور شعری مجموعہ کی رسمِ اجراء! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں ٹھہرا مزاح نگار اور آپ ٹھہرے شاعر۔ یوں بھی دوسرے درجہ کا ادب لکھنے والا، پہلے درجہ کا ادب لکھنے والے کی کتاب کی رسمِ اجراء کیوں کر انجام دے سکتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ موٹر ڈرائیور سے یہ کہیں کہ وہ ہوائی جہاز چلائے اور ہوائی جہاز چلانے والے سے یہ کہیں کہ وہ حکومت چلائے"۔

مگر ف۔س۔ اعجاز اپنی ضد پر اڑے رہے اور آج میں پوری ندامت کے ساتھ آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ سخن فہمی کے معاملہ میں میرا یہ وطیرہ رہا ہے کہ جب بھی کوئی شعر میری سمجھ میں نہیں آتا تو بے تحاشہ داد دیتا ہوں تاکہ اپنا اور شاعر دونوں کا بھرم قائم رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد بیشتر اردو شاعری کے تعلق سے میرا یہی رویّہ رہا ہے۔ اب جو ف۔س۔ اعجاز کی شاعری پڑھی تو مجھے ان کے کلام پر داد دینے کے معاملہ میں نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ یہ ایسی شاعری ہے جو نہ صرف میری سمجھ میں آرہی ہے بلکہ دل کو چھو رہی ہے، احساس کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے، ذہن کے نہاں خانہ میں بھی کچھ کچھ ہونے لگا ہے۔ شعر پڑھتے ہوئے اپنی ذات میں یہ سب کچھ ہونا ایک عرصہ سے بند ہو چکا تھا۔ اب یہ ہونے لگا ہے تو زبان سے داد کا ادا ہونا دشوار سا لگ رہا ہے۔ میں تو شعر پر اُسی صورت میں بے ساختہ داد دینے کا عادی ہو چکا ہوں جب یہ میری سمجھ میں نہ آئے۔ بھائی بیس پچیس برسوں کی عادت ہے۔ یونہی تھوڑا جائے گی۔ ف۔س۔ اعجاز کی شاعری ایسی نہیں ہے کہ آپ صرف شاعر کو داد دے کر ادب کا حساب بے باق کر دیں۔ یہ داد تو وہ ہے جو پڑھنے والا اپنے آپ کو چپکے چپکے دیتا ہے۔ ایسی داد کے لیے کسی بیجا شور و غل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لیے میں فی الحال ف۔س۔ اعجاز کو اُن کی شاعری پر داد نہیں دوں گا کیوں کہ اس شاعری کی داد، ایک قاری کی حیثیت سے پہلے میں اپنے آپ کو دینا چاہتا ہوں۔

میں ف۔س۔ اعجاز کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اُنھوں نے اپنے مجموعہ کلام کے پیش لفظ کا عنوان ہی رکھا ہے "کچھ اپنے قارئین سے"۔ گویا اب ادب میں بے چارے قاری کی اہمیت کو بھی محسوس کیا جانے لگا ہے۔ عرصہ ہوا کہ ہمارے سنجیدہ ادب کا معتبر اور ذہین قاری غائب ہو چکا ہے۔ پہلے شاعر اور قاری مل کر ادب کے بارے میں فیصلے کیا کرتے تھے مگر اب شاعر اور نقاد مل کر آپس میں ریوڑیاں بانٹ رہے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ ف۔س۔ اعجاز نے اپنی شاعری کے ذریعہ قاری اور فنکار کے رشتہ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ کوشش اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب کا موسم سچ مچ بدل رہا ہے۔ یہ محکمہ موسمیات کی رسمی پیش گوئی نہیں جو بعد میں حسبِ معمول جھوٹی ثابت ہو بلکہ یہ ایک جاندار، توانا، باشعور

اور باصلاحیت شاعر کے دل کی دھڑکنوں سے تشکیل پانے والی پیشین گوئی ہے جو کبھی جھوٹی ثابت نہیں ہوگی۔ میں روزنامہ "عکاس" کے مدیر کریم رضا مونگیری اور افضل اقبال کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے کلکتہ آنے کی دعوت دے کر اُن شخصیتوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا جنھیں میں عرصہ سے غائبانہ طور پر جانتا ہوں اور جن سے ملنے کی تمنا ہمیشہ میرے دل میں جوان رہی ہے۔ قبلہ سالک لکھنوی، علقمہ شبلی، اعزاز افضل، مبین رشید، قیصر شمیم، احسن مفتاحی، جسٹس خواجہ یوسف اور بعض دیگر اہلِ قلم، وہ شخصیتیں ہیں جنھوں نے ہر موسم میں اردو شعر و ادب کی شمع جلائے رکھی ہے۔ اور اب جب کہ موسم بدل رہا ہے مجھے یقین ہے کہ اس شمع کی لو کچھ اور بھی تیز ہوگی۔ میں ف۔ س۔ اعجاز کی ایک غزل کے چند شعر سنا کر اپنی بات کو ختم کرنا چاہوں گا۔

؎

آدھی ادھوری بات کی لرزش
ہونٹوں پر جذبات کی لرزش
آج بھی شانے پر ہوتی ہے!
اک انجانے ہات کی لرزش!
کتنے موتی رکھ پائے گی!
آنکھوں میں صدمات کی لرزش
تخت اُلٹ دے، تاج بدل دے
کاغذ کے صفحات کی لرزش!
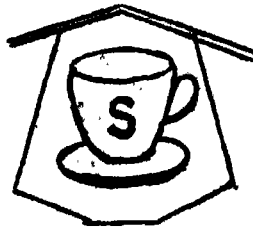
ام۔ اے پینڈے
لکچرر ہندی آرٹس کالج
حیدرآباد

ہندی سے ترجمہ
کیشو لال

نل اور دمینتی

نل اور دمینتی کی کہانی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مشہور ہے۔ پر آپ یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ نل کے ساتھ تو صرف ایک ہی دمینتی تھی پھر یہ دمینتیاں کہاں سے آگئیں۔ کیا راجہ نل کے پاس کئی دمینتیاں تھیں؟ آپ کا حیران ہونا بالکل واجبی ہے صاحب۔ راجہ نل بھی آپ ہی کی طرح ایک ہی بیوی والے شوہر تھے اور انھوں نے اپنی ایک ہی بیوی کو خوش رکھنے کے لیے دنیا کے سارے دکھ برداشت کئے جب کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ پر کریں بھی کیا۔ ہمیشہ سے یہ رواج چلا آیا ہے کہ ایک ہی بیوی والا شوہر دکھی ہی رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بیوی کو بھی دکھی بنا دیتا ہے۔ شاید اسی لیے بھگوان کرشن نے ایسی فاش غلطی نہیں کی۔ پھر بھی ایک بات تو ضرور سچ ہے کہ ان کے دکھوں کی وجہ سے ہی ان کی کہانیاں اتنی مقبول و مشہور ہوگئی ہیں کہ ان کی دکھ بھری کہانیاں سن کر بھی لوگ خوش ہوتے ہیں۔ مگر آج ہم جس نل کا ذکر خیر کر رہے ہیں وہ پرانوں کا نل نہیں ہے۔ آج کا نل ہے جو دکھی نہیں ہے بلکہ اپنے کارناموں سے لاکھوں دمینتیوں کو تکلیف پہنچا رہا ہے۔ دکھ دے رہا ہے۔ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کس نل کی بات کر رہا ہوں۔ یہ نل ہر جگہ ہے۔ مکانوں میں ہے۔ دکانوں میں ہے۔ مدرسوں میں ہے۔ مدرسہ گاہوں میں ہے۔ اور دواخانوں میں ہے۔ دفتروں میں ہے۔ ہوٹلوں اور سینماؤں میں ہے۔ گھروں اور باغ، باغیچوں میں ہے کارخانوں اور سڑکوں پر بھی ہے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ شہری زندگی کے ہر دائرہ عمل میں اس کا دخل ہے۔ گاؤں اور دیہاتوں میں اس کا اثر ضرور کچھ کم ہے مگر اب آہستہ آہستہ وہاں بھی اس کا دخل ہوتا جا رہا ہے تاکہ وہاں کے لوگ بھی مساوی طور پر دکھ میں مبتلا ہوں۔ آخر شہر اور دیہات کا فرق ختم کرنا ہی تو ہمارا مقصد حیات ہے۔ قومی فرض ہے یا یوں کہئے کہ فرض اولین ہے۔ ہمارے لیے آج نل پانی کا عظیم منبعٔ حیات ہے۔ شہر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ پانی کا منبع کنواں، تالاب یا ندی ہے۔ اگر آج ہم جدید شہروں کے کسی بھی بچے سے سوال کریں کہ ہمیں پانی کہاں سے ملتا ہے تو بلا تاخیر وہ جواب دے گا کہ نل سے ملتا ہے۔ اور کنواں، تالاب اور ندی کو انسان سے جوڑنے کا ایک واحد ذریعہ نل ہی ہے۔ نل کے بغیر شہری زندگی ایک دہ جیسی ہے۔ اس کے بغیر پھر ہم عہد قدیم کی طرف ہی جا سکتے ہیں۔ نل کو نل کیوں کہا جاتا ہے۔ کیا اس نل کا (عہد جدید کے نل کا) پرانے راجہ نل سے کوئی رشتہ وابستہ ہے —

اس کا جواب مجھے معلوم نہیں۔ شاید نَل سے نَل بنا ہو۔ مگر یہ نَلی کہاں سے آیا۔ زبان انگریزی میں پائپ کے آخر میں جو چیز لگائی جاتی ہے اسے نَل کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اصل ہے یا نقل۔ ملکی ہے یا غیر ملکی؟ مگر ہے کمال کی چیز۔ بھارت کی زیادہ تر زبانوں میں اسے نل ہی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا قیاس ہے کہ یہ لفظ سنسکرت زبان کا ہوگا۔ اور یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ہمارے پاس نل تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نل کا موجد راجہ نل ہی رہا ہو۔ تاکہ دمینتی کو پانی بھرنے کی زحمت اُٹھانی نہ پڑے۔ اور وہ راجہ نل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت پیار و محبت کے لیے نکال سکے۔ مگر صاحب! یہ صرف میرا ایک اندازہ ہی ہے کہیں آپ اسے سچ مان کر ہندوستان کی تاریخ میں اس حقیقت کو شریک کرنے یا شامل کرنے کے لیے کوئی تحریک شروع نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ پروفیسر آوک نے اس کے متعلق پہلے ہی سے تحقیق مکمل کر لی ہو!

خیر صاحب یہ نَل ملکی ہے یا درآمد شدہ کردہ ہے اس کا فیصلہ تو پروفیسر آوک پر ہی چھوڑ دیں گے۔ مگر ان سب سے علحٰدہ ایک اور حقیقت ہے کہ آج یہ نَل سب کو برابر پریشان کر رہا ہے۔ گزشتہ ایک سال سے ہمارے شہر میں ہر شخص نل کی ہی بات کرتا ہے اور نل کی ہی بات سوچتا ہے۔ آپ کسی سے بھی ملیئے وہ پہلا سوال یہی کرے گا کہ آپ کے پاس نل کب کھلتا ہے۔ پانی کتنا آتا ہے۔ کتنی دیر کے لیے آتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پہلے جب نل میں بے حساب پانی آتا رہتا تھا۔ تب اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی اور جب سے نل میں پانی کا آنا کم ہو گیا ہے تب سے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے اور معاشیات کا یہ اصول سچ ہوتا جا رہا ہے کہ نایاب اشیاء کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ عورتیں (دمینتیاں) دن تمام نل کو کوستی ہوئی نل کا ہی انتظار کرتی رہتی ہیں۔ نل کی وجہ سے صرف دمینتیاں ہی پریشان نہیں ہیں بلکہ ان کے شوہر اور بچے بھی مساوی طور پر پریشان ہیں۔ کیونکہ نل کا غصّہ دمینتی (عورت) اپنے خاندان کے افراد پر ہی نکالتی ہے۔ مگر وہ بے چارے کیا کریں۔ وہ لوگ بھی تو نل کی سازش کا شکار ہیں۔

لوگ ہر سال کسی نہ کسی وجہ سے ضرور پریشان ہوتے ہیں البتہ اس سال یہ کام نل نے کیا ہے جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ نل کا تعلق ذخیرۂ آب سے ہے اور ذخیرۂ آب کا تعلق ندی سے ہوتا ہے اور ندیوں میں پانی صرف بارش سے ہی آتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس بار شہر میں بارش نہیں ہوئی۔ اور چیزوں کا انتظام تو سرکار کر سکتی ہے! انھیں وہ کہیں سے بھی منگوا سکتی ہے مگر وہ پانی کہاں سے لائے! اس معاملہ میں کوئی شاطر رہنما بھی کوئی ہیرا پھیری نہیں چلا سکتا۔ کوئی چالاکی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں سرکار نے پانی کے لیے راشننگ کا انتظام کیا ہے۔ ہماری آزادی کے بعد سے سرکار نے پانی کے سوا ہر چیز کے لیے راشننگ کا انتظام کیا ہے۔ خود پانی کے لیے بھی اب یہ دفتار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس نے بھی کہا کہ ہم اپنا بھاؤ بڑھائیں گے۔ دیکھیں کہ آپ کہاں سے اس کا انتظام کرتے ہیں۔ سرکار کے پاس اس کا صرف ایک ہی معقول علاج تھا نل بند کر دیئے جائیں۔ اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نل دن رات بے خوف و خطر کھلے رہتے تھے وہ اب بند ہو گئے ہیں۔ [illegible] میں صرف ایک بار برائے نام دو گھنٹوں کے لیے انھیں لینے کی اجازت دی گئی ہے۔ جس کے بعد شہروں کی خواتین [illegible] دمینتیوں کے جہدِ مسلسل کا آغاز ہوا۔

اب نل کے ناز و نخرے بڑھ گئے ہیں۔ اس کی آمد کا کوئی معین وقت نہیں۔ چور یا گمنام عاشق کی طرح وہ کبھی [illegible] آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسے گمنام عاشق کہنا ہی واجب ہے کیوں کہ چور کا انتظار نہیں کیا جاتا ہے اخباروں میں [illegible] شائع کی جاتی ہے کہ نل کب چھوڑ دیا جائے گا۔ یا کھولا جائے گا۔ اگر مطلوبہ وقت پر نل کھل جائے تو سمجھئے کہ کوئی [illegible]

جلسہ میں وقت پر آ گئے ہیں۔ اس کے برعکس جیسا کوئی وزیر وقتِ مقررہ پر مقامِ جلسہ پر حاضر ہونے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے ٹھیک اسی طرح جناب نل صاحب بھی ٹھیک وقت پر کبھی بھی نہیں آتے ہیں۔ اس فن میں نل صاحب تو ایک وزیر سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ وہ کئی بار مقررہ وقت سے بہت پہلے تشریف فرما ہوتے ہیں اور ایسے وقت دلہنتی کی پریشانی کا حال نہ پوچھئے۔ دلہنتی کی حالت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ قابلِ دید ہوتا ہے وہ منظر۔

جب یہ نل بے وقت آتا ہے اس وقت وہ کسی اور کام میں مشغول رہتی ہے مگر اب مجبوراً اسے اس کام کو ادھورا چھوڑ کر اس نل کے پاس آنا پڑتا ہے۔ دوڑتے، گرتے پڑتے آنا پڑتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ گھر میں ہی نہیں رہتی۔ اور جب وہ واپس آتی ہے تو دیکھتی ہے کہ نل بہا یا جا رہا ہے تب وہ ایسے وقت محکمہ آب رسانی کے عہدیداروں کو گالی دیئے بغیر خاموش نہیں رہتی۔ اس کے برعکس کئی بار نل دیر سے آتا ہے تب بے چاری دلہنتی اپنے سبھی کام ادھورے چھوڑ کر گھر کے سارے برتن اور گھڑے نل کے سامنے باضابطہ ایک قطار میں رکھ دیتی ہے۔ مگر قسمت کی بدنصیبی کو کیا کہیئے کہ نل صاحب خفا ہو جاتے ہیں۔ اس میں پانی کا نام ہی نہیں ہے۔ دلہنتی پڑوس کے گھروں میں جا کر پوچھ آتی ہے کہ کیا آپ کے گھر میں پانی آ رہا ہے؟ اگر ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے تو وہ خوش ہو لیتی ہے۔ اور جب کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا اور پڑوس کے کچھ گھروں میں نل چالو رہتا ہے اور خود اس کے گھر کے نل میں پانی ندارد۔ تب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ پڑوسیوں نے کوئی سازشی چال چلی ہے اور کچھ کر کے ہمارے نل کو بند کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنے شوہر پر برس پڑتی ہے اور کہنے لگتی ہے "لوگ کچھ تو کر کے اپنے نل میں پانی لا رہے ہیں اور دیکھو تم ایک ہو کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوئے ہو۔" شوہر بے چارہ کیا کرے۔ جب کہ اسے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ پڑوسی کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ یہ تو محض ایک اتفاق ہے کہ ان کے پاس پانی آ رہا ہے اور وہ صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ ارے کئی بار اپنے پاس تو ان سے پہلے پانی آیا ہے۔ تب دلہنتی کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور وہ کہتی ہے "آپ چپ بھی رہیئے جب کچھ نہیں کر سکتے ہیں تو خواہ مخواہ زبان کیوں چلاتے رہتے ہو" اتنے میں نل سے سوسو، سی سی کی آواز آنے لگتی ہے اور ایک دم پانی آ جاتا ہے تب شوہر صاحب راحت کی سانس لیتے ہیں اور دلہنتی نل کو کوستے کوستے اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ حالانکہ نل پر ہر وقت پانی کی دھار کی رفتار ایک سی ہی رہتی ہے پر دلہنتی کو اشک لاحق ہوتا ہے کہ ہر روز پانی کی دھار کی رفتار میں کمی ہوتی جا رہی ہے اور یقیناً کوئی اور دلہنتی پمپ لگا کر اس کے پانی کو کھینچ رہی ہے۔ کچھ حد تک یہ بات سچ بھی ہے۔ کئی دلہنتیوں کے شوہروں نے ان کی سہولت کے لیے پمپ خرید لیئے ہیں جو نل سے پانی کو کھینچنے میں مدد دیتے ہیں اور نتیجتاً پڑوس کے نل کی دھار پتلی ہو جاتی ہے۔ جب کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پمپ لگا کر پانی کھینچنا ایک غیر قانونی فعل ہے مگر صاحب ہمارے یہاں کون قانون کی پرواہ کرتا ہے۔ کبھی کبھی نل دو گھنٹہ کی بجائے چار گھنٹے تک آتا رہتا ہے اور گھر میں برتنوں کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے تو کبھی نل ایک گھنٹہ میں ہی بند ہو جاتا ہے۔ اب اس بدنظمی کے لیے کون ذمہ دار ہے۔ محکمہ آب رسانی والے یا پڑوسی۔ اس کا راز آج تک فاش نہیں ہو پایا ہے۔ کچھ بھی ہو بہرحال دلہنتیوں کی پریشانیاں حسبِ حال برقرار ہیں۔

نل کی وجہ سے یوں تو سب ہی پریشان ہیں مگر اپنے متوسط طبقہ کی عورتوں کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا ہے اعلیٰ طبقہ کی دلہنتیاں اس سے زیادہ پریشان نہیں ہیں کیونکہ ایک تو پانی بھرنے کے لیے ان کے پاس نوکر ہوتے ہیں اور دوسرے ان کے گھروں میں بورویل کھدے ہوتے ہیں جسے موٹر بھی لگا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کے لوگ پانی کم پیتے ہیں اور اکثر وہ خوشبوؤں سے نہا لیتے ہیں۔ ان کے کپڑے لانڈریوں میں دھلتے ہیں

لوگ اکثر کھانا بھی باہر ہی کھاتے ہیں یا پھر کھاتے ہی نہیں ہیں کیوں کہ کئی طرح کی بیماریوں کی وجہ سے انہیں پرہیز انھیں کھانے سے منع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ اعلیٰ طبقہ کی دمینتیاں عام طور پر گھر پر بہت کم وقت کے لیے ہی رہتی ہیں۔ ادنیٰ طبقہ کی دمینتیوں کو بھی یہ جناب نل تنگ نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ ان کے گھروں میں ہوتے ہی نہیں ہیں اور اس طبقہ کی خواتین ہمیشہ ہی عام لوگوں کے لیے بنائے گئے نلوں سے ہی پانی حاصل کرتی ہیں۔ اب تو جگہ جگہ پر بورویل کے لگ جانے سے ان کا کام اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے وہ لوگ حسبِ ضرورت جب چاہیں تب بورویل کا ہینڈل مار کر پانی حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو پانی کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے پاس دھونے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا اور اپنے آپ کو بھی وہ لوگ بورویل پر ہی دھو لیتے ہیں۔

نل نے سب سے زیادہ متوسط طبقہ کی دمینتیوں کو پریشان کر دیا ہے۔ کم بخت یہ متوسط طبقہ ہے ہی ایسا یہ طبقہ خود بھی پریشان رہتا ہے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے سرکار بھی اسی طبقہ سے خوف زدہ رہتی ہے۔ متوسط طبقہ کی دمینتیاں گھر میں نوکر نہیں رکھ سکتی ہیں اور بورویل نگولنے کی بھی طاقت ان کے پاس نہیں ہوتی اور پھر وہ سڑک کی دمینتیاں بھی نہیں بن سکتی ہیں۔ سڑک پر جا کر بورویل سے پانی لانے سے ان کے متوسط طبقہ کے احساس کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اسی طبقہ کو پانی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے گھروں میں لوگ دن بھر پانی ہی پیتے رہتے ہیں۔ سب ہی کپڑے گھر میں ہی دھلتے ہیں، یہاں تک کہ چادریں اور پردے بھی گھر پر ہی دھوئے جاتے ہیں۔ برتن بھی اسی طبقہ کے لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر مہینے نئے برتن خریدتے رہنا ان کا ایک شوق ہے۔ اس پر ستم یہ کہ ہر روز گھر کو دھونے کا پاگل پن سوار رہتا ہے۔ ان کے گھروں میں ہر آدمی ہر دن نہاتا ہے۔ کچھ لوگ تو دن میں دو دو بار بھی نہاتے ہیں۔ نل میں اگر ذرا پانی زیادہ آنا ہو تو پوچھئے مت۔ پھر تو یہ گھنٹوں نل کے نیچے بیٹھے رہیں گے! اسی لیے نل نے بھی متوسط طبقہ کی دمینتیوں کو ہی پریشان کر رکھا ہے۔ ان دنوں یہ سب کچھ بھول سی گئی ہیں۔ پانی کے انتظار میں ایک دن گزارتی ہیں اور پانی کے آنے کے بعد نل کو کوستے ہوئے دوسرا دن گزارتی ہیں۔ نل کی وجہ سے ان کا نظام الاوقات ہی بدل گیا ہے۔ یہ اسی دن باہر جانے کا پروگرام بنائیں گی جس دن پانی نہیں آتا ہے۔ جو دن پانی آنے کا دن ہے اس دن وہ بڑی سے بڑی دعوت کو ٹھکرا دیں گی۔ نل کی وجہ سے ہی ممکن ہے کہ آج کل سینما گھروں میں ہجوم کم ہو گیا ہے اور محفلِ خواتین یا خواتین کی میٹنگیں بھی بند ہو گئی ہیں۔

محکمہ آبرسانی کی طرف سے نل کھولنے کا وقت بھی بڑی عجیب و غریب شکل اختیار کر گیا ہے کچھ علاقوں میں یہ علی الصبح چار بجے آ جاتا ہے تو کچھ مقامات پر دوپہر کے بارہ بجے آتا ہے اور کبھی کبھی تو رات کے دس بجے سے اس کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جہاں پر یہ صبح آتا ہے وہاں کی دمینتیاں تین بجے سے ہی اپنی نیند پر پانی پھیر کر اٹھ بیٹھتی ہیں اور اسی کی وجہ سے دوردرشن کے پروگراموں کو چھوڑ کر وہ آٹھ بجے ہی سو جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان حالات میں نئی شادی شدہ خواتین کی پریشانیاں الگ قسم کی ہیں۔ کئی وجہ سے وہ جلدی سو نہیں سکتیں اور صبح جلدی اٹھنا ان کے لیے ایک لازمی مجبوری ہو جاتی ہے انھیں یا تو اپنے پانی والے نل مہاراج سے پریم کرنا پڑتا ہے یا اپنے خاوند نل سے۔ نل مہاراج تو کسی بھی وقت مل سکتے ہیں پر نل کا تو بس ایک وقت مقرر ہے۔ اس لیے نل سے ہی چھٹکارا رہتی ہیں۔ جہاں پر نل دوپہر میں آتا ہے وہاں پر ایسی دمینتیوں کے لیے پریشانی ہے جو دفتر میں کام کرنے جاتی

ہیں۔ شاید ایسی دینیاں پانی بھرنے کے لیے کوئی جزوقتی ملازمہ رکھ لیتی ہیں۔ یا ساس سسر یا نند دیور کو پریم سے اپنے گھر میں رہنے کے لیے بلا لیتی ہیں۔ جہاں پر پانی رات کے وقت آتا ہے وہاں کی پریشانیاں کچھ اور ہی ہیں۔ بے چاری دینتی جمائیاں لیتے ہوئے نل کے سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ یہاں پر بھی تو شادی شدہ دینتی کی الجھن بڑی ہی عجیب ہوتی ہے۔ رات کے دس بجے اس کا نل راجہ اس کی راہ دیکھتا رہتا ہے جب کہ وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر نل کی خدمت کرتی رہتی ہے اور جب دو گھنٹے بعد نل بند ہوتا ہے تو بے چارے نل مہاراج سو چکے ہوتے ہیں۔

بہرحال زمانۂ قدیم میں ایک نل (راجہ) ایک ہی دینتی کو پریشان کیے ہوئے تھا مگر آج ایک ہی نل ایک ہی ساتھ لاکھوں دینتیوں کو پریشان کر رہا ہے!

△△

رضا نقوی واہی

ایک مکالمہ

ایک کفگیر نے چمچے سے کہا بجھ گیا منتری منڈل کا دِیا
ہم اندھیرے میں کِدھر جائیں گے
اپنے پیروں کے جو نیچے تھی زمیں دُور تک اب نظر آتی ہی نہیں
اب تو ہم لوگ بکھر جائیں گے
رزق کا تھا جو وسیلہ، وہ گیا اب نہ جل پائے گا گھر کا چُولھا
ہم تو بے موت ہی مر جائیں گے
بولا چمچہ کہ نہ گھبرا کفگیر ہاتھ لگ جائے گا پھر کوئی وزیر
اپنے حالات سدھر جائیں گے
رزق دے گا ہمیں اُوپر والا پھر بنائے گا ہمیں شہ بالا
گیسوئے وقت سنور جائیں گے
راستہ سارا ہے دیکھا بھالا ہاتھ میں اپنے لیئے جئے مالا
ہم سوئے بابِ اثر جائیں گے
ہم ہُنرمند ہیں گھبرائیں کیوں اپنی محرومی کا غم کھائیں کیوں
یہ بُرے دن بھی گزر جائیں گے

—: اسماعیل ظریف :—

سِیٹیاں

بجاتا ہی رہا وہ سیٹیوں پہ سیٹیاں لیکن
بڑی بی نے سڑک کو پار آخر کرلیا بڑھ کر
سپاہی نے قریب آکر بگڑ کے یوں کہا اُن سے
بڑی بی کیا تمہارا آج مرنے کا ارادہ تھا
میں بوڑھی ہوچکی ہوں اِس لیے مجبور ہوں بیٹے
میں رُک جاتی تھی اکثر ایک سیٹی پہ جوانی میں

بے روزگار

تنہا تھے رات دو بجے گھر جا رہے تھے ہم
اک شخص اک گلی سے اچانک نکل پڑا
کہنے لگا حضور کچھ امداد کیجئے
نادار ہوں غریب ہوں بے روزگار ہوں
اب میرے پاس کچھ نہیں پستول کے سوا

محمد خورشید آصف ([illegible])

راستہ چھوڑو راستہ روکو

نوزائیدہ ادبی تنظیم "انجمن غنچۂ ادب" کے ناظم اعزازی حاضرین جلسہ سے خطاب کرنے کے لیے بصد ناز تشریف لائے اور سمع خراشی کی پیشگی معذرت کے بعد یوں لب کشا ہوئے،

"حضرات! اس اجلاس کے انعقاد کا مقصد ملیح لفظوں میں یہ ہے کہ اربابِ خرد اور اربابِ اقتدار کی توجہ بعض تلخ حقائق اور حالاتِ حاضرہ کے پیدا کردہ کچھ سلگتے اور کچھ دہکتے ہوئے مسائل کی طرف مبذول کی جائے تاکہ وہ ان معاملات پر غور و خوض فرمائیں اور اگر اللہ انھیں توفیق دے تو کچھ عملی اقدامات بھی کریں۔

حاضرین جلسہ نے محسوس کیا ہوگا کہ آج کا نوجوان طبقہ ماشاء اللہ تعلیم یافتہ اور ذہین و فطین ہے، اور چشم بد دور، اس میں لیاقت و اہلیت کی کمی نہیں لیکن اس مصدقہ حقیقت کے باوجود انھیں موقع نہیں ملتا کہ وہ اپنے علمی و ادبی کمالات کا مظاہرہ کر سکیں۔

ہماری ٹریجیڈی یہ ہے کہ ہماری راہ میں سالخوردہ حضرات سنگی دیوار کی طرح حائل ہیں۔ ان کی موجودگی کے باعث ٹریفک جام ہو گیا ہے اور ہماری راہ مسدود ہو گئی ہے۔ یہ حضرات کتابوں کے پشتے لگا رہے ہیں، سرکاری اداروں سے زرِ نقد بعنوان نذرانہ وصول کر رہے ہیں، دیگر فتوحات مستزاد۔ لیکن ہم نوجوان ٹکٹکی باندھے دیدم دم نہ کشیدم کی عملی تفسیر بنے اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے ہیں۔ اس امید پر کہ آج وہ کل ہماری باری ہے لیکن تاحال ہمیں چانس ملنے کے آثار ہویدا نہیں۔ صبر و شکر تو دور کی بات ہے، ہمارے آگے کوئی گھاس تک ڈالنے کا روادار نہیں۔ ہم اپنی گرانقدر تخلیقات کا پلندہ اس طرح بغل میں لیے پھرتے ہیں جیسے سودا اپنے دلِ صد پارہ کو لیے پھرتے تھے، مگر کس نمی پرسد کہ بھیا کون ہو؟

ان حضرات نے اربابِ بست و کشاد کے گرد ایک حصار قائم کر لیا ہے جس کے باعث ہم مالِ غنیمت کے امین حضرات تک رسائی حاصل کرنے سے معذور ہیں۔ وہ انھیں بانٹتے اور ہمیں ڈانٹتے ہیں۔ چنانچہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ہم نے ایک باضابطہ تحریک شروع کی ہے جس کا نعرہ ہے "راستہ چھوڑو"۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ جو معمر حضرات سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں، انھیں راستہ سے ہٹنے پر مجبور کیا جائے تاکہ ان کی طرح ہم بھی اپنی غریبی دور کر سکیں اور ہمارا نام بھی بقدرِ لب و دنداں نکل سکے۔

مرد حضرات! اتنے دن تو ہم نے اس امید پر گزار دیے کہ یہ بھی آ جائیگا، از خود شاخ سے ٹپک پڑیں گے

لیکن ان لوگوں نے شاید کوئی اعلیٰ کوالٹی کا ریفا ئینڈ آبِ حیات پی رکھا ہے، کسی طرح دفعان ہونے کا نام ہی
چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ مذکورہ تحریک کا باضابطہ آغاذ کر دیا جائے اور ان ہیوی ویٹ حضرات کو ہٹا کر اپنی
کے مواقع حاصل کئے جائیں۔

حضرات! ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری تخلیقات کمیت وکیفیت کے اعتبار سے ان کے
ہیں۔ ان تخلیقات میں نہ صرف یہ کہ ہمارا خونِ جگر موجزن ہے بلکہ روحِ عصر بھی رواں دواں ہے اور یہ ہمارے
دروں کا مظہر بھی ہیں، لیکن ادبی دنیا کا بالائی طبقہ ہماری فکری کاوشوں کو قابلِ اعتناء نہیں سمجھتا انھیں لوا
اور خرافات کا پلندہ کہہ کر پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ نقادانِ فن بھی ہیں آئے دن سنگِ تنقید
سنگسار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ روش انتہائی دل آزار اور دل شکن ہے اور وہ اپنے منصب کا ناجائز فائدہ
رہے ہیں۔ ہمارا اصرار ہے کہ ہماری تخلیقات میں جملہ خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود ہماری
نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمیں اوورٹیک (Over-take) کے مواقع حاصل نہیں۔ آپ
امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ اوورٹیک کے لیے سفارشی خطوط لازمی ہیں۔ سفارشات، تخلیقات کو صا
اقتدار کے پاس براہ راست اس طرح لے جاتی ہیں، جیسے راکٹ مصنوعی سیارہ کو اپنی آغوشِ عاطفت
منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن بارگاہِ عالیہ تک جن کی رسائی ہے، خود ان کے درِ دولت تک رسائی
کرنا کبھی کارِ دسے کارد۔ کیوں کہ ان کے گرد حاشیہ برداروں کا ایک جم غفیر ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ اب
پاس کوئی ہنومان گیز تو ہے نہیں کہ اس مقامِ بلند تک پہنچ سکیں۔

اندریں حالات ہمارے لیے صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ایک طرف ہم رائے عامہ کو بیدار کر
کا آشیرواد حاصل کریں اور دوسری طرف اس ہجوم کو منتشر کرنے کی سعی کریں جو ہماری راہ میں حائل ہے۔

رخصت ہونے سے قبل ایک بات اور عرض کر دوں کہ بعض حضرات کی فہمِ ناقص میں ہم کم عمر ناتجربہ کار
ان حضرات کو سعدی علیہ الرحمہ کی وہ تاریخی ڈانٹ ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ بزرگی بعقل است نہ بسال۔

آخر میں اپنے دوستوں سے عرض کروں گا کہ وہ فارغ نہ بیٹھیں اور اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ ان کے
کی پیمانہ سے از خود چھلک جائے گی۔ یہ بزمِ دنیا ہے۔ یہاں کوتاہ دستی محرومی کی علامت ہے، اس لیے دراز
سے کام لیں اور مینائے مقصود پر قابض ہو کر شاد کام ہوں۔ اور آپ حضرات سے بھی خلوص التماس ہے کہ ہما
حق میں دعائے خیر کریں تا کہ ہم اپنے مشن میں ظفریاب ہوں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔ خداحا

ان کے بعد اس انجمن کے ناظمِ عمومی صاحب نے مائک سنبھالا اور رسمی باتوں سے گریز کرتے ہوئے انتہائی
سے فرمایا،

"حاضرینِ جلسہ سے بعد سلام مسنون عرض ہے کہ آپ حضرات کو ہمارے مسائل کا کچھ اندازہ ضرور ہوگا
اور یقین واثق ہے کہ ان مسائل کی سنگینی کا بھی آپ کو احساس ہوا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم دل شکستہ نوجو
ایک عرصہ سے غمِ زندگی کا لاشہ اپنے دوشِ ناتواں پر لیے لیے پھر رہے ہیں لیکن افق میں کوئی ستارہ تو کیا ا
ہلکی سی کرن بھی نظر نہیں آتی۔ کوئی ہمیں لفٹ دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہمارے معترضین بر بنائے مخاصمت کہتے ہیں کہ ہماری تخلیقات میں تغزل نہیں، ادبیت و شعریت نہیں

ملقات میں ردیف و قوافی کی پابندی نہیں اور ہم شلِ شتر بے مہار لشکر ادب میں ادھر ادھر مچا رہے ہیں اور فیلِ
مست کی طرح اقدارِ کہن کو پامال کر رہے ہیں لیکن یہ محض بہتان ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ ہم سے یہ توقع
رکھتے ہیں کہ ہم جسمانی طور پر موجودہ صدی میں زیست کریں اور ذہنی طور پر سابقہ صدی میں مراجعت کریں، فکرِ امروز
فروانہ کریں، محوِ غمِ دوش رہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ اس دورِ مصروفیت میں کسے فرصت ہے رات دن میسر نہیں
وہ تصورِ جاناں کیے بیٹھا رہے، تلاشِ قافیہ میں اپنا سر کھپائے اور سنگلاخ زمینوں میں تخم ریزی کر کے تنئے سنئے
گل کھلائے؟ یہاں تو خود ہمارا قافیہ تنگ ہے اور شوریدگی کے ہاتھوں سر وبالِ دوش بنا ہوا ہے۔

ان حضرات کا اصرار ہے کہ تشبیہ و استعارہ اور دیگر صنائع و بدائع عروسِ سخن کے زیورات ہیں اور یہ
نہ ہوں تو وہ زنِ بیوہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا استدلال یہ ہے کہ نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی دیکھو
بادرِ بن، گہنے کیسا خوشنما لگتا ہے؟ حسنِ ذاتی تصنع سے بَری ہوتا ہے، دلیل یہ ہے کہ گلاب کی قبا میں گل بوٹہ نہیں ہوتا۔
سادگی اور پُرکاری اور کم خرچ بالانشیں کا دور ہے، تشبیہ و استعارہ کے مرصع زیورات کا چلن کبھی رہا ہوگا مگر
اب وہ دن اُڑ گئے۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ اب فیشن بدل چکا ہے۔ زمرد کا گلو بند کبھی باعثِ زیبائش
رہا ہوگا مگر اب اس کا شمار طوقِ لعنت میں ہوتا ہے۔ عروسِ سخن کے وہ جڑاؤ زیورات اب ہمارے پائے تخئیل
کی زنجیریں بن گئی ہیں اور ہمارا یہ عزم بالجزم ہے کہ اب ہم پابندِ سلاسل نہ رہیں گے اور ان قیودِ آہنی سے رستگاری
حاصل کر کے رہیں گے تاکہ جب ہماری روح اور ذہن آمادۂ رقص ہوں تو یہ مزاحم نہ ہوں۔

ہمارے فاضل معترضین کہتے ہیں کہ غزل گوئی شلِ رقصِ طاؤس تھی ہم نے اسے رقصِ ابلیس کی طرح وحشت ناک
بنا دیا ہے لیکن بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ ان کشتگانِ تیغِ بے اعتنائی کا رقصِ بسمل ہے جو ادب کا رر فتہ اور غیر
مستحقین کو فیض یاب بلکہ سیراب دیکھ کر انگاروں پر لوٹ رہے ہیں اور اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں،
یہ حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہے ہیں کہ مالی اعانت، جزوی ہو یا کلی، اندھے کی ریوڑیوں کی طرح تقسیم ہو رہی
ہے۔ خدا ان تقسیم کنندگان کے دست و بازو کو نظرِ بد سے بچائے، ریوڑیاں بانٹنے میں ایسے مشاق و ماہر
ہیں کہ ہر چند وہ آنکھ پر پٹی باندھ کر بانٹنے کے مدعی ہیں، مگر کیا مجال جو ایک بھی ریوڑی دامنِ غیر میں پہنچ جائے۔ مستفید
ہونے والوں میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو برسرِ روزگار اور فارغ البال ہوتے ہیں۔ سالِ گزشتہ ایک ایسے شخص
کو نوازا گیا جس کی تنخواہ ڈبل فیگر میں ہے، کسی دل جلے نے کہا ہے

خیرات بٹ رہی تھی درِ شہر یار پہ ٭ سنتے ہیں اب کے سال سکندر بھی لے گیا

جو خود صاحبِ نصاب ہوں اور زکوٰۃ کے لیے کیو میں لگ جائیں تو پھر غریب غرباء کا پرسانِ حال کون ہوگا؟

مختصر یہ کہ ان کے حاشیہ بردار گل بداماں ہیں اور یاں انتظار و یاس کا یہ عالم کہ شاخِ گل سوکھ کے
گر جائے تو کاشانہ بنے۔

ہم نے اب تک سوزِ نہاں ضبط سے ہونٹوں کو سی رکھا تھا مگر اب وقت آگیا ہے کہ ہم محرومین یک جا ہو کر
اس تحریک کو مؤثر طور پر آگے بڑھائیں۔ میں حاضرین سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ وہ ہماری ہمت افزائی اور پشت
پناہی کریں اور دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ہم اپنے مقصد میں ضرور بالضرور کامیاب ہوں گے۔ میں دعا کرتا ہوں آمین ثم آمین
اس کے بعد محترم بہ نفسِ نفیس مائک پر تشریف لائے، حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور شروع ہو گئے۔

"معزز سامعین! آپ نے فاضل مقررین کی تقریریں سن لی، اُنھوں نے اپنا کلیجہ نکال کر آپ کے روبرو رکھ دیا۔ اس ضمن میں مزید گل افشانی کی ضرورت تو نہیں، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ان کی بیشتر شکایات درست اور مطالبات جائز ہیں۔ انھیں جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے وہ یقیناً باعثِ تشویش ہے۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت کے مرتکب ہوں، میں ذمہ دار حضرات سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ان شکایات کے ازالہ کے لیے فوری اور مؤثر قدم اُٹھائیں ورنہ میرا دل تو [illegible] جا رہا ہے کہ اگر یہ کھڑے ہو گئے تو انجام کیا ہوگا؟

میں سینئر حضرات سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ [illegible] خود ہی [illegible] ریٹائر ہو جائیں اور نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیں۔ جو حضرات آل ریڈی مستفید ہو چکے ہیں، اب ان کے بدستور ڈٹے رہنے کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہیں رہا۔ اب رہ گئے وہ حضرات جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور جن کی نظریں درِ دولت پر لگی ہوئی ہیں تو میں ان کے تئیں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے درخواست کروں گا کہ وہ اب حقِ یاس میں بارآور ہونے کی توقع نہ رکھیں۔ بہتر ہوگا کہ وہ گوشہ نشین ہو کر اپنے اعمالِ سابقہ کا جائزہ لیں اور سفرِ آخرت کے لیے توشہ فراہم کریں۔ اللہ بس، باقی ہوس!"

صدارتی تقریر کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ لوگ کافی متاثر بھی ہوئے اور کچھ دنوں تک اس مسئلہ پر بحث دلچسپی بھی رہی مگر مخالف کیمپ میں اس کا بہت شدید ردِّ عمل ہوا۔ پیرانِ جہاندیدہ، لاکھ ان کی قوت سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ انھوں نے سوچا قبل اس کے کہ یہ تحریک زور و قوت حاصل کرے اور عوام و خواص اس سے متاثر ہو کر اس کی حمایت کریں، اس کا اثر زائل کرنا ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے جوابی تحریک شروع کی جس کا نعرہ ہے "راستہ روکو"۔ اس سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اس تحریک کے [illegible] شرکت کی۔

جلسہ کا آغاز ایک پیرِ صد سالہ کی تقریر سے ہوا، جو ضعیف العمری [illegible] لگے تھے، موصوف نے فرمایا:

"سامعین کرام! ہماری تنظیم کے اس اجلاس کا مقصد غالباً آپ سے مخفی نہ ہوگا، یہ ایک متوازی تنظیم ہے، جس کا نعرہ ہے "راستہ روکو" یعنی عرصۂ ادب میں نوآموز، غیر تربیت یافتہ [illegible] دعوے دار افراد کو داخل ہونے سے روکا جائے کیونکہ یہ بارگاہِ ادب ہے سینما ہال نہیں کہ جو [illegible]

برخورداروں کا یہ قول بیا بانی ہیں زنگ [illegible] وہ اعتماد کی بہ نسبت کم ہے حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ پرانا لوہا، پرانی مشین اور پرانی کھوپڑی زیادہ پائیدار اور قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جتنی ان کی عمر ہے اس سے زیادہ ہماری سروس ہے۔ ان نادانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شاعر جب تک بوڑھا نہ ہو، اس کی شاعری پر شباب نہیں آتا۔ لہٰذا ہم سے یہ مطالبہ کہ ہم ایسے وقت سنیاس لیں جبکہ جوہر دکھانے کے دن ہیں، قطعی طفلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔

ہماری عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ تو بقول حسرت موہانی شعراء کے مصرعے اُٹھانے اور مُردوں کو کندھا دینے میں صرف ہو گیا۔ درِ دولت تو اب باز ہوا ہے، اور دامے، درمے کی نوبت تو اب آئی ہے، لہٰذا ایسے وقت میں جب کہ اربابِ اقتدار نہ صرف گل بلکہ ثمر بھی نہایت فراخدلی سے پھینک رہے ہیں، کیوں نہ ہم بھی حسبِ مقدور فیض یاب ہونے کی جستجو کریں۔

ہوتے ہیں طرزِ قدیم پر قائم ہیں اور خارج البحر اور ساقط الوزن اشعار سن کر اس طرح اچھل پڑتے ہیں گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

وہ مائک پر تشریف لائے اور اپنے مخصوص لوکیلے اور کٹیلے لہجہ میں کہنا شروع کیا،

"حضرات! آپ کو غالباً علم ہوگا کہ آج کل ہمارے نوجوانوں نے نا مہ قدا ایک تحریک شروع کی ہے، جس کا نعرہ ہے "راستہ چھوڑو" اور جس کا روئے سخن ہماری طرف ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ سعترت رساں تحریک ان نوجوانوں کے دماغ کی اختراع نہیں، کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ یہ تحریک ان کے ایماء پہ شروع کی گئی ہے جو ہماری صفوں میں اضطراب و انتشار کے خواہاں ہیں۔ ان برخورداروں میں ایسی دوررس اثرات کی حامل تحریک مستحکم طور پہ شروع کرنے کا سلیقہ کہاں؟ نہ ان میں کوئی لیاقت ہے اور نہ اہلیت ان کی علمی لیاقت کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ کل جو میری شامت آئی تو ایک گریجویٹ سے لفظ "ولد" کے معنی پوچھ بیٹھا۔ اس ہونہار نے ایسا صدمہ پہنچایا کہ دو انجکشن لینے کے بعد ہی طبیعت بحال ہو سکی۔ اگر میں نے کذب بیانی کی ہو تو روسیاہ۔

یہ مجوزہ تحریک قطعی احمقانہ اور اس کے شرکاء کی نا عاقبت اندیشی کی دلیل ہے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے؟ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ نہ عمر نہ لیاقت، نہ تجربہ نہ مشاہدہ، لیکن اساتذہ کے منہ آتے ہیں، بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ اتنی کچی عمر میں انھیں زمانہ کے سرد وگرم کا کیا تجربہ ہو سکتا ہے؟ اور ایسی صورت میں ان کی تخلیقات کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ۔ ظاہر ہے ان کے پاس جو سرمایہ ہے وہ محض کتابی اور اکتسابی ہے، ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی نہیں۔ شاعری محض مشق و مطالعہ سے نہیں آتی اور نہ حقیقی شاعر اس طرح گلی کوچوں سے ابلتے ہیں۔ نرگسِ سخن باغ ادب میں قرنوں تک زار و قطار بلکہ دھاڑیں مار مار کر روتی ہے تب ایک آدھ دیدہ ور پیدا ہوتا ہے قدرت نے ہمیشہ اس معاملہ میں بخل و خساست سے کام لیا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ شاعر ہونا ایک الگ بات ہے اور موزوں طبع ہونا دوسری بات، اور غزل گوئی تو خالصتاً وہبی صفت ہے۔ یہ وہ کافر صنفِ سخن ہے، جس کی شاطگی میں عمر صرف ہو جائے مگر اس کی زلفوں کے پیچ و خم کم نہیں ہوتے۔ ذہنی پختگی اور فکری بالیدگی کے بغیر شاعری بالعموم اور غزل گوئی بالخصوص ممکن ہی نہیں۔ غزل گوئی نینسی زیورات پہ نگینے جڑنے کا نام ہے، یہ جزو پیغمبری اور سحرِ حلال ہے، چاول پہ قل ہو اللہ لکھنے، رگِ گل سے بلبل کے پر باندھنے اور الفاظ میں بجلیاں پیس کر بھر دینے کا فن ہے مگر اس کے لیے سلیقہ شعاری شرط دل ہے۔ یہ وہ طلسم ہے جس میں بسا اوقات رات بھر انڈہ ابالنے کے باوجود کچا رہ جاتا ہے، مگر ان کے پیچھے یہ نزاکتیں اور رموز و نکات کہاں جانیں۔ ان کے نزدیک تو شاندار الفاظ اور خوبصورت ترکیبوں کا ڈھیر لگا دینے کا نام شاعری ہے خواہ مفہوم کے اعتبار سے وہ لایعنی ہی کیوں نہ ہو۔

حضرات! آپ نے پڑھا ہوگا کہ شاہ عالم نے ایک دن حضرت سودا سے دریافت کیا کہ "مرزا! کتنی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟"

سودا نے عرض کیا تھا "پیر و مرشد! جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں" شاہ عالم نے یہ سنا تو بڑی حقارت سے کہا "بس! ارے میاں ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں لکھ لیتے ہیں۔"

سودا نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضورا آں غزلوں سے بو بھی تو ویسی ہی آتی ہے" یہ کہہ کر چلے آئے اور پھر نہ گئے۔

اگر دور حاضر کے بیشتر شعراء کا کلام پڑھ کر نفاست پسند حضرات ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

شاعری بازیچۂ اطفال، قافیہ پیمائی یں شہ رگ تک سمٹ سکتی ہے۔ یہ پتہ مار اور زہرہ گداز فن ہے مشق و ممارست، عمیق مطالعہ اور بے پناہ ریاض کی متقضی ہے۔ آپ نے ان استاد کا نام سُنا ہوگا جو اس شرط پر کسی کو شاگرد بناتے تھے کہ وہ روزانہ بلا ناغہ ایک غزل کہہ کر لائے گا۔ چنانچہ جب شاگرد مسلسل کھپ کر ایک غزل مکمل کر کے لے کر آتے تو یہ خاموشی سے رکھ لیتے اور اس کے جانے کے بعد بغیر پڑھے کنوئیں میں ڈلوا دیتے۔ اس طرح ایک سال گزر جاتا پھر اس کے بعد اس کے کلام پر نظر ڈالتے اور اصلاح دیتے۔ جب تک دانہ کی ایسی تیسی نہ ہو جائے وہ گل دگلزا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا فنا فی الشعر کی منزل تک پہنچے بغیر ہماری ہمسری ممکن نہیں ؎

کس نیک کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

لیکن آج پوزیشن یہ ہے کہ ہر شخص خود کو تلمیذ الرحمان سمجھتا ہے اور اپنا کچا پکا کلام برائے اشاعت روانہ کر دیتا ہے۔

آخر میں، میں اپنے معاصر شعراء سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس نوع کی تحریکوں سے قطعی مرعوب نہ ہوں پوری قوت سے اپنی مدافعت کریں، اور عرفی کا یہ شعر ذہن نشین رکھیں ؎

عرفی مندیش ز غوغائے رقیباں ؛ آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہ "راستہ روکو" تحریک بروقت، برمحل اور اشد ضروری ہے۔ میں اس تحریک کے متعلقین کو اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے مرخص ہوتا ہوں۔"

اب جو بزرگ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے تشریف لا رہے ہیں، شعلہ بیانی اور تلخ گوئی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ آئے اور ایک ادائے خاص سے گویا ہوئے،

" حضرات! آج خلافِ معمول میرے دل میں درد سوا ہو رہا ہے، اس لیے براہ کرم میری تلخ گوئی اس امید پر گوارا فرمائیں کہ زہر بھی کبھی کار تریاقی کر جاتا ہے۔ اَلْحَقُّ مُرٌّ آپ نے سماعت فرمایا ہوگا یعنی سچ کڑوا ہوتا ہے اور چونکہ آج میں بے تحاشہ سچ بولنے کے موڈ میں ہوں اس لیے میری حق گوئی کے باعث بعض حضرات کو ذہنی اذیت ہو سکتی ہے، میں ان حضرات کی خدمت میں پیشگی معذرت پیش کرتا ہوں قبول فرمائیں میرا اندازِ بیاں گرچہ خوب نہیں ہے لیکن اس امید پر کہ شاید مری بات آپ کے دل میں اتر جائے سمع خراشی کی جرات کر رہا ہوں۔

ہاں! تو عرض ہے کہ کل ناگاہ اک کتاب پر نظر پڑی یا بالکل اسی طرح جس طرح میر کا پاؤں ایک کاسہ سر پر آ گیا تھا اور انھیں دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مذکورہ کتاب کے سر ورق پر نمایاں طور پر سے ایک سطری نوٹ لکھا ہوا تھا کہ "یہ کتاب کسی اُردو اکیڈیمی کے مالی تعاون سے شائع نہیں ہوئی ہے۔"

میں اس نوٹ کو دیر تک دیکھتا اور دور تک سوچتا رہا، اور آپ سے بھی دست بستہ ملتمس ہوتا کہ

بھی اس کے مضمرات پر سنجیدگی سے غور کریں کہ آخر مصنف کو اس لفظ کو نمایاں طور پر شائع کرنے کی ضر
کیوں پیش آئی؟ یہ بظاہر ایک سادہ سا جملہ ہے، مگر اس میں اک جہانِ معنی پوشیدہ ہے اور حساس ا
کے لیے مہمیز سے کم نہیں۔ خیر! میں نے ایک مصرعہ طرح دیدیا ہے، اسے آپ ہوم ورک کہیں اور گھر جا کر ا
سے اس پر طبع آزمائی کریں کیونکہ اب میں آپ کی توجہ آزاد، شلوی اور نثری نظم کی طرف مبذول کرنا چ
ہوں جو عصرِ حاضر کے سہل پسند نوجوانوں کا دلچسپ مشغلہ ہے اور شاید آخری پناہ گاہ بھی۔

اس قبیل کی برتراز خیال و قیاس و گمان و وہم نظمیں اور غزلیں منٹوں میں لکھی جا سکتی ہیں۔ اس خرافات
کا انجام یہ ہے کہ آج کل ادبی رسائل میں ایسے لوٹ نظر آتے ہیں کہ شعراء حضرات غیر طلبیدہ تخلیقات بر
اشاعت ارسال نہ کریں، دفتر میں ایسی تخلیقات کا انبارِ گراں موجود ہے۔ اس طرح کی نظمیں اور غزلیں وہی
لکھ رہے ہیں جو حریفِ تنظیم سے وابستہ ہیں۔

اگر ہمارے نوجوان برسرِ روزگار ہونے کے بعد شاعری کو بطور سائیڈ بزنس اختیار کریں تو کیا م
ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ جو حضرات اپنے نورِ نظر اور لختِ جگر کو ڈاکٹری اور وکالت وغیرہ کی تعلیم دلوا
ان کے بہی خواہ ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ ساتھ میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ بھی سکھلا دیں تاکہ ایک فاض
رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ یہی مشورہ میں نے ایک گیسو دراز نوجوان کو دیا تھا جس کی طویل بے ر
اور بسیار نویسی سے علی الترتیب والدین اور اڈیٹر صاحبان عاجز و نالاں ہیں، مگر اس نے گردن جھٹک کر کہا،

"کیا آپ نے مجھے ہرچرن داس سمجھ لیا ہے، کہیں ہرن پر بھی گھاس لادی جاتی ہے؟ کہاں اصنامِ خیال ک
اور کہاں یہ مغزِ سرکا آماس! لاحول ولاقوۃ . . . " وہ نوجوان اب بھی ابہام و علامات سے لبریز شا
مستغرق ہے۔ شاید آپ نے کبھی غور کیا ہو، اردو کے بیشتر نقاد گنجے ہیں۔ اس کی وجہ خدانخواستہ ان میں
دانش کی زیادتی نہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ جب تجزیاتی تنقید کے لیے اس قسم کی تخلیقات کا مطالع
ہیں تو بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں سے اپنے سر کے بال نوچنے لگتے ہیں، نتیجہ ظاہر ہے،

عجب تماشہ ہے، یار لوگوں نے اردو شاعری کو غریب کی جورو سمجھ لیا ہے،

جسے دیکھو وہی دست درازی پر آمادہ نظر آتا ہے۔ نہ لیاقت نہ مناسبت، لیس کاتا اور لے دوڑے۔ انھیں
ہونا چاہیئے کہ یہ بازارِ مصر نہیں بارگاہِ ادب ہے۔

ان حالات میں "یہ راستہ روکو" تحریک زبردست اہمیت کی حامل ہے اور آپ کے تعاون کی طالب
تاکہ نااہلوں کی ناکہ بندی ہو سکے، طوقِ زرّیں گردنِ خر کی زینت نہ بن سکے اور عقابوں کے نشیمن کرگسوں کے ق
میں نہ آسکیں۔ خدا حافظ۔"

دونوں تحریکیں زور و شور سے جاری ہیں، دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

ز. وارثی
(سنبھل)

ضرورت استاد کی۔ ایک شاعرہ کو

سنائی ایک سخنور نے دوسرے کو خبر
حضور، ایک پری رو کی آپ پہ ہے نظر

اسے تلاش ہے اک کہنہ مشق شاعر کی
اب آپ آئے ہیں زد میں نگاہ کافر کی

وہ شاعرہ کہ جسے جانِ شاعری کہئے
وہ ساحرہ جسے شاگرد سامری کہئے

وہ شمع رو کہ دیارِ ادب کی بلبل ہے
بڑے بڑوں کا چراغ اس کے سامنے گل ہو

مشاعرے میں سناتی ہے جب کلام اپنا
تو جیسے وار کرے تیغ بے نیام اپنا

فروغ نغمہ سے ناہید کو لجاتی ہے
تاثرات نگاہِ حسیں سے لاتی ہے

غزل کے منہ سے غزل سن کے سامعینِ کرام
خود اس کو کرتے ہیں جھک جھک کے بار بار سلام

وہ پڑھ کے شعر جب آداب عرض کرتی ہے
فضا میں دستِ حنائی سے رنگ بھرتی ہے

سُنے جو حضرت شاعر نے حسن کے چرچے
تو پاؤں قبر سے باہر نکال کر بولے

مگر یہ اور بتاؤ کہ ماجرا کیا ہے
نگاہ ناز کا دراصل مدعا کیا ہے

شریکِ زندگی اے کاش وہ پری ہو جائے
تو شاخِ خشک مری زیست کی ہری ہو جائے

خدا کرے مرا ویرانہ رشکِ جنت ہو
وہ آئے گھر میں مرے ایسی میری قسمت ہو

بڑھی جو بات پیامی نے پینترا بدلا
بڑے شرارتی انداز میں ہوا گویا

خطا معاف، یہ میرا تصور ہے شاید
جو مدعا ہے وہ بین السطور ہے شاید

وہ قدر آپ کے ذہنِ رسا کی کرتی ہے
وہ آپ پر نہیں، تکمیلِ فن پہ مرتی ہے

ابھی تو خیر ترنم بھی ہے، جوانی بھی
مگر یہ دونوں ہی چیزیں ہیں آنی جانی بھی

وہ چاہتی ہے اسے شہرتِ دوام ملے
جہانِ شعر میں اک مستقل مقام ملے

یہ آرزو ہے، زباں پر عبور حاصل ہو
عروض و لفظ و بیاں کا شعور حاصل ہو

حضور اس کے لیے ورکشاپ بن جائیں
یتیم سمجھیں اسے اور باپ بن جائیں

بیاض و حقِ اشاعت عطا کریں اس کو
حیات ہی میں وراثت عطا کریں اس کو

جب آئے وقت تو وہ جانشین آپ کی ہو
بیچارہ اس کا ہو قبلہ۔ تو ہین آپ کی ہو

یہ حال کہہ کے پیامی تو ہو گیا خاموش
یہ حال سن کے سخنور ہے آج تک بے ہوش

دلاور فگار

ہمارے استقبالئے کا اہتمام

ایک مدت سے ہمیں تھی فکر استقبالیہ
روز استقبالئے ہوتے ہیں لوگوں کے یہاں
کون استقبالیہ دے ہم غریبوں کو یہاں
سیٹھ صاحب کی یہ مجبوری کہ وہ بدذوق ہیں
بعض لوگ اس شرط پہ راضی ہیں استقبال کو
ہم کو حسرت تھی کہ ہم سے کچھ تو پڑھوائیں یہ لوگ
ملک کے باہر سے آج اک بزم نے لکھا ہمیں
یہ ہے وہ تقریب، ماضی میں نہیں جس کی مثال
آپ استقبالیہ میں آیئے اس شان سے
آپ استقبالئے میں ایسی کچھ نظمیں سنائیں
آپ پاکستان سے آئیں تو از راہِ کرم
ہم غریبانِ وطن ہیں اور یہاں یہ حال ہے
غور فرمائیں کہ یہ بزمِ سخن ہے، اس جگہ
اس جگہ اُردو کا پودا ہم نے بویا ہے جہاں
ہم نے اردو کو نئے قالب میں ڈھالا ہے کہ آج
ہم نے سوچا تھا بلائیں، آپ کو بھی "بائی ایر"

تاکہ ہو مشہور اپنا بھی کلام عالمیہ
اس کے شاہد ہیں بہت سے واقعاتِ حالیہ
سب یہی کہتے ہیں "میں تو ہوگیا دیوالیہ"
اور حکومت کی یہ معذوری کہ کم ہے مالیہ
پان ان کو ہم کھلائیں اور وہ ہم کو چھالیہ
میریہ، سودائیہ، انشائیہ، اقبالیہ
ہم سنیں گے آپ سے اشعار نظمِ حالیہ
اور نہ "مستقبل" میں ہوگا ایسا استقبالیہ
سانس میں عنبر، غزل میں مشک، منہ میں غالیہ
جن کے موضوعات ہیں کچھ واقعات حالیہ
ساتھ لیتے آئیں اک بورے میں دو من چھالیہ
کوئی غالب ہے نہ حالی ہے، نہ کوئی حالیہ
لوگ قوالی کو کہتے ہیں جہاں "قوالیہ"
لوگ پچپن۵۵ سالہ کو کہتے ہیں پچپن۵۵ سالیہ
"نامۂ اعمال" کو کہتے ہیں ہم "اعمالیہ"
کیا کریں لیکن کہ پوری بزم ہے "دیوالیہ"

بہر استقبال ہم ہر طرح راضی ہیں مگر
آپ اپنے خرچ پہ آجایئے سومالیہ

حلیمہ فردوس
(بنگلور)

نیم پلیٹ

کتبے اور نیم پلیٹ میں بس زندگی اور موت کا فاصلہ ہے۔ کتبے مُردوں کا تعارف ہیں تو نیم پلیٹ زندوں
ایک مشرق کی دین ہے تو دوسری مغرب کی۔ ایک سرہانے لگائی جاتی ہے تو دوسری گھر کے دیوار کے سینے پر۔
دانشور کہتے ہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ نام کی بڑی اہمیت ہے۔ چاہے وہ نام انسان
ہو یا جانور کا یا عمارت کا۔ عمارتیں تو بے حساب تعمیر کی گئیں لیکن وہی عمارتیں مشہور ہوئیں جن کے نام میں دم خم تھا
جیسے تاج محل، قطب مینار، چار مینار، گول گنبد، گگو دہار، گگن محل، برہما ون، لال باغ وغیرہ۔ آپ نے بھی کبھی چڑیا
گھروں کی سیر کی ہوگی لیکن جانوروں کی نیم پلیٹ پڑھنے کا خیال آپ کو کبھی نہ آیا ہوگا۔ میسور کے چڑیا گھر کی سیر
کرتے ہوئے جب ہم شیروں کے کٹہرے کے پاس پہنچے تو ان کی نیم پلیٹ پڑھ کر حیران رہ گئے کیوں کہ یہاں ہر
کٹہرے میں ایک سے ایک اہم کردار بند ہیں۔ کوئی اشوک ہے تو کوئی سیتا۔ ہم نے سوچا کہ تاریخی کردار کو زندہ رکھنے
کا اس سے بہترین طریقہ اور کیا ہو سکتا!

آج کل انسانی محبت اور حسن میں دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ تبھی تو لوگ حسن، خلوص اور محبت کو صرف جانوروں
میں تلاش کرنے لگے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فیشن ایبل مائیں اپنے بچوں کو ماما کے حوالے کر دیتی ہیں اور ہر وقت
کتے کے پلوں کو سینے سے چمٹائے رہتی ہیں ہو سکتا ہے اس کا بھی کوئی نفسیاتی جواز ہو۔ بلیوں اور کتوں کو ڈلار
کرتے دیکھ کر جی تو چاہتا ہے کہ کاش ہم بھی بلی یا کتا ہوتے کم از کم میاؤں اور بھاؤں کرتے ہی پیٹ بھر کھانا اور
مالک کے نرم گدوں اور گرم لحافوں میں جگہ تو ملتی۔ ایک صاحب کو اپنی کتیا سے اس قدر پیار تھا کہ وہ جب بھی دوست
احباب سے اس کا ذکر کرتے تو انھیں یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا کہ آیا یہ اپنی بیوی کا ذکر کر رہے ہیں یا PET کا۔ ہوا یوں
کہ اُن کے دوست نے گھر فون کیا اور ان کی بیوی کی خیریت جاننی چاہی سوئے اتفاق بیوی نے فون اٹھایا۔ اُدھر
سے آواز آئی اوہ آپ! بھابی جان مبارک ہو خیریت سے تو ہو نا بتائیے چھوٹا کیسا ہے۔ بچاری وہ پریشان اُنھوں
نے کہا کس بات پر مبارکباد، کیسی خیریت کون چھوٹا یہ آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ اُدھر سے آواز آئی بھابی
ہم نے سُنا ہے کہ آپ کو بچہ ہوا ہے کل ہی آپ کے شوہر نے یہ خوشخبری سُنائی۔ بچاری یہ سن کر ہنسنے لگیں اور
بتایا کہ بھائی صاحب آپ سب غلط فہمی میں مبتلا ہیں مجھے نہیں ہمارے گھر کی کتیا ROSI.Y کو بچہ ہوا ہے۔ یہ
تو غلط فہمی کتیا سے لگاؤ کے بناء پیدا ہوئی تھی آئیے آپ کو ایک اور صاحب سے متعارف کروائیں جن کے گھر پر

نیم پلیٹ لگی ہے لیکن محلے والے اسے پڑھنا تو کُجا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ معمولی سے تاجر ہیں۔ نہ نام کے آگے لمبی چوڑی ڈگری ہے نہ ہی اعلیٰ عہدہ، پھر کیا جادو ہے اُس نیم پلیٹ میں۔ تو سُنیئے اُن سے مشہور تو اُن کا کتا ہے۔ جس کا نام اُنھوں نے Rambo رکھا ہے۔ وہ خونخوار تو نہیں لیکن خونخوار ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اس نے محلے میں کسی کو کاٹا نہیں اُس کے باوجود ! سب اس سے ڈرتے ہیں اور اسی خوف کی بدولت محلوں کو اس کے گھر کا پتہ بھی یاد ہے۔ محلے میں کوئی اجنبی برکت علی صاحب کا پتہ پوچھے گا تو مکان تلاش کرنے میں اُسے بڑی دقت ہوتی ہے اگر کوئی سوال کرے کہ Rambo کا گھر کہاں ہے تو بآسانی پتہ مل جائے گا۔ Rambo ایک فلم میں کام کرنے کے لیے ہزاروں ڈالر لیتا ہو لیکن برکت علی صاحب نے اپنے کتے کا نام Rambo رکھ کر ایک فلمسٹار کی جو عزت افزائی کی ہے اُس کا جواب نہیں۔

دوسروں کی نیم پلیٹ دیکھ دیکھ کر ہمارے صاحب کو بھی خواہش ہوئی کہ ایک عدد نیم پلیٹ بنائیں۔ اور جب نیم پلیٹ بن گئی تو اس کے لیے اچھے اور خوبصورت گھر کی تلاش شروع ہوئی۔ افسوس اب تک کئی گھر بدل چکے ہیں لیکن اُن کے نیم پلیٹ کے لائق گھر نہیں ملا۔ [ہر ماہ نوکر بدلنے کے ذمہ دار ہم ہیں تو ہر سال گھر بدلنے کے قصوروار وہ] ہم نے جیسے ہی ایک نئے گھر میں قدم رکھا تو سوچنے لگے کہ نیم پلیٹ کیسے لگائیں۔ اس گھر میں سامان قرینے سے رکھنے کی بھی گنجائش نہیں تھی ایسے میں خوبصورت نیم پلیٹ اٹھا کر کہاں رکھتے۔ گھر کی حالت کو دیکھ کر ہمارا صبر کا پیالہ چھلک اٹھا [کیوں کہ اس کے علاوہ سارے پیالے ٹوٹ چکے تھے] ہم نے برسنا شروع کیا جب آپ کو ذاتی گھر بنانے کی خواہش نہیں تو یہ خوبصورت کرائے کے گھر کی تلاش کیوں انھوں نے بڑے صبر سے جواب دیا بیگم یہ ستم ہم گھر پر کرتے ہیں آپ کی ذات پر تو نہیں۔ اور وہ بھی اس لیے کہ ہماری خوبصورت نیم پلیٹ آپ کے سِوا کوئی اور سنبھال کر نہیں رکھ سکتا۔ ہم سر پیٹ کر کہنے لگے یہ نیم پلیٹ ہے یا آملیٹ کی پلیٹ۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے تم نے آملیٹ کا ذکر خوب چھیڑا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا اکثر گھروں پہ دو دو تین تین نیم پلیٹ ایک قطار میں لٹکتے رہتے ہیں؟ آملیٹ کے لیے انڈا، پیاز کے لچھے اور ہری مرچ کے ٹکڑے بھی ضروری ہیں۔ بس اسی طرح صاحبِ خانہ کی نیم پلیٹ انڈے کی حیثیت رکھتی تو بیٹے کی نیم پلیٹ پیاز کے لچھے اور بیٹی کی نیم پلیٹ ہری مرچ کے ٹکڑے [جنھیں کھانے سے پہلے ہی علیحدہ نکال کر پھینکا جاتا ہے] بس اسی طرح بیٹی کی نیم پلیٹ بھی شادی کے بعد کہیں پھینک دی جاتی ہے۔ ہم نے ان کی بات کاٹ کر کہا بس بس اب رہنے بھی دیجئے لکچر اور نیم پلیٹ لگانے کا انتظام کیجئے۔ وہ اُٹھے ہتھوڑی اور کیلوں کی تلاش میں۔ کیلے ملے تو ہتھوڑی غائب، ہتھوڑی ملی تو کیلے غائب۔ ہم نے اُن کی یہ دوڑ دھوپ دیکھی نہ گئی اُن کی مدد کے لیے پہنچ گئے ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمارے بغیر زندگی کے اہم فیصلے تو کُجا معمولی کام بھی نہیں کرسکتے۔ ایسے ہی وقت ضرورت ساتھ دینے کیلئے خدائے تعالیٰ نے اماں حوّا کو بابا آدم کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ جس کرسی پر وہ ٹھہرے ہوئے کیلے ٹھونک رہے تھے اس کے پائے برابر نہ تھے۔ ابھی وہ نشانہ لگانے بھی نہ پاتے کہ لڑکھڑا جاتے۔ ہم نے انھیں سنبھالا پھر ہتھوڑی اُن کے ہاتھ میں دی۔ پہلا وار ٹھیک تو لگا لیکن انگوٹھا زخمی ہوگیا۔ خون ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ ہم نیم پلیٹ چھوڑ ڈیٹول اور روئی لانے دوڑے اور منع کرتے رہے کہ اب جانے بھی دیجئے یہ کام کل بھی کیا جاسکتا ہے لیکن وہ گویا ہوئے۔

" آپ ہی تو کہتی ہیں کہ جو کل کرنا سو آج کرلو [اسی بدولت تو کل کا پکا کھانا فریج میں رکھ کر آج کھلاتی ہیں کیا

اس قدر ناکارہ ہیں للہ ہمیں اور نہ رسوا کیجئے۔ ہماری انگلی شہید ہونے سے ہماری رگ حمیت اور پھڑک اٹھی
ہے جو انگلی سے نہ ٹپکے وہ لہو کیا ہے۔ نیم پلیٹ لگانے میں ایسے معمولی حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں انشاء اللہ
بار ہمارا نشانہ خطا نہ ہوگا" یا علی مدد کی آواز گونجی اور ہتھوڑی کی زور دار آواز کے ساتھ دیوار کا پلستر
اکھڑ گیا۔ ابھی وہ تیسرے وار کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ مالک مکان آ پہنچے انھوں نے وہ
لواتیں سنائیں کہ توبہ بھلی۔ آخر میں ہدایت دیتے گئے کہ میاں یہ خالہ بی کا گھر نہیں اپنے گھر پہ نیم پلیٹ لگانے
اس قدر خواہش ہے تو خوش دامن صاحبہ کے گھر پہ لگائیے۔ مہمان پہلے وہاں پہنچیں، چائے پئیں اور پھر
قات کے لیے یہاں آئیں۔ انھوں نے جواب دیا "ہم نے یہ تجربہ بھی کیا ہے جناب لیکن خوش دامن صاحبہ
یہ شکایت تھی کہ "میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے"۔ مالک مکان کی شرافت کا آپ خود
ازہ کر لیجئے کہ وہ بغیر جرمانہ عائد کیئے چپ چاپ چلے گئے۔ ہم نے صاحب کو سمجھایا کہ نیم پلیٹ
ڈوری باندھ کر لٹکانے میں ہی بھلائی ہے۔ کھڑکی کی سلاخوں تک ڈوری باندھ کر نیم پلیٹ لٹکائی گئی۔
ی اس کام کو نپٹا کر بیٹھے ہی تھے کہ ہمارے صاحب کے جگری دوست چلے آئے۔ وہ دروازے پر تک
یتے جاتے اور ساتھ ہی قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ ہم نے سلام علیک کے بعد ہنسنے کی وجہ پوچھی تو وہ یا
پر قہقہوں کا دورہ پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا بھابی جان نظر بد سے بچنے کے لیے تعویذ
ندھتے سنا تھا نیم پلیٹ نہیں"۔ پہلے ہی صاحب کافی تھک گئے تھے انھوں نے بڑی بے زاری سے جواب
ا۔ سنو میاں اس گھر کا مالک میں ہوں۔ جو چاہے سو کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ دو شرابیوں میں بحث
ڑ گئی کہ شیر انڈا دیتا ہے یا بچہ۔ دونوں اپنی اپنی دلیل پر اڑے ہوئے تھے۔ تیسرا شرابی آیا اور کہنے لگا
ہیں کیا پڑی ہے اس قدر مغز پاشی کرنے کی وہ تو جنگل کا بادشاہ ہے جو جی میں آئے کر سکتا ہے نیم پلیٹ
ہے سیدھی لٹکے یا الٹی میں اس گھر کا بادشاہ ہوں تمہیں کچھ کہنے کا حق نہیں۔ اس تاویل کو سننے کے بعد
ہ چپ چاپ کھسک گئے اور جاتے جاتے کہنے لگے بھابی آج یہ بھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے میں
ے کہا بھائی صاحب دراصل یہ نئے گھر کا خمار ہے۔

آپ کو بھی پتہ ہوگا نیم پلیٹ عارضی بھی ہوتی ہے اور مستقل بھی۔ عارضی اگر ہو تو اسے لٹکایا جاتا ہے۔
ماٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد انسان چالاک ہو جاتا ہے تو گھر گھر کی دلولدل کا مزہ چکھ کر نیم پلیٹ حساس
و جاتی ہے۔ عارضی نیم پلیٹ یا تو لکڑی کی ہوتی ہے یا تانبے پیتل کی مگر مستقل نیم پلیٹ کے لیے صرف
سنگ مرمر یا سنگ اسود ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں تو سنگ اسود کا رواج ہی عام ہے۔ کالے
ن سے بنائے گئے مکانوں پر سنگ اسود سے بنائے گئے نیم پلیٹ ہی سہاتے ہیں مستقل نیم پلیٹ کی
ہائی دور کرنے کے لیے ایک اور پلیٹ بھی لگائی جاتی ہے۔ ایک پلیٹ پر مکین کا نام ہوتا ہے تو دوسرے
مکان کا نام۔ رحمت منزل، راحت منزل کی پلیٹیں اب باقی نہیں رہیں۔ البتہ شوق ولا۔ بیت النظیر
یت المعراج آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ اردو محبت کے ثبوت میں گھروں کے نام گلستاں، باغ
رو، پھول بن، غبار خاطر بھی رکھے جاتے ہیں ان دو پلیٹوں کے علاوہ بھی کئی اور پلیٹیں لگائی جاتی ہیں جیسے
تے سے ہوشیار رہیے"۔ "یہاں تھوکنا منع ہے"۔ "پیشاب کرنا منع ہے"۔ یہ پلیٹیں برائے نام [illegible]

اُن کے لگانے پر بھی لوگوں پر اثر نہیں ہوتا۔ ہمارا تو مشورہ ہے کہ ایسی پلیٹیں لگانے کی بجائے ایک چوکیدار مقرر کریں۔ اس کی روزی روٹی کا انتظام بھی ہو جائے گا اور آپ کا گھر بھی محفوظ رہے گا۔ چوکیدار مقرر کرنا مشکل نہیں آج کی ہوش رُبا گرانی اور بے روزگاری کے زمانے میں میٹرک پاس ہی نہیں بی اے ایم اے پاس حضرات بھی اس کام کے لیے تیار ہو جائیں گے کیونکہ اس میں ذہنی اور جسمانی محنت کے بغیر ہی روٹی جو مل جاتی ہے۔

نیم پلیٹ پر نام کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ تعلیم، عہدہ، شعبہ وغیرہ۔ ایک صاحب نے نیم پلیٹ پر اپنے نام کے ساتھ ایم اے کی ڈگری لکھی پھر چند دن بعد وہ ایم اے سے بی۔ اے ہو گئے۔ جب ہمیں یہ معمہ سمجھ میں نہ آیا تو انھیں سے پوچھا کہ جناب یہ ایم اے سے پھر بی اے کا ماجرا کیا ہے۔ بڑی لجاجت سے بولے صاحب جب میری پہلی بیوی اللہ کو پیاری ہوئی تو میں نے دوسری شادی کی اور نیم پلیٹ پر M.A یعنی MARRIED AGAIN اب وہ بھی چل بسی ہے اس لیے میں نے M.A کو B.A میں بدل دیا یعنی کہ BATCHELOR AGAIN یہ ساری درد بھری داستان سن کر ہم نے کہا آپ غم نہ کریں ہم بھی آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ہماری جان پہچان کا ایک گھرانہ ایسا بھی ہے جن کے ننھیال اور ددھیال میں کوثر و تسنیم میں ڈھلی زبان بولی جاتی تھی۔ زمانہ گزرتے گزرتے تبدیلی ایسی آئی کہ پوتے۔ پوتیاں۔ نواسے۔ نواسیاں سب انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ انھیں کے خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک صاحبہ ہیں جو نسرین سے نین سی کہلانے لگی۔ انھیں اپنی موروثی زبان پر بڑا ناز ہے اور وہ اس قدر اردو بول سکتی ہیں کہ ممی کو مذکر اور ڈیڈی کو مونث استعمال کرتی ہیں جب انھوں نے اپنا ذاتی گھر بنایا تو ایک اچھے سے نام کی تلاش تھی۔ ممی کی ساتھیوں سے مدد لینے کا خیال آیا۔ جب اُن کے سامنے اپنی خواہش ظاہر کی تو انہیں بھی شرارت سوجھی آنٹی نے بتایا کہ بیٹی سارے نام تو پرانے ہو چکے ہیں بس یہی بھلا لگے گا کہ تم اپنے گھر کا نام "بیت الخلاء" رکھو وہ بہت خوش ہوئیں اور پتھر پر کندہ کروانے کے لیے گئیں۔ وہ بیچارا مزدور سوئے اتفاق اردو کا شاعر بھی تھا افسوس کرنے لگا۔ اس مذاق نے اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اس نے سوال کیا بیٹی آپ اردو نہیں جانتیں۔ نین سی نے جواب دیا کہ آپ نے کیسے پہچانا۔ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے اس نے کہا آئندہ سے ایسی غلطی مت کرنا دوسروں پر بھروسہ کرنا بڑا بھاری گناہ ہے۔ آپ نے اپنے گھر کے لیے جو نام تجویز کیا ہے اُس کے معنی تو TOILET کے ہیں۔ نسرین کی سمجھ میں آگیا کہ نین سی بننے کا یہی حشر ہوتا ہے —!

○●

روشن لال روشن بنارسی

غزل

ہزل کہنا بھی دوبھر ہوگیا ہے
عجب بیگم کا تیور ہوگیا ہے

میں ٹیچر سے پھٹیچر ہوگیا ہوں
وہ لیڈر سے منسٹر ہوگیا ہے

گلہ بنئے کا، بھاشن لیڈروں کا
سماعت کا مقدّر ہوگیا ہے

مرا سالا خدا رکھے سلامت!
رسالے کا ایڈیٹر ہوگیا ہے

وہ ایم اے پاس، بیکاری کا مارا
میونسپلٹی میں سویپر ہوگیا ہے

کرشمہ دیکھئے جمہوریت کا
گدھا! گھوڑے کا ہمسر ہوگیا ہے

بہ فیضِ کثرتِ اولادِ آدم!
جہاں میدانِ محشر ہوگیا ہے

غزل گو سے ہزل گو ہو کے روشن
وہ شیلر کا رپیٹر ہوگیا ہے

★

پیروڈی

نہ کسی وزیر کا ووٹ ہوں، نہ کسی امیر کا نوٹ ہوں
"جو کسی کے کام نہ آسکے" میں وہ ایک خستہ لنگوٹ ہوں

مرے دست و پا ہیں کٹے ہوئے، مرے مائی باپ ہیں دوسرے
مرے اختیار میں کچھ نہیں، میں بساطِ دہر کی گھوٹ ہوں

مرے بادباں ہیں پھٹے ہوئے مرے ناخدا ہیں بٹے ہوئے
جسے موج آپ لیے پھرے میں وہ بحرِ زیست کی بوٹ ہوں

میں غزل نہیں ہوں مزاح کی نہ صدا لگائیے واہ! کی
میں زمیں کے جسم کا زخم ہوں میں فلک کے ممدوح کی چوٹ ہوں

جمہوریت

ہمارے پاؤں کی جوتی اے روشن
ہمارے سر پہ ماری جا رہی ہے
ڈیموکریسی کی تھیوری اور ہی کچھ
کتابوں میں بگھاری جا رہی ہے

اقبال ہاشمی
حیدرآباد

غزل

جب سے ہے ان کی ماں کا رویہ مرے خلاف — بیٹی مرے خلاف ہے بیٹا مرے خلاف
حالانکہ ہر لحاظ سے اکا ہے میری ذات — نہلا مرے خلاف ہے دہلا مرے خلاف
شاعر مرے خلاف اگر ہو تو بات ہے — کاہے کو ہو گیا ہے گویّا مرے خلاف
جب جب مٹھائی کھاتا ہے میری کمائی سے — تب تب اُتارتا ہے وہ صفرا مرے خلاف

بھنکے ہوئے ہیں چھیچھڑے جس دن سے ہاشمی
بلّی مرے خلاف ہے کتّا مرے خلاف

افروز عالم
دربھنگہ (بہار)

در بیان فضائل کلرکی

(ممدوح حالی سے معذرت کے ساتھ)

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — کلرکی کے ہوتے فضائل ہیں کیا کیا
کہا، گرچہ ہوں میں حکیمِ زمانہ — کلرکی کے آگے جھکا ہوں سراپا
کلرکی کی عظمت کا قائل ہوں میں بھی — کہ کوئی بھی بزنس نہیں اس سے اچھا

کلرکی کو بس حاصلِ زیست سمجھو
اسے موج و مستی کا اک گیت سمجھو

کلرکی کو ترسے ہیں بابو تمام — کہ ہوتا ہے اِس سے بڑا اونچا نام
کلرکی کا اونچا وزیری سے بام — کلرکی کا بھرپور صہبا سے جام
یہ کرسی نشینی کا ہے وہ مقام — سبھی جس کو کرتے ہیں جھک کر سلام

نکالا ہے اکبر نے مطلب اسی سے
کلرکی کرو پھول جاؤ خوشی سے

خدایا یہی آرزو اب مری ہے — پیشانی ترے در پہ ہر دم جھکی ہے
کہ پڑھ لکھ کے سروس کلرکی کی پاؤں — چھپی اس میں دنیا کی ہر برتری ہے
کلرکی ہے مطلوب و مقصود میرا — جو پاؤں اسے بات یہ اک بڑی ہے

تری رحمتوں سے نہ مایوس ہوں میں
کلرکی کی سروس سے مانوس ہوں میں

ناوک حمزہ پوری
گیا (بہار)

اتنک وادی

قول برحق ہے کہ انسان فطری طور پر بڑا ناشکرا ہے۔ یوں بات بات پر "الحمد اللہ" اور "شکر ہے اللہ تعا" کا تکیۂ کلام رکھنے والے مولوی حسّو کی بھی ویسے تو دلی مُرادیں بہت سی برآئی تھیں لیکن انھیں لگتا یہی تھا کہ بہت کم دلی ارمان نکلے ہیں۔ اب بھی اُن کے نہاں خانۂ دل میں ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ گویا ہر خواہش کی تشنگی کے احساس پر اُن کا دم نکلتا تھا۔

جملہ تشنہ کامیوں کے ساتھ ساتھ ایک شدید احساس محرومیت انھیں یہ تھا کہ اُنھوں نے سینما اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اور وہ یہ مصرعہ گنگنانے میں حق بجانب تھے کہ ع سینما نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا۔ سینما دیکھنا اُن کے خیال میں اُن کا جنم سِدھ ادھیکار تھا۔ اُن کے اس پیدائشی حق سے سماج نے یا حقیقت سے قریب لفظ میں کہیے تو ان کی مولویت نے انھیں محروم کر رکھا تھا۔ سینما کے بارے میں مولوی حسّو نے اپنے جگری یار لنتو سے بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ مگر انھیں "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کا غم اکثر بہت ستاتا تھا۔

مدرسوں کے سال خوردہ 'درس نظامیہ' کی چکی میں پس پسا کر میاں حسّو نکلے تو مولوی حبیب اللہ بن کر نکلے۔ مگر ان کی طرح پیٹی پیا تھی کہ کورے مولوی بن کر نکلے۔ چنانچہ ہون سانگ اُن کے نزدیک ذریات شیطانی میں سے کسی کا نام تھا تو آئن سٹائن کسی ڈائن کی اولاد کا۔ اس میں ان کا قصور کم اور مدارس میں رائج نظام تعلیم کی خطا زیادہ تھی۔ جہاں نگاہ صرف "فی الآخرۃ حسنہ" پر رہتی ہے اور "فی الدنیا حسنہ" سراسر اوجھل۔ ان مدارس کے فضلاء کی قسمت میں زمانۂ قدیم ہی سے کاتب تقدیر (ان مدارس کے اساتذہ زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیجیے تو ان کا نصاب تعلیم) بڑی فراخ دلی سے یا وعظ و نصیحت کا دھندا یا انھیں مدارس کی استادی یا سفارت (چندے کی وصولیابی) یا پھر مسجد کی امامت لکھتا رہا ہے۔ وعظ و تقریر کے سلسلے میں "خود را فضیحت دیگر را نصیحت" کی مثل مولویوں سے زیادہ بہتر کسی اور پہ صادق نہیں آتی۔ چندہ وصول کرنے کے گُر بھی جتنے مولویوں کو معلوم ہیں کسی دوسرے کو نہیں آتے۔

مولوی حبیب اللہ عرف حسّو کے ساتھ بھی وہی کچھ پیش آیا جو اُن کے کاتب تقدیر نے ان کی پیشانی میں لکھ دیا تھا۔ پیٹ کی آگ نے "وابتغو من فضل اللہ" پر تو انھیں آمادہ کیا لیکن اُن کی مولویت نے "و اشتغلوا فی الارض" کو اُن کی نگاہ سے اوجھل کر دیا۔ اللہ نے پیدا کیا ہے، روزی بھی وہی دے گا۔ اور

روزی جب آسی کو دینی بیتے تو آپ شدہ ہی گھر سے دے۔ کھٹیا مولوی حستو نے روزی کی تلاش کے لیے خدا کے گھر کا دروازہ ہی کھٹکھٹایا۔ یعنی تعلیم سے فراغت کے بعد محلے کی مسجد کے پیش امام ہوئے۔ دنیا اُن سے تمام تر فرشتگی کا مطالبہ کرنے لگی۔ ہزاروں آلودگیوں اور گندگیوں سے معمور سماج متقاضی تھا کہ مولوی صاحب جو بات منہ سے نکالیں وہ شرع متین کے عین مطابق ہو اور جو کام کریں وہ از سرتاپا حکم خدا و رسول کے تابع ہو۔ ایسے میں معمولی تاک جھانک کا تو مولوی صاحب کو یارا ہی نہ تھا۔ سینما تو گویا گناہ کبیرہ کے زمرے میں تھا۔

سینما کے لیے مولوی حستو کی آتش شوق کو بھڑکایا تھا اُن کے یار غار لنتو نے۔ نصرالدین اُن کے بچپن کے دوست تھے۔ مدرسے کے مولویوں کے ڈنڈوں کی تاب نہ لاکر گھر سے بھاگ کھڑے ہوئے جگہ جگہ گھومتے چکرا تے پھرے۔ کبھی گھریلو نوکر کا کام کیا، کبھی ہوٹلوں میں برتن مانجے۔ کبھی بوٹ پالش کی اور کبھی بھیک مانگی۔ یہ سب کام انھیں مدرسے کی پڑھائی سے زیادہ آسان لگے۔

مشہور ہے کہ ایک طفل نادان اپنے ابّوجان کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ راہ میں ایک حجّن ایک بکرے کی گردن میں رسی ڈالے اُسے گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔ بے چارا بکرا زور زور سے ممیاتا جا رہا تھا۔ بچے کی سمجھ میں آیا کہ بکرا رو رہا ہے۔ ابوجان سے پوچھا "بکرا کیوں رو رہا ہے؟" "حجّن اُسے ذبح کرنے کو لیے جا رہا ہے"۔ ابّو نے وضاحت کی۔

"تب کاہے کو رو رہا ہے؟ میں نے سمجھا کہ اسے یہ آدمی مدرسہ لیے جا رہا ہے"۔ بچہ غرق حیرت تھا۔

جہاں گردی نے نصرالدین کو لنتو میاں بنا کر چھوڑا۔ آج کل ایک مقامی سینما گھر میں گیٹ کیپر ہیں۔ روزانہ شو دیکھنے کا لطف الگ اٹھاتے ہیں اور گیٹ کیپری کی تنخواہ الگ پاتے ہیں۔ آم کا آم گٹھلیوں کا دام شاید اسی کو کہتے ہیں۔

لنتو میاں کے نہ آگے ناتھ تھی نہ پیچھے پگہا۔ دُنیا میں اُن کا کوئی نہ تھا نہ قرابت مند نہ گھر دوار۔ اس لیے دن تو جیسے تیسے بیت جاتا تھا رات کو شو ٹوٹنے کے بعد روزانہ اُن کے سامنے "جائیں تو جائیں کہاں؟" کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ دُنیا والے اپنا دروازہ بند کر کے سو چکے ہوتے تھے اور جو نہ بھی سوتا تھا وہ لنتو میاں کے لیے اپنا دروازہ کیوں کھولتا۔ ایسے آڑے وقت میں انھیں ایک ہی گھر کا دروازہ کھلا ملتا اور وہ تھا خُدا کا گھر۔ سو لنتو میاں روزانہ کسی نہ کسی مسجد میں جا کر سو رہتے تھے۔ سونے کے پہلے اکثر مستی کے عالم میں رقت آمیز لہجے میں بُدبُداتے تھے۔ "فرشتو! گواہ رہنا۔ دن رات میں پانچ بار نہ سہی ایک بار ضرور خُدا کے گھر میں حاضری دیتا ہوں"۔ جب سے مولوی حستو مسجد کے پیش امام ہوئے تھے لنتو میاں کی یہ مشکل آسان تر ہو گئی تھی بچپن کی یاری کا خیال کر کے مولوی صاحب نے اپنے حجرے کے ایک گوشے ہی میں انھیں سونے کی اجازت دے دی تھی۔ سونے سے قبل اکثر دونوں دوست اپنا دکھ ایک دوسرے کو سُنا کر غم ہلکا کرتے تھے۔

جب بھی کوئی مزے دار، اے ون پکچر لگتی لنتو میاں اس کی پوری اسٹوری چٹخارہ لے لے کر مولوی حستو کو سُناتے۔ ہیرو ہیروئن کے ڈائلاگ کی نقل اتارتے۔ ہیروئن کی عمر، قد قامت، ناک، نقش، عضو عضو کی گویا تصویر بیان کر کے رکھ دیتے اور جب یوں ہوتا تھا تو مولوی حستو کا احساس محرومیت اور شدید ہو جاتا۔ احساس محرومیت کے انھیں کمزور لمحوں میں ایک رات لنتو میاں نے قسم کھائی "یار مولوی! غم نہ کر۔ قسم ہے

اس تہجد کے وقت کی۔ میں تجھے ایک دن سینما دکھا کر رہوں گا۔" اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ پاکر مولوی منمنائے "مگر یار! یہ ہوگا کیسے ؟ کسی نے دیکھ لیا تو ؟" نستو نے مولوی کی جانگھ پر ایک تھاپ جماتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا "تو اس کی فکر نہ کر۔ میں سب انتظام کرلوں گا۔"

شہر کے سب سے عالیشان سینما گھر "اپسرا" میں نائٹ شو شروع ہوئے پندرہ بیس منٹوں کا وقفہ گزرا تھا۔ احاطے کی رونق سمٹ سمٹا کر سینما ہال میں بند ہوچکی تھی۔ ٹھیلے اور خوانچے والوں کے علاوہ بس اکا دکا لوگ ہی ادھر ادھر گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ مینجر کے کمرے میں بکنگ کلرک سیلز بکس اٹھائے پہنچنے لگے تھے کہ اسی اثناء میں فرسٹ کلاس کا چیکنگ کلرک سہما ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"سر جلدی کیجئے ورنہ انرتھ ہوجائے گا۔"

"کیوں کیا ہوا ؟"

"سر! فرسٹ کلاس میں ایک آتنک وادی گھس آیا ہے۔ سر سے پاؤں تک سیاہ برقع اوڑھے ہوئے ہے۔ مجھے اس کی چال ڈھال پر پہلے ہی شک ہوا تھا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد برقعے کے اندر اس کی داڑھی بھی دکھائی دے گئی تو شبہ نہ رہا۔ سر! مجھے ایسا لگتا ہے اس کے پاس کوئی طاقتور بم بھی ہے۔ لگتا ہے اس کی یوجنا سینما گھر کو اڑا دینے کی ہے۔" کلرک نے اپنی بات ختم کی تو سراسیمگی مینجر کے لہجے میں بھی تھرائی۔ "کہاں ہے وہ ؟"

"اپنی سیٹ پر فرسٹ کلاس میں آرام سے بیٹھا ہے"۔

کمرے میں موجود لوگ جو اب تک خاموش تھے اظہارِ خیال کرنے لگے۔ کسی کا خیال تھا کہ اگر اس کی یوجنا سینما گھر کو اڑا دینے کی ہوتی تو بم کہیں چھپا کر بھاگ نکلتا۔ خود بھی مرنے کے لیے بیٹھا نہ ہوتا۔ دوسرا تردید کرتا کہ آتنک وادیوں کا کیا ہے وہ لوگ اپنی جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں۔ تیسرے نے کہا کہ آج کل جب لوگ اسپتالوں کو بھی ملیامیٹ کرنے سے باز نہیں آتے تو سینما گھر تو سینما گھر ہے۔ غرض صلاح مشورے کے بعد فوراً پولس کو خبر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مینجر کی انگلی ٹیلی فون کے ڈائل پر تھرکی۔ چونگا منہ کے قریب آیا۔

"پولیس ہیڈ کوارٹر ——— لیس ——— اٹ از مینجر فرام اپسرا سینما ہاؤس ——— یس ——— ہاں ——— سر! سینما ہال میں کوئی آتنک وادی گھس آیا ہے ——— ہاں ——— کالا برقع اوڑھے ہوئے ہے ——— اس کے پاس بہت پاورفل بم ہے ——— ہاں ——— ہوسکتا ہے ——— شاید سینما گھر اڑا دینے کی اس کی یوجنا ہے ——— ہاں ——— نہیں ——— انرتھ ہوجائے گا ——— ہزاروں نردوش مارے جائیں گے ——— جلدی کیجئے ——— ہاں ——— تھینک یو سر!"

ہال اندھیرے کی آغوش میں لپٹا ہوا تھا۔ پردۂ سیمیں پر رقص کے مناظر میں درشک کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے کانوں میں لاؤڈ اسپیکر کی آواز ٹکرائی۔ "درشک بھائیو اور بہنو! ہمیں کھید ہے کہ کچھ گڑبڑی کی وجہ سے بیچ ہی میں ہمیں شو روکنا پڑ رہا ہے۔ لیکن آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ سے انورودھ ہے کہ جو جہاں ہے وہیں شانت بیٹھا رہے۔ خبردار۔ کوئی ہلنے ڈولنے یا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ سینما گھر کو چاروں طرف سے پولس نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ آپ سے اپیل ہے کہ آپ شانت رہیں۔

یہ سارا انتظام آپ ہی کی سُرکشا کے لیے کیا گیا ہے"؟

اعلان کے ساتھ ہی سینما ہال کے تمام بلب جل اُٹھے۔ روشنی ہوتے ہی تمام دروازوں پر مسلح سپاہی نظر آئے۔ ہال میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ لوگوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ چند مسلح سپاہی ہر چہار سمت سے ایک برقع پوش خاتون درشک کو نشانے کی زد پر لیے ہوئے ہیں۔ پولس افسر نے کڑک کر کہا "خبردار جو کوئی حرکت کی۔ کھڑے ہو جاؤ اور برقع اتار دو" خاتون سعادت مندی کے ساتھ چپ چاپ کھڑی ہوگئیں۔ جسم کی کپکپاہٹ برقع کے اوپر سے بھی ظاہر تھی۔ افسر پھر گرجا "میں نے کہا برقع اتار دو"!

خاتون نے برقع ہٹایا تو اندر سے مولوی حسّو برآمد ہوئے۔ ▲△

- انتظار حسین
(پاکستان)

مجتبیٰ حسین

مزاح نگاری کی روایت میں نیا چہرہ

ہمارے یہاں مزاح نگاری اس وقت بڑی حد تک اخباری کالموں کی مرہونِ منت ہے یعنی اس وقت اس کا تعلق ادب سے کم اور صحافت سے زیادہ ہے۔ شائد اسی لئے ابتذال نے بہت راہ پائی ہے۔ لے دے کے ایک بڑا نام ہے جو صحافت سے الگ رہ کر پروان چڑھا ہے یہ مشتاق احمد یوسفی کا نام ہے لیکن اب اسی ٹکر کا دوسرا نام ہندوستان سے اُبھر کر سامنے آیا ہے، یہ مجتبیٰ حسین ہیں اور اب شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ بات سن لیجئے کہ "معاصر ظریفانہ ادیبوں میں دو ہی چار ایسے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کی ادبی حیثیت کو مستحکم کیا ہے۔"

شمس الرحمٰن فاروقی نے دو ہی چار میں سے صرف دو نام بتانے ضروری سمجھے ہیں۔ ایک مشتاق احمد یوسفی اور دوسرے مجتبیٰ حسین "اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے طنز و مزاح کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سودا اور میر سے لے کر پطرس۔ بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔"

مجتبیٰ حسین کے تعارف کے لئے یہ بتانا کہ وہ ابراہیم جلیس کے بھائی ہیں چنداں ضروری نہیں ہے۔ خاندانی پس منظر کے طور پر آپ اس رشتہ کو یاد رکھنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین برادر خورد ضرور ہیں مگر بڑے بھائی کا سایہ ذرا جو اپنے اوپر پڑنے دیا ہو۔ یعنی ابراہیم جلیس کا بڑا ہونے نے مجتبیٰ حسین کا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ خاندانی اعتبار سے تو یہ سانحہ ہے مگر شاید یہ لکھنے والے کی حیثیت سے مجتبیٰ حسین کے لئے یہ اچھا ہی ہوا کہ ابھی انہوں نے ہوش کی آنکھ کھولی ہی تھی کہ بڑا بھائی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔ ابراہیم جلیس ۴۸ء میں سانحۂ حیدرآباد کے نتیجہ میں بہہ کر پاکستان چلے آئے اور مجتبیٰ حسین کے لئے ان کی حیثیت یہ ہوگئی کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ "ابراہیم جلیس افسانہ نگار تھے مگر میرے لئے صرف افسانہ تھے حالانکہ وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ وہ پڑوسی ملک کے شہر کراچی میں رہتے تھے، مگر لگتا تھا کہ وہ لاکھوں کروڑوں میل دور ہیں۔"

سو مجتبیٰ حسین نے جب قلم اٹھایا تو ان کے سر پر کسی بڑے کا سایہ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی راہ آپ نکالی۔

رستے پر چلے ہی نہیں جہاں ایسا امکان ہو سکتا تھا' افسانے کو چھوڑ کر طنز و مزاح کے میدان میں اپنا دست بنایا۔ اس میدان میں وہ کسی کے چھوٹے بھائی نہیں ہیں۔ ویسے بھی یہ میدان انہیں خالی ملا تھا۔ اس میدان میں کسی زمانے میں جو بڑے مانے گئے تھے وہ گذر چکے تھے یا اپنا وقت پورا کر چکے تھے۔ ہمعصروں میں بھی کم از کم ہندوستان کی حد تک انہیں اپنا کوئی حریف نظر نہیں آتا تھا۔ یوں حیدرآباد کی ادبی فضاء میں طنز و مزاح کا بہت چرچا تھا۔ اب بھی وہاں یہ صورت ہے کہ مشاعرے ہوتے ہیں تو طنز و مزاح کے حوالے سے ہوتے ہیں' محفلیں برپا ہوتی ہیں تو وہ طنز و مزاح کے حوالے سے ہوتی ہیں۔ مزاحیہ شاعروں کی جتنی بڑی کھیپ حیدرآباد نے پیدا کی ہے جو پاکی معمودنیا کی فراہم کردہ کھیپ پر بھاری ہے مگر شاعری میں وہاں جتنی فصل بوئی گئی وہ پھل لائی ایک نثر نگار کے یہاں جاکر مجتبیٰ حسین اس فضاء میں پھل پھول کر اس فضاء سے آگے نکل گئے اور اس صف میں اپنے لئے جگہ بنائی جس کا سلسلہ شمس الرحمٰن فاروقی کے لفظوں میں سودا اور میر سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا یہ ذکر اصل میں اس تقریب سے نکلا ہے کہ انہیں دنوں ہندوستان سے مجھے ایک رسالہ کا خصوصی نمبر موصول ہوا ہے جو مجتبیٰ حسین کے لئے وقف ہے۔ یہ حیدرآباد سے نکلنے والا رسالہ "شگوفہ" ہے جو ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کی ادارت میں شائع ہوتا ہے' اس کا تازہ شمارہ 'مجتبیٰ حسین نمبر' ہے جو چار سو ساٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ نقادوں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے اس مزاح نگار کے کام پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' شمیم حنفی' پروفیسر مغنی تبسم' پروفیسر وحید اختر جیسے نقاد اس فہرست میں شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے مزاح کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں مختلف نقادوں نے بہت سی باتیں کی ہیں مگر ایک بات جو شمس الرحمٰن فاروقی نے کہی ہے وہ میرے دل کو بہت لگی۔ انہوں نے نیویارکر کے ایڈیٹر ہیرالڈ راس کا حوالہ دیا ہے وہ جس مزاح نگار کو کم تر درجے کا قرار دیتا تھا اس کے بارے میں کہہ دیتا تھا کہ اس کی ظرافت میں چاشنی نہیں ہے غریب کو زبان جو نہیں آتی۔ اس مثال سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں اور صحیح نکالتے ہیں کہ زبان کا ہتھیار طنز و مزاح میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے "ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہم شمارہ نکالتے ہیں لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد' تناسب' توازن کے ذریعے ہنسی والی اب بات بن جائے ہر ایک کا کام نہیں۔ مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں۔"

اصل میں ہمارے زمانے میں دو ہی مزاح نگار ایسے ہیں جو زبان کے معاملہ میں پکے ہیں اور اپنے فن میں اسے برتنا اور اس سے کھیلنا خوب جانتے ہیں اول مشتاق احمد یوسفی دوم مجتبیٰ حسین۔

لیجئے میں مجتبیٰ حسین کے مزاح کی تعریف کئے جارہا ہوں' کچھ نمونۂ کلام بھی تو سامنے آنا چاہیئے۔

"اتنے برسوں تک بھانت بھانت کے رکشاؤں میں بیٹھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جب گھوڑے کی قسمت پھوٹ جاتی ہے تو وہ تانگہ میں جوت دیا جاتا ہے اور جب انسان کی قسمت پھوٹ جاتی ہے تو وہ رکشا

چلاتا ہے اور جس شخص کی قسمت کسی وجہ سے پھوٹنے نہیں پاتی بلکہ پھوٹنے کی منتظر رہتی ہے تو وہ رکشا میں بیٹھ جاتا ہے۔ ہزار بار رکشا والوں کو سمجھاتا ہوں کہ میاں سلامتی کی چال چلو کہ زندگی میں یہی کلید کامیابی ہے تو وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ "حضور سلامتی کی چال چل کر تو اس نوبت کو پہنچے ہیں اور اب مزید سلامتی کی چال چلیں تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

انہوں نے جو خاکے لکھے ہیں وہ بھی خوب ہیں۔ آدمی کو کیا بیان کرتے ہیں کہ اسے آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ عمیق حنفی کے بارے میں چند سطریں دیکھئے۔

"پھر ہم ریڈیو اسٹیشن کی سیڑھیوں سے اتر کر آنے لگے تو دیکھا کہ عمیق حنفی اپنے پستہ قد کو زمین سے گھسیٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ پستہ قد لوگوں کو میں ہمیشہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ زمین پر کم سے کم چلیں۔ قدرت نے جتنا بھی قد دیا اس کی جی جان سے حفاظت کریں اگر خدانخواستہ یہ کثرتِ استعمال سے گھس گیا تو زمین پر آدمی کی بجائے ٹوپی چلے گی۔"

— —

غالب حیدرآبادی

بور کرنا ہے مجھے اور نہ ستانا ہے مجھے
باوجود اس کے بھی بھرمار سنانا ہے مجھے

فلمی دنیا کو تو لوٹا ہوں میں کافی حد تک
بن کے ستیاس شہر لوٹ کے جانا ہے مجھے

بن گیا سادھو میں بہروپیا بھی سمجھو مجھے
باندھ کے ساڑی نیا ڈھونگ رچانا ہے مجھے

اک ذرا سے میں جھڑپ چلتی حسینوں سے کبھی
عمر اسّی میں کہاں روٹھ کے جانا ہے مجھے

بس اکیلے میں یہ کہتا ہے نیا شاعر آج
دور سے آیا، بہت دور ہی جانا ہے مجھے

یہ تو اندر ہی سے کہتا ہے مسلماں کلمزاج
لوٹ کر پھر سے دوبارہ نہیں آنا ہے مجھے

نبیؐ کا قول ہے تم خشّہ رہو بشّہ رہو
اس لیے ہی تو ذرا ہنسنا ہنسانا ہے مجھے

میں قلندر تو نہیں غم پہ جو غم سہتا چلوں
بس ذرا ٹیس جو ہو بوم مچانا ہے مجھے

شیخ تو لیتے ہیں ہفتے میں بس اک بار ہی غسل
نہ ملے پانی تیمم پہ بھی آنا ہے مجھے

بات کچھ اور ہی ہے لیتا ہوں میں عذرِ صحت
صورتِ برہمناں روز نہانا ہے مجھے

دوڑے آتے تھے عرب سوئے دکن بہرِ معاش
ارضِ چاؤش میں اب دوڑ کے جانا ہے مجھے

میں لگا دوں جو ابھی کان میں سب کے آلے
"نبض کے چلنے کی آواز سنانا ہے مجھے

دست بستہ ہیں یہاں لفظ کے لشکر غالب
جن کے الفاظ ہی ان کو نچانا ہے مجھے

ایک قوّال کو رکھتا ہوں جلو میں غالب
شعر محفل میں انہی سے ہی گوانا ہے مجھے

محمد طارق
(امراؤتی)

ڈگریوں کا بزنس

اُس نے بے تکلف ہوکر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں پہ نظر ڈالی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمارے ہاں سب سے اچھی بلڈنگیں تعلیمی اداروں کی نہیں ہوتیں تھیٹروں کی ہوتی ہیں — نتیجے پہ پہنچتے ہی اس کے ذہن نے قلابازی کھائی —

تھیٹر بھی تو ایک قسم کی درس گاہ ہے۔ جہاں عشق و سیکس۔ مار دھاڑ لوٹ کھسوٹ۔ دہشت طرازی کا درس دیا جاتا ہے۔ الگ الگ ڈھنگ سے نئے نئے انداز سے جو اس صدی میں تو کام آہی رہا ہے لیکن اکیسویں صدی میں اس درس کے سوا کوئی چارا ہی نہیں رہے گا۔ باقی سارے درس سر درد بن جائیں گے — اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فلم کا مستقبل روشن ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے وہ اپنی کھوپڑی اس طرح سہلانے لگا جیسے کسی شریر اسٹوڈنٹ نے اُس کے سر پہ پتھر مار دیا ہو۔ جس طرح اسٹرائیک دنگوں میں پتھر مارے جاتے ہیں ایسے ہی۔

اب اُس کا ہاتھ سر سے ماتھے پر آگیا تھا وہ طلبہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو ڈگریوں کے لیے ریس کے گھوڑوں کی طرح دوڑ رہے ہیں — تعلیم کے اُجاڑ میدانوں میں چر رہے ہیں۔ جگالی کر رہے ہیں — جگالی کرنے والے طلبہ وہ ہوتے ہیں جو بار بار فیل ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کو اُن کے اساتذہ و سرپرست یہ کہکر پھسلا لیتے ہیں کہ "گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں"

اور یہ سنتے ہی طلبہ شہسوار بن جاتے ہیں اور تعلیم کے میدان میں پھر کود پڑتے ہیں جہاں اساتذہ اُن کے ٹیوٹر بن جاتے ہیں ویسے جو طلبہ جگالی کرنے والے نہیں ہوتے وہ بھی ٹیوشن لگا لیتے ہیں۔ استاد محترم کی فرمانبرداری اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے۔ جس مضمون کی وہ ٹیوشن لگاتے ہیں اس میں کامیابی دلانے کی گیارنٹی استاد محترم اپنے سر لے لیتے ہیں۔ اس طرح مدرسین صاحبان کی سائیڈ انکم ہو جاتی ہے اُن کی زندگیاں بھی شان سے گزرتی ہیں اور طلبہ بھی شان سے ترقی کرتے جاتے ہیں اور اتنی ترقی کر لیتے ہیں کہ انھیں ڈگریاں مل جاتی ہیں۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے طلبہ کتنا پیسہ صرف کرتے ہیں اس کا حساب ہر اس سرپرست کے دل کی ڈائری میں تفصیل سے درج ہے جن کی ہونہار اولادیں ڈگریاں حاصل کر کے سڑکوں کی خاک چھان رہی ہیں اور اپنی اپنی ٹانگوں کی ٹانگیں توڑ رہی ہیں۔

سوچ سوچ کر کچھ نہیں ہوتا۔ اُس نے سوچا تعلیم کا معیار دن بدن ٹی بی کے مریض کی صحت کی طرح گر رہا ہے اسے صحت مند بنانے کے لیے ہمارے ہاں کوئی سینی ٹوریم نہیں ہے اس لیے مجھے کچھ کرنا چاہیئے۔

اس نے جعلی ڈگریاں بنانی شروع کر دیں۔ یہ سوچ کر کہ ہمارے دیس میں نقلی دوائیاں فروخت کر کے مریض کی زندگی سے موت کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کھلے عام نقلی چیزیں بک رہی ہیں غذا میں بھی نقلی چیزوں کا استعمال اتنا ہو رہا ہے کہ کوئی غلطی سے اصلی چیز استعمال کرے تو بدہضمی ہو جائے۔

ہاں — " ذہن نے پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔

کیا ہوگا —؟ کچھ نہیں ہوگا۔ اس کام سے دیش کا ہر چھوٹا بڑا امیر غریب ڈگری والا بن سکتا ہے۔ انسان ہی نہیں جانور بھی ڈگری والے بن سکتے ہیں — سارا دیش ڈگری یافتہ ہو سکتا ہے۔ ملک مکان اپنے باہر کے دروازے پر من چاہی ڈگریاں لے کر نیم پلیٹ لگا سکتا ہے اور جن لوگوں کے پاس گھر نہیں ہے وہ اپنے گلے میں اپنی نیم پلیٹ پر ڈگریاں لکھ کر لٹکا سکتے ہیں اور سینہ تان کر سر اُٹھا کر گھوم پھر سکتے ہیں — کام تو بہت اچھا ہے تعلیمی ترقی کے لیے اس سے اچھا کام اور کیا ہو سکتا ہے — پیسہ کم اور ترقی زیادہ۔

اس کی جعلی ڈگریاں خوشی سے ہاتھوں ہاتھ بکنے لگیں۔ اسے احساس ہوا۔ میرے دیش کے لوگ ڈگریوں کے لیے کتنے ترسے ہوئے ہیں کاش میں یہ کام عرصہ پہلے شروع کر دیتا۔

ایک دن اُسے خیال آیا کہ اُس نے آج تک اپنی دھرم پتنی کو ڈگری یافتہ نہیں بنایا۔

خیال آتے ہی اپنی بیوی سے بولا۔ "جانم! ایک بات کہوں!"

"کیا"

" دیش کے اکثر لوگ ڈگری یافتہ بنتے جا رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ بنا ڈگری کے اپنا جیون بتا رہی ہو — اچھا ہوا مجھے تمہارا خیال آگیا تمہیں تو اپنی فکر ہی نہیں — کونسی ڈگری دوں تمہیں؟"

" مجھے نہیں چاہیئے ڈگری وگری — کیا کروں گی میں تمہاری ڈگری لے کر" کچھ نہیں — مگر اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی شادی کی تصویر کے نیچے جو میں نے اپنی ڈگری لگائی ہے اس کے بازو تو لگا سکتی ہو تم —' میرے من کو اچھا لگے گا — میں ایم اے، پی ایچ ڈی اور تم کچھ نہیں"

" اے — ہے کچھ نہیں' وہ میرے پتا جی کے پاس میرا چوتھی کلاس پاس سرٹیفکٹ رکھا ہوا ہے تمہیں تو جہیز میں اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی نا — اب منگوالو۔ اور لگا دو تمہاری ڈگری کے بازو ہی "

"نہ ۔۔۔ سچ اچھا لگے گا بھلا؟ دنیا میں عورت اور مرد کی نامساوات ختم کرنے کے لیے تحریکیں چلائی جا رہی ہیں اور میں ان کا دل و جان سے حامی ہوں۔ مجھے کیسا اچھا لگے گا بھلا —؟ میں ایم اے پی ایچ ڈی اور تم صرف چوتھی کلاس پاس۔ یہ تو مساوات کے خلاف ہے' میں ایسا نہیں کروں گا — تمہیں بھی ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگری دوں گا"

اس نے جب اپنی بیوی کو ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی تو اس کی بیوی نے ڈگری سے چوہلہا سلگا لیا — وہ بہت ناراض ہوا۔

ناراض کیوں ہوتے ہو جی! ایندھن تو گیلا منگواتے ہو اور گھر میں ایک کاغذ بھی نہیں رکھتے — کیا سارے کاغذ دل کی ڈگریاں بنا ڈالتے ہو تم — تو کیا کروں [illegible]

ہے نا ہر روز۔ کیا میں اپنے ہاتھ پیر لگا دوں چولہے میں؟

"نہیں ۔ نہیں یہ ظلم کبھی مت کرنا۔ اپنے ہاتھ پیر چولہے کے باہر ہی رکھنا نہیں تو ظالم سماج (جسے جانے کس نے ظالم بنا ڈالا) مجھ پر الزام لگا دے گا کہ میں نے اپنی بیوی کو زیادہ جہیز نہ ملنے پر جلانے کی کوشش کی۔ اس لیے براہ مہربانی میری خاطر، میری عزت و آن کی خاطر اپنے ہاتھ پاؤں چولہے میں مت لگانا اور آئندہ ڈگریاں کبھی مت جلانا۔

یہ کیا میں تمہیں اپنے برابر کا درجہ دینا چاہتا ہوں لیکن تم وہی رہنا چاہتی ہو برسوں پرانی رسوائی گھر کی عورت!

تمہارا یہی حال رہا تو تم مردوں کے برابر کبھی نہیں ہو سکتیں ۔ اونچی ایڑی کی سینڈل پہن کر خود کو مردوں کے برابر سمجھ لینا تمہاری بیوقوفی ہے سمجھی! اس نے جھلا کر اپنی بیوی سے کہا۔

ناٹے قد کی اس کی بیوی مسکراتے ہوئے اس کے قریب آئی نگاہوں سے اپنے شوہر کے قد سے خود کو ناپا اور چہکی " ناراض کیوں ہوتے ہو جی! دوسری ڈگری بنا کر دے دو۔ یہ تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

بیوی کی چہکار سن کر اور اس کی تبسم دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں اور ایسی کھلیں کہ اسی وقت بند ہوئیں جب ایک روز پولس آفیسر نے اسے گرفتار کر لیا۔ جعلی ڈگریاں بنا کر فروخت کرنے کے جرم میں۔

وہ پولس آفیسر اسے قطعاً گرفتار نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کے فرزند ارجمند کو ایک ڈگری دے دیتا جو اس نے مفت میں مانگی تھی۔ اپنے والد محترم کی طرح۔

وہ اسے مفت میں بخوشی ڈگری دے دیتا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ لوگ اعلیٰ عہدہ داروں، نیتاؤں کو ان کے رشتہ داروں کو کیا کچھ نہیں دیتے۔ غلطی صرف یہ ہوئی تھی کہ اس نے اسے بتایا ہی نہیں تھا کہ میں ایک پولس آفیسر کا بیٹا ہوں۔

میں کہوں گا یہ غلطی پولیس آفیسر کے فرزند کی نہیں تھی اس کی ہی تھی۔ بیوقوف نے آواز سے بھی پہچانا نہیں تھا کہ کس کا بچہ بول رہا ہے۔

شاہد عدیلی

میری غزل پہ لوگ کچھ ایسے مچل گئے
ایک ایک کرکے ہال سے باہر نکل گئے

بچہ نس میں ہم خُسر سے جب آگے نکل گئے
باہر سے خوش ہوئے مگر اندر سے جل گئے

لُکنت تھی اک ذرا سی ہماری زبان میں
لیکن ہمارے لڑکے تو ہکلے نکل گئے

کل رات گھر کو لوٹنے میں دیر کیا ہوئی
آتش فشاں پہاڑ سے لاوے اُبل گئے

بدلیں حکومتیں تو ملا کیا عوام کو
اتنا ہوا ضرور کہ چمچے بدل گئے

دیکھیں گے سر کے بل بھی کسی روز جا کے ہم
اب تک تو اُن کے کوچے میں ٹانگوں کے بل گئے

رہنے لگے ہیں توپ کے سانچے میں جب سے ہم
سب کو گماں ہے توپ کے سانچے میں ڈھل گئے

ساقی کا جشنِ سالگرہ میکدے میں تھا
جب میں گیا تو حضرتِ واعظ اُچھل گئے

دشمن خود اپنے داؤ پہ گھٹنوں کے بل گرا
ہم پینترا ذرا سا جو شاہدؔ بدل گئے

لاغر نرملی

کچرا عزّت کا

ڈاکٹر ہڈیوں کے دو تھے مطب کھولے ہوئے — اتفاقاً تھے وہ دونوں ہی بہت نکلے ہوئے
بات اُنھیں اپنی منانے کی بُری عادت تھی — شرط آپس میں لگانے کی بُری عادت تھی
ایک دن دونوں مطب میں تھے یوں ہی بیٹھے ہوئے — ہڈیوں کے کسی پیشنٹ کی رہ تکتے ہوئے
دُور سے آیا نظر آدمی اک آتا ہوا — چل رہا تھا جو کسی وجہ سے لنگڑاتا ہوا
بڑی مشکل سے اُٹھاتا تھا قدم وہ ایسے — اُس کے اِک پیر میں تکلیف بہت ہو جیسے
بحث یوں کرنے لگے دیکھ کے اُس کو احمق — شرط آپس میں لگا بیٹھے وہ دونوں ناحق
ایک کا دعویٰ تھا "ٹخنے کی ہے ہڈی ٹوٹی" — دوسرا کہتا تھا "گھٹنے کی ہے ہڈی ٹوٹی"
جوں ہی پاس آیا وہ دونوں نے اُسے گھیر لیا — یک زباں ہو کے لجاجت سے یہ دریافت کیا
سچ کہو آپ کے ٹخنے کی ہے ہڈی ٹوٹی؟ — یا کہ گر پڑنے سے گھٹنے کی ہے ہڈی ٹوٹی
سُن کے بچکانہ سوال اُس نے منہ اپنا کھولا — کچرا کرتے ہوئے دونوں کا وہ ہنس کر بولا

نہ تو ٹخنے کی، نہ گھٹنے کی ہے ہڈی ٹوٹی
بے وقوفو! مرے چپل کی ہے پٹی ٹوٹی

○

جھاپڑ ناگپوری

تلخ گفتار پہ اُس کی یہ گماں ہوتا ہے
جیسے سالن ہو کوئی تیز مسالے والا
ایسی چُپ سادھ کے لیٹے ہیں وہ ارضِ دل پہ
جیسے صندوق پڑا ہو کوئی تالے والا
نرم لہجے میں جو ہے پھول کی پتی کی طرح
سخت لہجے میں وہی بول ہے بھالے والا
تیری شہرت کا بھی اِک روز بجے گا ڈنکا
مسکہ مارے گا مجھے آکے رسالے والا

امتہ السلام عالمہ صدیقی
ایم اے، سال اول (اردو)
آرٹس کالج، جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد)

نقل نویسی کے ماڈرن طریقے

زندہ دلان حیدرآباد کی سلور جوبلی کے موقع پر منعقدہ بین کلیاتی مزاحیہ مضمون نگاری کے مقابلے میں ججس نے اس مضمون کو انعام اول کا مستحق قرار دیا تھا ——— (ادارہ)

نقل کیا ہے؟ کسی کی کہی ہوئی بات کو ان کے ہی انداز میں یا اُن کی ہی آواز میں بیان کرنا نقل ہے۔ انسان کی شکل وصورت، عادات واطوار خود نقل ہیں اس کے آبا واجداد کی۔ انسان کی زندگی۔ اس کا رہن سہن طور طریقے، بات چیت کا طریقہ۔ لباس۔ رہائش۔ سب نقل ہیں۔ پھر نقل کو اتنا بُرا کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اگر کوئی نیک کام کرے تو اس کی مثال دی جاتی ہے اور ویسا ہی عمل کرنے کو کہا جاتا ہے۔ کیا یہ نقل نہیں ہے؟ ہمارے نبی کریم نے ہم کو زندگی کے ہر پہلو، ہر لمحہ کے لیے اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں جو احادیث میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہر اچھی و بُری چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نیک و بد کی شناخت تبلائی ہے۔ دوزخ وجنّت کا فرق بتایا۔ اس کو پانے اور بچنے کے دونوں طریقے بتائے ہیں چنانچہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔ کیا یہ نقل نہیں ہے؟ غرض یہ کہ انسان نقل کا پتلا ہے۔ بچہ اپنے والدین کی نقل کرتا ہے لڑکا والد کی طرح آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر شیو کرنا چاہتا ہے تو لڑکی بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ لڑکا جوتا پاتا ہے پہن کر ہلیمٹ پہن کر اسکوٹر چلانا چاہتا ہے تو لڑکی اوڑھنی بیٹ کر سر پر اوڑھنی ہے لانبی چوٹی گوندھ کر۔ اور دوپٹہ ڈال کر دلہن بننا چاہتی ہے۔ غرض کہ بچے بچپن سے ہی اپنے بڑوں کی نقل کرتے ہیں نقل ہماری جبلّت میں شامل ہے۔ یہ ہماری زندگی کا اہم پہلو ہے۔ آیئے اب آپ کو ہم نقل نویسی کے چند ماڈرن طریقے بتاتے ہیں۔ نقل نویسی کے کئی طریقے ہیں اور ان کا تجربہ ان ہی کو ہوتا ہے جو خود اس میں ملوث ہوتے ہیں یا پھر ایسے استاد جن کی ڈیوٹی اکثر وبیشتر امتحانی ہال میں لگا دی جاتی ہے۔ پھر بھی ہم چند دیکھے، سُنے اور سوچے ہوئے طریقے بتاتے ہیں۔

نقل مارنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے آپ کو اچھی غذا استعمال کرنا ضروری ہے روزانہ صبح ایک عدد ایک گلاس دودھ، چار بھیگے ہوئے بادام۔ دو کھجور اور کچھ چلغوزے و پستہ۔ نہار پیٹ کھانا ضروری ہے

نقل مارنے کے لیے اچھی کتابیں اچھے نوٹس چاہئیں کبھی اپنے پیسوں سے کتابیں مت خریدیئے۔ اور نہ ہی نوٹس بنانے میں وقت خراب کریں۔ کیونکہ ہر چیز آج کل تیار ملتی ہے۔ لائبریری سے کتابیں لائیے۔ جس کتاب میں اچھا مواد ہے اس کو آہستگی سے بالکل صحیح ڈھنگ سے پھاڑ ڈالئے۔ دوستوں کے نوٹس لائیے اور گول ہو جائیے۔ اگر وہ مانگنے آئے تو معافی چاہ لیجئے۔ یا واپس کرنے پر مجبور ہو جائیں تو اُس کی زیراکس کروا لیجئے۔

سال بھر کالج مت جائیے۔ البتہ کالج کی کینٹین ضرور جائیے۔ وہاں گرم گرم چائے اور کافی پیجئے۔ اور تمام حالات کا جائزہ لیجئے۔ کالج کی سرگرمیوں سے واقف رہیئے۔

کلاسس کبھی اٹنڈ نہ کریں۔ صرف اساتذہ کے چہروں اور ناموں کی شناخت کرلیں۔

امتحان کا سنٹر کہاں بن رہا ہے ممتحن کون رہیں گے اور پرچے جانچنے کے لیے کس کو دیئے جائیں گے ان باتوں سے ضرور واقف رہیئے اور ان کی خبر لیتے رہیئے۔ یہ بنیادی چیز ہے کہ نسا پرچہ کس مقام پر جا رہا ہے ضرور معلوم کریں۔

صرف ہال ٹکٹ لینے کالج آئیں۔ اور آگے اور پیچھے والا کون ہے ضرور اُس کا نام اور پتہ نوٹ کرلیں اور دوستی بڑھائیں۔ پڑوسی سے اُلفت رکھنا، میل ملاپ بڑھانا ایمان کا جُز ہے۔

جہاں بھی سنٹر بن رہا ہو وہاں کے مجموعی حالات۔ وہاں کے ہال۔ روم۔ آفس۔ کھڑکیاں۔ فلور مع باتھ روم۔ ہر چیز کا جائزہ لیں۔

جس کالج میں بھی امتحان دینا ہو وہاں کے لڑکے جاکر۔ مالی۔ آفس بوائے اور چوکیدار کو ضرور کچھ نقدی دیں اور دوستی کرلیں۔

اس طرح تمام حالات سے واقف ہو کر فراخدلی کا مظاہرہ کیجئے کچھ دوستی بڑھائیے۔ جیب پر بوجھ ڈالیے والدین سے زیادہ رقم کا مطالبہ کیجئے۔ گھر میں گڑبڑ کیجئے۔ اس طرح دھوم دھام سے امتحان کی تیاری میں مصروف رہئیے

امتحان سے ایک دن قبل کی شام و رات آپ کی تیاری کی اصل رات اور کامیابی کی مظہر ہے۔ تمام کاموں سے مطمئن ہو جائیے اور تھک گئے ہوں تو کوئی سکنڈ شو پکچر دیکھنے میں ہرج نہیں۔ یا پھر ریستوران میں بیٹھ کر کافی پیجئے۔ ساری رات بات چیت میں مصروف رہنے سے آپ کی دماغی تھکن دور ہو جائے گی۔ صبح صبح سو جائیے تا کہ آنکھیں متورم نہ ہوں۔ چہرے کی سوجن کم ہو جائے۔ ٹھیک آٹھ بجے اُٹھیے۔ گرم گرم پراٹھے۔ نیم برشٹ انڈا کا ناشتہ لیں۔ چائے سے فارغ ہو کر کالج جانے کی تیاری کریں۔ پہلے پن دیکھئے ہے یا نہیں۔ خیر نہ ہو تو پرواہ نہیں راستہ سے خرید لیجئے۔ یا پھر کوئی دوست سے مانگ لیجئے۔ مگر ہاں۔ کچھ تیار ہے یا نہیں!؟ ارے ارے ذہن۔ دل و دماغ تو خالی ہیں مگر جیب۔ کالر۔ بنین کے اندر انڈر ویر کے اوپر پٹی میں۔ پاتابوں کے اندر۔ تلوے کے نیچے جوتے کے اندر۔ گھڑی کے نیچے۔ ٹخنے سے لے کر پنڈلی تک ربر بینڈ سے کسا ہوا کمپاس کے اندر۔ ہال ٹکٹ کے اوپر ہلکا ہلکا پنسل سے لکھا ہوا۔ بشرٹ کے آستین کی پٹی میں۔ پاینٹ کے نیچے کی پٹی میں ہتھیلیوں پر۔ انگلیوں کے بیچوں بیچ نٹ بیٹری پر پٹ کے اوپر۔ غرض یہ کہ ہر مناسب و خفیہ جگہ پر جہاں آپ کو سہولت ہو کچھ مفید "مال" رکھ لیں۔

دورِ حاضر میں جہاں الکٹرانک اور سائنٹی ترقی نے انسانوں کو بے پناہ سہولتیں مہیا کی ہیں وہیں صاحب عقل لوگوں کے لیے کم وقت میں آگے بڑھنے اور بغیر محنت کے خاطر خواہ فائدے اُٹھانے کے ذرائع بھی پیدا کئے ہیں۔

ایک زمانہ تھا طالب علم کی کامیابی کا دارومدار صرف اس کی محنت، اور لگن پر منحصر تھا۔ لیکن اس ترقی یافتہ دور میں قسمت اور چالاکی نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اگر آپ میں ذراسی عقل ہو تو اپنی جملہ صلاحیتوں کو کام میں لا کر امتحان ہال کے نگران کو اپنی بے پناہ خوبیوں سے چکمہ دے کر نقل کریں تو کیا مجال ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا امیدوار آپ پر سبقت لے جائے۔

آج کل آپ کو نقل کے لیے کسی چٹھی یا نوٹ کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ یہ کام آج کل جیبی ٹرانسسٹر آسانی کر سکتے ہیں۔ صرف کم فریکیونسی کا ریڈیو ٹرانسسٹر درکار ہے جو بہ آسانی مل سکتا ہے۔ کسی قریبی مقام سے پرچے کے جوابات نشر کرنے کا انتظام کر لیجئے۔ جوابات کانوں کی راہ سے قلم کے توسط سے کاغذ پر منتقل ہو جائیں گے۔۔۔ اور یوں منتقل ہوں گے کہ کیا مجال ممتحن بھی آپ کی بے پناہ مصروفیت کو دیکھ کر قریب آنے کی جرأت کر سکے۔ وہ آپ کی مصروفیت پر خوش ہوگا۔

اگر آپ اس عمل کے قائل نہیں تو ایسا کر سکتے ہیں کہ اہم نوٹس کو ایک جیبی ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر لیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ شرٹ کے اندر سے واکر کو لے کر ایرفون کان پر لگالیں اور سر پر پگڑی باندھ لیں۔ بس بٹن دبائیں اور نوٹس آپ کے کان میں موجود۔۔۔

آبجکٹیو سوالات کے جوابات لاؤڈ اسپیکر سے بھی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ امتحانی سنٹر کے نکڑ پر جلسہ کرنے کے بہانے لاؤڈ اسپیکر لگوا لیجئے۔ اور لاؤڈ اسپیکر ٹسٹنگ کے بہانے صحیح جوابات کے نمبر حاصل کر لیجئے۔ یہ کوئی نہیں غور کرے گا کہ لاؤڈ اسپیکر ٹسٹنگ میں حروف یا اعداد صحیح اور سلسلہ وار گنے گئے کہ نہیں!

کیا مجال کہ پولیس یا ممتحن آپ کی اس نقل نویسی کا اندازہ کر سکیں!

اگر آپ کامرس کے یا حساب کے طالب علم ہوں تو جمع تفریق تقسیم ضرب کرنے کی تکلیف نہ کریں۔ ایک جیبی CALCULATOR ضرور ساتھ لے جائیں۔

ممتحن کے بھی اقسام ہوتے ہیں۔ نوجوان۔ مرد۔ عورت۔ اگر کوئی نوجوان خوبرو مرد ہال میں آپ کی نگرانی کر رہا ہو تو فوراً اُس سے کرکٹ کا اسکور۔ پوچھئے۔ پچھلے میچ کے بارے میں تبصرہ کیجئے یا اس کی شادی ہوئی ہے یا نہیں دریافت کیجئے۔ کسی لڑکی کا پتہ بھی بتائیے۔ ہماری فلاں بہن ہے۔ ۲ لاکھ نقد، چار لاکھ کا گھر۔ کار۔ اسکوٹر وغیرہ سب دیں گے۔ یہ بھی کہئے کہ اچھے لڑکے کی تلاش ہے۔

اب دیکھئے نوجوان ممتحن آپ کے چاروں طرف چکر لگانا شروع کر دیں گے اور اس پیام کے بارے میں استفسار کرتے رہیں گے اور آپ اُن کی اس مہربانی سے کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر INVIGILATOR اُن بیاہی محترمہ ہوں تو کہیں کہ ہمارے ایک بھائی ہیں سعودیہ میں ملازم ہیں۔ لین دین کے سخت خلاف ہیں نوجوان لڑکیوں اور بیواؤں کی فلاح کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ شادی کرتے ہی فوراً فیملی کو باہر لے جانا چاہتے ہیں۔ صرف خوبصورت بالکل آپ کی طرح اور قابل اور پڑھی لکھی لڑکی چاہیئے۔ بس دیکھئے۔ محترمہ مسکرا مسکرا کر آپ پر مہربان ہوں گی! اسی طرح اگر عمر رسیدہ مرد یا عورت آپ کی نگرانی کر رہی ہو تو اُن کی اولاد کے لیے اچھے رشتے یا ملازمت کا ذکر چھیڑ دیجئے۔ اور وہ بہتر مستقبل اور بہتر داماد کی خوشی کے تصور میں آپ کو چھوٹ دے دیں گے۔

کمپاس باکس کے نیچے کے BASE کے اوپر ایک اور SLIDING BASE بنایئے۔ اور اُسے QUICK FIX سے چپکا دیجیے۔ ایک طرف کا حصہ کھلا رکھیں اور اُس پر IMP. POINTS نوٹ کرلیں۔ کمپاس کو ہاتھ میں لیجیے اور نیچے کے BASE کو تھوڑا سا دھکا دیجیے۔ وہ جیسے جیسے باہر نکلتا جائے گا اہم پائنٹس نوٹ کر لیجیے۔ ممتحن صاحب آتے ہی اُس حصہ کو فوراً اندر ڈھکیل دیجیے۔ جوں کا توں کمپاس۔ بشک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

آپ کے سامنے والے جو بھی صاحب یا صاحبہ ہیں اُن کو دوست بنا لیجیے۔ اور امدادِ باہمی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ان کی گردن کے پچھلے حصے پر یعنی گُدّی کے نیچے سے کچھ دور تک بال پن سے اہم اشارے لکھ لیجیے۔ سفید کپڑے بھی بہت حد تک نقل نویسی میں مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ سفید نہرو شرٹ یا پاجامہ۔ واہ آپ تو نیت نظر آئیں گے مگر پہلے آپ گھر میں ان کپڑوں کو اُلٹا کر لیجیے۔ نہرو شرٹ کے دامن کے نچلے حصے پر POINTS اس طرح نوٹ کریں کہ جب آپ اپنا دامن اُلٹا کریں تو امتحان ہال میں وہ لکھائی آپ کو سیدھی نظر آئے اور پاجامے کے پائینچوں پر بھی ایسا ہی لکھیں جب آپ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پائینچا آہستہ سے اٹھائیں تو لکھائی سیدھی نظر آئے۔ آپ کے کپڑوں کی سفیدی آپ کے اُجلے پن کی نمائندگی کرے گی۔ اور ہر کوئی آپ کو عزت سے دیکھے گا بلکہ امتحان ہال میں تو بالکل نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح خواتین بھی اپنی اُجلی اُجلی سفید ساڑیوں اور خصوصاً مہریوں سے مستفید ہوسکتی ہیں۔ بال پن کی ریفل کے اوپر باریک بتی ROLL بنا کر تھوڑی چپکا دیجیے۔ پن اپنی اصلی حالت پر رہے گا۔ REFILL کو جھٹکنے کے بہانے وہ گول بتی نکال لیں۔ اور آرام سے لکھیں۔ موٹی خواتین اپنے پیٹ کا صحیح استعمال کرسکتی ہیں۔ پیٹ پر اہم سن اور کچھ اشعار نوٹ کرلیں۔ اوپر سے ساڑی اور پلّو اچھی طرح ڈھانک لیں۔

امتحان ہال کے بیت الخلاء میں اچھی کتاب کہیں اوپر پہلے ہی سے محفوظ کردیں۔ ضرورت کے بہانے جائیے اور اہم نکتہ یاد کرکے واپس آجائیے۔ مگر اس میں وقت کی خرابی ہے۔

▨ ▥

فارم ۱۷ حسبِ قاعدہ 8 بابت شگوفہ حیدرآباد

۱۔ مقامِ اشاعت : ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہنامہ

۳۔۴۔۵۔ پرنٹر، پبلیشر اور ایڈیٹر کا نام : سید مصطفےٰ کمال ۸۷۸-۶-۱۷، دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

۶۔ مالک : قیصر کمال، ۸۷۸-۶-۱۷
دبیر پورہ۔ حیدرآباد۔

میں سید مصطفےٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط
مصطفےٰ کمال

یکم مارچ ۸۸ء

ماجد شمیم ایڈوکیٹ (بیدر)

ہم نے بھی کُل ہند مشاعرہ پڑھا

شہر بیدر میں "کاروان اسٹڈی سرکل" کی جانب سے کُل ہند مشاعرہ "ہم ایک ہیں" کے عنوان سے منعقد کرنے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ مقامی شعرائے کرام اس کُل ہند مشاعرہ میں شرکت کے لئے اپنے اپنے کلام کے نوک پلک سنوارنے میں لگے ہوئے تھے اور میں جو دو ایک بار مقامی مشاعرے لوٹ چکا تھا لیکن کُل ہند مشاعرے میں شرکت کی شدید خواہش کے سامنے بے بس نظر آرہا تھا۔ کیونکہ میرے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان یہ تھا کہ دعوت نامہ کیسے حاصل کیا جائے۔ پھر تو میں نے کنوینر مشاعرہ اور اُن کے رفقاء کے سامنے بار بار مشاعرے کے عنوان پر بحث کرنا شروع کیا تاکہ اپنی شدید خواہش کا اشاروں، کنایوں میں اظہار ہو جائے۔ مگر پھر بھی دعوت نامہ تک رسائی نہ ہو سکی۔ اور تاریخ مشاعرہ تھی کہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ جب مشاعرے کے لئے صرف دو دن باقی رہ گئے تو اپنی نصف بہتر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے کنوینر کو ناشتہ کی دعوت دے ڈالی۔ کھانے کے درمیان اور کھانے کے بعد موضوع بحث، کُل ہند مشاعرہ اور اس کے انتظامات ہی رہے۔ آخر ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ مقامی شعراء میں کون کون مدعو کئے گئے ہیں؟ کنوینر نے زیر تبسم فرمایا کہ "آپ کو تو دعوت نامہ مل ہی چکا ہوگا۔۔۔؟"
میں نے چڑ کر کہا۔ "کہاں کا دعوت نامہ، کہاں کا مشاعرہ!"
کنوینر کو جو ناشتہ کی دعوت دی تھی، وہ بالآخر رنگ لا کر ہی رہی اور شام میں کُل ہند مشاعرے

کا دعوت نامہ آ ہی گیا۔ دعوت نامہ کیا ملا، ہمارے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اگرچہ کہ ایک مرصع غزل پہلے ہی سے تیار تھی مگر پھر بھی کل ہند مشاعرے میں شرکت کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ چونکہ آج کل کے سامعین، شعر کے معنی مطلب سے زیادہ شاعر کی خوش الحانی، اس کے پڑھنے کا انداز اور اس کے لباس پر خاص نظر رکھتے ہیں اسی لئے ہمیں ان اوصاف کو اپنانا تھا۔ شام کا کھانا سر مغرب ہی کھالیا۔ . . . اور کمرے میں بند ہوکر قدآدم آئینے کے سامنے مشق سخن شروع کردی . . . ابھی پہلے شعر کا مصرعۂ ثانی ہی زیر مشق تھا کہ کسی نے کال بل بجائی۔ بادل نخواستہ باہر گیا۔ دیکھا ہمارے بے تکلف دوست نثار صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کی اس معنی خیز مسکراہٹ کو نظرانداز کرکے میں نے اُن کی خیر و عافیت دریافت کی تو انہوں نے کہا۔ " معلوم ہوتا ہے کہ کل ہند مشاعرے کو لوٹنے کی تیاریاں چل رہی ہیں " میں نے کہا۔ " ہم کہاں کے شاعر اور اس میدان میں ہماری کہاں دال گلے گی " انھیں رخصت کرکے پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور آتے ہوئے کال بل کو ڈسکنکٹ کرنا نہیں بھولا۔ آئینہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ میری محنت منفرد مقام حاصل کرنے کے لئے کچھ اور وقت اور زحمت کی طالب ہے۔ اور میں نے بہتر سے بہتر کی جستجو میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ اور نیند کو شکست پہ شکست دیتا چلا گیا مگر نیند نے صبح کی اولین ساعتوں میں خنک ہوا کے جھونکوں کی سازش میں آکر مجھے دبوچ ہی لیا۔

رات بھر کی تھکن اور صبح کی میٹھی نیند کی وجہ سے کچھ زیادہ دیر ہی تک سوگئے اور نتیجتاً کچھ کھائے بغیر ہی عدالت کی راہ لی، لیکن کل ہند مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ لینا نہیں بھولے۔ گھر سے عدالت تک راہ میں دوست احباب ملتے گئے، ہاتھ میں دعوت نامہ دیکھ کر اُن کی مبارکبادیاں وصول کرتے گئے۔ مقدمات کو نپٹانے کے لئے تیز تیز قدموں سے عدالت پہنچے۔ بھوک کے باوجود ہمارا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ایک وکیل دوست نے طنزاً کہا " شائد آج شمیم صاحب کو کوئی خزانہ مل گیا ہے " میں انھیں کیسے سمجھاتا کہ کل ہند مشاعرے میں کسی شاعر کا پڑھنا اس کے لئے کسی خزانے کے ملنے سے کم نہیں۔ مشاعرے کا دعوت نامہ بار روم میں ایک میز پر رکھ چھوڑا تاکہ ہر ایک کی نظر اس پر پڑے۔ میرے ساتھی آتے دعوت نامہ دیکھتے اور مجھے مبارکباد دیتے۔ مسلسل مبارکبادیوں کی وجہ سے ایک پرتکلف لنچ آراستہ کرنا پڑا۔ ساتھیوں نے لنچ سے فارغ ہوکر مجھے نہ صرف مزید مبارکبادیوں سے نوازا بلکہ رات مشاعرے میں شرکت کا وعدہ بھی کیا۔

جب میں عدالت سے چار بجے نکلا تو چھتری سرکل کے " گل مرگ " کافی ہاؤس میں کچھ شناسا صورتیں نظر آئیں تو دل نے اکسایا کہ چلو انھیں بھی دعوت دیتے چلیں۔ ہمارے ہاتھ میں دعوت نامہ دیکھ کر سب نے ہمیں گھیر لیا اور مبارکبادیاں دیں۔ مبارکبادیاں وصول کرنے کے بعد ہم نے بھی اپنا فرض جانا کہ کافی کا بل ادا کردیں۔ کافی ہاؤس سے نکل کر مشاعرہ لوٹنے کے رموز جاننے کے لئے اپنے دوست قادری سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ (بعض دفعہ سامعین ہی کسی شاعر کو بے پناہ داد سے نواز کر بام عروج پر پہنچاتے ہیں تو کبھی ہوٹنگ

کرکے اس کو مشاعرے سے آؤٹ کردیتے ہیں۔) میرے محترم دوست قادری بھی اسی قسم کے ایک گروپ کے لیڈر ہیں۔ قادری صاحب کا مشورہ تھا کہ سامعین پر اپنا رنگ جمانے کے لئے بیاض دیکھے بغیر اپنا کلام سناؤ اور خوب لہک لہک کر پڑھوں اور اگر کسی کونے سے ہوٹنگ ہو تو دل برداشتہ ہونے کی بجائے مسکرا مسکرا کر جھک جھک کر سلام کروں۔ سامعین خود بخود شرمندہ ہو جائیں گے۔ قادری صاحب کی ان باتوں کو گرہ میں باندھ کر گھر کی طرف چل پڑا .... کاروان سرکل کے قریب حکیم صاحب کے مطب کے سامنے دو چار مقامی شعراء حکیم صاحب سے محو کلام تھے۔ میرے ہاتھ میں دعوت نامہ دیکھ کر ڈاکٹر وحید بہار نے ہانک لگائی۔ "ارے ... ! شمیم صاحب آپ کو بھی دعوت نامہ مل گیا۔ ؟" اس طنزیہ فقرہ پر غصہ تو آیا لیکن ہم نے مسکرا کر کہا ... " ہاں صاحب ! آپ لوگوں کی صحبت نے ہمیں بھی شاعر بنادیا اور اللہ نے چاہا تو استاد محترم کی نظر کرم سے ایک دن اس قافلے کی سرداری کا قرعۂ فال بھی ہمارے ہی نام نکلے گا" حکیم صاحب نے ازراہ شفقت فرمایا ... " اللہ وہ دن ضرور لائے گا ۔" ہم نے ان کی دعائیں لیں اور گھر کی طرف چل پڑے۔

گھر میں جوں ہی قدم رکھا تو دیکھا، دیوان خانہ، ورانڈہ اور اندرونی حصہ محلہ والوں اور عزیز و اقارب سے بھرا ہوا ہے۔ پہلے تو ہم گھبرائے کہ ماجرا کیا ہے .... لیکن ان کے چہروں پر بشاشت اور ہونٹوں پر تبسم رقصاں دیکھی تو دل کو کچھ سکون ملا۔ مجھے دیکھتے ہی سبھوں نے مسکرا مسکرا کر مبارکباد دینی شروع کی۔ اور میں غور کر رہا تھا کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ .... میں ابھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ اندر سے ہمارے سالے بہادر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "ارے واہ ... بھائی جان ... آپ کو آل انڈیا مشاعرہ پڑھنے کا دعوت نامہ ملا اور ہمیں خبر ہی نہیں دی۔" پاس پڑوس کی بہنوں نے کہا "بھابی صاحبہ نے بتلایا تو ہمیں معلوم ہوا کہ آج آپ آل انڈیا مشاعرہ پڑھنے جارہے ہیں .... ہم سب آپ کو مبارکبادی دینے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔" چند قریبی عزیزوں نے میرے بازو پر "امام ضامن" باندھتے ہوئے خیر سے لوٹنے کی دعائیں کرنے لگے جیسے میں کسی جنگی محاذ پر جارہا ہوں۔

پہلے ہی قدم پر اس پذیرائی کو دیکھ کر مجھے یقین ہوا جارہا تھا کہ آج کا یہ آل انڈیا مشاعرہ ہمارے ہاتھوں ہی لٹے گا اور کل اخبار میں آسمانِ شاعری کا درخشاں ستارے کے لقب سے نوازے جائیں گے۔ انہیں باتوں میں رات کے آٹھ بج گئے۔ میری رفیقِ حیات نے کھانے کے لئے کہا ... مگر کھانے کا کس کو ہوش تھا ؟ اور پھر تاخیر الگ ہورہی تھی۔ اس لئے مشاعرہ گاہ کی طرف چل پڑا۔

ایل۔ سی۔ بی بنک کا مشہور و معروف کشادہ ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا اپنی تنگ دامانی کا اظہار کررہا تھا۔ خوبصورت انداز میں اسٹیج کو سنوارا گیا تھا۔ اور اسٹیج پر مقامی و بیرونی شعرائے کرام تشریف فرما تھے ہم نے بھی مقامی شعراء کی صف میں اپنے لئے جگہ بنالی۔ مشاعرہ کا آغاز ہونے جارہا تھا۔ اور ہم بار بار اپنی تازہ غزل کے اشعار جو قادری صاحب کے مشورہ کے پیش نظر ازبر کرلئے گئے تھے، دل ہی دل میں دہرا

تھے اور ساتھ ہی سامعین کی صفِ اوّل میں بیٹھے چھوٹے صاحبزادے کو دیکھ رہے تھے جنہیں ہماری نصف بہتر نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ہماری بیاض دے کر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا تھا کہ جب ہم خدانخواستہ کوئی شعر بھول جائیں تو فوری یہ بیاض ہمارے ہاتھ میں تھما دے ۔۔۔۔! ہم اپنی نصف بہتر کے اس حسنِ انتظام پر اُن کی دور اندیشی کے قائل ہو گئے۔

مشاعرے کا آغاز ہو چکا تھا۔ مقامی شعراء کو دعوتِ سخن دی جا رہی تھی۔ اور ہال میں نعرۂ تحسین اور "واہ۔! واہ ۔۔۔۔! اور خوب و مکرر ارشاد" کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مگر میں ان ساری چیزوں سے بے نیاز اپنی غزل کے مصرعوں کو پابند ردیف و قافیہ کرنے میں لگا تھا۔ کبھی کبھار سامعین کی بے پناہ داد میں مصرعہ اپنی جگہ سے کھسکتا نظر آتا تو فوراً یہ دیکھ کر اطمینان کر لیتا کہ صاحبزادے اپنی جگہ پر ہیں یا نہیں' اور انہیں شعر فہمی میں غوطہ زن دیکھ کر اطمینان کی سانس لیتا۔ اتنے میں ڈاکٹر وحید نے میرے پہلو میں چٹکی لیتے ہوئے کہا۔ "شمیم صاحب آپ کا نام اناؤنس کیا جا رہا ہے"۔ کنوینر نے اعلان کیا۔ "لیجئے اب آپ ہمارے مقامی شاعر جناب شمیم صاحب کو جنھوں نے حال ہی میں میدانِ شاعری میں قدم رکھا ہے سماعت فرمائیے۔" اور میں دل تھامے مائیک کی طرف بڑھا۔ ہال میں دو ایک گوشوں سے نعرۂ تحسین بلند ہونے پر کچھ ہمت بندھی۔

میں نے سامعین سے کہا کہ آپ نے بارہا اس خاکسار کی ہمت بندھائی ہے، اور آپ کی اسی ہمت افزائی کے سہارے آج آل انڈیا مشاعرہ پڑھنے کے قابل ہوا ہوں"۔ ایک کونے سے آواز آئی۔ "جی ہاں! آج امتحان ہو ہی جائے گا"۔ میں نے کہا۔ "شعر سماعت فرمائیے"۔ ۔۔۔ ارشاد ۔۔۔۔ ارشاد ۔۔۔! سامعین ہمہ تن گوش تھے۔

بھوک، پیاس، افلاس، بیکاری، عریانی

ابھی شعر مکمل ہونے بھی نہ پایا تھا کہ سامعین نے دادِ تحسین سے سارا ہال سر پہ اٹھا لیا اور مکرر، مکرر کی تکرار شروع کر دی۔

سامعین کی بے پناہ داد سے مارے خوشی کے میرے ہاتھ پیر پھول گئے اور ذہن سے غزل کے دیگر شعر رفوچکر ہو گئے اور میں بھوک و پیاس کی تکرار ہی کرتا رہ گیا۔ صاحب زادے پر نظر پڑی تو وہ بھی سامعین کی داد سے خوشی میں پھولا نہیں سما رہے تھے اور اپنی امی کی نصیحت کو بھلا بیٹھے تھے۔ کسی منچلے نے آواز لگائی "شائد شاعر صاحب مشاعرہ پڑھنے کی خوشی میں صبح سے بھوکے ہیں، تب ہی بھوک و پیاس کی رٹ لگائے ہوئے ہیں"۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ میں صبح سے بھوکا ہوں۔ یہ یاد آنا ہی تھا کہ مجھے چکر سا محسوس ہوا اور میں لڑکھڑا گیا ۔۔۔۔ میرے اس لڑکھڑانے پر بھی ۔۔۔۔ کسی نے مکرر مکرر کی آواز لگائی ۔۔۔۔۔ سارا ہال گھومتا نظر آیا ۔۔۔۔!

پھر پتہ نہیں کیا ہوا ۔۔۔۔ مجھے بعد میں اپنی شریکِ غم سے معلوم ہوا کہ مجھے مشاعرہ گاہ سے سیدھا دواخانہ لے جایا گیا اور پھر گھر لاکر چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر نے سخت ہدایت دی ہے کہ میں آرام کروں اور محفلوں سے احتراز کروں

••

دمے کے خط (مراسلے)

گیان سنگھ شاطر
حیدرآباد

مجتبیٰ نمبریا!

شرمیندر، شرمیندر سنو، میری بات تو سنو!
کیا ہوا؟ چلّا کیوں رہے ہو؟
وہ جو مجتبیٰ حسین ہے نا؟
کیا ہوا اُسے؟
"مجھے بات تو پوری کرنے دو، بیچ میں بولتے جاؤگی تو کیسے بتاؤں گا!
مجتبیٰ نمبریا ہوگیا ہے۔"
"ہے، ہے، کیا بک رہے ہو؟ وہ تو شریف آدمی تھا، فیملی مین تھا بے چارہ!
کیا کیا اُس نے؟ جو اُسے نمبریا ہونا پڑا۔"
"تم پھر ٹوک رہی ہو، بھئی یہ وہ نمبریا نہیں، جو تم سمجھ رہی ہو۔ نمبریے سے میرا مطلب . . . . ."
"خدا بچائے تم لکھاریوں سے! ہمیشہ لفظوں کی جان کے درپے رہتے ہو، اور اُن کے نئے نئے معنی نکالتے رہتے ہو، خواہ کسی کی سمجھ میں آئے نہ آئے۔ بڑے آئے! زندگی میں تم ایک لفظ نہ بنا سکے لیکن جو لفظ کوئی بھلا مانس بنا گیا ہے، اُسے توڑ مروڑ کر اُس کی عاقبت خراب کرتے رہتے ہو۔ ہاں! تو تم نے نمبریے کا کونسا نیا مطلب نکالا ہے، جو غالب نہ نکال سکے؟"
"میں . . . ."
"ذرا ٹھہرو جی! اب تم بار بار ٹوک رہے ہو۔ میں تو کہتی ہوں تو تمہارا پارہ چار مینار پر چڑھ جاتا ہے۔"
"یہ تم . . . ."
"اُسے چار مینار پر ہی کیا ہے! وہ بھی اس لیے کہ حیدرآباد آئے پچیس برس ہوگئے اور تم اتنا نہ کرسکے کہ چار مینار ہی دکھلاتے! میں اُس کا نام لے کر دل بہلاتی ہوں تو بھی تمہیں بُرا لگتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں، جب سے تم ڈاروِن پڑھنے لگے ہو اور یہ جان گئے ہو کہ ہمارے پُرکھے چار پائے تھے، تمہیں لفظ چار سے چڑ ہوگئی ہے۔ ورنہ دلی میں تھے تو مجھے قطب مینار میری مرضی کے خلاف دکھلائے تھے، حالانکہ وہ کشمیری گیٹ سے بیس کوس دُور ہے اور چار مینار صرف چار کوس۔ ہمارے پُرکھے چار پائے تھے کہ نہیں، میں ایک بات بالکل ٹھیک جان گئی ہوں کہ لفظ چار نوعِ آدم کا چار دِنا چار جزو ہے۔ دیکھو نا، لوگ اُسے عقل مند سمجھتے ہیں، جو چار آدمیوں میں بیٹھ کر بات کرسکے۔ گھر کا معاملہ ہو کہ باہر کا، سچ بولنا ہو تو ڈرنا کیسا! جب سے تم چار پیسے کمانے لگے ہو، میرے ماں باپ کو خاطر میں نہیں رکھتے ہو، حالانکہ تمہاری قسمت کو چار چاند انہیں کی سفارش سے لگے ہیں۔ ان سے مراسلت نہ کرو ٹھیک ہے، اُن پر چار حرف تو مت بھیجو۔ تمہاری زبان چار ہاتھ کی ہے، ایک ایک جگہ چار چار جُڑ کے لگے ہیں میرے چار کھونٹ رشتے داروں کی بھرمار ہے، نہ کہیں جاتے ہو، نہ مجھے جانے دیتے ہو۔ گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلتے، جب دیکھو چارپائی پر پڑے رہتے ہو۔ سبزی لاؤں میں، آٹا پساؤں میں، بچوں کو اسکول پہنچاؤں میں، پڑوسی سے جھگڑے نپٹاؤں میں، مجھے گوڈے گوڈے مصروف دیکھ کر تمہارا لہو چار چلو بڑھتا ہے، اسی لیے سیب کی طرح لال ہوا اور میں غم سے پیلی تانبہ ہو رہی ہوں۔ جب سے بیاہی آئی ہوں، کیا مجال

چار پہر آرام کیا ہو، یا میری بیماری کے دوران تمہیں چارہ سازی کی فرصت ملی ہو۔ لے دے کے ایک ہی گن ہے تم میں۔ چار یاروں میں بیٹھ کر بے سُری غزل سُناؤ اور اُسے چار تال سمجھو۔ کبھی اتنی نہیں سُوجھی کہ پنساری سے چار مغز لاکر طاقت کی دوا بنادو، یا چار عناصر کی صحت یابی کے لیے کشمیر لے چلو۔ پنجاب سے کشمیری چار قدم پہ تھا، تم وہاں سے کشمیر نہ لے جاسکے، یہاں سے کیا اُمید کرسکتی ہوں۔ قربان جاؤں! ایسے عالم کے، بے تکی باتوں میں چاروں ورتوں کی خبر ہے، خبر نہیں تو اپنے گھر کی۔"

"تم چار مینار . . . "

"ہاں! میں جانتی ہوں، مجھے چار مینار کے بجائے آسمان کہنا چاہیئے تھا۔ تُم زبان دان جو ٹھہرے اور میں تمہاری بیوی، میری کوتاہی کیسے برداشت کرسکتے ہو۔ اچھا جناب! زبان کی غلطی معاف ہو، اب تو خوش ہو۔ ایک بات بتاؤ، کیا یہ سچ ہے کہ غالب ہر لفظ کے نئے معنی نکالتے تھے اور لوگوں کے قہر و عتاب کا شکار ہوتے تھے۔ تم کہتے تھے کہ قاطع برہان اُن کی دانشوری پر سب سے بڑی تہمت تھی۔ میری مانو! مجھے معلوم ہے تم مانو گے نہیں، میری بلا سے، میں بھی کہنے کی غرض سے کہہ رہی ہوں، تمہیں اپنا اچھا بُرا آپ سمجھنا چاہیئے، تم لفظوں کے معنی وہی نکالا کرو، جو پہ چلت ہیں، میرا مطلب عام ہیں، ورنہ ذلیل و خوار ہو گے۔"

"بس . . . . "

"اُرے یہ بدبو کیسی! لگتا ہے، دال جل گئی۔ دیکھا؟ تمہاری بات جائے بھاڑ میں، اب روٹی میرے کلیجے سے کھاؤ گے۔"

ہاں تو میاں مصطفیٰ کمال! تم نے مجتبیٰ حسین نمبر نکال کر کمال کیا ہے کہ کچھ اور! اس کا فیصلہ تو اہلِ علم و فن ہی کرسکتے ہیں، لیکن اس نمبر نے میرے گھر میں بکھیڑا ڈال دیا اور گویہ سے میرا دوگنا نقصان کیا۔ وہ یوں! جس دن میں وہ نمبر خرید کر لایا، اُس دن کھانا ہوٹل میں کھایا۔ وہ ابتداء تھی، انتہا کیا ہوگی؟ کہیں وہی نہ ہو، جو اکبر صاحب فرما گئے ہیں۔

کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جاکر

رہا مجتبیٰ حسین! میں اُسے اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ خود کو نہیں پہچانتا تھا۔ تم پوچھو گے، وہ کیسے! آدمی خود کو نہ پہچانے!! یہی تو المیہ ہے، اور اس المیے میں وہ اکیلا نہیں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ہیں۔ چھوڑیے! مجھے کیا لینا ہے کسی سے، مجھے تو اپنے پیارے مجتبیٰ حسین سے مطلب ہے۔ کمال صاحب! اپنے پیارے، میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ وہ واقعی میرا پیارا ہے اور میری پہلی ملاقات کا حاصل۔ میں حیدرآباد دیا نیا آیا تھا اور نئے احباب کی تلاش میں تھا۔ کسی نے رائے دی، 'اورینٹ' جاؤ، وہاں تیرے جیسوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ اور ایک شام میں اورینٹ چلا ہی گیا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، مجھے اپنے جیسا کوئی نظر نہ آیا۔ میں واپس پلٹنے ہی والا تھا کہ میں نے سوچا اتنی دور آیا ہوں، کیوں نہ ایک کپ چائے پی کر تازہ دم ہوتا چلوں۔ تمام ٹیبل کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، صرف ایک ٹیبل پر جگہ تھی، جہاں اتفاق سے ایک ہی آدمی چائے پی رہا تھا۔ میں روس سے چند دن پہلے آیا تھا، اس لیے وہاں کی تہذیب کا اثر مٹا نہ تھا۔ کرسی پر بیٹھنے سے پہلے، میں نے اُس آدمی سے جھک کر عرض کیا "کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی سعادت حاصل کرسکتا ہوں؟"

"ہاں ہاں، ضرور ضرور۔"

اُس دُبلے پتلے، سانولے سلونے آدمی نے تقریباً اُچھلا کر میری گذارش قبول کی اور اپنی کرسی بھی پیچھے سرکا دی، حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ یہی نہیں، اس نے غیر متوقع طور پر میرے لیے چائے کا آرڈر بھی دے دیا اور

اپنا ہاتھ آگے مصافحے کے لیے بڑھایا۔ باتوں باتوں میں مجھ پر یہ راز کھلا کہ مجتبیٰ حسین باہر سے میرے جیسا نہ سہی، اندر سے میرے جیسا ہی تھا۔

اتوار کا دن تھا، شام ہوئی، شام ڈھلی، رات ہوئی اور رات گہری ہونے لگی۔ میں اور مجتبیٰ باتیں کرتے رہے، جیسے ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے رہے اور چائے کے دور چلتے رہے۔ اس دوران کئی احباب ہمارے ساتھ آکر بیٹھے اور اٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے بھیڑ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ میں اور بیٹھنا پسند کرتا اگر مجتبیٰ بیرے کو بل لانے کو نہ کہتا۔ بیرا بل لایا، جسے میں نے کچھ اتنی جلدی ادا کیا کہ مجتبیٰ دیکھتا رہ گیا۔ جب تک بیرا واپس آیا ہم دونوں بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

"تم حیدرآباد کے مہمان ہو، میرے مہمان ہو، تم نے بل کیوں دیا؟"

"بس یوں ہی، میرا دل کیا۔"

"میرا دل بھلے مانے! میری تہذیب اسے گوارا نہیں کرتی۔"

"پیارے مجتبیٰ! تمہارا بل ادا کر کے میں نے تمہاری اور اپنی تہذیب کو نئے معنی دیئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"میں نے تمہارا قرض چکایا ہے۔"

"کون سا قرض؟"

"کبھی پھر بتاؤں گا۔"

اُس وقت جو بات ادھوری رہ گئی تھی، میں اُسے پوری کر رہا ہوں۔

کمال صاحب! تمام زمانہ اہلِ علم و فن کا قرض دار ہے۔ وہ اس قرض کو کہاں کہاں، کیسے کیسے چکا رہا ہے، اُسے خبر نہیں۔ اور میں اکیلا ہی اُن کا قرض دار نہیں ہوں، میری آنے والی نسلیں بھی اُن کی مقروض ہیں۔ غالب کی طرح مجھے ہزاروں خواہشیں نہیں، ایک ہی خواہش

ہے، لیکن ہے عجیب دلفریب!

کاش کوئی میرا بھی مقروض ہوتا!

چال کی کھال (تبصرہ)

بیربل کی شوخیاں

ثریا جبین

ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۰ قیمت: ۶ روپے

ترقی اردو بیورو نے بے حساب علمی کتابیں شائع کی ہیں۔ طالب علموں کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ اور نصابی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ درسی، نصابی اور علمی کتابوں کے ساتھ عوام کی پسند کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ ایسی کتابیں بھی شائع ہونی چاہیں جو خاص و عام میں مقبول ہوسکتی ہیں۔ کلاسیکی ناولوں کے ترجموں کے علاوہ ہلکے پھلکے موضوعات اور طنز و مزاح پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ علمی کتابیں وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن عوام کے پسندیدہ موضوعات پر کتابیں شائع کرنے سے کتابوں کی سیل کی آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اور بیورو کا عوام سے رابطہ بھی قائم ہوسکتا ہے۔ "بیربل کی شوخیاں" ۶۲ صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عام پسند کو ملحوظ رکھا جائے تو اردو کتابوں کی پیشانی سے یہ داغ دھویا جاسکتا ہے کہ ان کتابوں کا کبھی دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوتا۔

بچوں کے لیے مرتب کی گئی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں بیربل کی زندگی کے مختصر حالات فراہم کئے گئے ہیں۔ بیربل کے نام سے تو ہر چھوٹا بڑا واقف ہے لیکن زندگی کے حالات کا بہت کم کسی کو اندازہ ہوگا۔ اکبر کے دربار سے وابستگی اور بیربل کی جرأت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا اور بیربل کی شوخی اور برجستگی کے متعلق واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ زبان سادہ اور دلنشین استعمال ہوئی ہے۔ کتاب صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے معیاری ہے۔ قیمت نہایت واجبی ———— (مدیر)

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا
ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۱
شمارہ ۴
اپریل ۱۹۸۸ء

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

قیمت فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے
عرب ممالک سے: ایک سو پچاس روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ: ۲۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون آفس 557716 مکان 551064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

اُڑیں گے پُرزے (خاکہ)

دخل در نامعقولات (افسانہ و ڈرامہ)

چوُرن (منظومات)

رضا نقوی واہی
پٹنہ۔

سومالیہ میں دِلاور فگار کا استقبالیہ

[محبّی! خوش رہیئے۔ کل مارچ کا "شگوفہ" ملا۔ دلاور فگار کی نظم دلچسپ ہے پڑھ کر طبیعت محظوظ ہوگئی تو اُسی زمین میں ایک "تازہ نظم" تولّد ہوگئی۔ امید ہے اربابِ شگوفہ ہر طرح خوش اور اچھے ہوں گے۔
واہی]

سخت عبرت ناک تھا شاعر کا استقبالیہ
خرچ سے اپنے جنھیں جانا پڑا سومالیہ

منتظم حضرات، اس میں شک نہیں خوش ذوق تھے
پر مہاجر کی طرح تھے سب کے سب دیوالیہ

یوں تو اُن کی انجمن کا نام تھا خاصا بڑا
پر خسارے میں رہا کرتا تھا اُس کا مالیہ

شعر پڑھنے کی ہوس شاعر کو تھی کچھ اس قدر
چل دیئے گھر سے لیے صرف ایک پیکٹ چھالیہ

ایک جھولے میں رکھا لُنگی پیجامہ اور قمیض
چند مطبوعہ کتابیں، کچھ کلامِ حالیہ

وقت پہ بزمِ سخن میں سامعین آتے گئے
صدر کی کُرسی پہ بیٹھے اِکس بج اُلو آلیہ

حضرتِ شاعر کے فن پہ خوب تقریریں ہوئیں
ایک صاحب نے سنائی نظمِ استقبالیہ

میہماں شاعر اُٹھے پڑھنے کو اس انداز سے
"سانس میں عنبر، غزل میں مشک، منہ میں غالیہ"

رات بھر ہر رنگ میں پڑھتے رہے اپنا کلام
"میریہ، سوداشیہ، اِنشائیہ، اقبالیہ"

چائے کے بدلے اُنھیں تربوز کا پانی ملا
پان کی خواہش ہوئی تو کھا لیا کچھ چھالیہ

بھوک سے بیتاب تھے لیکن وہ کرتے بھی تو کیا
خود ہی بھوکے تھے وہاں جب اہلِ استقبالیہ

داد لوٹی خوب، علّامہ کا بھی پایا خطاب
بزم میں پھُولا پھَلا اتنا کلامِ عالیہ

وقتِ رخصت سخت مایوسی ہوئی اُن کو مگر
نقدہ کی شکل میں پایا نہ جب کچھ مالیہ

فکر یہ تھی ہاتھ خالی گھر کو جب لوٹیں گے وہ
کس طرح آنگن میں ہوگا ان کا استقبالیہ

بس پہنچتے ہی چھڑے گی گھر کے اندر سرد جنگ
سخت برہم ہو کے بولیں گی یہ بیگم عالیہ

میرے زیور رکھ کے بندھک، قرض بنئے سے لیا
اور ہوا کے دوش پہ اُڑ کر گئے سومالیہ

شاعری کا شوق تھا، وہ شوق تو پورا ہوا
میرے زیور کیسے واپس آئیں گے کہنا لیہ

★

ممتاز شاعر رشید عبدالسمیع جلیل

کا طنزیہ و مزاحیہ

نظموں ، غزلوں ، قطعات اور خاکوں پر مشتمل ایک دل چسپ و معیاری مجموعہ

نمی دانم

اہتمام کے ساتھ

شائع ہوچکا ہے

(ناشر : زندہ دلان حیدرآباد)

"نمی دانم طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ادھر شائع ہونے والے مجموعوں میں ایک عالی معیار اور خوبصورت اضافہ ہے"

—— پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

"... اس آئینے میں اپنے ملک ، اپنے معاشرے ، اپنی اردگرد کی زندگی کی جیتی جاگتی مضحک تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں"

—— رضا نقوی واہی

سرورق : سعادت علی خاں ، صفحات : ۱۴۴

قیمت : بیس روپے

طنز و مزاح کے شائقین کے لیے ایک قیمتی تحفہ بتوسط شگوفہ حاصل کیجیے۔

وجاہت علی سندیلوی

اگر ہم کبھی بوڑھے نہ ہوتے؟

اگر ہم کبھی بوڑھے نہ ہوتے تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ جوان رہتے اور جب بھی ہمارا انتقال پُر ملال ہوتا ہمارے متعلقین بہت حسرت و یاس سے کچھ اس قسم کے مصرے اور شعر پڑھتے ؎

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

؎ پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے ؛ حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

اور ہمارے احباب فلک کج رفتار سے فریاد کرتے۔ ؎

ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف ؛ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

کسی انسان کو بوڑھا کرنے کے سلسلے میں سب سے زیادہ گھپلا اعداد و شمار کرتے ہیں۔ انسان ہنس رہا ہے، بول رہا ہے، شاعری کر رہا ہے، عشق فرما رہا ہے، بوڑھوں پر پھبتیاں کس رہا ہے، زندگی کو منہ چڑا رہا ہے لیکن یہ کچھ نہیں۔ عمر کا نان اسٹاپ سپرفاسٹ میل جہاں پچاس کے سنگ میل سے آگے بڑھا فوراً گھنٹی بج جاتی ہے کہ وہ بوڑھا ہو گیا اور آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ اور ہر چہار جانب سے یہ غلغلہ بلند ہونے لگتا ہے ؎

اے عندلیب چپ کہ چلے دن بہار کے۔

اب آپ لاکھ حضرت جوش ملیح آبادی کو پکاریں اور گڑگڑا کر کچھ اس قسم کی دعائیں مانگیں ؎

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یا رب ؛ سو بار جہنم میں جلانا یا رب

معشوق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ ؛ ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یا رب

آپ کی سب دعائیں میعاد باہر سمجھی جاتی ہیں اور بڑھاپے کی تعریف میں شامل کر لی جاتی ہیں۔

اکثر عمر کے متعلق اس گنتی کے کھیلے میں گھپلا در گھپلا بھی ہو جاتا ہے۔ کچھ بیچارے ابھی جوانی ہی کی منزل میں ہوتے ہیں لیکن اُن کے حلیے اور شکستہ چال ڈھال کو دیکھ کر لوگ قبل از وقت یہ ہوائی اڑا دیتے ہیں کہ وہ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ نہیں معلوم لوگوں کو جتنا خود جوان بننے کا شوق ہے اس سے زیادہ دوسروں کو بوڑھا بنانے کا کیوں اشتیاق رہتا ہے۔ بلکہ آج کل کی ماڈرن خواتین جتنا جھل اپنی عمر کے ساتھ کرتی ہیں اتنی ہی

یا اُن کی عمر یا پڑھاپے کی دوروں کے سلسلے میں کرکے ایک ڈھکوسلا برابر کر دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ ایک تجربہ کی بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ جو بھی از قسم صنفِ نازک اپنی صحیح عمر بتا دے اُس پر کبھی بھروسا نہ کیجیے وہ کوئی بھی راز ہو محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

ایک روز ہم حسبِ معمول سویرے ٹہلنے جا رہے تھے۔ راستے میں للت موہن کا گھر پڑا تو اس کی پیٹھ پر گرانے کو ہم نے جھوٹ موٹ اسے آواز دی۔ اتوار کا دن تھا لہٰذا وہ سچ مچ ہمارے ساتھ ہو لیا بلکہ یوں کہیے کہ پیچھے پڑ گیا۔ ہم لوگ نہر کے پل پر پہنچے تو دیکھا کہ دوسری طرف سے ایک باریش شخصیت جو گوشیہ ٹوپی اور سفید براق کرتا پائجامہ پہنے بڑے باوقار انداز سے آ رہی ہے۔ للت موہن نے کہا آئیے آپ کو ایک فرشتہ خصلت ہستی سے ملوا دوں ہم نے ٹالنا چاہا "اجی ہٹاؤ، ابھی ہمیں فرشتوں سے ملنے کی فرصت نہیں" لیکن بھلا للت موہن کب ماننے والا تھا۔ اس نے ہمارا اور مولانا صاحب کا نہ صرف تعارف کرا دیا بلکہ یہ فقرہ بھی جڑ دیا "آپ ہی کی طرح ہمارے مولانا بھی پہلے کلین شیو تھے اور پان بہت کھاتے تھے لیکن جس دن سے انھوں نے داڑھی چھوڑی پان بھی چھوڑ دیا۔" ہم نادم ہوئے کہ ابھی تک ہم اپنے گناہوں ہی سے چھٹکارا نہیں حاصل کر پائے اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو توبہ کرنے سے بھی چھٹی پا چکے ہیں۔ مولانا کی داڑھی میں اگرچہ کالے بال سفید بالوں سے کہیں زیادہ تھے لیکن ان چند عجوبوں نے ہمیں اس شک میں مبتلا کر دیا کہ کہیں کالوں کی اکثریت میں خضاب کی تو کارفرمائی نہیں۔ اور پھر ہمیں اپنی نگاہ پر بھی بھروسہ نہیں تھا کیوں کہ عینک گھر ہی میں چھوٹ گئی تھی لہٰذا ہم خود مولانا کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا پائے۔ ادب شیوہ کا فائدہ انھیں کو دیتے ہوئے ان کو "آپ" اور "جناب" سے مخاطب کرنے لگے۔

ملاقات کی برف کچھ اور پگھلی تو مولانا نے اپنا مزید تعارف یہ کرایا "میں آپ کے بڑے لڑکے کا کلاس فیلو تھا" ہم نے انھیں یہ کہتے ہوئے گلے لگا لیا "میاں تم نے للت موہن کی پیدا کی ہوئی ایک بڑی غلط فہمی دور کر دی۔ میں ابھی تک تمہیں اپنے والد ماجد کا کلاس فیلو سمجھ رہا تھا۔"

پیرانِ سالی بھر بہروپیوں کو چھوڑ دیجیے جو اپنا حلیہ بگاڑ کر دو دل کا گلا گھونٹ کر اور زبردستی بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر یا جو خضاب، مصنوعی بالوں، مصنوعی دانتوں کی مدد سے اور سب سے زیادہ بڈھی گھوڑی لال لگام قسم کی حرکتیں کر کے عمر کے دو حصوں کی ارضِ فاصل (NO MAN'S LAND) میں جوانی اور بڑھاپے کی ناجائز درآمد اور برآمد کا دھندا کیا کرتے ہیں۔ یہ واقعی ایک بڑا فکر انگیز سوال ہے کہ اگر انسان بڑھا نہ ہو تو کیا ہو؟ ہم نے یہ سوال اپنے دوست قدرت اللہ سے کیا تو وہ حد سے زیادہ خفا ہو کر بولے "اور اگر دنیا میں شیطان نہ ہو تو کیا ہو؟" ہم اپنی سادہ لوحی سے پوچھ بیٹھے "کیا آپ بڑھاپے کو شیطان سمجھتے ہیں؟" تو وہ اور آپے سے باہر ہو گئے اور ہم کو ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھا کہ ہمیں تو کچھ ایسا لگا کہ جون کی دوپہر میں ہم غسل آفتابی کر رہے ہیں اور ہم نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ اُن کا جواب سنے بغیر ان کے سامنے سے اوجھل ہو جائیں۔

جب انسان کے جسم سے الگ کار رفتہ دل، گردے، پھیپھڑے، آنکھیں اور دیگر اعضاء بدل کر نئے لگائے جا سکتے ہیں اور یہاں تک دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اب دماغ تک تبدیل کر دینے کے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں یعنی ہمارے آئن سٹائن اور برٹرینڈ رسل کے دماغ ہمارے جیسے نتھو، بدھو، خیرو کے دماغوں کے بجائے ہم میں فٹ کیے جا سکیں گے تو یہ بات بالکل قرین امکان ہو جاتی ہے کہ ہمارے جسم کے ان اجزائے ترکیبی یا

غرض یہ کہ ہے بڑھاپا آتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے اور اس کے بجائے [illegible]
میں ایسا آبِ حیات گھول دیا جائے کہ ہم پر سدابہار جوانی چھائی رہے اور ہم اس قسم کے مالیسی کن اشعار
کبھی نہ کہیں۔ ے

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا ؛ جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں ؛ وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

ہم مذاق سمجھ رہے تھے لیکن جب خلاف معمول ہم نے سنجیدگی سے غور کیا تو ہمیں لگے پاکسی بھی انسان
کے کبھی بوڑھے نہ ہونے کے امکانات بڑے پیچیدہ اور خطرناک نظر آئے۔ ہر معاشقہ یا تنازعہ کسی فریق
کے میدان سے ہٹ جانے کے باعث نہیں بلکہ اس کے صرف قتل ہوجانے یا خودکشی کر لینے ہی پر ختم ہو۔ پرانے
ملازمین، ڈاکٹر، وکیل، فلم اسٹار، شاعر، ادیب وغیرہ بڑھاپے کی وجہ سے کبھی اپنی جگہیں نہ چھوڑیں اور ان سے
پیچھے دوسری صف والے نوجوانوں کے لیے خودکشی کر لینے یا پھر قاتل بن جانے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ رہے۔
غیر فطری موتوں کی بہتات سے وکیلوں کی پانچوں اُنگلیاں گھی میں اور مریضوں کی سدابہار جوانی سے بے چارے
ڈاکٹروں کے سر کڑھائی میں چلے جائیں۔ میاں بیوی کے رشتے زیادہ استوار ہوجائیں اور اس سلسلے میں اگر چھپے
چھپے کی وارداتیں کم نہ بھی ہوں تو ایرا غیری کی حماقتوں میں ضرور تخفیف ہوجائے۔ باپ بیٹوں اور ماں بیٹیوں میں
رقابت کے حادثات بہت عام ہوجائیں بوڑھوں کی توقیر اور تعظیم ختم ہوجائے۔ اور ہمارے موجودہ نظام
نظام میں ایک زلزلہ پڑ جائے۔ البتہ سیاست کی بساط پر اس سے کوئی اثر نہ پڑے کیوں کہ آج بھی کوئی سیاسی
نیتا محض بڑھاپے سے نڈھال ہوکر ہرگز میدان نہیں چھوڑتا ہے۔
مقویات کے بجائے لاغریات، دانت گرانے والے منجن، بال سفید کرنے والے خضاب آنکھوں کی بینائی
کم کرنے والے ممیرے اور گالوں میں جھرّیاں ڈالنے والی کریموں وغیرہ کی خرید و فروخت بہت بڑھ جائیگی۔
اگر آپ کہیں گے کہ وہ تو آج بھی بہت بڑی ہوئی ہے تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔

○○

آج کا نیتا

پاگل عادل آبادی

(سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر اس نظم کو کل ہند مقابلوں میں انعام دوم کا مستحق قرار دیا گیا) ۰

اِس دیش کا ہر نیتا ایسا نظر آتا ہے
پینیدی کے بنا جیسے لوٹا نظر آتا ہے

آتا ہے الیکشن تو محلّوں سے نِکلتا ہے
پد یاترا کرتے کو گلیوں میں ٹہلتا ہے
کرتا ہے نمستے بھی آداب بھی اور وِش بھی
گرگٹ کی طرح پَل پَل رنگ اپنا بدلتا ہے
اپنے سے بڑے کا یہ چمچہ نظر آتا ہے

اسٹیج پہ کرتا ہے جذباتی اداکاری
بھاشن سے ٹپکتی ہے عیّاری و مکّاری
چیلا ہے یہ گاندھی کا ظاہر میں مگر باطن
گاندھی کے اُصولوں سے کرتا ہے یہ غدّاری
کھدّر کے لباسوں میں ننگا نظر آتا ہے

ہے باس یہ غنڈوں کا چوروں کا یہ افسر ہے
کل تک تو یہ پیدل تھا اب صاحبِ موٹر ہے
کیونکر نہ پولیس کانپے اوپر سے پہنچ اس کی
جیبوں میں گورنر ہے مٹھّی میں منسٹر ہے
ہر لُوٹ میں اس کا بھی حصّہ نظر آتا ہے

لائسنس کے پرمِٹ کے دھندوں پہ یہ پلتا ہے
مرنے ہی نہیں ثابت بکرے بھی نِگلتا ہے
تھا صبح کو اِس دَل میں ہے شام کو اُس دَل میں
تھالی کا یہ بیگن ہے ہر سمت لڑھکتا ہے
دَل اپنا بدلنے میں یکتا نظر آتا ہے

کرسی کا یہ بھوکا ہے پیاسا ہے یہ ووٹوں کا
ڈھونگی ہے فریبی ہے ایجنٹ ہے چوروں کا
یہ ووٹ تو لیتا ہے ننگوں سے غریبوں سے
پر کام بناتا ہے دس نمبری لوگوں کا
ہر بنک میں اب اس کا کھاتہ نظر آتا ہے

مَندر کے، مساجد کے بھجنوں کے اذانوں کے
جھگڑے یہ لگاتا ہے مذہب کے زبانوں کے
میرٹھ میں بھیونڈی میں، دلّی میں بنارس میں
گھر اُس نے اُجاڑے ہیں غیروں کے بیگانوں کے
ابلیس کا یہ مجھ کو چیلا نظر آتا ہے

گفتار کا غازی ہے کردار کا ہے پاجی
اک ہاتھ میں کعبہ ہے اک ہاتھ میں ہے کاشی
سچ پوچھو تو اے پاگل جو آج کا نیتا ہے
ظاہر میں ہے سنیاسی باطن میں مہا پاپی
پی پی کے لہو خوں کا تھیلا نظر آتا ہے

شیخ سلیم احمد

غالب شناس مالک رام[1]

ذکرِ غالب' مالک رام کی غالب شناسی کی شہرت کا نقطہ آغاز ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ میں چھپی تھی۔ میں نے اسے زمانۂ طالب علمی میں پڑھا تھا تو یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ ہرگوپال تفتہ، خوب چند ذکا یا میر مہدی مجروح کی طرح مالک رام بھی مرزا غالب کے ہم عصر ہیں اور انھوں نے غالب کی زندگی کے چشم دید حالات لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر غالب کی زندگی اور ان کے عہد کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ ایک عرصہ کے بعد دلی آیا۔ مالک رام کو کسی جلسہ کی صدارت کرتے دیکھا تو حیرانی ہوئی اور خوشی بھی کہ مرزا غالب کے ایک ہم عصر سے میری بھی ملاقات ہو گئی۔ اس وقت سوچا تھا کہ مالک رام محقق ہیں مشاہیر کی پیدائش و عمروں کا حساب کتاب درست کرتے رہتے ہیں اپنی عمر کے اعداد و شمار میں دو چار دہے کا اضافہ کر لیا ہوگا۔ یہ دہے آج تک ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ عقدہ بھی بعد میں کھلا کہ جب جب ان کو صدارت کا فریضہ انجام دیتے وقت پہلی بار دیکھا تھا تو وہ محض کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ صدارت ان کے فرائضِ منصبی میں سے ہے۔

مرزا غالب کی طرح مالک رام بھی اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ بن گئے ہیں۔ وہ مشہور و معروف محقق۔ دانشور و مفکر ہیں۔ علم کی چاروں کھونٹ گھوم آئے ہیں۔ ان کھونٹوں کی بھی سیر کر آئے ہیں۔ جو ممنوعہ ہیں۔ وہ غالبیات سے لے کر مولانا آزاد تک تلاش و تحقیق کی کتنی منزلوں سے گذرے ہیں۔ انھوں نے اسلام کا بھی مطالعہ کیا اور اسلام میں عورت کے مرتبہ کا بھی [وہ عورت کے مرتبہ سے متاثر ہیں]

یہ باتیں درست، لیکن مالک رام کی اصل شہرت مرزا غالب کی مرہونِ منت ہے۔ اوائل عمری میں انہوں نے غالب کا دامن تھاما تھا اور آج تک اس سے لپٹے ہوئے ہیں۔ دونوں میں ایسی گہری دوستی قائم ہوئی کہ دونوں من تو شدی تو من شدم کے مصداق بن گئے۔ اب دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل۔ مرزا غالب' مرزا رام اور مالک رام' غالب رام نظر آنے لگے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست ؛ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

[1] نئی دہلی میں جشن مالک رام کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا۔

دوستی کا دم بھرنے کے لیے اپنی وضع قطع بھی غالب جیسی بنانی شروع کردی اور مرزا کی پیروی میں کلاہ پاپاخ پہننے لگے۔ شاید اسی لیے شمس الرحمن فاروقی نے مالک رام کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ لکھا ہے: "وہ ایسے محقق ہیں جو اپنے موضوع کو اس طرح زندہ کر دیتا ہے کہ آپ محقق کی تحریر پڑھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود اس شخص سے مل لیے جو اس کی تحقیق کا موضوع ہے۔"

مرزا غالب نے اپنے سفرِ کلکتہ کے دوران قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی تھی اور کہا تھا کہ قتیل کون۔ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ! میں کیوں اس فرومایہ کو منہ لگانے لگا۔ مرزا غالب کو کیا معلوم تھا [معلوم ہوتا تو ناک بھوں نہ چڑھاتے] کہ ایک دن اسی قتیل کی برادری سے تعلق رکھنے والا پنجاب کے علاقہ پھالیہ کا باشندہ کھتری بچہ مالک رام لوبھایا اس کے نام کو چار چاند لگائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ غالب کا سہارا لے کر اس کھتری بچہ نے اپنے نام میں کہیں زیادہ چاند ستارے ٹانک لیے ہیں۔

دراصل فن تحقیق کے ماہرین کے لیے چند باتیں تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً یہ کہ مالک رام نے اپنی تحقیق کا وشوں کے لیے غالب ہی کو کیوں چنا؟ اس کے پیچھے کوئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ انسان کو اپنی پیدائش پر اختیار نہیں لیکن مالک رام کو اپنی پیدائش پر بھی اختیار تھا۔ تبھی تو وہ سوچ سمجھ کر دسمبر میں پیدا ہوئے چونکہ مرزا غالب دسمبر میں پیدا ہو چکے تھے۔ [عالم ارواح میں غالب کے ساتھ ساز باز کی مثال] اس سازش میں مالک رام کے ساتھ شاید قدرت بھی شریک نظر آتی ہے۔ غالب کے آباو اجداد کا پیشہ سو پشتوں سے سپہ گری رہا۔ ان کے خاندان میں علمی و ادبی روایت نہیں ملتی۔ مرزا غالب اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جس نے قلم سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اسی طرح مالک رام کے اجداد صدیوں سے کھیتی باڑی سے اپنی روٹی روزی پیدا کرتے رہے۔ ان کے خاندان میں خود مالک رام سے علمی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔

دونوں کے مذہبی عقائد مشتبہ لیکن دونوں مذہب انسانیت کے کٹر پیروکار، مالک رام اپنی وضع قطع اور رہن سہن میں متقی پرہیزگار مسلمان نظر آتے ہیں۔ اسلام کی حقانیت کی تلاش میں قادیان تک ہو آئے۔ ہندو مذہب سے ان کا کیا رشتہ ہے یہ موضوع تحقیق طلب ہے۔ مرزا غالب جب انگریز افسر کے سامنے پیش ہوئے تھے تو انگریز افسر نے جب ان کے مذہب کے بارے میں دریافت کیا تو مرزا نے جواب دیا تھا کہ آدھا مسلمان ہوں کیوں کہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ مرنے کے بعد اہل تشیع مرزا کی تجہیز و تکفین شیعہ طریقہ پر کرنا چاہتے تھے۔ ایک سرپھرے نے تو انھیں نزی مین (عیسائی) تک کہہ دیا تھا۔ مالک رام کا معاملہ بھی اپنے ممدوح سے کچھ مختلف نہیں۔ ماہرین کا ایک کمیشن یہ معلوم کرنے کے لیے بٹھانا ہوگا کہ مالک رام کا دین و مذہب کیا ہے۔

دونوں خوش نصیب تھے کہ دونوں کو ان کی زندگی ہی میں بے پناہ شہرت ملی۔ دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن ان کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ ذکر غالب جو مالک رام کی شہرت کا باعث بنی وہ بھی پانچ بار چھپ چکی۔ دونوں نے اپنے ہم عصروں کی دشنام طرازیوں کو بھی جھیلا۔ اگرچہ مرزا غالب یہ شکوہ کرتے رہے کہ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں۔ وہ زندگی بھر مالی مشکلات سے نبرد آزما رہے۔ ایک خط میں میر مجروح کو لکھتے ہیں۔۔۔

"یہاں بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینہ روزے کھا کھا کر کاٹ دیا۔ آگے خدا رزاق ہے۔ اور کچھ کھانے کو نہ ملا غم تو ہے۔"

لیکن یہاں مالک رام کی زندگی میں مرزا سے گریز نظر آتا ہے مالک رام زمانہ کی ناقدری کا اتنا زیادہ
نہیں ہیں جیساکہ مرزا تھے اور نہ انھیں مرزا کی طرح عسرت و تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل غالب کے
یں شیرس (shares) خریدنے و بیچنے کا کاروبار شروع نہ ہوا تھا۔ ورنہ تو مرزا بھی شیرس میں
لگاکر مالک رام صاحب کی طرح مالدار بن جاتے۔ یا کسی موٹر کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر بن جاتے تو ان کی
بھی مالک رام کی طرح آرام سے گزر جاتی۔ مگر شاید تب وہ مرزا غالب نہ بن پاتے۔

مالک رام نے تقریباً نصف صدی غالب کی صحبت میں گزاردی۔ وہ یہ طے کرتے رہے کہ غالب کی تاریخ
کیا تھی۔ غالب کی کونسی مہر گول تھی۔ کونسی چوکور۔ ان کی غیر مطبوعہ تحریریں کہاں کہاں ہیں۔ کونسے خطوط جعلی
ان کا استاد کہا جانے والا شخص عبدالصمد اصلی تھا کہ نقلی۔ اپنے ممدوح سے مالک رام کی دوستی مسلم مگر ان
دوستی کا حق صحیح معنوں میں ادا نہیں ہوسکا۔ مالک رام خود ثقہ و پاکباز بنے رہے۔ اپنا دامن تک تر نہ ہونے
تو تب جانتے کہ غالب کی آواز میں آواز ملاکر کہتے قدیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست اور غالب
جام پر جام لنڈھاتے۔ خوباں سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ گھر پر جوئے کی محفلیں سجاتے۔ نواب کی کسی خوبصورت
دیکھ کر بے تاب ہوتے [قاضی عبدالستار نے اپنے ناول غالب میں لکھا ہے کہ مرزا ایک نواب کی نوجوان خوبصورت
کے عشق میں گرفتار ہوئے اور اسے بھگاکر متھرا کے راجہ کے یہاں لے گئے اور اس کے محل میں بیوہ کے ساتھ
رلیاں مناتے رہے] ایک آدھ بار (علامت کے طور پر ہی) جیل بھی ہو آئے۔ یہیں ان کی غالب دوستی اور
شناسی پر حرف آتا ہے۔ بات تو تب تھی کہ ایک دن اخباروں میں خبر چھپتی کہ مشہور غالب شناس مالک رام دیسی
کے ٹھیک سے جھومتے نکلے اور راستہ میں کسی سراپا ناز کے ساتھ بیش دستی کرتے ہوئے دھر لیئے گئے۔ کیا مزا آتا۔ لوگ
گوئیاں کرتے۔ مہینوں چٹخارے لے لے کر اس واقعہ کا ذکر کرتے۔

کہتے ہیں تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ مالک رام ان اثرات سے محفوظ رہے ہوں گے۔ انھوں نے
کچھ حرکتیں ضرور کی ہوں گی لیکن چھپکے چھپکے۔ مرزا غالب کی سی جرأت رندانہ وہ اپنے میں پیدا نہ کرسکے جو سر عام
کرتے کہ ہے کوئی مے مردانگی عشق۔ محققین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو مالک رام کی عاشقی و رندی
ں کو منظر عام پر لائے اور جب تک ان کی تردامنی ثابت نہ ہوجائے ان کی غالب شناسی غیر معتبر سمجھی
ئے اور ان کی تمام تصانیف بحق سرکار ضبط کرلی جائیں۔

مرزا غالب جب تک زندہ رہے اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے جہاں کہیں رہے اور جہاں بھی گئے رونق
ل بنے رہے۔ ان جیسے اپنے عہد میں کوئی بھی شخص ان کو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے عہد پر چھائے
ے۔ ان کی زندگی خود اپنے عہد کا آئینہ ہے جس کے اوراق پر اس دور کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ مالک رام بھی
ممدوح کی طرح اپنے زمانہ کی دھڑکنوں میں بسے ہوئے ہیں۔ آج کے اردو منظرنامہ کا کوئی بھی بیان مالک رام
ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔ اپنے دور پر ان کی گہری چھاپ ہے۔ بس ایک آنچ کی کمی رہ گئی۔ مالک رام خدا کے
ور جائیں گے تو ان کا اعمال نامہ کورا کاغذ ہوگا۔ کاش مرزا غالب کی طرح وہ یہ کہنے کا حوصلہ کرسکتے!

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک —!
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا —!

پٹ حیدرآبادی

غزل

وہ نہ دیکھے بھی تو اپنے کو دکھانا ہے مجھے
اُس کی نظروں میں خود اپنے کو گھسانا ہے مجھے
اپنے گھر اُس کو زبردستی بُلانا ہے مجھے
وہ نہ آئے تو اُسے کھینچ کے لانا ہے مجھے
میری مرضی ہے خوشی میری ہے منشا ہے میرا
عاشقی کرنا ہے اور جھڑکیاں کھانا ہے مجھے
میں ہوں اور وہم ہوں اور ارمانوں کا کیوسسٹم ہو
اپنی خلوت ہی میں اک بزم سجانا ہے مجھے
جو نہ سہتے تھے حسینوں کے سہے ظلم و ستم
جوتے کھا کر سرِ تسلیم جھکانا ہے مجھے
کرکے مشہور کہ وہ آج ہیں مہمان میرے
ناچ ننگنی کا رقیبوں کو نچانا ہے مجھے
جل گئی رسّی مگر رسّی کے بَل باقی ہیں
فاقہ مستی میں بھی شان اپنی دکھانا ہے مجھے
نظر آیا ہے مجھے عقل میں اپنی تو فتور
دیکھنے والے تو کہتے ہیں سیانا ہے مجھے
لینا ہے اپنی حفاظت کا مجھے اپنے سے کام
جو ستاتے ہیں مجھے ان کو ستانا ہے مجھے
نوجوانی میں حسینوں سے رہا یارانہ
اب نہ جانا ہے کہیں اور نہ آنا ہے مجھے
نیکی و صُلح سے بنتا نہیں سرپٹ کوئی کام
لیا ڈگی ہی سے اب کھانا کمانا ہے مجھے

شبنم کاروراری

تضمین

(رُوحِ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

بیوی جو چھوڑ دی ہے تو بچہ بھی چھوڑ دے
چھوڑا ہے چاند ، چاند کا ٹکڑا بھی چھوڑ دے
گھر والی چھوڑی گھر کا یہ جھگڑا بھی چھوڑ دے
"مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے"
"نظارے کی ہوس ہے تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے"

دل پر چلائے تیر بہت یہ کمانِ عقل
دل کی ڈبوے کشتیاں یہ بادبانِ عقل
دل کی زباں جدا ہے الگ ہے زبانِ عقل
"لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل"
"لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے"

○

کسی نے پھر نہ سُنا قرض کے فسانوں کو
میرے نہ ہونے سے راحت ملی دوکانوں کو
دوا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
کہ راس آگئی بیماری اب دوانوں کو
ہمارے بعد کے مہمان کا خدا حافظ
کچھ اتنا ہم نے ستایا ہے میزبانوں کو
ہمارے مُنہ پہ زمانے نے اتنا تھوکا ہے
کہ شرم آنے لگی ہے اگالدانوں کو

پروفیسر انیس سلطانہ
(بھوپال)

ہم سے خلاف ہو کے زمانہ کرے گا کیا؟

صدیوں پرانی روایات کے علمبردار ہم کہ ہمارے اُستادِ محترم نے ہمیں جی جان سے پڑھا تو دیا ..... لیکن آگے حدِ ادب ..... یعنی کہ وہ گُر اپنے پاس ہی رہنے دیا جس سے ان کی استادی اور ہماری شاگردی میں فرق نہ آئے .... یعنی کہ پی۔ایچ ڈی کی کافرادائی سے ہم محروم ہی رہے۔ کیونکہ محترم کے خیال میں لڑکیاں جنھیں ابھی کچھ دن پہلے تک صنفِ نازک بھی کہا جاتا تھا، ایسی بدعت کی مرتکب نہیں ہوسکتیں۔ تو خیر ہم اس بدعت تو کیا کسی بھی بدعت نیز شرک سے حتی الامکان بچتے رہے۔ گدھے ہمارے شہر میں تھے ہی نہیں، اس لئے پڑھ لکھ کر اپنے پر ہی لادے رہے اور کہ تنقید کی بوجھل بوجھل کتابیں جو باقیات الصالحات کے طور پر بچ رہی تھیں خشوع وخضوع سے توبہ واستغفار کرکے دھونی دے کر چھپا دی گئیں۔ تمام ادبی محاذ، اداریوں، مجلسوں (زوم کی نہ سمجھئے گا) محفلوں اور انجمنوں سے یوں دور دور رہے کہ جیسے ٹارزن نے اپنے آپکو شہری زندگی سے دور رکھا تھا۔

پڑھنے سے توبہ توبہ کئے رہے، لیکن توبہ کا دروازہ ابھی کھلا تھا' پڑھانے سے دامن بچا نہیں سکتے تھے، کہ روزِ اول سے مقدر ہو چکا تھا۔ فرشتوں سے تو خیر ہمارا واسطہ کیا پڑتا، قدسی عفت لڑکیوں کو پڑھا پڑھا کر ہم اپنے کو اُستادِ اعظم سمجھنے لگے۔ سرسید کو اگر ہم بہت بڑا مزاح نگار ثابت کردیں تو وہ سرِ تسلیم خم کئے رہیں گی۔ حالی کو مصلحِ اعظم قرار دے کر شیخ مصلح الدین (سعدی شیرازی) کا شاگرد قرار دے لیں، کوئی حرفِ شکایت کسی کی زبان پر نہ آئے گا۔

چنانچہ ہماری نئی نئی تحقیق کی روشنی میں 'آثار الصنادید' محکمۂ آثارِ قدیمہ کے لئے نہایت کام کی تصنیف تھی۔ ہم میں تحقیق کے جراثیم در آئے تھے۔ اِدھر غضب یہ ہوا کہ اپنی سرکار نے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری کو لازمی قرار دیا

ہم اس پابندی سے بچنا چاہ رہے تھے ...... ہم تو ہر پابندی سے بچنا چاہتے ہیں ..... لیکن وہی ہم پر سوار ہوجاتی ہیں۔ دوست احباب نے اس قدر زور ڈالا کہ ہم بھی اندر ہی اندر پھسل گئے ...... اور زیر لب انکار کر گئے۔

دوست آشنا، عزیز اقربا سب نے زور دیا، سوائے ہمارے کوئی ایسا نظر نہ آیا جو یوں کورا ہو ...... آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، ہر چہرہ پر ڈگریوں کی بہار تھی اور ہر دل ہماری نااہلی پر برافروختہ ...... ایسا لگنے لگا کہ اگر کچھ دن اور ہمارا نام اسی معصومیت سے عقیقہ کے ساتھ چھٹی کا دودھ یاد دلاتا رہا اور کسی نئی صفت سے متصف نہ ہوا تو ہمارا علمی بائیکاٹ کر دیا جائے گا۔

بائیکاٹ کیسا ہی کیوں نہ ہو، اس سے ڈرنا لازم ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسی بائیکاٹ نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا۔ اس سے پہلے کسی کو یہ طریقہ نہ آتا تھا، ورنہ اپنے بھارت ورش میں گونڈ، بھیل اور دراوڑ قوموں کے علاوہ باہری عنصر نظر ہی نہ آتا۔ کیا کیا ہمارے احباب نے مفید مشوروں سے ہمیں نوازا، جن کا شکریہ ہم انشاء اللہ اپنے مقالہ کے دیباچہ میں ضرور کریں گے اور بالواسطہ کیا کیا دہشت زدہ بھی کیا۔ نوکری سے نکالے جانے کی دھمکیاں دیں۔ (دروغ برگردن راوی)۔

اب ہم نے ایک بار پھر ان تندرست کتابوں سے رجوع کیا جنھیں بے ضرر سمجھ کر الماری میں رکھ چھوڑا تھا۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، داستان، حتیٰ کہ داستان در داستان پر اتنا کام ہوچکا تھا کہ ہماری ہمت پست ہونے لگی۔ ہم اس میدانِ خارزار سے بچ کر نکلنے ہی والے تھے کہ پکڑے آئے۔ ہاتھ ہتھکڑیوں سے فگار، پاؤں بیڑیوں سے بیزار، سینہ چھلنی، کاوش کی تیر افگنی، با دلِ ریش ریش، قہرِ درویش بر جانِ درویش، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، القصہ گرفتارِ عذاب آئے۔ ایک طرف سے رہبرِ کامل، دوسری طرف سے احباب فاضل۔

مرتا کیا نہ کرتا ...... بلکہ ... مرتی کیا نہ کرتی .... عنوانات کی ایک طویل فہرست لے کر ہم پہنچے۔ کتنے عنوان تو ان میں سے کسی اور کو پیارے ہو چکے تھے۔ جو بچ رہے تھے وہ اتنے سخت جان تھے کہ ہماری جانِ ناتواں ان سے ٹکر لینے کا خیال، خواب میں بھی نہ لاسکتی تھی، مگر .... پیر مغاں جائے نماز کو تر کرنے کا حکم صادر کر چکا تھا، اور کہ اس کے لئے شراب بھی انھیں نے مہیا کی تھی۔ چنانچہ ہمارے گائیڈ صاحب کو ایک عدد عنوان بھی یاد آ ہی گیا۔ وہ تو خیر اپنی جھولی میں سینکڑوں عنوان ڈالے پھرتے ہیں .... اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو اس جھولے کے راز جو جان جائے یا تو جان سے جائے یا اعزازی ڈگری پائے۔

غالبِ خستہ کے پاس تو چند تصویرِ بتاں اور چند حسینوں کے خطوط کے سوائے کچھ نہ ہوتا تھا، وہ بھی سُنا ہے بہ قائمی ہوش و حواس دائمی اجل کو لبیک کہنے سے پہلے نذرِ آتش کر دیئے تھے اور یہ غزل لکھی تھی ؎

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

یہاں مع ہذا حسینوں کا کئی پشتوں کا شجرہ موجود رہتا تھا کہ کسی التباس کی گنجائش نہ رہے۔ یعنی جتنے اربابِ حل و عقد

ایچ دِلی جیسی کاوشوں میں عمریں تباہ کی تھیں ' یا فی الحال کر رہے تھے ' برصغیر کے ایسے تمام لوگوں
ان کے پاس ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ اور یا ان کے دماغ کے نہاں خانے سے حسب ضرورت برآمد
ہتی۔

رفیک آدمی کا دشمن آدمی ہے ، انھوں نے ہمیشہ ایک عدد عنوان سے نوازا ..... ہم نے شکریہ کے
ن سے ...... کہ یہ موقع اظہار تشکر کے ساتھ ساتھ سرور و انبساط کا بھی تھا - آئیے ہماری اس
نی میں آپ بھی شریک ہوکر ہمیں مشکور ہونے کا موقع عنایت کیجئے۔ !!

بت سے لوگ زندگی بھر کچھ نہیں کرتے اور جیئے چلے جاتے ہیں۔ جیسے خود ہم .... تو ہمارے عنوان صاحب*
بیل اللہ جیئے چلے جارہے تھے اور نصیب دشمناں آج تک بقید حیات ہیں۔ اللہ ان کی عمر میں اور برکت دے۔
ہمارا پوچھنا کیا .. . جزاک اللہ انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے والے تھے ' اپنے ذوق نظر اور شعور
ہ پر تو ہمیں پورا یقین تھا۔ تائیدِ غیبی کا اشارہ بھی نہیں تھا کہ جسے موصوف ' کی تائید حاصل ہو
شان ہونے کی کیا ضرورت ؟

محترم غزل گو شاعر واقع ہوئے ہیں - ہمارا جی باغ باغ ہوگیا بلکہ دل روشن مانند چراغ ہوگیا .... غزل
ارے دل کے نرم گوشوں میں کچھ ایسا پیار سمایا ہوا تھا اور ان کی بچپن کی سنی ہوئی غزل کی وجہ سے
اگا کر پڑھا کرتے تھے ' ہم اپنے گرویدہ ہوچکے تھے کہ ایک والہانہ ربودگی سے ہم سرشار ہو اٹھے۔

لیکن یہ سرشاری اور ربودگی تحقیقی مقالہ میں کام آنے والی نہ تھی۔ ابھی تو مرحلہ تھا ' حالاتِ زندگی کا۔
دزنگار تو انھوں نے تھوڑے بہت بتا بھی دیئے تھے ' لیکن حالاتِ زندگی کی تو ہوا بھی نہیں لگنے
سال وہ زندگی اور اس کی سرشاریاں اور کہاں یہ بے نمکی ' کہاں وہ شوراشوری اور کہاں یہ بدمزگی!!
ے تو سرے سے ہی ان باتوں سے گریز اختیار کیا۔ اب ہماری مدح سرائی کے موقعے ہاتھ آتے آتے
رہے تھے۔ یوں ہم کوئی موقع گنوانے کو تیار نہ تھے۔ ادھر ان کی مرنجامرنجی ' موقع دینے سے انکاری...
پھر یہ ہوا کہ ان کا در اور ہمارا بستر۔ جہاں موقع ملا ' ادھر سے روانہ ادھر جا موجود .... کتنے چکر ان
ے لگائے ' یاد نہیں۔ کتنی بار وہ نہیں ملے — یاد نہیں ..... کتنی بار مل کر بھی نہیں ملے .....
ملے بھی ملنے کے ارادے سے تو کانوں میں مائیک فٹ کروانا ہم بھول گئے — آہستہ کلامی کا ایک
' وہ مدھم سُر میں بات کرتے ' ہم پنچم میں سوال اٹھاتے۔ ہم پانچ جملوں میں سوال کرتے ' وہ
بن کر ایک آدھ فقرہ سے ہمیں مالا مال کردیتے۔

پھر اکثر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ شادی سے پہلے کے واقعات ان کی والدہ بتانے لگیں اور بعد کے

---

* عنوان چشتی صاحب سے انھیں ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔

ں زوجۂ محترمہ ۔ ابھی ان کے انگلش زدہ بچوں کو ہم سے دلچسپی نہ ہوسکی تھی، یہی غنیمت تھا۔
پھر ایک دن ہم فہرست بنا کر لے گئے کہ کم سے کم ان کی غزلوں کو ادوار میں تقسیم کر کے شائد ہم کوئی
ایاں انجام دے سکیں۔ پتہ چلا کہ اس کا فیصلہ وہ خود نہیں کر سکتے کہ کون سی غزل کب لکھی۔ سو ہم نے
کام کیا اور اپنی ذمہ داری پر کیا کہ پھیکی پھیکی غزلوں کو شادی سے پہلے کی واردات سمجھا، لیکن ان سے
، تو ان کی بیگم ہم پر خفا ہوئیں۔ بولیں اگر ایسے بے رنگ اشعار کہتے تو میں ان سے شادی ہی کیوں کرتی؟
اب لیجئے آپ ہماری دقتوں کا اندازہ کیجئے۔ چھوٹے بڑے تمام ادبی رسالے اسی اُمید میں ٹٹولے کہ موصوف
یں کوئی مضمون مل جائے۔ لیکن تمام لائبریریاں اس باب میں خالی پڑی تھیں۔ جانے اپنے نقادوں کو بھی
شاعروں سے کوئی چڑ ہے۔ جب خدا نخواستہ وہ بھی میر و غالب سے جا ملیں گے تو شاید ان سے
بڑے شاعر قرار دیدیئے جائیں۔ ابھی تو کوئی بھی زبان کھولنے سے ڈرتا ہے۔ مقالہ کے لئے کتابیات کی
ت بھی تو ہونا چاہیئے نا۔ ہمیں اگر بھولے سے کہیں ان کا نام مل بھی جاتا ہے تو اس کے ساتھ آٹھ دس شاعروں
م اور ہوتا ہے۔
کسی انفرادی رنگ کی تلاش میں ہم نے ان کا دیوان جسے آج کل "مجموعہ" کہنے لگے ہیں، بار بار پڑھا
جتنی بار پڑھا، ان کے اشعار ہمیں ایسے ازبر ہوئے کہ اب ہم اُٹھتے بیٹھتے انھیں کا ورد کرتے ہیں، لیکن
نک ان کے بارے میں ڈھنگ کا ایک جملہ نہ لکھ پائے۔
اَب سوچتے ہیں، لکھ ہی ڈالیں ۔ ۔ ۔ ۔ کون سی کتاب چھپوانا ہے، ڈگری ہی تو لینا ہے۔

○ ○ ○

بالو سرتاج
(چندراپور)

کیا رسوا ہمیں شوقِ تصویر نے

آپ نے بھی دیکھا ہوگا، اکثر فوٹو اسٹوڈیوز کے باہر ایک بورڈ لگا ہوتا ہے جس کی تحریر کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

"اگر آپ خوبصورت ہیں تو ہم آپ کی خوبصورتی کو محفوظ رکھیں گے"۔

"اگر آپ خوبصورت نہیں ہیں تو ہم آپ کو خوبصورت بنا دیں گے"۔

جی نہیں، خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے یہ فوٹوگرافر۔ بس اتنا کہتے ہیں کہ سیاہ کو سفید، بدشکل کو خوبرو اور ناقابلِ دید کو قابلِ دید بنا کر دکھا دیں گے اور واقعی دکھا بھی دیتے ہیں۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اسٹوڈیو میں ناز و انداز دکھاتی کسی حسینہ کے قاتل پوز کو دیکھ کر اس کا دیدار کرنے سر کے بل جائیں تو چہرہ حقیقتاً ایسا ہوگا جیسے اس پر ریل گزر گئی ہو۔ بالوں کی سیاہ گھٹاؤں میں چاند سا دمکتا چہرہ واقعتاً اس کے الٹ ہوگا۔ دراز قد جوان پانچ فٹ سے کم ہوگا تو توانا حریف کو زیر کرتا شخص محض سا مریل ہوگا۔

ایک مرتبہ ہم بھی ایک اسٹوڈیو کے باہر لکھے ان جملوں کی کشش سے کھنچے اسٹوڈیو میں داخل ہو گئے تھے۔ فوٹوگرافر سے دریافت کیا تھا "آپ نے باہر جو کچھ لکھ رکھا ہے اس تحریر کی دوسری سطر میں ہمیں دلچسپی ہے۔ کیا آپ حقیقت میں ایسا کر سکتے ہیں؟" فوٹوگرافر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "حالانکہ آپ کو دلچسپی پہلی سطر میں ہونی چاہیے۔ آپ تو ماشاءاللہ بے حد حسین ہیں"۔

ہم سمجھ گئے بزنس ٹیکٹ آزما رہا ہے اس لیے زیادہ نہ پھولتے ہوئے کہا۔ "بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ہم ماشاءاللہ کافی حسین ہیں (خود ہمارا اور ہمارے آئینے کا تو ہے ہی) کوئی کہتا ہے کہ ہم سائیڈ سے مینا کماری کی طرح لگتے ہیں، بات کرتے وقت ہم میں پروین سلطانہ کی شباہت جھلکتی ہے۔ سامنے سے رتی اگنی ہوتری کا گمان ہوتا ہے تو پیچھے سے ممتاز کا۔ لیکن ہم نے جب بھی فوٹو اتروائی ان میں سے کسی کی طرح نظر نہ آئے۔ کسی میں چہرہ طرائی سا ہی کا سا آیا تو کسی میں ٹن ٹن جیسا۔ کبھی بیٹھا کدو نظر آئے تو کبھی فٹ بال جیسا کیوں ہوتا ہے؟"

ویسے وجہ تو ہمیں معلوم تھی کیوں کہ جس کسی فوٹوگرافر سے شکایت کرتے وہ یہی کہتا کہ آپ کا چہرہ فوٹوجینک نہیں ہے۔ (البتہ شوہرِ محترم کا خیال قدرے مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں فوٹوگرافر کی کیا غلطی؟ جیسی تم ہو ویسا ہی

دکھائی دے گا۔ جو بھی ہو گزشتہ تلخ تجربات کی بناء پر ہم نے اس فوٹو گرافر سے راست دوسری سطر میں ان جیسی ظاہر کی تھی، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے کہا "آپ ہمارے اسٹوڈیو میں فوٹو (تاریخ ادب پہلے ہی کہہ دیتے)۔ آپ بینا کماری دکھائی دینا چاہتی ہیں یا پروین سلطانہ؟"

ہم نے عرض کیا "بھائی صاحب، ہم جیسے ہیں ویسے ہی دکھائی دیں اس کی سعی فرمائیے۔ ٹن ٹن، بلراج ساہنی یا کدو نہ دکھائی"۔ کیمرہ سیٹ کرتے ہوئے فوٹو گرافر نے کہا "آپ پہلی خاتون ہیں جو ہمارے اشتہار کی دوسری سطر کی طرف متوجہ ہوئی ہیں"۔ ہم نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے مگر ہم ذرا حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں"۔

تو صاحب اُس دن ہماری جو فوٹو اُتاری گئی اس میں ہم واقعی دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ بالکل اپنے جیسے۔ (یہ وہی تصویر ہے جو گزشتہ پانچ سالوں سے "تازہ ترین" کہہ کر ہم رسائل میں چھپوا رہے ہیں)

یہ ساری تمہید اس بات کی تھی کہ ہمیں فوٹو اتروانے اور فوٹو جمع کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ اب اس شوق کے ہاتھوں ہم کس کس طرح رسوا ہوئے ہیں خصوصاً تفریحی سفر میں، اس کا بھی کچھ بیان کر دیں۔ ہم نے بذات خود آج تک کیمرے کی آنکھ سے جھانکا نہیں ہے۔ (تاک جھانک ہمیں کبھی پسند نہیں رہی) مگر ہم نے یہ مواقع فوٹو گرافروں کو اکثر مہیا کئے ہیں۔ ہم کشمیر گئے، کنیا کماری گئے، بنگلور، حیدرآباد، اوٹی، میسور، جے پور، اجمیر گئے اور واپسی میں ہر مقام کی یادگار فوٹو ساتھ لائے۔ ہم مناظر قدرت کے شیدائی ہیں۔ ہر تفریحی مقام پر قدرت کے حسین مناظر کی فوٹو بھی مل جاتی ہیں مگر یہ فوٹو لاکر ہم اپنے حلقۂ سہیلیاں میں بتائیں تو یہ اس بات کا ثبوت تو نہیں کہ ہم بہ نفس نفیس ان مقامات پر تشریف لے گئے تھے جبکہ حسین مناظر کے پس منظر میں قدرت کے تخلیق کردہ ہم بھی ہوں تو مناسب رہے گا، بس یہی سوچ کر ہم فوٹو اترواتے ہیں۔ (اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیجئے گا ورنہ ہم کیا ہماری صورت کیا؟)

تفریحی مقامات پر پیشہ ور فوٹو گرافر ہوتے ہیں جن سے معاملہ طے کر لینے پر وہ اپنا کیمرہ سنبھال آپ کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جہاں آپ چاہتے ہیں وہاں آپ کے فوٹو اُتار کر رول آپ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ آپ اپنے شہر جا کر دھلوا لیں۔ ہمیں اس طرح کا پہلا تجربہ کافی تلخ ہوا تھا یعنی اپنے شہر واپس لوٹ کر ہم نے رول دھلوایا تو دنیا مظہر العجائب! نہ ہم پہچانے جا رہے تھے نہ مقامات۔ کسی فوٹو میں کسی ایک شبیہ کے چار ہاتھ اور چار پاؤں نظر آرہے تھے تو کوئی شبیہ آدھا مرد، آدھی عورت کا فینسی ڈریس پیش کر رہی تھی۔ کہیں پانی میں بیل گاڑی چل رہا تھا تو کہیں سمندر کے سینے پر موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ کہیں کشتی عمارت کی چھت پر تھی تو کسی میں سر پر عمارتیں دھری تھیں۔

ہم حیران کہ، یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ فوٹو گرافر سے یہ راز پوچھا تو اس نے کہا "آپ کو چیٹ کیا گیا ہے کسی پُرانے رول پر فوٹو اُتار کر آپ کو تھما دیا گیا ہے"۔ (اپنی بے وقوفی کی سند کے طور پر وہ فوٹو گرافس ہم آج تک سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں)

آگے سے ہر مرتبہ ہم نے اپنی بلّی کی سی چوکس آنکھوں کے سامنے نیا رول خرید کر ڈلوایا۔

آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سیر و تفریح کی غرض سے جانے والوں کے پاس کافی وقت ہوتا ہے (اسی لیے تو جاتے ہیں) مگر اس مناسبت سے پیشہ ور فوٹو گرافر کے پاس وقت کی اتنی ہی کمی ہوتی ہے۔ وہ عجلت میں شیطان کو بھی مات کرتا ہے۔ وہ کبھی نہیں پسند کرتا کہ آپ جگہ کا چناؤ کرنے یا پوز بنانے میں وقت ضائع کریں۔ جیسے اودے پور کے ایک باغیچے میں ہمیں کوئی ایسا مقام پسند نہیں آرہا تھا جہاں کھڑے ہو کر ہم پوز دے سکیں۔ ہر جگہ گلاب کے پھول اس طرح

افراط رہے تھے کہ کوبھی ایک پھول کی گنجائش تھی نہ مناسبت۔ تنگ آکر فوٹوگرافر نے کہا "آپ مٹی کے اس شیر پر بیٹھ جائیے۔ سبھی بچے یہاں فوٹو اتارتے ہیں۔"

"کیا ہم بچے ہیں؟" ہم نے بہت زیادہ بُرا مان کر کہا "ویسے بھی شیر کی سواری صرف ولیشنو دیوی کے لیے مخصوص ہے۔ سوم شیر بھلے ہی مٹی کا ہو، ہے تو شیر ہی۔ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ہم مٹی کے شیر کے اتنے نزدیک جا سکتے ہیں۔ کیمرہ ٹرک سمجھیں گے سب۔" ہم نے دوسری جگہ کی تلاش کی۔ آخر ایک خشک فوارہ ہیں پسند آیا۔ فوارے کے درمیان ایک خوبصورت ہنس بنا ہوا تھا۔ ہم نے کہا "ہم وہاں جاتے ہیں۔ اُس ہنس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوں گے۔" فوٹوگرافر نے کہا "آپ سیدھے راستے سے چل کر وہاں تک جائیں گی تو کافی وقت لگ جائے گا۔ ایسا کیجیے درمیان کی یہ کیاریاں پھلانگ کر وہاں تک پہنچ جائیے۔"

ہم نے کہا "ناممکن! ہم نہیں پھلانگ سکتے۔"

فوٹوگرافر نے حوصلہ افزائی کی "کوشش کیجیے۔ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔"

ہم نے پلّو کھول کر ساڑی اونچی کی اور اللہ کا نام لے کر کیاریاں پھلانگ ڈالیں۔ حوض کی دیوار اونچی تھی پھر ایک مرتبہ جمناسٹک کا کامیاب مظاہرہ کیا اور پہنچ گئے ہنس کے نزدیک۔ مگر ابھی سانسیں معمول پر اور لباس درست نہ کرنے پائے تھے کہ کلک کی آواز کے ساتھ تصویر اُتر گئی۔ اس تصویر میں ہم اُس خاکروب عورت کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو حوض کی صفائی کرنے کے لیے حوض میں اُتری ہو۔

ایک اور تفریحی مقام پر ہمیں ایک چٹان بھا گئی جو ہمیشہ کی طرح فوٹوگرافر کو کوئی خاص پسند نہ آئی۔ پھر بھی ہماری پسند کو مقدم جان کر اس نے فوٹو کھینچی۔ اس فوٹو میں ہم چٹان پر بیٹھے ہوئے کچھ اس طرح نظر آرہے تھے جیسے گڑ کی بھیلی پر مکوڑا بیٹھا ہو۔

گلمرگ میں فوٹوگرافر نے کہا۔ "برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو ماریئے (یعنی پوز دیجیے) ہم دونوں نے سوچا یہاں ہمیں کون پہچانتا ہے۔ لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" نہایت شوخ بن کر برف کا ایک گولہ شوہر محترم کی طرف پھینکا۔ انھوں نے رسید عطا فرمائی۔ اب خدا کی شان دیکھیے کہ فوٹو بہت عمدہ آئی۔ صرف اتنی گڑبڑ ہوئی کہ ہم دونوں کے چہرے ندارد تھے اور اُن کی جگہ گردن سے اوپر دو برف کے گولے رکھے ہوئے تھے۔ (ہمارا خیال ہے کہ فوٹوگرافر بٹن دبانے میں بہت عجلت نہ کرتا تو ہمارے بدن پر ہمارے چہروں کا دکھائی دینا عین ممکن تھا)

ڈل جھیل میں سیر کرتے ہوئے شکارے میں بیٹھی ہوئی ایک تصویر ہم نے لینا مناسب خیال کیا۔ فوٹوگرافر کو پوز دیتے ہوئے کہا "بھئی خیال رہے۔ تصویر دیکھتے ہی معلوم ہو جانا چاہیے کہ ڈل جھیل ہے۔" اُس نے کافی مہارت دکھائی۔ اس فوٹو میں بس ڈل ہی ڈل دکھائی دے رہی تھی۔ ہم لوگوں کا وجود بس ویسا ہی نظر آرہا تھا جیسے PEDAGOGICAL ڈرائنگ میں، لکیروں کے ذریعہ ہونے کا احساس کرا دیا جاتا ہے۔ فوٹوگرافر کی اپنی پسند ناپسند کی بات تھی، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

تاج محل دیکھنے گئے تو بڑا مزا آیا۔ فوٹوگرافر نے محبت کی اُس حسین یادگار میں ہماری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی "تاج محل ہاتھ میں لے کر فوٹو اتروانا پسند کریں گی آپ؟"

ہم نے کہا "جب مجسم تاج محل سامنے ہو تو ماڈل کی کیا ضرورت ہے؟"

ں نے کہا "ماڈل نہیں، یہی تاج محل آپ کے ہاتھ میں آجائے گا۔ یوں (ہاتھ آگے کرکے اُس نے پوز بنایا)
ہم حیرت سے اچھل پڑے "مذاق نہ کیجیے"۔ پھر فوراً ہی سراسیمہ ہوکر کہا "ذرا آہستہ بولیں۔ کل کو کسی نے الزام لگادیا
ہم نے تاج محل ہاتھ میں لے کر اُس کی بنیادیں کمزور کردی ہیں تو خواہ مخواہ فتنہ کھڑا ہوجائے گا۔

"اُف فوہ میڈم! حقیقت میں تاج محل نہیں آئے گا بلکہ صرف فوٹو میں ایسا نظر آئے گا"۔ اس نے البم کھول کر کئی تصویریں ہمیں دکھائیں جن میں چڑیا پکڑنے کے انداز میں لوگوں نے تاج محل کا اوپری کنگورا پکڑ رکھا تھا اور خود چراغ کے جن کی طرح خلاء میں تیر رہے تھے۔ ہمیں ایسے کرتبوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے سیدھے سادے ڈھنگ سے فوٹو اتروالی۔ مگر فوٹو گرافر کا کرنا ایسا ہوا کہ تاج محل ہم نے ہاتھ میں اٹھانے سے انکار کردیا تھا اس گناہ کی پاداش میں اُس نے ہمیں تاج محل کے اوپر بٹھادیا۔ (پتہ نہیں غلطی کہاں ہوئی تھی)؟

پہلگام گئے تو بارش ہورہی تھی۔ گرم کوٹ کے اوپر لمبی چوڑی برساتی بھی پہننی پڑتی۔ اسی طرح لدے پھندے گھوڑے پر سوار ہوئے اور پہلگام گھوم آئے۔ گھوڑے پر سوار ایک تصویر کی خواہش کی۔ فوٹو گرافر سے بات ہوئی اس نے مطلع صاف ہونے تک انتظار کرلینے کو کہا۔ مطلع صاف ہوا اور قبل اس کے کہ ہم برساتی اور اونی کوٹ وغیرہ اُتار کر کچھ ہلکے پھلکے ہوتے یا باگیں سنبھال کر پوز دیتے کہ فوٹو گرافر نے فوٹو اتار لی۔
ہم دل میں سمجھ تو ضرور رہے تھے کہ فوٹو کوئی خاص اچھی نہیں آئے گی (اس کے لیے ہم موسم کو موردِ الزام ٹھہرانے کا مصمّم ارادہ کرچکے تھے) مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ فوٹو دیکھ کر کہنا پڑے گا "محو حیرت ہوں کہ فوٹو کیا سے کیا ہوجائے" سب ہی فوٹو دیکھ کر ہنستے ہنستے بے حال ہوگئے۔ ایک نے کہا۔ گھوڑے پر بوجھ ضرورت سے زیادہ لاد دیا گیا لگتا ہے۔ دوسرے نے کہا ہاتھی بھی اب گھوڑے کی سواری کرنے لگے"۔ کسی نے کہا۔ جانے دیجیے ہمیں بہت شرم آرہی ہے۔ اور دوسری تصاویر کی بات نہیں بتاتے ہم۔

۵۷

بابو آر کے
(اچل پور)

ایک
ہنگامہ پہ موقوف ....

یوں تو ہماری سرزمین پہ آریہ آئے۔ تاتاری اور ترک بھی آئے۔ انگریز اور فرانسیسی بھی آئے... لیکن کسی کے بھی آنے پر اتنی ہاہاکار اور شور وغل نہیں مچا تھا جتنا کہ ہمارے ملک میں سوکھے کے آجانے سے مچا ہے۔ اس لئے باربار ہمارے دل سے یہی آواز آتی ہے کہ بھائی سوکھے! آپ یہاں برا جے ہی کیوں؟ کیا یہاں بھوک اور پیاس کے مرحلے اور لاء اینڈ آرڈر کے مسئلے نہیں تھے؟ کیا آندولنوں اور ہڑتالوں کے بازار گرم نہیں تھے؟ کیا گورکھا لینڈ اور پنجاب کے جھمیلے اور بوفورس کے واویلے کم تھے ....؟ الغرض کیا یہاں اندھکار اور ہاہاکار کم تھی جو آپ منہ جھاڑ سر پہاڑ لئے آوارد ہوئے۔

ویسے استقبال تو ہم نے آپ کا بھی کیا ہے۔ کیونکہ استقبال کرنے کے معاملے میں ہم لوگ کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ جب کبھی ہمارے دیرینہ انگریز آقا ملک میں آئے ہیں تب ہم نے استقبال کے نام پر ان کے تلوے چاٹے ہیں اسی طرح غیر سفارتی تعلقات والے ملکوں کے رہنما جب جب یہاں آئے ہیں تب تب ہم نے استقبال کے نام پر انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا ہے۔ یہاں تک کہ سفاک ڈاکوؤں نے جب ہتھیار ڈالا ہے تو بھی ہم نے ان کا استقبال اس حد تک کیا ہے کہ انھیں ہیرو بنا کے چھوڑا ہے۔

خیر یہ ہماری مہمان نوازی اور اعلیٰ قدروں کی اپنی روایات ہیں۔ اس لئے جس دن سے سوکھے مہاشے آپ کی اگوانی ہوئی ہے اُس دن سے آج تک ہم سب بھارت واسی آپ کی آؤ بھگت میں جٹے ہوئے ہیں۔ ملک کے عام شہری سے لے کر وزیر اعظم تک آپ کی جی حضوری اور ناز برداریاں اُٹھانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اور اب تو یوں لگنے لگا ہے جیسے آپ سوکھے نہیں بلکہ سانس ہوں اور سارے دیش کو نندا رہے ہوں۔ آج اخبار ہو یا رسالہ، ریڈیو ہو یا ٹی وی، شوہر ہو یا بیوی، تقریر ہو یا تحریر، الغرض وزیر حقیر۔ امیر فقیر۔ ہر ایرا غیرا سوکھے کی رٹ لگائے، بس سوکھے سوکھے کا جاپ کرنے میں کھویا ہوا ہے۔ آج ملک کے گوشے گوشے۔ گاؤں گاؤں

گلی گلی، سوکھے کے لئے جلسوں کا انتظام ہے اور کانفرنسوں کا اہتمام۔ سوکھے کے لئے چندے ہیں، فنڈ ہیں اور بانڈ بھی۔ کھیلوں کے انعقاد بھی اور سیمیناروں کی بھرمار بھی۔ الغرض ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

والا معاملہ ہے۔ ان دنوں ملک کا ہر شہری سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سوکھا سوکھا کہہ کر اپنا منہ سکھا رہا ہے اس لئے سوکھے جہا شے ہمیں ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں آپ ہماری اس آؤ بھگت اور خاطر داری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیش میں مستقل ڈیرہ ہی نہ جمالیں۔ ہاں اگر آپ Depute پر Temprury Bases ہوکر آئے ہو، تب تو ٹھیک ہے، ورنہ .... مستقل پڑاؤ کا معاملہ ہوا تو پھر خدا کی پناہ! آپ اگر اسی شد و مد کے ساتھ ہمارے بیچ تشریف فرما رہیں تو عین ممکن ہے کہ مستقبل میں بارش کا نام و نشان مٹ کر رہ جائے گا۔ اور ہماری آنے والی نسل موسموں کا شمار صرف گرما اور سوکھا کہہ کر کرنے لگے گی۔ ایسی صورت میں ہماری آنے والی نسلوں کو بارش بھی کبھی ایک موسم تھا، یہ سمجھانا دشوار ہو جائے گا۔ یا دوسرے معنوں میں آنے والے برسوں میں آپ کے مستقل ڈٹے رہنے کے کارن ہماری نسل کے آگے بارش کا ذکر یقیناً ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج ہمیں من و سلویٰ کا واقعہ محسوس ہوتا ہے۔ مستقبل میں جب ہم اپنے نونہالوں کو بارش کے تعلق سے یہ کہیں گے کہ برخوردار! ہمارے زمانے میں بجلیاں چمکتی تھیں۔ گھٹائیں چھاتی تھیں۔ بادل گرجتے تھے اور چاروں طرف جل تھل ہو جاتا تھا .... یہ سن کر بچے حیرت سے منہ کھولے ہماری طلسماتی باتوں کا لطف اٹھا رہے ہوں گے۔ پھر ہم کہیں گے کہ ...... بارش آسمان سے یوں ٹوٹ کر برسا کرتی تھی کہ پورے چار مہینے گھر کی چھت ٹپکا کرتی تھی ..... اور پھر ہم انہیں بتائیں گے کہ یہ پرنالہ موسلا دھار وہاں گرتا تھا ..... تب ہماری اس بک بک پہ ہمارے نونہال کہیں گے کہ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں اسی لئے جو جی میں آیا اناپ شناپ بکے جا رہے ہیں، لیکن کل ہماری نسلیں فخر کے ساتھ سینہ پھلائے گردن تانے کہیں گی کہ ہمارے اجداد نے بھی بارش دیکھی تھی، اور وہ ..... اس میں بھیگے بھی تھے۔

ویسے فی الحال تو ملک میں مکمل سوکھے کی نوبت ابھی نہیں آئی ہے یعنی ابھی بفضل ربی ملک جزوی سوکھا اور جزوی گیلا ہے۔ جہاں مغربی بنگال، آسام اور بہار کے لوگوں نے اچھے اچھوں کو پانی پلایا ہے وہیں آج ان کے سروں سے پانی اونچا ہے اور وہاں چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔ اس کے برعکس ملک کے بیشتر حصوں میں گھڑا بھر پانی پینے کیلئے ہے اور نہ چلو بھر پانی ڈوبنے کے لئے۔ ویسے بھی چلو چلو کر کے پانی کے کتنے ہی سمندر کیوں نہ بنا لئے جائیں، تب بھی ڈوب کر مرنے والوں کا سمندر ٹھاٹھیں ہی مارے گا۔ کیونکہ ...... آج غیرت انسانی موجودہ سماج کے سارے ہی پرانیوں کو اُن کے کُو کرموں پر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا شُبھ سندیش دے رہی ہے۔

آج ملک میں سوکھے اور سیلاب کے لئے الگ الگ محاذ پر راحتی کام کئے جا رہے ہیں جس سے وقت

انرجی دونوں کا ناش ہورہا ہے۔ اچھا ہوتا اگر مصیبت میں پھنسے دونوں قسم کے افراد کی مدد ایک ساتھ امداد باہمی
نام پر یوں کی جاتی کہ ؎

احباب مل کے کرلیں آپس میں ادلا بدلی
یہ بھی تو فی الحقیقت امداد باہمی ہے

دباہمی کے اس مشن کو پورا کرنے کے لئے سوکھے علاقے کے افراد اپنی چھتریاں اور برساتیاں سیلابی علاقوں میں
وادیں اور وہاں سے Sun Goggles اور خس کی ٹٹیاں، سوکھے علاقوں میں روانہ کردی جائیں (آخر ایک ملک
ار ہنے کے بہت سارے نقصانات کے ساتھ کم از کم اتنا فائدہ تو ایک دوسرے کو ملنا چاہیئے) اسی طرح ملک میں جا بجا
ش خرامی اور تیراکی کے قومی مقابلے منعقد کئے جانے چاہئیں۔ اور ان میں حصہ لینے والے آتش خراموں کو سوکھے علاقوں
ں اور تیراکوں کو سیلابی علاقوں میں سکونت دی جانی چاہیئے۔ اس ضمن میں سوکھے مہاشئے، ہمیں جہاں آپ سے اور
کائیتیں ہیں وہیں ایک شکوہ یہ بھی ہے کہ مرجھائے ہوئے چہرے اور سوکھے جسم والی بھوکی پیاسی جنتا کے لئے تو آپ
لی سوکھے بلکہ سراپا سوکھے ہیں جبکہ سرکاری ٹولے کے بیشتر افراد کے لئے تو آپ سوکھے کی بجائے سُکھ ہی سُکھ ثابت
ے ہیں۔ اسی لئے تو یہ بیچارے سوکھے سے متاثر بھوکی پیاسی جنتا کیلئے بھرے پیٹ اور کسی آئی ڈیلکس کے ساتھ ہوائی
وں میں ہمہ تن و توش مصروف ہیں۔ ویسے ان کے لئے یہ کام بھی ہے اور Cure بھی، کیونکہ سوکھے علاقوں میں
وپ کی تمازت سے ان کے جسم کی چربی پگھلنے کے امکانات زیادہ روشن ہیں جس سے ان کے ہائی بلڈ پریشر کا پیمیٹر
ہ کم ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سوکھے کے راحتی کاموں کے لئے ہائی بلڈ پریشر والوں کا ملک گیر پیمانے پر ایک دستہ تشکیل
جانا چاہیئے تاکہ بیشتر وزیروں اور نیتاؤں کے ساتھ ہی یہ لوگ بھی اپنے روگ میں تخفیف کرسکیں۔

سوکھے مہاشئے، اگر آپ کو ہمارے ملک میں رہائش اختیار کرنا ہی ہے تو آپ شوق سے رہ سکتے ہیں لیکن
ں یقین ہے کہ ...... جس دن بھی آپ اپنی آنکھوں سے پورے ملک کا بہ نظر غائر جائزہ لیں گے تو آپ
دیش میں چاروں طرف فسادات کی ہولناکیاں نظر آئیں گی۔ فرقہ واریت کا ننگا ناچ دکھائی دے گا۔ لاء اینڈ آرڈر
ابتری اور مارا ماری نظر آئے گی تب .... آپ خود ہی چپکے سے اپنا بوریا بستر سمیٹ سر پہ
ں رکھ کر یہ کہتے ہوئے بھاگیں گے کہ ؎

کون سے کام بند ہیں غالبِ خستہ کے بغیر

کاروبار چلے

قمر الزماں قمرؔ (رانچی)

نوازشوں کی اگر یاد لو بہار چلے
تو ہم کنواروں کا گلشن میں کاروبار چلے

ہم اہلِ دل ہیں کہاں انتظار کی طاقت
اٹھائے سر کو ہتھیلی پہ بے قرار چلے

مثالِ دل ہوئی زخمی ہماری پاکٹ بھی
غزالی آنکھ سے جب اشک تیز دھار چلے

ثبوت اُردو نوازی کا اور کیا دیتا
لگا کے پیاز ہم آنکھوں میں اشکبار چلے

مزاج اپنا قمرؔ اس قدر ہے آوارہ
جو تخت دار سے اُترے تو کوئے یار چلے

قطعات

واحدؔ انصاری (برہانپور)

پھر پریشانیوں نے آگھیرا — بے کلی ذہن و دل پہ طاری ہے
ٹریجڈی ہے کہ بعدِ نس بندی — میری بیگم کا پاؤں بھاری ہے

دے رہے ہیں جو امن کا پیغام — وہ کرائیں فساد اور دنگے
کس پہ واحدؔ کریں بھروسہ ہم — ایک حمام میں ہیں سب ننگے

جس کو اپنی اصلیت کا خود نہ ہو واحدؔ پتہ — فرق وہ لیڈر کرے کیا اونچ میں اور نیچ میں
لیڈری کا حال ہے اس دور میں کچھ اسطرح — جیسے اک بگڑی ہوئی عورت ہو سب کے بیچ میں

(PER CENT)

ہم مسلماں ایک سو پرسینٹ ہیں! — فکر آخر کیوں کریں ہم پاپ کی
سر کے بل جنت میں جائینگے ضرور — کیوں کہ جنت ہے ہمارے باپ کی

لوٹ لے زندگی کے خوب مزے — کچھ نہ پایا ہے اور نہ پائے گا
روزِ محشر میں سامنے رب کے — یاد چھٹی کا دودھ آئے گا

نعیم زبیری
(حیدرآباد)

پاکھنڈی

سیٹ بیلٹ کے دونوں سروں نے ایک دوسرے کے قریب آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور میرے برابر والی
سیٹ میں بھرا ہوا موٹا بار بار کوشش کر کے ہار چکا تھا۔ اور اب بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ قریب سے گزرنے والی ایئر
ہوسٹیس نے جن کے چہرے پہ وہی بیزارگی پھیلی ہوئی تھی جو اکثر ایئر ہوسٹیس کے چہرے پہ ہوتی ہے۔ موٹے کی عجیب
و غریب پریشانی کو دیکھا تو مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی۔ میں نے دل ہی دل میں موٹے کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی وجہ
سے کسی ایئر ہوسٹیس کے چہرے پہ مسکراہٹ تو دیکھنی نصیب ہوئی! پھر اس نے جھک کر بیلٹ کو ڈھیلا کیا اور محدث
کی وسیع و عریض توند کے نقطہ عروج پہ کس دیا اور ایجنڈا رستہ مل گئی۔ لیکن اب کرسی میں بندھا ہوا موٹا پھر کلبلا رہا
تھا کیوں کہ اس کا گول چہرہ پسینہ میں بھیگ گیا تھا اور اس کے لیے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کے دستی نکالنا
کی کوشش تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کسی ہاتھی کے لیے پیچھے مڑ کر اپنے دانت سے پیٹھ کو کھجانا۔ پسینہ
کی موٹی موٹی بوندیں اب کولڈ کریم کی دبیز تہوں سے پھوٹ پھوٹ کر پہاڑی جھرنوں کی طرح اس کی اکڑی ہوئی
قمیص پہ بہنے لگی تھیں۔ مجھے موٹے پہ نہایت ترس آیا۔ لیکن آپ کو مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ میں نے اپنی
دستی نکال کے اس کا چہرہ لونچھ ڈالا ہوگا۔ جی نہیں۔ میں نے وہی کیا جو اس سچویشن میں مجھے کرنا چاہیئے تھا۔ سیٹ کی
پُشت سے سر ٹکا دیا اور آنکھیں موندلیں۔ کچھ دیر بعد جب ایئر ہوسٹیس نے چاکلیٹوں والی کشتی آگے بڑھائی تو اپنی
ساری مشکلات اور تکلیفوں کو بھول کر اس نے اپنا موٹا ہاتھ آگے بڑھایا اور مجھے کچلتا روندتا ایک دم چیار چھ
چاکلیٹ اپنے دبیز پنجے میں دلوچ کے لے گیا۔ اب میں اس تکلیف دہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ کس طرح اس نے دو
تین چاکلیٹ ایک ساتھ مُنہ میں ڈالے اور پھر میرے کان کے قریب اس کی ناک سے سانس کی دھونکنی اور منہ
سے چاکلیٹ چبانے کی چپڑ چپڑ کس قسم کا آرکسٹرا میرے بھیجے میں چبھوتی رہی۔ بہرحال بڑی مشکل سے میں نے
اپنے حواسِ خمسہ کو اس کے چنگل سے باہر نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھنے میں کامیاب ہوا۔ درمیانی سیٹوں میں بیٹھے ہوئے خوش
نصیبوں میں سے ایک جو اس موٹے کی زد سے میلوں دُور تھا بڑے بڑے رنگین کاغذوں پر چھپے ہوئے اعداد و شمار
سے اُلجھا ہوا تھا۔ وہ کسی بزنس کانفرنس میں جا رہا ہوگا۔ اور دوسرا چھت کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہوا کے ناب کو کھولنے بند
کرنے میں معروف تھا اور اس کوشش میں اپنی سیٹ سے آدھا اُٹھ گیا تھا۔ ہوا کی تیز لہر اس کی طویل ڈاڑھی سے

ستانی کر رہی تھی۔ مجھے یہ شخص مانوس سا محسوس ہوا۔ لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ وہ کون تھا۔ وہ میری طرف دیکھتا تو شاید
ں اپنی یادداشت کو کچھ اور کرید سکتا۔

"آداب عرض ہے جناب" پیچھے سے ایک آواز آئی۔ جو شاید کچھ دیر سے آرہی تھی لیکن میں نے توجہ نہیں دی
ی۔ پلٹ کے دیکھا تو عبدالغفور صاحب تھے۔" اچھا تو آپ بائی ائیر جا رہے ہیں؟" انھوں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔
ر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انھیں کیا جواب دوں۔ لیکن وہ شاید جواب کے منتظر تھے۔ "پتہ نہیں" میں نے مصنوعی گھبراہٹ
اظہار کر کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے ردِعمل سے وہ کچھ بوکھلا سے گئے" نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ آپ دِلّی
ا رہے ہیں"؟

اُنھوں نے پوچھا؛

"نہیں تو۔ میں تو بنگلور جا رہا ہوں"

"ہائیں" میرے طویل و عریض پڑوسی سے ایک چیخ بلند ہوئی۔ میں بُری طرح گھبرا گیا۔ "کیا بات ہے"؟
میں نے پوچھا۔

"یہ فلائیٹ تو۔ دلی کی ہے" یہ موٹے نے سارے موٹوں کی ناک کٹوا دی۔ سُنا ہے عام طور پر موٹے زندہ
ل اور ذہین ہوتے ہیں۔ میں شیطان اور گہرے سمندر کے درمیان پھنس گیا تھا۔ ویسے عبدالغفور صاحب سمجھ
یٹھے تھے کہ میں ان کی ٹانگ کھینچ رہا تھا۔ اس لیے موقعہ پاکر اپنا اخبار پڑھنے میں لگ گئے تھے۔ موصوف اُن
بارح قسم کے احمقوں میں سے ہیں جو ہر معاملے میں ٹانگ اَڑا کے دوسروں کا بلڈ پریشر بڑھانے کے سلسلے میں مشہور
یں۔ اُن کی بعض حرکتوں پہ مجھے شرمندگی آمیز ترس بھی آتا ہے۔ گزشتہ مرتبہ جب وہ "بائی ائیر" کہیں گئے تھے
و اُن کے ہاتھ میں ان کا مخصوص پان دان تھا۔ ایک چھوٹا سا بیگ جس میں ان کے پان سپاری زردہ۔ اور کچھ کاغذا
غیرہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ کیبن ٹیگ (CABIN TAG) جو ائیر لائینس والوں نے انھیں عطا کیا تھا ان کے اس
اندان سے مسلسل لٹکا ہوا تھا۔ سڑک پہ آفس میں، بیڈ روم میں، ہوٹل میں ہر جگہ یہ ٹیگ جو شاید ان کے لیے کسی عالمی
قابلے میں پائے ہوئے گولڈ میڈل کی طرح تھا۔ ان کے ساتھ جاتا تھا۔ پچھلے "بائی ائیر" سفر کے بعد ان کا ہر جملہ
ن کی ہر تقریر۔ "بائی ائیر" سفر کرتی تھی۔ میں جب پچھلی مرتبہ "بائی ائیر" دلی گیا تھا۔ تو محمود میاں سے چاندنی چوک
یں ملاقات ہوئی تھی۔ پچھلی دفعہ جب میں بائی ائیر دلی گیا تھا۔ تو دلی میں بڑی گرمی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ عبدالغفور صاحب
کی قبیل کے بہت سے لوگوں کی مراجعت کی خبر بھی ہمیں اخباروں کے ذریعہ ہی ملتی ہے کہ موصوف بذریعہ طیارہ
روانہ ہوئے۔ اگر آپ کبھی ان کے گھر جائیں تو ڈرائینگ روم کے ایک کونے میں رکھے ہوئے سوٹ کیس پر ان کے یادگار
سفر کا ٹیگ ضرور لگا ہوا ہوگا۔ جسے انھوں نے بے خیالی میں لگا رہنے دیا ہے۔

اس کے بعد دوران سفر کئی بھیانک واقعات میرے پڑوس میں رونما ہوئے جن کی تفصیلات سے میں
آپ کو بور نہیں کروں گا۔ مثلاً ہوسٹیس کا منہ بنا کے "ویج اور نان ویج" پوچھنا اور موٹو کا پہلے "ویج" کہہ دینا اور پھر
بوکھلا کے نان مس نان کی گردان کرنا۔ ہوسٹیس کا کنفیوز ہونا۔ موٹے کا وضاحت کرنا۔ "نان ویج میڈیم" پھر پلاسٹک
کے نازک چمچے کو توڑ دینا۔ اپنی مرغی کے ٹکڑے کو میری جیب میں گرا دینا۔ پھر موٹے منہ میں بھرے ہوئے نوالے کے
ساتھ میری طرف کھسیانی مسکراہٹ پھینک کے میرے ڈنر کا ناس مارنا وغیرہ وغیرہ۔

میرے لیے ادھر اُدھر کی باتیں سوچ کر اپنا دل لگانا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی نوٹ بُک نکال کر یہ لکھنا شروع کر دیا کہ مجھے کل اور پرسوں فرصت ملنے پر کیا کیا کرنا ہے۔ اس کے لیے وہ خریدنا ہے اس کے لیے یہ خریدنا ہے۔ اور شعیب صاحب سے ضرور ملنا ہے۔ سُنا ہے انھوں نے سارے کلبوں سے ناتا توڑ لیا ہے۔ شکار کے سارے ہتھیار توڑ دیتے ہیں۔ اپنا کیمرہ کسی کو دے دیا ہے۔ کیونکہ انھیں اچانک احساس ہو گیا ہے کہ تصویر کشی گناہ ہے بہرحال وہ ایک نہایت اچھے بچے ہو گئے ہیں پڑوسی بھی بے حد خوش ہیں کہ اُنھوں نے اپنا مخصوص گیت جو وہ باواز بلند اپنی بھدّی آواز میں کئی سال سے گا کر ان کی نیند خراب کر رہے تھے۔ اب اچانک بند کر دیا ہے۔ اور اب وہ اپنی مشہور ڈینگیں بھی نہیں مارتے ہیں جن سے میں نہایت مرعوب رہا کرتا تھا۔

"شعیب"۔ رویندر ناتھ جی نے کہا "سُنئے۔ ذرا وہ پینٹنگ تو اِدھر رکھ دینا۔ میں ذرا اسے مکمل کر لوں"۔ ا
آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ شعیب صاحب اپنے بچپن میں رابندر ناتھ ٹیگور سے اپنے تعلقات کا ذکر کر رہے ہیں۔

ڈاڑھی والے صاحب پھر ادھر اُدھر کے ہوا کی لہر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے اب بھی اُن کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ انھوں نے اب ایک دوپلّی اوڑھ رکھی تھی۔ ان کے کاندھوں کے خم کو دیکھ کے پھر ایکبار مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کیسے؟ وہ بیٹھ گئے اور میں سوچتا رہ گیا میں نے دل ہی دل میں اپنے لیے دوستوں، رشتہ داروں اور شناساؤں کی فہرست مرتب کرنی شروع کی جن کے ہاں ڈاڑھیاں تھیں۔

"اسمٰعیل صاحب" لیکن ان کی ڈاڑھی تو سرسید قسم کی ہے۔ کافی گھیر دار اور پھر وہ اتنے ڈھیلے ڈھالے کہاں ہیں شروانیاں، مگر وہ تو بش شرٹ پہنتے ہیں اور گنجے سر پر جہاں جہاں ممکن ہو لمبے بال پالنے کے شوقین ہیں۔ مولوی ارشاد؟۔ ان کی ڈاڑھی چُگی ہے۔ کافی متمول ہیں اور صرف وہی ایک ایسے ہیں جو اپنے بَل بُوتے پہ ــــ بقول عبدالغفور ــ "بائی ایئر" آنے جانے کے حقدار ہیں لیکن۔ ہوائی سفر سے ڈرتے ہیں۔

تو پھر یہ میاں کون ہیں جن کے سر کا پچھلا حصّہ اور جُھکے ہوئے کندھے میری یادداشت میں ٹھونگیں مارتے ہیں۔ کبھی کبھی کچھ چہرے یادداشت کی کال کوٹھری کے اندھیرے کونوں میں دبک جاتے ہیں اور روشنی میں آنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ اُلجھن بڑی جان لیوا ہوتی ہے۔ میرے ساتھ یہ اکثر ہوتا ہے۔

"اوہو ــ ارے کہاں ہو بھئی۔ نظر ہی نہیں آتے؟ ایک صاحب نہایت گرمجوشی سے بھرے بازار میں بیٹھ پہ ہاتھ مار کے کہتے ہیں اور مجھے مطلق یاد نہیں آتا کہ میرا یہ بے تکلف دوست کون ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے ذہن کے اسکرین پہ ایک مبہم مبہم سی یاد وضاحت اختیار کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہتی ہے۔ اور اس ڈر سے کہ کہیں یہ بے چارے بھانپ نہ جائیں کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ کون ہیں بڑی اداکاری کرنی پڑتی ہے، بغیر نام لیے بے تکلفی کا جواب بے تکلفی سے دیتے رہنا پڑتا ہے۔ اور اسی دوران ذہن کی گٹھری کو کھول کے اس میں گڈ مڈ کباڑ سے سامنے والے کا نام ٹٹولتے رہنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس جدوجہد میں سر میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ کچھ ایسی ہی بے چینی اب بھی شروع ہو گئی تھی ذہن بار بار اسی طرف چلا جاتا تھا جہاں دوپلّی اوڑھے ہوئے صاحب بیٹھے ہوئے تھے جنھوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر رکھا تھا۔ اس اُلجھن کا ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اپنے برابر والی کرسی میں دھنسی ہوئی شخصیت کو بھول گیا تھا۔

لیکن اس کا ایک وحشت ناک خراٹا مجھے حقیقتوں کی دنیا میں کھینچ لایا۔" آشا ہے کہ آپ کی یاترا شُکھد رہی ہوگی؟"

پی اے سسٹم پر آنے والی بے چہرہ آواز نے اکتائے ہوئے انداز میں مجھ سے کہا۔ اور یہ آشا مجھے بڑی اشتعال انگیز معلوم ہوئی۔ کیونکہ کسی ایسے شخص کی یاترا کے سُکھد رہنے کی آشا کرنا تو زخم پہ نمک ہی چھڑکنا ہوا جب کہ ادھیڑ عمر گھنٹہ کے لیے گوشت کا نامعقول پہاڑ لاد دیا گیا ہو۔ بہرحال میں اپنے بچے کھچے جسم کو لیکر ان لوگوں میں شامل ہوگیا جو اس بے تحاشہ انداز میں X/T کی طرف چل رہے تھے، جیسے انھیں پلین کے ہائی جیک ہوجانے کا خطرہ ہو۔ پھر جب اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ دوپٹی والے صاحب غائب تھے اور لگتا تھا جیسے انھیں باہر نکلنے کی جلدی سب سے زیادہ تھی۔ موٹے نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح اسے اوورٹیک کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

بیگیج کو کلیم (CLAIM) کرنے والے پرجوش یاتریوں سے الگ تھوڑی دیر ٹھیرے رہنے ہی میں خیریت ہوتی ہے۔ کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کے قریب کھڑے ہوئے کوئی صاحب دور سے کنویئر بیلٹ پر پڑے ہوئے اپنے سوٹ کیس کو کشاں کشاں اپنی طرف بڑھتا دیکھتے ہیں۔ تو ان کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکلتی ہے۔ اور آپ پہ کچھ اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے بلی چوہے پر اور اس پرجوش اقدام کے دوران کبھی کبھار آپ کے زخمی ہوجانے کا امکان بھی ہوتا ہے۔

سامان کے آنے میں دیر سے اکتا کر میں بھی دوسروں کی طرح اُونگھنے لگا تھا کہ گڑبڑ کی وجہ سے آنکھ کھل گئی ایک طرف بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے اور پولیس والے انھیں پیچھے ہٹانے میں مصروف تھے۔

" ڈرگس کا ایک اسمگلر پکڑا گیا ہے"۔ ایک صاحب نے مجھ پر ترس کھا کے اطلاع دی۔

" اچھا " ؟ میں اب ایک دم چاق و چوبند ہوگیا تھا۔ وردیوں کے گھیرے میں مجھے وہ صاحب نظر آئے۔ جن کی دوپٹی ذرا سی ہٹ گئی تھی، اور اب ان کا چہرہ میری طرف تھا۔ مجھے دیکھ کے ان کی آنکھیں ایک لمحہ کے لیے کانپیں پھر انھوں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

میں گم صم سا کھڑا رہ گیا۔

" منا۔ ذرا وہ میری پینٹنگ تو ادھر رکھ دینا"۔

OO

سلطان جمہوری (بنگلور)

تلاشِ نوکری

بڑھتا ہوا سیاسی شعور غلاموں کی تعداد کو کم کرتا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی سائنس ٹکنالوجی مشترکہ خاندان منتشر کرتی جا رہی ہے۔ عورتیں مردوں کے کام کرنے لگی ہیں۔ گھر کی روایتی شکل بدلتی جا رہی ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے میاں بیوی میں جو بے کیفی پیدا ہوتی جا رہی ہے وہ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے فالِ نیک ہے۔ شاہینِ سیاست کی عقابی نظروں نے اس میں افادیت کا پہلو ڈھونڈھ نکالا ہے اور خادماؤں کی فلاحی انجمن بنا ڈالی ہے جہاں ٹریڈ یونین کے سائے میں غلاموں پہ شہنشہی کے راز کھولے جاتے ہیں اور خود آگہی کے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔

مگر اس سے مالکن اور نوکرانی میں کچھ زیادہ ہی تلخی بڑھ گئی ہے، اور سعدیؒ و سقراط جیسی قسمت والے مالکوں پر تو قیامتِ صغریٰ ہی ٹوٹ پڑی ہے کیوں کہ مستقل خانہ جنگی میں ایک فُل ٹائم نوکرانی اکثر و بیشتر میاں بیوی کے درمیان بفر اسٹیٹ یا نومین لائنس سے کم اہم ثابت نہیں ہوتی۔ بسا اوقات تو اُسے ثالث کے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں۔

کم و بیش کچھ ایسا ہی معاملہ میرے نئے باس کے ساتھ تھا جو میری ہی طرح تبادلے پہ تبادلہ کے شکار تھے مختلف مقام سے ٹرانسفر ہو کر وہ یہاں آئے تھے اور میں بھی ایک جگہ سے تبادلہ ہو کر اُن کے ماتحت کی صورت آیا تھا۔ ان کا حال مجھے معلوم نہیں مگر میں اب تک سیٹل نہیں ہو پایا تھا کیونکہ قابلِ اطمینان نوکرانی نہیں ملی تھی۔

میں جو بھی نوکرانی لاتا اس میں دو چار دنوں کے اندر ہی خامیاں نکال لی جاتیں اور وہ ہٹا دی جاتی۔ یا ایسا ہوتا کہ خود نوکرانی ہی مالکن میں بخالت اور کڑواہٹ کے ہزار کیڑے نکال کر چلی جاتی۔

دوسری نوکرانی کے ملنے تک گھر تو کجا دفتر بھی اپنی پناہ دینے والی صفت سے محروم دکھائی دیتا۔ اور میں زرنجم ہو کے ذریعہ نوکرانی کی تلاش میں دفتر سے نکل جاتا۔ جان پہچان والوں سے مزید شناسائی پیدا کرتا۔ ناراض دوستوں سے تجدید دوستی کرتا۔ قریبی احباب کی نوکرانیوں سے دوسری نوکرانیوں کے پتے لیتا۔ نئے نئے دوست پیدا کرتا اور اپنے کینٹین سے سستے داموں پر کاسمیٹک مہیا کر کے اُنھیں نوکرانیوں کی تلاش پر مامور کر دیتا۔ اس طرح صرف پچاس دنوں کے قیام میں سترہ نوکرانیاں بدلنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔

نوکرانیوں کا جغرافیہ اور چوپدی پر ایسا درک ہو گیا تھا کہ دفتر والے مجھے خادماؤں کا انسائیکلو پیڈیا کہنے لگے تھے۔ شہر کی کون سی نوکرانی کہاں کام کرتی ہے۔ کس طرح کرتی ہے، کہاں کہاں کر چکی ہے۔ اس کی طبیعت

عصمت اور فطرت کیسی ہے، حسب نسب کیا ہے۔ سنی ہے یا شیعی۔ جوان ہے یا بڈھی۔ تنہا ہے یا شوہر بچے والی
الغرض اُن کا فل بائیوڈاٹا مجھے ازبر ہو گیا تھا۔

مگر ہر نئے ٹرانسفر پر بعض دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا جن میں سب سے بڑی دقت زبان کی ہوتی۔ یہ مسئلہ بھی نوکرانیوں ہی کے ذریعہ حل ہو جاتا۔ پہلے پہل ہم اشاروں کنایوں کی وہی زبان استعمال کرتے جس کو قدیم بے زبان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ دو چار توڑ پھوڑ، لغزشوں اور کوتاہیوں کے بعد ایسی کام چلاؤ زبان ہمیں اور نوکرانیوں کو آجاتی جسے رابطہ کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس زبان کی ترقی کا راز مسلسل غلام و آقا کے موجود ہونے میں مضمر ہے۔ مگر صبر و ضبط نام کی چیز ہمارے گھر میں نہیں، اسی لیے مجھے نوکرانیوں کی تلاش میں مصروف رہنا

مگر ادھر جب سے خادماؤں کی فلاحی انجمن قائم ہوئی تھی، میری تلاش کی نوعیت بدل چکی تھی، انجمن کی انچارج خاتون کے نزدیک بہت بدنام ہو گیا تھا کہ میں ہر دوسرے تیسرے روز نوکرانی بدل دیتا ہوں۔ اسی کے پیش نظر انجمن کے قانون میں کچھ ترمیمیں کی گئیں جس کا سب سے اہم کلاز یہ تھا کہ مالکوں کی بابت نوکرانیوں کی بیان کردہ کنفیڈینشیل رپورٹ پر ہی نئی نوکرانی کی منظوری دی جائے۔

لامحالہ مجھے ایک پارٹ ٹائم نوکرانی سے جیسے تیسے کام چلانا پڑ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اُس کے غائب ہو جانے کی عادت کی وجہ سے مجھے بڑی پریشانی ہوتی۔ اُسے ڈھونڈھ نکالنے میں وقت کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی میں اکثر دفتر سے غائب ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں سمجھا کہ سبھوں سے متعارف ہو رہے ہیں، مجھے بھی اسی لیے بلایا ہوگا۔ مگر مجھے دیکھتے ہی کہا۔ فضیحت کرنے سے پہلے میں نصیحت کرتا ہوں۔ آپ کا دفتر سے غائب ہو جانا مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے میں نے ڈرتے ڈرتے ماجرا بیان کیا تو ایک دم سے نرم پڑ گئے۔ کہا مجھے بھی جلد ہی ایک نوکرانی کی ضرورت پڑے گی۔ اس سلسلے میں آپ میری مدد کریں تو میری پریشانی دور ہو جائے گی۔ میں نے انجمن والی بات بتائی تو اُنھیں بڑا اچنبھا ہوا۔ کہنے لگے ایک ایک کر کے سب اپنی ٹولیاں بنا رہے ہیں، خیر! آپ ایک فارم میرے لیے لا دیں۔ میں بھر کر انجمن بھجوا دوں گا۔

دوسرے روز فارم لا کر دیا تو پڑھ کر بولے یہ فارم بھرنا ہے یا سات پشتوں کی روداد لکھنا ہے۔ نام، عمر، تعلیم، پیشہ تک تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ بیوی بچوں کی عمر، اُن کی تعداد، تعلیم اور مزاج اور گھریلو زبان کیا معنی؟ اور یہ کیا لکھا ہے، اس سے پہلے کتنی نوکرانیاں آپ کے یہاں کام کر چکی ہیں۔ انھوں نے آپ کو چھوڑا یا آپ نے اُن کو چھوڑ دیا؟ اسباب بتائیے۔

میں صاحب کو فارم بھرتا چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ مگر یہاں آ کر دیکھا کر اُترے ہوئے کپڑوں کا انبار جسے اب تک دُھل جانا چاہیے تھا، جوں کا توں پڑا ہے۔ برتنوں کا ڈھیر الگ اور فرش بھی گندہ ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ آج پھر غائب ہے۔ میں بے بسی سے فرش پر بیٹھ گیا۔ کل کیا پہن کر دفتر جاؤں گا۔ یہ کپڑے بھی جو پہن رکھے ہیں بار بار کی استری سے سرکس کے مسخروں کا لباس معلوم ہو رہے تھے۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ یکایک میں کھڑا ہو گیا۔ کپڑے اُتارے اور انڈر ویئر پہنے ہوئے تمام گندے کپڑوں کو لے کر باتھ روم میں گھس پڑا۔ الحذر از ہمت غیر الحذر۔ اس مصرعے سے ہمت جگاتا رہا اور کپڑے دھوتا رہا۔ مسلسل دو گھنٹے کی بیٹھک کے بعد اُٹھا تو ایک بالشت ہی اُٹھ سکا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں جلدی سے

بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ یوں ہی دو تین کوششوں کے بعد اُٹھنے میں کامیاب تو ہو گیا مگر میں آداب عرض کی صورت کمان کی طرح خمیدہ تھا۔

دوسری صبح اُٹھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ تمام جوڑوں کے نٹ بولٹ بُری طرح کسے ہوئے ہیں۔ ہلنے کی تاب نہیں۔ ذرا سی حرکت پر چاروں طرف سے درد چیخ اُٹھتا۔ دفتر کہلا بھیجا کہ فلو ہو گیا ہے۔ تین دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد دفتر گیا تو دیکھا صاحب انٹرویو کے لیے انجمن جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ لے لیا۔

انجمن پہنچے تو ابتدائی کارروائی کے بعد انچارج خاتون نے صاحب کو اپنے کیبن میں طلب کیا۔ میں دروازے پر پڑے اسٹول پر بیٹھ گیا اور اُن کی گفتگو سننے لگا۔

میڈم نے مقامی زبان میں گفتگو شروع کی۔ صاحب نے کہا سارّی! میں یہ زبان نہیں جانتا۔ میڈم نے نصیحت کی کہ آپ کو یہ زبان سیکھنی چاہیے۔ مجھے دیکھیے میں یہاں کی نہیں ہوں مگر تمام صوبوں کی بولی تھوڑی بہت جانتی ہوں۔ صاحب نے میڈم کی زبان دانی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ خدا نے یہ وصف عورتوں اور لیڈروں کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد میڈم نے پھر سوال کیا۔ آپ نے گھریلو زبان کے کالم میں شدھ اردو لکھا ہے۔ یہ کونسی زبان ہے؟ صاحب نے کہا۔ یہ آسان ہندی کا دوسرا نام ہے۔ گھر میں ہم یہی بولتے ہیں۔ مگر ملازمہ جس زبان کی بھی ہو ہم کام چلا لیں گے۔ یہ زبان ہو تو اور بھی بہتر ہے کیوں کہ ایسی نوکرانی زیادہ دنوں ٹِک جاتی ہے۔

میڈم نے ذرا ترش لہجے میں کہا۔ دیکھیے صاحب! ہم ٹھوک بجا کر اپنی ملازماؤں کے لیے مالک مہیا کرتے ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ ملازمہ کا مالک کون ہوگا؟ صاحب نے کہا۔ مالک قطعی طور پر مالکن ہی ہوگی۔ رہا میرا سوال تو میں دفتر میں حکم چلا لیا کرتا ہوں!

میڈم نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ تب آپ مالکن ہی کو انٹرویو کے لیے بھیجیے۔ ہم اُن سے اگریمنٹ کر کے نوکرانی اُنھیں کو ہینڈ اوور کریں گے۔

صاحب ہکا بکا نکل آئے۔ تھوڑی دور تک خاموش رہے، پھر کہا۔ نوکرانی ملنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ آپ ایسا کریں کہ چند دنوں کے لیے اپنی نوکرانی مستعار دیدیں چاہے جس شرط پر بھی!

مجھے خاموش دیکھ کر انھوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ اب میرے کوئی نوکرانی نہیں۔ میں خود اپنا نوکر ہوں۔ صاحب نے حیرت سے تفصیل چاہی تو میں نے پوری بات بتاتے ہوئے کہا۔ انجمن سرور جیسی نوکرانی دے تو ہرگز قبول نہ کریں۔ وہ آپ کے گھر کو راس نہیں آسکتی۔ وہ کئی جگہ پارٹ ٹائم کرتی ہے۔ [illegible] کرنا اُس کا معمول ہے۔ پُرانی ساڑیاں، چپڑیاں، تیل صابن، چاول آٹا مانگتے رہنا دستور ہے۔ اس کے علاوہ اس کے دو بچے اور ایک شوہر بھی ہے جس کو شراب کی بُری عادت ہے اور نہ ملنے پر بیوی کو مارتا ہے۔ اُس سے بچنے کے لیے وہ جب تب بھی مالکن کے گھر پیسے مانگنے پہنچ جاتی ہے۔ اس پیسے کا تنخواہ کاٹنے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہم اُس کے اوور ڈرافٹ ڈیمانڈ کو پورا کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر پھر بھی وہ فرش کو اسکوائر فٹ کے حساب پونچھتی ہے۔ برتنوں اور کپڑوں کو گنتی کے حساب سے دھوتی ہے۔ رومال اور دستی کا بھی حساب

نہیں چھوڑتی۔

صاحب نے یہ سب سُن کر ایک لمبی سانس لی اور بوجھل انداز میں پوچھا۔ اب کیا کیا جائے؟ میں نے کہا۔ آپ بھی اپنی ذات میں نوکر تلاش کر لیجئے۔ دفتر کی ذہنی کاوش اور گھر کی جسمانی ورزش سے صحت بھی متوازن رہے گی۔ برتن مانجھنے اور جھاڑو لگانے میں کوئی خاص تکنیک کا استعمال بھی نہیں ہوتا۔ ہاں کپڑے دھونے کا کام ذرا ہوشیاری سے کریں۔ دستی، چڈی اور انڈر ویئر جیسے چھوٹے چھوٹے کپڑوں سے شروع کریں تاکہ جسم آہستہ آہستہ پانی سے ایسا آشنا ہو جائے کہ آپ لحاف کمبل وغیرہ بھی آسانی سے دھونے لگیں۔ ◦

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مئے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

△△

اسحٰق انصاری
(مالیگاؤں)

آج ہم اپنی بند مٹھی کھول دینا چاہتے ہیں تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں (بلکہ ہم خود بھی سمجھ سکیں) کہ آخر ہم کتنے پانی میں ہیں۔ مٹھی بھی کتنی عجیب چیز ہے! "ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ" کے مصداق نظر آتی ہے۔ نہایت معمولی اور حقیر سی۔ لیکن اس کوزے میں ایک سمندر نہیں سات سمندر ٹھاٹھیں مارتے نظر آتے ہیں۔ خود انسان ہی کو لیجئے۔ یہ بھی محض ایک مشتِ خاک یعنی ایک "مٹھی بھر مٹی" کا پتلا ہے۔ چاہے وہ پتلا دبلا ہو یا موٹا تازہ، ہے بہرحال ایک مٹھی مٹی ہی کی مورت۔ اس مورت پر جب اللہ تعالیٰ کو پیار آتا ہے (یعنی جب یہ اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے) تو یہ عالمِ وجود سے پردۂ غیب کی طرف مراجعت کرتی ہے اور سیدھی عدم آباد کو سدھارتی ہے۔ اس وقت بھی اسے "مٹھی بھر مٹی" ہی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن صاحب، اس ایک "مٹھی مٹی" نے بھی دنیا کے سامنے کیا کیا کمالات پیش کئے ہیں کہ اُن کے پیشِ نظر شاعرِ مشرق محوِ حیرت ہو کر اپنی آنکھوں اور لبوں کا تال میل کھو بیٹھے اور اُن کے منہ سے نکلا بھی تو یہ نکلا کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اور آخر دنیا "کیا" سے "کیا" ہو گئی اور مزید "کیا سے کیا" ہونے کے [illegible] پر تو لے جا رہی ہے۔ (آپ کتنے ہی محوِ حیرت رہوں اُس کی بلا سے)۔ اسی ایک مشتِ خاک کی تعریف میں شاعر نے اس طرح کا اظہارِ خیال بھی تو کیا ہے ؎

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

ہماری اس مٹھی کا کیا کہنا! اس میں سمانے والی چنے کی مقدار ہم ایسے غریبوں کیلئے جینے کا سہارا بنتی ہے۔ اگر کسی گداگر کو اسی مقدار کا اناج ہر گھر سے حاصل ہو جائے تو وہ ایک ایسے گودام کا مالک بن سکتا ہے جہاں سے سستے داموں اناج حاصل کر کے ریلیف کمیٹیاں خشک سالی (یہ کوئی رشتہ نہیں) کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ریلیف کمیٹیوں کا تذکرہ

کیا تو یاد آیا کہ ہمارے ایک دوست بھی ریلیف کمیٹیوں کے شیدائی ہیں۔ بلکہ ریلیف کمیٹی سے اس حد تک عشق فرماتے ہیں کہ باقاعدہ ایک ریلیف کمیٹی کے از اوّل تا آخر (بلا شرکتِ غیرے) سب کچھ ہیں۔ چنانچہ غریبوں، مسکینوں میں ریلیف بانٹنے کے لئے ہر طرح کا چندہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور جب خطیر رقم کی یافت ہوجاتی ہے تو شاہراہوں پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں کرکے غریبوں، مسکینوں کی غیرت کو للکارتے ہیں کہ آئیے اور طویل قطار میں کھڑے رہ کر سستے داموں ریلیف کی روٹیاں اور سالن حاصل کیجئے۔ مستحقین تک ان کا حصّہ اس طرح پہنچانے کے بعد حساب کتاب برابر کرنے سے قبل وہ یہ ضرور دیکھ لیتے ہیں کہ اُن کا حقِ محنت (یعنی محنتانہ) وصول ہوا یا نہیں ؟ ظاہر ہے یہ حق اُن تمام مستحقین کے منجملہ حق سے بڑا ہی ہوتا ہے کیونکہ ہمارے یہ دوست سب سے "بڑے مستحق" ہیں — اور کیوں نہ ہوں اُن کی مٹھی جو سب سے بڑی ٹھہری !

آج کل مٹھی کو گرم رکھنے کا رواج عام ہوگیا ہے۔ کیوں کہ جب مٹھی گرم کی جاتی ہے تو بہت سے مشکل کام آسان اور ناممکن باتیں ممکن ہوجاتی ہیں۔ یہ مٹھی ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ جس طرح سب کے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے۔ ویسے بھی مٹھی اور پیٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مٹھی بھر چنا ہو یا مٹھی بھر خاک، پھانکے جانے پر پیٹ ہی میں پہنچتی ہے۔ لیکن پیٹ پاپی کہلاتا ہے جب کہ مٹھی گرم ہونے کا پاپ کرکے بھی باعزت رہتی ہے۔ باوقار انداز میں کام کرتی اور کرواتی ہے۔ اب تو معمولی معمولی کاموں میں بھی مٹھی اور پیٹ کا ساتھ اپنا ہنر بتانے لگا ہے۔ ہر کام میں مٹھی کا درجۂ حرارت ناپنا ضروری ہوگیا ہے۔ یہ درجۂ حرارت جتنا زیادہ ہوگا کام اُتنا ہی آسان اور اچھا ہوگا۔ گویا گُر کی بات یہ ہے کہ مٹھی کا درجۂ حرارت کام کی آسانی اور عمدگی سے راست تناسب رکھتا ہے۔

اس "شریفانہ عمل" کی رسائی دیکھئے کہاں سے کہاں تک ہے اور اس کے "عمل دخل" سے ہر اُلجھے کام کو سلجھانے کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اِس ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک چور نے اپنے وکیل سے کہا "وکیل صاحب، اب تک تمام بحثوں اور آپ کی جرح سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جج صاحب اپنا فیصلہ مُرتب کرکے آئندہ پیشی پر سُنادیں گے۔ اور وہ فیصلہ یقیناً ہمارے خلاف ہوگا۔" وکیل نے کہا "آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اگلی پیشی کو ابھی دو دن باقی ہیں۔ کوئی نہ کوئی نکتہ میں نکال ہی لوں گا۔ اور آپ باعزّت بری ہوجائیں گے" — اگلی پیشی کے موقع پر جج نے وکیل سے کہا "کہئے آپ کو اپنے موکل کی صفائی میں مزید کچھ کہنا ہے ؟" وکیل نے کہا "یور آنر ! میں اس قسم کے کیس کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ میرا موکل بالکل بے قصور ہے۔ یہ مثال میں اپنی بحث کی آخری دلیل کے طور پر پیش کررہا ہوں" یہ کہہ کر وکیل نے قانون کی ایک کتاب جج کے حوالے کی اور کہا "حضور، اس کتاب کے باب ۶ میں صفحہ ۳۵ پر آپ خود ملاحظہ فرمالیں۔ جج نے کتاب مذکورہ صفحے پر کھولی۔ اُس میں بغور کچھ پڑھنا شروع کیا اور تھوڑی دیر بعد کہا "ہاں، آپ کی یہ دلیل تو کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس ایک دلیل سے کام نہیں چلے گا۔ دو چار دلیلیں اور درکار ہیں" آپ جانتے ہیں اُس کتاب کے مذکورہ صفحے پر کیا دلیل تھی ؟ سَو سَو کے پانچ نوٹ !

اس طرح مٹھی گرم کرنے اور کروانے میں کبھی کبھی خطرات کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ یعنی انسدادِ رشوت ستانی

کا مکہ حرکت میں آجاتا ہے اور بند مٹھی کو کھلوا کر خود مٹھی والے کو بند کرنے کے درپے ہوجاتا ہے۔ تاہم اس مرحلے میں بھی بوکھلائے بغیر آدمی ہوش وحواس برقرار رکھے تو "رسیدہ بود بلائے" آخر کو "ولے بخیر گذشت" ہوجاتی ہے بہت آسان نسخہ ہے اس کا۔ ہمارے ایک انتہائی دانشور شاعر (جو دلاور بھی تھا) نے کہا ہے " لیکے رشوت پھنس گیا ہے، دیکے رشوت چھوٹ جا۔" (آخر یہاں بھی بےچارہ شاعر ہی کام آیا!) یعنی ہر مرض کی دوا ہے مٹھی کو گرم کرنا (یا "مٹھی کو گرم رکھنا")۔

آج کل مٹھی کا جادو ساری دنیا میں سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جہاں کسی کی مرضی کے خلاف آپ کچھ بولے اور اس کی مٹھی بھنچ گئی۔ اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہوا میں لہراتی ہوئی یہ مٹھی آپ کے رخساروں کا چٹا چٹ بوسہ لینے لگتی ہے۔ اب اگر آپ کو اپنی عافیت پیاری ہے تو اُف نہ کریں اور خاموشی سے اپنی راہ لیں ورنہ طاقتور مٹھی کی حمایت میں اور بہت ساری کمزور مٹھیاں بھی حرکت میں آجائیں گی۔ کیونکہ زبردست کا ٹھینگا سر پر ہوتا ہے۔ اور یاد رکھئے کا ٹھینگا تو مٹھی کا محض ایک حصہ ہی ہوتا ہے۔

ایک اور بات یاد رکھنے کی ہے کہ طاقتور لوگ محض مٹھی بھر ہوتے ہیں۔ اور یہ مٹھی بھر لوگ باقی تمام لوگوں پر حکومت کرنے، اُن پر ظلم وستم روا رکھنے اور انھیں پریشان کرنے کا آفاقی لائیسنس رکھتے ہیں۔ یہ مٹھی بھر انسان تفریح طبع کے طور پر فسادات اور دہشت گردی کی بےشمار کارگذاریوں میں مصروف رہتے ہیں اور بڑی بڑی حکومتیں ان مٹھی بھر شرپسندوں اور دہشت گردوں کے آگے بھیگی بلی کا کردار نبھانے پر مامور (یا مجبور) ہوتی ہیں۔ اور یہ کردار وہ بڑی کامیابی سے نبھاتی بھی ہیں۔ خود ہماری حکومت میرٹھ اور ملیانہ سے لے کر پنجاب تک اسی کردار کو نبھارہی ہے۔ حالات نے ہمارے وزیراعظم پر دوہری ذمہ داری ڈال رکھی ہے۔ اور وہ اسے نہایت کامیابی سے نباہ رہے ہیں، یعنی انھیں ڈبل رول ادا کرنے میں مہارت حاصل ہے۔ یعنی، جہاں وہ میرٹھ، ملیانہ اور پنجاب میں اول الذکر رول ادا کررہے ہیں، وہیں سری لنکا میں اپنا پُرامن ٹھینگا وہاں کی سرکار کے سر پر رکھنے میں انتہائی کامیاب رہے ہیں۔ اس کردار کو نبھانے میں انھوں نے خود اپنے سر پر آجانے والے خطرے کو بھی خاطر میں لانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

بات طول پکڑ رہی ہے اس لئے آخری بار آپ کو آگاہ کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ ہمیشہ مٹھی بھر لوگوں سے ڈرتے رہیئے۔ یہ مٹھی بھر لوگ اپنی تقدیر میں تخت یا تختہ لکھا کر آتے ہیں۔ جو تختہ لے کر آتے ہیں وہ یا تو "آدم آ" پڑھاتے ہیں یا "جا بیٹا جا نہیں نہ ڈرا" کا ورد کرتے ہیں۔ ہر دو صورت میں یہ لوگ آپ کے کسی کام کے نہیں۔ آپ ان لوگوں سے دور ہی رہیئے۔ ہاں جو اپنی قسمت میں تخت لے کر آتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے سے کمزوروں پر اپنی مٹھی بھینچنے، ہوا میں لہرانے اور کمزوروں کے گالوں کو اپنی آہنی مٹھی سے سہلانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ آپ کو ان سے دور رہنے کی زحمت اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ خود ہی آپ کو دور کردیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب کچھ ناعاقبت اندیش قسم کے خاک نشین زمانہ [illegible]

اُس وقت یہ پیارے تخت نشین لوگ نہایت محبت، خلوص اور یگانگت کے جذبات کے تحت اُسے اپنی مٹھی میں پناہ دے دیتے ہیں۔

— —

ڈاکٹر رضیہ صدیقی (حیدرآباد)
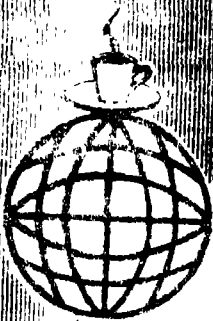
جوتے ہی جوتے

فی زمانہ لباس سے زیادہ جوتوں کو اہمیت حاصل ہے۔ میں نے کئی ایسے افراد کا جائزہ لیا ہے جن کی زندگی بالخصوص جوتوں سے جڑی ہوئی ہے بعض لوگ جوتوں کے فراق میں مبتلا ہیں۔ بعض جوتوں کے اس قدر شیدائی ہیں کہ ان کے ہاں ضرورت سے زیادہ اسٹاک موجود ہے۔ بعض صرف ایک جوڑ جوتے پر زندگی کے کئی سال گزار رہے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کو پہننے کے لیے جوتے نصیب نہیں لیکن ان کے جسم پر ضرور پڑتے ہیں۔

ایک صاحبہ کو میں نے دیکھا، جن کی عمر پچاس سال ہے، معلوم ہوا کہ پندرہ سال کی عمر کے بعد سے ان کا یہ چوتھا جوتا ہے جو استعمال کر رہی ہیں۔ ہر دس بارہ سال کے بعد یہ اپنا جوتا خرید پاتی ہیں۔

ایک صاحب کا جوتا کسی قدر خستہ حالت میں تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہوئے ساڑھے چار برس ہوئے ہیں اور وہ شادی کے بعد سے ابھی تک ایک ہی جوتے پر اکتفاء کئے ہوئے ہیں۔ جوتوں کی خستگی سے نہ صرف ان کے دوست شرمندہ تھے بلکہ ان صاحب کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنے جوتے ریل کے انجن میں کام کرنے والے کو بطور تحفہ دے دیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کو اکثر جوتوں کے دوکان پر دیکھا جا سکتا ہے جو ہر قسم کے جوتے منگوا کر ہاتھ میں لیتے ہیں اور پیروں میں ڈال کر پہننے کی حسرت بھی پوری کر لیتے ہیں اور پھر جوتوں کی ناپسندیدگی کے بہانے وہاں سے چل نکلتے ہیں۔

ایک صاحبہ جب سفر کے لیے نکلتیں یا مہمان جایا کرتیں تو ان کے ہمراہ تین چار جوڑ جوتے ضرور ہوتے تھے ایک کار چوبی سینڈل، جو پہن کر جاتیں، دوسرا وہ جوتا یا چپل ہوتا جو وہاں دن تمام پہن کر پھرتیں، تیسرا ہوائی چپل جو پہنچنے کے کچھ دیر بعد بیت الخلاء کی دہلیز کے قریب رکھ دیا جاتا۔ دوسری صبح موصوفہ کے پلنگ کے پائنتی، سلیپر ضرور نظر آتے جو رات کے کسی بھی وقت ان کے پیروں کو بیت الخلاء تک لے جانے میں مددگار ثابت ہوتے ہوں گے۔

ایک دعوت میں جانے کا اتفاق ہوا۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے جا رہے تھے، ہماری نظر اس گھر کی معمر بزرگ صاحبہ پر پڑی جو بیت الخلاء سے نکل رہی تھیں، جن کے پیر جوتے، چپل یا کھڑاؤں سے بے نیاز تھے

[illegible] ان کے علم اور تمدن [illegible]
[illegible] تہذیب ہے

ایک بر سر روزگار محترمہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ جوتا خریدنا چاہتی تھیں لیکن بڑھتی ہوئی گرانی کے سبب انھیں کئی سال سے جوتا خریدنے کا موقع نہیں ملا۔ کہنے لگیں کہ ماں باپ نے پہننے کے لیے جہیز میں جوتوں کے چار جوڑے دیے تھے سو وہ ابھی تک چل رہے ہیں۔ شومیٔ قسمت کہ ان کے شوہر محترم جاہل مطلق ہیں لہٰذا ان کی اور ان کے خاندان والوں کی طرف سے اس بیچاری پہ جوتے پڑتے ہی رہتے ہیں، پہننے کو نہیں ملتے۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہیں لیکن اپنی کمائی کے جوتے ابھی تک ان کے پیروں کو نصیب نہیں ہوتے۔

ایک ملنسار دوشیزہ کو میں نے دیکھا کہ جس کے پاس رنگ برنگی ساڑیاں موجود ہیں اور ہر رنگ سے میل کھاتی جوتی بھی اس کے ہاں موجود ہے، حتیٰ کہ ساڑیوں کی تعداد سے کہیں زیادہ جوتوں کی تعداد ہوگئی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے اس نے جو کچھ اپنے جہیز کے لیے جمع کیا ہے وہ صرف جوتے ہیں جو نہ صرف آئندہ اس کے کام آئیں گے بلکہ یہ جوتے اس کے شوہر کو وقت ضرورت بآسانی میسر ہوں گے!

ایک صاحب کے نئے جوتے مسجد میں کھو گئے۔ انھیں اس کا اس قدر صدمہ ہوا کہ پھر دوبارہ خریدنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اگر وہ ہمت کر بھی لیں تو اتنی رقم کہاں کہ انھیں جوتے نصیب ہوں، اس لیے اب وہ یہی تنبیہ کرتے ہیں کہ

"اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار ؛ ایک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت"

ہر جمعہ کو یا خصوصاً عید الفطر اور بقرعید کے دن ہزارہا مسلمان مرد بوڑھے، جوان اور بچے رنگ برنگی یا سفید یا صاف ستھری معطر پوشاک میں تیز تیز مسجد کی طرف قدم بڑھاتے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے پیر مصلحتاً پرانی چپل یا ہوائی چپل سے مزین ہوتے ہیں۔ موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ مصلحت جائز بھی معلوم ہوتی ہے، ورنہ نئے چپل سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور پھر خدا کے گھر سے اپنے گھر تک گویا تعظیماً برہنہ پا آنا پڑتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو مسجد سے ٹوپی کو جیب میں چھپا کر آتے میں عار محسوس نہیں کرتے مگر جوتے چوری ہو جانے پر ننگے پیر واپس ہونے کے لیے جھجک محسوس کرتے ہیں اور اس خفت کو مٹانے کے لیے وہ دوسروں کے چپلوں میں اپنے پیر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ جوتے چھوڑ کر خطبہ میں "اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" سے متعلق زکوٰۃ پر وعظ سنتے ہیں لیکن واپسی میں اپنے جوتے گم ہونے پر ان کا ذہن "اِس پاؤں دے اُس پاؤں لے" کے مصداق کام کرنے لگتا ہے۔

طلباء امتحان ہال میں جوتوں میں تحریر چھپا کر لاتے ہیں جس کا علم فلائنگ اسکواڈ (FLYING SQUAD) کو ہوتا ہے۔ فلائنگ اسکواڈ معتبر اشخاص پر مشتمل ہوتا ہے جن کی نظر سب سے پہلے نہ صرف طلباء کے جوتوں پہ پڑتی ہے بلکہ انھیں پیروں سے جدا بھی کروانا پڑتا ہے۔ بعض اوقات جوتوں کو ہاتھ میں لیے اس کے تہہ خانوں کا جائزہ بھی لینا پڑتا ہے۔ گویا یہ طالب علم علم سے دماغ کو آراستہ کرنے کے بجائے جوتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔

بہر کیف جوتے ہماری زندگی کا ایک جز بن گئے ہیں۔ ہماری عزت کا دارومدار جوتوں پر ہی ہے۔ شادی کے رسوم کی ابتداء اسی نام سے کی جاتی ہے یعنی "پاؤں میز کی رسم" ناپ کے لیے دلہن کا ایک جوڑ جوتا یا صرف ایک جوتا یا چپل دلہا کے گھر بھجوایا جاتا ہے۔ اس طرح دلہا اپنی دلہن کی صورت دیکھنے سے کئی روز قبل دلہن کی جوتیوں کا نظارہ کر لیتا ہے۔

افگار انصاری
رانچی - بہار

خوشامد

جس طرح جھوٹ بولنا ایک فن ہے اور سفید جھوٹ بولنا کلاسیکل آرٹ ہے، چوری کرنا فن ہے اور چوری کرکے سینہ زوری پر اترنا جدید آرٹ ہے، گواہی دینا ایک فن ہے اور سراسر جھوٹی گواہی دینا عمدہ بازی گری ہے، اسی طرح خوشامد کرنا بھی ایک فن ہے اور زندگی بھر خوشامد کئے جانا سیاست کی معراج ہے۔ خوشامد کے فن میں بڑی مہارت اور چابکدستی کی ضرورت ہوتی ہے ذراسی غلطی سے بنا بنایا کام خاک میں مل سکتا ہے اور میاں کی جوتی میاں کے سر پر پڑ سکتی ہے۔ اس فن میں آج کل بڑی ترقی ہوگئی ہے اس لئے بہت سے بے کار حضرات اس فن کو اپنا کر اپنا پیٹ پالنے لگے ہیں۔ پیٹ بھی بڑی ظالم شئے ہے۔ اس کو بھرنے کے لئے نت نئے طریقے اپنانے پر اہل دانش سوچ و فکر میں غلطاں ہیں مگر کوئی حل انہیں دستیاب نہیں۔ بہر حال !!

خوشامد کے بہتیرے طریقے ہیں جسے اپنا کر خوشامدی اپنا کام نکالتا ہے۔ خوشامد کا ایک [illegible]

سوچ سمجھ کر سلام داغتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ذراسی غلطی سے برسوں کی ریاضت پر پانی پھر سکتا ہے۔ اور اپنا بنا بنایا کام بگڑ سکتا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غلط سلام داغنے سے نوکری پر بھی آنچ آجاتی ہے۔ وقار مجروح ہوجاتا ہے اور بہت سی نئی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

خوشامد کا دوسرا طریقہ ربط ضبط، میل ملاپ بڑھاکر جھوٹی تعریف کرنا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان زبان پر قدرت رکھتا ہو اچھے برے پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہو۔ محاورے اور فقرے جاندار ہوں۔ مبالغہ آمیزی میں امتیازی شان جھلکتی ہو۔

خوشامد کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی کا چھوٹا کام خوشی خوشی انجام دے دیا جائے۔ آج کل بے کاری کی زیادتی کی وجہ سے دفتروں میں یہ دیکھا گیا کہ نوکری کی آس میں لو لگانے والے [illegible]

ہیں. اس کام میں بازار سے سبزی لانا، بچوں کو
اسکول پہونچانا اور اسکول کے بعد ان کو گھر پہونچانا
بیگم کی مارکٹنگ کی فرمائش پوری کرنا شامل ہے۔

خوشامد کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ گفتگو میں تلخی
کم رکھ دی جائے اور خوشامدی ہاں میں ہاں ملا کر محض
چرب زبانی سے اپنا بڑے سے بڑا کام نکال لے۔ اگلے
وقتوں میں نوابوں اور جاگیرداروں کے یہاں خاص طور
پر ایسے افراد کی مانگ ہوتی تھی۔ آج کل سیاست کے
ایوانوں میں ایسے لوگوں کا گذر ہے۔

ان چار طریقوں کے علاوہ بھی نت نئے
اندازسے خوشامد کی جاسکتی ہے۔ یہ خوشامدی کی
ذہانت پر ممکن ہے۔ وہ موقع اور مصلحت دیکھ کر
خوشامد کا ایک نیا طریقہ نکالتا ہے۔ میرے ایک
کرم فرما حضرت بدھو لال ہیں۔ بچپن میں ان کی ذہانت
دیکھ کر محلے کے بزرگوں نے ان کا پکارو نام بدھوا
رکھ دیا تھا مگر یہ حضرت جیسے جیسے اپنے سن شعور
کو پہونچتے گئے، ان کے چھپے ہوئے جوہر نمایاں ہونے
لگے۔ اب تو بچپن کے اسی بدھوا کا یہ حال ہے کہ اپنی
چرب زبانی، مصلحت اندیشی، دروغ بیانی کی بدولت
ہر میدان میں وہ اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں اور جلنے
والے ان سے جلتے ہیں مگر بدھو لال بھائی خوشامد
کی بدولت ایک ماہر کنٹراکٹر ہوگئے ہیں۔ اس کے
علاوہ ایک ڈی لکس کوچ، تین اسکوٹر، سات رکشے
اور پانچ ٹھیلے کے مالک بن بیٹھے ہیں۔

بچپن کے ایک دوست مرزا ماجے ہیں۔ ان کا
قد غیر معمولی حد تک چھوٹا ہے۔ اس لئے لوگ دیکھتے ہی
ان کو مرزا ناٹے کہہ کر پکارنے لگتے ہیں۔ مرزا کا لباس
وضع قطع بھی کچھ نرالا ہے۔ ہر وقت صدری کے علاوہ
اصلی گاندھی نما ٹوپی اپنے سر پر چپکائے رہتے ہیں
مسکرا کر لوگوں سے باتیں کرتے ہیں۔ میں نے ایک دن
ان سے رازدارانہ انداز میں دریافت کیا۔ بھئی مرزا
آج کل بی۔ اے، ایم۔ اے پاس تو جوتیاں چٹخاتے
پھرتے ہیں۔ تمہارے مال روٹی کا انتظام کس طرح
ہوتا ہے۔ مرزا ہنس کر کہنے لگے۔ بھئی خدا کا
شکر ہے خوشامد کے بل بوتے پر اپنا گذارہ
ہو رہا ہے۔ اس وسیع اور رنگین دنیا میں
خدا نے ایسے بے وقوف انسان بھی پیدا کئے
ہیں جو صرف خوشامد کی باتیں سن کر خوش ہوتے
ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر آدمی ان کی خوشامد
میں لگا رہے۔ لہذا میں نے ایسے کئی آدمیوں
کا انتخاب کرلیا ہے جن کی مرضی کے مطابق میں
دن کو رات کہتا ہوں۔ کالے معشوق کو پری زاد سے
تشبیہ دیتا ہوں۔ ان کے جاہل گنوار بیٹے کو عالم فاضل
بتاتا ہوں۔ ان کی کالی بھدی بھینس جیسی موٹی بیوی
کو پرستان کی حور کہتا ہوں۔

اگر غور سے اس کائنات کا مطالعہ کیا جائے
تو پتہ چلے گا کہ ہر طرف خوشامد کا بول بالا ہے۔
سورج کے گرد زمین گردش کرتی ہے اور اس خوشامد
کے ذریعہ سورج کو خوش رکھتی ہے۔ چاند زمین کے
گرد گردش کرتا ہے اور زمین کو خوش کرنے میں
ہر وقت چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے
سیارے ایک دوسرے کے گرد چکر کاٹ کر اپنی بقا کو
قائم رکھنے میں مصروف ہیں۔

اس روئے زمین پر ہر شعبے میں خوشامد
کا دخل ہو چکا ہے۔ باپ بیٹے کی خوشامد کرتا
ہے کہ کسی طرح بڑھاپا گذر جائے۔ عاشق معشوق
ایک دوسرے کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں۔
میاں بیوی موقع مصلحت دیکھ کر ایک دوسرے

...شامد اور چاپلوسی کرتے ہیں۔ حاکم محکوم میں
...امد ہی کے ذریعے رشتہ استوار ہوتا ہے۔
...د اور طالب علم میں اب علم سیکھنے اور ماحاصل
...ت کی بنیاد پر رشتہ نہیں رہا ہے بلکہ استاد
طالب علم ... کی اس لئے قدر کرتا ہے کہ کہیں
...محفل میں طالب علم اس کی پگڑی نہ اچھال دے
طالب علم استاد کی اس لئے خوشامد کرتا ہے کہ
...ت میں نمبر مل جائیں۔ وکیل اور موکل بھی ایک دوسرے کی
خوشامد میں لگے ہوئے رہتے ہیں۔ غرض کہ خوشامد کا
کاروبار پھلنے پھولنے لگا ہے۔

میرے محلے کے کلو صاحب خوشامد کے فن
...طاق ہیں۔ ابھی ان کی عمر پچاس سے کچھ اوپر
...ہے۔ پھر بھی وہ چار پوتیوں، تین نواسیوں
...بھتیجوں اور تین لڑکوں کی شادی بہ خیر و خوبی انجام
...چکے ہیں۔ وہ قرض مانگنے کی کلا سے بخوبی واقف
...۔ خوشامد کے ذریعہ وہ قرض دینے والوں کے
...سن کا تذکرہ مرچ مصالحہ لگا کر اس انداز میں
...کرتے ہیں کہ قرض دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اگر
...نے کلو صاحب کو اس وقت قرض سے نہ نوازا تو
...ے ہاتھ سے دین اور دنیا دونوں چھوٹ جائیں گی
...لے کر کلو صاحب اس طرح غائب ہوتے ہیں جیسے
...ھے کے سر سے سینگ۔ قرض لینا وہ جانتے ہیں
قرض ادا کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ اگر کسی
...مانس نے ان کو قرض کی ادائیگی کے لئے ٹوکا بھی
...کلو صاحب اس پر بالکل خفا نہ ہوں گے بلکہ اس
...سخاوت، مہربانی اور کرم فرمائی، نیز غریب پروری
...ذکر اس انداز سے چھیڑیں گے کہ قرض دینے والا
...سان اپنے گریبان میں منہ چھپا لیتا ہے اور پھر
...کلو صاحب کو قرض کی یاد دہانی کرانا بھی اپنی
...ان کے خلاف سمجھتا ہے۔

خوشامد کے بہتیرے فوائد ہیں۔ اسکول،
کالج، یونیورسٹی، دفتر، کارخانہ، کاروبار میں
خوشامد کے ذریعے اچھا سے اچھا کارنامہ انجام
دیا جا سکتا ہے۔ خوشامدیوں نے اپنا رنگ
روپ چولا بدل لیا ہے۔ اس لئے یہ تمیز کرنا
مشکل ہو گیا ہے کہ کون کس کی خوشامد کر رہا ہے
بہرحال خوشامد کا کاروبار اب تو زوروں پر
چل رہا ہے۔ کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہے۔
اسی لئے نظیر اکبر آبادی نے کہا ہے ؎
سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا راضی ہے

غزل

محمد حفیظ الدین فردوس
(کورٹلہ)

گوشہ نشین ہو گئے اصلی پہلوان
دنگل میں آج نقلی پہلوان رہ گئے

شادی جب ان کی ہو گئی میرے رقیب سے
پینڈنگ میں سارے دو شو ارمان رہ گئے

تنگ آ کر میزبان ہی گھر سے نکل گئے
اب سارے گھر میں دیکھئے مہمان رہ گئے

پیتل کا جو جہیز تھا وہ سارا بک گیا
سٹور کے اور لوہے کے سامان رہ گئے
چاندی کے چند سکوں کی خاطر تو دیکھئے
کچھ لوگ اپنا بیچ کے ایمان رہ گئے

یوسف یکتا
حیدرآباد

"پرہیز نہیں کرتے دوا کھاتے ہیں"

بچے ہوں بڑے ہوں کبھی ڈر جاتے ہیں — ماموں جو لڑھکتے ہوئے گھر آتے ہیں
سمجھے تھے محافظ جسے قاتل نکلا — اب کہیئے جناب آپ کیا فرماتے ہیں
پھرتے ہیں مزہ کرتے ہیں غنڈے سارے — معصوم ہیں جو لوگ سزا پاتے ہیں
لاحول پڑھو ایسے پدر پہ یارو — لونڈوں کی کمائی پہ جو اِتراتے ہیں
چیریں گے اندھیروں کا وہ سینہ کیسے — جو چاندنی راتوں میں بھی ڈر جاتے ہیں

"کیا خاک تمہیں فائدہ ہوگا یکتا
پرہیز نہیں کرتے دوا کھاتے ہیں"

جگ موہن پرشاد مکیش
نظام آباد

غزل

یارو نصیب بھی تو دلندر ملے ہمیں — گوہر ملے ہیں اوروں کو کنکر ملے ہمیں
اُس نے بڑھایا ہاتھ تو پتّہ ترنگ تھا — اپنے ہی تھے نصیب کے جوکر ملے ہمیں
دھوکے میں گُل بدن کے ملا ہم سے ایک بُت — پھولوں کی جستجو میں تھے پتھر ملے ہمیں
سلتے تھے کوٹ یار بڑی خار زار ہے — سیکل پہ تھے سوار تو پنکچر ملے ہمیں
دو سو روپے کرایہ میں یہ ٹھاٹ باٹ ہے — ٹپکے ہی ٹپکے جس میں ہیں چھپّر ملے ہمیں
تن ڈھانکنے کو اُس سے اگر مانگتے تو کیا — بشرٹ ہم نے مانگے تھے جمپر ملے ہمیں

کس دل سے دوستوں کا کریں ذکر اے مکیش
گھوڑوں کے رنگ روپ میں خچّر ملے ہمیں

سراج نرملی

پی کر شراب مستی میں وہ چُور ہو گئے
فکریں، مصیبتیں و اَلم دُور ہو گئے

میک اپ[1] سے پہلے، لگتے تھے وہ بھوت کی طرح
میک اپ کے بعد اب وہ فقط حُور ہو گئے

رُسوا نہ ہوتے، رکھتے جو "مخصوص" فاصلہ
اتنے ہوئے قریب کہ ہم دُور ہو گئے

رمی[2] میں، رم[3] میں، ریس[4] میں دولت ہوا ہوئی
کل تک جو "لاکھیر"[5] تھے وہ اب پُوئر[6] ہو گئے

دیوان ہاتھ لگ گئے "اہلِ قبور" کے
تھوڑا سا چینج[7] کر کے وہ مشہور ہو گئے

حاتم کے ڈپلیکیٹ[8] تھے کل تک تو وہ سراج
اب پائی پائی کو بھی وہ مجبور ہو گئے

۱- MAKE UP ۲- RUMMY
۳- RUM ۴- RACE ۵- LAKHIER
۶- POOR ۷- CHANGE
۸- DUPLICATE

سید عباس متقی (حیدرآباد)

"گدھے"

بچپن سے آج تک یہ لفظ ہمارے نام کے ساتھ منسلک ہے۔ بچپن میں ماں باپ بطور گالی استعمال کرتے تھے اب ہمارے حریف بطور لقب کے استعمال کرتے ہیں اور ہم رہ رہ کر سوچتے ہیں کہ کہیں زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو والی بات نہ ہو۔ بعض وقت تو ہم اس قدر دلگیر ہو جاتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ یہی تخلص فرمالیں مگر شعرا برادری کا لحاظ رکھنا ہی پڑھتا ہے ہم ان کے حقوق کیسے چھین سکتے ہیں: تاہم ہمیں اس جانور میں بظاہر کوئی ایسا عیب تو قطعاً نظر نہیں آتا کہ بے وجہ بے قصور کو احمق تصور کریں۔ کیا احمق کہلانے کے لیے انسانوں کی کمی ہے جو بے چارے جانور پر یہ ظلم ہونے لگے۔ ہم نے بعض گدھوں کو تو ایسے کام کرتے دیکھا ہے کہ ہر اس شخص کو جو اپنی تصنع آمیز متانت و سنجیدگی میں درجہ کمال پر پہنچ گیا ہو اسے ایسے ہی مبارک نام سے یاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔

لوگ گدھے کو لاکھ بُرا کہیں مگر ہم کبھی اسے بُرا نہیں کہیں گے، اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم میں اور اس بیچارے میں کوئی واقعی نوعیت کا رشتہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بے چارا بے وجہ بدنام ہے، گن تو دیکھیے کہ مزاج میں کچھ ایسی قناعت ہے کہ پُرانی ردّی پھٹے ٹاٹ کے ٹکڑوں، بوسیدہ بودیوں پر بھی گزارا کر لیتا ہے، چارے کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہم اسے چارا کھلا سکتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جس کو بے چارا کر دیں اس کی ہستی مشکوک ہو جائے ویسے ہم اپنے دوستوں کو بے چارے ہی کہتے ہیں، وہ ہمیں کیا کہتے ہیں فی الحال اسے مخفی رکھا جاتا ہے کیونکہ اپنی عزت سب کو پیاری ہے۔ گدھے کو سونے کے لیے کھاٹ چاہیے نہ تھان اس قدر معصوم و قناعت پسند ہے کہ کچرے کی کنڈی کے کنارے تین ٹانگ پر کھڑے کھڑے سو جاتا ہے۔

متانت کا یہ عالم ہے کہ مزاج کے گدگدانے تک صدائے دل پسند بلند نہیں کرتا۔ جب موڈ کافی بنتا ہے اور تنوع بام عروج پر پہنچتا ہے تب دوسروں کو اطلاع ہوتی ہے کہ قرب و جوار میں میاں گدھے بھی موجود ہیں۔ ہم نے گدھا جیسا شریف النفس جانور کہیں نہیں دیکھا۔ بچے بچے سواری کر لیتے ہیں لیکن کیا مجال جو پچھاڑ مارے۔ ہماری طرح بے گانۂ دُنیا واقع ہوا ہے جس طرح ہم گھر کے ہیں نہ سسرال کے یہ بیچارا بھی گھر کا ہے نہ گھاٹ گدھوں کی گزر ہی جاتی ہے کس طرح گزرتی ہے یہ گدھے ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ مزید براں اس قدر بھولا واقع ہوا ہے کہ اپنی دُم کی تک خبر نہیں رکھتا، بچے اطمینان سے اس کی دُم کو پٹاخوں کی لڑی باندھ کر شعلہ دکھا دیتے

ہیں۔ جب پہلا پٹاخہ چھوٹتا ہے تو ہوش میں آتا ہے اور ماحول سے خبردار ہو کر جدھر سینگ سمائے بھاگتا ہے تاکہ جلد از جلد پٹاخوں کے غول سے نجات مل سکے۔ اس کی بے ساختہ دوڑ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ زخمی ہو جاتے ہیں، بازاروں میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے۔ لوگ جدھر کے اُدھر سہم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بھاگتے گدھے کے لیے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ بھاگتا گدھا ٹریفک کے اصول کا پابند نہیں ہوتا۔ بڑے لوگوں کی طرح رانگ سائڈ مارتا ہے، جب تک پٹاخے ختم نہیں ہو جاتے گدھا گھوڑے کی رفتار سے بھاگتا رہتا ہے، جب پٹاخے ختم ہو جاتے ہیں تو تھک ہار کر کسی گلی کے چوبچے کے قریب پھر تین پاؤں پر کھڑے ہو کر کیل کیل کے رینکتا ہے تاکہ ڈر نکل جائے وہ سمجھتا ہے کہ شیطان نے اسے ستایا ہے، اس نے صحیح سمجھا ہے یا غلط اس کا فیصلہ ہم دوسروں پر چھوڑتے ہیں۔

بعض گالیاں تہذیبی ماحول میں ادبی قرار دی گئی ہیں جیسے بے وقوف، نالائق، بدتمیز، الّو، چغد، ابلیس، احمق وغیرہ لیکن جو بات گدھے میں ہے وہ دوسری گالیوں میں کہاں، گدھا کہتے ہیں یہ ساری گالیاں خود اس ایک گالی میں جمع ہو جاتی ہیں جیسے عطر مجموعہ میں ہر اقسام کے عطریات جمع ہو جائیں یا دلوائی ہنڈی میں ہمہ اقسام کی ترکاریاں۔

گدھے کے بچے نہایت خوبصورت اور بھولے لگتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ جوشِ محبت میں انسانوں کے بچوں کو گدھے کی اولاد کہنے لگیں۔ یہ حق تو صرف ہم اساتذہ کا ہے کہ ہر بچے کا سلسلہ نسب ہم گدھے سے جوڑ دیتے ہیں اور اسے انسان بنانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں جب وہ بڑا ہو کر مدرسہ سے وداع ہوتا ہے تو لوگ اس سے سوال کرتے ہیں کہ کس گدھے نے تجھے یہ تعلیم دی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر والدین اور اساتذہ دونوں ہی گدھے ہیں تو آخر وہ کیا ہے اور اس طرح اسے اپنے بارے میں حق الیقین ہو جاتا ہے۔

گدھے کی لمبی رینک کو محض "ڈھینچو" سے تعبیر کرنا اس کی تان کی شان کے خلاف ہے۔ کیا عمدگی سے سر کھینچتا ہے کہ کلیجہ پھٹ پڑے پھر سر کھینچ کر آواز میں جو زیر و بم پیدا کرتا ہے وہ کیفیت تو بس سننے سے تعلق رکھتی ہے پھر آخر میں ہلکی ہلکی سیٹیاں تو غضب ہی ڈھاتی ہیں۔ آدمی سر دھننے پر ہی اکتفا نہیں کرتا سر پھوڑ لینا بھی چاہتا ہے۔

ڈرامہ

جلیل بایزید پوری

(بمبئی)

بیوی کو بیوی بنائیے

[منظر :- ڈاکٹر عزیز خاں اسٹڈی روم میں ایک کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا ہے ۔ شاہدہ (عزیز خاں کی بیوی) جلدی جلدی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہی ہے (چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز) پس منظر سے پڑوس کے ایک بچے کی آواز آرہی ہے، وہ کہہ رہا ہے (پپا میلی ممی کہاں چلی گئیں)]

ڈاکٹر عزیز خاں :- (کھانستے ہوئے) ڈارلنگ ! آپ کی چوڑیاں بار بار کھنک کیوں رہی ہیں۔ اس کی کھنک جب میری روح کی دیواروں سے ٹکراتی ہے تو میں ایک قسم کی دھمکی محسوس کرتا ہوں۔ پڑوس کے بچے کی آواز آپ نے نہیں سنی، وہ کہہ رہا تھا پپا میلی ممی کہاں چلی گئیں، جب تمہارا لالا اسکول سے واپس آئے گا تو اسے میں کیا جواب دوں گا۔
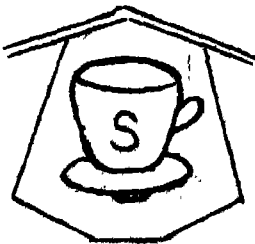
شاہدہ :- (سسکیاں بھرتے ہوئے) آپ جسے دھمکی سمجھ رہے ہیں وہ دھمکی نہیں عورت کی مجبوری ہے اور شاید آپ کی اکتاہٹ کا علاج بھی ہے، رنکو جب پڑھ کر واپس آئے تو آپ کے جی میں جو آئے کہہ دیجئے گا، میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں، آپ کا دل دل ہے اور میرا دل تو بھاجی مولی ہے جسے جب چاہے کاٹ دیجئے۔

ڈاکٹر عزیز :- ڈارلنگ ! کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم تو میرے جسم کا ایک حصہ ہو اور ایک حصہ کبھی دوسرے سے الگ نہیں ہوتا ہے، تم بات بہت جلد اپنے دل پر لے لیتی ہو جبکہ تمہارے دل پر صرف تمہارا ہی حق نہیں ہے۔ میری غیر موجودگی میں اپنے کسی کونے کھدرے میں تم میری آہٹ ضرور محسوس کرتی ہوگی، شوہر ہوں نا۔

شاہدہ :- بہت خوب ! اسی لئے آپ نے میرے ماما جیل کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا، آپ کا یہ جملہ

کیا اب جوتا بنانے والوں کے لئے بھی ناشتہ لاؤں؟
آج بھی میرے سر پہ گھڑوں پانی ڈال رہا ہے۔
آپ کیا جانیں وہ موچی میرا ماما ہے۔ امی کا دودھ بھائی۔ خیر میں جا رہی ہوں واپس اس وقت آؤنگی
جب آپ میرے دل کو لوہے کی بنی ہوئی زنجیر سمجھنا چھوڑ دیں گے۔

ڈاکٹر۔ کیا کہا، لوہے کی بنی ہوئی زنجیر۔ باتیں جو میرے منہ سے نکل گئیں اُسے تم اُڑتی ہوئی تتلی سمجھ کر بار بار پکڑنے پر تُلی ہوئی ہو، غلطی میں نے کی اور سزا رینکو کو دینا چاہتی ہو۔ پہلے بھی اور موقع پر بھی جاسکتی ہو۔ خواہ مخواہ میرے خلاف شکایت کی گٹھری بغل میں دبا کر آج ہی کیوں جانا چاہتی ہو۔

شاہدہ۔ میں بغل میں گٹھری نہیں ہاتھ میں بکس لے کر جا رہی ہوں ڈاکٹر صاحب۔ اکیلے میں خوب حقہ پیجئے، حقہ کے ساتھ ساتھ ایک دوا بھی دے کر جا رہی ہوں، تنہائی کی جدائی کی ایک ایسی کڑوی دوا جسے ہم دونوں ساتھ ساتھ پئیں گے تو زندگی کا مزہ آجائے گا۔ دل کی دنیا سے تھوڑے سے ہی جا رہی ہوں، آپ اپنا خیال رکھئے گا۔

ڈاکٹر عزیز۔ کڑوی دوا دے کر خیال کی بات کر رہی ہیں آپ۔ چلو اسی بہانے اپنی غلطیوں کو کپڑے کی مانند کھنگالنے کی نوبت تو آگئی ہے۔ ویسے تم بھی اپنا خیال رکھو گی، By the way تم یہاں سے کیسے جاؤ گی، بس سے یا گھوڑا گاڑی سے۔

شاہدہ۔ دو قدم پہ میکہ ہے، سسرال سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے میں آپ کے گھر کی بیوی کے بجائے مُرغی بن کر رہ گئی ہوں اور گھر کی مرغی دال کے برابر ہوتی ہے۔

عزیز خاں۔ (قہقہہ بکھیرتے ہوئے) بیوی مرغی دال بڑا اچھا عنوان ہے کسی افسانے یا ڈرامے کا۔
God bless you اپنے آپ کو تم مرغی سمجھو یا دال لیکن میں اس وقت تک نامکمل ہوں جب تک تم میں نہیں بن جاتیں، روٹھو ضرور روٹھو، روٹھو گی نہیں تو پیار کی دھیمی دھیمی آنچ کا ذائقہ میں کیسے چکھوں گا، مگر خدا کے لئے شکایت کی گیندیں میرے خلاف نہ اچھالو ورنہ میرے دل میں اکیلے پن کی اُچھالیں اور زیادہ چھوٹیں گی

شاہدہ۔ اب کچھ بھی کہہ لے، میری قسمت ہی کیوں نہ پھوٹ جائے میں کچھ دنوں کے لئے میکے جا کر رہوں گی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، پھر بس یا گھوڑا گاڑی نہیں ملے گی۔ رینکو جب اسکول سے واپس آئے آپ سنبھال لیجئے گا۔

(دوسرا منظر)

(ڈاکٹر عزیز خاں اسٹڈی روم میں بیٹھ کر کچھ سوچ رہا ہے۔ اتنے میں (عزیز خاں کا بیٹا) رینکو دوڑتا ہوا آتا ہے (رینکو کے آنے کی چاپ) وہ باپ سے آکر لپٹ جاتا ہے۔)

رینکو۔ ڈیڈی۔ ڈیڈی!

عزیز خاں۔ آج تمہاری ممی نہیں ہے۔

رینکو۔ کیا وہ بازار گئی ہیں۔

عزیز خاں۔ نہیں بیٹے وہ بازار نہیں گئی ہے، گھر گرہستی کے بازار سے بیزار ہو کر میکے چلی گئی ہے تمہارے نانا نانی کے گھر۔ چاول اور آلو کی بھاجی کھاؤ گے، بتاؤ بیٹے میں ہوں نا۔

رینکو: ڈیڈی! آپ کو میری ممی کی یاد آرہی تھی؟ میرے آنے سے پہلے سر جھکائے آپ کچھ سوچ رہے تھے۔

عزیز خاں: بہت شریر ہوگیا ہے، پڑھتا لکھتا کچھ بھی نہیں ہے اور بوڑھوں جیسی باتیں کرتا ہے۔

(تیسرا منظر)

(عزیز خاں رینکو کو پڑھا رہا ہے)

عزیز خاں: پڑھو Out' But' Put.

رینکو: ڈیڈی Pronunciation عجیب سا ہے اب آپ ہی بتائیے نا But ہے تو Put ہے ایسا کیوں؟

ڈاکٹر عزیز: یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ (دروازے پر دستک ہوتی ہے)

مشرا جی: ارے کوئی ہے، اتنی دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں کوئی سنتا ہی نہیں، سنی ان سنی کر دیتے ہیں۔ ہاں بھئی دور ہی کچھ ایسا ہے کم بخت ڈاکٹر سوچتا ہوگا مشرا جی کو ٹال دو، ایک کپ چائے ٹل جائے گی۔

رینکو: انکل آپ ناراض کیوں ہو رہے ہیں، میں پاپا سے پڑھ رہا تھا اور پاپا مجھے پڑھا رہے تھے، پڑھنے اور پڑھانے کے چکر میں آپ کی آواز یہاں تک نہیں پہونچی، ہاں باہر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں شائد اُن ہی کے ساتھ (زور سے ہنستا ہے)

مشرا جی: چُپ باپ سے مذاق کرتا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر کا بھی باپ ہے اور ہاں ڈاکٹر تم مجھ سے کنّی کیوں کترا رہے تھے، کیا تمہاری ایک کپ چائے پر بھی میرا نام نہیں ہے۔ چھ مہینوں کے بعد آپ کی صورت دیکھ پایا ہوں اور آپ منہ لٹکائے بیٹھے ہیں، بھابی کہاں ہیں۔

عزیز خاں: مشرا جی آپ Psychology میں بی۔اے آنرز ہیں مگر ہیں کورے، Psychology ایک Latin word ہے Psyche+logus جس کا مطلب ہوتا ہے The talk of the mind and soul۔ بھابی آپ کی نہیں ہیں یہاں، وہ میکے گئی ہیں، اُن کا روحانی علاج چل رہا ہے اور آپ اوٹ پٹانگ بکے جا رہے ہیں اور ہاں میری صورت میں آپ کو کوئی خاص بات نظر آئی ہے کیا

مشرا جی: بھاڑ میں جائے تمہاری صورت اور تم، بھابی کو ہوا کیا کوئی بیماری؟

عزیز خاں: انھیں بوریت کی بیماری ہوگئی ہے جس طرح آپ کو بکنے کا عارضہ ہے، جب بیوی سسرال سے بور ہوتی ہے تو میکے جاتی ہے اور میکے سے جب اکتا جاتی ہے تو سسرال چلی آتی ہے، یہ کون سی نئی بات ہے، عورتوں کے چوچلے ہیں جسے تم جیسا بے وقوف اور کنوارا نہیں سمجھے گا۔

مشرا جی: میں تمہاری نس نس کو سمجھتا ہوں، میری بھابی کو تم نے ضرور باتوں کی سوئیاں چبھوئی ہوں گی، اب کیا خاک چائے ملے گی کھانا تو دور کی بات ہے

ڈاکٹر عزیز: مشرا جی آپ ایسا کیجئے، اپنی طرف سے پیار کے چند بول اپنی بھابی کے پاس لے جائیے شائد اُن کی روح میں وہ بول اُتر جائیں۔

مشرا جی: تاکہ آپ کے گھر گرہستی کی گاڑی جو پٹری سے اتر گئی ہے لائن پر آجائے، ٹھیک ہے بھئی، چلتا ہوں۔

(چوتھا منظر)

(شاہدہ کی ماں باورچی خانے میں کچھ پکا رہی ہے، اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے)

شاہدہ: ماں! دروازہ کھولو میں کتنی دیر سے چلّا رہی ہوں جب کنواری تھی تو میں پہاڑ بن کر تمہارے سر پر کھڑی تھی، کیا اب بھی پہاڑ سمجھ رہی ہو۔

ماں: پورے محلے کو سر پر اٹھا رہی ہو تمہاری آواز ابھی ابھی تو میرے کانوں میں شیشے کی طرح پگھلی ہے اچانک کیسے آنا ہوا۔

شاہدہ: میں شیشہ ہوں بیٹی ہوں نا، بیٹا ہوتی تو ہیرا ہوتی، کیوں میں اچانک میکے نہیں آسکتی کیا۔

ماں: اسی لئے میں نے کہا کہ تمہاری آواز آواز نہیں سیسہ ہے، وہ بھی پگھلا ہوا سیسہ، شوہر سے لڑ کر آئی ہو اور بخار مجھ پر اُتار رہی ہو بُری بات ہے۔ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے۔ عقل کے ناخن لو اب تم بچی نہیں رہیں۔

شاہدہ: آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ سارا قصور میرا ہے بس مرغی کی ایک ہی ٹانگ۔ جب دیکھو وہ ایک بات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا تو کوئی ان سے سیکھے، اسی کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنے آپ کو ماسٹر اینڈ جانسن سمجھتے ہیں لیکن یہ بات اُن کے دماغ میں کبھی نہیں آئی کہ بیوی سے ہار کر بیوی کو جیت جائیں۔ بیوی اسی وقت بیوی ہے جب شوہر بیوی کو بیوی سمجھے۔

ماں: (کھانستے ہوئے) اور بیوی شوہر کو شوہر کہاں سمجھتی ہے اور سمجھے بھی کیوں، آج وقت بدل چکا ہے۔ آج شوہر، شوہر ہے کہاں، وہ تو گائے ہے بیل ہے، مشین ہے، کار ہے۔

شاہدہ: ماں میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میں کامیاب بیوی ہوں اور ہماری زندگی میں خوشبوئیں بھی بکھر رہی ہیں لیکن کبھی کبھی وہ میری مجبوریوں کو نخرے سمجھتے ہیں۔ اب میں انھیں کیسے سمجھاؤں کہ میں نخرے نہیں کرتی۔

ماں: کچھ بھی ہو کامیاب شوہر کا خواب دیکھنے سے قبل ہر طرح سے کامیاب بیوی بن جاؤ، اُن کے سر سے پاؤں تک تڑپ بن جاؤ۔ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بجتی ہیں، تم دونوں تو پڑھے لکھے ہو، آج کی بیویوں اور شوہروں میں وہ بات کہاں جو رُوح چھوئے جبکہ دونوں ایک دوسرے کی روح کا ایک حصہ ہونے کا ناٹک کرتے ہیں۔

شاہدہ: ہاں ماں آج سب کچھ ناٹک ہے، شوہر کے لئے بیوی چند مہینوں کی کشش کا سامان ہے پھر بیوی مذاق بن جاتی ہے۔

(پانچواں منظر)

(شاہدہ باورچی خانے کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہی ہے، شاہدہ کی ماں برتن مانجھ رہی ہے)

ماں: صبح صبح اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ اخبار بعد میں پڑھ لیتی، کہیں نوکری کر لیتی تو جی بھی بہل جاتا اور دو پیسے بُرے وقت میں کام بھی آجاتے۔

شاہدہ: نوکری کروں گی تو رہا سہا پیار تکرار بن جائے گا دیکھا ماں، میں نہ کہتی تھی کہ سگریٹ بھی انسان کے لئے موت کی دستک ہے۔ اس اخبار میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ سگریٹ پینے سے آدمی کو کینسر ہو سکتا ہے اور تمہارے داماد راجہ تو حُقّے کے رسیا ہیں

اور آج کل تو سارا کمرہ دھواں ہی دھواں بن کر رہ گیا ہوگا۔

ماں : ارے بیٹی، حقہ سگریٹ کیا یہ سب دل بہلانے کے انداز ہیں جنہیں سوکھی روٹیاں بھی نہیں ملتی ہیں وہ بیچارے کیا جانیں حقہ کیا ہے، سگریٹ کیا ہے

(اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے)

مشراجی : بھابی! میں تمہارا پیارا دیور، آپ کو ڈسٹرب کرنے آگیا ہوں۔ کہیئے کیسی ہیں آپ؟

شاہدہ : مشراجی آپ کے ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں، میں تو میکے میں ہوں اور میکے سے تو جانوروں کو بھی پیار ہوتا ہے۔

مشراجی : بھابی آپ ایسا کیجئے ڈاکٹر صاحب میں آپ اپنے ڈیڈی کو تلاش کرلیجئے، آپ دونوں کی چاہت گلاب کا پھول بن جائے گی۔

شاہدہ : ڈاکٹر صاحب سے پیار کرنے والے آپ جیسے دوست جو ہیں۔ میرے لئے اُن کے پاس وقت کہاں ہے اور جہاں تک سکون کا سوال ہے وہ تو ان ہی کا دیا ہوا ہے۔

ماں : تم دونوں کی آپسی جھڑپیں بے چینی کی ہلکی ہلکی بوندیں ہیں۔ یہ بوندیں ایک دن سمندر بن جائیں گی بس ایک دوسرے کو سمجھو۔

مشراجی : ماں جی! آپ کی یہ باتیں آج کی بیٹیوں کے لئے Psychological Knots ہیں جنہیں نوٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ شادی ایک آتمک بندھن ہے بھابی آپ دونوں ایک دوسرے کو Ideal بنالیجئے تھوڑی بہت کمی بیشی کی پرواہ نہ کیجئے، سمجھوتہ کرلیجئے، اتنا تو میں بھی جانتا ہوں کہ اس دور میں ڈاکٹر صاحب کو آپ جیسی سیوا کرنے والی پتنی نہیں ملے گی۔

شاہدہ : مجھے مرغا مرغی کی طرح ہر وقت لڑتے رہنے میں دلچسپی نہیں، ویسے مشراجی یہ بتائیے کہ رینکو کیسا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے گھر میں آپ نے ناشتہ واشتہ کیا؟

مشراجی : دیواروں اور کھڑکیوں کو آپ گھر سمجھتی ہیں۔ رینکو اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چولہا چوکا بھی اُداس ہیں۔ بہت مشکل سے ڈاکٹر صاحب نے ایک کپ چائے پلائی تھی۔

شاہدہ : مشراجی آپ کو ایک مزیدار بات سناتی ہوں اسے مزے دار بات بھی کہہ لیجئے اور مردوں کی نفسیات بھی۔ ایک بار میری انگلی ذرا سی کٹ گئی، وہ تڑپ اٹھے بہتے ہوئے خون کو چوس لیا، ڈانٹ بتائی جس میں اپنا پن کی چنگاری تھی "اپنا خیال رکھا کرو، کتنا خون بہہ گیا، جانتی ہو میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔"

مشراجی : گویا بھابی دھوپ ہے، سورج ڈوبا نہیں ہے۔ میرا اشارہ آپ دونوں کی اپنائیت کے سورج سے ہے، آپ دونوں کا پریم بیلی گھاس کبھی نہیں بننے گا، وہ کم بخت بھی آپ کے بغیر جی نہیں سکے گا۔

شاہدہ : کیوں مشراجی آج ڈاکٹر صاحب کے لئے بڑا بھائی پنا امڈ آیا ہے۔ کیا بات ہے اندر کی کوئی کیفیت ہے تو بتائیے۔ میں اُن سے کچھ نہیں کہوں گی۔

ماں : بیٹی تو بھی پاگلوں جیسی باتیں کررہی ہے شوہر

اور بیوی تو ایک دوسرے کی ضرورت ہیں، مشراجی
لینے آئے ہیں ۔
مشراجی ۔ ایسا کیجئے بھائی آپ شکر بن جائیے اور ڈاکٹر صاحب
کو دودھ بنائیے کا ذمہ میرا، بس ایک دوسرے
میں گھل مل جائیے ۔ زندگی ایک سوادلیشٹ بھوجن
بن جائے گی ۔ دونوں مزے لے کر زندگی کو کھاتے
رہیئے لیکن ڈر اس بات کا ہے کہ عورتیں ذرے
ذرے میں کچھ ، ذرے میں کچھ ہوتی رہتی ہیں، ہنس کر
بول دیجئے تو سارے شکوے بھول جاتی ہیں ۔
ماں : ذرا سا معاملہ برعکس ہوا تو پھٹ سے کچھ دیتی
ہیں آپ کے گھر میں کبھی سکھ ملا جو آج ملے گا
ہے نا مشراجی (زور سے ہنستے ہوئے) ۔
مشراجی ۔ ہاں جی آپ کو تو Psychology کا
پروفیسر ہونا چاہیئے تھا ۔
شاہدہ : میری امی تمہاری طرح بی اے آنرز ہیں نفسیات
میں ۔ پہلے افسانے بھی لکھتی تھیں مشراجی میں تو
صرف اتنا چاہتی ہوں کہ شوہر ہونے کا مطلب
یہ ہرگز نہیں کہ بیوی کو پچھاڑا جائے ۔
مشراجی : ڈاکٹر ڈاکٹر ہی نہیں خان بھی ہے وہ یہ نہیں
جانتا کہ بیوی کو جیتنے کا سب سے بڑا
Instrument یہ ہے کہ اس سے ہار
جایا جائے ۔
ماں : ویسے بھی آج کے شوہروں کو ہارنا چاہیئے
آج بیٹی کے والدین کے لئے جہیز سب سے بڑا
عذاب ہے اور سماج کے لئے گالی ہے ۔ باپ
دلالی کرتا ہے ، بیٹا بکتا ہے ۔ ظاہر ہے بیوی
شوہر کو غلام سمجھتی ہے ۔ ڈاکٹر کو کیا کمی تھی

میں نے بھی تو چالیس ہزار روپے نقد ڈاکٹر کو
دیئے ہیں ۔
مشراجی ۔ بھاؤ تاؤ کا زمانہ ہے ، جہیز میں ایک طرح کی
رشوت ہے ، ماں باپ اس لئے رشوت دیتے ہیں
کہ بیٹی زندگی بھر سکھی رہے ۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک
قسم کا سودا ہے ، بولی ہے ، جہاں زیادہ پیسے
ملے زبان سے بھی پھر جاتے ہیں ۔ اب جہیز کو کون
بُرا سمجھتا ہے جس طرح آفیسروں ، سیاسی رہنماؤں
سرکاری عملوں کے لئے رشوت پان کھانا دستوری
اور بخشش ہے اسی طرح شوہروں کے لئے یہ سسرالی
نذرانے ہیں ۔
شاہدہ : دنیا میں کوئی ایسا آلہ نہیں ہے جس سے یہ ناپا
جائے کہ شادی کے بعد آرام ہی آرام ہوگا ، آرام
نوٹ میں نہیں روح میں پوشیدہ ہے اور جہاں
شادی تجارت بن جاتی ہے وہاں روح کی کیا
ضرورت ہے ۔
مشراجی : سسرال والے بھول جاتے ہیں کہ بیٹی کا دوسرا
جنم اس کے پتی کے گھر میں ہوتا ہے ۔ ایک مدت
تو اُسے وہاں کے لوگوں کو سمجھنے میں لگ جاتی ہے
بے چاری نئی نویلی بیوی ایک
Psychological Story ہوتی ہے
گھر کا یا باہر کا ہر آدمی اسے پڑھتا ہے اس پر تنقید
کرتا ہے ۔ پگ پگ پر اُس کی پکڑ ہوتی ہے ۔
اس پر طعنہ کسا جاتا ہے ۔ Co-operation
ہو تو بیوی بہت جلد بیوی بن جاتی ہے خیر بھائی
میں آپ کو لینے آیا ہوں ۔
شاہدہ : مشراجی ! آپ اپنا کان میرے منہ کے قریب

لیجئے۔

مشراجی : اچھا یہ بات ہے۔

(چھٹا منظر)

(ڈاکٹر عزیز خاں کرسی پر بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھ رہا ہے۔ رینکو سبق یاد کر رہا ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ڈاکٹر : آیئے مشراجی آیئے۔ آخر آپ اپنی بھابی کو لے ہی آئے۔

مشراجی : آتے ہی Taunting کی برکھا شروع ہوگئی

رینکو : انکل انکل پپا چائے بناتے بناتے رو رہے تھے۔

مشراجی : تمہارے پپا مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہیں، بیوی گھر پر ہو تو کوڑی کا تین سمجھتے ہیں اور جب میکے میں ہو تو شوہروں کے بناؤٹی آنسو بہتے ہیں۔ بات یہ ہے بیٹا یہ آنسو نہیں شوہر کی مجبوری اور بے چارگی ہے۔ آج کے شوہر ہوتے ہیں نکمے۔ چالیس ہزار جہیز بھی لیتے ہیں اور ایک کپ چائے بنانے کے قابل بھی نہیں ہوتے ہیں حکومت کو چاہیئے کہ جہیز لینے والے شوہروں کے لئے یہ قانون بنائے کہ وہ چولہا چکی بھی سنبھالیں، بیوی کے ساتھ ساتھ۔

رینکو : ہاہا ہاہا۔

ڈاکٹر : چپ - یہ مشرا کا بچہ بک بک بہت کرتا ہے اس نے دیکھا کیا ہے۔ بعض گھروں میں تو میں نے جوتے چلتے ہوئے دیکھے ہیں، پلیٹیں ٹوٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور گالیاں چنگا ڈروں کی طرح اڑتی ہیں - رینکو کے بعد بشریٰ آجائے تو شائد تمہاری بھابی کا غصہ کم ہو۔

مشراجی : بیٹی کا بڑا شوق ہے، پیدا ہونے سے پہلے نام بھی رکھ لیا۔ خیر تمہیں ایک بیٹی کی اجازت دیتا ہوں۔ دو سے زیادہ نہیں ورنہ گھر مچھلی کی دکان بن کر رہ جائے گا۔

ڈاکٹر : مشراجی تمہارے جانے کے بعد ایک دوست مجھ سے ملنے آئے تھے بیگم کی خیریت جب مجھ سے پوچھی تو میرا جی چاہا کر اس کا منہ نوچ کر اس کی جیب میں رکھ دوں اور کہوں جاؤ ابھی جاؤ میں ایک کپ چائے بھی تمہیں نہیں پلاؤں گا، میرے لئے ایک کپ چائے کی تیاری بھی تمہاری بھابی کے بغیر جہاد سے کم نہیں

مشراجی : کیا کہا جہاد

ڈاکٹر : نہیں سمجھے crusade

مشراجی : اوہ! اب بھابی کو اتنا زیادہ feel کرنا لگے، چلو سدھر گئے بھابی کا بھی یہی حال ہوگا وہ بھی سہیلیوں کو یہی جواب دیتی ہوں گی کہ تم لوگ کون ہوتی ہو میرا حال پوچھنے والی ویسے ڈاکٹر آپ علاج بڑا اچھا کرتے ہیں جھنجھلاہٹ کو لگاؤ۔ میں بدلنے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے کچھ دن Cold War ہو زندگی اُدھار ہو۔

ڈاکٹر : تاکہ ندا فاضلی کے یہ اشعار پڑھوں۔

زندگی انتظار جیسی ہے
زندگی اُدھار جیسی ہے
ساری بستی مزار جیسی ہے
کوئی تنہائی نہیں اب تنہا
ہر خموشی پکار جیسی ہے

مشراجی: ساری بستی کو چھوڑو تمہارے دل کی بستی بھابی کے بغیر قبرستان ضرور بن گئی ہے۔ ویسے آپ اگر چاہتے ہیں کہ دونوں کے ہونٹوں پر پیار کے لال [illegible] تو بھابی کو اپنی مرضی پر گھر جانے دیجئے۔ ضرورت ہو تو مشورہ دیجئے جو عادت بھابی میں ڈالنا چاہتے ہیں پہلے خود Adopt کرو۔ ان کے رشتہ داروں کو اپنا سمجھو بلیا کو تو دلار آپ کرتے ہی ہیں۔

ڈاکٹر: ڈاکٹر میں ہوں اور کنوارا ہو کر بیوی کو نرم کرنے کے سارے گُر تم مجھے بتا رہے ہو جیسے میں بے وقوف ہوں، خیر اپنی بھابی کو کیوں نہیں لا سکے۔

مشراجی: بیوی کو میکے سے زیادہ پیار ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو، وہاں کی مٹی سے شریر جو بنا ہے۔ گھر میں آگ لگ جائے تو میکے کی ادنیٰ سی چیز بھی بچانے کی کوشش کرتی ہے اگر جل گئی تو دکھی ہو جاتی ہے۔ اور جب دل میں آگ لگ جائے تو کیا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر: اچھا بھئی تم بھی مجھے معاف کر دو اور بیوی سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ اب میں ذات پات کی بنیاد پر انسانیت کی عمارت کھڑا نہیں کروں گا کسی کو برادری کی ترازو میں نہیں تولوں گا، کوئی کمتر یا برتر پیدا ہو جنم تو پیدائش سے نہیں ہے۔ عمل انسان کو اونچا بناتا ہے۔ گھٹیا لوگ ذات پات برادری کا پیمانہ لئے پھرتے ہیں۔ پتہ نہیں میں کس موڈ میں تھا مجھ سے ممی ماما کے بارے میں کچھ گستاخی ضرور ہو گئی اور آج میں بیوی سے شرمندہ ہوں۔

شاہدہ: میں بھی شرمندہ ہوں۔ چائے اور سموسے حاضر ہیں آج میں بہت خوش ہوں۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہو گیا۔

ڈاکٹر: مگر میں حیران ہوں میری مونس و غم خوار بارش کے قطرے کی مانند آسمان کے بجائے باورچی خانے سے کیسے ٹپک پڑیں۔

Thank you misraji

شاہدہ: میں نے سوچا کہ آپ کو Surprize دوں۔ پچھلے دروازے سے باورچی خانے میں چلی آئی۔ چابی تو میرے پاس تھی ہی، آپ کو شک تک نہیں ہوا۔ سموسے امّی نے بنائے ہیں اور چائے بھی وہیں سے بنا کر لائی ہوں فلاسک میں۔ آپ دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

مشراجی: تڑپ میں شک کہاں ہوتا ہے میں نے بھی سوچا تھوڑی دیر ڈاکٹر کو بغیر پانی کی مچھلی کی طرح تڑپاؤں، چلئے دونوں کو میں نے ملا دیا میرا منہ میٹھا کیجئے۔ سموسے کے ساتھ پکوان بھی کھلائیے، ورنہ میں جھگڑا کرا دوں گا۔

شاہدہ: پھر کبھی، آج سموسے اور چائے پر مان جائیے۔

(سب مل کر قہقہے لگاتے ہیں)

-2- -2- -2-

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ ہر تخلیق پر اپنا پتہ ضرور لکھیں۔

دے کے خط...

(مزاسلے)

مکرمی!

شگوفہ مارچ ۸۸ء کا ملا۔ اس میں مجتبیٰ حسین صاحب کا مضمون ف س اعجاز کے عنوان سے چھپنے کی بجائے س ف اعجاز کے عنوان سے چھپ گیا ہے۔ اور مجتبیٰ حسین صاحب سے ملنے کے بعد سے میں اپنا نام بالکل بھول گیا ہوں۔ اور مقدور نہیں ہے کہ ہر لمحہ ہر پل کسی کو نام یاد دلانے کے لئے ساتھ رکھوں۔ وہ تو مضمون کے اندر بار بار ف س چھپا ہوا دیکھا تو یاد آیا کہ نام ف س اعجاز ہے۔ شائد یہ کاتب کی بھول ہو۔ مجتبیٰ صاحب نے میرا حافظہ بگاڑ دیا ہے۔

ف س اعجاز۔ کلکتہ

* * *

۔ "شگوفہ" پہلی بار نظر سے گذرا اور وہ بھی خوش قسمتی سے مجتبیٰ حسین نمبر! ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ سے دستیاب ہوا۔

مجتبیٰ حسین نمبر نکال کر آپ نے اپنی بے پناہ ادبی دیانت داری کا ثبوت ہی نہیں بلکہ اُردو ادب اور مجتبیٰ شناسوں کے ساتھ بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اِدھر خصوصاً سبھی قلمکاروں نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت و کارناموں کی یکجی اور خوبصورت تصویر پیش کی ہے کاش میرے علم میں یہ بات پہلے سے ہوتی کہ آپ مجتبیٰ حسین نمبر نکالنے جا رہے ہیں تو میں بھی اپنی ناقص رائے شگوفہ کیلئے ارسال کرتا۔ (ڈاکٹر) بہادر خاں سرحدی علیگڈھ

۔ .... رسید بھیجنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ شگوفہ کا سالنامہ بھی وصول ہوا۔ ایک ماہ پلک جھپکتے ہی گذر جاتا ہے تب بھی آپ شگوفہ کا ہر شمارہ پابندی سے کیسے نکالتے ہیں؟

مجتبیٰ حسین نمبر تو بڑے پائے کی چیز ہے۔ شاعر کا "کرشن چندر نمبر" جس قدر بسیط و وقیع تھا یہی حال مجتبیٰ حسین نمبر کا بھی ہے۔ آج کل طنز و مزاح کے میدان میں دو "م" کے بڑے چرچے ہیں۔ پہلا میم بحیثیت مزاح نگار مجتبیٰ حسین اور دوسرا میم بحیثیت مدیر مصطفےٰ کمال۔
خدا کرے آپکی ادارت میں یہ رسالہ خوب ترقی کرے۔ نئے شمارے کے مطالعے سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کارواں بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ خاص کر نئے لکھنے والوں کی بہتات ہے۔ "فر کی اہمیت" اور "کھڑکیاں" مختصر ہونے کے باوجود پُراثر ہیں۔

حلیمہ فردوس، بنگلور

* * *

۔ فروری کا شمارہ وصول ہوا۔ سرورق دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ یوسف ناظم نے مرزا بیگ کے پرزے خوب اڑائے ہیں۔ "صاحب آج کل کے" وجاہت علی سندیلوی کا یہ انشائیہ بھی عمدہ ہے۔ بعض جملے دل کو چھو لیتے ہیں۔ میرا ایک انشائیہ "[illegible]" سہ ماہی زبان و ادب پٹنہ میں شائع ہو چکا ہے۔
مجتبیٰ حسین نمبر کی سارے ملک میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایوانِ اُردو کے حالیہ شمارے میں مجتبیٰ نمبر کے متعلق بہت ساری تفصیلات درج ہیں، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں مجتبیٰ بھائی اُردو طنز و مزاح کے ایک اہم ستون اور فعال شخص ہیں۔

انوار انصاری۔ [illegible]

۔ شگوفہ کا تازہ شمارہ خوب ہے۔ شمیم اکرام الحق انصاری، رؤف خوشتر، مسرور مسلم، اور مختار یوسف کے مضامین بہت پسند آئے۔ مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، اور وجاہت علی سندیلوی کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ ان کے مضامین تو اچھے ہوتے ہی ہیں۔ سریٹ حیدرآبادی، نظر یرنی، رؤف رحیم، اسرار جامعی اور پاگل عادل آبادی کی نظمیں خوب ہیں۔ (نوٹ:۔ اپنا نام غلطی سے لکھ رہا ہے اسے کاٹ دیں۔)

اسرار جامعی۔ پٹنہ

-۲- -۲- -۲-

۔ شگوفہ ماشاء اللہ بہت اچھا چھپ رہا ہے۔ نئے مزاح نگاروں کو بھی آپ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ بہرحال کے مسرور مسلم کا مضمون پڑھا۔ بہت دن بعد ایک خوبصورت مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ طرزِ تحریر اور اسلوب کے کیا کہنے

منتظر خوشتر۔ بیدر

-۲- -۲- -۲-

۔ شگوفہ کا سالنامہ مجھے کافی پسند آیا۔ سالنامہ بہترین نکالنے پر میں آپکی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، یوں تو تمام مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، لیکن میرے استاد محترم جناب عاتق شاہ کا مضمون "میری مونچھیں" کافی پسند آیا۔ استادِ محترم نے مونچھوں کی اہمیت اور اس کے رکھنے کے فوائد پر بڑے عمدہ پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔ میری جانب سے استاد محترم کی خدمت میں دلی مبارکباد۔

اقبال محمد خان۔ ناندیڑ

جلد: ۲۱

شمارہ: ۵

مئی ۱۹۸۸ء

قیمت فی پرچہ ۴ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: ۵۰ روپے

عرب ممالک سے: ایک سو پچاس روپے

کتابت: محمود سلیم ۔ محمد عبدالرؤف ۔ مسعود انور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ:

۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد

فون آفس: 557716 فون مکان: 521064

سرورق: مطالب خوندمیر

کشمیری قوام

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوُرن ــــــ (منظومات)

۲۶ اور ۲۷ مئی کو کراچی (پاکستان) میں برپا ہونے والی پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس اور جشن خواجہ حمید الدین شاہد کے لئے ادارۂ شگوفہ اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا ہے۔

عابد معز
(سعودی عرب)

اتفاق کہ زندہ ہیں!

" اتفاق کہ زندہ ہیں " عنوان پڑھ کر آپ چونک اٹھے ہوں گے۔ جب ہمیں اپنے مضمون کا عنوان سوجھا، تب ہم بھی چونک پڑے تھے۔ جوں جوں خیالات کو کاغذ اور قلم کے سپرد کرتے گئے ہماری حیرت خود بخود ختم ہوگئی۔ مضمون مکمل کرنے کے بعد ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم صرف اور صرف اتفاقاً زندہ ہیں ورنہ ہمارے پاس موت کے اتنے سامان ہیں کہ ہمیں اپنے آپ سے سوال کرنا پڑتا ہے۔ اب تک ہم مر کیوں نہیں گئے ؟ آیئے دیکھیں آپ ہمارے اتفاقیہ زندہ رہنے سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں !

ڈاکٹر ہماری صحت کے نگہبان بلکہ ٹھیکہ دار ہیں۔ شب و روز ہمیں ہشاش بشاش رکھنے کے لئے بے تکان بیماریوں سے لڑے جا رہے ہیں۔ نئی دوائیں ایجاد کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ گردے، آنکھ، دل اور دیگر اعضاء ایسے بدل رہے ہیں جیسے ہندی فلموں کے گانوں کے دوران ہیرو اور ہیروئین کپڑے بدلتے ہیں۔ بے ہوشی کی حالت میں مریض کو عرصۂ دراز تک زندہ رکھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ رشتہ دار تنگ آکر مریض کی زندگی ختم کرنے کی گذارش کرتے ہیں۔ اب اس کو کیا کہیئے گا کہ ڈاکٹروں کی تمام تر کوششوں کے باوجود زندگی آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے۔ مسیحا خود حیران۔ " یہ کیسے ہو گیا، ہمارے حساب سے تو یہ مرنے کا کیس نہیں تھا "۔ شام بھلا چنگا تھا رات سویا تو صبح بستر پر مردہ پایا گیا۔ معمولی سردی زکام نے دماغی بخار کی خطرناک شکل اختیار کر لی۔ سگریٹ مت پیئو۔ ہر سگریٹ سے زندگی کے چند لمحے کم ہوتے ہیں۔ زیادہ مت کھاؤ خون میں چربی بڑھے گی، ہارٹ اٹیک ہوگا، ذیابیطس مار ڈالے گا۔ زیادہ آرام نہ کیا کرو۔ ہلکی ورزش بہتر ہے۔ موٹاپا خوشحالی کی نشانی نہیں، مختلف بیماریوں کی آمد کا اعلان ہے۔ بلڈ پریشر سال میں دو مرتبہ چیک کروایا کریں۔ لوگوں سے زیادہ گھل مل نہ رہا کریں معلوم نہیں کون سی متعدی بیماری موت کا بہانہ بن جائے تڑپا تڑپا کر زندگی ختم کرنے کے لئے کینسر ہی کیا کم تھا کہ اب ایڈس بھی ہاتھ دھو کر پیچھے لگ گیا ہے۔ دوا کھایئے تو بعض اوقات دوا بیماری سے پہلے بیمار کو ختم کر دیتی ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ غذا استعمال کرنا مشکل، آرام دوبھر، بھاگ دوڑ خطرناک، سگریٹ کے کش سے عمر میں کمی، شراب مہلک، دوائیں زہریلی اور اوپر سے زندگی کی درپے مختلف النوع بیماریاں ـــ

— کیا یہ اتفاق نہیں کہ ہم زندہ ہیں ؟

حادثات تو حادثات ہیں جن پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔ اسی لئے دن بہ دن حادثات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کب کہاں اور کیسے حادثہ درپیش ہو جائے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ حادثوں کی وجہ سے تو کہتے ہیں کہ موت کا بھروسہ نہیں جانے کب آجائے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔ گھر میں آرام سے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ پاس سڑک پر سے جاتی ہوئی لاری بے قابو ہوکر گھر میں گھس پڑی۔ اسٹیشن پر ریل گاڑی کھڑی تھی اور اسی لائن پر مخالف سمت سے ایک اور تیز رفتار گاڑی کتنی لوگوں کی موت کا بہانہ بن گئی۔ جہاز اُڑتے ہوئے معمولی پرندہ سے ٹکرایا اور لہرا کر زمین پر گر پڑا۔ کرنٹ شارٹ سرکٹ ہوکر آگ لگ گئی۔ پتنگ کرنٹ کے تاروں کو چھو گئی۔ گھر میں بحران کا گیس سلنڈر پھٹ پڑا۔ کار بے قابو ہوکر اُلٹ گئی۔ پیر پھسلا اور پانی میں ڈوب گئے۔ کئی قسم کے حادثات کے باوجود بھی ہم بچ جاتے ہیں۔ یہ اتفاق ہی تو ہے

سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں ترقی کی نئی راہیں نکالی ہیں وہیں انسانی زندگی کو بہت بڑے خطروں سے دوچار بھی کیا ہے۔ سارا شہر رات کی تاریکی میں سو رہا تھا کہ قریب کسی فیکٹری سے مہلک گیس کا اخراج ہوا اور شہر ویران ہوگیا اٹامک شعاعیں اپنا بندھن توڑ کر انسانوں کو مارتی اور مفلوج بناتی چلی گئیں۔ مختلف فیکٹریوں سے خارج شدہ فاضل مادّہ انسانی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے۔ ہوا اس سے متاثر، پانی آلودہ تو غذا میں ان کی ملاوٹ۔ اٹامک تجربہ کیا گیا تو چند مہینوں تک انسانی آبادی پر اس کے اثرات مرتب ہوتے رہے۔ یہی کیا کم تھا کہ فضاء مختلف کیمیائی اشیاء سے آلودہ ہو رہی تھی کہ اب مختلف شعاعیں بھی فضا میں اپنا شکار ڈھونڈتے ہوئے پھر رہی ہیں۔ مختلف قسم کے الکٹرانک مشین اپنی اپنی شعاعیں خارج کرتی ہیں۔ اب آپ ہی سوچیئے جان ہتھیلی پر لے کر سفر کرنا تو ہے ہی لیکن سات پردوں میں چھپ کر، گھر کی مضبوط دیواروں کے اندر بیٹھنا بھی محفوظ نہیں رہا —— کیا یہ اتفاق نہیں کہ ہم زندہ ہیں۔

ہماری سیاست ہمیں زندہ رکھنے سے زیادہ ہمیں مارنے کے درپے ہے۔ دہشت گردی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے بس میں سفر کر رہے تھے کہ راستے میں دو مسافر اٹھے اور دوسرے مسافروں کا کام تمام کر دیا۔ خط موصول ہوا، خط کھولنے کی کوشش کی اور بم پھٹ پڑا۔ جہاز میں بیٹھے اُڑ رہے ہیں کہ اغواء کر لئے گئے یا ایسے نیست و نابود ہوئے کہ نام و نشان مٹ گیا۔ بعد میں اس تباہی و بربادی کی ذمہ داری کوئی لبریشن فرنٹ یا کوئی دہشت پسند گروہ قبول کر رہا ہے۔ قائدین ہمدردی کے بیانات جاری کر رہے ہیں۔ تشدد کو سختی سے کچلنے کا انتباہ دیا جارہا ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں برسوں سے جدوجہد چل رہی ہے۔ کوئی آزاد ہونا چاہتا ہے تو کوئی انھیں اپنا محکوم بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ مرنے مارنے والا کسی کے نزدیک مجاہد ہے تو کسی کے آگے دہشت گرد ہے۔ بارود کے ڈھیر پر انسان پیدا ہوتے ہیں۔ بندوقوں سے کھیلتے ہوئے پلتے ہیں۔ جوان ہوئے میزائیل اٹھائے اور لڑنے چلے۔ لوگوں کو کھانے کے لئے روٹی نہیں ملتی لیکن مرنے اور مارنے کے لئے بندوق، گولہ بارود، بم اور نہ جانے کیا کچھ حاصل ہے۔ افراطِ زر کی طرح آج افراطِ ہتیار کا دور دورہ ہے۔ مرنے اور مارنے کے لئے انسان کم پڑ رہے ہیں اسی لئے آج قائدین جدوجہد اور لڑائی جاری رکھنے کے لئے زیادہ بچے پیدا کرنے کا مشورہ دینے لگے ہیں۔ سائنسدان مختلف طریقوں سے بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ

موجودہ آبادی کو ہوا، پانی اور غذا مہیا ہو سکے۔ اس کے برخلاف سیاستداں آبادی میں اضافہ کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ انھیں بندوق، بم، میزائیل اور موت مہیا کی جائے ——— پھر بھی ہم زندہ ہیں۔ کیا یہ اتفاق نہیں ہے۔

آج ہر ملک کو اپنے پڑوسی ملک سے خطرہ لاحق ہے اور ساری دنیا پر تیسری عالمی جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں ہر ملک اپنا دفاع مستحکم سے مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے خود ہتھیار بناتا، خریدتا یا بنواتا اور خریدتا ہے۔ ہتھیاروں کے بازار میں نت نئے ہتھیار بنائے جا رہے ہیں۔ مہلک سے مہلک تر ہتھیار جو انسان کو آناً فاناً ختم کر دیتے ہیں یا تڑپا تڑپا کر مار ڈالتے ہیں۔ چند ممالک آپس میں کئی سال سے لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ان ممالک نے اپنی آبادی کو جنگ میں جھونک دیا ہے۔ بعض ممالک کبھی کبھی لڑ پڑتے ہیں۔ ابھی دوسری جنگ عظیم کی تباہی و بربادی مکمل ہوئی نہیں کہ لوگ تیسری عالمی جنگ کی باتیں اور تیاریاں کرنے لگے ہیں۔ کہتے ہیں آج کرۂ ارض پر اتنا ہتھیار موجود ہے جو ساری دنیا کو کئی مرتبہ تباہ و تاراج کر سکتا ہے۔ ہتھیاروں کی حفاظت مسئلہ بن رہی ہے۔ رکھے رکھے ہتھیار خود بخود چل پڑتے ہیں۔ بم پھٹنے اور میزائیل اڑنے لگتے ہیں۔ کئی لوگ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں ——— اتنی عام اور سستی موت کے باوجود ہم زندہ ہیں۔ کیا یہ اتفاق نہیں ہے۔

جوں جوں انسان ترقی کرتا جا رہا ہے اس کی وقعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ جرائم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چند سکوں کے عوض زندگی ختم کی جاتی ہے۔ معمولی بات پر ایک دوسرے کی جان لی جاتی ہے۔ نام پوچھا، نام پسند نہ آیا اور کام تمام کیا۔ جہیز نہ لانے پر زندہ جلا دیا جاتا ہے۔ لوگ شوقیہ موت کا کھیل کھیلتے ہیں۔ نشیلی دوائیں الگ انسانی زندگی کی درپے ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمیں تو کسی بھی نوجوان کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ معلوم نہیں دواؤں کا عادی ہے۔ دہشت گرد ہے، انتہا پسند ہے یا اپنے آپ اور سماج سے لڑنے والا ہے۔ صالح اور نیک نسل تو آج پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اخبار جرائم سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ جرائم، حادثات، دہشت گردی، جنگ اور نہ جانے کس کس عنوان کے تحت ہزاروں کی تعداد میں اموات ہوتی ہیں ——— اس کے باوجود بھی ہمارا زندہ رہنا کسی اتفاق بلکہ معجزہ سے کم نہیں ہے۔

انسان کے ہاتھوں خود انسان کی موت اتنی آسان اور سستی ہو گئی ہے کہ قدرت نے اپنے آلام اور مصائب میں کمی کر لی ہے۔ طوفان آتے ہیں لیکن پہلے جیسے نہیں آتے۔ زلزلے کے ہلکے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں۔ آندھیاں بھی اٹھتی ہیں۔ قحط بھی پڑتا ہے۔ وبائیں پھیلتی ہیں لیکن پہلی جیسی تباہی نہیں ہوتی۔ چند لوگ پھر بھی عالم بالا کو کوچ کرتے ہیں ——— اور یہ اتفاق ہی ہے کہ ہم محفوظ رہتے ہیں۔

کہاوت مشہور ہے کہ موت کو بہانہ چاہیئے۔ موت کسی بھی صورت کسی بھی حال اور کہیں بھی آسکتی ہے۔ ہم نے آج تک کسی بھی انسان کو موت کو مات دیتے نہیں دیکھا جبکہ لوگوں کو اتفاقات کے سہارے جیتے دیکھا ہے۔ حادثہ میں جہاز کے پرخچے اڑ گئے لیکن ایک دس سالہ لڑکا زندہ رہا۔ جنگ میں کسی کو مردہ قرار دیا گیا لیکن بعد میں وہی شخص صحیح سلامت اپنے گھر واپس ہوا۔ طوفان کے دوران ایک شخص نے دو دن ایک درخت پر بیٹھ کر اپنی زندگی بچالی ——— کیا آپ ہمارے خیال اور مضمون کے عنوان "اتفاق کہ زندہ ہیں" سے متفق ہوتے ہیں؟

——

* طالب خوندمیری

قطعات

فیصلہ خود آپ ہی کر لیجئے!
کون کلچر کس قدر پامال ہے
شیکسپیر کا مکاں ہے میوزیم
حضرتِ غالب کے گھر میں ٹال ہے

○

بیڑیاں ٹوٹیں زمانہ ہو گیا
رُخ نہیں پلٹا مگر حالات کا
ہم کو آزادی مِلی تھی رات میں
سلسلہ باقی ہے اب تک رات کا

○

سیاسی اُصول

جذبات دوستی کے نہیں ہیں تو کیا ہوا
آپس میں بات چیت کی راہیں کھُلی رہیں
یہ سب سے اوّلین سیاسی اُصول ہے
دل کے کواڑ بند ہوں با نہیں کھُلی رہیں

○

نثری نظمیں

شاعری ہو نثر میں، یا قافیوں میں قید ہو
آج اس موضوع پر کچھ شاعروں میں جنگ ہے
میں بھی کہتا ہوں کہ بہتر ہے یہ "نثری شاعری"
کیونکہ اب اردو زبان کا قافیہ ہی تنگ ہے

○

آئندہ برس

(ایک خبر: آئندہ تعلیمی سال اُردو مدارس کے لیے ایک ہزار جائدادیں پُر ہوں گی)

یہ خبر، اخبار میں پڑھ کر یقین ہونے لگا
نخلِ اُردو کا نمو پائے گا آئندہ برس
جائدادیں ہیں بہت اُردو مدارس کے لیے
اب تقرر جن پہ ہو جائے گا آئندہ برس
اس خبر پر تو ہمیں پورا بھروسہ ہے مگر
دیکھنا ہے کس برس آئے گا "آئندہ برس"

○

ایک فوٹو، منتری جی کے ساتھ

آدمی جس میں کھڑا ہے ایک چوپائے کے ساتھ
ایسی اک مذّھم سی فوٹو زینتِ اخبار ہے
نیچے "منتری اور گدھا" لکھا ہوا تو ہے مگر
کون جانب ہے گدھا پہچاننا دشوار ہے

فیاض احمد فیضی
(بمبئی)

(ریڈیائی ڈرامہ)

یہ نہ تھی ہماری قسمت

کردار :-

ہُما : ایک تیس سالہ غیر شادی شدہ عورت، بینک منیجر
بوا : ہُما کی ملازمہ، عمر پینتالیس سال
سلطان خان : ادھیڑ عمر امیر شخص، عمر چالیس سال
عبدالغفور : انجینئر، سرکاری ملازم، عمر بتیس سال
ظریف مرادآبادی : شاعر

منظر :- ہُما کا فلیٹ، وقت صبح دس بجے

ہُما : (جماہی لیتے ہوئے) بُوا، اے بُوا جلدی اٹھو نا اُوہ دیکھو تو یہ صبح صبح کون گھنٹی کا گلا دبا رہا ہے۔

بوا : (ناگواری کے ساتھ) اٹھ ہوں۔ بی بی جی۔ ابھی تو صبح کے دس ہی بجے ہیں، اور آج اتوار بھی ہے آپ نے کیوں میری نیند خراب کر دی۔ میرا اتنا اچھا خواب بھی غارت ہو گیا۔

ہُما : اوہو۔ آئی ایم ساری بُوا۔ لیکن اٹھو نا، یہ کم بخت گھنٹی۔

(گھنٹی پھر بجتی ہے)

ہُما : اب اٹھو بھی۔

بوا : بی بی جی۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کر لیتی ہوں جب تک آپ ہی دروازہ کھول کر دیکھ لیجئے۔ ہو سکتا ہے کوئی غلطی سے ہمارے گھر کی گھنٹی بجا رہا ہو۔

ہُما : ہرگز نہیں۔ میں اگر دروازہ کھولوں گی تو آنے والا مہمان سوچے گا کہ کتنی کنجوس اور اَن کلچرڈ عورت ہے جو ایک ملازمہ بھی نہیں رکھ سکتی۔ اور پھر کیا پتہ مجھے ہی ملازمہ سمجھ بیٹھے۔ تم فوراً اُٹھ کر دروازہ کھولو اور میں یہاں ایزی چیئر پر بیٹھ کر انگریزی اخبار پڑھنا شروع کر دیتی ہوں۔

بوا : میں، میں آج ہی یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ اور پھر جس گھر میں نوکروں

کے ساتھ مالکوں جیسا سلوک نہ کیا جاتا ہو وہاں رہ کر کوئی فائدہ نہیں ۔

(دروازہ کھولتی ہے، ایک اجنبی شخص کھڑا ہے)

اجنبی : اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا ہوں مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی ۔ آپ کے پڑوسی کئی بار اپنے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے گھور چکے ہیں بلکہ ایک خاتون تو ابھی بھی ذرا سا دروازہ کھول کر جھانک رہی ہیں۔ یا الٰہی یہ میں کہاں آگیا ہوں۔

بُوا : خدا کے نیک بندے، آپ اپنے گھر سے کہاں جانے کے لئے نکلے تھے ؟

اجنبی : میں ہما خانم سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھے بلایا ہے ۔

بُوا : (حیرت سے) انھوں نے آپ کو بلایا ہے ؟ مگر ہمارے ٹی وی کی تو کل ہی مرمت ہوچکی ہے ۔ ابھی تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے ۔

اجنبی : لاحول ولا قوۃ ۔ میں آپ کے ٹی۔ وی کی مرمت کے لئے نہیں، اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی مرمت کیلئے آیا ہوں۔ میرا علاج ہما خانم ہی کرسکتی ہیں۔

بُوا : کیا مطلب ؟ ہماری میم صاب تو ڈاکٹر نہیں ہیں۔ وہ تو بینک منیجر ہیں۔

اجنبی : ہاں ہاں ۔ اور غیر شادی شدہ بھی ہیں۔ انھوں نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا تھا اور میرے خط کے جواب میں انھوں نے مجھے اپنے گھر پر آنے کا حکم دیا تھا۔ میں اُن سے ان ہی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں ۔

ہُما : (اندر سے) ضرورت رشتہ کا اشتہار ! اوہ مائی گاڈ، میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ارے بُوا۔ بُوا ۔

مہمان کو ذرا ڈرائینگ روم میں بٹھا دو۔ اور ہاں چائے بھی لیتی آنا ۔

اجنبی : (ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہوئے) آداب عرض ہے۔

ہُما : آداب عرض ہے ۔ آئیے تشریف رکھئے ۔ معاف کیجئے گا، میں تو اشتہار کی بات بالکل بھول ہی گئی تھی کہ میں نے اُمیدواروں کو انٹرویو کے لئے آج ہی اپنے فلیٹ پر بلوایا ہے۔

اجنبی : کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں ۔ لیکن شادی کے بعد ایسی کسی بھول کی اجازت نہیں ہوگی ۔ ہا ہا ہا ۔

ہُما : (تیزی سے) معاف کیجئے گا، شادی تو میں اس شخص سے کروں گی جو ہر کام کو میری مرضی سے کریگا جس طرح سے میرے بینک میں ہوتا ہے۔ ہاں ویسے آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔

اجنبی : مجھے سلطان خان کہتے ہیں۔ میری عمر چالیس سال ہے مگر اسکول کے سرٹیفکیٹ میں دو برس زیادہ عمر لکھی ہوئی ہے ۔ میں نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے ۔

ہُما : کوئی بات نہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ہر دس سال میں ایک جماعت پاس کی ہے۔ ویسے آجکل آپ پانچویں جماعت میں تعلیم حاصل کررہے ہیں یا اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

سُلطان : نہیں محترمہ ۔ خدا کے فضل وکرم سے میرے چار ہوٹل ہیں ، تین فلیٹ ہیں ، دو گاڑیاں ہیں اور ایک پیارا سا کتا ہے۔

ہُما : اوہ آئی سی ۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی

بیویاں کتنی ہیں؟

سلطان۔ بیویاں؟

ہما: جی!

سلطان: آپ کی دعا سے ابھی تک کنوارا ہوں۔ دراصل ہوٹل بزنس میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ شادی کے متعلق سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ بس میں ہوں اور میرا پیارا سا کتا، جو میرا رفیق ہے۔

ہما: (زور سے ہنستی ہے) بھئی واہ۔ تب تو ایک فلیٹ اور ایک گاڑی آپ کے کتے کے استعمال میں رہتی ہوگی۔

سلطان: نہیں نہیں۔ میرا ٹامی بہت ہی سیدھا سادا اور شرمیلا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بہت شرماتا ہے۔ چپ چاپ میرے فلیٹ کے ایک کونے میں پڑا رہتا ہے اور بھونکتا بھی صرف اسی وقت ہے جب اسے بھوک لگی ہو یا جب کوئی اس کی دُم پر چڑھ جائے۔

ہما: (قہقہہ لگاتی ہے) واہ واہ۔ کاش کہ آپ نے اس سے کچھ سیکھ لیا ہوتا۔

(بُوا داخل ہوتی ہے)

بُوا: بی بی جی۔ چائے پھیکی ہی پینی پڑے گی۔ شکر ختم ہوگئی ہے۔

سلطان: کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے پھیکی چائے ہی پینے کی عادت ہے۔

ہما: ہوں۔ تو آپ کے پاس اتنی دولت ہے۔ دل بہلانے کے لئے ٹامی بھی ہے۔ پھر آخر آپ شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

سلطان: کیا بتاؤں محترمہ۔ اب میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں بھی بیوی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے مزے دار کھانے کھاؤں۔ آخر میرا ٹامی کھانا تو نہیں پکا سکتا نا!

ہما: کیا مطلب۔ آپ کے ہوٹلوں میں مزے دار کھانے نہیں بنتے کیا؟

سلطان: اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ میرے ہوٹلوں کے اشتہاروں میں تو یہی لکھا رہتا ہے کہ شہر کے لذیذ ترین کھانے یہیں ملتے ہیں لیکن حقیقت تو میرا دل ہی جانتا ہے کیا آپ کو نہیں معلوم کہ جتنے بھی ہوٹل والے ہیں ان سب کا کھانا ان کے گھر سے بن کر آتا ہے۔

ہما: اچھا؟ لیکن میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ مجھے کچن کا کوئی کام نہیں آتا۔ میں روز اپنی سرونٹ کے ہاتھ کا بنا ہوا بدمزہ کھانا کھاتی ہوں۔ میری سرونٹ البتہ کبھی کبھی مجھ سے پیسے لے کر ہوٹل کا کھانا کھالیتی ہے۔

سلطان: کوئی بات نہیں محترمہ۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد کم سے کم اپنے نئے ہوٹل کے لئے بینک سے قرضہ حاصل کرنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہوگی مجھے!

ہما: ہوں۔ آپ خدا کے لئے یہاں سے دفعان ہو جائیے۔ میں اپنے کسی قرض دار سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

سلطان: ابھی تو جاتا ہوں۔ آپ غور کیجئے گا۔ میں پھر حاضر ہوں گا۔ قرضہ لینے سے پہلے میں آپ کو قیمتی تحفے بھی لاکر دوں گا۔

ہما: (غصے سے) جائیے یہاں سے!

سلطان: خدا حافظ۔

(میوزک) (تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجتی ہے)

بُوا: بی بی جی ذرا غصہ تھوک دیجئے۔ دوسرا امیدوار دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

ہما: اُف۔ جاؤ اسے بھی لے آؤ۔ دیکھیں وہ کس کھیت کی

مُولی ہے۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

بُوا : فرمائیے۔ آپ کس کھیت کی مُولی ہیں

اجنبی : مُولی نہیں مکھن۔ میں مکھن والا ہوں۔

بُوا : معاف کیجئے۔ ہماری میم صاب کو مکھن لگانے والے بالکل پسند نہیں۔ وہ مکھن کھاتی بھی نہیں ہیں۔ آپ کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹائیے۔

(دروازہ زور سے بند ہوتا ہے)

بُوا : بی بی جی، یہ تو رانگ نمبر نکلا۔ مکھن بیچنے آیا تھا۔

ہُما : اری بے وقوف۔ تُو نے ٹھیک سے دیکھا بھی تھا؟ ہو سکتا ہے وہ کوئی اُمیدوار ہو اور اس کا خاندانی نام مکھن والا ہو۔

بُوا : نہیں بی بی جی۔ اس کے ہاتھ میں مکھن کا پیکٹ بھی تھا۔ ویسے شکل سے وہ خاندانی مکھن لگانے والا ہی معلوم ہوتا تھا۔

(گھنٹی بجتی ہے)

ہُما : اچھا اچھا، اب باتیں نہ بناؤ۔ جاؤ دیکھو اب کون آیا ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

بُوا : کہئے، آپ کیا بیچنے آئے ہیں؟

اجنبی : جی، جی، جی نہیں۔ میرے پاس بیچنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ بس، میں ہُما خانم سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

بُوا : اچھا، اچھا۔ سمجھ گئی۔ سمجھ گئی۔ آپ نے بھی ضرورتِ رشتہ کا اشتہار پڑھ لیا تھا۔

اجنبی : جی ہاں، جی ہاں۔

بُوا : آئیے اندر آجائیے۔ یہاں اس کمرے میں۔

اجنبی : السلام علیکم۔

ہُما : وعلیکم السّلام۔

اجنبی : (گھبرائے ہوئے) میرا نام عبدل۔ عبدالغفور ہے

ہُما : ہاں۔ کیا آپ بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

عبدالغفور : جی نہیں، محترمہ جی نہیں۔ میں تو اُس تیس سالہ خوب صورت، صحت مند، تعلیم یافتہ، کلچرڈ خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بینک مینیجر ہیں۔

ہُما : تو میں آپ کو کیا دکھائی دیتی ہوں؟

عبدالغفور : آپ؟ آپ!

ہُما : ہاں ہاں میں، بولئے۔

عبدالغفور : آپ تو مجھے صرف تیس سالہ خاتون دکھائی دیتی ہوں۔ ذرا ہُما خانم کو بُلا دیجئے۔

ہُما : میں ہی ہوں ہُما۔ اور یہ رشتہ کا اشتہار میں نے ہی دیا تھا۔ اپنے لئے!

عبدالغفور : آپ کے لئے؟

ہُما : جی ہاں۔

عبدالغفور : مگر اشتہار میں تو آپ کے اتنے موٹے چشمے کا ذکر کہیں نہیں ہے!

ہُما : عجیب احمق آدمی ہیں آپ۔ دنیا میں کہیں بھی ضرورت رشتہ یعنی MATRIMONIAL کے اشتہار میں چشمے کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ اب آپ جلدی سے اپنے بارے میں بتائیے کہ آپ کون ہیں۔ ویسے آپ مجھے معقول آدمی نظر آتے ہیں۔

عبدالغفور : اچھی بات ہے۔ جی میں کیمیکل انجینئر ہوں۔ میری عمر بتیس برس ہے۔ میں سرکاری ملازم ہوں۔ تنخواہ یوں تو تین ہزار روپے ہے لیکن کٹ کٹا کر صرف اکیس سو بائیس روپے ہاتھ لگتے ہیں۔

ہما : یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر میں تو ایسے شخص سے شادی کروں گی جو میرے حکم کے مطابق چلے اور میری مرضی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے۔ میری پسند اور ناپسند کا خیال رکھے۔ اور مجھے کبھی بھی غصہ نہ دلائے

عبدالغفور : غصہ نہ دلائے ؟

ہما : جی۔

عبدالغفور : شادی سے پہلے یا شادی کے بعد ؟

ہما : آف کورس، شادی کے بعد۔

عبدالغفور : جی آپ کہتی ہیں تو منظور ہے۔ مگر آپ نے اپنی تنخواہ نہیں بتائی۔

ہما : (ہنستے ہوئے) میری تنخواہ ؟ پانچ ہزار روپے ہے

عبدالغفور : اچھا ؟ پانچ ہزار روپے ؟ پھر تو آپ مجھے صرف پچیس برس کی دکھائی دے رہی ہیں۔

ہما : (ہنستی ہے) جی نہیں۔ میں پچھلے پانچ برسوں سے تیس برس کی ہی دکھائی دے رہی ہوں۔

(بُوا آتی ہے)

بُوا : بی بی جی۔ چائے کے لئے شکر لے آؤں یا یہ پھیکی ہی چائے پیتے ہیں ؟

عبدالغفور : جی نہیں شکریہ۔ میں چائے پی کر آیا ہوں۔

ہما : ٹھیک ہے بُوا۔ تم جاؤ۔ یہ چائے پی کر آئے ہیں

بُوا : جی۔ جی بہت بہتر۔ (چلی جاتی ہے)

ہما : اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کی کوئی ڈیمانڈ تو نہیں ہے۔

عبدالغفور : جی نہیں، جی نہیں۔ میری کوئی ڈیمانڈ ویمانڈ نہیں ہے۔ میں گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا اور گھر جا کر ہی دوپہر کا کھانا کھاؤں گا۔

ہما : اوہ۔ میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہی تھی کہ شادی کے سلسلے میں آپ کی کوئی ڈیمانڈ تو نہیں ہے۔

عبدالغفور : شادی کے سلسلے میں ڈیمانڈ !

ہما : جی !

عبدالغفور : شادی سے پہلے یا شادی کے بعد ؟

ہما : اوہ مائی گاڈ۔ شادی سے پہلے۔

عبدالغفور : دیکھئے ویسے تو کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے۔ لیکن مجھے آپ کا یہ فلیٹ بہت پسند آیا ہے۔ شادی کے بعد ہم یہیں رہیں گے۔

ہما : یہ، یہ فلیٹ میرا نہیں ہے۔ مجھے میرے بینک کی طرف سے ملا ہے۔

عبدالغفور : کوئی فکر نہیں۔ ابھی آپ کے ریٹائرمنٹ میں کافی عرصہ ہے بلکہ شادی کے بعد اگر آپ اجازت دیں تو میں وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے کر باقی زندگی آرام سے آپ کی خدمت میں وقف کر دوں۔

ہما : کوئی اور فرمائش ہو تو وہ بھی کہہ دیجئے۔

عبدالغفور : جی نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ البتہ شادی سے پہلے آپ یہ پرانا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی بیچ کر نیا رنگین ٹی وی منگوالیں تو بہتر ہوگا۔

ہما : آپ نے ویڈیو کی فرمائش نہیں کی۔

عبدالغفور : مجھے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ویڈیو کا ہنگامہ یوں بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ اچھا آپ یوں کریں۔ ایک نیا اسکوٹر خرید لیں۔ مجھے آفس جانے میں سہولت رہے گی۔

ہما : اوہ۔ آپ کی ساری فرمائشیں ختم ہو گئیں یا اب بھی کوئی آخری فرمائش باقی ہے ؟

عبدالغفور : آخری فرمائش ۔ جی نہیں میری آخری فرمائش کوئی نہیں ہے ۔ میں جہیز کی لعنت کے سخت خلاف ہوں ۔ اب تو یہی فرمائش ہے کہ بس آپ مجھے مل جائیں ۔

ہُما : ہُنہہ ۔ آپ یہاں سے اُٹھتے ہیں یا میں چوکیدار کو بلاؤں ؟

عبدالغفور : آپ بُرا مان گئیں ۔ دیکھئے دیکھئے ۔ ۔ ۔

ہُما : جی نہیں میں بُرا کیوں ماننے لگی ۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی آپ جائیں ، میں غور کروں گی ۔

عبدالغفور : زہے نصیب ۔ اگر آپ اسکوٹر نہ دلواسکیں تو کوئی بات نہیں ۔ میں موپیڈ (MOPED) ہی سے کام چلا لوں گا ۔

ہُما : اوہ ۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کو اسکوٹر سوٹ نہیں کرے گا ۔ کیوں نہ آپ کو ایک سکنڈ ہینڈ کار دلوادی جائے ۔ لیکن پہلے آپ ذرا ڈرائیونگ سیکھ لیجئے ، پھر تشریف لائیے گا خدا حافظ ۔

عبدالغفور ۔ جی سیکھ لوں گا ، سیکھ لوں گا ۔ خدا حافظ ۔

(چلا جاتا ہے)

ہُما : ہُنہہ ۔ یہ منہ اور مسور کی دال ۔ اس فقیر دولہے نے تو میرے سر میں درد کردیا ، ہُنہہ ۔ (گھنٹی بجتی ہے اور بجتی ہی چلی جاتی ہے)

بُوا : بی بی جی ۔ لیجئے ایک اور دردِ سر پیدا ہوگئے ۔ کیا ان سے کہہ دوں کہ آپ گھر پر نہیں ہیں ؟

ہُما : ارے نہیں بُوا ۔ ایک اور انٹرویو کر لیتے ہیں ۔ شائد یہ وہی خدمت گار ہو جس کی مجھے تلاش ہے ۔ جائو اور اسے یہیں لے آؤ ۔

(دروازہ کھلنے اور بند ہونے)

اجنبی : آداب بجالاتا ہوں ہُما خاتون ہم آئیں گھر میں ہُما کے خدا کی کبھی وہ ہم کو کبھی اپنے گھر بندے کو ظریف مراد آبادی کہتے سے پیشہ آباو اجداد شاعری اور

ہُما : مراد آباد کے برتنوں کے بارے میں وہاں ظریف اور شاعر بھی بنتے ہیں

ظریف : جی ہاں خاتون ! فارسی میں خا ظروف اور بھرے ہوئے برتنوں ہیں ۔ آداب ۔

ہُما : چاہے ان میں بھوسہ ہی کیوں

ظریف : سبحان اللہ ، خاتون سبحان اللہ کیا ظریفانہ مزاج پایا ہے ۔ جو مل بیٹھیں گے فرزانے دو ۔ اس لاجواب بات پر بندہ آپ یہ گلاب کا پھول پیش کرنا چا قبول افتد زہے عز و شرف ۔

ہُما : (پھول لیتے ہوئے) ہم نے قبو یہ پھول تو گلدان میں لگا دینا ۔

بُوا : لائیے بی بی جی ۔ لیکن اپنا گلہ بڑا ہے ۔

ظریف : کوئی بات نہیں ۔ شادی کے دن پھولوں سے بھر دیں گے ۔

ہُما : ماشا اللہ ۔ آپ جاگتے میں کو ہیں ؟

ف: اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ا: آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ ترقی پسند
ہیں یا جدید شاعری کرتے ہیں۔

ف: (ٹھنڈی آہ بھر کر) ہاں خاتون۔ میں نے آٹھ
برس کی عمر میں ترقی پسند شاعری شروع کی
اور اٹھائیس برس کی عمر تک ترقی پسند
شاعری کرتا رہا۔ اچانک ایک صبح کو دانتوں
میں مسواک کرتے ہوئے خیال آیا کہ میری اب
تک کی ساری شاعری بیکار ہے۔ اکیسویں صدی
سر پر کھڑی ہے۔ اب مجھے جلدی سے جلدی جدید
شاعری شروع کر دینی چاہیئے۔ کیا پتہ اگلی صدی
میں شاعری میں بھی کمپیوٹروں کا استعمال ہونے
لگے، چنانچہ پچھلے سات برسوں سے میں آزاد
شاعری کر رہا ہوں۔

ہا: سبحان اللہ۔ آپ کی دلچسپ باتیں سن کر میرا
درد سر جاتا رہا۔

یف: مجھ سے شادی کر کے آپ کی زندگی کے سارے
دکھ درد جاتے رہیں گے خاتون جب آپ بینک
تشریف لے جائیں گی میں گھر کا سارا کام کاج خود
کر دیا کروں گا۔ شام کو گرما گرم چائے اور رات
کو لذیذ کھانے پکا کر آپ کی خدمت میں پیش
کروں گا۔ روز صبح بیڈ ٹی کے بعد اور ناشتے سے
پہلے آپ کے حضور میں اپنی ایک تازہ نظم بھی پیش
کروں گا۔

ہا: (ہنستی ہے) کبھی بہت اچھے۔ خدمت کا جذبہ
آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

(بوا آتی ہے)

بوا: بی بی جی۔ شاعر صاحب پھیکی چائے پئیں گے
یا میں شکر بازار سے لے آؤں یا پھر یہ گھر سے
چائے پی کر آئے ہیں۔

ظریف: سبحان اللہ، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ بوا تم ایسا
کرو، جلدی سے بھاگ کر پڑوس سے تھوڑی سی
شکر ادھار مانگ لو، کہنا شادی کے بعد
دولہا میاں خود لوٹا دیں گے۔ اور ہاں جلدی
سے چائے بنا لاؤ مجھے بہت جلد لوٹنا ہے۔

بوا: (ہنستے ہوئے) جی اچھا۔

ہما: آپ مجھے اپنے تمام دکھوں اور غموں سے زیادہ
خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔

ظریف: اجی ذرہ نوازی ہے آپ کی، ورنہ بندہ کس
لائق ہے۔

ہما: آپ ایسا کریں اپنی ایک تازہ نظم مجھے ابھی سنائیں
اس سے مجھے اندازہ ہو جائے گا کہ آپ اور آپ
کی شاعری کسی لائق ہے یا نہیں۔

ظریف: آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔
لیجیئے میں آپ کو بینک سے متعلق ہی نظم
سناتا ہوں۔

ہما: (چونکتے ہوئے) بینک سے متعلق نظم؟ کیا
واقعی؟ یقین نہیں آتا!

ظریف: جی ہاں محترمہ۔ اس کا عنوان ہے "بچت"
یہ میں نے آج ہی خاص آپ کے لئے لکھی ہے۔

ہما: (حیرت سے) اچھا؟ ارشاد ارشاد

ظریف: عرض کرتا ہوں۔
فکر فردا، آنے والے کل کے سپنے

اور بہتر زندگی کے خواب

سہا : واہ ، فکرِ فردا ، آنے والے کل کے سپنے
اور بہتر زندگی کے خواب

ظریف : آداب عرض ہے
فکرِ فردا ، آنے والے کل کے سپنے
اور بہتر زندگی کے خواب
بیماریوں ، آفتوں کا ڈر
بے سہارا بڑھاپے کا خوف
اور نہ جانے کتنے بینکوں کے اشتہار
اُکساتے رہتے ہیں مجھے
بچت کرو ، بچت کرو۔

ہُما : سبحان اللہ - حیرت انگیز - بہت خوب صورت
آپ مجھے شکل سے تو اتنے ذہین نہیں نظر آتے۔

ظریف : لیکن آپ تو مجھے شکل سے بقراط کی خالہ نظر
آتی ہیں۔

ہُما : جی ؟

ظریف : بوا ذرا چائے تو لیتی آنا !

(بوا آتی ہے)

بوا : لیجئے شاعر صاحب آپ کی چائے حاضر ہے۔

ظریف : میٹھی تو ہے نا !

بوا : ہاں ہاں - چوری کا گڑ اور اُدھار کی شکر میں
زیادہ مٹھاس ہوتی ہے۔

ظریف : واہ واہ مزہ آگیا۔ ہمہ خانہ آفتاب است۔

ہُما : تو آپ کیا کہہ رہے تھے۔

ظریف : جی عرض کرتا ہوں۔
فکرِ فردا ، آنے والے کل کے سپنے
اور بہتر زندگی کے خواب
بیماریوں ، آفتوں کا ڈر
بے سہارا بڑھاپے کا خوف
اور نہ جانے کتنے بینکوں کے اشتہار
اُکساتے رہتے ہیں مجھے
بچت کرو ، بچت کرو

ہُما : بچت کرو ، بچت کرو۔

ظریف : آگے عرض کرتا ہوں۔
اور میں اپنی بیوی کی میلی ساری
ننگے کان اور کلائی
اپنے بچے کی پھٹی نیکر
اس کی آنکھوں سے جھانکتے اَن گنت سوال
ان سب سے آنکھیں بچا کر
اپنی پونجی کو سمیٹ
نکل پڑتا ہوں اپنی تاریک کھولی سے
کسی ایرکنڈیشنڈ بینک کی طرف
لیکن !

ہُما : لیکن کیا ؟ ایسا لگتا ہے آپ بہک رہے ہیں۔
سچ ہے شاعروں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

ظریف : یہ آپ کی چائے کا اثر ہے جو میں بہک رہا ہوں
سنیئے نظم کا آخری بند سُنیئے۔

ہُما : ارشاد۔

ظریف : لیکن
سامنے کے فلیٹ کے پردوں کا رنگ
دروازوں کی چمک
کچن سے اُٹھتی مہک
ڈرائنگ روم کے ٹی وی کی چیخ
ویڈیو کی پکار

ہما : اوہ مائی گاڈ۔
ظریف : آگے سنیئے۔
پڑوسی کی بیوی کے قیمتی کنگن
جگمگاتی مسکراہٹ اور لباس
باندھ دیتے ہیں میرے پیروں کو
حال کی زنجیروں سے
کوئی بتائے مجھے
بحث کروں تو کیسے کروں
ہما : غضب خدا کا۔ اگر میرے بینک والوں کو پتہ لگ جائے کہ یہ نظم اس فلیٹ میں پڑھی گئی ہے تو وہ مجھے نوکری سے نکال دیں۔ براہِ مہربانی آپ میرے فلیٹ سے نکل کر سیدھے اپنی کھولی میں چلے جائیں۔ آپ وہیں اچھے نظر آئیں گے۔ میرا سر اب درد سے پھٹا جا رہا ہے۔
ظریف : مگر وہ شادی کی تاریخ ؟
ہما : (غصّے سے) بوا، ذرا انھیں دروازے تک چھوڑ دو۔ اور اب کسی کو اندر مت آنے دینا۔
ظریف : خاتون، اجازت چاہتا ہوں۔ آج کی یادگار ملاقات کی نشانی گلاب کا پھول چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔ خدا حافظ۔
ہما : خدا حافظ۔
بوا : بی بی جی۔ یہ بھی گئے۔ اب آپ کا کیا ہوگا۔
ہما : کچھ نہیں ہوگا پگلی۔ مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔ میں کنواری ہی بھلی۔
(گھنٹی بجتی ہے، دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)
بوا : جی بی بی جی، وہ چوکیدار آیا ہے۔
ہما : اوہ، اب کیا میری قسمت میں چوکیدار لکھا ہے؟
بوا : جی نہیں بی بی جی۔ وہ آپ کے لئے نہیں آیا ہے۔ وہ دراصل کہہ رہا ہے کہ ابھی ابھی جو صاحب یہاں سے گئے تھے نا وہ آتے وقت نیچے گارڈن سے ایک گلاب کا پھول توڑ کر اوپر لائے تھے۔
ہما : غضب خدا کا۔ اپنے گارڈن کا پھول توڑ کر لائے تھے؟
بوا : جاتے وقت چوکیدار نے انھیں پکڑا تو کہہ گئے کہ جرمانہ ہما بیگم صاحبہ دے دیں گی۔ بی بی جی وہ پانچ روپے مانگ رہا ہے۔
ہما : اوہ مائی گاڈ، اتنا بڑا دھوکا۔ بوا یہ لو پانچ روپے، چوکیدار کو دے دو اور اس سے کہہ دو کہ کوئی میرا پتہ پوچھتا ہوا آئے تو اسے اوپر نہ آنے دے۔ اور تم بھی سن لو کوئی امیدوار آئے تو باہر سے ہی چلتا کرنا اسے۔
بوا : مگر بی بی جی، آپ کی شادی۔
ہما : اُفوہ، میں نے کہہ دیا نا مجھے نہیں کرنی شادی۔ اب مجھے کسی مرد پر اعتبار نہیں رہا۔ اس دنیا میں سعادت مند مرد یا تو پیدا ہوئے بند ہو گئے ہیں یا ان سب کی پہلے ہی شادیاں ہو چکی ہیں۔
بوا : جی اچھا۔ (دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی ہے۔ دور کہیں ریڈیو بج رہا ہے۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔)

شاطرؔ گورکھپوری

دل مرا معشوق سے بیزار ہے، ایسا بھی نہیں
میرا معشوق چڑچڑی مار ہے، ایسا بھی نہیں

جانے کس بل پہ دیا کرتا ہے بل مونچھوں پر
میرا دشمن کوئی دم دار ہے، ایسا بھی نہیں

کوچۂ یار میں ہے آج یہ مجمع کیسا!
کوئی میلہ، کوئی تہوار ہے، ایسا بھی نہیں

پھر بھی رہتا ہے سدا کھٹکا نہ اڑجائے کہیں
طائرِ دل مرا پردار ہے، ایسا بھی نہیں

ہو بہو آپ ہی کے رنگ و شباہت کا ہے وہ
جس پہ مرتا ہوں، طرح دار ہے، ایسا بھی نہیں

کوئی محفل ہو پہنچ جاتا ہے، پڑھنے اشعار
میرا لڑکا کوئی فن کار ہے، ایسا بھی نہیں

گھر میں اُس شوخ کے گھسنا بھی نہیں ہے آساں
حدِّ فاصل کوئی دیوار ہے، ایسا بھی نہیں

سر سے جاتا نہیں سایہ بھی نحوست کا مگر
ہر ستارہ مرا دُم دار ہے، ایسا بھی نہیں

پھر بھی یادوں کا لگا رہتا ہے جمگھٹ ہر دم
دِل کسی نیتا کا دربار ہے، ایسا بھی نہیں

ہے خطاکار تو شاطرؔ، مگر اے حضرتِ شیخ
آپ کے جیسا سیہ کار ہے، ایسا بھی نہیں

مُفلسی کے گیت گاتے جایئے
شرحِ پیدائش بڑھاتے جایئے

قوم کو اُلّو بناتے جایئے
روز مہنگائی بڑھاتے جایئے

دیکھئے معیارِ اُلفت گر نہ جائے
کھا کے چپل مسکراتے جایئے

آپ شاعر ہیں تو شرماتے ہیں کیوں
بیٹھئے غزلیں سناتے جایئے

آج گھر والی کے ہیں تیور خراب
گھر سنبھل کر، سر کھجاتے جایئے

ہے اگر مطلب براری کا خیال
ان کے در پہ دُم ہلاتے جایئے

جب کہ ناکارہ ہی رکھنا ہے اُنھیں
اپنے لڑکوں کو پڑھاتے جایئے

رہیئے فاقے سے، مگر مولانا کو
مرغ و بریانی کھلاتے جایئے

کہئے شاطرؔ سے نہ رکھے لاٹھی بھی
آپ ایٹم بم بناتے جایئے

افلاس نے مارا، کبھی اُفتاد نے مارا
ابّو کو مرے، کثرتِ اولاد نے مارا

غنڈے تھے تو کھاتے رہے پولیس کے ڈنڈے
جب سدھرے تو آفاتِ خداداد نے مارا

بیٹی پہ سدا ساس چلاتی رہی بیلن
اور باپ کو فرمائشِ داماد نے مارا

جب شعر سنانے میں ہوئی مجھ سے کبھی چوک
اک ہاتھ وہیں کھینچ کے استاد نے مارا

ہر سال چلے آتے ہیں بے اذن و اجازت
اولاد کی بڑھتی ہوئی تعداد نے مارا

کچھ ایسے لُٹے، بھیک بھی ملتی نہیں شاطرؔ
اس طرح ہمیں دولتِ اجداد نے مارا

یوسف ٹھیشتر
(بیدر)

دیوانے آم

جنت نشاں ہندوستان میں جتنے فرقے، عقائد اور تہوار ہیں اتنی ہی تعطیلات ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق یہاں ہر چھٹا دن تعطیل کا دن ہوتا ہے۔ بقیہ پانچ دن ہم غیر سرکاری طور پر تعطیلات مناتے رہتے ہیں۔ اونگھتے ہوئے، چائے سگریٹ پیتے اور گپ بازی کرتے ہوئے۔

محکمۂ تعلیمات تو اب محکمۂ تعطیلات ہو کر رہ گیا ہے۔ درس و تدریس میں عرس و ہریس کی باتیں ہوتی ہیں۔ عام تعطیلات سے نہ ہمارا جی بھرتا ہے نہ پیٹ مگر لمبی گرمائی تعطیلات عام سی نہیں آم کی تعطیلات ہوتی ہیں جبکہ جی بھی بھرتا ہے اور پیٹ بھی۔

خطا معاف ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کرکٹ کو کھیل کا بادشاہ اور آم کو پھلوں کا بادشاہ مان کر تعظیم کے پیش نظر صرف دو چار رن بنانے اور دو چار آم کھانے پر ہی اکتفا کرلیں۔ کرکٹ میں ہم سینچری بنائیں یا نہ بنائیں ہماری مرضی۔ بلکہ اب تو سینچری بنانا بلے بازوں سے زیادہ ایمپائر کی مرضی پر منحصر ہے۔ شہادت کی انگلی سے وہ بلے باز کو ۹۹ رن پر ہی شہید قرار دے سکتا ہے۔ لیکن آم کے موسم میں اگر ہمارے صحن میں بکھری ہوئی گٹھلیوں کو گنا جائے تو یقیناً ہمارا اسکور اظہرالدین کے اسکور سے زیادہ ہوگا۔

محکمۂ تعلیمات کے پیش نظر گرمائی تعطیلات کا مقصد کچھ اور ہوتا ہوگا لیکن فی زمانہ ان لمبی تعطیلات کا مصرف صرف اور صرف آم کھانا اور گٹھلیوں سے کھیلنا ہو کر رہ گیا ہے۔ طلباء پڑھیں یا نہ پڑھیں، کامیاب ہوں یا فیل ہو جائیں۔ اساتذہ پڑھائیں یا ٹیوشن چلائیں، اس موسم میں ہر ایک کو آم نصیب ہو جاتے ہیں۔

آج کل اساتذہ کی یافت بڑھ رہی ہے اور دریافت گھٹ رہی ہے۔ اور یوں ان کی تنخواہ اور معلومات میں ہر سال چند صفروں کا برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

ہمارے ایک ساتھی لکچرار ہیں جو رات بھر غیر تدریسی مشاغل میں جاگ جاگ کر گزارتے اور اسٹاف روم میں سوتے رہتے ہیں۔ ایک دن ایک ساتھی نے انھیں جگاتے ہوئے یاد دلایا کہ آپ کے خراٹوں سے دوسرے اساتذہ کے

کاموں (کیرم اور شطرنج) میں خلل ہوتا ہے۔ اس لئے اسٹاف روم میں خراٹے لینا بند کر دیجئے۔ آپ کو سونا ہی ہے تو کسی کلاس روم کا رُخ کیجئے۔

آمدم برسرِ آم۔ آموں کو اب تک لال مٹی پسند تھی اور کالے لوگ بھاتے تھے۔ مگر اب معاملہ بدل گیا ہے۔ آموں کو اب سرد ممالک اور گورے لوگ پسند آ رہے ہیں۔

جی ہاں باہر جانے کا مرض اب وزیروں اور امیروں تک ہی محدود نہیں رہا۔ آموں کو شاید ہندوستان کی گرم اور فرقہ وارانہ ہوا راس نہیں آ رہی ہے۔ اس لئے وہ یورپ اور امریکہ کا رُخ کر رہے ہیں۔ اب تو آم اور خاص لوگ یعنی وی آئی پی ہی باہر جا رہے ہیں۔ سُنا ہے باہر کے لوگ ہندوستانی آم کو ہاتھوں ہاتھ اور ہندوستانی عوام کو آڑے ہاتھ لے رہے ہیں۔

ہمارے ایک آم فروش دوست باذوق شعر فہم اور حاضر جواب واقع ہوئے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے مہنگے اور اعلیٰ قسم کے آم فروخت کرتے ہیں۔ اب ان کی شکایت ہے کہ کوئی ان کے آم نہیں خرید رہا ہے۔ چنانچہ وہ "یہ دنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں" کہتے ہوئے اپنے آموں کو بیرونی ممالک بھیج رہے ہیں۔

ان ہی باذوق اور حاضر جواب آم فروش سے ایک واقعہ منسوب ہے۔ شہر کے ایک چھوٹے موٹے قائد جو لنگڑے واقع ہوئے ہیں سیاسی اُتھل پتھل میں ڈپٹی منسٹر ہو گئے اور پہلی بار جب وہ سرکاری کار میں بیٹھ کر بازار سے گذر رہے تھے تو آم فروش نے آواز لگائی "لنگڑے پر بہار ہے"۔

مرزا غالبؔ نے جہاں اُردو دنیا کو پرتگالی شراب، نرالی خطوط نگاری، چوسر بازی اور بلند پایہ شاعری سے روشناس کیا، وہاں انہوں نے آموں کی خوبیوں کو اتنے اچھوتے انداز میں پیش کیا کہ اس موضوع پر دوسروں کو کہنے کے لئے کچھ نہ رہا۔ ایک آم ہی کیا غالبؔ نے اتنا کچھ لکھا اور کہا ہے کہ اکثر شاعر اور نثر نگار حضرات غالبؔ کی شاعری اور خطوط نویسی کے مطالعہ کے بعد اپنے اپنے قلم رکھ دیئے اور آم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی اس شعر و سخن سے کام و دہن کی طرف منتقلی کو شعر و ادب کی بڑی خدمت قرار دیا گیا۔ البتہ آموں کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس دور کی ایک علت ہر چیز کی قلت ہے۔ اس لئے آج کل ہر کوئی مرزا غالبؔ کی طرح یہ آرزو کرتا ہے کہ آم بہت ہوں اور میٹھے ہوں۔ کثرت میں وحدت کے مصداق آم تو ہر جگہ ملتے ہیں مگر الگ الگ ناموں سے۔ جیسے قلمی آم۔ ظلمی آم (وہ آم جو ظلوں میں رکھے ہوتے ہیں)۔ لنگڑا، دسہری، چونسہ، فضلی، ثمر بہشت، گلاب خاص، سفیدہ وغیرہ وغیرہ۔ جنوبی ہند میں ایک آم ہوتا ہے جس کو آپوس کہتے ہیں، یہ اتنا میٹھا ہوتا ہے کہ گویا کہہ رہا ہو آ چوس۔

پہلے آم صرف آم کی شکل میں ملتے تھے۔ اب آم جام کی شکل میں بھی مل رہے ہیں۔ آم کا جام (شکر ہے کہ جام کا آم نہیں ملتا) آم کی جیلی اور آم کا مشروب۔ جب لوگ ایک چہرے پر کئی چہروں کے نقاب لگا سکتے ہیں تو پھر موجودہ دور کے آم بھی کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟ سو وہ بھی بدلی ہوئی شکلوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ آم کی خوبی یہ ہے کہ یہ خربوزے کی طرح اپنا رنگ نہیں بدلتا، نہ ہی یہ کیلے کے چھلکے کی طرح کسی کو گراتا ہے۔

موجودہ دور میں بڑے ملک ایک دوسرے کو ہتھیار دیتے رہتے ہیں۔ ہندوستان چونکہ ہمیشہ سے امن پسند ملک رہا ہے، اس لئے وہ خلوص و محبت کے طور پر دوسرے ملکوں کو آموں سے بھری بھری ٹوکریاں بھیجتا ہے، بلکہ کئی ممالک کے سربراہ تو محض آموں کی خاطر اپنے دورے آم کے موسم میں مقرر کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات بھی بنے رہتے ہیں اور آم بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ اسی کو سیاسی دنیا میں آم کے آم گٹھلیوں کے دام کہتے ہیں۔ اس طرح موجودہ دور میں جو کام ہوشیار ایلچی اور سفیر نہیں کر پاتے وہ کام میٹھے آم خاموشی سے کر لیتے ہیں ظاہر ہے جب کوئی میٹھے آم کھائے گا تو وہ جنگ، تشدد اور نفرت کی بات کیسے کر پائے گا۔ اس لئے ہمارا مشورہ ہے کہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں مندوبین کے ہاتھوں میں آم تھما دینا چاہیئے، وہ جارحانہ باتیں چھوڑ کر آم چوسنے میں لگ جائیں گے، ان کی تقریروں میں مٹھاس پیدا ہو جائے گی۔ زیادہ سے زیادہ شرکاء ایک دوسرے پر گٹھلی پھینکا کریں گے۔ جوہری لڑائی سے گٹھلی لڑائی بہتر ہے۔ کیچڑ اچھالنے سے آم کا رس اچھالنا اچھا ہے۔

آموں کی بات ہو رہی ہو اور یوم الدولہ کا ذکر نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم آم چوس رہے تھے کہ دبے پاؤں آکر پکے ہوئے آم کی طرح آموں کی ٹوکری پر گر پڑے اور دونوں ہاتھوں سے آم چوسنا شروع کر دیا۔ پھر فرمانے لگے۔

" اماں یار یہ کیسی جمہوریت ہے آم کے درخت بوئے اور نگرانی کرنے والوں کو پتھر مل رہے ہیں اور پتھر مارنے والے کو آم مل رہے ہیں، گویا جو بڑھ کے تھام لے آم اسی کا ہے۔ اچھا ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو پردہ نشین باحیا خواتین کی طرح خود کو چھپائے رکھتے ہیں اور شریر بچوں کے پتھروں سے محفوظ رہتے ہیں؟

ہم : ایسے آموں کو سیانے آم کہتے ہیں۔

یوم الدولہ : اور ایسے آموں کو کیا کہیں گے جو جدید نسل کی فیشن ایبل خواتین کی طرح خود کو آشکار کرتے رہتے ہیں۔ اور یوں وہ آوارہ شریر بچوں کے پتھروں کا نشانہ بن بن کر اُن کی گود میں آ گرتے ہیں؟

ہم : دیوانے آم۔

اسرار جامعی (پٹنہ)

آگ

لگ گئی لیڈر کے گھر میں آگ جب
کیا کیا اس نے سنو تم دوستو
دی خبر اخبار کو پہلے مگر
"فائر اسٹیشن" خبر کی بعد کو

آپریشن

آپریشن اس طرح کرتے ہیں آپ
دیکھئے یہ آدمی کا فیس ہے
کہہ کے "سوری" جھٹ سے بولا ڈاکٹر
ہیں یہ سمجھا "پوسٹ مارٹم کیس" ہے

افسر بہاری (پٹنہ)

موتی میاں

اک انسان پرجوش موتی میاں ہیں
نہ سمجھو کہ خرگوش موتی میاں ہیں
کبھی سر گھٹا دیں وہ گرمی کے مارے
کبھی زلف بردوش موتی میاں ہیں
بہت ناز سے ان کی بیگم ہیں کہتی
چلم میں ہوں سرپوش موتی میاں ہیں
مگر راز کی بات کہتا ہوں سن لو
کہ بیگم کی پاپوش موتی میاں ہیں
کبھی تین وائف تھیں، اب ایک ہی کے
فقط بار بردوش موتی میاں ہیں
جوانی تھی رنگین ان کی مگر اب
پس ریش روپوش موتی میاں ہیں
ابال آہی جاتا ہے باسی کڑھی میں
نہ سمجھو کہ نرگوش موتی میاں ہیں
حسینوں کی ہر بات سنتے ہیں لیکن
بظاہر گراں گوش موتی میاں ہیں
مئے دید پیتے ہیں چھپ چھپ کے اب تک
غضب کے بلانوش موتی میاں ہیں
ہیں شاعر بیچھر مگر زعم ہے یہ
کہ ہم پلۂ جوش موتی میاں ہیں
چہکتے ہیں محفل میں پر میرے آگے
زباں گنگ وخاموش موتی میاں ہیں
بڑھاپے کی منزل میں پہنچے ہیں جب سے
خرد سے سبکدوش موتی میاں ہیں
کبھی مبتلا اختلاج جگر میں
کبھی خود فراموش موتی میاں ہیں
سنا جب سے محفل میں اپنا قصیدہ
اسی شب سے روپوش موتی میاں ہیں
لڑکپن میں میں نے سنا تھا یہ افسر
کہ ذی علم ذی ہوش موتی میاں ہیں

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ
(پاکستان)

دیارِ عشق

بادبانی جہاز آہستہ آہستہ نیلے پانیوں کو چیرتے ہوئے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا سمندری پرندے
سروں پر سایہ کیے محوِ پرواز تھے۔ آس پاس رنگ برنگی کشتیاں تیر رہی تھیں ہم اپنے وفد کے ساتھ پاکستان کی
طرف سے ایک نوزائیدہ ملک دیارِ عشق کے سرکاری دورے پر تشریف لے جا رہے تھے یہ سلطنت صرف دو ماہ
قبل معرضِ وجود میں آئی تھی پاکستانی عوام میں اس کا بڑا چرچا تھا۔

جہاز اب ساحل کے ساتھ ساتھ رینگ رہا تھا۔ استقبال کو آئے ہوئے دیارِ عشق کے اعلیٰ سرکاری و سول
و فوجی حکام صاف نظر آ رہے تھے۔ ہم ساحل پر اترنے کے لیے بڑھے تو عوام نے دیکھتے ہی خوشی کا اظہار شروع
کر دیا وہ لوگ حسبِ توفیق اپنے ملک کی روایات کے مطابق نعرے بھی لگا رہے تھے عشق زندہ باد وصال
آوے ای آوے۔ ہجر مردہ باد، رقیب تباہ وغیرہ وغیرہ۔ وفد کے معزز ارکان آگے بڑھے تو ایک بانکا
نوجوان منہ میں بانسری زرق برق پوشاک پہنے پاؤں میں سلیم شاہی جوتا اور چوڑی دار پاجامہ زیبِ تن کیے
خراماں خراماں آگے بڑھا اور ہم سے گلے ملا خوب بھینچا اور پیٹ کو خونِ جگر سے سینچا یوں کہ پسلیوں سے کڑ کڑ
کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی کھڑے اعلیٰ فوجی افسر نے جو شاید عشقیہ فوج کے کمانڈر انچیف تھے اس
بانکے نوجوان کا تعارف کرایا "یہ ہیں ہز ایکسی لینسی جناب رانجھا صاحب علیہ ما علیہ پریذیڈنٹ مملکت خداداد
دیارِ عشق" ان کے ساتھ ہی ایک دوشیزہ چہرہ گلنار چشم آبدار کپڑے گل و گلزار زیبِ تن بہ شلوار کھڑی تھی
فوراً سمجھ گئے کہ یہ ملکِ دیارِ عشق کی خاتونِ اول ملکہ عالیہ ہیر صاحبہ ہیں اچانک ہیر صاحبہ نے بغل سے پتیلی کی
ایک رکابی نکال کر صدرِ مملکت کو پیش کی مسکراتے اور لجاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ چوری پیشِ خدمت ہے۔
انھوں نے رغبت سے رکابی صاف کرتے ہوئے کہا کہ چند دنوں سے چوری میں شاید ڈالڈا گھی ڈال رہی
ہو۔ گلا خراب ہو رہا ہے میں نے آج ہی "محبت میڈیکل" کالج میں تعینات ناک کان گلے کے اسپیشلسٹ
کو اسی غرض سے ایوانِ صدر میں حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔

عشقیہ فوج کے چاق و چوبند دستے ہمیں گارڈ آف آنر پیش کرنے کو بے تاب تھے۔ سلامی کے چبوترے
پر کھڑے ہوئے تو ایک اور نوجوان سامنے آئے سر پہ بڑا قیمتی پگڑ باندھ رکھا تھا جس پر وہ اپریل نما شملے

نظر آرہے تھے مونچھیں آخری سرے پر توس نا کر مڑی ہوئی ایک مرصّع تیر کمان ان کے ہاتھ میں تھی اور ترکش شانے پر جھول رہا تھا اکیس توپوں کی سلامی کی بجائے اس نوجوان نے اکیس تیر یکے بعد دیگر ے چلائے جو سنسناتے ہوئے سر پر سے گزر گئے اس حرکت کے فوراً بعد وہ سلامی کے چبوترے پر آئے تو پتہ چلا کہ موصوف دیارِ عشق کے دفاتی وزیر دفاع ہیں اور اسمِ گرامی مزاجٹ ہے معاً پیچھے نگاہ پڑی تو ایک صحت مند دوشیزہ ہاتھ میں مشکیزہ قمیص کے نیچے ساٹن کی جھلمل کرتی نھوتی زیب تن کیے نظر پڑی۔ دونوں کولہوں کے متوازی دو سرخ چیں سے لہرا رہے تھے۔ وزیر دفاع مزاجٹ صاحب نے پریشانی بھانپتے ہوئے بتایا کہ یہ اُن کی زوجہ محترمہ "صاحبان" ہے۔

عشقیہ فوج کے مختلف دستے چبوترے کے سامنے سے سلیوٹ کی بجائے تسلیمات اور فرشی سلام کرتے گزر رہے تھے۔ وزیر دفاع کافی گھُل مِل گئے تھے جو رجمنٹ گزرتی اس کا نام بتاتے جاتے مثلاً بہار رجمنٹ، خزاں رجمنٹ، کوچہ جاناں رجمنٹ اور سنگِ آستاں رجمنٹ وغیرہ۔

اسی دن سہ پہر کو رانجھا صاحب کے وفد کے ساتھ ہمارے بے ضابطہ مذاکرات کے لیے وقت مقرر تھا مذاکرات کا پہلا دور شروع ہوا تو ہم نے بتایا کہ پاکستان کپاس اور چاول وغیرہ برآمد کرتا ہے لیکن آپ کے ملک سے کیا برآمد کیا جا سکتا ہے ؟

فوراً ہی بتایا گیا کہ قدرت نے دیارِ عشق کو بہت سے قدرتی وسائل سے مالامال کیا ہے۔ اور جو چیزیں خاص طور پر برآمد کی جاتی ہیں اُن میں محبت، نازک جذبات خوبصورت احساسات۔ گل و بلبل اور نسیم سحر وغیرہ اہم ہیں۔ دیارِ عشق کی کابینہ کے ایک معزز رُکن نے بتایا کہ وزیرِ زراعت جناب فرہاد نے شبانہ روز محنت کے بعد پیار نگر کے پاس آکاش کی وسعتوں تک پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کوہ محبت کش میں شیشہ کی بجائے جدید مشینوں کی مدد سے دودھ کی نہر کے لیے راستہ بنایا تھا۔ اور اس دودھ کو چند میل آگے لے جا کر ایک جھیل کی شکل دی تھی جسے "جھیل شیر الملوک" کہتے ہیں۔ یہاں ایک بہت وسیع و عریض انڈسٹری بھی قائم کی گئی ہے جس میں اس دودھ کو جراثیم سے پاک ٹیٹرا پیک ڈبوں میں بند کر کے عوام تک پہنچایا جاتا ہے اور ملکی ضروریات کی تکمیل کے بعد فاضل دودھ کے ڈبوں کو بیرونِ ملک برآمد کیا جاتا ہے۔ بتایا گیا کہ اس دودھ کی بین الاقوامی منڈیوں میں بہت مانگ ہے۔

دوسری صنعت جو دن چوگنی اور رات آٹھ گنا ترقی کی طرف سرپٹ بھاگ رہی ہے، صنعتِ کباب سازی ہے دراصل مہینوال صاحب جن کے پاس ملک دیارِ عشق کی پانی و بجلی کی وزارت ہے اس کام میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں انھوں نے صنعتِ کباب سازی میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کر لیا ہے پچھلے دنوں ورکرز کی ملی بھگت کی وجہ سے ذرا مال غلط قسم کا سپلائی ہونا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اکثر شائقین (جن میں پوپلے چہروں والے دانتوں سے عاری بوڑھے بھی شامل تھے) جب اپنی دانست میں نرم کباب منہ میں رکھتے تو کباب میں ہڈی محسوس ہوتی تھی۔ بعدازاں یہ شکایت بڑی حد تک دُور کر دی گئی۔ مذاکرات کے اس دور کے بعد ہمیں موٹروں کے جلوس میں مہمان خانے لے جایا گیا۔ راستے میں صدر صاحب کی رہائش گاہ بھی نظر آئی۔ گن مین کی بجائے ایک دھان پان سا نوجوان چابک لیے ہوئے کوٹھی کے مین گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ ساتھ ہی لان میں رنگ برنگے پایوں والا پلنگ پڑا ہوا تھا۔ شاید ملکہ عالیہ فرصت کے اوقات میں اس پر استراحت فرماتی ہونگی سرکاری مہمان خانے

کے باہر ایک قدِ آدم بورڈ آویزاں تھا جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "ناصح قسم کے لوگوں کا داخلہ قطعی ممنوع ہے"۔ دوسرے روز ہم نے کچھ ناقابلِ دید مقامات کی سیر کی۔ تیسرے روز وفد کو قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھنا تھی۔ اسمبلی ہال کے صدر دروازے کے پاس ہی ماربل ستون پر قرار دادِ عاشقی رقم تھی۔

۱۔ دنیا میں بسنے والا کوئی بھی شخص عشق و محبت کے جذبات سے بیگانہ نہیں۔
۲۔ عشق دو دلوں کے درمیانی فاصلے کے براہِ راست اور مردوں کی جیبوں میں موجود رقم کے بالعکس متناسب ہوتا ہے۔
۳۔ عشق اور رقابت باہم برابر لیکن مخالف سمتوں میں عمل کرتے ہیں۔

قرار داد پڑھ کر محسوس ہوا کہ اس قسم کی قرار داد کہیں پہلے بھی پڑھ چکے ہیں پھر یاد آیا کہ جب کلاس نہم کے ہونہار طالب علم تھے تو نیوٹن کے تین قانون رٹے تھے جو اس قرار دادِ عاشقی کی نقل ماری ہوا اور یوں دنیا میں اپنا نام روشن کرالیا ہو۔ ہال میں داخل ہو کر اپنی نشستوں پر بیٹھے تو اسپیکر نے تعارفی تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ قومی اور صوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب کا معیار کچھ یوں ہے۔

۱۔ بنیادی طور پر ہر امیدوار عاشق مزاج ہو۔
۲۔ قومی اسمبلی کے لیے دس دفعہ محبوباؤں کے سینڈل کھا چکا ہو جب کہ یہی تعداد صوبائی اسمبلی کے لیے پانچ مقرر کی گئی ہے۔
۳۔ امیدوار کے حلقے کے کم از کم دس رجسٹرڈ عشاق اس کی رنگین مزاجی کی تصدیق کریں۔

اچانک ہماری نگاہ ساتھ والی قطار میں ایک نشست پر پڑی جس پر لکھا ہوا تھا۔ قائدِ حزبِ اختلاف جعفر چاچا قیدو رحمۃ اللہ علیہ وہاں ایک عمر رسیدہ لیکن پیچیدہ داڑھی کے بال چیدہ چیدہ ہاتھ میں ایک مڑی تڑی ٹانگ سن رسیدہ پکڑے بیٹھے تھے۔

اسمبلی کی کارروائی شروع ہوئی تو ایک رکن نے تحریکِ التوا پیش کی "وزیرِ قانون نے ناصح قسم کے لوگوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے وہ سرِ عام عشق و محبت کے خلاف زہر اگل رہے ہیں اور نوجوان نسل کو بے راہ روی کی جانب راغب کر رہے ہیں انھوں نے پیار بھرے دلوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے ان حالات میں امن و امان کی نازک صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر ہے؟"

وزیرِ قانون تحمل سے اٹھے اور خندہ لب چہرے کے ساتھ گویا ہوئے "جنابِ اسپیکر و صدرِ محترم ناصح قسم کے لوگوں کو ملک میں کوئی آزادی نہیں۔ جو کوئی بھی امن و آشتی کے خلاف بات کرتا پکڑا جائے اُسے قرنطین ہاؤس بھیج دیا جاتا ہے جہاں ہر مجرم کو روزانہ پانچ غزلیں میرؔ کی پچاس اشعار غالبؔ کے اور سو اشعار مرزا سوداؔ کے سنائے جاتے ہیں۔ ہفتے میں دو بار زبردستی عشقیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہر مجرم کو بلا ناغہ ترقی پسند ادیبوں کی پاکستان سے درآمد شدہ نثری نظمیں بھی سنائی جاتی ہیں یہ آخری سزا اس قدر خوفناک ہے کہ اب تک کئی لوگ تائب ہو چکے ہیں؟" وزیرِ قانون کے اس مدلل جواب کے بعد محرک نے اپنی تحریک پر زور نہیں دیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک کالے رنگ کا آدمی بڑی تمکنت سے ہال میں داخل ہوا سفید لباس جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ سبھی لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اسپیکر نے اس کو پاس بٹھایا اور تعارف کرایا "یہ ہیں صدرِ مملکت کے

مشیرِ غیر قانونی جناب مجنوں صاحب جو کہ ملک کا نظم و نسق چلانے میں وقت بے وقت بلا ضرورت، بغیر جھجک جناب صدر کو اپنے سستے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔"

اسمبلی کی کارروائی ختم ہونے کے بعد دونوں ممالک کے وفود کا اجلاس تھا۔ اس میں طے پایا گیا کہ پاکستان دیارِ عشق کو کپاس اور چاول برآمد کرے گا۔ ہم نے سوچا کہ آج کل وطنِ عزیز میں کچھ لوگ جدا جدا قومیتوں کے چھوٹے چھوٹے نعرے لگا رہے ہیں اس لیے میں نے صدرِ مملکت دیارِ عشق سے درخواست کی ہمارے ملک کو اپنی دھرتی سے دس لاکھ گانٹھیں محبت کی بیس ٹن احساسِ یگانگت اور پچاس مال بردار جہاز بھائی چارہ بہتر کرنے والے مصالحہ جات کے بھیجیں۔

○●

(ڈاکٹر وزیر آغا کی زیرِ صدارت شامِ انشائیہ میں پڑھا گیا)

ڈاکٹر رضیہ صدیقی
(حیدرآباد)

نکاح کے دوبول

نکاح کے دوبول اور طلاق کے تین بول ہمارے کان اس وقت سے قبول کر رہے ہیں جبکہ ہمارا شعور ان بولوں کی معنویت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگرچہ نکاح کے 'دوبول' میں مصری کی مٹھاس کا تصور آجاتا ہے۔ اور عقد کے بعد مصری، بادام اور کھجوروں کے لوٹنے میں جو مزہ آتا ہے وہ بھلایا نہیں جاتا اور لوٹ مار کے واقعات بچپن ہی سے تحت الشعور کے چور خانوں میں پوشیدہ رہتے ہیں اور کچھ اس طرح روبعمل ہوتے ہیں کہ ہم نے دلہنوں تک کو اُن کے اطراف پڑے ہوئے مصری اور بادام کو آہستگی سے جیب میں اُتارتے دیکھا ہے، لیکن افسوس کہ آخرالذکر تین بول کا بول بالا نہیں ہوتا، یہ بول زبان سے شاذ ونادر ہی ادا ہوتے ہوں۔ قلم ہی سے یہ بیڑا پار ہوجاتا ہے، گویا اس کا درجہ فحش گالیوں سے بھی بدتر ہوتا ہے جسے ایک شریف آدمی اپنی شریف بیوی کو بحالتِ مجبوری تحریر کرتا ہے یا وکیل کے ذریعہ اخبار میں مشتہر کرتا ہے۔

دو بول نکاح کے ساتھ ہی محفل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اگر آپ کنوارے ہیں، جواں ہیں، حسین وجمیل بھی ہیں اور تازہ روزگار سے لگے ہیں تو جان جائیے کہ عنقریب نکاح کے دوبول عقدۃ النکاح یعنی نکاح کی گرہ آپ کی خوشگوار اور آزادانہ زندگی پر پڑنے والی ہے۔ بہرحال اس مرحلہ سے ہرایک کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی کہ "کُلّ نَر جُلّۃٌ ذَائقۃ النکاح"۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ایک ایسا پل ہے جس سے گذرنے کے بعد بے شمار پگڈنڈیاں نظر آتی ہیں، جن کو عبور کرنے کے بعد صرف موت کا گھاٹ ہی باقی رہ جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ہم ٹی وی یا فلموں میں دیکھتے ہیں کہ نکاح سے پہلے یا پھیروں کے وقت کسی نہ کسی وجہ سے شادی رک جاتی ہے لیکن یہ باتیں داستانوں تک ہی محدود نہیں۔ قدیم زمانے میں دن کے اُجالے میں شادی کا رواج تھا۔ اور نکاح علی الصبح ہوا کرتا تھا۔ ہمارے نانا حضرت کے ماموں قبلہ کے توسط سے زمانۂ قدیم کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال ہمارے کانوں تک پہونچا ہے جو آپ کے گوش گذار کرتے ہیں۔ ہوا یوں کہ نکاح کے دوبول سے پہلے ہی دولہے

میاں نے شرافت کی رنگین دھاریوں کو گن گن کر اپنی دیوانگی کو براتیوں پر ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ (غور فرمائیے کہ دلہن اور اس کے رشتہ داروں پر کیا بیتی ہوگی۔) لیکن قدرت نے کچھ ایسا منظم کام کیا کہ فوری "ایمرجنسی دولہے" کا انتظام ہوگیا۔ دولہے کے دماغی خلل کا بروقت اظہار ہو جانے سے نکاح تو رُک گیا تھا اور دلہن والوں پر دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ ان حالات میں دلہے تو مسند سے اُٹھ جاتے ہیں لیکن دلہن کا اٹھنا محال ہوتا ہے۔ ویسے بھی قدماء بڑی دانشمندی سے کام کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ دلہن کا کوئی محرم عزیز جو قابل نکاح تھا اور ساچق و مہندی کے ہنگاموں سے دور کسی گوشہ میں آرام کر رہا تھا، اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر جھنجھوڑا اور جگایا گیا کہ "النکاح خیرٌ من النوم" لیکن وہ خوش قسمت ان باتوں کو کچھ دیر تک محض خواب ہی سمجھتا رہا، نیم خوابی کی حالت میں یہ بھی سوچتا رہا کہ کاش یہ سچ ہوتا۔ قصہ مختصر اسے پکڑ جکڑ کر نہلایا گیا اور زندگی کے محاذ پر لڑنے کے لئے اسے نکاح کے صرف دو بول سے لیس کر کے چھوڑ دیا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ یوں ہے کہ کوئی صاحب دلہا بنے، سہرے میں منہ چھپائے، اپنے روشن مستقبل کے بارے میں محو تھے، ابھی نکاح کے دو بول کہنا باقی تھا کہ ایک خاتون معہ چند بچوں اور نکاح نامے کے آپہونچی اور ہلّہ مچا کر اس بات کی تصدیق کر دی کہ موصوف نہ صرف ان کے شوہر محترم ہیں بلکہ کئی بچوں کے باپ بھی۔ چنانچہ فوری ایمرجنسی میٹنگ طلب کی گئی اور ان کو ہٹا کر فوری کسی "لنگڑے چچا" نامی شخص کو مسند نکاح پر بٹھا دیا گیا۔

زمانۂ قدیم کی شادیوں کی تقاریب میں کھانا کھلانا بے حد ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نکاح کے فوری بعد مصری بادام کی بارش (جس کی مقدار زیادہ ہوتی تھی) اور اس کے بعد طعام کا سلسلہ صبح تا نصف النہار ہوتا تھا لیکن آج کے دور میں نکاح کے بعد عام لوگوں کی ہلکی پھلکی تواضع اور دوسرے دن مخصوص میاں بیوی کو (جن کے بچے مدعو نہیں کئے جاتے) ایک وقت کے کھانے پر بُلا لیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بچے کسی نہ کسی طرح سراغ لگا کر دعوت میں پہنچ ہی جاتے ہیں۔ کیونکہ بچے صرف نکاح کے دو بول کے انتظار میں رہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ سالگرہ کی طرح شائد نکاح بھی ہر سال ہوا کرتا ہے۔ بعض بچے محض مصری بادام لوٹنے کی خوش فہمی میں خود اپنے ہی والد محترم کے دوسرے نکاح کے منتظر رہتے ہیں۔

جدید دور کی ایک شادی میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں دلہن تو موجود تھی لیکن دلہے کو نہ آنا تھا، نہ آیا۔ نکاح کے دو بول تو نہ ہو سکے البتہ بولیاں ضرور شروع ہوگئیں۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے چند دانشمند مرد و خواتین نے دلہن کو مجبور کیا کہ وہ کسی واقف کار لڑکے کے ساتھ بطور ایمرجنسی نکاح کے دو بول پڑھوا لے لیکن خوددار دلہن نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا "ایک دلہے کے بھجوائے ہوئے لباس کو زیب تن کئے دوسرے کے ہاں ہرگز نہ جاؤں گی"۔ چنانچہ اس کی مرضی کے موافق قدرت کی جانب سے اسے دلہا نمبر ایک ہی ہاتھ آیا۔

ایک اور شادی کا حال ملاحظہ ہو جس میں دلہا تو موجود تھا لیکن دلہن ندارد۔ محفل میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شادی میں آئے ہوئے بعض والدین کو اپنی بیٹیوں کے خواب پورے ہوتے نظر آنے لگے۔ مردانہ حصہ یا

پتہ ہی نہ چلا کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ قاضی صاحب بھی بے چین معلوم ہوتے تھے۔ سبھی فکر مند تھے، چنانچہ دلہن کے عزیزوں میں سے ایک صاحب جن کی پانچ لڑکیاں جوان تھیں، بڑی ہمت کے ساتھ یہ کہہ کر اٹھے "میں ابھی زنانہ سے تاخیر کی وجہ معلوم کر کے مطلع کرتا ہوں" لیکن زنانہ میں پہونچتے پہونچتے موصوف کی نیت بدل گئی۔ اپنی بیگم صاحبہ کو بلوا کر انہوں نے سرگوشی کی کہ باہر قاضی صاحب، دلہا اور سب لوگ اس بات پر حیران ہیں کہ دلہن اب تک شادی خانہ کیوں نہیں آئی اور پھر رازدارانہ طریقے سے کہنے لگے۔ "دیکھو بھئی! پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔ اور ذرا دیر ہوئی تو اپنی رشیدہ، فریدہ، سعیدہ، زبیدہ اور حمیدہ میں سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کے دو بول پڑھا دیں گے" مہمانوں سے گھبرا کر ان کی بیگم صاحبہ نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ "ذرا آہستہ بولو! لوگ سنیں گے تو کیا نہیں گے۔ دراصل بیوٹی پارلر میں دلہن کو دیر ہو رہی ہے، وہاں بھی دلہنوں کی کیو لگی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو آگئی دلہن۔ جاؤ اب جلدی جاؤ مگر دیکھو جی میری یاد سے لوٹو اور ایک آدھ ٹکڑا اپنی بچیوں کے منہ میں بھی ڈالو تاکہ بچیوں کی شادی جلد طے پائے"۔

نکاح کے دو بول پڑھانے کے لئے قاضیوں کا بھی ڈیمانڈ بڑھ گیا ہے۔ وقت پر ملتے نہیں، اگر مل بھی جائیں تو دوسرے نکاح میں جانے کی بے چینی قابلِ دید ہوتی ہے لیکن فوٹوگرافر یا مووی کے وقت سنبھل جاتے ہیں دراصل شرحِ پیدائش کی طرح شادیوں کا تناسب بھی کسی قدر بڑھ گیا ہے۔ جس طرح خاندان میں ایک اچھے ڈاکٹر کی کمی کو محسوس کیا جاتا ہے اسی طرح ہر خاندان میں ایک قاضی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ایک دن میں کئی ایک نکاح پڑھانا واقعی کئی نکاح کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ نکاح کے دو بول کا انتظار لڑکیوں کو زندگی کا کئی برس تک تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن قاضیوں کی غیر موجودگی سے کئی گھنٹے مزید کئی برس معلوم ہوتے ہیں۔

سراج نرملی

جو پارسا تھے آج گنہ گار ہو گئے — لُچّے لفنگے، صاحبِ کردار ہو گئے
شادی سے پہلے دونوں تھے ڈبلی ایوریج — بیارل وہ بن گئی ہیں تو ہم تار ہو گئے
رمّی میں ہار جاؤ گے جِدّی بیٹھیں بھی — اٹھو چلیں گے اب تو سوا چار ہو گئے
مذہب زبان ذات و علاقوں کے نام پر — باشندے اپنے دیس کے خونخوار ہو گئے
پہلے تھے شیروانی میں اب سوٹ بوٹ میں — حالی تھے پہلے آج وہ کلدار ہو گئے
ماں باپ میرے اور ترے ماتاجی اور پتا — سب تیرے میرے بیچ میں دیوار ہو گئے

بلوائیوں کے خوف سے جو بھاگ رہے تھے
ناحق سراج! وہ بھی گرفتار ہو گئے

غافل عادل آبادی

(جاپان)

ابّا ہمیں بتائیے جاپان ہے کہاں
بیٹے نے پوچھا باپ سے نقشہ نکال کے
غصّے میں باپ نے کہا جا اپنی ماں سے پوچ
ہر چیز تیری رکھتی ہے وہ خود سنبھال

(سورج)

اک شرابی نے یہ پوچھا پی کے دارو باپ
رات کو سورج یہ کیوں مُنہ اپنا دِکھلاتا
باپ بولا سُن بے غافل یہ نکلتا ہے
پر اندھیرے کے سبب تجھ کو نظر آتا

روشن لال روشن بنارسی

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

بے سود ہے کہ اس سے کرو عرضِ مدّعا
"غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا"
بیگم نہ دیکھیں جو عدالت کا راستہ
"کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ"
ہم ہی تو ہیں جو عشق میں ناکام رہ گئے
"دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا"
اس بے وفا نے باپ سے پٹوا دیا ہمیں
"کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ"
اک روز میرے گھر پہ جو آؤ تو جانِ من
"تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا"
سرخی ترے لبوں کی ہے غمّاز جانِ من
"کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا"
روشن غزل چھپی ہے ادا شکریہ کرو
"غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا"

رفیع احمد
(مالیگاؤں)

دیر اور اندھیر

خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں لیکن ہمارے دیش میں دیر بھی ہے اور اندھیر بھی۔ اگر آپ کسی روز دفتر دیر سے پہنچیں تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"۔ اب تاخیر کے لیے "باعثِ تاخیر" ضروری نہیں۔ آپ بلا سبب تاخیر سے دفتر آ سکتے ہیں اور وقت سے پہلے جا سکتے ہیں۔ دیر سے آنا یا دیر سے کام کرنا تو ہر ہندوستانی کی جبلت بن چکی ہے۔ آپ اسے ایک قومی بیماری بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تاخیر کا تعلق صرف دفتر ہی سے نہیں بلکہ یہ سلسلہ تو گھر سے دفتر اور گلی سے دلی تک پھیلا ہوا ہے۔

پہلے گھر ہی میں دیکھ لیجئے۔ بچوں کو شکایت ہے کہ ابا جان ان کی فرمائشیں جلدی پوری نہیں کرتے۔ ہر فرمائش تنخواہ پر ٹال دی جاتی ہے۔ ابا جان کو گلہ ہے کہ بچے وقت پر کام نہیں کرتے۔ بیگم صاحبہ اس بات پہ ناراض ہیں کہ صاحب رات کو تاخیر سے تشریف لاتے ہیں۔ صاحب کھانا دیر سے پکنے پر جامے سے باہر ہو رہے ہیں۔ ساس کو بہو سے شکایت ہے کہ ہاتھ جلدی نہیں چلتا۔ صرف زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کام کی نہ کاج کی لو من اناج کی۔ بہو بھی ساس کی شان میں قصیدہ پڑھتی ہے کہ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔ غرض یہی "دیر" بعض اوقات گھر میں اندھیر کا سبب جاتی ہے۔ اگر ہر ساس کو یہ احساس ہو کہ وہ بھی کبھی بہو تھی اور ہر بہو یہ سوچے کہ وہ بھی ایک دن ساس بنے گی تو دونوں کے تعلقات روس اور امریکہ جیسے نہ رہیں۔

اب گھر سے باہر نکلیے۔ ہر طرف آپ کو دیر کا اندھیر نظر آئے گا۔ گزشتہ ماہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ایک خط ۲۸ سال بعد اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا۔ میں کہتا ہوں یہ مقامِ شکوہ نہیں مقامِ شکر ہے کہ پہنچ تو گیا ورنہ ایسے بہت سے خطوط ہوں گے جو آج تک نہیں پہنچے اور اُن کے کاتب یا مکتوب الیہ اِس جہانی سے آنجہانی ہو چکے ہوں گے۔ بالفرض اُس خط کا تعلق عشق و محبت سے ہوگا تو اِتنے طویل عرصہ بعد اگر محبوب دادا بن چکا ہوگا تو محبوبہ بھی دادی یا نانی بن چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ خط کسی بچے کی سالگرہ کا دعوت نامہ ہو۔ آج مکتوب الیہ سالگرہ کی مبارکباد دینے جائیں گے تو اُنھیں سالگرہ کی بجائے شادی کی مبارکباد دینی ہوگی۔ اگر خط کی نوعیت کاروباری رہی ہوگی تو ہو سکتا ہے اب کمپنی دیوالیہ ہو چکی ہو۔ الغرض ۲۸ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے اور آج کے ترقی یافتہ دور میں تو چند منٹوں میں دنیا زیر و زبر ہو سکتی ہے۔ لیکن محکمۂ ڈاک کو اس کی

کیا فکر وہاں تو یہی عالم ہے "ہم اپنی خُو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں" انھیں دام (تنخواہ) میں اضافہ چاہیئے کام میں نہیں۔

دفاتر سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ پہلی ملاقات میں آپ کا کام نہیں ہوگا۔ دفتر میں فائلوں کا سمندر موجیں مار رہا ہے اور کلرک صاحبان اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ آپ دفتر کا طواف کرتے رہیے مگر آپ کا کاغذ ایک ٹیبل سے دوسرے ٹیبل پر بغیر نذرانہ لیے نہیں منتقل ہوگا۔ خاص طور پر سرکاری دفاتر کا حال تو سب سے زیادہ ابتر ہے۔ آپ کوئی مسئلہ وہاں لے جائیے آپ کو کل بلایا جائے گا۔ کل جانے پر پرسوں بلایا جائے گا۔ اس طرح آج کل پرسوں میں برسوں بیت جائیں گے۔ آپ کا مسئلہ ایک طویل عرصے تک زیرِ غور ہی رہے گا چاہے آپ اس دوران "زیرِ گور" ہو جائیں۔

یہی حال ہماری عدالتوں کا ہے۔ اب "عدلِ جہانگیری" کا زمانہ نہیں کہ اِدھر آپ نے "زنجیرِ عدل" کھینچی اور اُدھر بادشاہ انصاف کے لیے حاضر۔ یہ جمہوری دَور ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کا زمانہ ہے۔ پہلے آپ عدالت میں وکیل کی معرفت کیس داخل کیجئے۔ برسوں بعد جب آپ کے کیس کا نمبر آئے گا تو اُس وقت تک آپ کے کئی گواہ عدالت کی بجائے خدا کے حضور حاضر ہو چکے ہوں گے۔ پھر برسوں تک بیانات اور گواہیوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کے بعد عمر نے رفاقت کی تو آپ بذاتِ خود جج کا فیصلہ سُن لیں گے ورنہ آپ کے جانشینوں کو سُننا پڑے گا۔ کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ مقدمہ لڑنے کے لیے قارون کا خزانہ، عمرِ نوح اور صبرِ ایوب درکار ہے۔

دیر کا یہ اندھیر صرف دفتر یا عدالتوں تک محدود نہیں بلکہ یہ تو راستے کے ہر موڑ، منزل کی ہر ڈگر، ہر شعبے اور ہر محکمے میں موجود ہے۔ شاہانہ دور تو ختم ہوگیا لیکن شاہانہ عادات و اطوار آج بھی باقی ہیں۔ دواخانے جائیے تو مریض ڈاکٹر کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔ بس اسٹینڈ جائیے تو مسافر بس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کا پتہ نہیں۔ شعراء کے محبوب اور ہماری ٹرینوں میں دو باتیں مشترک ہیں۔ دونوں برق رفتار ہیں اور دونوں دیر سے آتے ہیں۔ ہر حال میں وہ لیٹ (late) ہی آئیں گے چاہے آپ ریل کی پٹڑی پر لیٹ جائیں۔ آج کل ہمارے وزراء میں بھی یہ محبوبانہ صفت پائی جا رہی ہے۔ ان کے انتظار میں ٹرین کیا طیارے تک لیٹ ہو جاتے ہیں۔ محبوب کے لیٹ آنے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا سواریوں کے لیٹ ہونے سے ہوتا ہے لیکن جنتا کا یہ نقصان "جنتا کے خادموں" کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہمارے سماج میں کسی ہستی کی بڑائی کا اندازہ اس کے دیر سے آنے سے لگایا جاتا ہے۔ جو شخص جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی دیر سے آئے گا یا تاخیر سے کام کرے گا۔ جلسوں، کانفرنسوں، مشاعروں اور دوسری تقریبات میں آپ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ جو وقت کے پابند ہوتے ہیں اُنھیں کرسئ صدارت کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ بڑوں کا یہ "لیٹ فیشن" دیکھ کر عوام بھی دیر سے آتے ہیں۔ مشاعرہ کا وقت اگر ۹ بجے دیا گیا ہو تو باشعور سامعین سمجھ جاتے ہیں کہ مشاعرہ ۱۱ بجے شروع ہوگا اور تہجد کے وقت عروج پر آئے گا۔ شعراء کو ان کے مقام اور مرتبے کے مطابق مائک پر بلایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے نومشق شعراء کو اور بعد میں استاد شعراء کو دعوتِ نغمہ سرائی دی جاتی ہے۔ سب سے آخر میں جناب صدر کو غزل سرائی کی زحمت دی جاتی ہے۔ صدر

مشاعرہ چونکہ تمام شعراء کو برداشت کر چکے ہوتے ہیں چنانچہ وہ اس انداز سے اٹھتے ہیں کہ [illegible] کے بیٹھو مری باری آئی ہے لیکن سامعین کو نیند کی مدہوشی میں جگر تھامنے کا ہوش کہاں۔

آپ تو ایک زمانے سے وقت کے غلام ہیں۔ کیا آپ کا نام کسی اخبار کی زینت بنا؟ کسی نامہ نگار نے آپ سے انٹرویو لیا؟ وقت پر کام کرنے کا فائدہ ہی کیا؟ ہمارا دیش آزاد ہے۔ ہم آزاد ہیں۔ ہم نے انگریزوں کی غلامی برداشت نہیں کی تو اس دو ٹکے کی گھڑی کی غلامی کیسے برداشت کریں گے؟ ہم گھڑی کے غلام نہیں۔ گھڑی ہماری غلام ہے۔ آج تک انسان گھڑی بناتے آئے ہیں۔ گھڑی نے کسی انسان کو نہیں بنایا۔ اگر ہم وقت کی پابندی کرنے لگیں تو ہندوستان، ہندوستان نہیں رہے گا۔ جاپان بن جائے گا۔ بزرگوں نے ہماری بات کی تائید فارسی زبان میں یوں کی ہے۔

"دیر آید درست آید"

○○

غزلیں

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

لوگ کہتے ہیں کہ مجھ کو کام کی عادت نہیں
پاپڑ اپنا توڑ لوں اتنی مجھے طاقت نہیں

کام کوڑی کا نہیں اور نام کو فرصت نہیں
حیرت اس پہ ہے کہ اس پر بھی مجھے حیرت نہیں

میری قسمت میں لکھی بریانی تھی میں کیا کروں
مجھ کو اس سے کیا اگر رقعہ نہیں دعوت نہیں

ناچتے تھے جو کبھی نچوا رہے ہیں آج کل
اب سیاست میں پڑھے لکھوں کی کچھ حاجت نہیں

بات دامن کی اگر آئے تو دامن اور ہے
ہاتھ پھیلاؤں میں اپنا یہ مری فطرت نہیں

شعر کہتا تو ہوں شعروں کی مگر شہرت نہیں
کام عزت کا میں کرتا ہوں مگر عزت نہیں

کاہلی کا نام ہے بدنام بے وجہ یہاں
کیا کروں تقدیر میں لکھا ہے گر دولت نہیں

جن کے ہاں دولت نہیں فرصت ہے ان کو رات دن
جن کے ہاں دولت ہے ان لوگوں کے ہاں فرصت نہیں

عقد ثانی کیوں مرا ہوتا نہیں اے متقی
کیا مری تقدیر میں اک دوسری عورت نہیں

○

چپکے چپکے رات دن مسجد کو جانا یاد ہے
مجھ کو اب تک وہ مرا جوتے چرانا یاد ہے

قرض لینا وہ مرا پہلی کے وعدے پر سدا
اور پھر پہلی سے پہلے بھول جانا یاد ہے

چولہے پہ ہانڈی چڑھا کر ان کا کرنا انتظار
اور مع تھیلی کے میرا بھاگ جانا یاد ہے

کھینچ لینا ان کے منہ سے چوکڑا وہ دفعتاً
پوپلے منہ سے وہ ان کا بڑبڑانا یاد ہے

جنوری آتے ہی ضد کرنا نمائش کے لیے
فروری تک منہ پھلانا، جوتے کھانا یاد ہے

کیا نہیں آئی ابھی مجھ پر جوانی متقی
کیوں مجھے آخر وہ بچپن کا زمانہ یاد ہے

محبوب مانجھوی (بہار)

○

کب اپنی اصلیت کو بدل پائے رہے گدھے
کھا کر بھی زعفران گدھے کے رہے گدھے

برجستہ کہہ گیا کوئی سن کر مری غزل
اب شاعری سے شوق بھی کرنے لگے گدھے

پھرتے ہیں مارے مارے سڑک چھاپ کی طرح
اکیسویں صدی میں بھی لکھے پڑھے گدھے

کیا جانے بیٹھے بیٹھے یہ کیا آ گیا خیال
مارے خوشی کے لوٹ لگانے لگے گدھے

ملتا نہیں ہے جاب تو تنگ آ کے آخرش
جتنے پڑھے لکھے تھے، چرانے لگے گدھے

کتوں کی طرح گھر کے رہے اور نہ گھاٹ کے
تیرِ نگاہِ ناز کے مارے ہوئے گدھے

محبوب دور ہی سے ذرا واسطہ رکھو
چڑھ جائیں گے وگرنہ تمہارے گلے گدھے

کلیم اللہ
(حیدرآباد)

حیدرآباد کا جغرافیہ

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے تین بڑے ریلوے اسٹیشن ہیں جن کو عام بول چال میں "ٹیشن" کہا جاتا ہے۔ نامپلی ٹیشن، کاچی گوڑہ ٹیشن اور سکندرآباد ٹیشن۔ حیدرآبادی بہت ہی خوش مزاج، ہمدرد، ملنسار، مہمان نواز، بزلہ سنج اور پُر خلوص واقع ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کی چند کہاوتیں بہت مشہور ہیں۔ "حیدرآباد نگینہ اندر مٹی اوپر چونا"۔ "اوپر شیروانی اندر پریشانی"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ حیدرآبادی بلاوجہ پریشان ہونے میں مہارت رکھتے ہیں۔ پریشانی، شیروانی، بریانی اور پانی حیدرآباد کے اجزائے لازم ہیں۔ کسی زمانے میں ہر خاص وعام شیروانی زیب تن کیا کرتا تھا، عثمانیہ یونیورسٹی کا یونیفام شیروانی تھی۔ شیروانی خود ایک تہذیب کی علامت تھی جو اب صرف تقاریب تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ بریانی اور اس کے لوازمات میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن بریانی کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اور پینے کے لئے پانی ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ بعض محلوں میں تو ڈرینیج کے پانی، نل کے پانی میں مل جانے سے اموات بھی واقع ہوئی ہیں۔ پریشانی، شیروانی، بریانی اور پانی کے بعد نمبر آتا ہے' حیدرآباد کے پرسوں کا۔ قدیم سے قدیم واقعہ یہاں پرسوں کا واقعہ کہلاتا ہے۔ حتیٰ کہ بڑے بوڑھے سنہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے کہ پانی نہ رہنے کے باوجود پرسوں موسیٰ ندی میں طغیانی کس طرح آئی تھی۔

محل وقوع:۔ "دکن کے دم چھلے کے بغیر حیدرآباد نامکمل سا لگتا ہے۔ حالات نے پلٹا کھایا تو حیدرآباد صرف حیدرآباد بن کر رہ گیا اور "دکن" خود بخود نکل گیا۔ حیدرآباد کے شمال میں حیدرآباد، جنوب میں حیدرآباد حتیٰ کہ حیدرآباد کے مشرق و مغرب میں بھی حیدرآباد۔ یعنی حیدرآباد کے چاروں سمت حیدرآباد ہی حیدرآباد ہے۔ دہلی کی طرح حیدرآباد بھی قدیم اور جدید شہروں پر مشتمل ہے اور دہلی ہی کی مانند حیدرآباد بھی اُجڑنے، بسنے لگا ہے۔

آب وہوا :۔ آب و ہوا کے تعلق سے مندرجہ ذیل شعر پیش ہے ۔

خشک ہے گنڈی پیٹ تو کیا غم
پانی غائب ، دھواں تو باقی ہے

آب یعنی پانی گنڈی پیٹ ، حمایت ساگر اور منجرا کے ذخیرۂ آب سے نلوں کے ذریعہ ایک دن کے وقفے سے گھر گھر پہونچایا جاتا ہے اور وہ بھی حسب گنجائش ۔ ہوا کے نام پر گرد و غبار ، ڈیزل کا دھواں سانس کے ذریعہ پھیپھڑوں میں جاتا ہے ۔ اسی دھوئیں کی بدولت حیدرآبادیوں کی سانس چل رہی ہے اور اس دھوئیں اور گرد و غبار کے ہم اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ کھلی اور تازہ ہوا ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے ۔ ویسے ، تازہ ہوا آخری وقت شائد دواخانے میں آکسیجن سلنڈر کے ذریعہ میسر آسکے ۔ ہوا کی قلت کا اگر یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا پڑوسی سانس چھوڑے گا یا موٹر کاریں دھواں خارج کریں گی تب ہی ہم سانس لے پائیں گے ۔

تفریح گاہیں :۔ موڈی ہاؤز دنیا کے ہر شہر میں ہیں ۔ یہاں بھی ہیں جو کھٹملوں کی پرورش گاہیں ہیں ۔ بے روزگاروں کی رہائش کے لئے باغ عامہ موزوں جگہ ہے لیکن عثمان ساگر ، حمایت ساگر اور حسین ساگر سوائے حیدرآباد کے کرۂ ارض پر کہیں اور نہیں ، ان تالابوں میں تیرنا سختی سے منع ہے ۔ اس لئے اکثر نوجوان تفریحاً پانی میں غوطہ لگاتے ہیں اور تیرنے کی ممانعت کی وجہ سے ہاتھ پیر کو حرکت نہیں دیتے لہذا ڈوب مرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ چوک کی گھڑیال ، معظم جاہی مارکٹ کی گھڑیال ، فتح میدان کی گھڑیال ، سکندرآباد ٹاور کی گھڑیال برسہا برس سے مسلسل بند رہ کر تفریح کا سامان مہیا کررہی ہیں ۔ اور چوبیس گھنٹے میں ایک مرتبہ بالکل ٹھیک وقت بتاتی ہیں ۔

ذرائع آمد و رفت :۔ ذرائع آمد و رفت کے نام پر سیکل رکشا ، آٹو رکشا ، ٹیکسی اور بسیں موجود ہیں لیکن ٹیکسی عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہے ۔ رکشا راں اور آٹو رکشا رانوں کی زبان سمجھ سے باہر ہوتی ہے ۔ جس سواری میں ہزاروں لوگ سوار ہوں وہی بس کہلاتی ہے ۔ بس کے آگے آدمی بالکل بے بس ہے ۔ کاروں کی تعداد بے کاروں سے زیادہ ہے ۔ جو گاڑی آدمی کو روند ڈالے اُسے لاری کہتے ہیں ۔ بنڈی کا چلن جاری ہے ۔

سڑکیں :۔ زمانے قدیم میں شہر حیدرآباد سمنٹ کی سڑکوں کے لئے بہت شہرت رکھتا تھا ۔ اب ان سڑکوں کے کھنڈرات باقی ہیں ۔ معظم جاہی مارکٹ سے براہ عثمان گنج جو سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی قدیم شہر کو جاتی ہے اُسے پچھلے وقتوں میں شاہراہِ عثمانی کا درجہ اور شرف حاصل تھا ۔ اس اعتبار سے یہ سڑک تاریخی اور تہذیبی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس سڑک پر موجود دورِ عثمانی کے گڑھوں کی خاص طور سے نگہداشت کی جاتی ہے تاکہ دورِ ماضی کی یاد ہمارے ذہنوں میں تازہ رہے ۔ فتح نگر ریلوے گیٹ سے بالا نگر کی سمت جانے والی سڑک کشتی رانی کے لئے مفید ہے ۔ اس سے حادثات بھی کم ہوجائیں گے ۔

بہرحال شہر کے سڑکوں کی ابتر حالت کے پیش نظر یقین ہو چلا ہے کہ حیدرآبادیوں کو دوزخ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا ۔

پُل :- قدیم اور جدید شہر کے بیچ سے موسیٰ ندی بہتی ہے۔ اب بہنے کا شغل موقوف ہوگیا ہے حالانکہ ندی کی پہچان قائم رکھنے کے لئے اس میں ڈرینج کا پانی بھی چھوڑا جاتا ہے۔ موسیٰ پر نو پُل ہیں

۱۔ ٹیپو خان کا پُل۔ یہ پُل پہلے شہر سے باہر تھا اب شہر خود آپے سے باہر ہوگیا ہے۔
۲۔ بمبئی نیشنل ہائی وے :- یہ راجندر نگر سے ملاتا ہے۔ ابھی طفلِ مکتب ہے۔
۳۔ پرانا پل۔ چار سو سال پرانا ہے لہٰذا آثار قدیمہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے چار سو سالہ قدیم گڑھوں کو اُسی حالت میں برقرار رکھا گیا ہے۔
۴۔ مسلم جنگ پُل :- یہ پُل پُل صراط کا کام دیتا ہے۔
۵۔ نیا پُل :- آبادی میں اضافہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس پُل کو کشادہ کیا گیا ہے۔ اس کا نام "کشادہ پُل" ہونا چاہیئے تھا
۶۔ چادرگھاٹ پُل :- اس پُل پر نہ "چادر" ہے اور نہ "گھاٹ" البتہ پولیس والے گھات میں رہتے ہیں۔
۷۔ سالار جنگ پُل :- شبھ گھڑی کے انتظار میں سرکاری افتتاح سے محروم ہے۔
۸۔ ریلوے پُل :- خودکشی کے لئے بے حد موزوں ہے۔
۹۔ موسیٰ رام باغ پُل :- برسات کے موسم میں زیرآب رہتا ہے۔

پیداوار :- حیدرآباد میں پہلے ہر چیز پیدا ہوتی تھی اب صرف بچے اور افواہیں پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل دیکھا جائے تو پہلی افواہ ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۸ء کی طغیانی سے شروع ہوئی تھی کہ "ہاتھی آیا بھاگو" اور ۲۴ر ستمبر ۱۹۷۰ء کی افواہ تھی "پانی آیا بھاگو"۔ اب افواہ کی پیدائش برسات کے موسم کی محتاج نہیں رہی بلکہ آج کل تو افواہوں کے لئے فضا بہت سازگار ہے۔ اکثر کسی نہ کسی بڑی شخصیت کے مرنے کی افواہ پھیلتی ہی رہتی ہے۔ حیدرآبادیوں کو کبھی ہاتھی بھگاتا ہے تو کبھی پانی تو کبھی کرفیو تو کبھی فساد۔ شاعر، ادیب، انشاء پرداز، رہنما اور نیک انسانوں کی طرح جو شئے اُگ رہی ہے وہ ہے مزاح نگار۔ مزاح نگاروں کی پیداوار پہلے کی بہ نسبت چار گنا بڑھ گئی ہے۔

نئی پیداوار :- حیدرآباد کی بالکل نئی پیداوار یہاں کی ادبی اور تہذیبی انجمنیں ہیں جن کے کام ہیں تہنیتی جلسے منعقد کرنا یا کسی بڑی شخصیت کا سوگ منانا۔ یعنی تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے والا معاملہ ہے۔ ان انجمنوں کی تعداد دن دوگنی رات چوگنی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ویسے بعض لوگوں کا کام تو ہر وقت کسی بڑی شخصیت کی دل کی دھڑکن گنتے رہنا ہے۔ پتہ نہیں کب دھڑکن بند ہو اور کب یاد منائی جائے۔ ان انجمنوں کے علاوہ فسادات کی وجہ سے ایک نئی انجمن وجود میں آئی ہے جسے "امن کمیٹی" کہتے ہیں۔ اس انجمن کو برقرار رکھنے کے لئے فسادات کا ہونا اشد ضروری ہو جاتا ہے۔

ذرائع ابلاغ :- حیدرآبادی کاغذ کے بجائے دیواروں پر لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہر کی دیواروں پر توصیفی کلمات، گالی گلوج، محبت نامے، اعلان ہراج، وارننگ، اشتہارات مثلاً ظالم لوشن، نیم کا ٹھنڈا سُرمہ، زندہ طلسمات، لارڈز کرکٹ کلب، بہادر کبڈی کلب، کُتّا چھاپ دنت منجن وغیرہ۔ دیواروں پر الکشن کی تشہیر

کی وجہ سے شہر کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ اگر الکشن کی تشہیر دیواروں پر نہ ہوتی تو دیواریں بے مقصد رہ جاتیں۔ ان تشہیروں میں بعض اپیلیں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بابو بھائی کی اپیل ... فلاں پارٹی کو ووٹ دے ورنہ ... "۔ "خاجو بھائی کی اپیل ــــ ہمارے اُمیدوار کے اونٹ دے نئی تو محلہ چھوڑئے" اور "مرزا کی اپیل اپنے ووٹ دیتا یا چھوڑوں ایک ...۔ "شکریہ"

ٹورسٹ کے لئے ضروری ہدایت :۔ آپ کی آمد کے وقت شہر میں کوئی افواہ نہ پھیلی ہو تو چار مینار مکہ مسجد، سالار جنگ میوزیم، قلعہ گولکنڈہ، گنبدان قطب شاہی، ٹولی مسجد، نمبہ پارک وغیرہ وغیرہ ضرور دیکھیں ورنہ برلا مندر یا نوبت پہاڑ پر سے دور بین کے ذریعہ نظارہ کرلیں۔ ــــ
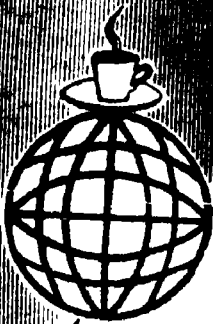
خامہ بگوش
(پاکستان)

جس روز اُن کا کالم شائع نہیں ہوتا اُس روز ردّی والے بھی اخبار کو ہاتھ نہیں لگاتے

اگر کوئی شخص بیک وقت شعر نگار، ڈراما نگار، سفرنامہ نگار اور کالم نگار ہو تو وہ ادیب سے زیادہ نگار خانہ نظر آتا ہے اور عطاء الحق قاسمی تو نگار خانۂ رقصاں ہیں کہ آج چین میں ہیں تو کل امریکہ میں۔ کبھی فرانس، ہالینڈ اور جرمنی کی سیر ہو رہی ہے تو کبھی ترکی، افغانستان اور ایران کی۔ خلیج کی ریاستوں میں تو ان کا آنا جانا اس طرح رہتا ہے جیسے اپنے گھر سے نکلے اور ڈاکٹر انور سدید کے گھر ہو آئے۔ اگرچہ ان دونوں میں خیالات و نظریات نیز گردشِ حالات کی وجہ سے بُعد المشرقین ہے، لیکن مکان دونوں کے قریب قریب ہیں تاکہ فریقین کو سرورِ خاطر ہمسایہ سے محظوظ ہونے کا موقع ملتا رہے۔

پچھلے چھ مہینوں میں عطاء الحق قاسمی کم از کم چار مرتبہ دوبئی اور قطر وغیرہ کا چکّر لگا چکے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ان ریاستوں میں چونکہ ہر طرح کی کرنسی قبول کی جاتی ہے، اس لئے وہ نظر بچا کر اپنے نام اور کلام کا سکّہ چلا آتے ہیں۔ نظام سقّہ نے چمڑے کا سکّہ چلایا تھا، عطا کے پاس فقط نام اور کلام ہے، سو ان کے دار الضرب میں یہی سکّے ڈھلتے ہیں۔ ایسی کم عمری میں اتنی ہر دلعزیزی اداکاروں اور کھلاڑیوں میں تو دیکھی تھی، ادیبوں، شاعروں میں یہ دینا شاکر کے بعد یہ مقام، خدا نظرِ بد سے بچائے، عطاء الحق قاسمی ہی کو ملا ہے۔

ہم نے عطا کا کلام بد قسمتی سے نہ سُنا ہے نہ پڑھا ہے۔ لیکن جو لوگ اس آزمائش سے گزرے ہیں، وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے، لیکن زبانِ حال سے "اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے" کی تصویر بن جاتے ہیں۔ گویا عطاء الحق قاسمی شعر نہیں کہتے، تیر چلاتے ہیں۔ اُردو کا ایک محاورہ تکّا چلانا بھی ہے، لیکن یہ اس کا محل نہیں۔ سُنا ہے کہ ان کی غزلوں کا مجموعہ "آشوبِ ہوا" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت تک اگر ہم میں شعر فہمی کی صلاحیت باقی رہ گئی تو انشاء اللہ ہم بھی عطا کی شاعری کے ہواداروں یا ہوا خواہوں میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کریں گے۔

غیر ممالک میں مشاعرے پڑھ کر آتے ہیں تو عطا سفر نامے لکھتے ہیں۔ گویا پڑھنے اور لکھنے کے کام ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اسی بناء پر ان کا شمار پڑھے لکھوں میں ہوتا ہے۔ بیک وقت ان کے چار سفر نامے زیرِ طبع ہیں۔ اس "زیرِ طبع" کو جولانیٔ طبع کا مترادف سمجھنا چاہیئے ورنہ کاغذ اور قاری دونوں کے لئے ایک وقت میں چار سفر ناموں کا بوجھ اٹھانا ذرا مشکل ہوگا۔

عطا کے سفر ناموں کے جو حصے رسالوں اور اخباروں میں چھپے ہیں، ان کی بنا پر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ عطا نے اُردو سفر نامے کو ایک نیا رنگ دیا ہے جو انہیں سے مخصوص ہے۔ وہ سفر نامے کے بہانے تاریخ یا جغرافیے کی کتاب نہیں لکھتے بلکہ منازل و مراحل کے باطن کا سراغ دیتے ہیں۔ وہ پامال راستوں سے بھی گذرتے ہیں تو انھیں اپنے منفرد زاویۂ نظر کے حوالے سے نیا پن عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے سفر نامے اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ قاری کھو جاتا ہے۔ عطا تو سفر سے واپس آ جاتے ہیں لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔ اس سے خدانخواستہ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ عطا کے سفر نامے گمراہ کن ہوتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب قاری عطا کے سفر نامے پڑھتا ہے تو وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ خود ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی عطا اپنے کالموں میں کسی سفر کی روداد سناتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ مفت کے ٹکٹ پر ہم بھی دنیا دیکھ لیں ...... لیکن ہم اکادمی ادبیات کے منظورِ نظر ہیں نہ حکومت کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں۔ ہمیں مفت کا ٹکٹ ملے تو کیوں؟

عطا کا اصل کارنامہ ان کی کالم نگاری ہے۔ اس وقت ہمارے اخباروں میں جو دو چار اچھے کالم نگار نظر آتے ہیں، ان میں عطا بھی شامل ہیں۔ جس اخبار میں وہ کالم لکھتے ہیں، وہ کبھی اپنے اداریوں کی وجہ سے مقبول تھا، اب عطا کے کالموں کی وجہ سے مشہور ہے۔ جس روز عطا کا کالم شائع نہیں ہوتا، اس روز ردی والے بھی اخبار کو ہاتھ نہیں لگاتے ہمارا تو یہ حال ہے کہ سب سے پہلے عطا کا کالم پڑھتے ہیں اور اس کے بعد "ضرورت ہے" کے اشتہارات۔ یہ فیصلہ ہم اب تک نہیں کر سکے کہ ہماری بیروزگاری عطا کی وجہ سے ہے یا ہم بیروزگاری کی وجہ سے عطا کے کالموں پر گذر بسر کرتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو، عطا کے کالم ہمارے لئے عطائے خاص کا درجہ رکھتے ہیں۔

پچھلے ایک ہفتے سے عطا کے کالموں کا نیا مجموعہ "جرمِ ظریفی" ہمارے حق میں "جرمِ ضعیفی" کی سزا ثابت ہو رہا ہے یعنی ہم نے اس کتاب کو پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا۔ اب تک عطا کے کالموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "روزنِ دیوار سے"، "عطائیے" اور "خندِ مکرر"۔ مگر "جرمِ ظریفی" سب سے بازی لے گیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ مجموعہ اس زمانے کی تخلیق ہے جس میں عطا کی عمر اور فن دونوں میں پختگی آئی ہے۔ عمر میں پختگی کا ثبوت اس تصویر سے ملتا ہے جو کتاب کے سرورق پر چھپی ہے اور فن کی پختگی کا اندازہ کتاب کے متن سے ہوتا ہے۔

سو سے زائد کالموں کا یہ مجموعہ پڑھنے کے لائق ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ موضوعات کا تنوع ہے۔ سیاست، معاشرت اور ادب کے کیسے کیسے پہلوؤں پر عطا نے لکھا ہے! حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص کا مشاہدہ کس غضب کا ہے۔ ہم آپ جن چیزوں پر سرسری نظر ڈال کر گذر جاتے ہیں، عطا ان کے حوالے سے مضامینِ نو کے انبار لگا دیتے ہیں۔ دوسری خوبی عطا کا شگفتہ اندازِ بیان ہے۔ کوئی جملہ ایسا نہیں جو شگفتہ بیانی کا آئینہ دار نہ ہو۔ یہاں تک کہ جہاں بوجوہ شگفتگی کی گنجائش نہیں ہوتی، وہاں بھی وہ پنجابی الفاظ کے استعمال سے جملے ہی کو نہیں، قاری کو بھی شگفتہ کر دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اُردو میں انگریزی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے تھے، اب تو بعض اہلِ قلم نے ان کی جگہ پنجابی

الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ بڑھ گیا تو وہ دن دور نہیں جب اُردو کتابوں کو سمجھنے کے لئے پنجابی کی ڈکشنری سے مدد لینے کی ضرورت ہوگی۔ اس معاملے میں ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کرنے کیلئے کسی باقاعدہ کوشش کی ضرورت نہیں۔ اُردو ایک وسیع المشرب زبان ہے، دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے میں بڑی فراخدل ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود وہ مقامی الفاظ جو اس کے مزاج کے مطابق ہوں گے، اس کا حصّہ بنتے جائیں گے۔

معاف کیجئے، ہم بھی اُستاد لاغر مراد آبادی کی طرح سنجیدہ ہو گئے۔ حالانکہ عطاء الحق قاسمی کی کتاب پر کالم تو کیا تنقید لکھنے کے لئے بھی سنجیدگی کے بغیر کام چل سکتا ہے۔ ہاں تو عطا کی کتاب "جرم ظریفی" کی دو خوبیاں تو ہم نے اوپر بیان کردی ہیں، تیسری خوبی یہ ہے کہ اس میں جو کالم شامل ہیں، وہ چھپے تو اخبار میں تھے، لیکن اخباری نہیں ہیں۔ انھیں بغیر کسی تکلف کے ادبی تخلیقات کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ "جرم ظریفی" کالموں کا نہیں، طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کی ادبی قدر و قیمت دائمی ہے۔ انھیں کسی بھی موسم اور کسی بھی زمانے میں یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ عطا کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ہنگامی موضوعات پر جو بھی لکھا وہ ادب بن گیا۔

عطا کی کتاب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعدد شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اگر اس نوعیت کے کالموں کو کچھ طویل کردیا جاتا تو یہ اچھے خاصے شخصی خاکے بن جاتے۔ موجودہ صورت میں بھی ان کالموں میں اچھے شخصی خاکوں کی بنیادی خصوصیات موجود ہیں۔ عطا کو شخصی خاکوں کی طرف باقاعدگی سے توجہ کرنی چاہیئے۔ اس طرح ان کے نگار خانۂ فن میں ایک اور شمع روشن ہو جائے گی۔

عطا کی کتاب کی پانچویں خوبی یہ ہے .... معاف کیجئے اگر ہم اسی طرح خوبیاں شمار کرتے رہے تو یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ پڑھنے والے کہیں گے دعوے تو کر رہے ہو، دلیلیں کہاں ہیں۔ ہم کوئی عطا کے وکیل تو ہیں نہیں، جو دعووں کے ساتھ دلیلیں بھی پیش کریں۔ ہم نے کتاب پڑھی، اور اپنے تاثرات قلمبند کردیئے۔ اگر کسی کو ہم سے اتفاق نہیں ہے تو نہ ہو، ہمارے لئے یہی بہت ہے کہ عطاء الحق قاسمی ہم سے صد فی صد متفق ہوں گے۔

ہم نے کچھ عرصہ قبل عطا کی کسی کتاب پر کالم لکھا تھا۔ یہ کالم پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں شامل ہو گیا۔ اُمید ہے ہمارا موجودہ کالم ایم اے کے نصاب میں شامل ہو جائے گا کیونکہ اس میں ہم نے عطا کی تعریف پہلے سے زیادہ اور دل لگا کر کی ہے۔

--

قلمی معاونین تخلیقات پر اپنا پتہ لکھنا نہ بھولیں۔

سید حسین علی امام
(پاکستان)

"آ" سے آنٹی ماں

خالہ اماں، خالہ جان وغیرہ کے الفاظ تو سبھی نے کہے اور سُنے ہوں گے لیکن "آنٹی ماں" جیسا میٹھا، مستند اور کانوں کو بھلا لگنے والا لفظ کبھی بھی آپ نے نہیں سُنا ہوگا۔ "آنٹی ماں" ہماری خالہ ہوتی ہیں اور ہماری ہی ہیں۔ سارے محلہ کی وہ "آنٹی ماں" ہیں۔ "آنٹی ماں" کا لفظ دراصل "انگریزی۔اُردو" سنگم کا ایک نیا رُخ پیش کرتا ہے۔ اور موجودہ معاشرے میں جس تیزی سے انگریزی ثقافت داخل ہو رہی ہے، اُس کی عکاسی کرتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اُردو لغت میں خالہ کے لئے "آنٹی ماں" کا لفظ "Introduce" کرنے کا سہرا ہمارے سر رہے گا۔ بہرکیف "آنٹی ماں" کو سب سے پہلے کس نے آنٹی ماں کہا؟ یہ غلام گھر کی کار کو بچانے والا اہم سوال بن سکتا ہے۔ کیونکہ "آنٹی ماں" کا لفظ خود ہماری آنٹی ماں کا اختراع کردہ ہے اور ہم بچوں کو بچپن میں ڈانٹ کر انہوں نے یہ لفظ یاد کرایا تھا کہ مجھے خالہ اماں مت کہا کرو بلکہ آنٹی ماں کہا کرو۔ کیونکہ ماڈرن زمانہ آچکا ہے اور انگریزی الفاظ کے استعمال سے رُعب پڑتا ہے۔ پس ہم نے طوطے کی طرح رٹ کر یہ لفظ یاد کرلیا اور آج بھی احترام سے ادا کیا جاتا ہے۔ (اس سے خالہ اماں کے رشتے میں ایک رعب و اثر قائم ہوگیا جو کہ صرف خالہ جان وغیرہ کہنے سے ممکن نہیں تھا)۔

آنٹی ماں میں بہت سی خوبیاں ہیں جو کہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ہماری خالہ ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ خدمت خلق میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اُن کے جاننے والے اور ہم عمر لوگ انہیں شعبۂ خدمت خلق کی چلتی پھرتی تنظیم سمجھتے ہیں۔ یعنی کہ جو کام کوئی پوری تنظیم سرانجام دیتی ہے وہ اکیلے ہماری آنٹی ماں منٹوں میں کردیتی ہیں۔ آنٹی ماں کی دوسری خوبی شعبۂ نشر و اشاعت ہے۔ اگر مارک ٹیلی "آنٹی ماں" کے ٹیلنٹ دیکھتا تو یقیناً اُن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتا یا انہیں B.B.C میں اعلیٰ تربیت دینے والی اکیڈمی میں اعزازی پروفیسر مقرر کرواتا تاکہ مغرب بھی اُن سے استفادہ حاصل کرسکے۔ ہمیں اس موقع پر مشہور انگریز ڈرامہ نگار جارج برنارڈ شاء کا یہ قول یاد

ا ہے کہ جب کسی نے شا سے دریافت کیا تھا کہ اخبار، ٹیلیفون اور عورت میں کون تیزی سے خبر ایک جگہ سے
سری جگہ پہنچا سکتا ہے تو اُس نے جواب دیا "عورت"۔ میں سمجھتا ہوں کہ برنارڈ شا کے پیشِ نظر ہماری
ٹی ماں، جیسی عورت ہی ہو گی۔

آنٹی ماں کی تیسری اور اہم خوبی ان کے اہل و عیال اور اپنی مدح سرائی اور قصیدہ گوئی ہے۔ آنٹی ماں،
تعریف کے معاملے میں خاصی فراخدل واقع ہوئی ہیں۔ ہر محفل، ہر دکان، ہر گھر کے سامنے سے گذرتے ہوئے جہاں
کسی خاتون سے ملاقات ہو، اپنی مصروفیات کا تذکرہ کرتی ہیں۔ اپنے صاحبزادے، صاحبزادیوں کے گُن گاتی
۔ لغت میں موجود جملہ اوصاف حمیدہ کسی بھی شخص میں جمع ہو سکتے ہیں تو اُن کی رائے کے مطابق وہ سب
ی اولاد میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ فرشتہ صفت، عبادت گذار، ہنس مکھ، پھوہڑ وغیرہ۔ ہم وثوق کے
تھ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے افتتاحی دور میں خلفائے راشدین کے اولین دور کی جھلک صرف انہیں
گھر ملے گی۔

"آنٹی ماں" کی طرح اُن کی صاحبزادیوں میں بھی اعلیٰ خوبیاں موجود ہیں۔ اُن میں سے ایک اپنی والدہ کا خیال
تی اور ہمہ وقت اُن کی خدمت کرتی ہے۔ ایک دفعہ ریڈیو کا مشہور کالم "آپ کی صحت" (جس نے اچھے بھلے اشخاص
حت خراب کر دی) آ رہا تھا۔ پروگرام ہائی بلڈ پریشر سے متعلق تھا۔ ہماری نانی صاحبہ جنھیں حقیقتاً بلڈ پریشر
، کچھ علامتیں سُن کر فرمانے لگیں کہ ڈاکٹر صحیح کہتا ہے۔ یہ علامتیں میں اپنے اندر محسوس کرتی ہوں۔ خالہ کی صاحبزادی
موجود تھیں۔ جس علامت پر نانی چُپ رہتیں اور تبصرہ نہ کرتی تھیں، صاحبزادی وہ علامت اپنی امّی سے
وب کر لیتی تھیں کہ یہ علامت ہماری امّی میں ہے اور ڈاکٹر صحیح کہتا ہے (ریڈیو کا ڈاکٹر اور ٹی۔ وی کا ڈاکٹر ہمیشہ
ح کہتا آیا ہے۔ اس لئے اُس دن بھی اُس نے صحیح کہا) اور جو کچھ ہائی بلڈ پریشر میں ہوتا ہے وہ سب کچھ خالہ جان
آنٹی ماں میں ہو گیا۔ (بہرکیف، پروگرام کو ختم ہونا تھا، ختم ہو گیا۔ اچھے بھلے کو مریض بنانا تھا سو ایک اور
یض کا اضافہ ہو گیا)۔ ساری بیماریاں بانٹ لی گئیں۔ ہم خالی ہاتھ خوش خوش واپس ہوئے۔ امّی نے دریافت کیا
ہوا ہے؟ بہت خوش ہو! ہم نے مسکرا کر جواب دیا۔ ریڈیو والے بلڈ پریشر دے رہے تھے، وہ سب نے
ٹ لیا، اس لئے خوش ہیں۔

جیسا کہ میں نے آپ کو اُوپر بتلایا کہ آنٹی ماں میں کئی خوبیاں ہیں اور ان خوبیوں کی سب سے بڑی خوبی
ہے کہ یہ خوبیاں فوراً سورج کی طرح ظاہر ہو جاتی ہیں اور ناظرین اور سامعین حیران
جاتے ہیں کہ ایک عظیم شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہو رہا ہے، جو اتنی خوبیوں کی مالکہ ہو۔ شادی ہو یا میت ہو،
نیقہ ہو، یا کسی بچے کی سنت، آنٹی ماں آئیں گی۔ گھر کا ہاتھ بٹائیں گی۔ مہمانوں کے سامنے بہت زیادہ، مہمانوں
سے پہلے بہت کم اور مہمانوں کے جانے کے بعد بالکل نہیں۔ تقریب سے تین دن پہلے ہر ملنے والی خاتون سے تذکرہ
ریں گی کہ فلاں کی شادی ہے۔ بہت مصروفیت ہے۔ جوڑے ٹانکے جا رہے ہیں۔ شاپنگ چوائس دیکھنا ہے۔

شادی کے بعد تکیۂ کلام ہوگا کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ہے۔ شادی کے ہفتہ بھر تک۔ ہر کسی سے تکیۂ کلام ہوگا کہ فلاں کی شادی کی مصروفیت کی تھکن ابھی تک نہیں اتری کہ فلاں تقریب اور آن پڑی ہے۔ شادیاں ختم نہیں ہوں گی، بچوں کی سنتیں اور عقیقے ہوتے رہیں گے۔ آنٹی ماں ان تقریبوں میں مدعو کی جاتی رہیں گی۔ مشورے دیئے جاتے رہیں گے۔ ہاتھ بٹاتی رہیں گی۔ تھکن ہوتی رہے گی اور تھکن نہیں اترے گی۔

آنٹی ماں، بہت فیاض اور سخی ہیں۔ قارون کا خزانہ اگر خدا انہیں عطا کرے تو وہ یقیناً اپنے سسرال والوں پر خرچ کریں گی۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ دیور، نندوں سے دلہن کی نہیں بنتی ہے۔ حالانکہ آنٹی ماں جب سے دلہن بنی ہیں، دیور نندوں کی دیوانی ہیں اور ہر ممکن ان کی مدد کرتی ہیں۔ ہر موقع پر انہیں اور ان کے بچوں کو پیش پیش رکھتی ہیں اور میکے والوں کو پیچھے۔ ہم ہمیشہ سے پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہیں۔ اس لئے آنٹی ماں کے ہاں ہونے والی تقریبات میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور تقریب منعقد ہونے کی کوشش میں پیش پیش۔

آنٹی ماں کا شمار اہل جدہ میں ہوتا ہے جو ہر سال فرنیچر بدلتے ہیں اور ہر دو سال بعد کار و بنگلہ ایک دفعہ کچھ مہینوں کے وقفے کے بعد ہم آنٹی ماں کے گھر دعوت میں گئے۔ ہم چپ چاپ کھانے میں مشغول تھے کہ آنٹی ماں نے کہا "امام، فلاں ڈش لو، شائد تمہارا ہاتھ نہیں پہنچ رہا ہے۔ میں دیتی ہوں" اور ایک ڈش پکڑا دیں۔ جب میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ آنٹی ماں نے نیا ڈائننگ ٹیبل خریدا ہے، جو خاصا لمبا ہے اور میز کی دوسری جانب ہاتھ آسانی سے نہیں پہنچ سکتا ہے۔ شائد یہی بات تھی یا میز پر چُنی ہوئی ڈشوں کی تعداد زیادہ تھی، پتہ نہیں کیا!

پطرس نے لاہور کے جغرافیہ میں کیا لکھا تھا، ہمیں یاد نہیں۔ آج کل لاہور کا کیا جغرافیہ ہے۔ ہمیں خبر نہیں اور ہمیں دلچسپی بھی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عام آدمی بھی آنٹی ماں کی زبانی ان کے گھر کا جغرافیہ (اس کے باوجود کہ ان کا بنگلہ ہر دو سال بعد بدلتا ہے) آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً فلاں تین مسجد کے پیچھے چار منزلہ بنگلہ ہمارا ہے۔ یا اُس مشہور شاپنگ سینٹر کے آگے کھڑے رہنے سے ہمارا شیشہ کا گھر نظر آجائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ محلے کے تمام بچے اور دکاندار آنٹی ماں کو آنٹی ماں ہی کہتے ہیں، ان کی امارت کا ادب اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

آنٹی ماں کے گھر ایرانی قالین، فرانسیسی برتن، تائیوان کے کھلونے، جاپانی الیکٹرانکس کا سامان بنکاک و کوریا کے کپڑے ہونے کے باوجود، وہ خالص پاکستانی ہیں اور ہماری خالہ یعنی آنٹی ماں ہوتی ہیں۔ آنٹی ماں کی ان خوبیوں کے باعث کونسا بھانجہ اپنی خالہ کو آنٹی ماں نہیں کہے گا۔ ہمیں امید ہے کہ آج کے بعد ہر شخص اپنی خالاؤں کو احتراماً آنٹی ماں کہنا شروع کردے گا یا شائد نہیں...۔ لیکن ہم آنٹی ماں کو ہمیشہ سے آنٹی ماں کہتے آئے ہیں اور بصد احترام آنٹی ماں ہی کہیں گے کیونکہ وہ ہماری والدۂ بزرگوار کی بڑی ہمشیرہ ہیں اور والدہ کا احترام ہمارے لئے جنت کا راستہ ہے۔

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

ارشد میر
(پاکستان)

شکر اور تشکر

حضرتِ انسان اشرف المخلوقات ہونے کا دعویدار ہے اور کبھی کبھی اس وہم کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ عقلِ کل ہے اور یہ کیفیت خاص طور پر اس وقت سے شدت اختیار کر گئی ہے جب سے اسے کائنات کو تسخیر کرنے میں چند ایک حیرت انگیز کامیابیاں نصیب ہوئی ہیں۔ اب اس کے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکتے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اتنی ترقیوں کے باوجود وہ ذہنی پراگندگی اور قلبی ژولیدگی سے دوچار ہے بلکہ دیکھا جائے تو اکثریت ذہنی اور جسمانی امراض کی پوٹ ہوکر رہ گئی ہے اور پھر بیماریاں بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ بے قابو سینہ زور اور ہجوم ادیگرے نیست کے شعور کے اسلحہ سے مسلح ہوکر ایک دفعہ تشریف لے آئیں تو پھر واپسی کا نام ہی نہیں لیتیں بلکہ اپنی فاتحانہ روایات پر ناز کرتی ہیں۔ اور اکثر و بیشتر مریضوں سے دوامی پٹہ لکھوا لیتی ہیں اور حتی المقدور ہر لمحہ اپنے ہمدم کی رفاقت میں گذارنا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہیں۔

مقصود اس وقت بیماریوں کی طولانی فہرست تیار کرنا نہیں اور نہ ان کے ماقبل کے محرکات اور ندما بعد اثرات سے پردہ سرکانا ہی ہے۔ سردست تمہ اپنی ذات قلیل الصفات پر مسلط مرضِ شکر جسے شکریات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ موزوں ہے۔ کو خراجِ توصیف پیش کرنا ہے جس نے ہم جیسے حقیر فقیر بے تقصیر کو اپنے مضبوط پنجوں میں جکڑا ہوا ہے بلکہ اس کے مسلسل چرکوں سے اب بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اس کی تند و تیز روانی میں تنکے کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں اور بظاہر اس کے گرداب سے نکل کر صحت کے ساحلِ مراد تک پہونچنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی اور اپنی بے چارگی کا بقول غالب یہ عالم ہے ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ تو خیر حال کی بات ٹھیری لیکن ماضی میں بھی جب اس مرض نے چوروں کی طرح نقب لگائی تھی اس وقت بھی اس کے انداز نرالے ہی تھے کہ ایک عرصہ سے پوری طرح زیرِ دام ہو چکے تھے لیکن پھر بھی اس ناخواندہ مہمان (مہمان کیا

بلکہ ملک الموت کی شان سے) کی آمد کی کانوں کان خبر نہ ہو سکی تھی۔ حالانکہ قیامت کی طرح اس کی نشانیاں بھی بڑی واضح اور عیاں تھیں۔ مثلاً بار بار قارورہ کے تقاضے زبان اور حلق میں خشکی، یہاں تک کہ عموماً لبوں پر زبان پھیرنے کی نوبت آجاتی تھی۔ نبض کج رفتار کبھی برق رفتاری کا مظاہرہ کرتی تھی اور کبھی ڈوبتی ہوئی دکھائی دینے لگتی تھی۔ پنڈلیوں کے پٹھے بیٹھکیں نکالتے محسوس ہوتے تھے۔ کانوں میں مدھم سی لئے میں گھنٹیاں بجتی سنائی دیتی تھیں۔ دل کی دھڑکن تنفس کے ہمقدم چلتی تھی۔ گاہے گاہے تاریکیوں کی پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے رقص کناں نظر آنے لگتی تھیں کبھی کا لاجواب حافظ اب خدا حافظ کہتا سنائی دیتا تھا۔ غرض کہ حواس خمسہ تو خیر اپنے خواص کافی حد تک کھو ہی بیٹھے تھے۔ چھٹی حس تک بھی بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ سب خطرے کی گھنٹیاں سننے کے باوجود جوانی کی مدہوشی نے ہم کو خواب خرگوش سے بیدار نہ ہونے دیا۔ بلکہ ہر وقت بغیر کوئی نشہ کئے بے خودی کے عالم میں ڈوبے رہے۔ یعنی ع

مدہوش نظر آتے ہیں بے ساغر و بادہ

اور دل ہی دل میں شاداں تھے کہ آنکھیں خمار آلود ہیں اور چٹخارہ کی اشتہا شباب پر ہے جو صحت یابی کی واضح علامت ہے لیکن وہ جو کہتے ہیں ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اور پھر خود کردہ را علاجے نیست ایک روز ہمارے دانت میں جو شدید درد اٹھا تو ہم نے مجبوراً ڈینٹل سرجن کی طرف رجوع کیا۔ اپنی حالتِ زار بیان کی اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے وقفہ وقفہ سے پیشاب کی بے پایاں آمد اور ایک معمولی سی پھنسی کے ٹھیک نہ ہونے کا قصہ چھیڑ دیا۔ یہ سننا تھا کہ اس مرد بقراط نے ہمیں علاج دنداں اخراج دنداں کا فارمولا یاد دلایا۔ لیکن ساتھ ہی دانت نکلوانے سے پہلے خون اور قارورہ کا امتحان ضروری قرار دیا۔ امتحانوں کے تو خیر ہم عادی ہیں۔ بقول شخصے ع

فلک لے گا ہماری خاک سے بھی امتحاں برسوں

بہر حال تعمیل ارشاد کی گئی تو لیبارٹری ٹسٹ میں ہمارا کچا چٹھا بلکہ میٹھا کتھا سب کھل گیا اور اس طرح اس روز سیاہ سے ہمارا ہسٹری شیٹ کھل گیا۔ خون اور پیشاب میں شکر کی مقدار کے ساتھ موروثی بیماریاں (امراض شماری بروزن مردم شماری کے) ایک رجسٹر میں محفوظ ہو چکی ہیں۔ دواؤں کا ایک مینا بازار ہمارے بیڈروم میں ایک مختصر سی میز پر سجایا گیا ہے اور طبی ہدایات کی روشنی میں ایک ٹائم ٹیبل بھی بنا لیا گیا ہے۔ (ٹائم ٹیبل کہ جو دورانِ تعلیم لاکھ دفعہ بنایا لیکن عمل ایک روز بھی نہ ہوا) یہی نہیں مختلف ٹسٹوں کی رپورٹوں اور دیگر ریکارڈ کو قیمتی دستاویزات کی مد میں بحفاظت الماری میں مقفل رکھا گیا ہے۔

ریکارڈ اور دواؤں کے اس کمیاب ذخیرہ کے باوجود زندگی کی عملی صورت کچھ یوں بنتی ہے کہ آپ کو ہر ملنے والا شخص فی سبیل اللہ ذاتی مجرب اور سماعی مجرب طبی مشوروں کا وعظ گویا اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ چنانچہ بیماری کے ابتدائی مراحل سے لے کر آج تک ایسے ہی لوگوں کا " ہدفِ مشورہ " ہوں کہ ایک سنیاسی تیر بہدف پھکی کی چٹکی جیبِ خاص سے نکال کر پیش کرتا ہے۔ کوئی خاندانی طبیب جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ جوشاندہ کو گرم

پانی میں جوش دلا کر پینے کا فرمان جاری کرتا ہے۔ کوئی "سیانا بیانا" ایک مخصوص لکڑی کے پیالے میں پانی پینے کا ہدایت نامہ صادر کرتا ہے۔ کہیں سے جامن (گلاب جامن نہیں) کے تنے کے چھلکوں سے لیکر اُس کے پتوں اور گٹھلی کو پیس کر خاکِ شفا سمجھ کر چاٹنے کی تلقین کی جاتی ہے تو کہیں سے تھوک کے حساب سے کریلے کھانے کا مژدۂ جانفزا سنایا جاتا ہے۔ (یہ بھی غنیمت ہے کہ تھوک کے حساب سے صرف کریلوں سے معدے کی تواضع تجویز کی اور اس کے ساتھ نیم چڑھا ہونے کی شرط بھول گئے)۔ ایک آدھ کرم فرمانے تو بڑے رازدارانہ لہجہ میں مختلف النوع کشتوں کو بالائی یا مکھن میں ڈال کر (خالی معدے جو کبھی خالی نہیں رہتا ہے، غذا نہیں تو دوا سے بھرا رہتا ہے) کافی مقدار میں دودھ کے ساتھ کھانے کی بھنک بھی کانوں میں ڈالی لیکن ہمیں چونکہ کئی احباب کے ان کشتوں کے ہاتھوں کشتوں کے پشتے لگنے کا ذاتی علم تھا۔ اس لئے ان سے کلیتاً اجتناب کیا۔ البتہ کچھ اعتماد ساتھیوں کے اصرار پر چند ٹوٹکوں اور بے ضرر جڑی بوٹیوں کو ضرور حرزِ جاں بنایا لیکن ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ہس پر ماتھا ٹھنکا تو ہم نے ایک منصوبہ کے تحت (جو بہرکیف سرکاری چند سالہ منصوبوں کی طرح مقسوم بہ عدم یل تھا) اس عارضۂ شکر بالفاظ دیگر شکری عارضہ کی طرح خصوصی توجہ مبذول کی (کیونکہ شوگر کا مرض راسی بے اعتنائی سے بپھر جاتا ہے اور قابو سے باہر ہوکر مریض کو تگنی کا ناچ نچاتا ہے) بلکہ اس کے ناز بھی زنینوں کی طرح اُٹھائے، دوا اور غذا کا ہر لمحہ دھیان رکھا اس کے مقابلے میں دوسری بیماریوں کو ہیچ سمجھا نکہ اطبا کی متفقہ رائے ہے کہ اگر شکر پہ مناسب کنٹرول نہ کیا جائے تو اپنے جلو میں بلڈ پریشر، دمہ، عارضۂ قلب راس نوع کے دوسرے امراض کو دعوت عام دینے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ جس طرح کوئی بھولا بھٹکا داست ناکردہ گناہ ملزم پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو اسے پولیس جلد دستیاب نہ ہونے والے اصلی ملزموں کی بنت سے تفتیش کا ہیرو بلکہ اپنی رائے میں ولین بنا دیتی ہے۔ اسی طرح جو شخص شوگر کے کنٹرول میں آجائے تو بی اسے درجہ اول کے مذکورہ امراض (کہ جنہیں اب ایک ہی خاندان کے نام لیوا وارث قرار دے دیا گیا ہے) کے تھ ساتھ چھوٹی موٹی بیماریوں کی چھاؤنی بھی بنا دیتا ہے۔ اب بیماریوں کا ذکر چلا ہے تو ان کی بھی کئی قسمیں اور ہے ہیں، مثلاً بعض بیماریاں مقامی پیداوار کی علامت ہوتی ہیں۔ کچھ موسمی تقاضوں سے معرضِ وجود میں آتی ں، کئی ایک کو ماحول سازگار میسر آجائے تو پنپنے کے سنہری مواقع سے فائدہ اٹھا کر مستقل ڈیرے جما لیتی ہیں۔
دکی بر وقت گوشمالی ہو جائے تو ان کا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ کا پیچھا چھوڑ کر نو دو گیارہ جاتی ہیں۔ لیکن ان سب میں سے شکر کا شمار ان چند گنے چنے امراض میں ہوتا ہے جس پر نہ کوئی موسم اثر انداز ہوتا ، اور نہ کوئی ماحول، نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے بلکہ یہ تو رنگ و نسل اور مذہب و ملت سے بھی را ہے۔ کسی بر اعظم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کا ہونا ضروری ہے۔ یعنیہٖ جہاں چینی ہ چینی ہو یا پاکستانی) وہاں ذیابیطس لازم و ملزوم ہیں۔ پھر دیکھا جائے تو یوں بھی شکر بڑا عیار مرض ہے

کا مرتبہ مریض ہنستا کھیلتا اور ہشاش بشاش نظر آتا ہے لیکن اس کا ایک خارجی روپ بصورت جعلی عکس ہوتا ہے
کیونکہ شکر کو مریض کا سبوتاژ کر کے یکایک بیڑا غرق کرنا ہوتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے کمانڈو شب خون مارتے ہیں
مرجاتا ہے لیکن جارحانہ حملے سے مقررہ ٹھکانے کو تہس نہس کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خوش فہمی یا غلط فہمی کی بنا پر
متعدد بار مریض شکر کے جھانسے میں آ کر اپنا "کونڈا" کرواتے ہوئے اگلے جہان کا ویزا اکھٹوا لیتے ہیں۔

دراصل وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس موذی مرض کی بیخ کنی ہو سکتی ہے وہ پرلے درجے کے نادان بلکہ کاؤدی
ہیں کیونکہ اگر ایک مرتبہ یہ براجمان ہو جائے تو پیر تسمہ پا اور تار عنکبوت ثابت ہوتی ہے اور مریض بھاڑے کے
ٹٹو کی مانند اس کا غلام بے دام بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسروں کا ذکر کیا اپنی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ اس کی
معدے سے لے کر آج تک ہم نے اندرون ملک بلکہ بیرون ملک گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے دنیا جہان کے متعدد اور منفرد
رسائل و اخبارات میں اس مرض کو قلع قمع کرنے کے بارے میں مضامین پڑھے ہیں۔ مختلف ڈیزائنوں میں دوائیاں،
کیپسول اور رنگ برنگی ٹکیوں سے ہی معدے کو سیراب نہیں کیا۔ بلکہ مختلف سائز کے ٹیکوں سے منحنی جسم تک کو بھی
چھلنی کرایا ہے۔ یہی نہیں قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ذیابیطس کی سرکوبی کے لئے منظم طریق سے تابڑ توڑ حملوں کا بھی ذکر
سنتے چلے آ رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ بقول مولانا روم سے

من بہ ہر جمعیتے نالاں شدم
جفت خوش حالاں دید حالاں شدم

کبھی نظر آتی ہے بلکہ ان سب حربوں کے باوجود آج بھی یہ حقیقت تقدیر کی طرح اٹل ہی نظر آتی ہے۔ کہ تادمِ تحریر
اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکا سے

پامالِ جفا ہے دلِ دلگیر ابھی تک
تدبیر کو ہے شکوۂ تقدیر ابھی تک

اپنے بارے میں اعتراف کر لوں کہ طبعاً متلون مزاج ہوں لیکن اتفاق کی بات ہے کہ مجھے میری رفیقِ حیات اور
بیماری دونوں قدرت کی طرف سے باوضع، باوفا اور مستقل مزاج نصیب ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر دو میں مٹھاس کا
عنصر بھی اچھا خاصا پایا جاتا ہے۔ میری بیوی مزاجاً روزمرہ کے معمولات میں ہر معیت سے (باستثنا میرے) سمجھوتہ
کر لینے کی خوگر ہے۔ حتی المقدور کسی سے بگاڑ نہیں کرتی لیکن جب سے شوگر نے ذرا زیادہ ہی قدم جمانے شروع کر دیئے
ہیں۔ اہلیہ کا اس نامراد سے سوکنوں جیسا سلوک ہو گیا ہے کیونکہ اس کو بھی وہ میرا رفیق حیات سمجھتی ہے۔ چنانچہ
اس نے اپنے تئیں اسے ختم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے اور اس کوشش میں رہتی ہے کہ چاہے
مریض رہے یا نہ رہے لیکن مرض چلا جائے مگر اس کا کیا علاج کہ ذیابیطس کی ہٹ دھرمی میں سرِ مو فرق نہیں پڑا۔
شاید یہ مرض ہی ہٹ کی چوتھی قسم ہے۔ پہلی تین قسمیں راج ہٹ، بال ہٹ، اور تریا ہٹ تو سبھی کو معلوم
ہی ہیں۔ انفرادی سطح کی کارگزاریوں کا تو ذکر ہی کیا، وہ میڈیکل بورڈ جنہیں کچھ عرصے تک یقین کامل تھا کہ

انسانی جسم میں لبلبہ کی ماہانہ یا سالانہ مرمت کرکے انسولین کی مناسب مقدار کو راہ راست پر لاکر اس ناہنجار مرض سے گلوخلاصی ہو جائے گی۔ تابکاری شعاعیں اس پر مکمل کنٹرول کرلیں گی یا پھر پنڈولم سے ملتی جلتی کوئی چیز سینے پر لٹکاکر شکری عارضہ کو جبری رخصت پر روانہ کردیا جائے گا۔ وہ بھی سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہیں بلکہ سرجری کہ جس نے آبگینۂ دل کو چیر کر پھر جوڑنے کا کمال دکھاکر ایک دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالا ہوا ہے، وہ بھی اس کم بخت کے ہاتھوں ہاتھ ملتی ہی دکھائی دیتی ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ تسلیم ہوتے ہوئے بھی شکر کے چند ایک نامور معالجین اور روشن طبع مریضوں کا خیال ہے کہ یہ بیماری اصلاً شریف الطبع، وضعدار اور نستعلیق ہے جو غرباء کے مقابلہ میں روٴسا کی زیادہ خدمت کرتی ہے اور ثبوت میں اس کے پے در پے وار اعضائے رئیسہ پر ہونے ہوتے ہیں یا پھر اس کا ہدف فنونِ لطیفہ اور علومِ مفیدہ کے رسیا ہوتے ہیں جو کوشش بسیار کے باوجود اس کے پنجے سے نکل نہیں سکتے۔

شکر بلکہ شکریات کے متعلق ایک چیز خاصی حیران بلکہ پریشان کن ہے کہ بظاہر اس کی اٹھان مٹھاس پر ہے جس کے نتیجہ میں اس کے مریضوں کو شیریں دہن ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن عملاً وہ تلخ کلام اور ترش دہن ہوتے ہیں۔ شائد انہیں آہستہ آہستہ جسم سے شکر کشید ہوکر شکر رنجی کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔ ویسے اگر اس مرض کی چھان بین سائنسی بنیادوں پر کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شکر محض ان لوگوں کی ازلی دوست ہے جو مرغن غذاؤں کے والہ وشیفتہ ہیں اور دسترخوان پر اللہ کی نعمتوں پر لنگر لنگوٹ کس کر خوانِ نعما سمجھ کر یوں جھپٹتے ہیں۔ جیسے یہ ان کی زندگی یا ان نعمتوں پر دسترس کا آخری دن ہو یا پھر اُم الامراض بن کر قبر کی چار دیواری تک ان لوگوں کا تعاقب کرتی ہے جو علاج بالمثل پر ایمان رکھتے ہیں اور بزعم خود سمجھتے ہیں کہ شوگر کی کمی اُٹھتے بیٹھتے اس کے "پھکّے" مار کر پوری ہو سکتی ہے یا پھر وہ جو مٹھائیوں، کیکوں اور ٹافیوں پر یہ جان کر ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں کہ ان میں چینی کی ہیئت ہی سرے سے تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ اُردو کا محاورہ شائد ایسے ہی حضرات کا ایجاد کردہ ہے کہ قسمت سے شکر خورے کو شکر اور موذی کو ٹکر ملتی ہے۔ اگرچہ نتیجتاً یہ شکر ہی موذی ہو کر شکر خورے کو ٹکر مارتی ہے۔ البتہ ان کے برعکس وہ مریضانِ شکر کہ جو سادہ غذا سے پیٹ بھرتے ہیں، صاف پانی پیتے اور تازہ ہوا پھانکتے ہیں، زمین دوز سبزیوں اور میٹھی اشیاء کو دور سے ہی سلام کرتے ہیں تانگے کی بجائے ٹانگوں کو حرکت میں لاتے ہیں اس موذی کے بھرپور وار سے بچے رہتے ہیں اور اکثر طبعی عمر کو پہنچتے ہیں۔

امریکہ نے اب کے کچھ ایسے میزائل ایجاد کئے ہیں جو اپنا ٹارگٹ خود تلاش کر کے نشانے پہ لگتے ہیں اسی طرح شکر کی بھی کارگزاریاں اسی نوع کی ہیں کہ وہ پہلے روز سے ہی اپنے ٹارگٹ کو جسم کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں ڈھونڈ کر اپنا وار کرتی ہے۔ چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی اس کا وار خالی نہیں جاتا بلکہ اس کی دست برد سے کبھی قوتِ گویائی جواب دے جاتی ہے یا پھر بینائی سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں بلکہ اس کی بے پایاں یلغار کے آگے تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو کر پھیپھڑے اور معدے تک سرِ تسلیم خم کر جاتے ہیں۔ جگر سوزی، اعصاب شکنی اور دوا اور پرہیز کے لئے

تلووں پہ چھونے ہیں تو اس کا جواب ہی نہیں، اس کی شدتِ التفات سے اکثر فالج کرتا ہے یا پھر ہاتھوں سے شروع ہوکر پورے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے ٹانگیں سوتی ہی نہیں بلکہ چلنے پھرنے سے ہی بالکل جواب دے جاتی ہیں یا پھر بالوں کو سفیدی عطا کرنا اور دانتوں کو جڑوں سے ہلا دینا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔

شوگر اس لحاظ سے بھی بڑا نامراد مرض ہے کہ مرورِ ایام سے بڑے دبنگ اور زبر جنگ شخص کی شوگر بھی ختم کر دیتا ہے۔ اچھے بھلے چست و چالاک انسان کو کاہل ہی نہیں بحر الکاہل بنا دیتا ہے۔ شکری مرض فی الواقع بیرونی ماحول سے کٹ کر اپنے ماحول میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے، طبیعت اپنے آپ سے بیزار ہو جاتی ہے۔ چڑچڑا پن رفیقِ زندگی بن جاتا ہے مردم بیزاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور عناصر میں اعتدال نہ ہونے کے سبب احساس ذمہ داری سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کی برکت سے ایک فائدہ ضرور پہنچتا ہے کہ عصمت بی بی از بے چادری کے اصول پر مریض بے اعتدالیوں کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے لیکن ان سب کمزوریوں اور قباحتوں کے باوجود اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم ہے کہ مرد و زن میں سے کوئی شوقیہ یا طبی ہدایات کے تحت اپنا خون یا قارورہ ٹسٹ کرائے وہ کسی نہ کسی صورت میں خود کو شکر کی لپیٹ میں پاتا ہے اور کچھ نہیں تو اس کے کچھ علامات TRACES تو ضرور نکل آتے ہیں۔ بس لے دے کر وہی لوگ باقی رہ جاتے ہیں جو ٹسٹوں کے جھمیلے میں نہیں پڑتے گویا وہی بات ؏

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

کوئی مانے نہ مانے شکری مرض کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کی سانپ اور چور کی مانند خاصی دہشت ہوتی ہے۔ ایک اور تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ اگر بالکل کم یا سرے سے مفقود ہو جائے تو بھی جان لیوا ثابت ہوتی ہے اور اگر مناسب مقدار سے بڑھ جائے تو جسم کے چاروں طرف محاصرہ کر لیتی ہے اور پھر صورتحال کچھ یوں بنتی ہے کہ غالبؔ سے معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے ؎

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام "شکر"
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

غالبؔ کے اس شعر میں وصال کی بجائے شکر کے تصرف کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اگر شکر کی مقدار کم یا بہت زیادہ ہو جائے تو دونوں صورتوں میں آدمی کا وصال ہو جاتا ہے گویا ؎

دو گونہ رنج و عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اہلِ مغرب نے تو شکر کی اہمیت کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور وہ اپنے طور پر اسے بھی چیچک اور طاعون کی طرح روئے زمین سے نیست و نابود کرنے کے خواہاں ہیں لیکن جب تک انہیں اس میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی وہ یوں بھی ہاتھ [illegible] سے بیٹھے نہیں رہے ہیں۔ بلکہ انہوں نے تو اب بھی اس خطرناک بیماری کا مردانہ وار ہی مقابلہ کیا ہے [illegible] دوائیوں کے علاوہ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے مخصوص خوراک بھی تیار کر لی ہے جو شکر کو لے کھا یا پھیلنے

پھر لنے اور من مانی کرنے سے باز رکھتی ہے لیکن ان کے برعکس ہمارے ہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے کہ یہاں کے نئے اور پرانے مریض ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر من وسلوےٰ اترنے کے منتظر ہیں یا پھر موت کا ایک دن معین ہے پر یقین رکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کی نظر میں ہی مغربی اقوام پر لگی ہوئی ہوں کہ جوں ہی شکر کے خاتمہ بالخیر کے لئے کسی دوائی کھلیہ دیں گے تو یہ بھی اسی امرت رس کو نوشِ جاں کرلیں گے۔

چلئے یہ تو مستقبل کی باتیں ہیں۔ سردست اور نہیں تو شکری طبقہ کی عالمی سطح پر مردم شماری کا ہی اہتمام ہوجائے کیونکہ دنیا میں اب ان کی تعداد واضح اور نمایاں ہے۔ اگر انہیں خدا شکر کے مریضوں کو توفیق دے اور یہ متحد ہوکر ریڈکراس یا ٹریڈ یونین طرز کی انجمن سازی کرلیں۔ تو نہ صرف بلدیاتی سطح پر کامیابی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں بلکہ اسمبلیوں میں بھی ٹیکنوکرائسٹس کی مانند نشستیں محفوظ کرا سکتے ہیں اور سودے بازی سے الکشن لڑنے کے لئے پارٹی ٹکٹ بھی حاصل کرسکتے ہیں اور اگر یہ سلسلہ کامیابی سے چل نکلے تو شائداِن کی مناسب نمائندگی سیکورٹی کونسل میں بھی ہوجائے تاکہ پھر خود سیکورٹی کونسل کی نان سیکورٹی ہونے کا پول کھل جائے اور مقدر یاور ہوں تو وہاں جوڑ توڑ سے کبھی ویٹو کرنے کے حق سے بھی بہرہ ور ہوجائیں لیکن اس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر تردد کرنے کی فرصت ہوگی جو بظاہر اس طبقہ کے بس کا روگ نظر نہیں آتا تا آنکہ۔

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

البتہ ایک چیز محلِ نظر ہے کہ آج کل ہم جس طرح خلاف فطرت زندگی گذار رہے ہیں اس میں یا تو ہمیں سنکی ہوجانا چاہیئے یا پھر خودکشی کے لئے پر تول لینے چاہیئے۔ ان روح فرسا حالات میں سے ہر دو آزما ہونے کی صورت نکل آئے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے (بلکہ ہو سکے تو پہلی فرصت میں ہی یوم تشکر منا لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں) کیونکہ اس مرض کا شکار ہوکر آدمی کو عاقبت سنوارنے کی فکر ہی نہیں پڑتی ـــــ بلکہ دینوی ادھورے منصوبوں کی تکمیل کے ساتھ مناسب اور معقول وقت بھی مل جاتا ہے ورنہ اس کے بجائے عارضۂ قلب اور اس سے ملتے جلتے امراض تو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی منہ بولتی تصویریں ہیں کہ حملہ آور ہوتے ہی شکار کو چشم زدن میں وصیت تحریر کرنا تو کجا آخری کلمات کہنے تک کی بھی مہلت نہیں دیتے۔ اس کیفیت اور دردناک صورتحال میں ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیجئے کہیں شکری عارضہ میٹھا زہر ہونے کے باوصف کم نصیبی کی بجائے خوش بختی کے زمرے میں شمار کئے جانے کے قابل تو نہیں ہے؟

— —

جالے کی کھال (تبصرہ)

رگِ ظرافت

- مصنف :- ضیاء الحق قاسمی (پاکستان)
- مبصر :- ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)

٭٭٭

پاکستان میں طنز و مزاح کی روایت خاصی بالیدہ ہے لیکن کسی بھی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے تازہ خون کی ضرورت ہوتی ہے. ضیاء الحق قاسمی یہ تازہ خون فراہم کر رہے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو ظرافت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں مرحوم احمد جمال پاشا کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اور اسے محض حسنِ اتفاق سمجھنا چاہیئے کہ قاسمی سے میری پہلی ملاقات آج سے چند سال پہلے اس وقت ہوئی جب میں پاشا صاحب کے ساتھ دہلی اُردو اکادمی کے ایک جلسے میں شرکت کرنے جارہا تھا۔ پھر قاسمی پاکستان واپس چلے گئے اور جب پچھلے دنوں دہلی میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس مختصر سے عرصے میں انہوں نے طنز و مزاح کے فروغ کے لئے کئی ایک کام کر ڈالے تھے۔ حیدرآباد سندھ میں ایک شاندار جشنِ ظرافت منعقد کیا، "ظرافت" کے نام سے ایک طنزیہ و مزاحیہ رسالہ نکالا اور اب "رگِ ظرافت" کے خوبصورت عنوان سے اپنا ایک مزاحیہ شعری مجموعہ بھی شائع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ انہیں اس تیز رفتاری کی داد دوں مگر وہ تو آگے کے منصوبے بتانے لگے۔ ایک انڈو پاک مزاحیہ مشاعرہ کرنے کا ارادہ ہے، ہندستان اور پاکستان میں پچھلے چالیس سال کے دوران لکھے گئے مزاحیہ ادب کی تاریخ لکھ رہا ہوں، ایک سفرنامۂ ہندوستان بھی لکھنا ہے، وغیرہ۔ میں ابھی دم بخود تھا کہ انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام "رگِ ظرافت" عنایت کر دیا اور میری بے خودی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"رگِ ظرافت" کا سرورق بے حد دیدہ زیب ہے، درجنوں خوبصورت رنگوں سے مزیّن اور "بے خودی لے گئی کہاں ہم کو" کی کیفیت پیدا کرنے والا۔ مگر یہ سرورق دھوکا نہیں دیتا۔ اندرونِ صفحات پر جو کلام ہے وہ بھی قلب و جگر کو نئی زندگی دیتا ہے۔ اس ظریفانہ کلام میں جو چاشنی ہے، جو ہلکی سی گدگدانے والی کیفیت ہے، اس کا صحیح اندازہ تو پڑھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے لیکن میں قاسمی کے مخصوص لب و لہجے کی وضاحت کے لئے صرف تین اشعار یہاں پیش کرتا ہوں۔ پہلا شعر خود قاسمی کا ہے۔ کہتے ہیں ؎

مری باتیں بڑی سادہ نہ ان میں کوئی پیچ و خم
مرے احباب کیوں کرتے ہیں ان کی دُہری تفسیریں

اور یہ دو اشعار دلاور فگار کے ہیں ؎

"رگِ ظرافت" پہ اس کا نشتر کچھ اس سلیقے سے چل رہا ہے
کہ جس کے انجکشن لگا ہے وہ نرس کا ہاتھ مل رہا ہے

جو ذوق کو ناگوار گذرے نہیں ہے اسکے وہاں وہ شوخی
وہ اس کا طنز و مزاح کیوں ہو جو خوش مذاقی کو کھل رہا ہے

واقعہ یہ ہے کہ یہی قاسمی کی ظریفانہ شاعری کا مزاج ہے۔ انہوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ شاعری کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ وہ اگر نشتر بھی لگاتے ہیں تو اس طرح کہ اس کی چبھن دیر تک محسوس

نہ ہو بلکہ مریض ایک ہلکی سی سسکی لے کر لذت آمیز سکون سے ہمکنار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد اصلاح ہوسکتا ہے مگر ان کی ظرافت نصیحتوں کے بوجھ سے دبی ہوئی نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ شوخی کی حدود سے بھی تجاوز نہیں کرتے اس طرح طنز و مزاح کے ملے جلے رنگوں کے ساتھ ایک بڑی دلفریب شاعری سامنے آتی ہے۔ خود ہی لکھتے ہیں۔

"میں اپنی روزمرہ کی گفتگو اور شاعری میں
یہی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی دل آزاری
نہ ہو۔ میں اگر کسی انسان کو مسکرانے کا ایک
لمحہ فراہم کرسکوں تو اس سے بڑی نیکی اور
کیا ہوسکتی ہے۔"

قاسمی کا یہ جذبہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات قابل داد ہے کہ انھوں نے لیڈروں کی طرح صرف باتیں نہیں بنائیں بلکہ جو دعویٰ کیا ہے اسے پورا کرکے دکھایا ہے۔ ان کی مزاحیہ شاعری واقعی ویسی ہی ہے جیسی وہ چاہتے ہیں یعنی لوگوں کو ہنسانے والی اور گدگدانے والی۔

قاسمی کے اس مجموعۂ کلام کے بارے میں چند باتیں اور کہنا کہ دل چاہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی زنبیل ظرافت میں ہر طرح کا مال ہے۔ قطعات بھی ہیں، تضمینات بھی، نظمیں بھی، غزلیں بھی اور منظوم خطوط بھی۔ جس کو جو پسند آئے۔ مجھے تو ان کے قطعات اور منظوم خطوط نے خاصا متاثر کیا۔ قطعات میں انھوں نے لطائف بھی نظم کر دیئے ہیں اور بعض لطائف ایسے ہیں جو دوسروں کے یہاں بھی موجود ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں دیکھئے۔
قاسمی لکھتے ہیں ؎

مفلسی نے وہ مسائل گھر میں پیدا کر دیئے
بدگماں مجھ سے مرے سُتّے کی اماں ہوگئیں
لیکے بچوں کو چلیں وہ آج میکے کی طرف
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یہی بات میں نے ایک ہندوستانی شاعر کی زبان سے اس طرح سُنی تھی ؎

بیویاں مرتی گئیں میں شادیاں کرتا گیا
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

قاسمی کہتے ہیں ؎

ایک چوہے سے کسی ہاتھی نے پوچھی اس کی عمر
عرض کی چوہے نے حضرت آپ سے ڈرتا ہوں میں
عمر میری آپ سے کچھ کم نہیں لیکن حضور
آپ خوش خوراک ہیں اور ڈائٹنگ کرتا ہوں میں

یہی لطیفہ ایک بھارتی شاعر نے بھی چار مصرعوں میں اس طرح بیان کیا تھا ؎

ہنس کے اک ہاتھی سے اک چوہے نے پوچھا اس کا نام
بولا ہاتھی میں ہوں ہاتھی اور بڑا سردار ہوں
لیکن اتنا تو بتاؤ تم کو کیا کہتے ہیں لوگ
بولا چوہا میں بھی ہاتھی ہوں مگر بیمار ہوں

بہرحال اس سے تو بس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان ہو یا ہندوستان دونوں جگہ کے فنکار زندگی کی ناہمواریوں پر یکساں طور سے سوچ رہے ہیں۔ دوسری بات جو میں قاسمی کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً مذہب، سیاست، تجارت، فیشن، تعلیم وغیرہ پر نظر رکھی ہے اور ان کا مشاہدہ وسیع ہے۔ ریل کے سفر، فون، مکان کی تعمیر، آٹو رکشا والوں کی من مانی، ڈاکٹروں کی منافع خوری اور مریض کی طر

سے بے توجہی، محکمہ ڈاک کی لاپرواہی اور پردیسیوں میں نوکری کرنے والوں کے اہل خاندان کی بدحالی کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ گرچہ اہل پاک کے تجربات ہیں مگر اہلِ ہندوستان پر بھی صادق آتے ہیں۔ ان چند اہم یا غیر اہم باتوں کے بعد میں قاسمی کے کچھ اہم اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کی رگِ ظرافت بھی پھڑک اٹھے۔

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی
سنگ باری کے لئے شیطان پر جانا پڑا
ایک کنکر پھینکنے پر یہ ندا اس نے سنی
تم تو اپنے آدمی تھے، تم کو آخر کیا ہوا

جب بھی چاہیں مرغ کھا لیتے ہیں دولتمند لوگ
دن کی پابندی نہیں منگل ہو یا اتوار ہو
ہاں مگر مفلس کو کب ہوتا ہے یہ کھانا نصیب
مرغ ہو بیمار یا وہ خود کبھی بیمار ہو

کیا خوب کہ ابلیس کے سر منڈھتا ہے الزام
انسان تو خود آپ ہی شیطان ہے پیارے

عزت تجھے ملے گی ترے ٹھاٹ باٹ سے
پیارے نئی نہیں تو پرانی ہی کار رکھ

ہر حال میں جسموں کی نمائش ہے ضروری
موسم کا کوئی غم نہیں گرمی ہو کہ جاڑا

دے کے خط ....

(مراسلے)

- برادرم ۔ تسلیم !

مجتبیٰ حسین نمبر ملا ۔ بہت بہت شکریہ ۔ واقعی آپ کی کاوشیں کمال کی ہیں۔ اتنے جامع اور خوبصورت نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

وجاہت علی سندیلوی

-۰- -۰- -۰-

- شگوفہ کا شگفتہ نمبر مل گیا تھا اور واقعی خوب تھا۔ ایسے اچھے نمبر نکالنا آپ کی عادت بن گئی ہے۔ آج کی تاریک فضا میں مسکراہٹوں کے جگنو چھوڑنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ طنز و مزاح کو ادب کا درجہ دلوانے میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ فکرؔ، تونسوی، مجتبیٰ حسین اور کھنہ صاحب جو شگوفہ کے خاص سرپرستوں میں سے ہیں، اردو کے اصلی دوست ہیں۔

بلراج ورما۔ نئی دہلی

-۰- -۰- -۰-

- آپ نے مجھے اپنے حسن سلوک و محبت سے اپنا اسیر بنالیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی محبتوں کو قائم و دائم رکھے۔ آپ کے ساتھ حیدرآباد میں گزارے ہوئے چند روز کی یادیں مجھے تاحیات گدگداتی رہیں گی۔ کیا خوبصورت دن تھے، یاد کرتا ہوں تو آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔

ضیاء الحق قاسمی ۔ کراچی

-۰- -۰- -۰-

- "شگوفہ" کا تازہ شمارہ ملا۔ حسب معمول ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ خدا جانے آپ کے ہاتھ کون سا جادوئی چراغ آگیا ہے کہ آپ ہر مہینے اچھا خاصا مزاحیہ مواد اردو والوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں ۔ اب تو اس میں خواتین کی بھی خاطر خواہ تعداد شامل ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ نظم کا بھی اچھا خاصہ حصّہ شامل ہوگیا ہے۔ پہلے نثر کے سامنے نظم کا حصّہ کم اور ہلکا ہوتا تھا۔ اب تو "شگوفہ" کے ذریعہ مزاحیہ کلام کی ایک سالم کتاب وجود میں آگئی ہے۔ میرا اشارہ "نمی دانم" کی طرف ہے۔ میری طرف سے رشید عبدالسمیع جلیل صاحب کو مبارکباد۔

لیکن یہ خط لکھنے کا اصل سبب تو وہ مضمون ہے جو سلیم احمد صاحب نے مالک رام صاحب پر لکھا ہے۔ اب سلیم صاحب حیدرآباد آ ہی گئے ہیں تو ان سے اور لکھوائیے۔ کسی سنجیدہ اور بزرگ شخصیت (وہ بھی مالک رام صاحب کی سی) پر ایک دلچسپ خاکہ لکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس وادیٔ پُرخار سے گزرے ہیں۔ سلیم احمد صاحب اس پُل صراط پر سے کامیاب پار کر گئے ہیں۔ ان کو بھی مبارکباد۔

رشید الدین ۔ حیدرآباد

-۰- -۰- -۰-

- سوونیر پسند آیا۔ ہند و پاک میں شگوفہ ہی طنز و مزاح کا نمائندہ ماہنامہ ہے۔ اور اب یہ اس صنف کی علامت بن گیا ہے۔

سلطان جمہوری بنگلور

-۰- -۰- -۰-

- خدا آپ تمام حضرات سے اردو طنز و مزاح کے تیور اسی تندہی اور جولانی کے ساتھ اُجاگر کرواتا رہے

بابو آر کے ۔ اچل پور شہر
(مہاراشٹرا)

-۰-

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۲۱
شمارہ : ۶

جون ۱۹۸۸ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

قیمت فی پرچہ : ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ : ۵۰ روپے
عرب ممالک سے : ایک سو پچاس روپے

کتابت : محمد سلیم، محمد عبدالرؤف، مسعود انور
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد۔۲

منیجر اعزازی (بمبئی) :
فیاض احمد فیضی

خط و کتابت کا پتہ :
۲۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد۔
فون آفس: [illegible]716 فون مکان: 521064

مہیدق : طالب خوندمیری

کشمیری قوام

گوشۂ پاکستان

"جرم ظریفی" ــــ مقدمہ و انتخاب

تراشے

چورنگی (منظومات)

اس ہاتھی کے پچھے پٹھے

(فہرست)

صاحب "نمی دانم" ــــ نثری و منظوم خاکے

مالِ مفت (انشائیے)

ــــ ★ ــــ

ضمیر جعفری
اسلام آباد (پاکستان)

ضمیریات

○

(خاص "شگوفہ" کے لیے بدست جناب مجتبیٰ حسین)

اساس

حصول علم کا ہے گُر، مدام لکھ مدام پڑھ
چھٹانک علم کے لیے حروف تین سو گرام پڑھ
مگر کوئی نظامِ فکر و تربیت ہے لازمی
نہ یہ کہ تو سیام جا کے حافظ و خیام پڑھ

عارضی مستقل

خیام ہی میں قیام کا پہلے عارضی انتظام کرنا
پھر اپنے خیموں میں میرے شہروں کا مستقل انضمام کرنا
تمہارا طرزِ جہاں روائی "سپر مقام" سمجھ گئے ہم
مصافحے میں سلام کرنا، معانقے میں غلام کرنا

پیمانۂ امروز

جب کہ انگریزی میں ہو سب کاروبارِ عاشقی
درمیاں پھر اپنی اردو رائیگاں کیوں کر کریں
وہ یہ بولی "عشق ویری گڈ" مگر لے ڈارلنگ

اُمید سے ہے!

زندگی ہے اِک دوراہے پر امید و بیم کے
شام ہے شامِ غریباں ، صبح صبحِ عید ہے
مختصر لفظوں میں یہ ہے صورتِ حالات آج
رہنما* اُمید سے ہے ، قوم نا اُمید ہے

دلاور فگار

* پاکستانی لیڈر بے نظیر بھٹو

غزل

نیاز سواتی
(گوجرانوالا - پاکستان)

اگرچہ کھاکے رشوت بڑھ گئی ہے اُس کی موٹائی
مگر چہرے پہ اب باقی نہیں پہلی سی رعنائی!
ہمارے عہد میں توقیر کا معیار دولت ہے
شرافت کام آتی ہے، نہ کام آتی ہے دانائی!
نہیں آتا ہے اُن کو تیرنا چھوٹی سی ندیا میں
سمندر کی مگر وہ ناپنے نکلے ہیں گہرائی
پناہ لینی پڑے گی ہم کو بھی دامانِ رشوت میں
اگر بڑھتی رہی یوں ہی گرانی اور مہنگائی
کوئی ہم کو دِلا دے کاش ایسی نوکری جس میں
برائے نام ہو تنخواہ پہ اِنکم ہو بالائی
وزارت سے ہمیشہ کے لیے ہیں ہاتھ دھو بیٹھا
خطا بیٹے کی تھی لیکن ہوئی ہے میری رسوائی
بہت مہنگا پڑا ہم کو نیاز آنکھوں کا آپریشن
اُسے بھی ہم گنوا بیٹھے جو تھی تھوڑی سی بینائی

نصر اللہ خان
کراچی (پاکستان)

آداب عرض

جناب مخمور بھوپالی کی پانچویں اور آخری بھینس بھی چوری ہوگئی۔ سُنا ہے کہ اب مخمور بھوپالی صاحب اپنی اس بھینس کی جدائی میں آج کل راگ بھوپالی گا رہے ہیں۔ یہ بھی خبر ملی تھی کہ پچھلے دنوں انھوں نے لانڈھی کے تھانے میں پہنچ کر تھانیدار سے یہ پوچھا تھا۔

ہے ہے میری بھینس لے گیا کون ؟

کسی زمانے میں شاعروں کے شعروں میں سرقہ ہوتا تھا۔ اور اب یہ شاعروں کی بھینسوں میں بھی ہونے لگا ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ مخمور بھوپالی کی یہ بھینس بھی شاعروں ہی نے چُرائی ہو گی۔ کہتے ہیں کہ مخمور بھوپالی کی صحبت میں رہ کر ان کی بھینسیں اچھی خاصی سخن فہم ہوگئی تھیں۔ چونکہ ملک میں سخن فہموں میں کمی ہوگئی ہے لہٰذا شاعروں کے لئے سخن فہم بھینس بھی غنیمت ہے۔ سُنا ہے کہ جب لانڈھی کے تھانیدار نے ایک شاعر ہی کے گھر سے مخمور صاحب کی بھینس برآمد کی تو شاعر نے کہا۔ یا حضرت یہ سرقہ نہیں توارد ہوگیا ہے اور ہم نے مخمور صاحب کی زمین میں یہ بھینس نکالی ہے۔

تھانیدار نے کہا کہ تم نے یہ مان لیا ہے کہ تم نے مخمور صاحب کی زمین سے یہ بھینس نکالی ہے؟" شاعر نے سر پیٹ کر کہا کہ حضرت میں نے زمین "سے" نہیں زمین "میں" کہا ہے۔ اور پھر شاعر نے غصّے میں آکر کہا "یارو شاعروں اور شاعری کے معاملات میں تھانیدار کا غیر شاعر ہونا کیسا ستم ہے۔ ایک سیٹھ کا کہنا ہے کہ ایک حد تک تو بھینس بھی شاعری برداشت کر لیتی ہے۔ چنانچہ پچھلے کئی دنوں سے مخمور صاحب کی شاعری میں آورد رہی۔ لہٰذا جب ایک دن وہ اپنی غزل کا بیسواں شعر اپنی بھینسوں کو سُنا رہے تھے تو وہ سنگل تڑا کر بھاگ گئیں۔ اور جب سے اب تک مخمور صاحب اپنی پانچوں بھینسوں کے سنگل اور کھونٹے اپنی گردن میں ڈالے ان کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اخبار کی رَدّی کا چارا

کہتے ہیں کہ اخبار کی ردّی کھانے سے گائے اور بھینسوں کے دودھ میں اضافہ ہوتا ہے کہ اخباروں کی ردّی کو کوٹ چھان کر گائے بھینسوں کو کھلانا چاہیئے کیونکہ اخباروں میں بے شمار خبریں ایسی ہوتی ہیں جو گائے بھینسوں کے پیٹ میں اس سے ہضم ہوجاتا ہے۔ ایک ڈیری فارم کے مالک نے یہ

بتایا ہے کہ پریس ریلیز کھانے سے ہم نے گائے بھینسوں کو ڈکاریں لیتے دیکھا ہے۔ البتہ ہماری گائے بھینسیں پریس ٹرسٹ کے اخبارات بڑے شوق سے چرتی ہیں۔ لیکن ان اخبارات سے ان کے دودھ میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا جتنا ان کے گوبر میں ہو جاتا ہے۔ اور یہ گوبر، گوبر گیس بنانے کے بہت کام آتا ہے۔ ہر اخبار کھلانے کے بعد انھیں پانی کا ایک گلاس بھی پلانا پڑتا ہے۔ اور بعض جانوروں کو تو سوڈا واٹر بھی پلانا پڑتا ہے۔ بعض اخباروں کی عبارت ایسی گنجلک ہوتی ہے کہ ان اخباروں کی جگالی کرتے کرتے گائے بھینسوں کے دانت گھس جاتے ہیں اور انھیں پائیریا بھی ہو جاتا ہے۔ ایک گوالے نے اخباروں کے مالکوں سے یہ کہا کہ وہ اخبار چھاپتے وقت گائے بھینسوں کے ذوق کا بھی خیال رکھیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ جو اخبار عام پڑھنے والوں میں کثیر الاشاعت نہیں ہوں گے تو وہ گائے بھینسوں میں کثیر الاشاعت ہو جائیں گے۔ اور ان اخباروں میں کوئی چیز ایسی نہ چھاپی جائے جسے سونگھتے ہی گائے بھینس اپنا منہ پھیر لیں۔

اخباروں میں اداریے ایسے لکھے جائیں (جیسے لکھے جا رہے ہیں) اور جو عام پڑھنے والوں سے زیادہ بھینسوں کی سمجھ میں آئیں۔ پھر ان اخباروں میں مزاحیہ کالم ایسے ہوں کہ جن کو سوچنے اور سمجھنے کی بھینسوں کو زحمت نہ اٹھانا پڑے بلکہ انہیں سونگھتے ہی بھینس کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

برطانیہ کی وزیر اعظم مسز تھیاچر کے شوہر گرامی مسٹر ڈینس تھیاچر کی خدمت میں خطبۂ استقبالیہ

عالی مرتبت مسز تھیاچر کے گرامی قدر شوہر ڈینس تھیاچر صاحب گڈ مارننگ سر۔ صرف یہ بات آپ ہی کے لئے قابلِ فخر نہیں ہے کہ آپ برطانیہ کی پہلی وزیر اعظم کے شوہر ہیں، بلکہ یہ بات آپ کے ساتھ دنیا کے سارے شوہروں کے لئے بھی قابلِ فخر ہے۔

فرسٹ لیڈی آف دی کنٹری کی طرح آپ دنیا کے پہلے جنٹلمین آف دی کنٹری کہلائیں۔ اللہ تعالیٰ سارے شوہروں کو یہ مرتبہ عطا فرمائے۔ آمین۔ اور مسٹر ڈینس تھیاچر سر۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایک خاتون وزیر اعظم کے شوہر ہونے کے بعد بھی آپ زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی اہلیہ کا سایہ آپ کے سر پر ہمیشہ دائم و قائم رکھے۔ آمین این دعا از من و از جملہ شوہراں آمین باد۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کسی شوہر کو کسی وزیر اعظم کا شوہر ہونے کے بعد زندہ رہنے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

سنا ہے کہ آپ ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام دی ڈینجرز آف بیئنگ دی ہزبینڈ آف پرائم منسٹر ہے جس کا اردو میں ترجمہ یہ ہوگا کہ وزیر اعظم کا شوہر ہونے کے خطرات اور یہ بھی سنا ہے کہ آپ کی اہلیہ بھی ایک کتاب لکھ رہی ہیں جس میں وہ خاتون وزرائے اعظم کے شوہروں کی پرورش اور ان کی تربیت کے طریقے بتائیں گی۔

عالی جناب!

آپ کا تعلق اُس ملک سے ہے جس نے ہمیں آزادی دی اللہ تعالیٰ ہماری طرح آپ کو بھی آزادی دلوا دے۔ (دلوائیں)

ہمیں جب بھی آپکی قوم کے احسانات یاد آتے ہیں تو ہم انھیں ایک ایک کر کے یاد کرتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ کبھی کبھی مومن خاں مومن جنھیں ہمارے میمن بھائی میمن خاں میمن کہتے ہیں۔ یہ مصرع پڑھ کر آپ کو بھی یاد کر لیتے ہیں۔

ہمیں یاد ہیں وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آپ اپنے راج میں ہمیں اس طرح تقسیم کرتے رہے کہ اب ہم آپس ہی میں تقسیم ہونے لگے ہیں۔ آپ خود تو جمع ہو کر فرہیں

لگاتے رہے اور ہمیں منفی اور تقسیم ہونے کے قابل بنا کر چلے گئے۔ آپ کے یہ احسانات ہم جیسی بھولیں گے۔ ہمیں یاد ہیں یہ ذرا خدا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

- عنایت علی خاں

غزل

چمن ہے ابر ہے ٹھنڈی ہوا ہے کیا سمجھے
اسی سے آپ کو نزلہ ہوا ہے کیا سمجھے

مذاکرات کا خط آرہا ہے کیا سمجھے
مرا خیال ہے خط آرہا ہے کیا سمجھے

وہ جس نے قیس وغیرہ کی جان لے لی تھی
مرض ہمیں بھی وہی ہوگیا ہے کیا سمجھے

بس ابتدا ہی میں تھوڑی پریڈ ہوتی ہے
اور اس کے بعد مزا ہی مزا ہے کیا سمجھے

مرے نکاح کا صدمہ فقط تمہی کو نہیں
تمہارا باپ بھی پچھتا رہا ہے کیا سمجھے

وہ شہسوار ہی کیا جو زمیں پہ آجائے
اماں ! وہ شعبدہ سے دکھلا رہا ہے کیا سمجھے

قمر جلیل نے ایجاد کر کے نثری نظم
چچا کی روح سے بدلہ لیا ہے کیا سمجھے

ہم اہلِ بزم کو سمجھا ہے کیا عنایت نے
برابر ہم سے کہے جارہا ہے کیا سمجھے

- راغب مرادآبادی

قطعات

شیخ صاحب کی تو پیری پہ جوانوں کو ہے تنک
زلفِ خوباں میں نظر اب بھی اٹک جاتی ہے
عمر اتنی سے کسی طرح نہیں کم، لیکن
رال اس عمر میں بھی منہ سے ٹپک جاتی ہے

●

"زیر و بم" مجموعۂ اشعار کا رکھا تھا نام
بے گناہی کی سزا کا آج تک احساس ہے
لے کے وارنٹ آگئی اک دن پولس، اور یہ کہا
تم وطن دشمن ہو، زیر و بم تمہارے پاس ہے

●

مردانہ لباس آئی پہن کر جو کلب میں
نائیجیریا کی ایک سیہ فام حسینہ
کہنے لگا اک شخص، جو بیٹھا تھا مرے ساتھ
شاید یہ کسی جن کی ہے اولادِ نرینہ

• ● •

اظہر حسن صدیقی
کراچی (پاکستان)

جناب اظہر حسن صدیقی پاکستان کے نمائندہ مزاح نگار ہیں اور انکم ٹیکس سروس سے وابستہ ہیں۔ کراچی میں ان دنوں کمشنر انکم ٹیکس کے عہدہ پر فائز ہیں — (مدیر)

کہتے ہیں مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ڈاکو تو آکر چلے گئے مگر اپنے پیچھے ہمدردی اور تسلی دینے کے لئے آنے والوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چھوڑ گئے جو باوجود اتنا عرصہ گذرنے کے غیر منقطع ہے اور ساتھ ہی خاطر مدارات کے اخراجات میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ بقول ایک دوست کے اتنا مالی نقصان تو ڈاکوؤں نے بھی نہیں پہنچایا تھا جتنا دوست احباب اور رشتہ داروں کی محبت اور شفقت پہنچا رہی ہے۔ وہ تو ایک دفعہ محنت کر کے اور شرمندہ کر کے چلے گئے مگر اپنوں کی کرم نوازیاں ابھی تک جاری ہیں۔ ہمارے اوپر تو وہ مثل صادق آتی ہے کہ ایک تو نقصان مایہ اور دوسرے شماتتِ ہمسایہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کی تو فون پر حال معلوم ہو کر تسلی نہیں ہوتی پھر گھر، دفتر پہنچ کر پہلے چائے یا شربت سے خاطر تواضع کراتے ہیں اور پھر پوچھتے ہیں "ہاں بھئی شروع سے سناؤ" گویا یہ بھی ایک قصہ کہانی ہے۔ کاش اس وقت کی فلم ہوتی تو ان حضرات کی خدمت میں پیش کردیتے اور عرض کرتے کہ لیجئے کیسٹ حاضر ہے، گھر جاکر آرام سے وی سی آر پر ملاحظہ فرمالیجئے گا اکثر آنے والوں کے تاثرات مختلف نوعیت کے تھے کچھ حضرات تو صرف یہ معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ کتنے کا نقصان ہوا جبکہ کچھ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا بچا اور کچھ کو زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ پاس کیا کیا تھا، بعض ایسے بھی تھے جو صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ گھر والوں پر اس واقعہ کا کیا اثر ہوا۔ چند ایک خواتین و حضرات کی صرف سننے سے تسلی نہیں ہوتی تھی بلکہ موقع کا پورا معائنہ کرنا چاہتے تھے۔ بعض کو یہ افسوس تھا کہ ان کے دیکھے بغیر دروازوں، الماریوں اور دیگر سامان کی کیوں مرمت کرادی گئی۔ ان کا خیال تھا کہ پبلک کے دیکھنے کے لئے تمام سامان اسی طرح پڑے رہنے دینا چاہیئے تھا۔

یہ بات تو تھی دوست احباب اور رشتہ داروں کی۔ پولیس والوں کا رویہ ان سے قطعی مختلف تھا، ان کی عنایت تھی کہ فون کرنے پر فوراً تشریف لے آئے مگر آئے مرحلہ وار اور درجہ بدرجہ یعنی پہلے اے ایس آئی اور پھر انسپکٹر اور ڈی ایس پی اور اس طرح ساری رات استقبالیہ میں گذر گئی، حالانکہ ڈاکو حضرات تو ساڑھے دس بجے اپنا کام دکھاکر اور ہمیں فارغ البال کرکے جاچکے تھے۔ ہم پولیس کے بڑے عہدیداروں اور اہل کاروں کے بھی مشکور ہیں کہ جنھوں نے صرف فون پر ہی ہماری خیر و عافیت پوچھی اور ہمیں اپنے پورے تعاون کا یقین دلانے پر ہی اکتفا کی ورنہ ہماری ساری رات اور صبح ان لوگوں کا استقبال کرنے اور خاطر تواضع میں ہی گذر جاتی۔ ایک گھنٹہ بیٹھ کر اور چائے وغیرہ پی کر پولیس کے اہلکاروں نے سب سے بڑا انکشاف اور ہماری معلومات میں اضافہ تو یہ کیا کہ

فرمایا "یہ تو پیشہ ور ڈاکو کا کام معلوم ہوتا ہے"۔ یہ جان کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ ہماری پولیس کس قدر لائق اور قابل ہوگئی ہے اور اس کی کارکردگی میں کس قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ کہ جی چاہا کہ اگر ہمارے بس میں ہو تو فوراً تمغۂ حسن کارکردگی عنایت کردیں۔ اس انکشاف کے بعد باری آئی چوری ہونے والی اشیاء کی فہرست کی۔ قبل اس کے کہ ہم شروع کرتے انھوں نے خود ہی استفسار فرمایا: "وی سی آر تو ڈاکو لے ہی گئے ہوں گے۔" ہم نے عرض کیا کہ "لے تو وہ جب جاتے جب ہمارے پاس ہوتا۔" ہمارے جواب سے موصوف کو سخت مایوسی ہوئی اور بُرا سا منہ بنا کر رہ گئے، گویا یہ اظہار مقصود تھا کہ کہاں غلط جگہ آگئے اور لوگوں کی طرح پولیس والوں کو بھی جانے والے سامان کی تفصیل سے بہت دلچسپی تھی۔ غالباً وہ یہ چیک کرنا چاہتے تھے کہ جو اطلاع ان کے پاس پہنچی تھی وہ صحیح تھی کہ نہیں اور یہ کہ ان کے ساتھ ہیر پھیر تو نہیں کیا گیا تھا۔ اب انھیں کیا بتاتے کہ تصویر بتاں ہمارے پاس تھی ہی نہیں کہ ہم بُت پرست نہیں، موحد ہیں۔ رہے حسینوں کے خطوط تو، اس کا کیا ذکر کریں، ہمیں شرم آتی ہے اس لئے کہ جب کبھی ہم نے خوش فہمی یا غلط فہمی میں حسینوں کو خط اگر لکھے بھی تو انھوں نے ہمیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور کبھی جواب دینے کی زحمت بھی نہیں گوارا کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں اور دوستوں پر رعب جمانے کی خاطر اُلٹے ہاتھ سے اپنے نام فرضی خطوط لکھ کر میز پر یا ڈائری میں اس طرح رکھنے کی کوشش کی کہ چھپائے نہ چھپے۔ جانے والی چیزوں میں دو قیمتی چیزیں البتہ بہت یاد آتی ہیں، ایک تو ہندو پاک مشاعروں کے ٹیپ، دوسرے میچ دیکھنے کے لئے ایک پاکٹ ٹی وی جو ہماری فرمائش پر ہمارے ایک کرم فرما نے باہر سے لاکر دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری کالی واسکٹ جو سرکاری تقاریب میں پہننے کے کام آتی تھی اور جس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کو پہن کر تصویر صاف آتی تھی اور لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی کہ گروپ فوٹو میں ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ایک بات کی تو بہرحال داد دینی پڑے گی کہ ڈاکو تھے صاحبِ ذوق۔ دو باتوں کے لئے تو ویسے بھی ہم ان کے شکر گذار ہیں، ایک تو یہ کہ سرِشام آئے، رات کی نیند نہیں خراب کی، جلد نبٹا گئے اور دوسرے یہ کہ ہماری غیر موجودگی میں تشریف لائے اور ہمیں مزید شرمندگی سے بچا لیا۔

پولیس والوں کو تو نقصانات سے قطعی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ان کا زیادہ وقت ملازم سے پوچھ پاچھ اور جرح کرنے میں گزرا کہ ڈاکوؤں کے پاس ہتھیار کس قسم کے تھے؟ کیا وہ کلاشنکوف سے مسلح تھے یا جی تھری رائفل رکھتے تھے اور اگر ریوالور تھے تو کس قسم کے تھے۔ انہیں تو زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ ہمیں اس واردات کا کس پر شک ہے۔ اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ ہمیں کس پر شک و شبہ تھا، دشمنی ہماری کسی سے ہے نہیں۔ ویسے بھی ہمارے ہوتے ہوئے ہم سے بڑھ کر ہمارا دشمن کون ہوگا۔ البتہ جب قریبی دوست احباب پوچھتے ہیں کہ کیا کیا سامان گیا تو ہم انھیں اپنے ان دوست کا پتہ بتادیتے ہیں کہ ان سے تفصیل پوچھ لیں جنھوں نے واردات کی رات کو ہمیں کھانے پر بُلایا تھا اور پیچھے ہمارے گھر کا صفایا کرادیا!

پولیس نے تو اتنے سوال و جواب نہیں کئے اور نہ اتنے مشورے دیئے اور نہ ہماری اتنی کوتاہیوں کی نشاندہی کی جتنی دوست احباب اور رشتہ داروں نے کی۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس معاملے میں سب سے بڑے خطا کار ہم خود تھے اور جان بوجھ کر اس حادثہ کا شکار ہوئے ہیں۔ کسی کو اس بات کا شکوہ تھا کہ ہماری نالائقی کی وجہ سے گھر کے باہر کی دیوار اتنی نیچے رہ گئی جس کی وجہ سے ڈاکو بے دریغ گھر میں داخل ہوگئے اور اس پر غضب یہ کیا کہ اس پر شیشے

کے ٹکڑے بھی نہیں لگائے جبکہ دوسروں کا اصرار تھا کہ ہم نہایت لاپرواہ ہیں اور گھر میں چوکیدار تک نہیں رکھتے۔ انہوں نے اپنی محبت میں صرف مشورہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ یہ دھونس بھی دی کہ وہ کل ہی ایک قابل اعتماد چوکیدار ہمارے ہاں تعینات کردیں گے۔ کچھ کرم فرماؤں کو یہ شکایت تھی کہ ہم نے کُتّے کیوں نہیں پال لے۔ ان کے خیال میں کُتّوں کی موجودگی میں چور ڈاکوؤں کے آنے کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حضرات کا اپنی اپنی پسندیدہ نسل کے کُتّے ہمیں مفت فراہم کرنے پر اصرار تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ اگر یہ تمام حضرات اپنی پیش کش قبول کرانے پر اڑے رہے تو ہمارے گھر میں اہل خانہ کے لئے تو رہنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی اور یہ جو ہماری تنخواہ ہے، یہ تمام کی تمام کُتّوں کی نذر ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہمارا غریب خانہ بھی کُتّا خانہ ہو جائے گا جہاں ہر ذات اور نسل کا کُتّا موجود ہوگا اور جن کی حفاظت کے لئے انہیں رکھا جائے گا ان کے لئے گھر میں شائد ہی کہیں کوئی جگہ بچے۔

ہمارے بہتیرے بزرگوں اور خیر خواہوں کا یہ خیال تھا کہ یہ آفت اس لئے آئی کہ ہم صحیح وظائف کا ورد نہیں کرتے ان لوگوں [illegible] حضرات نے [illegible] ہم سے مختلف وظائف پڑھوا کر سُنے بلکہ اتنے بہت سے لکھ کر دیئے ہیں کہ اگر ہم روزانہ ان کا ورد کریں تو پھر کسی چوکیدار وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ یہ تمام وظائف عشاء کی نماز کے بعد پڑھنے ہیں اور اگر یہ تمام پڑھے گئے تو فجر کی اذان تو ویسے ہی ہو جائے گی۔

شہر میں بڑھتی ہوئی وارداتوں کے پیش نظر اور ڈاکو صاحبان کو زحمت اور اپنے آپ کو مزید شرمندگی سے بچانے کی خاطر اب ہم نے یہ طے کیا ہے کہ مکان کے باہر ایک بورڈ اس مضمون کا لکھ کر لگا دیں "یہاں ڈاکہ پڑ چکا ہے، آپ کو زحمت اور ہمیں شرمندگی ہوگی"

--

خوں بہا

ہرفن لکھنوی
(کراچی)

ایک خبر میں نے پڑھی اخبار میں باغ و بہار
حادثے میں مرنے والوں کی ہے قیمت دس ہزار

کس قدر رنگین کتنی خوب صورت ہے خبر
ایک معمولی سا انساں اور قیمت اس قدر

اس خبر پر روز اِک دو آدمی مرنے لگے
جو ہیں زندہ موت کی تیاریاں کرنے لگے

ایک بیوی نے کہا مجھ پر کرم فرمایئے
عشق ہے مجھ سے میاں تو روڈ پر مر جایئے

میری غربت سے جو رُوٹھے ہیں وہ اب من جائیں گے
آپ کے مرنے سے میرے کام سب بن جائیں گے

ایک صاحب بس کے نیچے آ گئے دے کر یہ دلیل
مختصر سی جانِ انساں نوٹ کی گڈی طویل

نوٹ کے بدلے ملے موٹی رقم درکار ہے
طفلِ نومولود مرنے کے لیے تیار ہے

آپ خود ہی دیکھئے دولت میں کیا اعجاز ہے
باپ سے پہلے پسر آمادۂ پرواز ہے

روئے غربت پہ خوشی کا رنگ گہرا آ گیا
مرنے والوں کے لیے موقع سنہرا آ گیا

خرچ کرنا زر دوا دارو پہ اب بے کار ہے
حادثے کی نذر کر دو گھر میں جو بیمار ہے

شائقینِ خودکشی کو یہ خبر پہنچایئے
شوق گر مرنے کا ہے تو بس کے نیچے آیئے

اس خبر سے فائدہ سب کو اُٹھانا چاہیئے
موت بستر پر نہیں سڑکوں پہ آنا چاہیئے

آؤ سمجھاؤں تمھیں دولت کمانے کے ہُنر
گھر میں جو معذور ہو تو پھینک آؤ روڈ پر

کچھ اندھیرے میں چھپا ہے اور کچھ باریک ہے
اس خبر کا ایک پہلو اس قدر تاریک ہے

ایک بیٹے نے دیا یہ درسِ عبرت آپ کو
مسخ کر کے لاش چوراہے پہ پھینکا باپ کو

رؤف پاریکھ
(کراچی، پاکستان)

یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے؟

لوگ سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟ یہ سوال ہمارے ذہن میں سب سے پہلے اس وقت آیا جب سگریٹ پینے والے دوستوں کی ایک "دھواں دھار" محفل نے ہمیں کھانسی میں مبتلا کیا۔ ہم نے کھانستے کھانستے سوچا کہ آخر لوگ سگریٹ ہی کیوں پیتے ہیں؟ اگر کچھ پینا ہی ہے تو لسّی پیجئے، اس سے جان بنتی ہے اور پی کر خواہ مخواہ بڑھکیں مارنے کو جی چاہتا ہے۔ چائے پی لیجیے، اس سے ذہن و اعصاب کو "تحریک" ملتی ہے اور اس تحریک کی مدد سے لوگ دفاتر میں اپنے آپ کو سمجھا بجھا کر کام پر لگا سکتے ہیں۔ ٹھنڈے مشروبات نوشِ جاں فرمائیے کہ بسیار خوری کے بعد ان کے پینے سے مزید کھانے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ نہ معلوم کیوں سگریٹ ہی پینے پر مُصر ہوتے ہیں؟ بالکل اسی طرح جس طرح انکم ٹیکس والے خون پینے پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ پینے کے لیے سب سے اچھی چیز غصّہ ہے۔

اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں تھے کہ ایک دوست ریلوے انجن کی طرح دھواں اگلتے ہوئے نمودار ہوئے ہم نے چھوٹتے ہی پوچھا، "سگریٹ پینے کا کیا فائدہ ہے؟"

"بہت فائدہ ہے۔" انھوں نے پیشانی پر بل ڈالے بغیر جواب دیا۔ "سگریٹ ساز ادارے اور سگریٹ کے کاروبار سے متعلق افراد ہمارے سگریٹ پینے کے دم قدم سے ہی تو پھل پھول رہے ہیں۔"

"ان کے علاوہ بھی کسی کا کوئی فائدہ ہے؟" ہم نے پوچھا

"کیوں نہیں" انھوں نے سگریٹ کے دھوئیں سے فضا میں دائرے اور لہریئے بناتے ہوئے جواب دیا۔ "سرطان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر حضرات، دافع سرطان دوائیں بنانے والے دوا ساز ادارے" وغیرہ وغیرہ۔

"بندۂ خدا! سگریٹ پینے والوں کا بھی کوئی فائدہ ہے اس میں؟"

"کیوں نہیں، سگریٹ پینے سے ذہنی پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مجھے دیکھو میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہوں کہ کہیں سگریٹ نوشی کی وجہ سے مجھے سرطان نہ ہو جائے۔ لیکن جیسے ہی سگریٹ سلگاتا ہوں یہ سارے تفکرات دھواں بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ سگریٹ پینے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو دنیا کے غموں سے بہت جلد نجات مل جاتی ہے اور وہ حیاتِ فانی یعنی دنیائے بے ثبات سے جاودانی کی جانب کوچ کر جاتا ہے۔ لواحقین اور قرض خواہ روتے دھوتے رہ جاتے ہیں۔ میں نے وصیت تحریر کر دی ہے کہ میری قبر پر ہر جمعرات کو گھٹیا قسم کے ولایتی سگریٹوں کی دھونی دی جائے۔"

"سگریٹ نوشی میں بھی اعتدال لازم ہے۔" ہم نے اُن کی تقریر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا، "ایک کے بعد ایک سگریٹ پینا اور ایک سے دوسری سگریٹ اس طرح سلگانا کہ CHAIN یعنی زنجیر بن جائے اور آدمی چین اسموکر

(ERMONS MRARBR SMOKER) کہلانے لگے، بھلا کس طرح فائدہ مند ہو سکتا ہے؟"

فرمانے لگے، "اس کتاب سے بڑا فائدہ تو مجھے یہی نظر آتا ہے کہ اس طرح آدمی ماچس کے خرچ سے بچ جاتا ہے اور اس بچی ہوئی رقم کو مزید سگریٹ خریدنے پر صرف کر سکتا ہے۔ خود میں اسی طرح روزانہ پچاس پیسے بچاتا ہوں اور ان بچاس پیسوں کے مزید سگریٹ خرید کر پی جاتا ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جدید تحقیقات کی رو سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایک سگریٹ روزانہ زندگی کے ساڑھے چار منٹ کم کر دیتا ہے۔" ہم نے اپنی دانست میں بڑی دانائی کی بات کہی۔ یہ سن کر وہ چونک پڑے۔ کاغذ قلم نکال کر حساب جوڑنے لگے اور پھر گویا ہوئے، "میرے دادا کی عمر اٹھانوے سال ہے۔ وہ پندرہ سال کی عمر سے سگریٹ پی رہے ہیں اور جتنے سگریٹ آج تک پی چکے ہیں اس حساب سے ان کی زندگی کے چوبیس سال کم ہو چکے ہیں۔ جس طرح وہ بیٹنگ کر رہے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی سنچری مکمل کر لیں گے۔ ان آئندہ دو سالوں میں یعنی سو سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ اپنی زندگی کے چوبیس سال سات ماہ کم کر چکے ہوں گے لیکن تمہاری بات سے یہ ثابت ہوا کہ اگر وہ سگریٹ نہ پیتے تو آج وہ ۹۸ کے بجائے ۱۲۲ سال کے ہوتے۔"

اس تاریخی انکشاف کے بعد مزید بحث فضول تھی۔ لہٰذا ہم اس سوچ میں پڑ گئے کہ اوروں کو تو اس کا ذخیرہ سے باز رکھنا مشکل ہے، خود اپنے آپ کو سگریٹ کے مسموم دھوئیں سے بچانے کے لیے ہم کہاں جائیں؟ لیکن یہ خیال کر کے ہمارا دل بیٹھ گیا کہ سگریٹ کے دھوئیں سے خود کو بچانا ناممکنات میں سے ہے، کیونکہ اس کے لیے ہمیں ہمالیہ یا قراقرم کے پہاڑی سلسلوں کی کسی برف پوش وادی میں مستقل قیام کرنا ہوگا۔ اس نتیجے پر پہنچنے کی وجہ یہ تھی کہ ان برفانی ویرانوں کے علاوہ تمباکو کے شائقین ہر جگہ ہمیں دھواں پھیلاتے نظر آتے ہیں۔

منی بسوں میں، جہاں عموماً لوگ مُرغا بنتے ہیں اور بریک لگنے پر ایک دوسرے کی گود میں بیٹھ جایا کرتے ہیں اور اس طرح چند لمحے دم لے لیتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ آکسیجن کے سلنڈر ساتھ لے کر سفر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ حتیٰ کہ بسوں میں بھی، جہاں کی آبادی ایک آدمی فی مربع انچ ہوا کرتی ہے، لوگ سگریٹ پینے سے باز نہیں آتے اور بس کی فضا میں دھوئیں کی آمیزش کا خاطر خواہ انتظام و انصرام رکھتے ہیں تاکہ بس کے وہ مسافر جو کسی مجبوری کے سبب فرضِ تمباکو نوشی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ بھی اس نفلی عبادت کے مزے لے سکیں اور دھوئیں کے لطف سے محروم نہ رہ جائیں۔ اب ان سے کون کہے کہ حضرت! اگر آپ کو تازہ ہوا سے کوئی دلچسپی نہیں، آپ آکسیجن سے بھی الرجک ہیں اور نکوٹین آلود دھواں اپنے پھیپھڑوں کو مہیا کرنے پر مُصر ہیں تو ایسا بصد شوق کیجئے، مگر آپ کو یہ حق کس نے دیا کہ آپ دوسروں کی آکسیجن خراب کریں؟

ایسے بھی باذوق حضرات موجود ہیں جو یہ مشقِ دل سوزی بیت الخلاء میں بھی جاری رکھتے ہیں، چند ہی منٹوں بعد دروازے کی جھری سے دھواں باہر آنے لگتا ہے اور دیکھنے والے گھبرا کر پکار اٹھتے ہیں کہ

یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

اس وقت یاد آتا ہے کہ یہ دھواں خلا میں جانے والے اس راکٹ کا ہے جو اس وقت مدار میں گردش کر رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست ایسے بھی ہیں جن کی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ شغلِ تمباکو نوشی سے عبارت ہے صبح آنکھ کھلتے ہی ان کا ہاتھ لاشعوری طور پر سرہانے کی طرف جاتا ہے جہاں ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا دھرے دل کی شدت

کو کم کرنے والی دواؤں کے ساتھ رکھے رہتے ہیں۔ اس وقت سے جو سگریٹ پینا شروع کرتے ہیں تو سوائے
دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے کے وقفے کے، اس نیک کام میں کوئی خلل نہیں آنے دیتے۔ "لنچ" اور "ٹی ٹائم"
کے فوراً بعد یہ کہہ کر سگریٹ سلگاتے ہیں کہ

جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

اور اس بے دردی سے کش پہ کش لگاتے ہیں کہ چند ہی لمحوں میں سگریٹ راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سگریٹ کے اس
"انجام" پر ان کے لبوں پر ایک فاتحانہ تبسم رقصاں ہو جاتا ہے، آنکھوں میں قندیلیں جلنے لگتی ہیں اور چہرے پر ایک
روحانی سکون اور قلبی طمانیت لہریں لینے لگتی ہیں گویا ساری زندگی کی مایوسیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کا انتقام
اس ایک سگریٹ سے لے لیا ہو۔ لیکن چند ہی لمحوں بعد آپ کے خون میں جوشِ انتقام موجیں مارنے لگتا ہے اور
انتقام کی آگ کو سرد کرنے کے لیے انھیں ایک اور سگریٹ پینا پڑتا ہے۔ دن بھر اسی طرح کوئی ستر، اسّی مرتبہ
اپنی مایوسیوں کا انتقام لیتے ہیں۔

اس کثرت سے انتقام لینے کے طفیل ان کی انگشتِ شہادت اور اس کے برابر والی انگلی کے پورے
پیلے پڑ چکے ہیں۔ ان دونوں انگلیوں کو عالمِ خواب میں بھی عادتاً سگریٹ پینے کے انداز میں اکڑائے رکھتے ہیں۔ دھواں
ان کے جسم میں اس قدر بھر چکا ہے کہ جب سگریٹ نہ پی رہے ہوں، اور عالمِ بیداری میں ایسا بہت کم ہوتا ہے
تو ان کے دونوں کانوں سے دھواں خارج ہونے لگتا ہے۔ غنودگی کے عالم میں جب کبھی انگڑائی لیتے ہیں تو
نہ جانے کن عضلات پر زور پڑتا ہے کہ منہ سے دھوئیں کے مرغولے برآمد ہونے لگتے ہیں۔

ہمارے ایک اور دیرینہ کرم فرما مرزا محمد صاحب انیس مخدوم مدمر آبادی، (یہ ایک ہی صاحب ہیں) سگریٹ نوشی
کے دوران ایک ایسی دل جمعی اور انہماکِ توجہ کا مظاہرہ کرتے ہیں گویا سگریٹ نوشی سے زیادہ اہم کام دنیا میں کوئی
نہیں، اور اگر تھا بھی تو یہ اسے بہ حسن و خوبی اور بہ تمام و بہ کمال انجام دے چکے ہیں۔

ایک دفعہ ہم ان سے ملنے گئے۔ دور ہی سے دھواں نظر آ گیا جو ان کے مکان کی چمنی سے بل کھاتا ہوا باہر آ رہا
تھا۔ ہم نے فوراً اندازہ لگایا کہ یہ حضرت آتش دان کے سامنے بیٹھ کر وہی کام کر رہے ہیں جس سے ان کے اپنے خیال
کے مطابق تمباکو کے کاشتکاروں کی معاشی حالت بہتر ہوتی ہے، حالانکہ اس عمل نے خود ان کے اقتصادی حالات
کو ایک واضح اور [illegible] بہ سختی ہے لیکن اپنی طبعی رحم دلی اور تمباکو کے کاشتکاروں کے خراب مالی حالات
کی بنا پر یہ اس کام کو کیے جاتے ہیں۔

ہم کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ دھوئیں کے بادلوں میں بیٹھے انتہائی استغراق کے عالم میں ملک کی معیشت
کو سہارا دینے [illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] ہم نے ان کے ہونٹوں سے سگریٹ کھینچ کر اپنے آنے
کی اطلاع دی، [illegible] سے نکل کر [illegible] دنیا میں آئے۔ آنکھیں کھول کر ہمیں اس طرح
دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں [illegible] کی بد دعائیں لیتا ہے بچہ؟" لیکن "بچے" نے ان سے کہا، "یار! کبھی اس
طرح [illegible] جس طرح سگریٹ پی رہے ہوتے ہو، دیکھ کر جگر مراد آبادی کی نظم "شکستِ
توبہ" یاد آ رہی ہے۔ جس میں [illegible] بل کھا کے پی گیا، [illegible] شرما کے پی گیا، گھبرا کے پی گیا۔"
انھوں نے [illegible] سے [illegible] ہم ان کی پروا کیے بغیر بولے، "آج [illegible] سگریٹ

کے نقصانات نہیں بتاؤں گا، کیوں کہ آج میں نے سگریٹ پینے کے فوائد پر ایک لطیفہ پڑھا ہے۔

"سگریٹ پینے کے فوائد"؟ وہ چونک کر بولے۔

"ہاں! سگریٹ نوشی میں بھی اہلِ بصیرت نے بڑے بڑے فوائد تلاش کر لیے ہیں۔ مثلاً سگریٹ پینے والا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ سگریٹ پینے والے کے گھر کبھی چوری نہیں ہوتی اور سگریٹ پینے والے سے لوگ کبھی اُدھار نہیں مانگتے۔"

"وہ کیسے؟ غالباً انھوں نے یہ لطیفہ نہیں سنا تھا لہذا حیرت سے استفسار کیا۔

"وہ ایسے کہ اکثر سگریٹ پینے والے مختلف جان لیوا بیماریوں کے شکار ہو کر عالمِ نوجوانی میں ہی سورگباش ہو جاتے ہیں، اس طرح بوڑھا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سگریٹ پینے والے کے گھر چوری نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بے چارے تمام رات کھانستے رہتے ہیں اور رہی یہ بات کہ لوگ سگریٹ پینے والوں سے اُدھار کیوں نہیں مانگتے تو بھائی! سگریٹ نوش حضرات اپنے خون پسینے کی کمائی دھوئیں میں پھونک دینے کے عادی ہوتے ہیں لہذا ان کی جیب بالعموم خالی ہوتی ہے۔ لوگ ان سے اس ڈر سے اُدھار نہیں مانگتے کہ کہیں یہ خود اُلٹا قرض نہ مانگ بیٹھیں۔

انھوں نے ہمارے اس تقریر نما لطیفے کو نہایت تحمل کے ساتھ سنا اور بڑی متانت سے فرمایا "تمہاری آئے دن کی بحث اور آج کے دلائل سے میں قائل ہو گیا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی سگریٹ نہ پیوں گا۔"

ہم نے انھیں گلے لگایا۔ بہت مبارک باد دی اور اسی خوشی میں انھیں اپنی جیب سے ٹکٹ لے کر سنیما بھی دکھا آئے۔ وہ حضرت بھی اپنے قول کے پکے اور بات کے سچے نکلے۔ سگریٹ پینا تو درکنار قسم لے لیجئے جو انھوں نے سگریٹ کو کبھی ہاتھ بھی لگایا ہو ۔۔۔ اب وہ سگار پیتے ہیں، اور چوں کہ ان سگاروں کی بدبو سے ہمارا دماغ پھٹنے لگتا ہے چنانچہ اب ہم اُن کے پاس نہیں جاتے۔ اب ہم بیٹھ کر یہ سوچا کرتے ہیں کہ لوگ سگار کیوں پیتے ہیں ۔۔۔؟

اِرشاد احمد خاں
(کراچی)

تخریب کاری کے کلب پر بھی چھاپہ مارا جائے

جناب اِرشاد احمد خاں پاکستان کے ممتاز صحافی اور کالم نگار اِن دِنوں روزنامہ "مشرق" کے ایڈیٹر ہیں ۔۔ یہ "کالم" سابق وزیر جناب عباس باوزیر کی جانب سے کراچی سے ۶۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک پُرفضا جھیل پر ۲۹۔مئی ۲۰۰۸ کو ہندوستانی ادیبوں کے اعزاز میں منعقد کیے گئے استقبالیہ جلسے میں پڑھا گیا ـــــ (ادارہ)

گزشتہ روز گاہو کینٹ پولیس نے کتا ریس کلب پر چھاپہ مارا جس کے نتیجے میں کئی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ گرفتار شدگان میں نو کتے بھی شامل ہیں۔ گویا یہ پہلا موقع ہے کہ جب کتے بھی گرفتار ہوئے ورنہ عموماً چھاپہ پڑنے پر افراد گرفتار اور کتے فرار ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں وقتاً فوقتاً اطلاعات آتی رہتی ہیں کہ پولیس نے گھیرا تنگ کر دیا ہے۔ ایرپورٹ ، ریلوے اسٹیشنوں اور سرحدوں کی نگرانی سخت کر دی گئی ہے۔

کتوں کی گرفتاری اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ان میں سے ہر کتا ۵۰ ہزار سے لے کر ایک لاکھ روپے مالیت کا ہے دوڑ لگانے کی صورت میں اس کی قیمت کتنی بڑھ جاتی ہوگی؟ اس کا صحیح جواب پولیس ہی دے سکتی ہے البتہ ان کتوں کے قبضے سے جو سامان برآمد ہوا ہے اس میں وڈیو کیمرہ ، وی سی آر اور کلر ٹی وی شامل ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتے فارغ اوقات میں وی سی آر پر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔

ریس کے کتوں کے یہ ٹھاٹ باٹ بعید از قیاس اس لیے بھی نہیں کہ خود ہمارے ایک شناسا نے اپنی ساری دولت اور جائداد کتوں کی پرورش اور خاطر مدارات پر صرف کر دی وہ انہیں مہنگی کلو فاسٹ فوڈ کھلاتے اور خود سلو دال کھاتے ، خود ٹھرا پیتے لیکن انہیں دوسرے کتوں کے پرمٹ کی وہسکی بلیک سے خرید کر پلاتے خود اکلوتی بیوی تک سے اس لیے دور رہتے کہ کہیں پکڑ جانے کی صورت میں ناپاک نہ ہو جائیں لیکن اپنے پالتو کتوں کی تفریح کے لیے بطور گرلز فرینڈ اعلیٰ نسل کی کتیاں یورپ سے منگاتے تھے اگر کوئی دیسی کتیا دوستی کا ہاتھ بڑھاتی تو فوراً ہی اپنے کتے کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہتے "کمبخت! کیا اپنی نسل خراب کرے گا" آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پہلے پالتو انہیں دیکھ کر دُم ہلاتے تھے آج وہ خود ان کتوں کو دیکھ کر دُم ہلاتے ہیں اگر اس واقعہ پر یقین نہ آئے تو [illegible] طرح تاز و نعم ۔۔۔ کوئی کتا [illegible] کے دیکھیے [illegible]

آپ اس کے سامنے دُم ہلائیں گے اور وہ بھونکنے لگے گا بس شرط یہ ہے کہ کُتا ہو اعلیٰ نسل کا خاندانی ۔۔ رہ گئے آوارہ کُتے تو اُن کی وفاداری سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، ان دنوں جب وہ کراچی کے میونسپل ٹاور کے قریب سے گزرتے ہیں تو بے اختیار دُم ہلانے لگتے ہیں۔

مشہور ہے کہ سانپ اور کُتوں کی بے شمار قسمیں ہوتی ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ مہارت نہ ہونے کے سبب اُن کی شناخت نہ کی جا سکے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کچھ یوں پیش آچکا ہے کہ ایک صاحب بڑا سا کُتا زنجیر سے باندھے جا رہے تھے ایک راہ گیر نے پوچھا "یہ گدھا کہاں لے جا رہے ہو؟" برہم ہوتے ہوئے بولے "اندھے ہو، دِکھتا نہیں، یہ گدھا نہیں، کُتا ہے کُتا۔۔۔"

راہ گیر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "معاف کیجئے میں آپ سے نہیں کُتے سے پوچھ رہا تھا۔"

پچھلے دنوں کراچی میں گدھا گاڑی ریس منعقد ہوئی لیکن صوبائی وزیر محنت عباس باوزیر نے ریس جیتنے کا انعام گدھا گاڑی والے کو دیا لوگوں نے اعتراض کیا "ریس گدھے نے لگائی تھی گاڑی والے نے نہیں، اس لیے انعام کا مستحق گدھا ٹھہرتا ہے" لیکن ہم اس اعتراض کو درست نہیں سمجھتے اور وہ اس لیے کہ گدھوں کا کام صرف محنت کرنا ہے انعام حاصل کرنا نہیں اسی لیے تو یہ مقولہ بھی مشہور ہے کہ بے وقوف کام کرتے ہیں اور عقل مند انعام پاتے ہیں، اب اس مقولے کو آپ جس صورت میں چاہیں تبدیل کر لیں بلکہ گزشتہ دنوں مختلف موضوعات پر منعقد ہونے والے سیاسی فسادات اور دھماکوں کی روشنی میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ

"بے وقوف جان گنواتے ہیں اور عقل مند اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں۔"

چنانچہ بعض سیاسی ناموں کو اگر کھرچ کر دیکھا جائے تو ان میں سے نہ جانے کتنے مظلوم اور نہتے شہریوں کا خون برس رہا ہوگا۔

ہاں تو صاحب بات ہو رہی تھی ریس کلب کے کُتوں کی۔ اور اس باب میں ہم عرض یہ کرنا چاہتے تھے کہ اب کُتے ریس کلب یا صاحب کے بنگلے تک محدود نہیں رہے اگر پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے ریس کے علاوہ دوسرے کلبوں مثلاً تخریب کاری کے کلب، انتشار پسندی کے کلب، رشوت خوری کے کلب، سازشوں کے کلب، ملک دشمن اور اسی نوعیت کے دوسرے کلبوں پر بھی چھاپے ماریں تو کُتے نہ سہی لیکن اس نوعیت کی گرفتاریاں عمل میں آ سکتی ہیں۔۔۔۔

رہا آوارہ کتوں کا مسئلہ ۔ تو مختلف وارداتوں کے بعد ان کے لیے کوئی علاقہ مخصوص نہیں رہا۔ لاہور ہو، پشاور ہو، پنڈی ہو یا حیدرآباد، آوارہ کُتے ہر شہر اور ہر قصبے میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ اب انہیں شہریوں کا تعاقب کرنے میں کچھ دشواری پیش آنے لگی ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ زیادہ فیٹی ہو گئے ہیں یا انہیں ہائی بلڈ پریشر ہونے لگا ہے، بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ اُن کے خوف سے شہریوں نے زیادہ تیز دوڑنا شروع کر دیا ہے اسی لیے اب آوارہ کتوں کا ملک بھر کے بلدیاتی اداروں سے یہ مطالبہ ہے کہ ہمیں شہریوں کا تعاقب کرنے کے لیے تیز رفتار موٹر سائیکلیں فراہم کی جائیں۔

نسیم انجم
کراچی (پاکستان)

آشوبِ ڈائجسٹ

صاحب معروفیت کا دور ہے ہر کوئی اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں گھرا ہوا ہے لیکن معروفیت کی بھی مختلف شکلیں ہیں کسی کا ذہن تخریب کاری کے بارے میں سوچتا رہتا ہے اور کوئی بنی نوع کی بھلائی اور فلاح و بہبود کے منصوبے بناتا رہتا ہے جن کے پاس کوئی بھی کام نہیں ہوتا ہے تو وہ اپنے پسندیدہ مشاغل میں مگن رہتے ہیں۔ بات مشاغل کی چل نکلی ہے تو یاد آیا کہ آج کل کے لوگوں کا مشغلہ ڈائجسٹ پڑھنا بھی ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں کا۔ جہاں چلے جائیے نوجوانوں کے ہاتھ میں ڈائجسٹ ملیں گے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ وبا نوجوانوں میں بُرے طریقے سے پھیل چکی ہے۔

زیادہ تر یہ حضرات اپنا قیمتی وقت (جسے یہ فالتو سمجھتے ہیں) ڈائجسٹ کی خوبصورت کہانیوں کو پڑھ کر گذارتے ہیں۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان کہانیوں نے اِس طبقے کو سُست اور کاہل بنا دیا ہے۔ بڑے سے بڑا کام پڑا ہو یہ اس وقت تک نہیں اٹھتے ہیں جب تک کہ کہانی اپنے انجام کو نہ پہنچ جائے اور آنکھیں ڈائجسٹ چشم یا آشوبِ ڈائجسٹ چشم میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ تب کہیں یہ اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں کو ملتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ دو چار انگڑائیاں لے کر تھکن اور کہانی کا خمار اتارتے ہیں۔ ذہن سے نہیں جسم سے۔

کچھ تو کہانی کے اختتام پر کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں یا اس سوچ میں غلطاں رہتے ہیں کہ کہانی کا انجام یوں نہیں۔ یوں ہونا چاہیئے تھا۔ یا پھر قتل و غارت، ڈاکہ زنی کے حیرت انگیز کمالات پر حیران و پریشان رہتے ہیں اور اکثر مصنّف کو داد دیتے ہیں کہ کتنے کمال و ہوشیاری سے قتل کر دیا۔ ایک نہیں پورے سات۔ اور کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوا۔ اور کچھ ان کہانیوں کے "ہیرو" جیسے کمالات کر ڈالتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک شاگرد ہیں سفیان۔ وہ زیادہ تر اسکوٹر کا ایک پہیہ استعمال میں لاتے ہیں اور ہاتھ چھوڑ کر چلاتے ہیں۔ کل شام بھی وہ ایک پہیئے پر اسکوٹر چلانے کا مظاہرہ بڑی شانِ بے نیازی سے کر رہے تھے۔ لوگ ان کے کمالات کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور سفیان صاحب مکمل ہیرو بنے ہوئے تھے جب موصوف اپنا طویل کرتب دکھا چکے اور لوگ اپنے اپنے کاموں سے رخصت ہو گئے تب ہم نے انہیں موقع غنیمت جان کر آواز دے ڈالی۔ بھئی یہ کیا طریقہ ہوا اسکوٹر چلانے کا؟ خدا نخواستہ تم اسکوٹر سنبھال نہیں پاتے اور گر جاتے تو جانتے ہو اس کا نتیجہ میں تمہاری ٹانگ وانگ ٹوٹ جاتی تو ہماری بات سنا کر۔ وہ بڑی زور سے ہنسے۔ گویا انھوں نے اپنی دانست میں ہمارا مذاق اڑا لیا۔ سفیان میاں اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ہم نے اپنی سبکی محسوس کرتے ہوئے ذرا چڑ کر کہا ہنسنے کی ہی تو بات ہے جس اہم تو چڑا سے ہیں پہیہ ہاتھ چھوڑ کر ایک پہیئے

[illegible] آتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور بیٹے میاں بیچارے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ یہ "ٹلا" کونسا لفظ ہے ہم نے غصہ
کو پیتے ہوئے کہا۔ ممی آپ کو نہیں معلوم؟ یعنی وہ سنتری بادشاہ۔ انہوں نے وضاحت کی یعنی تم پڑھے لکھے آدمی ہو مہذب زبان
بولتا۔ ٹریفک کانسٹیبل۔ ممی اس زمانے میں سب ٹلا ہی کہتے ہیں۔ ہمارے اسکول کے سر بھی ٹلا ہی کہتے ہیں۔ وہ اچھے الفاظ بھی تو بولتے
ہوں گے۔ آپ کو نصیحت بھی کرتے ہوں گے۔ کیوں نہیں ممی۔ روز قوانین کا احترام اور حب الوطنی پر ایک لیکچر دیتے ہیں۔ تو پھر
تم نے ان پر عمل کیوں نہیں کیا۔ میری بات پر عمل کر ڈالا۔ میں نے کہا کہ انہیں تمام لوگ ٹلا ہی کہتے ہیں، وہ لاجواب ہوتے
ہوئے بے بسی سے بولے۔ سفیان میاں اگر تم ہی اتفاقیہ کسی اچھے کام کی قدر کرو تو تمہارا مستقبل درخشاں ہو سکتا ہے۔ تم ایک
اچھے ذمہ دار شخص اور باعزت شہری کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہو۔

سفیان ایک بات تو بتاؤ کہ تم نے یہ حیرت انگیز کمالات سیکھے کہاں سے ہیں۔ ہم نے ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر ذرا
مسکراتے ہوئے کہا۔ ارے ممی ایک ماہ پہلے ایک کہانی پڑھی تھی۔ 005' اس کہانی کا ہیرو بہت بڑا اور پکا مجرم ہوتا ہے۔ پولیس
کو ایسے ڈاج دیکر نکلتا ہے کہ بس ...... وہ ہمیشہ ایک ہی پہیہ پر اسکوٹر چلاتا تھا اور ریس میں پہلے نمبر پر آیا تھا۔ ریس کونسی
کہانی سے متاثر ہو کر لگائی تھی؟ ممی ریس تو ہم نے انگلش فلم میں دیکھی تھی۔ تو انگلش فلمیں بھی تخریب کاری کے جراثیم پیدا
کرنے میں پیچھے نہیں۔ ممی میں تو ایک دفعہ بھی اسکوٹر سے نہیں گرا ہوں مگر شریف صاحب کا لڑکا ہے نا۔ چھوٹو جب بھی کسی جاسوسی
کہانی کا ہیرو بننے کی کوشش کرتا ہے نقصان ہی اٹھاتا ہے۔ ایک بار اسکوٹر کی ریس میں ایسا گرا کہ بیچارے کے پیر کی ہڈی ٹوٹ
گئی۔ ہم نے انہیں بھرپور سمجھانے کی کوشش کی کہ بھائی اگر ہیرو ہی بننا ہے تو محمد بن قاسم علامہ اقبال اور قائد اعظم کی طرح بنو۔
رہتی دنیا تک نام روشن رہیگا۔ یاد رکھو اچھا شہری وہ ہوتا ہے جو وطن سے محبت اور قوانین کا احترام کرتا ہے۔ لیکن صاحب
وہ مسلسل دانت دکھاتے رہے۔ گویا ہماری نصیحت کا ان پر ذرا اثر نہیں ہوا۔ خیر سے یہ تو ہمارے شاگرد ہی تھے۔ ہمارے
میاں اور صاحبزادے کب کسی سے پیچھے ہیں۔ بقول ان دونوں کے جاسوسی کہانیاں اتنی سنسنی خیز ہوتی ہیں کہ پوری پڑھے
بغیر چین ہی نہیں آتا۔ جب تک ختم نہ ہو جائیں ذہن، دل و دماغ حتیٰ کہ گردے کلیجی پھیپھڑے تک اس کہانی میں پھنسے
رہتے ہیں۔ اب میں کب سے اپنے برخوردار طارق کو آوازیں دے رہی ہوں مگر مجال ہے کہ جو کان پر جوں رینگ جائے۔
صاحبزادے تو سنتے ہی نہیں ہیں۔ آپ ہی گوشت ترکاری لا دیجئے۔ کھانا پکانے کو دیر ہو رہی ہے۔ اف وہ ایک تو تم ساری کہانی
کا مزہ خراب کر دیتی ہو تمہیں کیا معلوم کہانی کس کلائمکس پر پہنچ چکی ہے۔ اس کلائمکس نے تو تم دونوں کی بھوک پیاس
ہی نہیں چھینی بلکہ فرائض سے بھی غافل کر کے نکھٹو بنا دیا ہے۔ انہوں نے سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا منہ سے کچھ نہیں بولے
بولنے کی صورت میں کہانی کا مزہ ختم ہو جاتا نا۔

کہتے ہیں لوہے کو لوہا کاٹتا ہے تو صاحب پچھلے دنوں سے ہم نے بھی ڈائجسٹ خریدنا شروع کر دیئے ہیں بلکہ بڑی پابندی سے
پڑھتے بھی ہیں ہمارے پڑھنے کا اتنا اثر ہوا کہ پہلے ہم چیختے چلاتے تھے لیکن اب ہمارے شوہر نامدار اور لاڈلے بیٹے شور مچاتے ہیں۔
ممی کھانا پکانے کو دیر ہو رہی ہے بھوک لگ رہی ہے آنتیں رہ گئے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں نے تمہیں کاہل بنا دیا ہے گھر گندہ پڑا رہتا ہے کوئی
کام توجہ نہیں کرتی ہو ہر وقت پڑھنے میں مگن ... اب خاموش بھی ہو جاؤ۔ کہانی کلائمکس پر پہنچ چکی ہے بس ایک منٹ ابھی ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں نہیں تو
خواہ مخواہ کا شور مچا رکھا ہے۔

ایس۔ ایم۔ معین قریشی
کراچی (پاکستان)

موصوف اور موصوفہ

یہ مضمون ہندوستانی مزاح نگاروں کے اعزاز میں منعقدہ ایک محفل میں پڑھا گیا (مدیر)

میں جب بھی اخبار میں کسی نو بیاہتا جوڑے کی تصویر دیکھتا ہوں اور اس میں مرد کو سراپا ناز اور عورت کو سراپا نیاز پاتا ہوں تو مجھے اپنا استحقاق مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ اب سے دو تین عشرے قبل تک جب ہمارا عقد "لاثانی" ہوا تھا، شادی کو ایک خالصتہً نجی مسئلہ تصور کیا جاتا تھا اور اخبارات میں اس کی تشہیر کا رواج نہ تھا۔ مگر اب دولہا دلہن بھی قومیا لئے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی تصویر دیکھ کر ایک قسم کا احساس محرومی ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے ـــ کیوں نہ "لاثانی" کو "ثانی" کر دیا جائے۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ موجودہ حدود اربعہ کے ساتھ تصویر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ کی زینت تو بن سکتی ہے، اخبارات میں شاید بطورِ اشتہار بھی نہ چھپے۔ "گلیمر" کے اس دور میں کون گلہری جیسی شکلیں چھاپنے کا خطرہ مول لے گا۔

اس ابتدائی احساس کے بعد میرے دل میں تصویر والے مرد کے بارے میں ہمدردی کے گہرے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بے چارہ، نتائج سے غافل اور بے پرواہ کیسے جاہ و جلال کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ کسی نے اس غریب کو متنبہ نہیں کیا کہ صرف دو الفاظ "قبول ہے" کہہ کر وہ خود اپنے کانٹے کا شکار ہو چکا ہے۔

اگلے روز کسی اخبار میں ایک بے ہنگم اور فضول سے دولہا کو اپنی نازک اندام، پری چہرہ لیکن بظاہر شکست خوردہ دلہن کے پاس فاتحانہ انداز میں بیٹھے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر یہ شعر آگیا ؎

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھی اور ہم نے بیگم سے کہا کہ ہماری شادی کا البم تو نکالو، تا ہم بھی عمر رفتہ کو آواز دیں۔ بیگم نے حسبِ معمول ہماری بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا لیکن جب ہم کو اس معاملے میں کافی سنجیدہ پایا

ہماری آرزوؤں کو "شورٹ" اور خود ہمیں "ہورٹ" کر دیا کہ تصویر پرانی ہو جانے اور کٹ پھٹ جانے کی وجہ سے پھینک دی گئی۔ گویا ہماری فتح مندی کی یہ آخری یادگار بھی ختم ہو چکی تھی۔ ہم یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ خواتین یا بھی ہی نہیں کہ مردوں کی برتری کی کوئی بھی نشانی باقی رہے (شاید یہی وجہ ہے کہ مردوں نے اپنی شادی کی تصاویر اخباروں میں چھپوانی شروع کر دی ہیں تاکہ یہ عظیم یادگاریں بیگمات کی دسترس سے نکل کر تاریخ صحافت کا حصہ بن جائیں)۔

شادی کی تصویروں کا خبط اب اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ برأت کی روانگی سے قبل ایک شخص کو اگر قاضی صاحب کو لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو دوسرے کو فوٹو گرافر کی طرف۔ قاضی صاحب اگر جلدی پہنچ جائیں تو انہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوتا ہے جب تک فوٹو گرافر صاحب مع اپنی گن کے نہیں آجاتے۔ اور پھر اخبارات ان تصویروں کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں بلکہ بعض جرائد تو رنگین تصاویر چھاپنے لگے ہیں۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ یہ تصویریں کیوں چھپتی ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ ایک بار تصویر شائع کرنے کے بعد اخبار والے پلٹ کر اس بے زبان کی کوئی خبر نہیں لیتے جسے عرف عام میں شوہر کہا جاتا ہے۔

تجربے کے طور پر سہی، میری تجویز ہے کہ کوئی صاحب دل صحافی کسی جوڑے سے اس کی شادی کے ایک سال بعد ملاقات کرے اور اس وقت کی ایک تصویر بنائے۔ یہ دوسری تصویر بتائے گی کہ گاڑی ریورس گیئر میں چلنے لگی ہے۔ جو گردن پہلی تصویر میں اکڑی ہوئی تھی، اب اپنی اصلی حالت میں آچکی ہے۔ اس کے برعکس پہلی تصویر کی جھکی ہوئی گردن اور نیچی نگاہیں اب قدرے بے باک ہو گئی ہیں۔ پہلی تصویر میں جو مونچھیں کٹار کی مانند تنی ہوئی تھیں، دوسری میں اعتدال پر آگئی ہیں۔ گویا تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔

اگلا دورہ پانچ سال بعد ہونا چاہیے۔ اب جو تصویر بنے گی اس میں موصوف کے نقش و نگار اور تیوروں میں مندی کا رجحان صاف نظر آئے گا۔ مونچھیں مائل بہ زوال ہوں گی۔ گردن میں نیچے کی طرف خم ہوگا اور آنکھوں میں ویرانی۔ کیفیت یہ ہوگی کہ بقول شاعر ؎

ہمارے سامنے گر آئینہ ہو
بڑی شرمندگی کا سامنا ہو

اس کیفیت کی روداد حضرت جوش کی زبانی سنیے ؎

تنگ دھندلی دھنسی ہوئی آنکھیں
جیسے فرمانِ قتل پر مہریں!

موصوفہ اس کے برعکس پورے فارم میں نظر آئیں گی اور داغ کے اس شعر کی بھرپور ترجمانی کریں گی ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

اس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لئے دس سال بعد ایک اور دورہ کر لیجئے اور دونوں کو ساتھ بٹھا کر (اگر وہ ایک

ساتھ بیٹھے ہوئے ہوجائیں تو) ایک تصویر اور بنا لیجیے۔ اس کا موازنہ شادی کی پہلی تصویر سے کریں۔ فرق صاف ظاہر ہوگا۔ موصوف ایک زیر مقدمہ ملزم کی مانند نظر آئیں گے جبکہ موصوفہ ایس۔ ایچ۔ او کے روپ میں۔ تصویر موصوف کو دکھائیں تو خود پکار اٹھیں گے ؎

"عقد" نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ صورت حال مستقل بھی ہے اور آفاقی بھی۔ چنانچہ امریکی دانشور ہربرٹ ہوور نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں درحقیقت ایک ہی پولیس فورس ہے یعنی امریکی خواتین۔

کچھ عرصہ قبل سابق سکریٹری اطلاعات جناب علی احمد بروہی پریس کلب کی ایک تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ اپنے خطاب میں انہوں نے ضمناً پاکستانی فلموں کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمارا ہیرو ہر بحران پر قابو پا کر آخر کار ہیروئن سے شادی کر لیتا ہے اور ایسی فلم کے انجام کو طربیہ کہا جاتا ہے حالانکہ اصل المیہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا تھا اگرچہ گھسا پٹا ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے دوبارہ سُن لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شادی کی ایک محفل میں نکاح کے بعد دولہا اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ہنس ہنس کر سب سے مبارکباد وصول کر رہا تھا۔ اُدھر زنان خانے میں دلہن کی رخصتی کا وقت تھا اس لئے گھر والے زار و قطار رو رہے تھے۔ دلہن کا چھوٹا بھائی ان دو مختلف مناظر کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اُس نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے والد سے پوچھا۔ "ابو آپ رو رہے ہیں، امی رو رہی ہیں، باجی رو رہی ہیں، ان کی سہیلیاں رو رہی ہیں، سب رو رہے ہیں لیکن باہر دولہا ہنس رہا ہے۔ وہ کیوں نہیں روتا ابو؟" "آج اُسے ہنسنے دو بیٹے" والد نے رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے کہا "ہم سب تو رو دھو کر تھوڑی دیر میں خاموش ہو جائیں گے، اس غریب کو ساری عمر رونا ہے۔"

یہ عمر بھر کا رونا بے چارے شوہر کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ صحافت ہمیشہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کرتی ہے (صحافت کے اُستاد کی حیثیت سے ہم خود بھی اپنے طلبہ کو یہی تعلیم دیتے ہیں) اگر یہ صحیح ہے تو اخبارات میں ایک نیا کالم شروع کیا جائے اس میں ایسے جوڑوں کی تصاویر شائع ہوں جن کی شادی کو چودہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے۔ صحافی بھائیوں کی آسانی کے لئے کالم کا عنوان ہم تجویز کر دیتے ہیں ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت "نکاح" ہو

عارف لکھنوی

ہائے گرانی!

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی ایک ایک کمانی

کیا وقت تھا وہ بھی کہ ہر اک چیز تھی سستی
پچیس روپے میں تھا وہ سامان گرہستی
تھا امن و سکوں تھی وہی سکھ چین کی بستی
چہرے پہ نہ تھی دوستو پھٹکار برستی

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی اک ایک کمانی

چھ آنے میں تھا قورمہ، پیسے کی چپاتی
شادی میں کوئی بوجھ نہ تھا خوش تھا براتی
تھی دھوم محلے کا محلہ تھا براتی
وہ وقت جو یاد آئے تو اب پیٹئے چھاتی

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی اک ایک کمانی

تھا گائے کا وہ دودھ اٹھنی میں سوا سیر
گھی ایک روپے سیر، نہ تھا جس میں کوئی پھیر
پیسے میں دھڑی بھر ملے کھاؤ جو اگر بیر
ہر سمت نہ تھی لوٹ نہ ہر سمت تھا اندھیر

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی اک ایک کمانی

اب سوٹ کی قیمت سے زیادہ ہے سلائی
دھلوائیں تو دے دیجئے دن بھر کی کمائی
پھٹ جائے تو بس کیجئے خود اپنی پٹائی
کیا وقت ہے کچھ کہہ نہیں سکتا مرے بھائی

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی اک ایک کمانی

یہ بات سناتا نہیں سو سال پرانی
ہے صرف چوالیس برس کی یہ کہانی
گزری تھی کبھی عیش کے عالم میں جوانی
کھی ہے بڑھاپے میں مصیبت یہ اٹھانی

اس طرح مرے سر پہ گرا کوہِ گرانی
ٹوٹی ہے مرے جسم کی اک ایک کمانی

سید ضمیر جعفری

نامور مزاح نگار و کالم نویس
عطاء الحق قاسمی کی کتاب
"جرم ظریفی" کا مقدمہ

عطائے خداوندی

اب کچھ یاد نہیں آرہا کہ عطاء الحق قاسمی سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی البتہ ایک بات یاد ہے کہ اس کی ذات میں ظرافت کا چشمہ ابلتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی گفتگو اتنی چمکدار تھی کہ وہ دوزخ میں سے بھی خلد کا راستہ ڈھونڈ لیتا۔ اس کا کوئی جملہ ایسا نہ تھا جو غم ایام کے سر پر دو ٹوکرے مٹی نہ ڈال جاتا ہو۔ بعد کی ملاقاتوں میں یہ تاثر مزید گہرا، تہرا ہوتا چلا گیا۔ اس میں ایک ایسا شخص ملا جس سے محبت واجب ہو جاتی ہے۔

میں اخبارات کے مزاحیہ کالموں کو اردو کے مزاحیہ ادب کا دست و بازو بلکہ بازوئے شمشیر زن سمجھتا ہوں۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اچھی غزل کی طرح اچھا کالم بھی کم کم لکھا جاتا ہے۔ بہرحال میرے نزدیک ان کالموں نے ہمارے مزاحیہ ادب کی آبیاری اور طرحداری میں بڑا نمک آفریں حصہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت کے بغیر اردو مزاح نگاری نہ اتنی "سچل سرست" ہوتی اور نہ وہ انسان اور زندگی کے اتنی قریب ہوتی جتنی کہ اب ہے۔ اخبارات کے شگفتہ کالموں کے بغیر میرا اعتقاد ہے" بے شمار مسکراہٹیں، اجنبی کبوتروں کی طرح بستی سے باہر شہتوتوں اور بیریوں کے درختوں پر ہی جھومتی رہتیں اور ان گنت مسرتیں مکانوں کی اونچی منڈیروں سے گھروں کے آنگنوں میں کبھی اترنے نہ پاتیں۔

دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا اور سب سے آسان کام دوسروں پر تنقید کرنا ہے۔ بعض لوگ اتنی سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں کہ ادب پری چہرہ لوگوں کی اتنی مورچھل برداری کیوں کرتا ہے۔ ادب محبوب کے رخساروں کی لٹ ٹوٹ کر بلائیں لے یا والہانہ سرمستی میں اس کے گیسوؤں میں کنگھی کرے، حسینوں کی روٹی پکائے یا ان کا بستر بچھائے، اپنے تئیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ادب کا یہی ایک وظیفہ تو نہیں کہ دوبارہ بیٹھے گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے حقہ پیتا رہے۔ اس میں ظالم کی کلائی مروڑنے کی کچھ ہمت بھی ہونی چاہیئے۔ اس "ہلاشیری" میں صحافتی کالموں کی آواز سب سے پہلے سنائی دیتی ہے۔ زندگی کی خوبیاں، بدنمائیاں ادب کا مواد ہیں۔

حسین چہروں کی طرح حسین کالموں کی بھی اتنی مختلف صورتیں ہیں کہ ہر صورت پہ دم نکلے۔ مثلاً دم کسی پہ نکلتا ہے، اس کا فیصلہ اپنی اپنی پسند پر منحصر ہے۔ کسی کو نرگسی آنکھ پسند، کسی کو نرگسی کو فتنہ۔ میں ذاتی طور پر خوش خلق، ہشاش بشاش مسکراتے ہوئے کالم کو پسند کرتا ہوں جو زخموں کی نشاندہی کرے، زخموں کی نمائش نہ لگائے۔ گلی کوچوں میں مچھر مارے یا جمہوریت کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے ہوئے پھرے۔ اس کا اپنا سراپا اور ہیئت سے اس کا وقار"

...زیادہ دشگفتہ ہونا چاہیے۔ کالم آرائی میں اگر عالم آرائی نہیں . . . تیشے سے بربط کوہسار بجانے کی تک نہیں . . . اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں . . . تو وہ اداریہ ہے۔ تندرہ ہے، جواب مضمون ہے۔ انشائیہ ہے۔ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہے، مگر کالم نہیں ہے۔ کالم "ثقہ" مگر "پھیکا" نہ ہو۔ باوقار کے ساتھ ساتھ دل بہار۔ جس طرح کوئی اجل عالم۔ اپنی دستار اور کتابوں کا تھیلا میدان کے کنارے رکھ کر محلے کے چھوکروں کے ساتھ فٹ بال یا گلی ڈنڈا کھیلنے لگ جائے۔ قلم بے شک ٹہلتا ٹہلتا چلے۔ دائیں بائیں گھومے، اِدھر اُدھر ڈھلکے۔ لڑھکے۔ جھانکتا بھانکتا جائے مگر کسی منزل کی طرف چلے۔ اگرچہ ہم اس منزل کو بھی قابلِ التفات نہیں سمجھتے کہ جس کی کھجوریں روز خیمے ہی میں سطروں میں سامنے کھڑے نظر آ جائیں۔

کالم کو جرنیلی سڑک پر نہیں، پگڈنڈیوں پر چلنا چاہیے۔ وہ گرجے کم، برسے زیادہ۔ ان توقعات پر وہی کالم پورا اترتا ہے جو توقعات سے بے نیاز ہو کر لکھا جاتا ہے اور عطاء الحق قاسمی کا یہی وہ بے نیازانہ انداز ہے جس کی صحت اور زندگی کی دعا دوست دشمن دونوں مانگتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی معاشرتی، معاشی، سیاسی کوتاہیوں اور ناہمواریوں کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔ ظالم اور مظلوم کی نشاندہی، اس کے کالموں میں جا بجا نظر آتی ہے بعض اوقات تو وہ آستینیں چڑھائے، ڈنڈا اٹھائے برے کو اس کے گھر تک چھوڑ آتا ہے لیکن اس ساری کارروائی میں وہ اپنے قاری کو بدمزہ یا ماحول کو افسردہ نہیں ہونے دیتا۔ اس کا غصہ ایک ایماندار شخص کا غصہ ہے جو آتا بھی جلد ہے اور جاتا بھی جلد ہے۔ وہ جہاد کرتا ہے، فساد نہیں کرتا۔ طنز کو وہ عینک کی طرح نہیں پہنتا کہ اپنے چہرے کے سوائے سب کچھ نظر آئے۔ اس کا دھاوا دفاعی اور رفاہی ہوتا ہے۔ اس کے کالموں کی مقبولیت کا راز اس کے "سوادلے" طرزِ تحریر میں مضمر ہے جس کا مزاج طبیبانہ نہیں جیبانہ ہے۔ اور ہاں اس کی نثر میں کارفرما جراحی کا وہ طلسم بھی موجود ہے جو نثر کے ایک عام ٹکڑے کو ادب کی پرت عطا کر دیتا ہے جس کو یگانہ میرنے شعور سے جنوں کرنا کہا ہے۔

در اصل ہیں کالموں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بنجر، بارانی، چاہی اور نہری۔ بنجر کالم محض رقبہ گھیرتا اور وقت ضائع کرتا ہے۔ بارانی کالم میں ہریالی کم اور خشکی زیادہ ہوتی ہے۔ مینہ کا چھینٹا پڑ گیا تو کوئی انکھوا نکل آیا۔ ورنہ موعظ و پند کی حدت۔ لو جھکڑ۔ بجھے ہوئے کھیت، اڑتی ہوئی ریت۔ ان کی گرمی سے چٹانیں اور ان کی خشکی سے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

کالموں کی بہترین صورت چاہی اور نہری کالموں میں نظر آتی ہے۔ البتہ چاہی میں بہاؤ کم اور کھنچاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ مطالب باریک نکات؟ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ اور جب علی بیگ سرور دعاؤں کو اکھٹے گزرتا دیکھو۔ علم گہرا، فلسفہ گھنا، محاورہ بیبن میں تلا ہوا شگفتگی کبھی آئی ہوئی، کبھی لائی ہوئی۔ کپڑا معمولی۔ سلائی چست، بٹن رکشن، زبان کھلی ہوئی کم ڈھلی ہوئی زیادہ۔ حرف جلیل، ظرف قلیل ؎

جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا

نہری کالم . . . لبالب بھری ہوئی کشادہ نہر کی طرح رواں دواں چلتا ہے۔ گاتا، گنگناتا، شادابی پھیلاتا، گرد و پیش کو آئینہ دکھاتا . . . اتھلا کم چھپا زیادہ، اپنے پہاڑوں اپنے دریاؤں کا پانی۔ روانی میں جوانی۔ حقائق بلبلے، پھریلی۔ افسانہ و حقیقت ہم آغوش۔ بچے کا خوش حال گھرانہ۔

عطاء الحق قاسمی کے اکثر و بیشتر کالم نہری ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں پانی ہوگا، اُتار چڑھاؤ بھی ہوگا۔ بالائی منطقوں میں اگر برف پگھل جائے گی تو لہروں میں شکن بھی آجائے گی۔ سیاست کا کوئی گلیشیر ٹوٹ گیا تو کنارے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ مگر یہ عجیب نہر ہے کہ اس کا پانی برسات میں بھی گدلا نہیں ہوتا۔ اس نوع کے کالم جاگتے دل اور اونگھتی آنکھوں سے لکھے جاتے ہیں۔

جن لوگوں نے اردو کے عظیم اور امر کالم نویس مولانا چراغ حسرت کو دیکھا ہے انھوں نے مولانا کو عموماً اونگھتے ہی دیکھا۔

اردو کے منفرد کالم نگاروں کی فہرست بڑے بڑے پہاڑ ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ان پہاڑوں کے بیچوں بیچ اپنی کوئی الگ روش تراشنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مگر "روزن دیوار سے" ہم جمیں بادلوں کے ایک ایسے جھرمٹ کو بڑی تیزی سے اشکال پذیر ہوتا دیکھ رہے ہیں، جو کسی تحریر کی مخصوص چھاپ کہلاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریر باریک چٹائی کی تحریر ہے۔ اس میں کوئی دراڑ، کائی یا بھول بھلیاں" نہیں ہے۔ اس کے جملے، رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، فوج کے جوانوں کی طرح قدم ملا کر چلتے ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ اس عمل میں فاصلہ زیادہ طے کرتے ہیں اور گرد کم اڑاتے ہیں۔ اس کی سوچ بشاشت میں گھلی اور صداقت میں تلی ہوتی ہے۔ اس کی طبیعت کی بے اندازہ شگفتگی کالم کی ایک دن کی زندگی کو شیرکی زندگی بنا دیتی ہے اور اس کی روایتی "وقتیت" میں عصری تاریخ کی ایک تصویر متحرک ہو جاتی ہے۔

آرٹ اپنی سرشت میں خاصی بدلحاظ، بے مقصد اور بے لگام چیز ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے جس کمال قدرت سے اس وحشی کو رام کیا ہے، اس پر وہ داد کا مستحق ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کالموں کے پرانے کھدے ہوئے مورچوں میں جا کر کالم لکھتا وہ کالموں کو کھینچ کر اپنی پسند کے محاذ پر لے آیا ہے۔ جس سے کالم کی چھب کے علاوہ اس کی نشست و برخاست کا انداز بھی بدلا بدلا نظر آتا ہے یہ "اجنبیت" کے مقابلے میں "اپنائیت" کا عمل ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ عطاء کے کالموں میں اردو کالم نگاری نے پہلی مرتبہ انگرکھا اتار کر گلے میں ٹپکا لڈ ڈالنا سیکھا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اردو میں اس قسم کا "لوزیاں والا" اور "تعویذاں والا" "بلھے شاہیاں" کرتا ہوا گبھرو کالم، جو پاکستان کی مٹی میں "ملا دلا" رہتا ہے اور ہمارے کھیتوں میں اگنے والی کپاس کے پھولوں کی طرح ہنستا ہے، شاید کسی نے نہیں لکھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے دوست انتظار حسین ساہیوال یا جہلم میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا کالم بھی یہی بولی بولتا۔

عطاء الحق قاسمی

اصلی مصافحہ

بچوں کی تربیت کی طرف ہم آپ تو پتہ نہیں اتنی توجہ دیتے ہیں کہ نہیں، مگر ہم نے کچھ لوگوں کو اس معاملے میں بہت جان مارتے دیکھا ہے۔ مثلاً اگر وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو بچوں کو انگریزی میں گفتگو کی تلقین کرتے ہیں۔ بلکہ گھر میں انگریزی بول کر ان کی انگریزی کو سان پر لگاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ ہم ایسے سفید پوش ہیں اور انگریزی افورڈ نہیں کر سکتے، تو گھر میں بچوں سے اردو بولتے ہیں۔ اور انھیں بھی اردو بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ہم اس طرح کے کسی سفید پوش کے مہمان ہوئے تو اس کا بچہ بیٹھک میں داخل ہوا اور اپنے چھوٹے بھائی کی شکایت کرتے ہوئے کہا ابا! وہ بیرا آکھا" نہیں مانتا" اس پر ابے "نے ڈانٹ کر اس کی اردو کی اصلاح کی اور کہا اوے! آکھا نہیں مانتا، نہیں کہتے "کہنا"، نہیں مانتا کہتے ہیں" بلکہ کئی "ابے" تو ایسے بھی ہیں جو اگر ذرا سی انگریزی افورڈ کرنے لگیں، تو "ڈیڈی" ہو جاتے ہیں اور اگر اس ضمن میں ان کے درجات مزید بلند ہو جائیں تو "ڈیڈ" کہلانے لگتے ہیں اسی طرح "بے بے" پہلے "ممی" اور پھر "مام" ہو جاتی ہے اور بچے فاروق، یا سرادر خالد سے جونی گڈو اور ٹونی کی جون میں آ جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت جو لوگ بطور خاص ہمارا موضوع ہیں وہ اپنے بچوں کی لسانی تربیت سے زیادہ تہذیبی تربیت پر توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ محفل میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے سیکھے" تا کہ کل کلاں ان پر یہ الزام نہ آئے کہ انھوں نے اپنے بچے کی تربیت صحیح نہیں کی۔ چنانچہ ابھی گزشتہ روز ہماری ملاقات ایک ایسے ہی بزرگ سے ہوئی۔ جو غالباً اپنے پوتے کے ساتھ ہمارے دفتر میں تشریف لائے۔ کمرے میں میزوں کے ساتھ میزیں جڑی ہوئی تھیں۔ اور مہمان بھی اس وقت کثیر تعداد میں وہاں موجود تھے اس بچے نے لوگوں سے بھرے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسلام علیکم کہا اور ایک کونے میں لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر بزرگ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا "بڑوں سے اس طرح ملتے ہیں، چل اٹھ مصافحہ کر!" چنانچہ بچے نے اپنے "کوچ" کی ہدایات پر ایک سرے سے مصافحہ کرنا شروع کیا اور پھر آخری سرے تک مصافحہ کرتا چلا گیا۔ اور بالآخر واپس آ کر کھڑا ہو گیا بزرگ نے ایک بار پھر اس کی سرزنش کی اور کہا! "تم اس کونے کے لوگوں کو چھوڑ گئے ہو" اس نے کہا آگے میز ہے گزرنے کا راستہ نہیں ہے" اس پر بزرگ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "میز ہے کوئی دریا نہیں ہے۔ چل اٹھ مصافحہ کر"! چنانچہ وہ تعمیل ارشاد میں ٹھوکریں کھاتا، کسی کا پاؤں کچلتا، گرتا اور سنبھلتا ہوا باقی ماندہ مصافحے کر کے ایک بار پھر واپس اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بزرگ نے دریں اثناء اپنی آمد کا مدعا بیان کیا اور کام سے فراغت کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے مڑے تو بچہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ اچانک بزرگ کی نظر اس پر پڑی تو اسے ایک بار پھر ڈانٹا اور کہا "اس طرح واپس جاتے ہیں۔ چل واپس مصافحہ کر!"

اب آپ خود ہی بتائیں کہ جس بچے کی تربیت میں اتنی جزئیات کا خیال رکھا گیا ہو۔ وہ بھی دفتر جانے

کے بے وقت پر گھر سے نکلے گا۔ اور رستے میں راہگیروں سے مصافحہ کرتے کرتے دفتر پہنچے گا تو لیٹ ہوگا افسر کی جھاڑیں سُنے گا۔ اور آخری جھاڑ کے بعد اس سے مصافحہ کر کے واپس اپنے کمرے میں آجائے گا، مگر اپنے اس معاشرتی فریضے سے کبھی منہ نہیں موڑے گا۔ فریدہ حفیظ بتاتی ہیں کہ بچپن میں جب کبھی ریڈیو سے بابا فرید کا کلام "اُٹھ فریدا سُتیا" نشر ہوتا تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتیں مصافحے والا معاملہ بھی یہی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر اچھی چیز ہے۔ مگر وہ جو کسی نے کہا ہے نا کہ

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

تو اس نے بھی صحیح کہا ہے۔ اب دیکھ لیں کچھ عرب ملکوں سے روس مصافحہ کرتا ہے اور کچھ عرب ملکوں سے امریکہ مصافحہ کرتا چلا آرہا ہے مگر نہ کسی کے کام روس آور نہ کسی کے کام امریکہ کا مصافحہ آیا جب کہ ایک مصافحہ وہ ہے جو روس اور امریکہ خلوت میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں اور سچ پوچھیں تو بس یہی ایک پُرخلوص اور اصلی مصافحہ ہے، باقی ہیر پھیر ہے!

حقِ دوستی

"یار تم نے اپنا گھر بہت خوبصورت بنایا ہے!"

"بھئی تم جانتے ہو، اس پر میری کتنی دولت اور کتنا وقت صرف ہوا ہے!"

"اس کا نقشہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟"

"حاصل کیا تھا؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ یہ نقشہ ایک بین الاقوامی شہرت کے ماہر تعمیرات سے بنوایا تھا۔ دس لاکھ روپے تو صرف اس کی فیس ادا کی تھی!"

"دس لاکھ روپے صرف نقشے کی فیس کے طور پر ادا کئے تھے؟"

"ہاں اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے، تم جانتے ہو اس مکان کی تعمیر پر کتنی لاگت آئی ہے؟"

"کتنی لاگت آئی ہے؟"

"چلو چھوڑو، تم سن کر بے ہوش ہو جاؤ گے بس اتنا جان لو کہ اس میں جو کچھ تمہیں نظر آرہا ہے وہ سب کا سب امپورٹڈ شف ہے!"

"کیا تم اس گھر میں خوش ہو؟"

"کیا مطلب؟ خوش کیا بہت خوش ہوں!"

"پر تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم نے یہ گھر رزقِ حلال سے نہیں بنایا!"

"ہاں جانتا ہوں۔ مگر پھر؟"

"کیا تمہارا ضمیر تمہیں ملامت نہیں کرتا"؟

"ضمیر؟ ضمیر انسان کو گناہوں سے روکتا نہیں! بس ان گناہوں کا مزا کرکرا کرتا ہے سو کبھی کبھی میرا مزا بھی کرکرا ہو جاتا [illegible]

"اگر تم کبھی اینٹی کرپشن والوں کی نظروں میں آ گئے؟"
"تو کیا ہوگا؟"
"پکڑے جاؤ گے اور کیا ہوگا؟"
"تم بھی بہت بھولے آدمی ہو۔ کوئی اور بات کرو!"
"کیا تم نے کبھی سوچا کہ اتنے کرو فر سے رہنے کے باوجود معاشرہ تمہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا؟"
"کون سا معاشرہ؟"
"ارے بھئی وہی معاشرہ جس میں تم رہتے ہو۔ جس میں تمہارے عزیز و اقربا، تمہارے محلے دار اور تمہارے دوست احباب بھی شامل ہیں؟"
"یہ سب لوگ تو مجھے دیکھ کر سجدے میں چلے جاتے ہیں۔"
"یہ سب کچھ اوپر اوپر سے ہے، اندر سے وہ لوگ تمہیں پسند نہیں کرتے۔"
"اندر کی بات جب تک اندر ہی رہے اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچتا ہے؟"
"اچھا چلو ضمیر کو بھی چھوڑو، اینٹی کرپشن والوں کو بھی چھوڑو، معاشرے کو بھی چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ مذہب پہ ایمان رکھتے ہو؟"
"ہاں ہر مہینے باقاعدگی سے گیارہویں شریف کا ختم پڑھاتا ہوں۔"
"لیکن اگر تمہارے رزق میں حرام کی ملاوٹ ہے، تو یہ نذر و نیاز تمہارے کسی کام نہیں آئے گی!"
"یار کیوں مجھے ڈراتے ہو؟"
"نہیں اس میں ڈرانے والی کوئی بات نہیں، میں امرواقعہ بیان کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو حرام مال سے اپنے لیے گھر بناتے ہیں اور دنیا کی آسائشیں خریدتے ہیں!"
"یار تم کیوں مجھے خوف زدہ کرنے پر تل گئے ہو؟"
"میں تمہیں خوف زدہ نہیں کر رہا۔ صرف بطور دوست اپنا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ قبر جو پہلے ہی تنگ ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے اور زیادہ تنگ ہو جائے گی!"
"اور . . . اور کیا ہوگا؟"
"اور یہ کہ دوزخ کے فرشتے ایسے بدبختوں کو جلتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیں گے اور جب ان کے جسم جل کر راکھ ہو جائیں گے تو انھیں نیا جسم عطا کیا جائے گا اور اس کے بعد دوبارہ الاؤ میں ڈال دیا جائے گا اور یہ عمل کروڑوں سال تک جاری رہے گا۔"
"کیا تم یہ سچ کہہ رہے ہو؟"
"میں نے اس معاملے میں جھوٹ بول کر خود جہنم کی آگ میں جلنا ہے؟ تم اب عمر کے آخری حصے میں ہو طرح طرح کے عوارض میں گرفتار ہو کسی بھی وقت سانس تمہارا ساتھ چھوڑ سکتی ہے کیوں چند برسوں کی آسائش کیلئے خود کو کروڑوں سال کے عذاب میں ڈالتے ہو، قارون کتنا امیر آدمی تھا؟ لیکن جب وہ مرا تو اس کا مال و دولت اس کے کام نہیں آیا اس وقت وہ بیٹا دوزخ کی آگ میں جل رہا ہوگا۔"

تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ تم میرے محسن ہو۔ مجھ سے اب اس گھر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بیٹھا جا رہا، تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"

"خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری باتوں کو دھیان سے سنا اور ان کا اثر بھی قبول کیا۔ اب تم اس عذاب سے اسی صورت میں نکل سکتے ہو کہ اپنے رزق حلال میں سے ایک چھوٹی سی کٹیا خرید کر یا کرائے پر لے کر اس میں رہو۔ یقین جانو تمہیں اس کٹیا میں زیادہ سکون ملے گا۔"

"اور موجودہ گھر کو کیا کروں؟"

"یہ تم میرے نام کر دو، میں تمہاری خاطر سارے عذاب سہہ لوں گا آخر حق دوستی تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے!
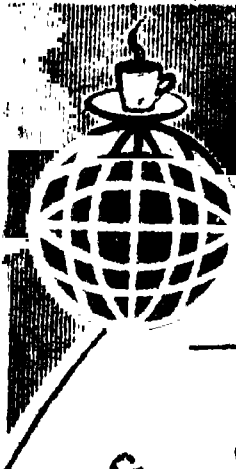
(جرم ظریفی سے)
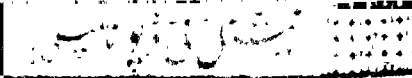
انتظار حسین — لاہور نامہ

مزاح نگار اب صرف حیدرآباد میں پیدا ہوتے ہیں!

ابھی پچھلے دنوں کراچی میں جو ایک طنز و مزاح کانفرنس ہوئی ہے اس کی خوشبو ہمیں لاہور میں اس طرح پہنچی کر ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان کانفرنس سے نکل کر سیدھے لاہور پہنچے۔ یہ اپنے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین تھے تعجب سے کہنے لگے کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کے مزاح نگار تو بہت نظر آرہے تھے مگر پاکستان کے مزاح نگار دکھائی نہیں دیئے۔

ہم اس پر کچھ گزارش کرنے لگے تھے کہ ایک دوست نے اس محفل میں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیا اور کہنے لگا "حضرت آپ نے کالم میں لکھا ہے کہ پاکستان میں رونما ہونے والے حادثوں کی وجہ سے کون کونسی تقریب ملتوی ہوئی اور ہوتی چلی جارہی ہے کراچی کے ایک شاعر کا بھی ذکر کیا کہ جب وہ اپنے مجموعہ کلام کی افتتاحی تقریب کی تاریخ طے کرتا ہے تو مہاجر اور پٹھان آپس میں لڑنا شروع کردیتے ہیں مگر دیکھئے طنز و مزاح کانفرنس کو تو شہر کی کوئی آفت اور ملک کا کوئی سانحہ منعقد ہونے سے نہیں روک سکا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی واقعہ آدمی کو کوئی کام کرنے سے نہیں روک سکتا۔ بس ہمت شرط ہے"۔

یہ بات سنتے ہوئے ہمیں شیخ سعدی کا وہ مشہور شعر یاد آگیا۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق ؛ کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس شعر میں جو سچائی بیان کی گئی ہے اس کا مظاہرہ ہم پچھلے سالوں میں کراچی میں دیکھ چکے ہیں۔ سہراب گوٹھ کے سانحہ کے آس پاس کے دنوں میں مت پوچھئے کہ کتنی تقریبیں ملتوی ہوئیں۔ انھیں تاریخوں میں ایک ادبی تقریب میں ہمیں بھی اس شہر میں جانا تھا۔ ادھر سے ہمیں تار آگیا کہ شہر کے حالات ناساز گار ہیں اس لیے تقریب ملتوی ہوگئی ہے۔ ہمیں یہ التواء بہت جائز نظر آیا۔

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل ؛ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

ایسے پرآشوب وقت میں ادب اور عشق کا کسے ہوش رہتا ہے۔ شعر و ادب عشق و عاشقی ایسے سب معاملات موقوف

ٹھہرتے ہیں۔

مگر اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ آفت اگر طول کھینچ جائے تو پھر ردِ عمل اُلٹ ہو جاتا ہے مصیبت زدہ یار سوچتے ہیں کہ آؤ غم غلط کریں اور عشق کریں ٹھیک سوچتے ہیں کہ غم روزگار کا اگر کوئی توڑ ہے تو غم عشق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کراچی والے قحط زدہ دمشق والے ردِ عمل سے اب آگے نکل گئے ہیں۔ کتنے دنوں تک اس شہر میں یار و بار معطل رہے۔ سب کاروبار معہ کاروبارِ عشق کے۔ دردمندوں نے گریہ بھی بہت کیا۔ اب وہ فراموشیِ عشق اور گریہ دونوں منزلوں سے گزر گئے ہیں۔ رو دھو کر دیکھ لیا۔ اب ہنس کر بھی دیکھ لیں۔ بالکل ٹھیک ہے آدمی کچھ نہ کر سکے تو پھر اُسے ہنسنا چاہیئے۔ جانوں پر جو کچھ بھی گزرے ذہنی صحت تو سلامت رہنی چاہیئے۔ اور یہیں حفیظ جالندھری کا ایک مصرعہ بے ساختہ یاد آتا ہے۔ اب خوب ہنسے گا دیوانہ

ہاں لیجیے مجتبیٰ حسین کی یاد تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ ان کے تعجب کا ہم کیا جواب دیں۔ مجتبیٰ حسین کا حیدرآباد سے تعلق ہے اس کانفرنس میں وہ اکیلے نہیں آئے۔ وہاں سے اور مزاح نگاروں کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ جس بزرگ نے اس طنز و مزاح کانفرنس کا ڈول ڈالا تھا ان کا تعلق بھی حیدرآباد دکن ہی سے ہے۔ اور طنز و مزاح کانفرنس تو اصل میں حیدرآبادی کی ایجاد ہے۔ ابھی پچھلے برسوں میں ہم کچھ ایسے ہی موقع پر حیدرآباد جا نکلے تھے۔ اس کانفرنس کا رنگ دیکھا۔ یاروں کا رنگ ڈھنگ دیکھا اس کانفرنس کے زیرِ اہتمام ایک مشاعرہ ہوا۔ مزاحیہ شاعروں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی اور یہ سب شاعر حیدرآباد ہی کے تھے۔ اور ہم حیران کہ یا اللہ حیدرآباد میں کیا سب شاعر مزاحیہ شاعر ہی ہوتے ہیں۔

تو ہمارے حسن حیدرآبادی بزرگ نے یعنی کہ حمید الدین صاحب نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا انھوں نے بجا سوچا کہ پاکستان میں مزاحیہ شاعر بلکہ نظم و نثر دونوں میں لاکر مزاح نگار ہیں کتنے ڈھائی تین چنے ہیں کیا بھاڑ کو جھونکیں گے۔ چھڑ پڑ کر بجھے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ اس کے لیے جس ایندھن کی ضرورت ہے وہ تو حیدرآباد ہی سپلائی کر سکتا ہے۔ سو انھوں نے حیدرآباد سے ایندھن وافر مقدار میں مہیا کیا اور گرمیِ محفل کا بندوبست کر دیا مجتبیٰ حسین ہی کا بیان ہے کہ طنز و مزاح کانفرنس بہت کامیاب رہی بس ذرا پاکستانی مزاح نگاروں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک جن جلا کہنے لگا کہ وہ موجود ہوتے تو پھر نہیں طنز و مزاح کی کمی محسوس ہوتی۔

اس پہ ہم سوچ میں پڑ گئے۔ کیا فی زمانہ طنز و مزاح کے کیلئے حیدرآباد کی جاگیر ہے۔

مجتبیٰ حسین بھی تو اسی حیدرآباد سے منجھ کر نکلے ہیں اور کیا خوب نکلے ہیں حیدرآباد کو یہاں اہل دل رو دھو بیٹھے تھے۔ سوچتے تھے کہ اپنے زوال کے ساتھ وہ شہر ٹھنڈا ہو گیا مگر دیکھئے اسی خاکستر سے یہ چنگاری برآمد ہوئی ہے۔ بلکہ اس شہر میں ظرافت کی فصل پھولتے دیکھ کر اسے زعفران زار حیدرآباد کہنے کو جی چاہتا ہے اور زعفران زار حیدرآباد سے کیا شگوفہ پھوٹا ہے کہ رنگ مزاح میں اس وقت اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

مجتبیٰ حسین کے اعزاز میں شیزان میں جو ایک تقریب ہوئی وہ کسی کسی نام سے منعقد ہو یاروں نے اسے عطاء الحق قاسمی ہی کی طرف سے جانا۔ عطاء الحق قاسمی ہی کے وہ ان دنوں لاہور میں مہمان تھے۔ تقریب میں انھوں نے ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا کہ دنیا کے مزاح نگارو ایک ہو جاؤ۔

اس پر کسی نے مہمان اور میزبان کی سنگت کو دیکھا اور کہا کہ دنیا کے مزاح نگار دیکھ ہو جاؤ ــــــ ویسے مجتبیٰ حسین جاتے جاتے ایک عجب بات کہہ گئے ایک محفل میں تعجب سے بولے کہ پاکستان میں کالموں کو بھی مزاحیہ ادب میں شمار کیا جاتا ہے اور ہر مزاحیہ تحریر کو کالم سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کراچی کی طنز و مزاح کانفرنس میں اپنا مضمون پڑھا کسی ہفت روزہ کے ایڈیٹر میرے پاس آئے اور بولے اپنا کالم اشاعت کیلئے دے دیجئے میں نے تعجب سے انھیں دیکھا اور کہا کہ وہ مضمون کالم تو نہیں تھا بولے بھائی جو کچھ بھی ہے دے دیجئے ہم اسے کالم ہی کے ذیل میں شائع

پاکستان اور بھارت کے ادیب محبت کو عام کریں

دونوں ممالک کے مابین کتابوں کے تبادلوں پر عائد پابندیاں نرم کی جائیں

لاہور: ۶۔جون (ادبی رپورٹ) ادارہ پنجابی ادب و ثقافت لاہور کے زیر اہتمام آج ایک مقامی ہوٹل میں حیدرآباد بھارت سے آئے ہوئے دو ادیبوں مجتبیٰ حسین اور مصطفیٰ کمال کے اعزاز میں خصوصی تقریب منعقد ہوئی صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی۔ عطاء الحق قاسمی نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مجتبیٰ حسین برصغیر میں اور خاص طور پر بھارت میں کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کے اہم ترین ناموں میں شامل ہیں اور مصطفیٰ کمال حیدرآباد دکن سے گزشتہ ۲۰ برس کے دوران میں نکلنے والے جریدے "شگوفہ" کے مدیر اور منفرد لکھاری ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اس موقع پر اپنے سفرنامہ ازبکستان کے ایک کردار غفورا کے حوالے سے خوبصورت تحریر پیش کی۔ انھوں نے اس سے پہلے دونوں ممالک کے ادیبوں کے ایک دوسرے کے قریب آنے اور محبت کو عام کرنے پر زور دیا۔ مصطفیٰ کمال نے بتایا کہ لاہور میں آکر انہیں اپنائیت کا احساس ہوا ہے انھوں نے کہا کہ "شگوفہ" کے ذریعہ وہ مزاحیہ ادب کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس سلسلے میں انھیں ہر سطح پر تعاون حاصل ہوا ہے۔ ادارہ پنجابی ادب و ثقافت کے صدر ڈاکٹر محمد بشیر گورایا نے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایسی تقاریب کا انعقاد ادارہ پنجابی ادب و ثقافت کی بنیادی پالیسی کا حصہ ہے کیوں کہ اس سے قلم کاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ صدر تقریب احمد ندیم قاسمی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کتابوں کے تبادلے کے سلسلے میں عائد پابندیاں نرم کرے تاکہ سچائی پر مبنی ادب کا دائرہ اثر وسیع ہو سکے انھوں نے کہا کہ اردو ادب کے دور حاضر میں طنز نگار تو زیادہ ہیں لیکن مجتبیٰ حسین جیسے مزاح نگار کم ہیں۔ انھوں نے دونوں بھارتی ادیبوں کی پاکستان آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ایسے روابط سے ایک دوسرے کے ادب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تقریب میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر سلیم اختر حمید اختر، احمد حسن حامد، اشفاق احمد، شہزاد احمد، ظہیر کاشمیری، عبدالمتین حسن رضوی، اسلم کمال، اصغر ندیم سید، جاوید طفیل، یونس اصغر، ابن اسلام، امجد نذیر ناجی، اختر حسین جعفری، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، قائم نقوی۔ ڈاکٹر سعادت سعید، ذوالفقار احمد تابش، انتظار حسین، یونس جاوید، بیدار سرمدی، نیاز احمد، نجیب احمد، ڈاکٹر انجم نیازی، سید سرفراز احمد، انیس ناگی اور بہت سے دوسرے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔

(بشکریہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور۔ ۷ر جون ۸۸ء)

مسیح انجم
(حیدرآباد)

جلیل ڈھکّن

آج سے کوئی اٹھارہ اُنیس سال پہلے، میں رشید عبدالسمیع جلیل کو پہلی بار اے۔ جی۔ آفس کے ایک مشاعرے میں دیکھا تھا جس کی صدارت مخدوم صاحب فرمارہے تھے۔ شہر کا ایک سے ایک خرانٹ قسم کا شاعر اس مشاعرے میں موجود تھا۔ میں اپنی دانست میں سمیع کو ایک سامع سمجھ بیٹھا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے سے نہ تو وحشت برس رہی تھی اور نہ بدحواسی ہویدا تھی جو عموماً شاعروں کی ذات سے منسوب کی جاتی ہے۔ اس کا لباس نہایت ہی معقول قسم کا تھا جو اس کی شخصیت سے پوری طرح میل کھاتا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی جو دور سے تو قطعی نظر نہ آتی تھی۔ البتہ قریب سے دیکھنے پر کچھ کچھ دکھائی دیتی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ داڑھی نہیں، ایک موہوم سی اُمید تھی جو ٹھوڑی کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک پتلی سی منحنی لکیر بناتی چلی گئی تھی۔ اس قسم کی تراش و خراش اور وضع و قطع میں نائی کی ہنرمندی کو دخل تھا یا سمیع کی حکمت عملی کو، یہ راز صاحبِ داڑھی جانے، میں کیا جانوں! اُس مشاعرے میں رشید عبدالسمیع، المتخلص بہ جلیل مکاراج پیٹی نے کیا سُنایا تھا، کچھ یاد نہیں رہا۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جلیل نے اپنی غزل کے ایک شعر میں مقتل کو زبردست چیلنج کیا تھا اور مارنے مرنے کی دھمکی تھی۔ پتہ نہیں، جلیل نے وہ شعر ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کہا تھا یا صدرِ مشاعرہ کو خوش کرنے کے لئے۔ خواہ کچھ ہو، جلیل کے لہجے سے لینن کا پیغام صاف سنائی دے رہا تھا۔ چونکہ بات ترقی پسندی کی تھی اور صدارت مخدوم کی، اس لئے داد کا ملنا یقینی تھا۔ یوں بھی مخدوم نوجوانوں کا حوصلہ بڑھانے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا کرتے تھے۔ چنانچہ صدرِ مشاعرہ نے اُس شعر پر بے پناہ داد دی، جس کے جواب میں رسید کے طور پر جلیل نے ایک اناڑی اور اَن ٹرینڈ (untrained) دُلہا کی طرح دھڑا دھڑ دو چار اُلٹے سیدھے آداب بھی بجالائے۔ جلیل کا وہ غالباً پہلا مشاعرہ تھا۔

اَب، جب میں اٹھارہ، اُنیس سال پہلے کے جلیل کا آج کے جلیل سے تقابل کرتا ہوں تو اسے انتہائی حواس باختہ پاتا ہوں۔ چوالیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ اس عمر میں تو بعض زندہ دل عقدِ ثانی کی سوچتے ہیں۔ اور پرویز یداللہ مہدی جیسے تو کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ ویسے، کبھی کبھی جلیل بھی دبے دبے انداز میں اس کا اظہار کرتا ہے۔ دلیل کے طور پر ایک چھوٹا سا واقعہ پیش ہے۔ ایک بار اُس کے گھر والوں کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر ایک ترکاری...

اس کے تین سالہ چھوٹے لڑکے کو اٹھا لے گئی۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن جب کافی دیر تک بچہ نظر نہ آیا تو اُس کے گھر والوں نے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ بڑی جستجو کے بعد وہ موقع واردات پر پہنچ ہی گئے جہاں ایک عورت، ترکاری والی سے بچے کا سودا کر رہی تھی۔ کافی بحث و مباحث کے بعد جلیل کے گھر کے افراد اپنے بچے کو چھڑا لانے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے دن جب میں نے اُس واقعہ کے حوالے سے جلیل کو چھیڑا تو وہ ہنس کر بولا:
"کہاں ہے اُس عورت کا مکان جسے بچے کی ضرورت ہے؟ میں اُس سے ایک بار مل لینا چاہتا ہوں!"
ہاں تو میں جلیل کے حواس کی بات کر رہا تھا۔ اس کے حواس خمسہ میں کی ایک حس اب اُسے ہاتھ دینے لگی ہے۔ دور کی بصارت بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کب، کس عورت سے ہٹ جائے! البتہ بصیرت تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اس کو یہ جان لینا چاہیئے کہ زر پرستی، خود غرضی اور مفاد پرستی کے اس دور میں، وہ اپنی بصیرت کو لے کر کیا کرے گا جس کے کوئی دام ہی نہیں، جبکہ بصارت بیچنے پر منہ مانگے دام مل جاتے ہیں۔ اُس کا رنگ جلنے کی طرف مائل ہے۔ لیکن جیسے جیسے اُس کا رنگ جلتا رہا ہے، اُس کا فن جلا پا رہا ہے اور شاعری نکھرتی جا رہی ہے چنانچہ اس کی ایسی ہی مدقوق حالت کو دیکھ کر کچھ عرصہ پہلے میرے ایک ستم ظریف خالہ زاد بھائی نے جلیل کے غیاب میں یہ ریمارک پاس کیا تھا "ارے یہ کیسا شاعر ہے بھئی، بالکل ڈُگل معلوم ہوتا ہے!" —— "ڈُگل" ایک بول چال کا لفظ ہے جو صرف دیہات میں بولا جاتا ہے۔ آپ نے سیندھی کا درخت تو دیکھا ہی ہوگا۔ اور آپ کو یہ بات بھی معلوم ہی ہوگی کہ اس درخت سے سیندھی نکالی جاتی ہے۔ سیندھی کے درخت سے بوند بوند سیندھی حاصل کرنے کے لئے تاسندہ (یعنی کلال) اس درخت کو تاستا چلا جاتا ہے۔ تاسنے کے اس عمل کے دوران کبھی کبھار ایک ایسی منزل بھی آجاتی ہے جبکہ سیندھی کا درخت تاسے ہوئے حصے کی دوسری جانب کچھ اس طرح جھک جاتا ہے جیسے حروف تہجی میں "م" (میم)۔ درخت کے اس منزل پر پہنچنے کے بعد جو سیندھی حاصل ہوتی ہے اُس میں وہ POWER اور FORCE نہیں ہوتا جس کے لئے سیندھی مشہور ہے۔ ایسی منزل کو پہنچائے گئے سیندھی کے درخت کو "ڈُگل" کہتے ہیں۔ اب آپ اس وضاحت کی روشنی میں جلیل کے طنزیہ و مزاحیہ شعری مجموعے "نمی دانم" میں کے "م" (میم) کو دیکھئے اور استادہ حالت میں رشید عبدالسمیع جلیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے، تو پتہ چلے گا کہ دیوان اور صاحب دیوان میں کتنی مماثلت ہے۔ سیندھی کے درخت کو کلال اپنے ذاتی مفاد کے لئے تاستا اور زخم پہنچاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جلیل کو زمانہ بھی ایک کلال کے روپ میں مسلسل تاستا اور خون چوستا جا رہا ہے۔ کبھی بیورو کریسی کے روپ میں تو کبھی دفتر کے باس کے روپ میں۔ کبھی گرانی بن کر تو کبھی قرض خواہ بن کر۔ لیکن اس کے باوجود جلیل کی اعلیٰ ظرفی کا یہ عالم کہ وہ بوند بوند خون دیتا ہوا بھی جی رہا ہے، مسکرا رہا ہے، سگریٹ پی رہا ہے، کھانس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے، شعر موزوں کر رہا ہے۔

مختصر یہ کہ جلیل زندگی کے زہر کو "زہر خند" میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ بھلے ہی "ڈُگل" سہی، لیکن اس کی شاعری "ڈُگل" نہیں ہے، اور اس کا شعری مجموعہ "نمی دانم" طنز و مزاح کا ایک حسین امتزاج ہے۔

صحت کے معاملے میں وہ انتہائی لاپرواہ واقع ہوا ہے۔ سگریٹ اس کثرت سے پیتا ہے کہ اُس کی انگلیاں تک پیلی پڑگئی ہیں۔ پھیپھڑوں کی حالت اللہ ہی جانے۔ ویسے، سگریٹ میں بھی پیتا ہوں۔ طالب خوندمیری بھی پیتے ہیں، بلکہ دوستوں کو آفر بھی کرتے ہیں۔ سگریٹ تو ڈاکٹر مصطفیٰ کمال بھی پیتے ہیں، اور وہ بھی فارن برانڈ۔ صبح ایک تو شام ایک، اُن کی سگریٹ نوشی تو محض ایک تفریح ہے۔ اُن کا اصل مقصد تو اپنے چند بے تکلف دوستوں جیسے مضطر مجاز، غیاث متین اور بطورِ خاص راقم الحروف کو سگریٹ دکھا دکھا کر ترسانا اور تڑپانا ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک جلیل کی سگریٹ نوشی کا تعلق ہے، وہ اس معاملے میں Maximum Benefit کا قائل ہے۔ اور قائل بھی اس حد تک کہ ایش ٹرے کے استعمال کی بہت ہی کم نوبت آتی ہے۔ سالم سگریٹ پی جاتا ہے۔ سگریٹ پیتا جاتا ہے اور کھانستا بھی جاتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں سگریٹ نہ ہو تو اس کی انگلیاں بُلبل ترنگ بجانے کے انداز میں حرکت کرتی رہتی ہیں۔ میں بھلا کون ہوتا ہوں جو اس کے کھانسنے اور خیالی بُلبل ترنگ بجانے پر اعتراض کروں۔ البتہ مجھے اُس وقت بڑا عجیب سا لگتا ہے جب وہ نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے تو اس کی ابتدا ر کھانسی سے ہوتی ہے۔ وہ اُس کی دعا نہیں بلکہ "کھانسی نامہ" ہوتی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم اس کو اُس پوزیشن میں دیکھ لے تو شائد یہ گمان کر بیٹھے کہ مسلمانوں کے یہاں دعا کے ساتھ ساتھ کھانسنا بھی لازمی ہے۔ مجھے اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ اس خاکے میں سگریٹ اور دھواں بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ سگریٹ اور چائے کے ذکر کے بغیر جلیل کا خاکہ مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔ اگر میں یہ کہوں تو شائد غلط نہ ہوگا کہ جلیل صرف چائے اور سگریٹ پر زندہ ہے۔ اگر میرے عزیز دوست طالب خوندمیری اپنی کسی پینٹنگ میں چائے کی پیالی، سگریٹ اور دھویں کو پینٹ کرکے مجھ سے عنوان تجویز کرنے کے لئے کہہ دیں تو میں بلا جھجک یہی کہوں گا کہ یہ تو رشید عبدالسمیع جلیل ہے۔ جلیل اگر سگریٹ نوشی ترک کردے تو اس کے آدھے سے زیادہ مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ اور صحت خود بخود ٹھیک ہوجائے گی۔ لیکن اُس کے ذہن میں یہ بات بُری طرح بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اگر سگریٹ نوشی ترک کردے گا تو اس کی تخلیقی صلاحیت سلب کرلی جائے گی۔

جلیل بڑا لیٹ لطیف ہے۔ اُس سے وقت کی پابندی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اُس وقت آفس پہنچتا ہے جبکہ لنچ کے لئے ایک آدھ گھنٹہ باقی رہتا ہے۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں اس کا کوئی بھی افسر اسے راہِ راست پر نہ لاسکا، بلکہ وہ خود راہِ راست پر آگئے۔ جلیل ایک ایسا کلرک ہے جو "دیر آید درست آید" کے مقولے کو منوا کر رہا وہ اُن کلرکوں میں شامل نہیں جو دفتر کو تو وقت پر آتے ہیں مگر کام کو جوں کا توں پینڈنگ رکھتے ہیں۔ کاش کہ جلیل وقت کی پابندی کے بل بوتے پر کام کو پینڈنگ رکھنے کا ہُنر جانتا!

اُس کی شام رات کے بارہ بجے سے شروع ہوتی ہے۔ وہ کبھی عجلت سے سرِ شام اپنے گھر پہنچ جاتا ہے تو اس کی بیوی اور بچے پریشان ہوکر اس کی مزاج پُرسی میں لگ جاتے ہیں۔ دن چڑھے تک سوتے رہنا اس کی عادت ہے۔ چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہوجائے وہ دس بجے سے پہلے اٹھنا جانتا ہی نہیں۔ لیکن اس [illegible] "تیرے خیال سے غافل

آئیں تھا رہا" کے مصداق فجر کی نماز ضرور پڑھ لیتا ہے، چاہے قضا ہی کیوں نہ ہو! البتہ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس وقت کون سی نماز کی نیت باندھتا ہے۔

وہ میرا دوست تو ہے ہی، لیکن اب پڑوسی بھی بن گیا ہے۔ جب سے وہ میرا پڑوسی بنا ہے میں اس کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس کوشش میں، اس کی جانب کھنچتا جا رہا ہوں۔ جلیل ایک انتہائی شریف النفس مخلص، خوش گفتار اور ظریف الطبع انسان کا نام ہے۔ میں نے کہیں ایک ماہر نفسیات کا یہ قول پڑھا تھا کہ جو شخص جینیس (Genius) ہوتا ہے اس کی ذات میں بلا کی لاأبالی اور بے اعتدالی رچی بسی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں اس قول میں کس حد تک صداقت ہے۔ بہرحال، اس قول میں صداقت ہو یا نہ ہو مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جلیل ڈکل بلاشبہ جینیس (Genius) ہے۔

رشید عبدالسمیع جلیل سنجیدہ شاعری بھی کرتا ہے اور مزاحیہ شاعری بھی۔ اس کی سنجیدہ شاعری کا ایک مجموعہ "نصاب دل" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ لیکن وہ سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں صرف ایک ہی تخلص "جلیل" سے کام چلا لیتا ہے۔ ایسی کفایت شعاری بھی کس کام کی؟ میرا یہ خیال ہے کہ اُس کو دو تخلصوں سے کام لینا چاہیے، سنجیدہ شاعری میں "جلیل" اور مزاحیہ شاعری میں "ڈکل"۔ اس طرح "جلیل ڈکل" کی مناسبت سے اس کے فن شعر گوئی کو سمجھنے میں نقادوں کو بہت زیادہ مدد ملے گی۔

--

نوٹ :- یہ مضمون ممتاز شاعر رشید عبدالسمیع جلیل کے طنزیہ و شعری مجموعہ "نمی دانم" کی رسم اجراء کے موقع پر پڑھا گیا

طالب خوندمیری

نمی داند

ممتاز شاعر سمیع جلیل
کے مزاحیہ مجموعۂ کلام
کی رسمِ اجرا کے موقع پہ
پڑھی گئی

گُم صُم ہے جلیل اپنا، گفتار نمی داند
مُنہ میں تو زبان دارد، اظہار نمی داند

ترسیل کے موسم میں، ابہام سے ڈرتا ہے
خود اپنے ہی شعروں کا معیار نمی داند

ہر شعر بقولِ خود، لوکل بہ ولادت ہے
خم خانۂ شیراز و تاتار نمی داند

جب بھی وہ گزرتا ہے، گلیوں سے حسینوں کی
کیوں پاؤں پٹکتا ہے رفتار نمی داند

دیکھے جو حسینوں کو، آنکھ اُس کی نمی جُنبد
لگتا ہے وہ آدابِ دیدار نمی داند

شادی کی گھڑی ہی سے بیگم کو شکایت ہے
وہ شاعرِ آوارہ گھر بار نمی داند

ق

کہتی ہے پڑوسن سے رو رو کے یہی اکثر
وہ مجھ کو نمی پُرسد، کیا پیار نمی داند

ایسا بھی تو ہوتا ہے اکثر وہ کئی دن تک
دروازہ نمی بیند، دیوار نمی داند

گھر اپنے پہنچتا ہے، وہ رات گئے، لیکن
طوفان کی آمد کے آثار نمی داند

شعروں کے وسیلے سے خود اپنی بڑائی کا
اقرار نمی کرد است، انکار نمی داند

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

نمی دانم کا شاعر

بہت اُچھلے ہے کودے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے
برہنہ وار تھرکے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

رشیدم اپنے بچوں میں، شمیم اپنے یاروں میں
جلیلم شعر ڈھالے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

"شگوفہ" کی ادارت سے ارادت کا یہ ثمرہ ہے
زبانِ خلق بولے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

"نعابِ دل" بھی لکھتا ہے "نمی دانم" بھی کہتا ہے
ہمیں دھوکے میں ڈالے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

کبھی موپیڈ پر گھومے ہے، کبھی سیکل گھمائے ہے
کبھی پیدل ہی ٹاپے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

کہیں مصری نما نظمیں، کہیں بادام سی غزلیں
کہیں فقرے اُچھالے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

کبھی سگریٹ کو یہ پھونکے، کبھی سگریٹ اسے پھونکے
نکوٹن بن کے بکھرے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

کبھی زلفوں میں اُلجھے ہے، کبھی آنکھوں میں ڈوبے ہے
کبھی سانسوں میں جھلسے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

ردیفوں سے کبھی کھیلے، قوافی سے کبھی کھیلے
کبھی لفظوں سے کھیلے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

غزل ہو یا رباعی ہو، قصیدہ یا مرقع ہو
سبھی پر ہاتھ پھیرے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

بڑی مشکل سے یہ بولے، اگر بولے تو کم بولے
زباں تالو پہ رکھے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

جنوں پڑھنے کا اتنا ہے کہ سب کچھ پھونک کر اپنا
کتابیں چاٹ ڈالے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

بزورِ فارسی دانی لگا کے "ام" کا دُم چھلہ
نئی فرہنگ لکھے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

طریقت سے لگاؤ ہے، شریعت کا رچاؤ ہے
وظیفے خوب گھوٹے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

اسے فلموں سے رغبت ہے، نمازوں کی بھی عادت ہے
یہ دو جھولوں میں جھولے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

بہت مشہور طائر کی طرح یہ رات بھر جاگے
کبھی دن میں بھی جاگے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

مزاح و طنز کی راہوں میں پھکڑپن بھی آتا ہے
مگر یہ بچ کے نکلے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

اُگا ہے سبزۂ اسود جو اُس کے دونوں گالوں پر
اسے یہ حد میں رکھے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

یہ شاعر خود کو بدصورت سمجھتا ہے، بجا، لیکن
حسیں صورت پہ پھڑکے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

نجانے کتنے سورج پی لئے ہیں اس کے چہرے نے
کہ چہرہ خود ہی بولے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

ہے خطِ استوائی رنگ اس کا، ہاشمی لیکن
زباں برفیلی بولے ہے، نمی دانم کا شاعر ہے

ابراہیم یوسف
(بھوپال)

ناشتہ بقدرِ یک مصرع

حالی کو بیٹھے بٹھلائے جانے کیا سوجھی کہ غالب کو "حیوان ظریف" کہہ دیا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ غالب حیوان ظریف نہیں بلکہ "حیوان ستم ظریف" ہیں۔ ان کی یہ ستم ظریفی مرنے کے بعد بھی موجود ہے اور وہ پیرِ تسمہ پا کی طرح آج تک ہر اُردو داں کی گردن پر سوار ہیں۔ ابھی دو چار دن ہی کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست بے حد گھبرائے ہوئے پریشان حال ہمارے پاس آئے۔ صورت سے کچھ ایسی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی جیسے ابھی ابھی یتیم ہوئے ہوں۔ پہلے تو ہم نے انھیں اُوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں دیکھا کہ سڑک پر کسی حادثہ کے باعث ٹوٹ پھوٹ تو نہیں گئے ہیں' کہ یوں بوکھلائے ہوئے ہیں مگر ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اطمینان ہوا۔ پتہ چلا کہ پریشانی کا باعث ٹوٹ پھوٹ نہیں بلکہ عزیز محترم کا اپنی محترمہ سے جھگڑا ہوگیا ہے اور جھگڑے کی وجہ۔ "حیوان ستم ظریف"۔ ہوا یوں کہ عزیز محترم کی محترمہ سے کسی بات پر یوں ہی معمولی سی تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی تھی۔ محترمہ کا پلڑا کچھ بھاری پڑ رہا تھا۔ عزیز محترم جب زِچ ہوگئے تو منہ سے نکل گیا۔ "اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"۔ بس اس پر محترمہ کا پارہ اور چڑھ گیا' فرمانے لگیں۔ "بس ہمیشہ غالب کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ غالب کی شاعری نہ ہوئی سو بیماریوں کا ایک علاج ہوگئی اور وہ بھی دو مصرعوں سے نہیں ایک مصرع سے"۔ پھر غرّا کر بولیں۔ "پہلا مصرع بھی سناؤ"۔ یہ جملہ کچھ اس قدر غیر متوقع تھا کہ عزیز محترم کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور گھگھی بندھ گئی مگر رعب شوہریت قائم رکھتے ہوئے فرمایا۔ "نہیں سناتے کوئی زبردستی ہے"۔ مگر محترمہ بھی ایک کائیاں تھیں' فوراً بات کی تہہ کو پہنچ گئیں اور لال پیلی ہوکر فرمانے لگیں۔ "کیسے نہیں سناتے۔ سنانا پڑے گا اور اگر نہیں سناتے تو آج کھانا بھی بقدرِ یک مصرع پکے گا' یا تو تم ہی کھا لینا یا میں کھا لوں گی"۔

یہ الٹی میٹم کچھ اس قدر خوفناک تھا کہ عزیز محترم کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دماغ پر لاکھ زور دیا مگر پہلا مصرع۔ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے"۔ دماغ سے غیر حاضر رہا۔ جب ہم نے انھیں بے بسی کی تصویر بنے دیکھا تو اظہارِ ہمدردی بلکہ اظہارِ قابلیت کرتے ہوئے کہا۔ "اماں معمولی سی بات ہے۔ دیوانِ غالب میں دیکھ لیا ہوتا۔ کیا تمہارے پاس دیوانِ غالب بھی نہیں ہے"۔

"ارے بھئی ہے کیوں نہیں خدا جھوٹ نہ بلوائے ایک چھوڑ سات سات نسخے ہیں مگر جس الماری میں سجائے گئے ہیں، اس کی چابی محترمہ کی تحویل میں ہے۔"

"ان سے مانگ لی ہوتی مسئلہ حل ہو جاتا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ گویا ہم اپنی شکست قبول کر لیتے۔"

"اور یوں دُم دبا کر گھر سے بھاگ آنا شکست قبول کرنا نہیں ہے۔"

"دُم دبا کر بھاگ آنا کیا معنی؟ ہم انتہائی پتا سے بہ ادائے غیض و غضب گھر سے نکلے ہیں کہ ہم ایسے گھر میں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتے جہاں بقدر یک مصرع کھانا پکتا ہو اور پہلا مصرع سنانے کے لئے تڑیا ہٹ ہو۔"

"مگر اب ... "

"مگر اب کیا۔ راستہ میں کالج کے تین پروفیسروں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے اکیس[21] شاعروں کے ذریعہ گم شدہ مصرع تلاش کرنے کی کوشش کی مگر سب ہی کر کے خاموش ہو گئے۔ لاحول ولا قوۃ — ہاں تو گم شدہ مصرع کیا ہے۔"

ہم نے گھبرا کر کہا۔ "ذرا آہستہ ذرا آہستہ۔ کہیں ہماری شیریں نہ سن لے۔ ہم نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہے۔" پھر آہستہ سے کہا۔ "گم شدہ مصرع تو ہمیں بھی یاد نہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ گویا تم بھی ہماری طرح ...."

اسی وقت ہماری بیگم ناشتہ کی ٹرے لئے داخل ہوئیں۔ ہم نے اور ہمارے عزیز محترم نے کچھ پریشانی اور کچھ معنی خیز نظروں سے انھیں دیکھا مگر وہ یا تو ناشتہ کی خوشبو سے مست ہو رہی تھیں یا کچھ خوشگوار موڈ میں تھیں کہ انھوں نے اس طرف دھیان نہیں دیا اور تنقید و تبصرہ کیا مگر پھر بھی اتنا ضرور کہا کہ "آپ دونوں یہ آہستہ آہستہ کیا کھُسر پھُسر کر رہے ہیں اور ہاں یہ تین پروفیسروں اور اکیس شاعروں کی کیا بات ہو رہی تھی۔" ہم نے اور عزیز محترم نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا مگر ہماری نظر بازی کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت شگفتہ انداز میں فرمانے لگیں۔ "میں آپ لوگوں کے مشاغل میں دخل انداز ہونا نہیں چاہتی، آپ اکیس کے بجائے اکیاون شاعروں کو بلائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اچھے اچھے کھانے والے آجاتے ہیں۔ مگر ایک بات کہے دیتی ہوں کہ خاطر و مدارت مجھ سے نہ ہو سکے گی، آپ کو جو کچھ انتظام کرنا ہے ہوٹل سے کیجئے گا۔ اب اسی دن کی بات لیجئے، ایک شاعر صاحب سات پیالے آئس کریم چٹ کر گئے اور فرمانے لگے گلا بیٹھ گیا۔ آئس کریم جمانے میں کچھ خامی رہ گئی تھی۔ کیا نام تھا ان کا، صورت سے کچھ اول جلول نظر آ رہے تھے۔"

ہم نے عرض کیا کہ اس وقت عرض کرنے میں عافیت تھی۔ "جانے آپ کس اول جلول کی بات کر رہی ہیں، شاعر تو سب ہی اول جلول نظر آتے ہیں۔"

"خیر ہوں گے کوئی۔ دوسرے صاحب کو شامی کباب پسند نہیں آئے اور تیسرے صاحب کے خیال میں مرغ گلا ہوا نہیں تھا، میں تو باز آئی ایسے سوں کی خاطر مدارات کرنے سے۔ کھاتے جاتے ہیں اور غراتے جاتے ہیں۔"

عزیز محترم نے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ بھی تو بلاوجہ غیر ضروری اہتمام کرتی ہیں ——

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر" مگر گھبرا کر اس طرح منہ پر ہاتھ رکھا جیسے حالت نزع کی آخری سانس کو ہاتھ سے روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک ہُپ کی آواز کے ساتھ سانس واپس پیٹ میں لوٹ گئی۔ اب ہماری نصف اول کے کان کھڑے ہوئے کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ پہلے تو انھوں نے عزیز محترم کو اور پھر ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور زبانِ فصاحت بیان سے کچھ فرمانے ہی والی تھیں کہ ہم نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے کھڑے ہو کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے صاحب۔ ایک دعوت آپ پر واجب ہوگئی"۔

لیکن ہماری نصف اول کا شک ابھی دور نہیں ہوا تھا، فرمانے لگیں۔ "کیسی دعوت؟"

ہم نے ہنستے ہوئے کہا: "ایک مصرع پڑھنے پر۔ ہم نے طے کیا ہے کہ اب جو غالب کا صرف ایک مصرع پڑھے گا اسے دعوت کا اہتمام کرنا پڑے گا۔"

ہماری نصف اول نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ جو شرارت کے وقت ان کے ہونٹوں پر رقصاں ہوتی ہے فرمایا: "یہ معاہدہ بڑے کام کا ہے، اب کم از کم ہر روز ایک دعوت تو کھانے کو ملے گی"۔ پھر ہماری طرف دیکھ کر سوال کیا۔ "یہ آپ کہاں جانے کے لئے پر تول رہے ہیں"؟

"ذرا دیوانِ غالب ......"

بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "پہلا مصرع ہے۔ "گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر"۔ اتنی سی بات کے لئے غالب کے دیوان کی چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔

"نہیں اس مصرع کے لئے نہیں بلکہ ......" عزیز محترم نے کچھ ایسی خونی نظروں سے ہمیں گھورا کہ ہم ہکلا کر رہ گئے۔

ہماری نصف اول نے ناشتہ کی ٹرے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں دیوانِ غالب لائے دیتی ہوں۔ آپ بیٹھیے"۔

"مگر حضور یہ ناشتہ ——"

"اب آپ دونوں تو ناشتہ دیوانِ غالب کا کریں گے اور یہ پڑا پڑا ٹھنڈا ہوتا رہے گا۔"

"مگر پہلے ہم ——"

بات کاٹ کر فرمایا: "جی نہیں ممکن نہیں ہے۔ جو نہار منہ دیوانِ غالب دیکھتا ہے اسے ناشتہ اور لنچ کے وقت کا احساس نہیں رہتا"۔

اس سے قبل کہ ہم اس فیصلہ پر احتجاج یا اس بے مروتی کا گلا کریں وہ ناشتہ کے ساتھ کمرے سے غروب ہو چکی تھیں اور ہم بے بسی کی تصویر بنے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہے تھے کہ وہ مالک رام صاحب کا مرتب کیا دیوانِ غالب ہاتھ میں لئے طلوع ہوئیں اور ہماری طرف بڑھاتے ہوئے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔

"وہ مصرع صفحہ نمبر ۲۳۳ پر ہے"

ہم نے حیرت سے پوچھا "آپ کس مصرع کے بارے میں فرما رہی ہیں"

مسکرا کر فرمایا "وہی۔ غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط" فوراً ہی عزیز محترم کی محترمہ نے اسی دروازے سے برآمد ہوتے ہوئے دوسرا مصرع داغا "اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"۔ پھر بے حد خوش دلی سے قہقہہ لگا کر فرمایا۔

"مجھے معلوم تھا کہ آپ کی آخری پناہ گاہ یہی ہے۔ پیش بندی کے طور پر میں آپ سے پہلے یہاں وارد ہو گئی تھی"

عزیز محترم اس نئے حملہ کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ پہلے تو کچھ سٹپٹائے پھر فوراً ہی خود پر قابو پاکر فرمایا "جی ہاں مرگ ناگہاں سے کسی جگہ مفر نہیں۔"

مسکرا کر فرمانے لگیں "مفر ہو یا نہ ہو یہ الگ سوال ہے لیکن اس وقت مجبوری یہ ہے کہ ناشتہ بقدر دو مصرع ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرع کے لئے کوئی گنجائش نہیں"

اور پھر دونوں مصرعے کھانے کی میز کی زینت بن گئے۔ ہمارے اور عزیز محترم کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ لنچ کے انتظار میں دیوان غالب کا نہار منہ ناشتہ کرنے لگیں۔
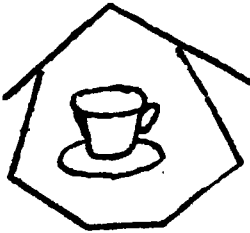
--

سید رحیم الدین توفیق
حیدرآباد

قانون گزیدہ

حکومت تو کچھ دن سے یہ افواہ گرم تھی کہ اسکوٹر رانوں کے لئے ہیلمٹ کا لزوم ہونے والا ہے لیکن ایک دن صبح صبح اخبار ہاتھ میں آیا تو پتہ چلا کہ یہ افواہ واقعی قانون بن چکی ہے اور اسکوٹر رانوں کے سر پر ایک بوجھ بن کر گری ہے ۔ حکم تھا کہ تمام اسکوٹر ران اپنے سر کی سلامتی چاہتے ہوں تو ہیلمٹ کا لازمی استعمال کریں ۔ اس کے لئے انھیں ایک مہینے کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ تنخواہ ملنے پر نئی ہیلمٹ خرید لیں ۔

کچھ لوگوں نے یہ بات پھیلائی کہ کسی منسٹر کے سالے نے ہیلمٹ بنانے کی فیکٹری کھول لی ہے اور اسی کے بزنس کی ترقی کے لئے یہ سب جتن کئے جا رہے ہیں ۔ لیکن اگر یہ سچ ہوتا تو حکومت موپیڈ سواروں کو بھی نہیں بخشتی اور پچھلی سیٹ کی سواریاں بھی ہیلمٹ کی "زد" میں آجاتیں ۔ اس طرح مال کی نکاسی دوگنی ہو جاتی ۔ اگر پچھلی سیٹ کی سواریوں کے لئے بھی ہیلمٹ لازمی ہو جائے تو آپ ذرا ان حضرات کا تصور کیجئے جو سڑک پر انگوٹھا دکھا دکھا کر لفٹ مانگتے ہیں ۔ اس وقت یہ حضرات سڑک پر ہاتھ میں ہیلمٹ لئے ناچتے نظر آئیں گے ۔ اسطرح انھیں انگوٹھا دکھا کر لفٹ پلیز ، لفٹ پلیز کہنے سے نجات مل جائیگی ۔ ہاتھ میں کاسۂ گدائی یعنی ہیلمٹ دیکھ کر ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ بیچارہ لفٹ کا طلب گار ہے ۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے ، اس بار بھی لوگوں نے اس کان سے سنا اور اس کان سے اڑا دیا ۔ لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ حکومت اس بار واقعی سنجیدہ ہے اور انھیں ٹوپی پہنانے پر تلی ہوئی ہے ۔ شروع شروع میں تو اسکوٹر رانوں نے اس قانون کی سخت مخالفت کی اور خوش قسمتی سے انھیں صحافت کی ہمدردی بھی حاصل ہو گئی ۔ بعض اخبارات نے تو اس کی مخالفت میں اداریئے بھی لکھے ۔ لوگ طرح طرح کے بہانے بنانے لگے ۔ کوئی کہتا ہیلمٹ کے استعمال سے اس کے سر میں درد ہوتا ہے ، کسی نے کہا اس کی نظر خراب ہو گئی ہے ، کسی نے کہا کہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا کہ بیوی پیچھے بیٹھ کر کیا ہدایت دے رہی ہے ۔ کئی بار وہ بسوں اور لاریوں کی زد میں آتے آتے رہ گیا ، کیونکہ اسے ہارن ہی سنائی نہیں دیتا ۔ ایک صاحب نے بیان کیا کہ انھیں ہیلمٹ کی گرمی سے چکر آگئے

اور وہ اسکوٹر سے گر کر بے ہوش ہوگئے۔ لوگوں نے دماغی ماہرین سے بھی بیانات دلوائے کہ ہیلمٹ کے استعمال سے پاگل ہونے کے پچاس فیصد امکانات ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیس پچاس فیصد دی گئی تھی۔ اگر سو فیصد دی جاتی تو امکانات بھی سو فی صد ہو جاتے۔ لوگ جیبوں میں میڈیکل سرٹیفکیٹس لے کر پھرنے لگے۔ شروع شروع میں تو حکومت نے بھی طرح دی لیکن ہر اسکوٹر راں کے پاس سے ڈرائیونگ لائسنس اور رجسٹریشن کاغذات کے ساتھ میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی نکلنے لگے تو حکومت کی بدگمانی بڑھ گئی۔ پتہ چلا کہ یہ تو دس دس روپیہ میں ملنے والے سرٹیفکیٹ ہیں جس سے ڈاکٹروں کی چاندی ہو رہی ہے۔ اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سختی سے چالانات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حکومت نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ کے سر میں درد ہوتا ہے یا چکر آتے ہیں یا متلی ہوتی ہے تو اسکوٹر چلایا ہی مت کیجئے لیکن ہیلمٹ سے چھٹکارہ تو نہیں ملے گا۔ برہنہ سر والے اسکوٹر رانوں کو پولیس گھیرا ڈال کر پکڑنے لگی اور یہ اسکوٹر سوار اس گھیرے میں پولیس سے کبڈی کھیلتے اور محاصرہ توڑ کر فرار ہونے کی کوشش کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بیچارے اپنے ہاتھ پیر توڑ لیتے۔ ایسے حادثات کی رپورٹنگ کچھ یوں ہوتی "پولیس کے چالانات سے عوام میں دہشت۔ پولیس ظلم سے معصوم بچے اور خواتین بھی غیر محفوظ۔ شوہروں کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھنے والی خواتین اور معصوم بچے بھی بھاگ دوڑ میں زخمی" لیکن اس میں پولیس کا کیا قصور، بیوی بچے ہیلمٹ کے لزوم سے مستثنیٰ ہونے کا لائسنس تو نہیں۔ کسی ہیلمٹ پوش اسکوٹر راں کا حادثہ ہوتا تو دوسرے دن اخبار میں خبر ایسے دردناک انداز سے دی جاتی کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے آنسو ٹپک جائیں۔ مثلاً "ایک ریٹائرڈ انجینئر اپنی اہلیہ کے ساتھ اسکوٹر پر جا رہے تھے کہ پیچھے سے لاری نے انھیں ٹکر دے دی، میاں بیوی دونوں موقعۂ واردات پر ہلاک ہوگئے۔ انجینئر صاحب ہیلمٹ پہنے ہوئے تھے" اب یہ ہیلمٹ نہ ہوئی گویا ذرہ بکتر ہو گیا جو سالم انجینئر کو بچا لیتا۔ ایک دوسرا واقعہ بھی اخبار میں چھپا جو ٹریجڈی اور کامیڈی کا بہترین امتزاج ہے۔ "ایک صاحب بیوی کے ہاتھ میں ہیلمٹ تھما کر بڑے مزے میں اسکوٹر پر ہوا کھاتے جا رہے تھے کہ اچانک سامنے ملک الموت یعنی ٹریفک کانسٹبل نظر آگیا۔ میاں اسے لبیک کہنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انھوں نے بیوی سے کہا جلدی سے ہیلمٹ پہنا دو، بیوی گھبرا گئیں، گویا انھوں نے ہیلمٹ پہنانے نہیں بلکہ حلق میں آب زم زم ٹپکانے کے لئے کہا تھا۔ گھبراہٹ میں انہوں نے ہیلمٹ یوں پہنا دی کہ میاں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ ایک بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئے۔" ایسی خبریں پڑھ پڑھ کر لوگ کہاں چپ رہنے والے تھے، انھیں ایک مشغلہ ہاتھ آگیا اور اخباروں اور محفلوں میں چشم دید واقعات بیان کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک صاحب نے قسم کھا کر اپنا چشم دید واقعہ سنایا کہ ایک اسکوٹر راں سڑک پر اچانک سر کے بل گرے۔ لوگوں نے انھیں اٹھایا۔ انھوں نے اپنے کپڑے جھاڑے، اسکوٹر سیدھی کی اور ہمدردوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے جب ہیلمٹ اتاری تو ان کی کھوپڑی بھیجہ سمیت ہیلمٹ کے ساتھ اتر آئی، اپنا بھیجہ دیکھتے ہی وہ صاحب وہیں گر کر ختم ہوگئے۔ لیکن ایک دوسرے راوی نے یوں بیان کیا کہ وہ گرے نہیں بلکہ خالی خالی نظروں سے بیوی کو گھورنے لگے چونکہ بھیجہ ان کے ہاتھ میں تھا اس لئے وہ سوچ نہیں سکتے تھے۔ بیوی کی نظر جب ان کے چہرے سے اوپر اٹھی تو

ایک چیخ نکل گئی اور وہ انہیں لے کر سیدھا ڈاکٹر کے پاس بھاگیں، راوی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خود اسکوٹر چلا کر گئے یا انہیں ایمبولینس میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے ان کی کھوپڑی پر دوا لگا کر ہیلمٹ پہنا دی اور اسے کس کر باندھ دیا چار دن بعد جب ہیلمٹ اتاری گئی تو کھوپڑی اپنی جگہ فٹ تھی اور ہیلمٹ صاف اس طرح اتر آئی تھی جیسے اُبلے ہوئے انڈے سے چھلکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر آپ کے ستارے اچھے نہیں تو ہیلمٹ بھی آپ کی کھوپڑی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ لیکن راوی کا کہنا ہے کہ اگر ہیلمٹ نہ ہوتی تو ٹوٹی ہوئی کھوپڑی اور بھیجہ کے بکھرے ہوئے ریزوں کو کس طرح یکجا کیا جاتا۔ ہیلمٹ نے کھوپڑی کو اس قابل رکھا کہ ڈاکٹر پھر اسے ان کے سر پر جما سکے۔ پولیس کی چوکسی اور مسلسل چالانات کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ اب ہیلمٹ کے بُری طرح عادی ہو گئے ہیں۔ گھر میں بھی ہیلمٹ اُتارتے وقت وہ دائیں بائیں دیکھ لیتے ہیں کہ کہیں کوئی ٹریفک کانسٹبل نگرانی تو نہیں کر رہا ہے۔ پہلے اکّے دُکّے سر پر ہیلمٹ نظر آتی تھی۔ آج کل اکّا دُکّا سر بغیر ہیلمٹ نظر آتا ہے۔ سختی سے قانون کی پابندی کی وجہ سے حکومت کی آمدنی کو زبردست دھکا لگا۔ اب حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا چنانچہ مرتی ہوئی لاقانونیت کو تازہ دم کرنے کے لئے اسے آکسیجن دی جا رہی ہے یعنی اب پولیس اسکوٹر راکبوں کو بغیر ہیلمٹ چلانے کا ایک موقع دے کر انہیں پھر غفلت میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی بغیر ہیلمٹ نظر آئے تو پولیس اسے گھیرنے کے بجائے پلٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہو رہا ہے۔ عوام کافی ہوشیار ہو گئے ہیں۔ اب وہ اس پرانے اور فرسودہ جال میں پھنسنے والے نہیں ہیں۔

یہ تو تھی ہیلمٹ کی المناک داستان، اب سنیئے کچھ ریکھاؤں کے بارے میں۔ آج کل ٹریفک کو باقاعدہ بنانے کے لئے سڑکوں پر پیلی اور سفید لکیریں کھینچی گئی ہیں اور مختلف گاڑیوں کے لئے الگ الگ Tracks بنا دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمارا قومی اتحاد اتنا مضبوط ہے کہ کوئی بھی اس طرح اپنے اپنے راستہ پر چلنے تیار نہیں، سب آپس میں مل جل کر ایک ہی راستہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ آٹو رکشہ موٹروں کے ساتھ دوڑتے ہیں اور سائیکل والے اسکوٹر اور موٹروں دونوں کے ساتھ دوڑنا چاہتے ہیں۔ ان لائنوں کے پابند رہ کر آپ اپنی منزلِ مقصود پر کبھی بھی وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔ لوگ قدم قدم پر آپ کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے بلکہ بھگتا بھی ہے کہ دو حضرات لونا پر سوار بازو بازو باتیں کرتے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے ہیں، دوسری سواریاں بیچاری اس انتظار میں ان کا پیچھا کر رہی ہیں کہ کب وہ موقع دیں اور یہ آگے بڑھیں۔ انہیں اوور ٹیک کرنا بھی مشکل ہے کیونکہ جوں ہی آپ نے یہ لکشمن ریکھا پار کی، راون کا ہاتھ آپ کی اسکوٹر کے ہینڈل پر پڑا، یا وہ آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ آپ کو لنکا نہیں لے جائے گا بلکہ آپ کا معاملہ وہیں نپٹا کر چھوڑ دے گا۔ اس پابندی کی وجہ سے لوگ ریکھاؤں سے اور اس سے زیادہ ان کے رنگ سے الرجک ہو گئے ہیں۔ اکثر یرقان میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہیں ہر طرف ایک ہی رنگ نظر آتا ہے اور وہ ہے پیلا رنگ۔ اب تک گٹر کے پانی یا نل کے پانی میں ملاوٹ کی وجہ سے یرقان پھیل رہا تھا لیکن اب یہ دوسری وجہ پیدا ہو گئی ہے، پہلی سے تو چھٹکارہ ممکن ہے لیکن دوسری سے نہیں۔ اس لئے صبر کیجئے کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰابِرِین

محمد کوثر اعظم مظفر بھاگا

کہانی سبزی باغ کی!

[ارشندگانِ سبزی باغ (پٹنہ) سے معذرت کے ساتھ]

ویسے تو آپ نے بہت سے محلّہ نما باغات دیکھے ہوں گے، جیسے لال باغ، نشاط باغ، گلوار باغ، خوشنما باغ اور دلکش باغ وغیرہ لیکن میں جو سبز باغ آپ کو دکھانے جا رہا ہوں، معاف کیجئے گا سبز باغ نہیں دراصل وہ ہے "سبزی باغ" وہ بہار کی راجدھانی پٹنہ کا ایک مشہور محلّہ اور بازار بھی ہے جسے آپ قلب شہر بھی کہتے ہیں۔

آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ہر نام کے ساتھ ایک المیہ ہوتا ہے مثلاً کسی کا نام ہو بہادر سنگھ تو وہ حضرت عملی زندگی میں ڈرپوک واقع ہوں گے اسی طرح کسی بدشکل کا نام آپ نے شکیل ضرور سنا ہوگا۔ ٹھیک یہی روایت سبزی باغ کے ساتھ بھی ہے یعنی سبزی باغ میں سبزی کی دکانیں آپ کو شاید ہی ایک دو ملیں گی بقیہ مختلف چیزوں کی دکانیں ہیں آیئے میں آپ کو شہر کی مخصوص سڑک اشوک راج پتھ کی جانب سے سبزی باغ لیے چلتا ہوں جیسے ہی آپ کا گذر سبزی باغ کی مشہور سڑک سے ہوگا آپ کو بے شمار پھلوں کی دکانیں نظر آئیں گی۔ جن میں تازہ اور سوکھے میرا مطلب ہے DRY FRUIT دونوں ہی شامل ہوں گے۔ پھلوں کے دکاندار بالکل آنکھ بند کئے ہوئے آپ کو صدا لگاتے دکھائی دیں گے۔ اور آپ کے گریبان پر کبھی کبھی اس وقت آ پڑتی ہے جب آپ کسی پھل فروش سے مول جول کر بیٹھیں۔ گریبان کو اگر وہ بخش بھی دیں تو شاید آپ پر چند فقرے چسپاں کرنا تو ہرگز نہ بھولیں گے مثلاً "جیب میں پیسے نہیں ہیں اور چلے آتے ہیں پھل کھانے" یا پھر انداز بیان کچھ اس طرح کا ہوگا "ارے آپ پھل کیا کھائیں گے؟ پہلے مونگ پھلی جا کر کھائیے" وغیرہ وغیرہ بالکل وہی زبان جو دلّی ٹرانسپورٹ (D.T.C) کے ملازمین کی ہوتی ہے یا پھر چاندنی چوک کے دکانداروں کی۔ ایک بار اتفاق سے بہار یونیورسٹی (مظفرپور) سے ایم۔ اے (اردو) کے کچھ طالب علم اپنے تعلیمی سفر پر دلّی پہنچے۔ طالب علموں کے اس گروپ میں راقم الحروف بھی شامل تھا ہم لوگوں میں سے کسی ایک نے دکاندار سے ٹی شرٹ کی قیمت دریافت کی۔ دکاندار اس طرح مخاطب ہوا "ہاں یار ہم ۳۰ روپیے دے دو" اس طالب علم نے بھی اس کی نقل کرتے ہوئے کہا "ہاں یار، ہم بہت ہیں ۲۵ لے لو" ۲۵ روپے کی بات سنتے ہی دکاندار نے کرخت لہجے میں کہا "اچھا یار اپنی لاشیں ڈھوتے پھرو" لہٰذا اس طرح ہم لوگ خراماں خراماں وہاں سے آگے چلتے بنے۔ دکاندار کے اس طرز گفتگو سے ہم لوگ اندر ہی اندر

پڑھے تو مزید لیکن اب یہ احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی خوشی بھی کہ کچھ جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی زبان کا خیال رکھتے ہیں لیکن اس کے برعکس اپنے اساتذہ جو اُردو کی روٹی پر پلتے ہیں اور جن کی شخصیت سماج میں اردو زبان و ادب کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہے ان کے زبان و بیان میں آپ کو بے شمار غلطیاں ملیں گی۔

آپ حضرات بھی کہیں مجھ سے بدگمان نہ ہو جائیں کہ چلے تھے سبزی باغ دکھانے لیکن بجائے اس کے سبزی باغ دکھانے لگے خیر معذرت کے ساتھ میں پھر سبزی باغ آپ کو واپس لیے چلتا ہوں۔ پھلوں کی دکانوں سے کچھ آگے آپ بڑھیں گے اندر گلی میں رحمانیہ ہوٹل اور کچھ اردو کتابوں کی دکانیں نظر آئیں گی واضح کر دوں کہ یہ وہی رحمانیہ ہوٹل ہے جس میں کچھ دنوں پہلے شہر کے نامور شعراء اور ادباء بیٹھ کر گپیں مارتے تھے اور ایک کپ چائے کے بہانے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے جمع ہو جایا کرتے تھے لیکن اتفاق سے آج کل ایسی بیٹھکیں نہیں ہوا کرتی ہیں اسے آپ ہوٹل کی خوش قسمتی سمجھیں یا محرومی لیکن رضا نقوی واہی کا یہ شعر ضرور سن لیں ؎

سلطان الاختر آپ جو غائب ہیں آج کل رحمانیہ نشینوں کی شام و سحر ہے ڈل

اگر آپ بھی زیادہ بور ہو رہے ہوں تو ایک کپ چائے پی کر اپنے موڈ کو ریفریش کر لیں اور اس طرح آپ جیسے ہی رحمانیہ ہوٹل سے تر و تازہ ہو کر باہر نکلیں گے آپ کی نظریں ادبی اور غیر ادبی کتابوں سے دو چار ہوں گی واضح رہے کہ قارئین حضرات کئی طرح کے ہوتے ہیں بعض دکھاوے کے لیے کوئی خالص ادبی اور معیاری پرچہ یا کتاب دکاندار سے طلب کرتے ہیں اور خاص کر ایسے وقت جب ان کے ہمراہ دو چار افراد ہوں تاکہ دیگر حضرات پر دل ہی دل میں قاری موصوف کے علمی معیار کا سکہ بیٹھ سکے گھر میں خواہ وہ بازاری کتاب ہی کیوں نہ پڑھتے ہوں اور اگر اتفاق سے تنہا ہوئے تو کوئی غیر ادبی پرچہ یا کتاب خریدتے نظر آئیں گے اس کے برعکس دوسری صف میں ایسے حضرات ہوتے ہیں جو واقعی خالص ادبی ذوق رکھتے ہیں لیکن ان کی ادبیت کو اس وقت ٹھیس پہنچتی ہے جب وہ اپنی من پسند کتاب یا رسالے کے گرد و پوش کو اُلٹ کر قیمت دیکھنا چاہتے ہیں جس کی جگہ پر انکو خوبصورت سا لیبل نظر آتا ہے اور اس پر لکھا ہوتا ہے "REVISED PRICE" ٹھیک اسی وقت ان کے ذہن کے ریکارڈ پر یہ گانا بج رہا ہوتا ہے۔

یہ دنیا گول ہے اوپر سے خول ہے نیچے سے دیکھو پیارے بالکل پولم پول ہے

اگر آپ سچے ادب پرست ٹھہرے تب تو گھر دی گرد کر کے بھی اپنے ذوق کو سیراب کریں گے ورنہ خراماں خراماں آگے بڑھتے نظر آئیں گے تقریباً دس قدم آگے کی جانب بڑھتے ہی آپ کے استقبال کے لیے موٹے موٹے تندرست پہلوان قسم کے دو چار میزبان آپ کو نظر آئیں گے پہلی نظر میں آپ یہ سمجھیں گے کہ یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں یہ پہلوان نما میزبان مخصوص صدا لگائیں گے "بیٹھے صاحب سیٹ خالی ہے، مچھلی پراٹھا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ ممکن ہے اس خوشگوار فضاء کو دیکھ کر آپ کی بھوک بھی بڑھ جائے اور ایسی صورت میں یقیناً آپ اس کی تکمیل کیلئے ہوٹل کا رخ کریں گے اور جیسے ہی آپ اپنی پیٹ سے شکم سیر ہو کر اٹھیں گے آپ کے گال پر پندرہ روپے کا زبردست طمانچہ رسید کیا جائے گا جس کی دھمک آپ کی جیب تک پہنچے گی اور اس طرح آپ سبزی باغ سے جلدی رخصت ہونا چاہیں گے دس پندرہ قدم لوٹتے ہی آپ کو دو علم راستے نظر آئیں گے ایک راستہ تو دریا پور کو

ہوتا ہے اور دوسرا سبزی باغ کہلاتا ہے خدانخواستہ اگر آپ رات سے تشریف لے جاتے تو آپ کو شب گزاری
اور آرام کی ضرورت پیش آئے گی لہٰذا ان دونوں راستوں پر مختلف لوجنگ ہیں گے جنھیں میں نے چمن میں لوجنگ
(LODGING) سمجھا تھا جسمیں میری کم عقلی اور اردو رسم الخط کی خامی دونوں کو دخل ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ
رہا تھا کہ آپ شب گزاری کے واسطے کسی لوجنگ میں تشریف لے جائیں گے یہاں کا انتظام بھی دیدنی ہوتا
ہے ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کسی صوفی کی خانقاہ میں تشریف فرما ہیں۔ چوکی نہیں تو چارپائی کی جگہ تھی پایا ہوگا
اور جو تے میں اینٹ لگی ہوگی جس پر آپ کو آرام فرماتے ہوئے بالکل بے حس و حرکت پڑا رہنا ہوگا ورنہ اجاڑ
کے لیے تیار رہنا ہوگا اگر اتفاق سے چوکی ٹھیک نکلی تو تکیے میں روئی بس اس قدر ہوگی کہ چوکی کی سطح اور تکیے کی
سطح میں ع من تو شدم تو من شدی . . . . . .
والا معاملہ نظر آئے گا۔ روشنی کا انتظام اگر ٹھیک رہا تو پنکھا اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے گا۔ مختصر یہ کہ
ایک نہ ایک قابلِ ذکر بات ضرور نظر آئے گی۔ اگر آپ قناعت پسند ٹھہرے اور تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بھی
آ گئی تو ٹیکس ہر حال میں آپ کو ادا کرنا ہی ہوگا۔ یہاں جناب آپ کو جانی اور مالی دونوں طرح کا ٹیکس یکے بعد
دیگرے ادا کرنے پڑیں گے۔ واضح رہے کہ جانی ٹیکس کی بھی دو قسم ہوتی ہے ایک اعلانیہ دوئم خاموش۔ اعلانیہ
جانی ٹیکس جس کے تحت نمبر دو کے چچا حضرت مچھر آپ کے خون کے پیاسے ہوں گے اور دوئم خاموش جانی
ٹیکس جس کے تحت کھٹملوں کے قافلے جوق در جوق آپ سے مستفیض ہوتے رہیں گے اس طرح آپ کسی طرح بچ
بچا کر رات لٹا کر صبح صادق کا انتظار کرتے نظر آئیں گے اور پو پھٹتے ہی یہ کہاوت دل ہی دل میں یاد کرتے ہوئے
بھاگ کھڑے ہوں گے۔

"جان بچی سو لاکھوں پائے"

جاتے جاتے میں آپ کو درونِ خانہ کی سیر بھی کراتا چلوں۔ اتفاق سے یہاں بھی وہی سبز باغ آپ کو ملے گا۔ شام کے
وقت ذرا کسی کوٹھے کی چھت پر آپ بیٹھ جائیں یا پھر اکبر الہ آبادی کی طرح چھتوں کی طرف نگاہ کیے کہیں بھی
کھڑے رہیں ؎

بنگلوں کی چھتوں پر ہی کریں شاعر اب نگاہ + دورِ جدید میں کوئی شئے آسماں نہیں

آپ دیکھیں گے کہ تقریباً تمام چھتوں پر صنفِ نازک اور صنفِ سخت ایک دوسرے کے بعد عاشقی کو آزمانے
کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ یہاں کچھ دیر تک غزل کی زبان میں گفتگو کے بعد دونوں فریقین غالب کا یہ شعر
گنگناتے ہوئے چھتوں سے نیچے اتر جاتے ہیں ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو + یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

حضرات میں یہ واضح کر دوں کہ یہ حال کسی ایک محلّہ یا شہر کا نہیں بلکہ اکثر ترقی یافتہ شہروں اور محلوں کی یہی حالت ہے
نئی نسل کے نوجوان عشق کو بھی فیشن میں شمار کرنے لگے ہیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ عشق لڑاتے
وہ اتنا ہی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ جب شادیاں EXPIRY DATE پر ہونے لگیں تو نوجوانوں نے "عشق کا
پیٹ گز کا مالیدہ کافی" والی کہاوت پر عمل کرنا شروع کر دیا دراصل اس میں قصور کچھ ان کا نہیں بلکہ قصور ہے ان
منافقوں اور حالات کا جس میں انھوں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ نوجوانوں کی بیروزگاری اور بڑھتا ہوا سن۔

[illegible] جیسی جھلک [illegible]
جاری ہے اور حسن کا لازمی نتیجہ سمجھے جاتے ہے۔

سرکاریں بدلتی رہیں، ٹوپیاں بدلتے رہے، جسم بدلتے رہے لیکن دماغ نہیں بدلا ؎
وہی حسن یوسف کی خریداری جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

لیجئے جناب بات تو چلی تھی سبزی باغ سے اور پہنچ گئی کہاں سے کہاں۔ اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

ے کے خط ....

—(مراسلے)—

محترم مصطفیٰ کمال صاحب

کئی مہینوں کے بعد آپ سے کراچی میں ملاقات ہوئی وہ بھی آدھی۔ (فون پر گفتگو کو بھی ملاقات کہہ سکتے ہیں) میرا پہلی ملاقات کے لئے میں بہادر آباد کلب پہنچا تھا وہ بھی رات بارہ بجے، پتہ چلا کہ آپ جا چکے ہیں۔ مصطفیٰ علی بیگ اور حمایت اللہ صاحب سے ملاقات سرسری ہوئی۔ بزار ہا لوگوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کراچی میں آپ لوگ بہت معروف رہے اور ہم کراچی والے تو معروف ہی رہتے ہیں، بس ملاقات نہ ہوئی۔ مجتبیٰ حسین نمبر نکالنے پر مبارکباد۔ سلور جوبلی منانے پر زندہ دلان کو مبارک طالب خوندمیری اور حبیب ضیاء کو کراچی میں سُنا، بہت اچھے لگے۔ حبیب ضیاء کی نثر میں ٹیلنٹ نظر آتا ہے۔

مصطفیٰ علی بیگ، حمایت اللہ صاحب بھی اچھے رہے۔ حمایت صاحب میں حیدرآبادی زبان کی چاشنی خوب نظر آتی ہے۔ یوسف ناظم مجتبیٰ حسین تو صفِ اوّل کے ادیب ہیں اور ہم نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ، فیاض فیضی کی نثر میں بھی جوہر کھلتے نظر آتے ہیں آپ حیدرآباد دکن سے کراچی آئے ہیں، حیدرآباد سندھ سے کراچی آپ سے ملنے آیا، پھر بھی ملاقات نہ ہوئی اور آپ کی میزبانی کا شرف تو کجا ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ انشاء اللہ آئندہ ملیں گے کہ ادیبوں کی ملاقات تو تحریروں سے ہوتی ہے۔ بہرکیف، جب سارے شہر میں شگوفہ، زندہ دلان حیدرآباد اور آپ سب لوگوں کا چرچا تھا تو میں بھی خوش تھا کہ اس قافلے میں اس تحریک میں اس رسالے کے چھپنے والوں میں نئی نسل کی نئی تحریروں میں کہیں میں بھی ہوں۔ تمام اہل قلم مضمون نگار کو میرا سلام۔

میر حسین علی امام

حیدرآباد (سندھ)۔ پاکستان

-☆- -☆- -☆-

— شگوفہ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ عابد معز کا مضمون بہت اچھا ہے۔ رؤف خوشتر، فیاض احمد فیضی، کلیم اللہ، میر حسین علی امام کے مضامین بھی اچھے ہیں۔ طالب خوندمیری کے قطعات اور سراج نرملی کے یہ اشعار بہت پسند آئے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ؎

مذہب، زبان، ذات، علاقہ کے نام پر
باشندے اپنے شہر کے خونخوار ہو گئے
بلوائیوں کے خوف سے جو بھاگ رہے تھے
ناحق سراج وہ بھی گرفتار ہو گئے

اسرار جامعی۔ پٹنہ

-☆- -☆- -☆-

— ایک ہی زمین میں دلاور فگار اور واہی صاحب کی نظمیں "شگوفہ" میں دیکھیں۔ دونوں ہی نظمیں کیا خوب ہیں۔ لیکن اصل سے زیادہ کامیاب نقل ہے۔ ویسے دونوں اُستاد ہیں۔ ان کی تعریف میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

نٹ کھٹ عظیم آبادی

-☆- -☆- -☆-

— آپ شگوفہ کے ذریعہ مجھ جیسے کتنے مایوس لوگوں کو خوشی و زندہ دلی کا مواد شگوفہ کے ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ شگوفہ ہر وقت شاداب رہے۔ اخباری خبروں سے آپکی پاکستان میں ہورہی مزاحیہ کانفرنس میں شرکت کی اطلاع بھی ملی۔ میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

امجد علی فیضی۔ مجھرکو

پھر ملیں گے اگر خدا لایا ——! (اداریہ)

کراچی میں پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس ۲۶ اور ۲۷ جون کو منعقد ہوئی۔ ہندوستان سے یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت، ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر رشید موسوی، حمایت اللہ، طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ، فیاض احمد فیضی کے علاوہ مدیر شگوفہ نے شرکت کی۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیر اہتمام اس نوعیت کی تقاریب کا بارہا انعقاد عمل میں آچکا ہے، لیکن پاکستان میں اب تک اس جانب کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ اس بار بھی یہ کام ایک حیدرآبادی نے سرانجام دیا۔ جس کے لئے محترم خواجہ حمید الدین شاہد اور ان کے رفقاء (جن کا تعلق حیدرآباد سے نہیں!) قابلِ مبارکباد ہیں۔ شہر کراچی فسادات کی لپیٹ سے پوری طرح سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اہلِ کراچی کو طنز و مزاح کانفرنس کی صورت میں اپنے زخموں پر مرہم رکھنے کی دعوت دی گئی۔ کراچی کے باشندوں نے لبیک کہتے ہوئے اپنی روایتی مہمان نوازی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ کانفرنس کے اجلاسوں میں سامعین کی کثیر تعداد شریک رہی اور داد و تحسین کے ذریعہ طنز و مزاح نگاروں کا حوصلہ بڑھایا گیا۔ برصغیر کے دو نامور مزاح نگاروں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے علاوہ ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کو بے حد پسند کیا گیا۔ نثری مضامین کو شعر کی طرح داد دی گئی اور جب کانفرنس کے اجلاس ختم ہوئے تو خیر مقدمی تقاریب کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ کراچی کی تمام اہم انجمنوں نے طنز و مزاح نگاروں کے لئے تہنیتی جلسے منعقد کئے اور انھیں بار بار سنا گیا۔ محترم مشفق خواجہ حسبِ عادت جلسوں میں کم شریک رہے لیکن مشفقانہ برتاؤ میں کسی سے کم نہ تھے۔ انھوں نے مندوبین کے لئے ایک پُرتکلف عشائیہ بھی ترتیب دیا جس میں تمام معززینِ شہر اور ادیب و شاعر شریک تھے۔ خود ان کے دولت خانہ پر وہ سب کچھ ہوتا رہا، جس کے بڑے پیمانہ پر مشاہدہ کے موصوف قائل نہیں —— حمایت اللہ، طالب خوندمیری اور مصطفیٰ علی بیگ نے نہ صرف شعر سنائے بلکہ مزاحیہ خاکے بھی پیش کئے۔ کراچی سے وقت نکال کر میں اور مجتبیٰ حسین لاہور پہنچے لاہور میں عطاء الحق قاسمی نے محبتوں کے حصار میں ایسے باندھ لیا، کہ قیام کے چار دن ایک خواب بن گئے۔ پاکستانی دوستوں کی ان عنایات اور محبتوں کا آئندہ شمارہ میں تفصیلی ذکر ہوگا۔ زیرِ نظر شمارہ بڑی عجلت میں پاکستان سے واپسی اور دوبئی کو روانگی کے درمیان شائع ہو رہا ہے۔ اس شمارہ میں خصوصی طور سے پاکستانی مزاح نگاروں کی تخلیقات بطور سوغات پیش ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہند و پاک کے مزاح نگاروں کا یہ ربط طنز و مزاح کے ادب ہی میں نہیں ہند و پاک کے تہذیبی و سماجی تعلقات میں فروغ کا باعث ہوگا اور شگوفہ اپنی آئندہ اشاعتوں میں اس ربط کے بہترین نتائج پیش کر سکے گا۔

شگوفہ کی مجلسِ ادارت کے رکن جناب منظور احمد امریکہ میں ڈیڑھ سال قیام کے بعد حیدرآباد لوٹ چکے ہیں۔ شگوفہ ان کا استقبال کرتا ہے کہ ان کی واپسی سے شگوفہ کو نئی تازگی حاصل ہوگی۔

——

ماہنامہ

زندہ دلانِ حیدرآباد
کا ترجمان

حیدرآباد

جلد ۲۱ ـــــ شمارہ ۷
جولائی ۱۹۸۸ء

ابت: محمود سلیم - محمد عبدالرؤف - مسعود انور
باعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدرآباد - ۲

بت فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے
ر سالانہ: ۵۰ روپے
رپہ ممالک سے: ایک سو پچاس روپے

خط و کتابت کا پتہ:
۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد
فون آفس: 557716 فون مکان: 521064

پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس
کراچی

مالِ مفت (انشائیے)

چھوٹ (منظومات)

فہرست : اس تھیلی کے چٹے بٹے

رضا نقوی واہی

تحقیقی مقالوں کی دوکان

آج کل ہماری بعض یونیورسٹیوں میں پی۔ایچ ڈی کے لئے مقالے ڈھالے اور دھڑلے سے فروخت کئے جارہے ہیں۔ ایسے نقلی ڈاکٹر نئی نسل کے طلبا کو جس معیار کا درس دیتے ہونگے وہ اظہر من الشمس ہے۔ایک جانب تو اُردو آبادی' اُردو کی گرتی ہوئی ساکھ پر دن رات واویلا مچا رہی ہے' اور دوسری جانب خود اُردو کے اساتذہ اپنی ذاتی منفعت کے لئے مقالے فروخت کرکے اُردو پڑھانے کے معیار کو پست سے پست کر رہے ہیں۔ دانشوروں اور اُردو کے بہی خواہوں کو اس مسئلہ پر سوچنا چاہیئے۔

پیش رفت اُردو اُدب کی تیز کرنے کے لئے
ملک میں دو نمبری دھندوں کی برکت دیکھ کر
جامعہ کے چند استادوں کو سُوجھی دُور کی
اس نجی انڈسٹری میں تھیسیس ڈھلنے لگیں
ایسے ایم۔اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کُھل گئی
اِن کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لئے
فیس استادوں نے رکھی فی مقالہ دس ہزار
دست کے پیسے ختم ہوجاتا ہے شاگردوں کا کام
اِکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسیس گئی
واہی واکے واسطے آیا جوں ہی اکزامینر
ہو کے ممنونِ کرم اس کو وہی کرنا پڑا
جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی
تیل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اُردو فارسی
اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دُہرا فائدہ
نسلِ نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر
کس نے تحقیقی مقالہ لکھا کس کے نام سے

خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لئے
اور چھوٹی جیبوں کی اپنی' قدر و قیمت دیکھ کر
منچلوں نے کھول ڈالی اک نئی انڈسٹری
اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں
اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی
خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لئے
جس سے سودا پٹ گیا' بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار
حضرتِ اُستاد کرتے ہیں بقیہ انتظام
پیروی جا جا کے خود گائڈ نے اسکے گھر پہ کی
ہوٹلوں میں اسکو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر
حضرتِ استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا
لیکچرس کی شاخ میں گویا کلی سی کِھل گئی
مِل ہی جائے گی کسی کالج میں اسکو نوکری
ایک کو اُجرت ملی اور ایک روزی سے لگا
کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پہ ڈالے ایک نظر
کون دِلّی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

جیب اُستادوں کی' اچھا ہے رفو ہوتی رہے
اور برج یا تو یونہی بے آبرو ہوتی رہے

اسمٰعیل ظریف

قطعات

غزل پوری کسی سے اتفاقاً لڑ ہی جاتی ہے
توارد اس کو کہتے ہیں یہ سرقہ ہو نہیں سکتا
اُڑاؤ غیر کے چربے ادب میں اب یہ جائز ہے
یہ وہ سرقہ ہے جس کا کوئی دعوا ہو نہیں سکتا

میں کیوں شاعر بنا کیسے بنا یہ پھر بتاؤں گا
بھری محفل میں کوئی راز یوں کھولا نہیں جاتا
پرانے پیپروں سے میں غزل تو مار سکتا ہوں
مگر مصرعہ کو ڈنڈی مار کر تولا نہیں جاتا

کہیں تو پانی نہیں ہے کہیں ہے طغیانی
نئی نئی ہے مصیبت اب آدمی کے لیے
اچانک ہوتا ہے بجلی کا جب کہ ڈبہ گل
اندھیرے رہتے ہیں بے تاب روشنی کے لیے

مت پوچھئے جو حال ہمارا ہے دوستو
بے موت اس گرانی نے مارا ہے دوستو
اپنی حجامت آپ بنانے کے باوجود
گھر کے بجٹ میں پھر بھی خسارا ہے دوستو

غزلیں

عالم تاجپوری

جو فور ٹوینٹی کا کلاکار نہیں ہے
سرکار میں رہنے کا وہ حقدار نہیں ہے
اس ڈسکو حکومت کے سبھی ڈسکو محافظ
منجدھار میں نیتا تو ہے پتوار نہیں ہے
جو فرقہ پرستی کو نوازے نہ بصد ناز
دراصل اور جنل وہی سرکار نہیں ہے
ممکن نہیں بن جائے شرافت سے منسٹر
اوباشوں کا جو آدمی سردار نہیں ہے
کیوں لوگ سمجھتے ہیں اُسے شاعرِ اعظم
گہوارۂ طفلی سے جو میخوار نہیں ہے
مصروف ہیں دھندے میں سبھی چور اُچکے
اس دور میں شیطان بھی بیکار نہیں ہے
اس دور میں وہ قابلِ تعظیم ہے یارو
جو اہلِ دل و صاحبِ کردار نہیں ہے

○

جو لوگ مقدر کے سکندر نہیں ہوتے
وہ تیل کی مالش سے منسٹر نہیں ہوتے
سُنتا ہوں کبھی چور منسٹر نہیں ہوتے
نیچر میں مگر چور سے کمتر نہیں ہوتے
مٹتی نہیں نمرود کی دیرینہ خدائی
کیا اب ترے سنسار میں مچھر نہیں ہوتے
سرکار انھیں کیوں نہیں کرتی ہے مقید
کیا شوخ نگاہوں میں بھی خنجر نہیں ہوتے
اسٹیج پہ کیوں آکے اُچھل کود کرے ہیں
بندر کی تو اولاد یہ شاعر نہیں ہوتے

یوسف ناظم

قیام نامۂ کراچی

یہ میرا سفرنامہ نہیں، قیام نامہ ہے کیونکہ پاکستان جانا کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے کہ اس کا سفرنامہ لکھا جائے۔ یوں بھی سفرنامہ ایسے ملکوں کا لکھا جاتا ہے جہاں جانے، پہچاننے والے عموماً اور ادیب وغیرہ خصوصاً کم جاتے ہوں تاکہ ان باتوں کی تردید ہوسکے جو ان سفرناموں میں عام طور پر لکھی جاتی ہیں۔ پاکستان تو ہمارا پڑوسی ملک ہے وہاں کے حالات لکھنے کے لیے سچ پوچھئے تو وہاں جانا بھی ضروری نہیں ہے اور جب سے پاکستان ایمبسی ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنا عارضی ویزا آفس قائم کرنے لگی ہے پاکستان کا سفر اور زیادہ آسان ہوگیا ہے ورنہ عارضی آفس کی روایت اور رعایت سے پہلے، ویزا حاصل کرنا کسی بڑے عارضے میں مبتلا ہونے سے کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا اور اس تکلیف سے دوچار ہونے میں اہلِ ذوق کو تکلف ہی ہوتا تھا۔

مہاراشٹرا اردو اکادمی کے فاضل نائب صدر ظ۔ انصاری صاحب نے جو میرے دیرینہ کرم فرما ہیں اور جن کا شمار اب ان وزراء میں ہوتا ہے جو مستعفی ہوچکے ہیں مجھ سے فرمائش کی کہ میں اپنے سفرِ پاکستان کے تاثرات تحریری طور پر پیش کروں تو میں نے اس لیے انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ ظ۔ صاحب دوسری بار فرمائش نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کا اس لیے بھی شوق ہوا کہ ہندو پاک کی ۴۰ سالہ ادبی وغیر ادبی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ظرافت کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ کسی ظریف نے خوب کہا ہے کہ ۴۰ سال کی مدت گزرنے پر بھی اگر کسی بھول کی تلافی ہوجائے تو اسے بھول نہیں کہتے۔ مئی ۱۹۸۸ء کی پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس کو میں صرف "تلافی" ہی نہیں، "تلافیٔ مافات" بھی سمجھتا ہوں۔ اپنی اپنی سمجھ ہے۔ دلِ لخت لخت کو دعوتِ مژگاں کی خاطر جمع کرنا بھی درست لیکن ان ٹکڑوں کو اپنی ہی پلکوں سے چُننا بھی چاہیئے۔ اس کانفرنس کا دعوت نامہ ملا تو غیب سے یہ مضمون خیال میں آیا کہ شاید ہم مدعوئین میں سے کسی نے کبھی صمیم قلب سے یہ شعر پڑھ ڈالا ہوگا۔

گُل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی　　اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

خواجہ حمید الدین شاہد، جو رہنے والے حیدرآباد کے ہیں اور فارغ التحصیل جامعہ عثمانیہ کے ہیں، ہمارے میزبان تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے شاگردِ رشید ہیں اور اتنے رشید ہیں کہ حیدرآباد کے "ایوانِ اردو" اور حیدرآباد کے ماہ نامہ "سب رس"، کو اپنے ساتھ لے گئے یہ ان کا مقدر تھا لیکن یہ دونوں چیزیں ان کی توجہ گرمہیں ان کے لیے نخمہ خواں ثابت ہوئیں۔ صبر کا پھل تو میٹھا ہوتا ہی ہے لیکن سعادت مندی کا پھل، رہروِ راہ خُلد کا توشہ۔ اور طوبیٰ و سدرہ

کا جگر گوشہ ہوتا ہے۔ خواجہ حمیدالدین شاہد کی وضع داری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ حیدرآباد کا سب رس مجھے نہیں ملتا لیکن کراچی سے شائع ہونے والا سب رس مجھے ہر ماہ مل جاتا ہے۔

اس طنز و مزاح کانفرنس کا نقشہ انھوں نے کیسے بنایا اور اہل کراچی کو جن میں آفتاب احمد خاں ماہر غالبیات بھی شامل ہیں کس طرح اپنا ہم خیال بنایا اس کی داستان میں نے اُن کی زبانی اس لیے نہیں سنی کہ مجھے معلوم ہے کہ کافی دردناک ہوگی۔ مئی کا مہینہ تو بڑا سخت مہینہ تھا اور ہمیں ہر گھڑی اس مضمون کے ٹیلی گرام کا انتظار تھا کہ کانفرنس ملتوی ہوگئی۔ کراچی میں کرفیو کا نفاذ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کے وہاں پہنچ جانے کی خبر جب گرم ہوئی تو دوسرے تیسرے دن ہی کرفیو برخاست کر دیا گیا۔ ظرافت کے اس تابناک پہلو کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں اور آپ سے اس کی داد بھی چاہتا ہوں۔ ویسے میں اس بات کا قائل اور مدعی ہوں کہ ظرافت کے راستے میں پتھر ہوں یا کہکشاں اہلِ دل کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہم لوگ جن میں حیدرآباد دکن سے مدیر شگوفہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، دکھنی زبان کے کہنہ مشق اور لغوی و معنوی اعتبار سے قد آور شاعر حمایت اللہ، اینگلو اردو شاعری کے ماہر مصطفیٰ علی بیگ طرزِ نو اور فکر تازہ کے مزاح گو طالب خوندمیری، خاتون مزاح نگاروں کی نمائندہ ڈاکٹر رشید موسوی اور ڈاکٹر حبیب ضیاء (یاد رہے کہ دونوں بے ضرر ڈاکٹر یعنی پی ایچ ڈی ہیں) دلی سے مجتبیٰ حسین اور بمبئی سے راقم السطور کے علاوہ فیاض احمد فیضی شامل تھے، بالاقساط کراچی پہنچے۔ قافلے کی شکل میں وہاں پہنچنا ہم نے مناسب نہیں سمجھا۔ حسنِ اتفاق سے شفیقہ فرحت بھی جنھیں دوشیزہ ڈائجسٹ کا ایک ایوارڈ حاصل کرنا تھا بھوپال سے وہاں پہنچیں، کانفرنس کی زینت بنیں اور بلا پس و پیش ہر محفل میں پیش پیش رہیں کیونکہ مزاح میں فرحت کے عنصر کا ہونا لوازمات میں سے ہے۔

کانفرنس دو اجلاسوں پر مشتمل تھی۔ مقالے اور مزاحیہ مضامین کی یکجائی بھی حیرت ہے سامعین کی یکسوئی میں خلل انداز نہیں ہوئی بلکہ ایک لحاظ سے فرحت بخش ثابت ہوئی۔ افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی بجا طور پر مجتبیٰ حسین تھے۔ صدارت کے فرائض آفتاب احمد خاں نے انجام دیئے اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر منظورالدین احمد صاحب نے افتتاح فرمایا۔ افتتاحی تقریر خاصی طویل تھی۔ سامعین کو جب یہ شبہ ہوا کہ یہ شاید اگلے اجلاس تک جاری رہے گی تو انھوں نے تالیاں بجائیں تاکہ تالیوں کے شور میں تقریر سُنائی نہ دے لیکن معزز مقرر جو ظرافت کی ماہیت پر اظہارِ خیال اور طنز و مزاح کے نازک فرق کی وضاحت فرما رہے تھے، سامعین کے حسِ مزاح کو محسوس نہ فرما سکے۔ ایسے وقت میں مغرب کی اذان سے یہ نکتہ واضح ہوا کہ نماز کی کچھ برکتیں بدیہی بھی ہوتی ہیں۔ جب کانفرنس کی کارروائی کا از سرِ نو آغاز ہوا تو سامعین تازہ دم تھے اور ایسے خوش تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ کراچی کے گھٹے گھٹے ماحول اور اندیشوں کی تمازت سے سوزاں و بریاں حالات میں ظرافت نے بارش کے پہلے قطرے کا کام کیا۔ کراچی میں ویسے بھی پچھلے ۳ سال سے بارش نے پھوار کی شکل میں بھی نمودار ہونے کا نام نہیں لیا ہے۔ ایسا محسوس ہوا کہ لوگ مضطرب تھے اور منتظر تھے کہ کوئی انھیں چھیڑے۔ حالی نے مزاح کو ہوا کا جھونکا کہا ہے۔ اس ایک جھونکے نے مسکراہٹوں اور قہقہوں کے پھول کھلا دیئے ایسے باذوق سامعین کہ ہر جملے کو مصرعوں کی طرح اُٹھائیں اور وہ بھی باجماعت، یہ ہم سب کے لیے استفہامیہ بھی تھا اور استعجابیہ بھی۔ طربیہ تو تھا ہی۔ شکر ہے کہ اس اجلاس میں کوئی انشائیہ نہیں پڑھا گیا۔ سبھی نے مزاحیہ مضامین سُنائے۔ پاکستان میں کالم نگاری عروج پر ہے اور ایک سے ایک جیّد کالم نگار وہاں موجود ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ اردو صحافت وہاں ایک معزز پیشے اور منفعت بخش صنعت کی طرح زندہ ہے۔ کالم نگاری وہاں کالم نگار کی نہیں اخبار کی ضرورت ہے اور جمیل الدین عالی بھی جنھیں شعر و ادب کے علاوہ کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں ہے روز نامہ جنگ میں نہایت پُر امن طریقے پر کالم نگاری سے شغل فرماتے ہیں۔ مشفق خواجہ جیسے بلند پایہ محقق بھی خامہ بگوش کے قلمی نام سے "تکبیر" میں بالالتزام کالم لکھتے ہیں اور نہ صرف پاکستان کے مقبول ترین کالم نگار ہیں بلکہ ہندوستان میں بھی ان کے کالم ہر ماہ پابندی سے چھپتے اور پڑھے جاتے ہیں۔ نصر اللہ خاں روز نامہ "حریت" کے مستقل کالم نگار ہیں اور جو بھی کالم لکھتے ہیں نخ اس کے قریب ہوتی ہے۔ ہفتہ وار "تکبیر" بھی اِن کے کالم کے بغیر سونا سونا معلوم ہوتا ہے۔ مختار زمن کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری ہیں۔ اور ان کی کتاب "برگردنِ راوی" کو مزاحیہ ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو رباعی میں چوتھے مصرعے کا حق ہے۔ یہ دونوں ثقہ حضرات، یعنی نصر اللہ خاں اور مختار زمن اس محفل میں سامعین کے لیے جنت نگاہ نہ سہی فردوس گوش ضرور تھے اور مُوضا یہ محفل سے جو مقدار میں خطیر اور تعداد میں کثیر تھے، اتنی داد حاصل کر رہے تھے کہ مجھے ڈر ہوا داد و تحسین کا سارا مال و متاع کہیں قبل از وقت نہ ختم ہو جائے لیکن کراچی مال و منال کے اعتبار ہی سے نہیں، دین و ذہن کے لحاظ سے بھی خوش حال لوگوں کا شہر ہے۔ ہر مضمون کو اتنی داد ملی کہ سمیٹے نہ سمیٹی گئی۔ کراچی میں ہر چیز کی فراوانی ہے خاص طور پر آبادی تو افراطِ زر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ آبادی کے معاملے میں کراچی کو میں نے بمبئی کی زیروکس کاپی دیکھا دفورِ آبادی سے یہ شہر اُفقی طور پر بہت پھیل گیا ہے اور اب عمودی سمت میں بھی تیزی سے رواں دواں ہے یہ اور بات ہے کہ وہاں زمین کی پیمائش اب بھی گز کے پیمانے سے ہوتی ہے جب کہ بمبئی کی زمین سمٹ کر بہت جلد انچ کے پیمانے سے فروخت ہونے لگے گی۔ بہر حال یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کے مسئلے پر کوئی اختلاف رائے نہیں ہے اور دونوں ملک اضافۂ آبادی کے مقابلے میں گردن بہ گردن چل رہے ہیں.... نصر اللہ خاں کا مضمون "ہنسنا اور رونا" مزاح کے شگفتہ اور شاداب پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوا تھا تو مختار زمن کا مضمون ہدایت نامۂ سیاست گراں، طنز کے نشتروں سے آراستہ تھا۔ مضمون طویل تھا لیکن مضمون نگار کی فکرِ جمیل نے اسے مسلسل بنا دیا۔

اطہر حسین صدیقی نے گو کہ انکم ٹیکس کمشنر ہیں اور پیشے کے لحاظ سے انھیں سخت گیر ہونا چاہیے تھا، جب اپنا مضمون کسی سماجی ذہن کسی کی زبان، سنایا تو پتہ چلا کہ انھوں نے اپنے آپ کو بڑی احتیاط کے ساتھ الگ الگ فائلوں میں بانٹ رکھا ہے۔ علی گڈھ کے فارغ التحصیل ہیں اس لیے زبان کی چاشنی ان کے رگ و ریشے میں ہے۔ مجتبیٰ حسین نے پہلے تو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ظرافت کے بارے میں ایک مختصر تجزیہ پڑھا جو بجائے خود ایک دل چسپ اور فکر انگیز مزاحیہ تھا اور پھر اپنا مشہور و معروف مضمون "مکان والو ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ" سنایا اور سامعین کو نہال کر دیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین کو بے حال کر دیا اور سامعین کے قہقہوں نے ثابت کر دیا کہ دل و دماغ پر بوجھ ہو تب بھی ظرافت اپنا خراج وصول کر کے رہتی ہے نقصان یہ ہوا کہ اس اجلاس کی کامیابی دوسرے دن سامعین کی تعداد میں مزید اضافہ کا باعث ہوئی۔ اس اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر پریشان خٹک کرنے والے تھے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اس جلسے کا مہمان خصوصی ہوں تو وہ نہیں آئے۔ میں خود بھی تو عالم پریشانی میں دیر سے پہنچا تھا۔ پروفیسر پریشان خٹک لاجواب آدمی ہیں۔ اپنے قد و قامت اور لباس و پوشش کے اعتبار سے نہیں بلکہ اپنی پرجوش شخصیت اور قابلِ رشک خوش مزاجی کی وجہ سے۔ علمیت مستزاد۔ ان سے ایک اور محفل میں ملاقات ہو گئی۔ یہ محفل کراچی کی تجارت ملازمت اور زراعت پیشہ خواتین کی انجمن کے زیرِ اہتمام منعقد کی گئی تھی۔ کراچی کے سب سے خوبصورت ہوٹل اوبری ٹاور

کا خورشید ہال، خوشبوؤں اور خواتین سے معطر و منور تھا۔ پروفیسر پریشان خٹک نے اس محفل میں جب اپنی صدارتی تقریر فرمائی تو ایسا معلوم ہوا انھیں اتفاق ہو رہا ہے۔ کانفرنس کے دوسرے اجلاس کی تفصیل سے پہلے میں اس جلسے کا حلیہ بیان کر دوں۔ فاطمہ حسن اس جلسے کی کنوینر تھیں اور انجمن کی صدر محترمہ شمیم جلسے کی سربراہ۔ خواتین بھی اتنی منظم ہوسکتی ہیں اس کا اندازہ اسی جلسے میں ہوا۔ مزاحیہ مضامین بھی خواتین نے اتنی دل جمعی سے سُنے کہ ہمیں خود اپنے آپ سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ مجتبیٰ حسین نے اپنا مضمون 'ریلوے منتری' جب سُنایا تو خواتین قیدِ حجاب میں رہ کر بھی اتنا ہنسیں کہ ہال لالہ زار ہوگیا۔ میرا مضمون 'سواریاں' بھی ان کی پسندیدگی اور خندیدگی کا سزاوار ٹھیرا۔ یہ محفل اس لیے یادگار رہے گی کہ اس میں مردوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور آپ جانتے ہیں کہ آٹے میں نمک ہوتا ہی کتنا ہے۔ اور کتنی آسانی سے گھُل جاتا ہے۔ برائے نام مرد سامعین بھی خواتین کی دیکھا دیکھی ہشاش بشاش تھے۔ اس محفل میں مہمانوں کو 'اجرک' اڑھائی گئی۔ 'اجرک' ہمارے ہاں کی شال کی بدل ہے لیکن نعم البدل کی طرح۔ یہ شال سے زیادہ طویل و عریض ہوتی ہے اور بڑی محنت سے تیار کی جاتی ہے۔

طنز و مزاح کانفرنس کا دوسرا اجلاس ڈاکٹر مصطفٰے کمال اور رشید موسوی کے مقالوں کے علاوہ پاکستان کے ڈاکٹر علی خان اور ایم ایم حسن اور مہمانوں میں ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، فیاض احمد فیضی اور راقم الحروف کے مزاحیہ مضامین پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر مصطفٰے کمال نے 'حیدرآباد اور طنز و مزاح' کے عنوان پر اپنا وقیع مقالہ پیش کیا جو اہلِ کراچی کے لیے معلومات کا خزانہ ثابت ہوا اور مقالہ نگار کو بکثرت داد ملی۔ ڈاکٹر مصطفٰے کمال البتہ اپنے مقالہ میں یہ کہنا بھول گئے کہ زندہ دلانِ حیدرآباد تو اودھ پنچ کی روایت کے محافظ اور زندہ دلانِ پنجاب کی امانت کے امین ہیں۔ ڈاکٹر رشید موسوی نے مزاح نگار خواتین کے عنوان پر اپنا تحقیقی مقالہ سُنایا۔ اس مقالے کا کینوس تو اور بھی زیادہ بڑا تھا۔ کینوس کیا تھا اچھا خاصا دال تو وال قالین تھا۔ اُنھوں نے اقتباسات بھی دیئے اور حوالے بھی اور اپنے وسیع مطالعہ اور محنت کی داد حاصل کی۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنے وطن سے باہر جاکر ملازمت حاصل کرنے والوں کے اہلِ خاندان کی نفسیات سے متعلق اپنا مضمون 'بچہ باہر گیا ہے' سُنایا تو محفل کا رنگ زعفرانی ہوگیا اور چہرے ہنسی سے ارغوانی۔ شفیقہ فرحت نے بھی کچھ کم جوہر نہیں دکھلائے خوشی سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ مسرت کی بات ہے کہ فیاض احمد فیضی کا مضمون 'پھلوں میں رنگ بھرے' نہ صرف موقعہ وار دات پر پسند کیا گیا بلکہ شہر میں کئی دن تک اس کے چرچے ہوتے رہے اور ایسا معلوم ہوا صرف سامعین ہی نہیں اس شہر میں ان جیسے دلوانے ہزاروں ہیں۔ بھی کبھی داد لوگ اپنے گھر سے جاکر کیا کرتے، یہ میرے کشکول میں ڈال دی گئی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے میں نے 'ظرافت' کے بارے میں بھی اپنے کہنہ خیالات کا اظہار کیا اور جب یہ کہا کہ ظرافت اور شرافت دونوں جڑواں بہنیں ہیں تو اہلِ کراچی نے اس طبی تحقیق کو بخوشی قبول کرلیا۔

کانفرنس کی کامیابی اپنی جگہ برحق لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اردو کے وہ مزاح نگار جن سے اُردو ظریفانہ ادب ممتاز و مفتخر ہے اس کانفرنس میں بوجہ ظرافت' موجود نہیں تھے۔ ضمیر جعفری مدعو تھے لیکن آ نہیں سکے۔ کرنل محمد خان اور شفیق الرحمٰن غالباً جلسوں سے اجتناب کے عادی ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی نمائندگی بھی شاید نہیں ہوئی۔ پاکستان میں مزاح کی صورتِ حال پر کوئی مبسوط مضمون کانفرنس میں پیش کیا جاتا تو کانفرنس کی درخشانی میں مزید اضافہ ہوتا۔ وقت کی تنگی اور وسائل کی کمی نے خواجہ حمیدالدین شاہد کو جو چند دنوں میں دُبلے ہوگئے تھے یہ موقعہ نہیں دیا کہ وہ سب کو دعوت نامے بھیج پاتے اور پریس کو اپنا ہمنوا بناتے لیکن اس کے باوجود کانفرنس اتنی کامیاب رہی کہ کراچی بھر میں کئی دن تک اس کا تذکرہ رہا۔ مزاحیہ مشاعرہ اور بزمِ قہقہہ

نے اس محفلِ زرّیں پر سہاگے کا کام کیا اور اہلِ کراچی نے ظرافت نگاروں کی پذیرائی میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ ہم سب سرشار ہوگئے۔ کانفرنس کے دوران جن لوگوں سے ملاقات ہوئی وہ اردو شعر و ادب اور صحافت کے معتبر اور معزز اشخاص تھے۔ ممتاز حسین باوجود اس کے کہ تنقید نگار ہیں اور ہنستے احتیاط سے ہیں، محفل کی رونق تھے افکار کے مُدیرِ محترم، صہبا لکھنوی باوجود اس کے کہ نحیف و ضعیف ہیں ایک شوخ و شنگ ہم دم دیرینہ قلم کی طرح موجود تھے۔ پروفیسر محمد علی جو کہ انگریزی اور اردو دونوں کے قلم کار اور علمبردار ہیں خوش و خرم حالت میں دیکھے گئے۔ بزرگوں میں مہدی علی صدیقی موجود تھے۔ مہدی علی صدیقی کی شہرت اس مقدمے کی وجہ سے بھی ہے جس میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو ماخوذ تھے۔ یہ مقدمہ انھی کے اجلاس پر پیش ہوا تھا اور ان کا لکھا ہوا فیصلہ بھی ادب کا حصہ بن گیا۔ شہزاد منظر موجود تھے تو منظر علی خاں منظر کیوں نہ آتے۔ غرض کہ ہر طرح کے مناظر نے جلسہ گاہ کو کہکشاں کی صورت دے دی تھی۔ محمد احمد سبزواری، ڈاکٹر عالیہ امام، رعنا فاروقی، شاہدہ حسن ڈاکٹر نسیمہ ترمذی اور لطف اللہ خاں کے علاوہ اور بھی لوگوں سے ملاقات ہوگئی جن میں عبدالرؤف عروج اور محمود قادر بھی موجود تھے۔ عبدالرؤف عروج سے کوئی ۵ سال بعد ملاقات ہوئی اور قدیم اورنگ آباد دکن آنکھوں میں گھوم گیا۔

غالب لائبریری اور انجمن ترقی اردو کے سربراہوں نے بھی ہمیں مدعو کیا۔ نورالحسن جعفری صاحب سے ہمیں نیاز حاصل ہوا اور مسرت و بہجت کی کئی منزلیں یک لخت طے ہوگئیں۔ صادقین بقیدِ حیات نہیں ہیں لیکن نورالحسن جعفری صاحب کے مضمون میں اُن کی وہی کیفیت ہے کہ یہ چل رہے ہیں وہ بھیر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں۔ اکابرینِ انجمن ترقی اردو نے فرداً فرداً ہر مہمان کو اظہارِ خیال کا موقع دیا (موقع کیا دیا اچھا خاصہ امتحان لیا) اور ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا۔ اتفاق سے اِس محفل میں وزیر آغا بھی موجود تھے انھیں بھی چند منٹ سُننے کا موقع مل گیا۔ کتابیں بھی تحفہ میں ملیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزار پر فاتحہ خوانی ہوئی۔ قدرت کی ستم ظریفی کہیے یا انصاف کہ بابائے اردو نے انجمن کی عملی زندگی کا آغاز اورنگ آباد دکن میں بی بی کے مقبرے ہی سے کیا اور کراچی میں انجمن ہی کی عمارت میں انھیں جگہ ملی۔ اردو سے اُن کی ادبی وابستگی ابدی وابستگی کا روپ اختیار کر گئی۔ غالب لائبریری کی محفل میں بیگم مجید ملک کی موجودگی ہمارے لیے موجبِ تشکر ہوئی۔ ادا جعفری بھی موجود تھیں اور راقم الحروف کی فرمائش پر موصوفہ نے اپنے کلام سے بھی نوازا۔ افتخار احمد خاں عدنی بھی موجود تھے جو غالب کے فارسی کلام کا اردو منظوم ترجمے کے صبر آزما کام کا بار سنبھالتے ہوئے ہیں۔ غلام مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پڑپوتے ہیں اور ظاہر ہے نہایت خوش فکر اور خوش گو شاعر ہیں۔ اِن کی کتاب "محشرِ خیال" اِس لیے بھی وہاں بے حد مقبول ہوئی کہ جمیل الدین عالی اور پروفیسر عزیز احمد کے معاندانہ تعلقات کی پیداوار ہے۔ اس کا انتساب ظ انصاری کے نام ہے جو عزیز احمد کے عاشق ہیں۔ تضادات کا دل خوش کن امتزاج ۔۔ عدنی صاحب سے ایک نجی ملاقات بھی ہوئی جس میں یہ کھُلا کہ اصل میں ظریف تو عدنی صاحب ہیں۔ انھیں میں پراگندہ طبع نہیں ظریف الطبع کہوں گا۔ یہ اپنی بے ساختہ نہیں بے محابا گفتگو سے اپنے مخاطب کو تقریباً ششدر کر دیتے ہیں۔ اساتذہ کے مصرعوں پر برجستہ گرہیں لگاتے اور اپنا مصرعہ زیادہ اُٹھاتے ہیں۔

غالب لائبریری کراچی کی سب سے کم عمر لائبریری ہے لیکن اس کم سنی میں بھی اس نے کیا قد نکالا ہے۔ ایسا قد طرۂ پر پیچ و خم کے پیچ و خم کھُلنے پر بھی قیامت کے فتنے سے لگّا کھائے۔ مرزا ظفر الحسن مرحوم نے اِس لائبریری کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی فیض احمد فیض اس لائبریری کے صدر تھے۔ آفتاب احمد خاں غالب کے نام پہ

ریشہ خطمی ہو گئے اور انھوں نے مرزا ظفر الحسن کے جوش و خروش اور ذوق و شوق کی داد اس طرح دی کہ لائبریری کے لیے ایک قطعہ زمین حاصل کر لیا اور حبیب بینک کے تعاون سے عمارت کھڑی کروادی۔ اب اس دو منزلہ عمارت میں نیچے روپیوں کے ڈھیر ہیں اور اوپر دولت بیدار۔ غالب اگر واقعی حج کے لیے گئے ہوتے تو اس حج کا ثواب پتہ نہیں ان تینوں حضرات میں کس کی نذر کرتے۔ بیگم مجید ملک سے مل کر واقعی بے حد مسرت ہوئی۔ ان کی اپنائیت برسوں یاد رہے گی۔ انھوں نے زمایا کہ وہ چاہتی تھیں کہ سب لوگ ان کے گھر پہ جمع ہوں لیکن غالب لائبریری کا حق مقدم تھا۔ بعد میں بھی مشفق خواجہ کے توسط سے اُن کے گھر جانے کی "دعوت" ملی لیکن بدقسمتی سے ہم اتنے گھر گئے تھے کہ باوجود آرزو کے اُن کے گھر نہیں جاسکے۔ میں نے بہرحال غالب لائبریری کی طرف سے جو کتابیں تحفے میں ملیں ان میں سے دو کتابوں پر اُن کا آٹوگراف لے لیا۔ ان میں سے ایک کتاب 'مضامین پطرس' کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جو غالب لائبریری کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے۔ غالب سہ ماہی کا تازہ شمارہ ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔

ادبی رسائل کی بات چھڑی ہے تو میں عرض کر دوں کہ اخبارات کی طرح اردو رسائل کی بھی یہاں مانگ ہے 'افکار' تو پابندی سے شائع ہونے کا ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ 'دائرے' وقیع رسالہ ہے اور ان دونوں پرچوں میں ہندوستان کی نمائندگی بخوبی ہوتی ہے۔ جوگندر پال، کشمیری لال ذاکر، رام لال تو ان میں چھپتے ہی ہیں لیکن نئے لکھنے والوں میں سلام بن رزاق کے افسانے اور عبدالاحد ساز کی غزلیں میں نے دو، تین شماروں میں دیکھیں۔ ان رسائل میں شرکائے محفل کے پتے لکھنے کا رواج نہیں ہے اس لیے ہوسکتا ہے کہ اور بھی کئی لکھنے والے ہندوستان کے ہوں۔

ہم لوگوں کو یعنی کبھی کبھی سب کو اور کبھی کبھی کچھ کو، تبادلۂ خیال اور انٹرویو کے لیے کئی اخباروں کے دفتر میں طلب کیا گیا۔ اسے آپ مدعو کیا گیا بھی کہہ سکتے ہیں 'جنگ' کے آفس میں تو باضابطہ ایک پینل بیٹھا اور بے حد سنجیدگی کے ساتھ سوالات جوابات ہوئے۔ 'حریت'، اخبارِ خواتین میں لمبے لمبے انٹرویو ہوئے۔ خواتین نے پریس کلب میں لنچ بھی کھلایا۔ اس کلب میں ایک کمرہ ابراہیم جلیس کے نام سے بھی منسوب ہے۔ خوشی ہوئی۔ ہر جگہ ہماری تصویریں کھینچی گئیں اور ہمیں بادلِ ناخواستہ مسکرانا پڑا لیکن اپنی تصویروں کو دیکھ کر ہم لوگ بے حد مسرور اور کچھ کچھ مغرور ہوئے۔ اپنی تصویر دیکھنے کے بہانے سر پہلے ہی نیچے کر لیا تھا بعد میں خفت نہیں اٹھانی پڑی۔

انجمن ترقی اردو کے پُرتکلف ظہرانے کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا۔ آوادی ٹاورس کا یہ بوفے لنچ اس لیے یاد رہے گا کہ کھانا پُرتکلف تھا لیکن صحبت بے تکلفی کی تھی اور یہاں دو ملک کچھ اس طرح ایک دوسرے میں ضم اور مدغم ہو گئے تھے گویا ان میں کوئی حدِ فاصل ہی نہ ہو۔ کھانا تو ہم نے زیادہ کھایا ہی لیکن اس سے زیادہ ہم نے کہا اور سُنا اور ملتے وقت کہا سنا معاف کرنے کی گزارش بھی کر دی۔

یہی بات انجمن ملازمت، تجارت اور زراعت پیشہ خواتین کے عصرانے کی بھی تھی۔ یہاں گفتگو کا موقعہ کم تھا ملاقاتیں زیادہ ہوئیں۔

ایک اہم بات یہ کہ کراچی، شعر و ادب کا مرکز تو ہے ہی لیکن ڈراما بھی یہاں اتنا ہی مقبول ہے جتنی کہ شاعری بلکہ اس کے پرستار کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔ ٹی۔ وی آرٹسٹوں کی قدر و منزلت ہے اور ڈراما نگاروں کو بھی غور سے دیکھا جاتا ہے۔ 'حریت' کے دفتر میں مقصود انور سے بھی ملاقات ہو گئی جن کے مزاحیہ کالموں سے بھرپور ڈرامے گرم کیک

کی طرح زودخت ہوتے ہیں۔ غالب نہدر روڈ پر تو میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن غالب صدی کے موقع پر جو ڈاکیومنٹری فلم تیار ہوئی تھی اُسے دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا اور آخرکار خود مصنف، خلیق ابراہیم خلیق نے اس کا انتظام کر دیا۔ کیا غضب کی فلم ہے۔ اسکرپٹ کے اعتبار سے بھی اور غالب کی اداکاری کے لحاظ سے بھی۔ اس صدا کے غالب بھانی یا یونس بھی ساتھ تھے۔ ایسا محسوس ہوا غالب صدی بول رہی ہے۔ خلیق ابراہیم خلیق لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور لکھنؤ کی یاد اس ان میں اب تک رچی بسی ہے۔ بمبئی میں رہ چکے ہیں اور یہاں کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالب کی ایک نادر و نایاب تصویر اپنے آٹوگراف سے مجھے دی۔ معلوم ہوتا ہے واقعی اسداللہ خاں غالب کی تصویر ہے۔ وہ اجرک جس کا ذکر میں نے اُوپر کی سطروں میں کیا ہے اور یہ تصویر جسے بھی دیکھنا مقصود ہو دونوں دیکھنے کی چیزیں ہیں تو غریب خانہ پہ موجود ہر ملاقی کے لیے۔

ادب اور صحافت کے سلسلے میں میں سہام مرزا کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ اُنھوں نے اپنی محنت اور تائیدِ ایزدی کی بدولت، بہت بڑا آفس جسے شاندار بھی کہا جا سکتا ہے قائم کر لیا۔ ان کے چار ماہنامے تو شائع ہوتے ہیں جن میں دوشیزہ ڈائجسٹ اور سچی کہانیاں کی رسائی ہر گھر میں ہے۔ ان چاروں رسالوں کی مجموعی اشاعت لاکھوں میں ہے۔ اور اب تو رخسانہ سہام مرزا، خواتین کا ایک روزنامہ شائع کرنے والی ہیں۔ اس کا اعلان انھوں نے بیانگِ دہل اُس دن کیا جس روز دوشیزہ ڈائجسٹ کے سالانہ انعامات کی تقسیم کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ یہ بھی بڑے ہنگامے کا جلسہ تھا۔ ہال خواتین سے اٹا پڑا تھا۔ مرد بھی تھے لیکن خال خال۔ اِس تقریب میں ہم مہمانوں کو خصوصی سامعین کی حیثیت سے صفِ اول میں جگہ دی گئی تھی۔ ویڈیو فلم پر یقیناً بڑا اثر پڑا ہوگا۔ اس محفل کی خاص الخاص بات یہ ہے کہ صوبہ سندھ کے سابق چیف منسٹر اختر علی جی قاضی اور بیگم اختر علی جی قاضی کی تقریریں سُننے کا موقع ملا۔ دونوں سندھ نژاد ہیں لیکن اُنھوں نے نہ صرف اُردو زبان پر بلکہ اردو لہجے پر بھی عبور حاصل کر لیا ہے۔ اپنا لہجہ بھی برقرار رکھا ہے ــــ بیگم قاضی نے ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ شوہر سے آگے نکل گئیں۔ اہلِ سندھ کی اُردو زبان سے یہ محبت واقعی قابلِ داد ہے۔ روزنامہ 'سویرا' جب شائع ہوگا تو اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل اور اخبار کی مجموعی اشاعت پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ یہ سارے دفاتر جو دو عمارتوں کے مختلف زینوں پر پھیلے ہوئے ہیں، اپنے کارکنوں کی تعداد کے اعتبار سے کافی ضخیم ہیں۔ تنخواہوں کے بارے میں میں کہہ ہی چکا ہوں کہ یہ ایسی نہیں ہیں کہ کوئی پوچھے تو یہ کہیں کہ ہم بتلائیں کیا۔ صحافت کے میدان میں خواتین کا "تناسب" اچھا خاصہ بلکہ دلپذیر ہے۔ روزناموں میں ان کی تعداد کم ہے لیکن ہفتہ وار اخبارات اور ماہناموں کے دفاتر میں رنگ و رامش زیادہ ہے۔ دوشیزہ ڈائجسٹ کی یہ تقریب ہمارے ہاں کی فلمی الوارڈ کی تقریب کی طرح کی کوئی چیز معلوم ہوتی۔

سرسید کالج، طالبات کا کالج ہے۔ خواتین لکچرر ہیں۔ اس کالج میں بھی ہمیں مدعو کیا گیا تھا لیکن کوئی جلسہ نہیں ہو سکا اس لیے کہ ایک ہی دن پہلے ہند و پاک کے بزرگ دانشور مجنوں گورکھپوری کا انتقال ہو گیا تھا۔ تاہم گفتگو کا سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس کالج میں مدعو کئے جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آمنہ مشفق صاحبہ یہاں لکچرر ہیں۔ یہیں یعنیٰ بھی شعیٰ سے ملاقات ہوگئی جنھیں قدرت نے ایسی مترنم آواز دی ہے کہ جو سنتا ہے محو ہو جاتا ہے۔ ان کی حمد سرائی کے کیسیٹ دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹی وی پر صرف حمد اور نعت سناتی ہیں لیکن نجی محفلوں میں غزل سُنانے سے احتراز نہیں کرتیں۔ ان کے لحن نے انھیں حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی نواز دیا۔ یہ حکومتی قافلے کی رکن تھیں۔ اپنے والی خاندیش کی بیٹی

ان سے گفتگو میں اس لیے مزا آیا کہ جان پہچان کا سلسلہ کارِ جہاں کی طرح دراز ہوتا گیا۔ ان کی صحت کا راز البتہ پوچھنا بھول گیا۔ یہ وہاں کی بے حد مقبول خاتون ہیں اور ان کی انگلیاں آٹو گراف دیتے دیتے فگار ہو چکی ہیں۔

کراچی میں حیدرآباد کالونی بھی ہے اور بہادر آباد بھی۔ دونوں جگہوں سے بلاوا آیا۔ بہادر یار جنگ اکادمی کی عمارت شان دار ہے اور لائبریری اس سے زیادہ شاندار۔ دونوں جگہ جلسے اور عشائیے ہوئے اور حیدرآبادی تکلفات کے پل صراط سے گزرنا پڑا۔ جلسوں میں مضامین بھی پڑھے گئے اور شاعری بھی ہوئی۔ بہادر یار جنگ اکادمی کے جلسے کی نظامت، حمایت علی شاعر کے سپرد تھی اور صدارت حضرت شاہد رزاقی کے تفویض۔ شاہد رزاقی صاحب نے بھی اپنی کتابوں کا سارا اثاثہ بہادر یار جنگ لائبریری کی نذر کردیا ہے۔ یہی کام مرحوم مسلم ضیائی نے بھی کیا۔ انھوں نے اپنی لائبریری ہمدرد کے کتب خانے کے حوالے کی۔ مسعود احمد برکاتی جو ایڈیٹر نونہال کے ہیں، مجھ پر مہربان ہوگئے اور انھوں نے اپنی لائبریری کی سیر کرادی۔ بڑے سلیقے کی لائبریری ہے۔ لائبریری کے لیے سلیقہ تو چاہیے ہی ورنہ وہ لائبریری کیوں ہوگی کباڑ خانہ ہوگا۔ خود حمید اللہ شاہد کے ایوان اردو میں کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ جن میں مخطوطات بھی ہیں اور مکتوبات بھی۔ یہی حال مشفق خواجہ کے کتب خانہ کا ہے۔ ہر چیز منضبط ہر بات مسکت۔ مشفق خواجہ مکان میں نہیں کتب خانے میں رہتے ہیں۔ ہاں ان کا ایک تازہ بتازہ مکان ساحل سمندر کے کنارے ہے بے حد وسیع و فراخ۔ ان کی ایک دعوت کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اس دعوت میں رضیہ فصیح احمد، ادا جعفری اور ہاجرہ مسرور بھی شریک تھیں۔ فرلیہ معین الدین عقیل اور ایک صحافی خاتون شمع زیدی بھی تھیں۔ شمع زیدی کا تعارف یہ ہے کہ یہ پاکستانی ایڈیشن تقطیع کے حساب سے کراؤن سائز کا ایڈیشن ہے لیکن مغز اور مواد کے اعتبار سے بے حد جامع۔ شمع زیدی فی الحال صرف 'حریت' اخبار سے وابستہ ہیں۔ بظاہر انھیں میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا۔ آنکھوں سے ہنستی ہیں اور آنکھوں ہی سے بولتی ہیں۔ اخبار خواتین سے منسلک حمیرہ اطہر کو بھی میں نے بہت تیز طرار اور چاق و چوبند پایا۔ وہاں خواتین صحافی کسی طرح ثانوی حیثیت نہیں رکھتیں اخبار خواتین کی سرِ بش ذرخ تو آتنی چوکنا رہتی ہیں کہ نظر نہ آنے والی چڑیا کے بھی پر گن لیتی ہیں۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کے سال سے کام کر رہی ہیں تو فوراً بولیں اچھا آپ میری عمر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ موصوفہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مردوں نے پہلے ہی مصلحتاً مشہور کر رکھا ہے کہ عورتوں کی عمر نہیں پوچھنی چاہیے۔ یہ بات میں اب کہہ رہا ہوں اس دن ایک خاتون نے تو میری پیٹھ بھی تھپکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دن بھر کامیابی میرے پیچھے پیچھے رہی۔ ذکر تھا مشفق خواجہ کی مرتبہ محفل کا۔ شان الحق حقی بھی اس محفل میں موجود تھے اور شکر ہے کہ اپنی کوئی چیز یہاں نہیں بھولے۔ ورنہ مشہور یہ ہے کہ ہمیشہ 'تلاش گمشدہ' میں مصروف رہتے ہیں۔ اس رات حمایت اللہ اور مصطفےٰ علی بیگ نے دو مزاحیہ خاکے پیش کئے اور حاضرین کے فلک شگاف قہقہوں نے اس نو ساختہ مکان کو لرزہ براندام کردیا۔ مکان کی بنیادوں پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔

ان خوش گوار صحبتوں اور محفلوں کے ساتھ ساتھ اس تعزیتی جلسے کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جو انجمن ترقی اردو نے غالب لائبریری میں مجنوں گورکھپوری کی یاد میں طلب کیا تھا۔ مرحوم کے کئی ہم چشم اور ہم عمر اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے والے سوگواروں کا مجمع تھا اور چاہیے تو یہ تھا کہ انہی بزرگوں میں سے کسی صاحبِ علم کو صدارت کی زحمت دی جاتی لیکن یہاں بھی اہلِ کراچی مہمان نوازی کو نہیں بھولے اور مختار زمن نے اس خاکسار کو صدارت کے لیے طلب کرلیا جو کسی طرح مناسب بات نہیں تھی۔ یہاں مجنوں گورکھپوری کے بڑے صاحبزادے ظفر عالم صاحب

سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہندوستان میں جب مجنوں صاحب کے انتقال سے پہلے ہی اُن کی تعزیت کے جلسے منعقد ہو گئے اور ان کی خبر مرحوم کو پہنچی تو وہ بے حد متاسف تھے۔ مجھے جب کچھ کہنے کا موقع ملا تو میں نے ہم سب کی طرف سے معذرت کرلی اور اپنے بارے میں بھی کہہ دیا کہ میں نے اس صدارت کو سعادت سمجھ کر قبول کیا ہے۔ یہاں ایک بات اور عرض کر دوں کہ پاکستان میں تعزیتی جلسوں میں حاضرین کا احتراماً خاموشی سے کھڑے رہنے کا رواج نہیں ہے وہاں جلسے کی ابتدا ہی میں فاتحہ پڑھی جاتی۔ اور مرحوم کی مغفرت کی دعا کی جاتی ہے۔

ہاں ہم لوگوں کی آمد کے سلسلے میں ایک جلسہ انجمن ارتقا کی طرف سے بھی منعقد ہوا جس کی صدارت کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر منظور احمد صاحب نے فرمائی انجمن ارتقا جامعہ عثمانیہ کے سابق طلباء کی انجمن ہے۔ اتفاق سے انور قمر بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ ان کا افسانہ بہت پسند کیا گیا۔ وحیدہ نسیم نے بھی جو ابھی ابھی کراچی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئی ہیں۔ اپنی نظمیں سنائیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد اس جلسے کے مہمان خصوصی تھے۔ بہت دنوں کے بعد میں نے انھیں خوش وخرم دیکھا لیکن ــــ جب انھوں نے اپنے گھر پر ایک عشائیہ موزوں کیا تو اس دن بھی حیدرآبادی کھانے کھلا کر بہت خوش ہوئے تھے حتیٰ کہ میزبان خاتون ڈاکٹر زاست بھی بے حد خوش تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں آخر مہمان رخصت ہو رہے تھے۔ بے حد مصروف ڈاکٹر ہیں۔ ان کے کام میں یقیناً حرج ہوا ہوگا۔ ادب کی ڈاکٹر ہوتیں تو کوئی بات نہیں تھی۔

اب کچھ باتیں غیر ادبی بھی۔ کراچی شہر ہمیں پسند آیا کہ اب پاکستان میں موٹریں ہی موٹریں ہیں ورنہ ایک زمانہ تھا جب لاہور جیسے شہر میں بھی صرف ذوالفقار علی خاں کی موٹر تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ صرف ایک سوزکی کار ہے جو پاکستان میں درآمد شدہ مال کی مدد سے ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ ہماری ماروتی کار کا جواب ہے اور وہاں کافی مقبول ہے دوسری ساری کاریں جاپان، جرمنی، فرانس، برطانیہ اور امریکہ سے آئی اور لائی ہوئی ہیں بلکہ شاید ان ملکوں سے بھی درآمد کی ہوئی ہیں جہاں کاریں بنتی ہی نہیں ہیں۔ ان کی وہ بہتات ہے کہ شہر کے ہر گلی کوچے میں دو چار کاریں اہل خانہ کی مملوکہ ومقبوضہ پائی جاتی ہیں۔ ویسے کراچی میں مسروقہ کاریں بھی تعداد میں کم نہیں ہیں کہا جاتا ہے یہاں سب سے آسان چوری، کار کی چوری ہے۔ موٹر سیکلیں اسکوٹر اور آٹو رکشا میں بھی بے شمار ہیں۔ اکثر موٹر سیکل نشیں حضرات کو بیچ سڑک میں اپنی سواری پر بیٹھے بیٹھے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ شہر میں سرکاری بسیں غالباً ممنوع ہیں بسیں چلتی ہیں لیکن خانگی۔ مسافر کبھی کبھی ٹکٹ بھی خرید لیتے ہیں۔ پیدل چلنے والے بھی ہیں لیکن اتنے نہیں جتنے کہ ہمارے شہر دلی میں پائے جاتے ہیں۔ کراچی کے لوگ بے حد جیالے ہیں اور راستہ چلتے وقت دوسرے کی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ ہر شخص اپنی گاڑی دوسرے شخص کی گاڑی سے آگے رکھنا چاہتا ہے۔ کون کب کس طرف کو اپنی گاڑی موڑ دے گا کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ٹریفک کانسٹیبلوں کو ان حالات میں اپنی سفید پوشی کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہماری رائے میں ان کے یونیفارم کا رنگ تبدیل کیا جانا چاہیئے۔ سفید رنگ امن کے پرچم کے لیے موزوں ہے اور کراچی کی سڑکیں تو اچھی خاصی رزم گاہیں ہیں ــــ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کراچی میں روپے کی ریل پیل ہے اسی لیے یہاں ریلیں نہیں چلا کرتیں۔ جسے بھی ہم نے سڑک پر دیکھا کھاتا پیتا دیکھا۔ آموں کا موسم تھا اس لیے شہر میں عموماً اور منڈیوں میں خصوصاً مکھیوں کی کثرت تھی۔ جو تھیں بھی کرتی یہاں کی مکھیوں کو اُٹھایا جائے تو اُڑتی نہیں ہیں جہاں بیٹھ گئیں حضرت داغ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کئے بیٹھی رہتی ہیں۔ خوبانی تو وہاں آتی پیدا ہوتی ہے کہ کیا ہمارے یہاں بیر پیدا ہوں گے۔ کیوں نہ ہو خوبانی کا

شہر ہے۔ آم کے نام سُنے تو معلوم ہوا کوئی سندھڑی ہے تو کوئی سردلی۔ ایک آم تو انور نام کا بھی پایا گیا۔ انور معظم کی یاد آگئی۔ خوش باش لوگوں کا شہر ہے اس لیے کسی سے راستہ پوچھیے تو دُور تک ساتھ آتا ہے۔ یادِ وطن کی طرح مقامی بولی سمجھنے کے لیے کراچی میں کم سے کم ۳ ماہ ٹھیرنا چاہیئے۔ یہاں لوگ ترکی نہیں بولتے لیکن یہ ہوتی ترکی ہی ہے۔ اہلِ کراچی کی ہم لباسی بھی پسند آئی۔ چند ہی لوگ ہوں گے جو شلوار قمیص نہیں پہنتے۔ نوجوان لڑکے اسی لباس میں اپنے محلوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے انتظام یہ کیا ہے کہ اپنی اپنی گلی میں ہر تین گز پر ایک رفتار شکن پہاڑی بنا رکھی ہے۔ گلی کوچوں کے سارے اسپیڈ بریکرس عوام الناس کی محنت اور مشقت کا پھل ہیں۔ سرکاری خزانے پر ان کا کوئی بار نہیں پڑا ہے۔ ان گلیوں میں ذہین کارنشیں حضرات جاتے ہیں جنھیں جان و مال عزیز نہیں ہوتے۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں لوگ جب گھر کے باہر نکلتے ہیں تو ہر شخص سڑک پر کافی جگہ گھیر لیتا ہے۔ دوسرے شخص کو اپنے لیئے جگہ بنانے میں کافی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے۔ بازاروں میں غیر ملکی مال یوں بکھرا پڑا ہے گویا اسی شہر میں بنتا ہے۔ تائیوان، کوریا، جاپان کا بازاروں پر قبضہ ہے۔ ملک کی معاشیات پر اس شاعرانہ اور شاطرانہ 'آمد' کا کیا اثر ہوا ہے اس کا تجزیہ اہلِ حساب کریں۔ ہمارا کام تو مشاہدہ ہے محاسبہ نہیں۔

اور یہاں کی بود و باش کا کیا کہنا۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مکان ہمارے مطالعے میں آئے۔ آمدنیوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مہنگائی کا لفظ بُرا لگتا ہے۔ نرخ ہالاکن کہ ارزانی ہنوز کا معاملہ ہے۔ شادیوں کے موقع پر لوگ اس طرح جی کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں کہ کچھ ہمارا ہی جی چاہتا ہے۔ سوچتے ہوں گے معلوم نہیں پھر کب ایسا موقع ملے۔

آخر میں عزیز کارٹونسٹ کے ہاں ناشتہ اور عظمت اللہ کے گھر ڈنر کا ذکر ضروری ہے ویسے عظمت اللہ کے ڈنر میں شرکت سے محروم رہا لیکن خوشبو ضرور پہنچی اور وہ بات تو رہ ہی گئی جس کے لیے یہ ساری حکایت لکھی گئی ہے یعنی خواجہ حمید الدین شاہد کا ۷۰ سالہ اور اُن کی ادبی خدمات کا ۵۰ سالہ جشن لیکن اس کے بارے میں تو الگ سے لکھا جانا چاہیئے۔ اور اب تو وہ طے ہی کر چکے ہیں کہ ۱۹۸۹ء میں بھی ایک اور کانفرنس کر کے رہیں گے۔ جوان آدمی ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔
ایک مرتبہ اور عرض کر دوں کہ یہ سفرنامہ نہیں ہے کیوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے سچ لکھا ہے! ▲△

جہانگیر انس
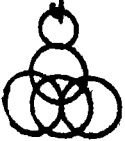
ہابی

دوسروں کے باطن میں جھانکنا، اُن کے نہاں خانۂ دل میں چھپے رازوں اور گھاتوں، ارادوں اور چالوں کا خام مواد حاصل کر کے اسے مختلف رنگوں سے مزیّن کرنا اور پھر اسے احباب میں مشتہر کرنا میری پسندیدہ ہابی ہے۔ میرے ایک مصلح نما دوست میری اس پسندیدہ ہابی کو غیبت کا نام دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں اپنی اس ہابی کے زیرِ اثر غیر شعوری طور پر دوسروں کی غیبت کرنے کا مرتکب ہوتا ہوں۔ وہ مختلف قسم کے دلائل سے مجھے یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی کی غیبت کرنا اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ لیکن میں ان کے تمام دلائل ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ میرے نزدیک خدا نے انسان کو دو کانوں سے اسی لیے نوازا ہے کہ وہ اپنے مصلح نما دوستوں اور بزرگوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دے۔ ویسے میرے ایک واقف کار کا خیال کچھ اور ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دو کان اور ایک زبان بنانے میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ انسان دو باتوں کا ایک جواب دے یعنی دو باتیں سُنے اور ایک بات بولے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر انسان کو خدا نے ایک ہی کان سے نوازا ہوتا تو اس دنیا کا رنگ و روپ کیسا ہوتا؟ ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جانے والی باتوں کا معمولی حصہ جو کان کی دیوار سے چپک کر باہر نکلنے سے رہ جاتا ہے انسان کے دل و دماغ کو کبھی کبھی اتنا زہر آلودہ اور پراگندہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ دیوانگی کے عالم میں اپنی انسانی خصوصیات زائل کر دیتا ہے۔ اپنے جسم پر سے اشرف المخلوقات کا حسین ملائم اور پُرکشش لباس اُتار کر حیوانیت کا موٹا بدرنگ اور بھدّا لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور جس شاخ پر اس کا آشیانہ ہے اسی شاخ کو کاٹنے لگتا ہے۔ تو ایک کان سے داخل ہونے والی باتیں نکاسی کا راستہ نہ پا کر جب دل و دماغ میں ذخیرہ ہو جائیں تو کیسا کیسا گُل کھلائیں۔

میرے تجزیے کے مطابق ہر شخص کی ہابی اس کے فکر و احساس کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ انسان کے مادّی وجود کو تو پابندِ طوق و سلاسل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے فکر و احساس پر پہرا نہیں بٹھایا جا سکتا۔ فکر و احساس تو ایک ایسا پرندہ ہے جو موسموں کے مد و جزر، دن رات کی گردش، زندگی اور موت کے خوف اور سرد و گرم ہواؤں کے اثر سے بے نیاز بلندی کی طرف مائل بہ پرواز رہتا ہے اس کی پرواز کی راہ میں کوئی رکاوٹ خواہ مرئی ہو یا غیر مرئی حائل نہیں ہو سکتی۔ اس کی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نہ آخری منزل ۔۔۔ میری ہابی بھی میرے فکر و احساس کی صدائے بازگشت

ہے۔ میرے لیے یہ ایک ایسی قندیل ہے جس کی روشنی میں دوسرے کے ظاہر کا ہی نہیں بلکہ باطن کا بھی نظارہ کرلیتا ہوں اور اس کے باطنی دنیا کے رنگا رنگ مناظر کا عکس الفاظ کے نقرئی ورق میں لپیٹ کر ہر خاص و عام کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس سے مجھے ایک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ دوسروں کے نہاں خانۂ دل میں پوشیدہ رازوں اور گھاتوں، ارادوں اور چالوں کو افشاں کرنا اور باطنی تصویر کی نقاب کشائی کرنا کتنا خوشگوار عمل ہے۔ دل و دماغ کو اس سے کتنا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ آدمی خود کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔

یہ بات نہیں کہ کسی کی غیبت کرنا میرے نزدیک کوئی احسن فعل ہے۔ اپنے مُصلح نما دوست کی طرح میں بھی غیبت کو بُرا سمجھتا ہوں اور اس سے حتی الامکان دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ غیبت ایک شعوری فعل ہے۔ یہ ایک ایسا زہریلا پودا ہے جس میں حسد کی شاخیں، بغض کی پتیاں، کینہ کی کلیاں، نفرت کے پھول اور عداوت کے پھل ہوتے ہیں۔ اس کی جڑیں گدھ کے پنجہ کی طرح نوکیلی اور تیز ہوتی ہیں ۔۔ لیکن ہابی کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے یہ احساسِ لطیف اور جذبۂ صادق کی مظہر ہوتی ہے۔ اس لیے میں اپنی پسندیدہ ہابی کو غیبت نہیں سمجھتا۔ اگر میری ہابی غیبت کے دائرہ میں آتی بھی ہو تو مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں کیوں کہ اپنی ہابی کے تحت کسی کی شخصیت کا آبگینہ چکنا چور کرنا میرا مقصد نہیں اور نہ کسی کی دل آزاری مطلوب ہے۔ اصل چیز تو نیت ہوتی ہے۔ شرمندہ تو وہ شخص ہوتا ہے جس کی نیت میں کھوٹ ہوتا ہے۔

ہابی میری تنہائی کی بہترین رفیق اور اعصابی تناؤ کم کرنے کا ہلکا پھلکا نسخہ ہے۔ اس کے گرم و نرم لمس سے میں اپنی زندگی میں تازگی پاتا ہوں۔ یہ میرے وجود میں چھپا ہوا ایک ایسا مقناطیس ہے جس کی کشش ناواقفوں کو بھی یارِ بے دام بنا دیتی ہے۔ احباب کی محفلوں میں یہ مجھے سرخرو کر کے بلند مقام عطا کرتی ہے ۔۔ تنہائی کے کانٹے جب میرے وجود میں پیوست ہونے لگتے ہیں تو میں ان کی خلش کا احساس ختم کرنے کے لیے تصور کی آنکھوں سے دوسروں کے باطن میں جھانکنا شروع کردیتا ہوں۔ کانٹوں کی چبھن سے پیدا ہونے والی خلش رفتہ رفتہ ایک احساسِ لطیف میں بدل جاتی ہے۔ مجھ پر روحانیت طاری ہونے لگتی ہے۔ خیالات کی پتنگ دلکش رفعتوں میں تیرنے لگتی ہے۔ تصور کی آنکھیں دوسروں کے باطن میں چھپی ہوئی خوبیوں اور خامیوں کو چن چن کر تصویر کی شکل میں میرے سطحِ دل پر منعکس کرنے لگتی ہیں جنھیں میں رنگ و روغن سے سجا سنوار کر احباب کی محفلوں میں آویزاں کر دیتا ہوں۔ احباب میرے اس فعل کو نگاہِ تحسین سے دیکھتے ہیں اور مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

ہابی انسان کے ذہنی میلان، جذباتی رجحان، ثقافتی اور عصری ماحول کی ترجمان ہوتی ہے۔ جیون پتھ کا یہ وہ سنگِ میل ہے جو انسان کو ازلی سفر دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس انسان کی کوئی ہابی نہیں ہوتی اس کی مثال اس پودے کی ہے جو سرسبز و شاداب ہونے کے باوجود پھل اور پھول سے محروم ہوتا ہے۔ وہ آنکھوں کو راحت تو پہنچا سکتا ہے لیکن دل و دماغ کو فرحت اور کام و دہن کو لذت نہیں بخش سکتا۔ اگر سچ پوچھا جائے تو انسان کی ہابی اس کے باطن کا آئینہ ہوتی ہے جس میں ہم اس کی باطنی دنیا کے مناظر کا دیدار کرسکتے ہیں۔

بعض کم فہم ہابی کو غیر ملکی پودا سمجھتے ہیں جو سمندر پار سے لاکر ہمارے دل و دماغ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ غیر ملکی آب و ہوا اور خوراک کے ذریعہ اس کی نشوونما ہوئی ہے۔ دیکھنے میں نہایت دیدہ زیب اور خوشنما نظر آتا ہے۔ اس کی شاخیں سنہری اور پتیاں نقرئی ہوتی ہیں اس کے اوپر من موہنی کلیاں کھلتی ہیں جن کی خوشبو انسان

دل ودماغ کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے کہ وہ جیون بھر اس کے اثر سے باہر نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت بھی ہے لیکن یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ یہ پودا غیر ملکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ پودا ابتدائے آفرینش سے ہی بلا لحاظ رنگ ونسل اور ملک وملت ہر شخص کے دل ودماغ پر اُگتا آیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پودا پہلے شوق کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے آباد اجداد کو نت نئے شوق پالنے کا کتنا شوق تھا۔ پتنگ اُڑانے کا شوق، عشق کرنے کا شوق، بٹیر بازی کا شوق، شطرنج کھیلنے کا شوق، کبوتر اڑانے کا شوق اور مرغ لڑانے کا شوق، سیاحت کا شوق، تعلیم حاصل کرنے کا شوق، باتیں بنانے کا شوق، جھگڑا لگانے کا شوق اور کچھ خاص الخاص شوق بھی تھے جیسے سکندر کو ساری دنیا پر فتح حاصل کرنے کا شوق تھا، چنگیز کو معصوم بچوں کے کٹے ہوئے سروں کو نیزہ پر اُچھالنے اور انسانی کھوپڑیوں سے مینار تعمیر کرنے کا شوق تھا، کسی کو نت نئی شادیاں رچانے کا شوق تھا، کسی کو دولت جمع کرنے کا شوق تھا، کسی کو دولت لٹانے کا شوق تھا۔

اس سے انکار نہیں کہ ہابی شوق کا انگلش اڈیشن ہے۔ ہو سکتا ہے ہابی اور شوق میں معمولی فرق بھی ہو جیسے خردبین سے دیکھا جاسکے یا دونوں کا فرق کلاسیکل میوزک اور ڈسکو میوزک کا ہو۔ لیکن انگلش اڈیشن ہونا یا معمولی فرق ہابی کے غیر ملکی ہونے کی دلیل نہیں۔ اور پھر جب غیر ملکی پوشاک، غیر ملکی خوراک، غیر ملکی زبان اور غیر ملکی انداز فکر ہمارے مہذب اور روشن خیال ہونے کی اولین شرط ہے تو پھر بیچاری ہابی کو اردو کی طرح غیر ملکی شئے قرار دے کر اسے سنگسار کرنے کی ناکام کوشش کرنا ذہنی دیوالیہ پن اور تعصب و تنگ نظری نہیں تو اور کیا ہے۔

ہابی کی زلف گرہ گیر کا اسیر کم و بیش ہر شخص ہوتا ہے اس کے لیے راجا بھوج ہونا شرط نہیں بھوج تیلی بھی اس معاملے میں "ہم بھی کسی سے کم نہیں" کا دعوٰی کرسکتا ہے۔ کم خرچ بالانشیں کا مقولہ جس نے بھی ایجاد کیا ہے ہابی کے لیے ہی ایجاد کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہابی سستے کا سودا ہے اور امیروں اور غریبوں کی ہابی میں فرق نہیں ہوتا ہے۔ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا تعلق امیری غریبی سے کم اور مزاج اور ذہن و جذبات سے زیادہ ہوتا ہے، بعض اشخاص کی ہابی کے پیچھے امارت کی نمائش کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں امارت کا کوئی قصور نہیں کیوں کہ نمائش تو امارت کا بنیادی جز ہے اگر امارت سے نمائش نکال دی جائے تو امارت اپنا حسن، اپنی کشش اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گی۔

ہابی کو فعل عبث سمجھنا ایک غیر مہذب جذبہ ہے۔ ہابی تو وہ کارآمد وسیلہ ہے جس کی مدد سے انسان حال میں رہ کر بھی ماضی کی روایات و حکایات کا مظاہرہ کرسکتا ہے۔ انسان کی ہابی کی وساطت سے ہی ماضی کا ورثہ حال کے دامن میں منتقل ہوتا ہے۔ ہابی کے طفیل ہی ماضی کے نقوش اپنے واضح اور روشن خدوخال کے ساتھ ہمارے پیش نظر ہیں۔ اگر انسان ہابی جیسے بیش بہا زیور سے محروم ہوتا تو ہمارا ماضی بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا۔ انسانی ہابی کی خوشہ چینی کے سبب ہی میوزیم آباد ہوتے ہیں۔ حال کی جھلسانے والی تمازت آفتاب، خون منجمد کرنے والی یخ بستہ ہوائیں اور جگر کے پار ہو جانے والی زمانے کی ادائیں جب ہمارے وجود کو ریزہ ریزہ کرنے لگتی ہیں تو ہم ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے میوزیم نام کے انھیں ماضی کے کھنڈروں میں پناہ لیتے ہیں جہاں حال کے سنگ ریزوں سے لہولہان ہماری حیات آفریں قوتیں از سرِ نو اپنی توانائی بحال کر کے حال سے مردانہ وار مقابلہ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتی ہیں۔

قدیم تہذیب و تمدن کی از سر نو دریافت اور جدید ترقی و تنزلی کا سہرا انسان کی ہابی کے ہی سر ہے۔ ابن بطوطہ کا سفرنامہ، مصر کے اہرام، امریکہ کی دریافت، روس کا انقلاب، بنگال کا اکال ... ماضی کے انسانوں کی ہابی کے منہ بولتے پیکر نہیں تو اور کیا ہیں اور آج بھی روبٹ، کمپیوٹر اور رنگ برنگے اسلحوں کی ایجاد، کھلے ہوئے سڑ لٹی ہوئی عصمتیں ـــ انسان کی ہابی کا ہی کارنامہ ہے۔

انسان کی ہابی کا دائرہ اتنا وسیع ہے جتنا عالمی ادب یا انسانی عرفان۔ آج کوئی بھی شخص یہ دعوا نہیں کرسکتا کہ وہ اس دائرہ میں محصور نہیں آپ لاکھ ہابی سے جان چھڑانا چاہیں لیکن وہ پیر تسمہ پا کی طرح آپ کے وجود سے چپکی رہے گی یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھانت بھانت کی ہابیاں دیکھنے اور سننے کو ملتی ہیں۔ آج کرسی سے چپکے رہنا کسی کی ہابی ہے تو کرسی چھیننا کسی کی ہابی ہے، سنہرے باغ دکھانا کسی کی ہابی ہے تو دولت کے انبار پہ سانپ کی طرح کنڈلی مارکر بیٹھے رہنا کسی کی ہابی ہے، جھوٹ بولنا کسی کی ہابی ہے تو غلط وعدے کرنا کسی کی ہابی ہے، محسن کشی کسی کی ہابی ہے تو انسان کشی کسی کی ہابی ہے، مختلف قسم کا انقباض پیدا کرنا کسی کی ہابی ہے تو مختلف طرح سے افراط پیدا کرنا کسی کی ہابی ہے، بیوقوف بنانا کسی کی ہابی ہے تو بیوقوف بننا کسی کی ہابی ہے۔ اور انسان کی یہ بھانت بھانت کی ہابیاں ہی اسے ایک دوسرے سے منفرد اور ممتاز کرتی ہیں۔ اگر آپ کے اندر ذرہ برابر بھی عقل کا مادہ ہے تو آپ اپنی ہابی کو ترقی کا زینہ بناکر بلندی تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے جال میں سونے کی چڑیا پھانس سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہابی کی کوئی قدریں نہیں ہوتیں۔ ہوتی ہیں مگر وہ موقع محل کے ساتھ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہیں۔

△△

---

* ڈاکٹر سلیمان عبداللہ
(پاکستان)

ماڈرن شاہین
(کلامِ اقبالؔ کی روشنی میں لکھی گئی ایک تحریر)

حضرتِ اقبالؒ شاہین کو بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ شاہین کے سے اوصاف ہمارے نوجوانوں میں بھی پیدا ہوں۔ انھیں اسی پرندے کی اچھی عادات اور جرأت سے بھرپور شب و روز بہت خوب لگے۔ جیسے شاہین مُردار نہیں کھاتا، اُونچی اُڑان اُڑتا ہے، اپنا خون گرم کرتا رہتا ہے، آشیانہ بنانے کو تضیعِ اوقات خیال کرتا ہے، کبھی نچلا نہیں بیٹھتا، جبن اور شکوہ کا اس کی زندگی میں نام کو دخل نہیں۔ سارا سارا دن بھی اُڑتا رہے تو کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا۔ حضرت علامہ کی خواہش تھی کہ ہر مسلمان اپنے اندر عقابی روح بیدار کرے۔ جب ایسا ہو جائے گا تو یقیناً ہر مسلمان باقی ماندہ سارے جہاں کو چڑیوں کی آماجگاہ سمجھے گا اور خاطر میں بھی نہیں لائے گا۔ صد شکر اور بار بار الحمد للہ پڑھنے کے بعد اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا ہے کہ آج کل ہمارے اندر وہ سبھی صفات تقریباً تقریباً پیدا ہو چکی ہیں جن کی آرزو حضرتِ علامہ کیا کرتے تھے۔ بس ذرا اُن کی خواہشات کا مطلب ہم نے اپنی سہولت اور طبیعت کے مطابق بدل لیا ہے کیونکہ آج کل کا جدید فقیر اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی پرانی لکیر کو نہیں پیٹتا اور نہ ہی اس پر چلتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی ایک علٰحدہ راہ متعین کرتا ہے۔

شاہین کی صفت ہے کبھی آشیانہ نہیں بناتا۔ حضرت اقبالؒ نے اس چیز کی طرف اشارہ کیا تو ہم نے اس عادت کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنا لیا لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ اکثر شاہین صفت لوگ اس دور میں اپنا آشیانہ یعنی مکان نہیں بناتے کیونکہ اس کام میں وقت اور تکلیف مسلسل کئی سال تک سہنی پڑتی ہے۔ آسان سا طریقہ اس مشکل پر قابو پانے کا یا اس مشکل کو قابو میں کرنے کا یہ ہے کہ کسی مالک مکان کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کا اسیر کریں، اس کے مُنہ بولے بھائی بنیں اور مکان کرایہ پر حاصل کرلیں۔ کرایہ نامہ کا فارم اور شرائط طے کرتے وقت انتہائی خلوص سے ایک بار بلکہ بار بار مالک مکان کو گلے لگائیں (ہو سکے تو اس کا ماتھا بھی چوم لیں کہ مستقبل قریب میں آپ کے اور آپ کے اہلِ خانہ کے لئے بہت سود مند بلکہ سود در سود مند ثابت ہوگا) ساتھ ہی یہ بھی کہہ ڈالیں۔ «آپ کو

جب دل سے بھائی کہا تو شرائط کی کیا ضرورت ہے، آپس کا اعتماد ہی تو اصل دولت ہے، آپ نے جب بھی کہا کہ مکان چاہیئے تو ہمیں بوریا بستر بغل میں لپیٹ کر دبانا ہے اور سامان سر پر رکھ کر یہ جا وہ جا ہو جانا ہے، اس لیے آپ کو تو فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ہوسکتا ہے کہ مالک مکان مروّت میں کہے۔ "حضور اس گھر کا اسی طرح خیال رکھیں جیسے لوگ اپنے گھروں کا رکھتے ہیں۔"

آپ بھی کھسیانی نہیں ہنسی سے کہیں۔ "کیوں نہیں۔ میں تو اسے اپنا ہی مکان سمجھ کر رہوں گا"

کچھ عرصہ گذر سے تو کرایہ دینا بند کردیں۔ مالک مکان زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ دیوانی عدالت میں کیس کردیگا تو کیا ہوا۔ یہ مقدمہ بہت جلد نبٹا تو پھر بھی سات آٹھ سال لگ جائیں گے۔ اس دوران مکان میں خوب آرام سے رہیں، بلا خوف و خطر توڑیں اور پھوڑیں، آپ کا سابقہ منہ بولا بھائی اور موجودہ حریف اگر مقدمہ جیت بھی گیا تو کیا ہوا؟ سامان اٹھائیں اور کسی اور شکار کو تلاش کرلیں۔ اس میں ذلت محسوس کرنے والی کون سی بات ہے کہ ؎

گذر اوقات کرتا ہے کرائے کے مکانوں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی

کلامِ اقبال میں بار بار جھپٹنے اور پلٹ کر پھر دوبارہ یہی حرکت کرنے یعنی جھپٹنے کا درس دیا گیا ہے۔ ہم ان کی اس نصیحت پر سو فی صد نہ سہی تو اسی نوّے فی صد تو ضرور عمل کرسکتے ہیں۔ انہوں نے دعا کی تھی کہ ؎

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

ہم نے اس کی تعبیر یوں پیش کی کہ جس کسی نے بھی صنعت لگائی یا جائیداد بنائی اُس کا بیڑہ غرق کر کے چھوڑیں گے۔ ان اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے رہنما اصول یہ بنائے گئے کہ جائیداد کرایہ دار کی — کارخانہ مزدور کا — زمین مزارعے کی —

جائیداد پر جو قابض ہوگیا اُسی کی ملکیت تصور ہوگی (لاکھ اس کے اصل مالک نے اسے حلال کی کمائی سے ہی بنایا ہو) کارخانہ مزدور کا ہے (سیٹھ صاحب کی ایسی تیسی) زمین مزارعے کی ہے (چودھری صاحب کو بے دخل کرکے چھوڑیں گے، ٹھیکہ لینے اب آئے تو ٹانگیں بھی توڑیں گے) شاہین کی دوسری صفات کو بھی ہم اپنا رہے ہیں۔ شاہین بلندیوں پر اُڑتے ہوئے بھی پستیوں میں اُڑنے والی چڑیوں اور اپنے شکار کو بھانپ لیتا ہے، پھر بجلی کی سی تیزی اور سرعت کے ساتھ اُسے اُچک لیتا ہے۔ ہمارے ہاں کے طاقتور بھی پستیوں میں رہنے والوں پر اسی طرح نظر رکھتے ہیں، جب چاہا نیچی پرواز کی اور اپنا شکار اُٹھا لے گئے۔

عقابی روح جب لاہور کے جوانوں میں پیدا ہوتی ہے تو اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ وہ اقبالؒ کے خوابوں کو سچ کر دکھانا چاہتے ہیں لیکن منشائے اقبال کی تکمیل کے لئے وہ ذرا مختلف طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے حلق سے نالۂ بے باک خارج ہوتا ہے جو آسمان کو چیرنے کے درپے ہوتا ہے۔ ان کی نگاہِ تیز

سارا سال اپنے تو ہمات میں اُلجھی رہتی ہے مگر بسنت کے دنوں میں آسمانوں کی نیلگوں وسعتوں میں جاکر ٹھہر جاتی ہے یہ بے چین نوجوان مینارِ پاکستان سے ملحق سبزہ زار کا رُخ کرتے ہیں۔ رنگ برنگی پتنگیں اڑاتے ہیں۔ قوتِ بازوئے مسلم ڈور لگانے اور مانجھا بنانے میں صرف ہوتی ہے، پھر اسی قوت کے بَل بُوتے پر بڑی بڑی پتنگیں دور دور تک اُڑائی جاتی ہیں۔ چیل کوّے ان سے اُلجھتے ہیں تو ملت کا نوجوان اپنی شہباز صفت پتنگ کو اور ڈھیل دیتا ہے۔ ؎

لڑا دے ممولے کو شہباز سے

شاہین بھی اپنی فلائیٹ کے دوران وہاں تک نہیں جاتا جہاں تک ہمارے جوانوں کی پتنگیں جاتی ہیں۔ ہم نے پتنگ بازی میں وہ کمال حاصل کیا کہ فضاؤں کو مسخر کر لیا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ سب نے مل کر اس پر غور و فکر کیا۔ ہم نے تو اس مقصد کے حصول کے لئے کائٹ فلائنگ اسوسی ایشن بھی بنائی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یورپ میں روشنیِ علم و ہنر بہت ہے لیکن اہلِ یورپ بسنت کی رات لاہور میں آکر دیکھیں تو دنگ رہ جائیں، شرمندگی سے اپنا منہ چھپاتے پھریں اور کوئی ماسک نہ ملے۔ اُس رات سارے شہر میں روشنی ہی روشنی ہوتی ہے۔ آخر ہوا کیا علم و ہنر کی روشنی نہ سہی سرچ لائٹ اور فلڈ لائیٹ کی ضیا ہی سہی، آخر کو روشنی تو یہ بھی ہے اور ہر کام کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوا کرتا ہے۔

حضرت علامہ کے افکار اور تصورِ شاہین سے دلی اُلفت کی بناء پر بہت سوچ و بچار کے بعد سیالکوٹ سے تین چار روز میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جانے والی چھکڑا گاڑی کا نام شاہین ایکسپریس رکھا گیا ہے۔ جیسے شاہین پرندوں کا درویش ہے اُسی طرح یہ گاڑی بھی راہبانہ فطرت رکھتی ہے۔ خانیوال میں کھڑی ہو اور لاہور سے بعد میں چلنے والی شالیمار پاس سے فراٹے بھرتی گزر جائے تو ذرا بھی مائینڈ نہیں کرتی۔ دو چار گھنٹے آرام کرنے اور پانی پینے کے بعد خیابانوں سے پرہیز کرتی ہوئی دلبرانہ ادائیں دکھاتی ہوئی پھر عازمِ سفر ہوتی ہے۔

ماڈرن شاہین اپنے گھر یعنی نشیمن سے بہت حد تک لاتعلق ہو چکا ہے، اسے گھر کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ سبزی گوشت پہنچانا ہے یا نہیں، پانی، بجلی اور گیس کے بِل ادا کئے جا چکے ہیں یا نہیں۔ اسی روش کی بناء پر اس کا نشیمن زاغوں کے تصرف میں چلا گیا ہے۔ جہاں انھوں نے خوب دھما چوکڑی مچائی ہوئی ہے۔ وہ آنریری عندلیب بن کر عیش اُڑاتے پھر رہے ہیں اور ایسا صرف شاہین صاحب کی غفلت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر یہ اپنا مقام و منصب پہچان لے، سیم و زر سے محبت چھوڑ کر اپنی اصل جگہ پر آجائے جو ستاروں سے بھی بلند ہے اور ایک ہی ضربتِ غازیانہ لگائے تو جملہ زاغ ہائے گوناگوں کائیں کائیں اور چائیں چائیں کرتے اُڑ جائیں۔ ؎

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

مگر اس دور کے شاہین کی طاقتِ پرواز بہت کم رہ گئی ہے۔ چٹانوں پر بسیرا کرنا تو دور کی بات ہے، اب یہ نیچی اُڑان اُڑ کر خضرِ سلطانی کے گنبد تک بھی نہیں جا سکتا۔ نفسانی خواہشیں اور حصولِ سامانِ تعیش کی لگن اس کے پاؤں کی زنجیر بن چکے ہیں۔ بچی کھچی ہمت کو کام میں لا کر کبھی اُڑنے کی کوشش بھی کرے تو یہ بوجھل اشیاء اس کے پاؤں اور پروں میں اُلجھ جاتی ہیں، ان ہی کی وجہ سے اسے اپنی پرواز ملتوی کر کے پھر زمین پر لینڈ کرنا پڑتا ہے۔ اپنی جولان گاہ زیرِ آسمان کی

بجائے بر لب زمین سمجھتا ہے۔ اسے تو چاہیئے کہ ایسی جست لگائے کہ اپالو گیارہ کی طرح اُڑے۔ اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھنے والے دنگ رہ جائیں اور یہ اُڑتا ہی چلا جائے، اپنی سوچوں کو زماں و مکاں کی حدوں سے آزاد کر دے تو شوکتِ رفتہ دوبارہ پا سکتا ہے۔ اب تو پھر بھی یہ بات غنیمت ہے کہ زمین کے اوپر پھرتا ہے اگر اس نے ان سامانوں سے نجات حاصل نہ کی تو اسے زمین دوز ہونا پڑے گا۔ زمانے کے شیطان عرصۂ دراز سے اسے پھانسنے کے چکر میں تھے، یہ بڑا سمجھدار تھا، ان کے نرغے میں نہیں آتا تھا۔ ہر بار انھیں غچہ دے جاتا تھا۔ ان صدیوں میں بڑی مدت کے بعد زیرِ دام آیا ہے۔

ایک روز میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ عقابِ سالخوردہ نے نوجوان شاہین کو بُلایا۔ وہ بُری طرح کھانس رہا تھا۔ شاہین جاتے جاتے اپنے بابا کے لئے کھانسی کا سیرپ سرفی کول اور ٹکیاں بھی لے گیا۔ حالانکہ بوڑھے عقاب کو ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اُسے تو سفید چمڑی والے کبوتروں اور چڑیوں کا تازہ گوشت درکار تھا۔ اُس نے شاہین کو نصیحت بلکہ وصیت کی کہ سخت کوشی کو اپنا شعار بنائے۔ کبوتر پر جھپٹ کر اس کا گوشت چٹ کرنا اصل مقصود نہیں۔ کھانا پینا تو کسی فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ سے بھی ہو سکتا ہے لیکن جو مزہ کبوتر پر جھپٹنے میں ہے وہ اس کے لہو میں نہیں اُس نے دھمکی آمیز لہجے میں شاہین کو کہا "اگر تو نے آرام طلبی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو میں تجھ سے جواب طلب کروں گا۔ پھر تو ٹائپسٹ ڈھونڈ کر جواب ٹائپ کرواتا پھرے گا تو پہلے ہی اپنے کردار کی اصلاح کر لے ورنہ تمہارے پیچھے رہائش پذیر کنجشکِ فرومایہ نشیب سے اڑکر فراز پر آجائے گی اور تجھ سے ہاتھاپائی پر اتر آئے گی۔ تُو تو جانتا ہے کہ باس اگر چپڑاسی کو 'گلے' سے پکڑ لے اور دو چار چانٹے رسید کر دے تو اس میں چپڑاسی کی نہیں باس کی بے عزتی ہوتی ہے۔ تجھے خدا نے سارے جہاں کا باس بنایا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ دسمبر جنوری کی سردی نے تمہارے لہو کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔ تمہیں ڈیپ فریزر میں لگا دیا گیا ہے، اپنے دل کو سوزِ یقین سے گرماؤ"۔

شاہین بیچارہ چونچ نیچی کئے پَر سُکیڑے گردن جھکائے شرمندگی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ عقابِ سالخوردہ نے بدقت اُٹھ کر اُسے تھپڑ مارا اور مزید کہا "میری تو اب بینائی بھی کمزور ہوگئی ہے، شائد سفید موتیا اتر رہا ہے۔ پر تیری وجہ سے تو فروغِ دیدۂ افلاک پیدا ہونا چاہیئے تو شاہینِ شہِ لولاک ہے۔ ایسا کر میری مان اور خودی کے زور پر ساری دنیا پر چھا جا ــــــ کیا ہوا جو آج کل تیرے اندر صفاتِ تیترانہ پیدا ہو چکی ہیں، تیری اصل تو شاہینی ہی ہے، تو آج ہی کسی ماہرِ امراضِ چشم سے معائنہ کروا۔ آئی ڈراپس ڈلوا یا اچھی اور موزوں نمبروں والی عینک لگوا تاکہ تیری یہ شرمیلی نگاہیں عقابی نگاہوں میں بدل جائیں۔ تو فخر سے کہتا پھرتا ہے کہ تیری آنکھیں غزالی ہیں اور جھیل جیسی ہیں، ان میں کسی کو ڈوب مرنا تو ہے نہیں، فوراً ان کی گہرائی کم کر یہ آنکھیں شعلہ بار ہونی چاہیں، ان میں بیباکی جھلکنی چاہیئے۔"

شاہین بچے نے دبی دبی زبان میں عرض کیا کہ بابا میرے دوست مجھے طعنے دیں گے، کیونکہ زندگی بتانے کا جو شیڈول آپ میرے لئے چارٹ کر رہے ہیں اس سے میری ساری دلچسپیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم سبھی دوست روزانہ یا تو بازار جاتے ہیں، چاٹ کھاتے ہیں، انارکلی میں مٹر گشت کرتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ عمر رسیدہ عقاب کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ تھری فیز کا الکٹرک کنکشن اُس کی آنکھوں میں لگا ہوا ہے۔ اُس نے شاہین بچے کو سرزنش کی۔

"ابھی ان سب چونچلوں کو چھوڑنے کا پکا اور ٹھوس عہد کر، اگر تو اپنی اِن حرکتوں سے باز نہ آیا تو تیرا جگر خراب ہو جائے گا، تجھے یرقان ہو جائے گا۔ بلبل و طاؤس کا پیچھا چھوڑ دے، کیونکہ یہ سب چیزیں ایک کھلا دھوکہ ہیں، بلبل تو صرف آواز ہے اور طاؤس فقط سنگ۔ تو ان دونوں پھیٹروں کو "فقط والسلام" کہہ کر ہمیشہ کے لئے ان سے الوداع ہو جا اور بقیہ زندگی میں جفاکشی کو اپنا شعار بنالے تو دنیا تیرے لئے تنگ ثابت نہیں ہوگی بلکہ تیرے سامنے راستے کھلے ہیں، اپنا پرانا تجسس بیدار کر جس کی بنا پر تو نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ایسی پیش قدمی کی کہ ساحلِ مکران تک آ پہنچا۔ اسپین و قبرص تیرے زیرنگیں آ چکے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اپنے نفس کی کوتاہی کی وجہ سے تو لذتِ نغمہ میں کھو گیا اور ارضِ فلسطین گنوا بیٹھا" شاہین نے جینز کی پینٹ اور ڈھلکتے شانوں والی جرسی زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس نے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی اور پھیکی ہنسی ہنستا چلا گیا۔ بوڑھے عقاب کی جھلاتی نظریں اور کھانسنے کی آواز اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

آج کا شاہین واقعی ایسا تخیل انگار بن چکا ہے کہ اپنے احوال ہی بھلا بیٹھا ہے۔ ایک وہ دور تھا کہ بیاباں کی خلوت اسے خوش آتی تھی، آب و دانہ سے کنارا کیا کرتا تھا۔ اب ڈرائنگ روموں کی جلوت اور بانہوں کے دائروں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک وہ دور تھا کہ یہ شکارِ زندہ کی لذت سے اپنے کام و دہن کو تسکین پہنچایا کرتا تھا اک یہ سماں ہے کہ خود دوسروں کی تسکین کا سامان بن چکا ہے۔ اس کی حیثیت اب باز و عقاب کی بجائے اس بھنے ہوئے تیتر کی سی بن چکی ہے جسے ابوالعلا معرّیؒ کے روبرو خوانِ تر و تازہ میں سجا کر بھیجا گیا تھا۔ کاش اس کی آنکھ فطرت کے اشارات دیکھتی تو اپنے گناہوں کی مکافات یوں اس کے سامنے نہ آتی کیونکہ جرم ضعیفی ایک ایسا سنگین گناہ ہے جس کی پاداش میں اسے اک نہ اک دن روسٹ ہو کر غیروں کے ڈائننگ ٹیبل کی زینت بننا ہی تھا۔ --

---

غزلیں

رؤف رحیم
حیدرآباد

دل لبھاتے ہوئے فقرے نہیں اچھے لگتے — اردو والوں کو یہ وعدے نہیں اچھے لگتے
مفلسی میں کبھی آٹا نہیں گیلا کرنا — ہاں ضعیفی میں یہ نخرے نہیں اچھے لگتے
گود میں کتے بٹھاتے ہیں وہ لیکن اُن کو — گھر کی دیوار پہ کوّے نہیں اچھے لگتے"
کوئی لیڈر ہو جو دُبلا تو بُرا لگتا ہے — اور شاعر جو ہیں موٹے نہیں اچھے لگتے
گر کھلاڑی ہو تو میدان میں جاؤ بیٹا! — گھر کے دالان میں چھکے نہیں اچھے لگتے
دال، چٹنی ہی مزا دیتی ہے ہم کو لیکن — ہم کو مانگے کے پسندے نہیں اچھے لگتے

کچھ نئی بات کہا کیجئے شعروں میں رحیم
لیلےٰ مجنوں کے یہ قصے نہیں اچھے لگتے

○

غالب ثانی

کیا قحط میں پانی کے ہے قدرت کا خزانہ — رُک رُک کے جو برساتے ہیں معلوم نہیں کیوں
زن عمرِ خضر پاتی ہیں شوہر مگر ان کے — کچھ جلد ہی مر جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں
معقول ہے تنخواہ تو پولس کے جواں کی — معمول بھی ٹرخاتے ہیں معلوم نہیں کیوں
مہ رخ جو سرِ رہ کبھی کھو جاتے ہیں اکثر — تھانے سے نکل آتے ہیں معلوم نہیں کیوں
تلگو میں سبھی کہتے ہیں بیوی کو بھی اماں — اور کہتے چلے جاتے ہیں معلوم نہیں کیوں
ابجد کے یہ استاداں یہ جوڑوں کے غلاماں — استاد بھی کہلاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

جو دیکھتے ہیں غالب خوش خط کے نمونے
تب رقص میں آجاتے ہیں معلوم نہیں کیوں

خامہ بگوش

(پاکستان)

وہ دیکھنے میں جتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں
برتنے میں اتنے ہی اس کے برعکس ہیں

طنز و مزاح کانفرنس کے حوالے سے جن ہندوستانی ادیبوں نے کراچی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازا، ان سب پر اگر فرداً فرداً کالم لکھے جائیں تو اس کام کے لیے عمر نوح درکار ہوگی۔ بفرضِ محال اگر ہمیں عمر نوح مل جائے تو اس کے بھی ضائع جانے کا اندیشہ ہے کیوں کہ معزز مہمانوں کی خوبیوں کا ذکر کرنے سے پہلے ان خوبیوں کو تلاش کرنے میں جان کھپانی ہوگی ہمیں اپنی جان کی تو پروا نہیں، لیکن معزز مہمانوں کے حوالے سے کسی کوشش میں ناکام ہونا ہمیں گوارا نہیں۔ بہرحال آدابِ میزبانی کے تحت کچھ نہ کچھ تو لکھنا ہی ہوگا۔ لہٰذا عرض ہے کہ بیشتر مہمانوں کا تعلق مرحوم ریاست حیدرآباد دکن سے ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کی طرح اس خطے کا تعلق بھی ہمارے ثقافتی ماضی سے ہے۔ دکنی مہمانوں سے مل کر دکنی تہذیب اور وضعداری کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے چار مینار، موسیٰ ندی اور ڈاکٹر زور والا حیدرآباد یہیں کراچی میں ہے۔

مہمانوں میں ڈاکٹر حبیب ضیاء اور ڈاکٹر رشید موسوی جیسی پڑھی لکھی خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انھیں مزاح بھی عزیز ہے اور تحقیق سے بھی لگاؤ ہے۔ ہمارے علم کی حد تک ان کی ایک ایک مزاحیہ اور ایک ایک تحقیقی کتاب شائع ہو چکی ہے چونکہ ہمارا علم ناقص ہے اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مزاح کس کتاب میں ہے اور تحقیق کس میں ہے۔ اگرچہ اہلِ تحقیق کو الگ سے مزاح لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے باوجود ان خواتین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سنجیدہ اور غیر سنجیدہ کام بیک وقت انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء نے دکنی قواعد پر تحقیق کی ہے اور ڈاکٹر رشید موسوی نے دکن میں مرثیہ گوئی اور عزاداری پر ضخیم مقالہ لکھا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں۔ یہ اتنی ثقیل ہیں کہ اب ہماری نظر اس قابل نہیں رہی کہ اس کے سامنے کوئی چیز گزرے۔

حمایت اللہ دکن کے مشہور شاعر ہیں اور اپنی بیگم ڈاکٹر رشید موسوی کے ساتھ بطور نادِ سفر تشریف لائے ہیں۔

حمایت اللہ دکنی زبان میں نہایت عمدہ مزاحیہ شعر کہتے ہیں۔

ان کی مزاحیہ شاعری کے عمدہ ہونے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی بیگم نے مرثیے اور عزاداری کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔

مصطفیٰ علی بیگ بھی شاعر ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح اردو میں انگریزی الفاظ کی ملاوٹ

سے شعر کہتے ہیں۔ پڑھتے بھی خوب ہیں، ہر غزل کے مزاج کے مطابق ترنم ہوتا ہے۔ گویا مزاحیہ شاعری کے انتخار امام صدیقی ہیں جنھوں نے غزل کی گائیکی میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ افتخار امام اور مصطفیٰ علی بیگ میں یہ قدرِ مشترک بھی ہے کہ یہ دونوں صرف اپنی غزلیں گاتے ہیں، دوسروں کی نہیں۔

مصطفیٰ علی بیگ اور حمایت اللہ ل کر مزاحیہ خاکے بھی پیش کرتے ہیں۔ ایسے ایسے سوانگ بھرتے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اصل کام ان دونوں کا یہی ہے۔ شاعری کو اضافی خوبی سمجھنا چاہیے۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اردو کے نوے فی صد شاعروں کی طرح یہ بھی شاعری کا سوانگ بھرتے ہوں۔

بمبئی کے فیاض احمد فیضی ایک نوجوان مزاح نگار ہیں مگر یہ صرف نوجوان نہیں اور بہت کچھ بھی ہیں انھوں نے طنز و مزاح کانفرنس میں ایک خوبصورت مضمون "پھلوں میں رنگ بھرے" پڑھ کر جو اثر قائم کیا تھا، اسے خود ہی اپنے ایک دوسرے مضمون کے ذریعہ نہایت خوش اسلوبی سے زائل کر دیا۔ یہ مضمون بمبئی کی لڑکیوں کے بارے میں تھا جو غالب لائبریری کی اس تقریب میں پڑھا گیا تھا جو ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی۔ اس مضمون میں فیضی صاحب نے بمبئی کی لڑکیوں کا اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ جیسے وہ کراچی پہنچ کر نوجوانی کی حدود میں داخل ہوئے ہوں اور اپنے بچپن کے بمبئی کی یادوں کو تازہ کر رہے ہوں۔

رسالہ "شگوفہ" حیدرآباد دکن کے مدیر مصطفیٰ کمال بھی مہمانوں میں شامل ہیں۔ وہ طنز و مزاح نہیں لکھتے، طنز و مزاح پر لکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ نقاد اور ادبی مورخ ہیں۔ اپنے رسالے کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ ادب کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اس رسالے کا معیار خاصا بلند ہے کیوں کہ کبھی کبھی اس میں ہمارے کالم بھی نقل ہوتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نقل کے لیے جتنی عقل کی ضرورت ہوتی ہے اتنی مدیر موصوف میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ "شگوفہ" کے کئی خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ "ہندوستانی مزاح نمبر" اور "مجتبیٰ حسین نمبر" ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ مصطفیٰ کمال نے انھیں بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ طنز و مزاح کانفرنس میں مصطفیٰ کمال نے ایک بڑا اچھا مقالہ دکن کے طنز و مزاح پر پڑھا۔ بعد کی محفلوں میں وہ مہمانوں کی طرف سے میزبانوں کا شکریہ ادا کرنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ شکریہ وہ اس طرح ادا کرتے تھے جیسے اپنے سر سے کوئی بوجھ اتار کر سننے والوں کے سروں پر رکھ رہے ہوں۔

ہمارا ارادہ "شگوفہ" کے مجتبیٰ حسین نمبر پر تبصرہ کرنے کا تھا لیکن اب جبکہ خود مجتبیٰ حسین یہاں تشریف لائے ہیں تو کیوں نہ خود انھیں پر تبصرہ کر دیا جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ پاکستان میں بے حد مقبول ہیں! ان سے ملنے کے لیے لوگ اس طرح بے چین نظر آتے ہیں جیسے مجتبیٰ حسین ادیب نہ ہوں فلم اسٹار ہوں۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں سے تو ہم واقف ہی تھے، لیکن شخصیت کے جادو سے پہلی مرتبہ آگاہی ہوئی۔ بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ گفتگو ایسی شگفتہ ہوتی ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ شفیقہ فرحت کا کہنا ہے کہ مجتبیٰ حسین اتنے خوش گفتار ہیں کہ وہ جھوٹ بھی بولتے ہیں تو سچ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے پوچھا اور جب وہ سچ بولتے ہیں تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ محترمہ نے فرمایا "اس کا ہمیں تو کیا خود مجتبیٰ حسین کو بھی تجربہ نہیں ہے۔"

مجتبیٰ حسین کی آٹھ دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں شخصی خاکوں کے دو مجموعے اور ایک سفرنامہ "جاپان چلو"

بھی شامل ہے۔ یہ ساری کتابیں خاصی مقبول ہوئی ہیں اور ان کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی مقبولیت کا سبب بقول ڈاکٹر مغنی تبسم یہ ہے کہ وہ "بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ ان کا موضوع انسان ہے اور وہ انسان کو سماج کے جو کھٹے میں دیکھتے اور پیش کرتے ہیں۔ انھیں واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے ان کا مشاہدہ جزئیات بین ہے اور اسی وصف کو کام میں لاکر کسی واقعے کے مضحک پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات بھی ان کی نظر سے نہیں چوکتے۔ سماج کے مختلف طبقوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرز زندگی، ان کے مسائل اور ان کے مخصوص رویّوں عادتوں اور خصائل کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ کسی واقعے کو محسوس بنا کر پیش کرنا اور کسی کردار کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا مجتبیٰ حسین کے فن کا خاص وصف ہے۔"

ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب نظر نقاد ہیں، اسی لیے انھوں نے یہ تو بتا دیا کہ مجتبیٰ حسین نے افراد کے طرز زندگی مسائل عادتوں اور رویوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ مجتبیٰ حسین کو کتابوں کے مطالعے سے بھی دلچسپی ہے یا نہیں۔ یہ ہم بتائے دیتے ہیں۔ چند روز ہوئے ہماری موجودگی میں ایک جفادری نقاد ان سے ملنے کے لیے آئے مجتبیٰ حسین کے اپنی چند کتابیں انھیں پیش کیں۔ جناب نقاد نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر اپنا تنقیدی مجموعہ مجتبیٰ حسین کی نذر کیا۔ جب وہ چلے گئے تو مجتبیٰ حسین نے یہ تنقیدی مجموعہ ہمیں دے دیا اور کہا "اینٹ کا جواب پتھر سے دینا بڑی اچھی بات ہے لیکن نقاد صاحب نے کچھ ضرورت سے زیادہ بھاری پتھر لڑھکا یا ہے لہٰذا اس پتھر کو چوم کر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے ویسے بھی ہوائی جہاز کے سفر میں اتنی وزنی چیز کو ساتھ لے جانا مناسب ہوگا۔"

یوسف ناظم بلاشبہ عمر اور فن کے اعتبار سے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سراپا انتخاب ہے۔ وہ ایسے ایسے موضوعات ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ ان کی تلاش پر حیرت ہوتی ہے اور ان موضوعات پر جس طرح وہ لکھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہنی افق بے حد وسیع ہے۔ وہ دیکھنے میں جتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں، برتنے میں اتنے ہی اس کے برعکس ہیں۔ ہمیں تو ان سے بات کرتے ہوئے خوف آتا ہے کہ نہ جانے کیا کچھ سنا پڑ جائے ان کا کوئی جملہ بے مقصد نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی کی شامت اعمال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین اپنے بڑے بھائی کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے۔ ایک محفل میں ان کے بھائی بھی موجود تھے، اس لیے مجتبیٰ حسین کو سگریٹ پینے کے لیے کئی مرتبہ کمرے سے باہر جانا پڑا۔ اس پر یوسف ناظم نے کہا "یہ اپنے بھائی کے سامنے سگریٹ نہیں پیتے لیکن اپنی کتابیں چھپوا کر انھیں پیش کر دیتے ہیں جو زیادہ شرمناک کام ہے۔"

یوسف ناظم کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ۲۵ سال پہلے جب ان کا مجموعہ مضامین "کیف و کم" شائع ہوا تھا تو کرشن چندر نے اس کے دیباچے میں لکھا تھا "ان کی ظرافت کا معیار متعین، شائستہ اور مہذب ہے جو بلند بانگ دیہاتی قہقہوں کے بجائے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتا ہے اور ہنسوڑ ہونے کے بجائے خوش خنداں ہونے پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس طرح قاری کے ذہن کو غور و فکر کی طرف مائل کرتے ہوئے اس مرکزی بات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو ہنسی کے پردے میں کہی گئی ہے۔ اختصار کے فن میں وہ پطرس کے قریب ہیں اور اپنے اسلوب کے مزاج کے اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں مدرسۂ فکر ایک دوسرے

سے اس قدر الگ الگ اور دور دور ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ یوسف ناظم نے کیسے ان دونوں کی خوبیوں کو اپنی تحریر میں یکجا کر دیا ہے کہ وہ بالکل ایک نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔"

یہ ۲۵ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد تو یوسف ناظم نے فکر و فن کے اعتبار سے جو مرحلے طے کئے ہیں، ان کے پیش نظر وہ خود ایک مدرسۂ فکر بن گئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ جملہ پڑھ کر مجتبیٰ حسین ضرور یہ کہیں گے کہ "فکر" کا لفظ "فکر و تشویش" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ □ ■

• انیس سلطانہ
(بھوپال)

مرزا غالب
اور
اکیڈمی کا انعام

مرزا کو ساہتیہ اکاڈمی (میرتقی اوارڈ) ملنے والا تھا۔ ان سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوسکتا ہے۔ اِدھر دربار شاہی سے نجم الدولہ، دبیرالملک، نظام جنگ کے خطابات ملے تو اُدھر آزاد ہندوستان نے بھی ان کی پذیرائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حالانکہ اب ان میں مال و منال کی طرف سے کچھ عجیب سی بے نیازی کی شان پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہ اکثر یہ کہتے پائے گئے تھے کہ ؎

زر سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یعنی بس اتنا پیسہ چاہیئے تھا کہ شراب عیش کے نشہ کی سرشاری برقرار رہے۔ کلکتہ کا سفر بھی اسی لئے کیا تھا۔ مہاجن کار تو قرض کے بدلے میں پوری کمائی کا حقدار ہوا جارہا تھا۔ اور اندرونِ خانہ کا حال مرزا کسی سے نہیں کہہ سکتے تھے۔ امراؤ بیگم اسی قدر چڑچڑی ہوگئی تھیں۔ پڑوسیوں کے گھر میں عیش و آرام کے سارے اسباب مہیا تھے، اور یہاں بس اللہ کا نام۔ وہ بھی بُری عادتوں کی وجہ سے کا جبھی ہی ہو پاتا تھا۔ مدت سے مرزا سے ان کی ان بن تھی۔ اک شاعری رہ گئی تھی، اسی کے ذریعہ دل کی بھڑاس نکال سکتے تھے۔ سو انھوں نے ایک غزل کہی ضرور، گنگناتے رہے، لیکن بیگم منہ موڑے بیٹھی رہیں۔ ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

عداوت پر مرزا کو یاد آیا کہ ایسا کچھ ہوجائے کہ بیگم سچ مچ ان پر مقدمہ دائر کردیں۔ اور نان نفقہ کے بہانے خاندانی پنشن بحال ہوجائے۔ لیکن بیگم اس پر بھی راضی نہ ہوئیں۔ مرزا بس غزل کہہ سکتے تھے، اس لئے کہتے رہے۔ ؎

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوئی

اب مرزا نے آسودگی کے دوسرے قرینے سوچے۔ اپنے پرانے، بوسیدہ دیوان کے مسودہ کو بغیر کانٹ چھانٹ کے بھوپال روانہ کیا، کہ حالیؔ بھی یہی کہہ رہے ہے کہ ابھی بھوپال، فرنگیوں کی زبردستیوں، چیرہ دستیوں اور ہر قسم کی دستیوں سے پاک ہے اہلِ بھوپال نے ان کے دیوان کو آنکھوں سے لگایا، اسے الہامی کتاب قرار دے کر وید مقدس کے ہم پلہ رکھ کر طاقِ نسیاں میں اس طرح مزین کر دیا جیسے خود چاروں ویدوں کو۔ پھر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ویدک احیاپرستی کی کوششوں میں ایک پیرِ شفیق، بزرگوار و ادب دوست کی دیمک زدہ الماری میں کسی طرح یہ پرانی، بوسیدہ تحریر درآئی۔ اس کا پتہ پیرِ بزرگوار کو اس وقت چلا، جب کسی طرح عالم بالا سے فرشتوں نے مرزا کو اطلاع دی، اور انھوں نے راتوں رات ایمرجنسی میٹنگ بلائی نیسز اس دیوان کو ان شفیق ہاتھوں سے رہائی دلائی اور اہلِ بھوپال کی سوئی ہوئی عقیدت کو جھنجھوڑ دیا۔ اب کیا تھا، سوئی ہوئی محبت اپنی تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ تازہ ہوگئی۔

چنانچہ اس بار، اکیڈمی کے میرتقی میرؔ ایوارڈ کے لئے دانشوروں کو واقعی دانشمند سمجھ کر مشورے لئے گئے۔ بیالٹ پیپر سیکرٹ رکھے گئے تھے۔ ہر ایک سے تین تین فنکاروں کو نامزد کرنے کے لئے کہا گیا۔ دانشوروں میں سے ہر ایک نے مرزا کا نام سرِفہرست رکھا اور باقی دو نام دوسرے لوگوں کے تھے۔ اسی لئے اتفاقِ رائے سے مرزا کے نام کا اعلان کر دیا گیا۔

مرزا دل ہی دل میں، صلہ اور ستائش سے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن بظاہر اک شان بے نیازی سے یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ ؏

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جلسہ کے انعقاد کے لئے اپنی سخن پرور حکومت نے خوب ہی اہتمام کیا تھا۔ ہر گوشہ سرو چراغاں کی داد دے رہا تھا اور ہر ذرہ تمثال دار تھا۔ مرزا خراماں خراماں ہال میں داخل ہوئے۔ طائرانہ نگاہ سے ہال کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی جنبش نہیں، کوئی تحریک نہیں، ہائے غالبؔ، وائے غالبؔ کرنے والا نہیں، کوئی ان کے استقبال کے لئے اٹھا تک نہیں۔ بہرحال، سامنے کی کرسیوں میں سے ایک پر جگہ پا کر مرزا بھی براجمان ہو گئے۔ حاضرین باتمکین کے ساتھ بیٹھے بیٹھے دو گھنٹے ہو گئے۔ جلسہ تھا کہ شروع ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گرماگرمی سے سیاست پر باتیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں، بیچ بیچ کی گرمی کا بھی ذکر تھا۔ نہ فراشی تھے نہ خس کی ٹٹیاں، مرزا نہایت حیران کہ پھر یہ ٹھنڈک کیسی ہے۔ پھر اسے اپنی ہی سرد مہری سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ کسی نے انھیں نہیں پہچانا، صدیوں کی گرد سے یادیں بھی پشیماں ہو چلی تھیں، مرزا سوچ رہے تھے۔ ؎

جس شخص کے جلو میں ہزاروں نقیب ہیں
وہ گم ہوا ہے بھیڑ میں، یہ مانتا ہے کون

کپڑے تو خیر انھیں نئے مل گئے تھے۔ ایسے جلسہ کے شایانِ شان تو نہ تھے، لیکن سوال تو وضع داری کا تھا۔ اچکن پہنے، ادائے شاہانہ سے مرزا وہاں وارد ہوئے۔ لیکن ان کی ٹوپی اس زمانہ میں کہیں نہ مل سکی۔ اور بغیر ٹوپی کے کوئی انھیں پہچاننے کو تیار نہ تھا۔ سرے سے ٹوپیوں کا فیشن ہی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ پگڑی اچھالنے کا زمانہ تھا۔

جس زمانہ میں وقت کی قدر اور پابندی کے راگ الاپے جا رہے ہوں، اس زمانہ میں اتنا طویل انتظار، ایسا تو انھوں نے کبھی کسی مہ لقا کے لئے بھی نہ کیا ہوگا۔ مگر انعام بُری بلا ہے اور وہ بھی زرِ نقد مرزا کُڑکے رہے، اندر ہی اندر کھولتے رہے اور ہنس ہنس کر لوگوں سے بولتے رہے۔

ارے خود میر ہوتے تو کب کے اُٹھ کر چل دیئے ہوتے۔ زندہ دل، مرزا کو لوگوں سے تعلقات نباہنا خوب آتا تھا۔ رگِ ظرافت جو پھڑکی تو پاس والے کا تعارف حاصل کرنے کو جی چاہنے لگا۔ وہ حضرات بھی نہایت گھاگ تھے۔ کہنے لگے۔ " ہم وی۔ آئی۔ پی ہیں۔ اگر ہمارے یہاں بیٹھنے پر آپ کو اعتراض ہو تو آپ خود اُٹھ جائیے۔ ہماری سیٹ تو ریزرو ہے"۔ مرزا نہ وی۔ آئی۔ پی سمجھے، نہ ریزرو، لیکن بہر حال، تیور تو سمجھ ہی گئے۔ زیرِ لب بولتے رہ گئے۔ ؎

مگر ان کا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور ان صاحب کو سنانے کو ذرا زور سے یہ شعر پڑھا ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

وی، آئی، پی صاحب کچھ پشیمان تو ہوئے مگر اپنے بشرہ سے شرمندگی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ مرزا نے دوسری طرف دیکھ کر پوچھا، آخر جلسہ شروع کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ وہ شاید وی، آئی، پی نہ تھے۔ اس لئے مرزا کو جواب مل گیا کہ جناب وزیر کی آمد آمد کا انتظار ہے۔ اور معتمدِ خاص انھیں لینے روانہ ہو چکے ہیں۔

آمد اور آورد کے اس چکر میں باتوں ہی باتوں میں مرزا کو پتہ چلا کہ جناب وزیر کھیلوں کے بڑے شائق ہیں اور مرزا کی اس غزل سے تو انھیں والہانہ عقیدت ہے۔ ؏

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

یہ کہ آج بھی محترم کسی کھیل کا افتتاح کرنے گئے ہوئے ہیں۔ کھیلوں کا افتتاح، مرزا کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا۔ کیونکہ انھیں تو چوسر کے شغف نے ہمیشہ تباہ رکھا تھا۔

مرزا دل ہی دل میں مشتاقِ دید ہوئے جا رہے تھے۔ لیکن بے نیازی سے بیٹھے رہے، مبادا اس اشتیاق کا اظہار نہ ہو جائے۔ سوچ رہے تھے کہ جن کے انتظار میں گھنٹوں بیٹھنا پڑا ہے، وہ خود کس شان سے آئیں گے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

سپاس نامہ کے طور پر ایک غزل بھی لکھ کر لائے تھے۔

ہال کے دروازہ کے پاس، ذی وقار حضرات، قطار باندھے فرشِ راہ ہونے کو تیار تھے۔ نقیبوں کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ان قطاروں میں کچھ کچھ ہلچل ہوئی۔ ہلچل کے قدم اندر اور اندر آتے چلے گئے۔ کچھ لوگ کُرتا۔ پاجامہ پہنے نہایت سادہ وضع میں اندر آئے۔ مرزا بڑے خوش ہوئے۔ میر کے نام کا انعام ہے، اسی سادگی کی ضرورت تھی۔ خدید

موصوف بھی سر سے پیر تک کھادی میں غرق تھے۔ مرزا نے انھیں قیافہ سے پہچانا۔ کیونکہ ان کے سر پر ٹوپی تھی۔ اس وقت مرزا کو کلاہِ پپاخ کے نہ ہونے کا بڑا دکھ ہوا۔ انھیں بھی دیکھتے ہی لوگ پہچان جاتے۔ کاش۔ اے۔ کاش۔

ناظم جلسہ نے کھڑے ہو کر وزیر موصوف کے قیمتی وقت کے اس طرح برباد ہونے پر شرمندگی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ان کی اُردو دوستی، اور اُردو پرستی کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ جناب وزیر کے ساتھ اکیڈمی کے کچھ اور اہم عہدیداروں کو اُوپر آنے کی دعوت دی گئی۔ ان سب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ آخر میں مرزا کو بھی اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی اور وصنیواد کیا گیا۔

مرزا نہایت پُر وقار انداز سے اسٹیج پر تشریف لے گئے۔ حاضرین جلسہ نے تالیاں بجائیں۔ جناب وزیر نے بھی کنکھیوں سے مرزا کو دیکھ لیا۔ مرزا کی کرسی۔ وزیر صاحب کے برابر ہی تھی اور پورے وقت وہیں رہی۔ وزیر موصوف کے علاوہ، دیگر عمائدینِ شہر کی بھی گلپوشی کی گئی۔

اور اب جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔ مرزا کی ہی ایک غزل، نہایت دلکش انداز میں سامعہ نواز ہوتی رہی۔ اور جب یہ شعر ان کے کانوں میں پڑا تو عجیب وجدانی کیفیت طاری ہوگئی ؎

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے، دکھلائیں کیا

وزیر موصوف، اتنی دیر تک ایک زاویہ سے بیٹھے بیٹھے تنگ آ چکے تھے۔ انھوں نے پہلو بدلا اور ہاتھوں کی کمانوں کو ٹیکیٹر کر ایک ہاتھ اپنی کُرسی پر اور ایک مرزا کی کُرسی کے پُشتہ تک لے جا کر دم لیا۔ مرزا کی جھلاہٹ عروج پر تھی وزیر موصوف کا جوتا، مرزا کے منھ کی طرف تھا۔ کوئی اور ہوتی تو مرزا، لگن لے آتے اور اس بت سیمیں کے پاؤں دھلانے لگتے۔ لیکن نہ وہ پاؤں رہے نہ جذبے اور ان کی سرشاریاں۔ وزیر موصوف کچھ ایسے بیٹھے تھے کہ ایک پاؤں سے فرش خاک کو نواز رہے تھے اور دوسرا پاؤں، نصف آغوش بناتے ہوئے مرزا کی طرف رخ کئے بے نیازی سے دھرا تھا۔ ہاتھوں کی طرف دیکھنے کا موقع نہ تھا کہ وہ پاؤں جوتوں سمیت، آنکھوں میں گھُسے جا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے مرزا سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ اس بیچ میں کیا کیا کہا گیا۔ انھوں نے کچھ نہیں سُنا۔ دماغ میں ہتھوڑے چل رہے تھے۔ اور شائستگانِ قوم کی ناشائستہ نشست کا انداز انھیں دل ہی دل میں خون کے آنسو رُلاتا رہا۔ ایک آدھ لفظ ان کے کانوں میں پڑا ضرور، لیکن دل گرفتہ، قفل بے کلید ہی رہا۔

مرزا کے ساتھ، اکیڈمی نے اور لوگوں کو بھی نوازا تھا۔ لیکن مرزا اس بھیڑ میں اپنے کو تنہا سمجھ رہے تھے۔ وہ ایسے یارباش قسم کے آدمی اور یہاں سخن فہموں کے نام پر اللہ کا نام۔ اب جو مرزا سے کچھ سنانے کی فرمائش ہوئی تو مرزا اور بھی دل برداشتہ ہوئے۔ جو غزل وہ لکھ کر لائے تھے، اسے نذرِ محفل کرنے کو جی نہ چاہا۔ اور اپنی وہی پرانی غزل پڑھنا شروع کی ؎

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

مجمع میں سے آواز آئی — "پرانی نہیں چلے گی"
کہیں سے اصرار تھا — "نئی سنیں گے —"

مرزا جھلا کر اسٹیج سے اُترنا چاہتے تھے کہ ذمہ دار کارکنوں نے انھیں منا کر دوبارہ ڈائس پر کھڑا کر دیا۔ اور مرزا کو اکیڈمی کا وہ انعام، سو بھر لفافہ میں کہ جس کا اوپر کا حصہ سبز اور زیریں حصہ زرد تھا، اور بیچ کے قرطاس ابیض پر چرخ کج رو نقش تھا، جناب وزیر کے دستِ مبارک سے عطا کیا گیا۔ فوٹو گرافر نے انعام لیتے وقت کی تصویر اتار ہی لی جس میں وزیر موصوف کا مکمل سراپا اور مرزا کا تیس فیصد زاویہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور کہ جس میں مرزا خود اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتے تھے۔ آخر میں مرزا نے شکریہ کے طور پر اپنی یہ غزل سنائی سے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

مجیب الرحمٰن بزمی
(رانچی)

آدھی غزل

اُس کو لا کر کھڑا کرے کوئی
"میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی"
نین کا تیر، قتل کا ساماں
"ایسے قاتل کو کیا کرے کوئی"
یہ بھی اک طرزِ خود کلامی ہے
"کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"
قید کرلو اسے نگاہوں میں
"نہ کہو گر بُرا کرے کوئی"
دعوتِ وصل جو کرے منظور
"دل میں ایسے کے جا کرے کوئی"
قول غالبؔ کا ہے میاں بزمیؔ
"بخش دو گر خطا کرے کوئی"

جھاپڑ ناگپوری

غزلیں

قرض مجھ کو پٹھان مت دینا
سر پہ بھاری چٹان مت دینا
اپنے ٹیچر کو مان مت دینا
تم پڑھائی پہ دھیان مت دینا
لون پر لون لے حکومت سے
پر بھکاری کو دان مت دینا
اچھا لگتا ہے ایک کو دینا
ہر کسی کو زبان مت دینا
عشق میں پھر لڑائی کرلینا
فیل ہونے پہ جان مت دینا

یوسف یکتاؔ
سکندرآباد

غزل

تم باتوں کو چھوٹی نکو سمجھو
باتوں باتوں میں لاکھوں کی جان گئی نا
سر جی پو پلاسٹک کی ماٹی پڑے
روپ بدلا بھی تو پہچان گئی نا
بارہ بُوبل پو بھائی پاشا کے
بھابی بیگم میری قربان گئی نا
شیخیاں کیسے کیسے بگھارا تھا
نکٹے پاشا کی محفل میں شان گئی نا
ساس سسرے نہ ملنے تو کیا یکتاؔ
میرے منّے کی ماں تو مان گئی نا

اختر امام انجم
سہسرام۔ بہار

اُلفت کی دکاں عشق کے بازار ہیں جمن
اے جنسِ گراں تیرے خریدار ہیں جمن
ہر روز کیا کرتے ہیں ہر شخص کی غیبت
کچھ ایسی خطاؤں کے گنہگار ہیں جمن
جورُو کی غلامی کا شرف ان کو ہے حاصل
احباب کے نزدیک طرح دار ہیں جمن
چھپواتے ہیں ہر سال نیا ایک کیلنڈر
خود اپنے لیے دردِ سر آزار ہیں جمن
بے چین تو رہتے ہیں بہت دردِ کمر سے
جورُو کے مگر پھر بھی پرستار ہیں جمن

ڈاکٹر سید محمد ظفر امام (نظام پوری)
(نیو یارک، یو ایس اے)

ہوسکتا ہے یہ لفظ آپ کی طبعِ نازک پر گراں گزرے، مگر کبھی کبھی جس طرح ایک آدمی سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح کسی لفظ کا بوجھ دل و دماغ پر دیر تک قائم رہتا ہے۔ ان کا قصّہ بھی ایسا ہی ہے اس "مقدس ہستی" کو تلاش نہیں کرنا پڑتا، وہ آپ کو تلاش کر لیتی ہے۔

عموماً کوتاہ قد، سیاہ داڑھی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے کھدر کا کُرتا پائجامہ زیبِ تن کئے، چھوٹا منہ بڑی بات کرتے ہوئے آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے، ان کی یہی مشغولیت ہے، یہی ذریعہ معاش اور مقصدِ زندگی بھی۔ آج یہاں تو کل وہاں نظر آئیں گے، جس کے ساتھ ہوں گے اس کی تعریفوں کے پُل باندھتے چلے جائیں گے۔ اور چلتے پھرتے مقامی لیڈروں سے لے کر منسٹروں تک ہر ایک کے آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف نظر آئیں گے، مسکرائیں گے۔ خاموشی ان کی توہین ہے، اس لیے بولتے جائیں گے ــــ اپنی لفاظی سے پُل اور سڑکیں بنائیں گے، اسکول، کالج اور اسپتال بنائیں گے الیکشن لڑائیں گے اور اسکول، کالج اور اسپتال کے لیے چندہ کے لیے ہر در اور ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور آپ سے ہمیشہ مسکرا کر باتیں کریں گے۔ کبھی وہ لیڈروں کی تعریف میں آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور کبھی خود لیڈروں کی رہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ ان کے لیے ٹرین میں بستر لگاتے اور اسٹیشن پر چائے اور پان تلاش کرتے نظر آئیں گے اور کبھی ایر پورٹ پر 'وِداع' اور 'سواگت' کرتے نظر آئیں گے۔

کب کہاں ہوں گے یہ کون جانے، کبھی کسی کی کار کی اگلی یا پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اور کبھی قائدینِ قوم کے ڈرائنگ رُوم کی زینت بن کر اور کبھی ان کے گھر کا ہر چھوٹا بڑا کام نپٹا کر یہ مسرور نظر آتے ہیں۔

ان کو کسی کام سے عار نہیں اور کسی کام کو "بے کار" نہیں سمجھتے حالاں کہ ساری عمر بے کار ہی رہتے ہیں مگر مشغولیت ایسی دکھاتے ہیں کہ کیا ملک کے صدر یا وزیرِ اعظم کی مشغولیت ہوگی ــــ ان کی آنکھیں ہمیشہ تعریف اور موقع کی متلاشی رہتی ہیں۔

آپ کو کوئی کام کروانا ہو، وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔ ذہنِ مبارک کو مختلف طریقوں سے کھول اور بند کر کے دشواریاں بھی سنائیں گے اور اس کا حل بھی بتا دیں گے، آپ کو ٹرانسفر کرانا ہے، ترقی کی منزلیں طے کرنی ہیں،

امتحان میں بچوں کے لیے نمبر حاصل کرنا ہے، قرض لینا ہے، قرض کی ادائیگی سے بچنا ہے، کون سا کام ہے جو، وہ نہیں کرسکتے اور "یقین محکم اور عمل پیہم" کے یہ پیکر آپ کے لیے سب کچھ اور بہت کچھ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ان کی باتوں میں، باتوں کے انداز میں ایک جادو ہوتا ہے ـــــ ایک عام انسان کا اعتبار حاصل کرنا، ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں، ان سے ملئے تو یہ احساس ہونے لگتا ہے جیسے ان کے وجود سے ہی یہ کائنات متحرک ہے۔

اپنی مشغولیت ثابت کرنے کے لیے بار بار کہیں گے۔ "مجھے مرنے کی بھی فرصت نہیں" لیڈروں کے ساتھ ان کی وفاداریاں بھی بدلتی رہتی ہیں اور ان کے خواب بھی، ساری ذمہ داری اور سارا بوجھ جو کسی بھی ذمہ دار سیاسی لیڈر کے چہرے پر ہوتا وہی ان کے چہرے پر جھلکتا نظر آتا ہے ـــــ اور ان کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے ان سے بڑھ کر ذمہ دار اور فرض شناس کوئی بھی نہیں اور یہی خوش فہمی ان کے لبوں کو ہمیشہ متبسّم رکھتی ہے۔ آپ انھیں کچھ بھی کہہ لیں آج ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ان کا بھی ایک مقام ہے ـــــ

... اور جب ہوائی جہاز دہلی سے کراچی پہونچا تو میرے "ادبی سرمایہ" کو کسٹم والوں نے بہت سُرخ سُرخ آنکھوں سے دیکھا اور کہا "ایسی چیزیں لے جانے کی اجازت نہیں"۔

"افسانہ اور کہانی لے جانے کی اجازت نہیں!" میں متحیّر تھا۔

خیر! جب کسی طرح ان لوگوں سے نمٹ کر باہر آیا تو بھائی جان سراپا انتظار بنے کھڑے تھے، مجھے حیرت تھی وہ کیسے آ گئے؟ اور تب انھوں نے بتایا، میری روانگی کے بعد شبنم نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔

کراچی شہر ابھی بیدار ہو رہا تھا، اور ہر طرف ہلکی دھند پھیلی ہوئی تھی اور کار دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

"بھائی جان یہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

بھائی جان جب کار چلاتے ہیں تو بالکل خاموش رہتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ کار میں بیٹھی ہوئی شریک حیات کی اہمیت تو اپنی جگہ ضرور ہے مگر کار کو احتیاط سے چلانے سے صرف کار ہی نہیں شریک حیات بھی اکثر محفوظ رہتی ہیں۔ کار کی سُست رفتاری تفریح کا سامان فراہم کر رہی تھی۔ میں نے یکّہ تو ہندوستان میں بھی دیکھا تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی، اس یکّہ میں دو خچر لگے تھے۔ ایک یکّے میں جُتا تھا اور دوسرا یکّے سے گویا باہر صرف کنارے سے بندھا تھا، اور جو باہر تھا، اس پر کوئی بوجھ، کوئی بار نہ تھا۔ اور دونوں بے تحاشا دوڑ رہے تھے، جو باہر تھا اس کے چہرے پر بھی وہی کھینچاؤ، وہی محنت اور مشقّت اور بار برداری کے آثار تھے۔ جیسے واقعی سارا بوجھ اسی نے اٹھا رکھا ہو۔

اور جب کار رُکی اور اتفاقاً یکّہ بھی برابر آکھڑا ہوا تو اُسے دیکھ کر بھائی جان گویا ہوئے:

"آپ غور سے دیکھیں، ایک تو یکّہ میں جُتا ہوا ہے اور ایک صرف بندھا ہوا۔ جو زیرِ تربیت ہے، اور اپنی محدود عقل و دانش کی وجہ سے جب دوڑتا ہے تو سمجھتا ہے سارا بار اسی پر ہے اور اُسے یہاں "پخ" کہتے ہیں"۔

اور تب مجھے احساس ہوا، میں نے پہچاننے میں کتنی دیر کر دی، میں نے تو گویا اُسے ہندوستان کے کونے کونے میں دیکھا ہے، ہر گاؤں، ہر محلہ اور ہر شہر میں دیکھا ہے، مقامی لیڈروں، ایم ایل اے، ممبر پارلیمنٹ

اور منتریوں کے ساتھ۔ سیاست کی ہر سطح پر دیکھا ہے، یہ تو وہی ہے، اس کی ساری خوبیاں بھی وہی ہیں ـــــ ہمیشہ بڑھنے کے لیے کوشاں، ہمیشہ مشغول، ہمیشہ ایک تصوراتی فرض اور بوجھ کے نیچے دبا ہوا۔ ہمیشہ یہ احساس کہ سارا بار، ساری ذمہ داری اُسی کی ہے اور اس کے بغیر سارے اعضا معطل ہیں۔

میں نے ایک نظر "رخ" پر ڈالی، وہ اپنے کان کھڑے کئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں تعریف و تحسین کی متلاشی تھیں، اُسے دیکھ کر میں نے کہا "آپ تو بالکل وہی ہیں، میں آپ کیا کہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ آپ بے زبان ہیں۔

بھائی جان نے گھوم کر دیکھا اور کہا ـــــ "آپ کس سے گفتگو کر رہے ہیں؟"

میں خاموش رہا ـــــ بھلا میں ایسے رہنماؤں کے بارے میں انہیں بتا بھی کیا سکتا تھا۔ اور یہ یقیناً ہمارا "اندرونی" معاملہ ہے ـــــ

▲

لاغر نرملی

غزلیات

مری اولاد ہو کر مجھ سے غداری، ارے توبہ
الیکشن! مجھ سے ہی لڑنے کی تیاری، ارے توبہ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اب کھائیں تو کیا کھائیں
مٹن سے ہو گئی ہے مہنگی ترکاری ارے توبہ

نئے مہمانوں کی ہر سال گھر میں آمد آمد ہے
یہی تو گُل کھلاتی ہے یہ بیکاری، ارے توبہ

تعارف اس کا اس سے مختصر جامع بھلا کیا ہو
"سیاست" عرف "دھوکہ" ولد "عیاری" ارے توبہ

گلی کے کُتّوں کو بھی پیار سے چمکارتے ہیں ہم
مگر یہ آدمیوں کی دل آزاری؟ ارے توبہ

نفع کے واسطے اپنے لگا دوں قوم کو چکلے؟
کھپا دے گی مجھے محشر میں سرداری، ارے توبہ

بنا رشوت کے DEAD BODY بھی ورثا کو نہیں ملتی
بڑے ظالم دواخانے ہیں سرکاری، ارے توبہ

خدا محفوظ رکھے عاشقی کے روگ سے لاغر
خطرناک "ایڈز" سے بھی ہے یہ بیماری، ارے توبہ

○

رہزنی جو آئی تھی ڈاکوؤں کے حصے میں
رہبری چلی آئی لیڈروں کے حصے میں

صرف جاگنا شب کا اُلّوؤں کے حصے میں
رات دن کی بیداری عاشقوں کے حصے میں

دولت اور شہرت تو کرکٹرز نے لے لی
صرف "واہ وا" آئی شاعروں کے حصے میں

چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھی کاؤنٹ کر نہیں پائے
پاپ بے حساب آئے پاپیوں کے حصے میں

پہلے کھینی دینے، بات کو سمجھ کر پھر
ہے ڈبل ہنسی گویا احمقوں کے حصے میں

سالوں پر لُٹا ڈالے آدھی جائیداد اپنی
اور آدھی کپ چائے دوستوں کے حصے میں

شاک ہیں مسائل کے شاعروں کے مقدر میں
اور شاک برقی کے پاگلوں کے حصے میں

ہے یہاں پہ رسوائی اور وہاں پہ پٹوائی
دو جہاں کی ذلت ہے ظالموں کے حصے میں

اُن سے بحث کرنے کی ہے ممانعت لاغر
جیت ہے UNANYMOUS جاہلوں کے حصے میں

اب OUT DATE روایات کی ایسی تیسی
یہ زمیں دوز خیالات کی ایسی تیسی

ہوا ہے فیل مرا لاڈلا کیا EASILY
تمام HARD سوالات کی ایسی تیسی

بُلا کے چائے پہ دامادی مجکو دے ڈالی
تمہاری ماں کی عنایات کی ایسی تیسی

سیاست آج کی سرکس سی اک لگے ہے مجھے
یہ جوکروں کے کمالات کی ایسی تیسی

تمام کام مرے ہو گئے ہیں چوپٹ آج
سویرے اُن سے ملاقات کی ایسی تیسی

نہ ناشتے میں ہیں انڈے نہ لنچ میں ہے چکن
ارے تمہارے حوالات کی ایسی تیسی

ہوئے ہیں فیل [illegible] میں ہم لاغر
[illegible] کی، پھل کی نباتات کی [illegible]

[روزنامہ "جنگ" کی جانب سے
منعقدہ مذاکرہ]

"برصغیر پاک و ہند میں طنز و مزاح نگاری کا کردار"

جنگ فورم میں پاکستان اور بھارت کے ممتاز ادیبوں کا اظہار خیال

"میں ادارہ جنگ کی جانب سے آج کی اس نشست میں آپ لوگوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں آج کی اس نشست میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز و معروف طنز و مزاح نگار اور شعراء حضرات تشریف رکھتے ہیں لہٰذا اس حوالے سے آج کی گفتگو کا موضوع "برصغیر میں طنز و مزاح نگاری کا کردار" سب سے پہلے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔"

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال: گزشتہ چالیس سال میں اردو ادب میں طنز و مزاح کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے پچیس تیس سال قبل طنز و مزاح لکھنے والوں کو ادب میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ طنز و مزاح لکھنا کوئی اہم بات نہیں بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ جو کچھ نہیں لکھ سکتا وہ مزاح نگار بن جاتا ہے نقادوں نے بھی یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ طنز و مزاح لکھنے کا جائزہ نہیں لیا اور یہ بحث بھی عام ہوئی کہ طنز و مزاح کی اہمیت کیا ہے؟ کسی نے کہا کہ محض ایک رجحان ہے کسی نے کہا کہ ایک انداز تحریر ہے جو پہلے بھی شاعری کی صنف میں موجود ہے کچھ نے اسے صنف کہا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ صنف کیسے ہوگی؟ لیکن یہ بات تو ماننا پڑے گی کہ گزشتہ پچیس تیس سال میں برصغیر میں طنز و مزاح نگاروں نے ادب میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ پچیس تیس سال میں ناول اور افسانے نے جو کام کیا تھا اور ترقی پسند تحریک کی وجہ سے ناول افسانے اور دوسری اصناف کو جو ان کو عام مقبولیت حاصل ہوئی تھی وہی مقبولیت اس صنف سخن کو بھی حاصل ہوئی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں طنز و مزاح نگاروں کو بڑی اہمیت حاصل ہو چکی ہے اور وہ موجودہ حالات میں انھیں جو کردار ادا کرنا ہے وہ کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ ادب کی دوسری اصناف کے برخلاف اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سماج سے تعلق نہیں، اس کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو ادب کی دوسری اصناف کا ہے اگر طنز و مزاح کا رشتہ سماج سے توڑنے کی کوشش کی گئی تو پھر یہ طنز رہے گا اور نہ مزاح ہو سکے گا یہ خاص رشتہ طنز و مزاح کی اہمیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ دراصل یہ دور بے اعتدالیوں کا دور ہے، ناانصافیوں کا دور ہے، تشدد کا دور ہے بدمعاشیوں کا دور ہے غرض جتنی برائیاں ہیں ان کو لوٹ کرتے جائیے ان سب کے خلاف طنز و مزاح نگار اپنے اپنے انداز سے لکھ رہا ہے اور اس کا بہت اچھا اثر ہو رہا ہے بہت سی برائیاں جن کا ادب کی دوسری اصناف میں بیان کرنا مشکل کام ہے جب کہ طنز و مزاح نگار بڑے آسان طریقے سے کہہ جاتا ہے اور اس کا قاری اس کی بات سن لیتا ہے۔

ان حالات میں برصغیر میں طنز و مزاح کو ادب میں بہت اہمیت حاصل ہو جاتی ہے طنز و مزاح نگار حضرات کو اس

وقت یہ کام سر انجام دینا ہے کہ وہ عام برائیوں کے خاتمے کے لیے تیار ہو جائیں وہ خامیاں خواہ سیاسی ہوں یا سماجی طنز و مزاح نگار ان پر بھرپور تبصرہ کریں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے جو ادیب ہیں ان کے ہاں پورا سماجی شعور موجود ہے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ پاکستان کے ادیب کس حد تک آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں البتہ ہندوستان کے بارے میں یہ بتا دوں کہ وہاں جو آزادی رائے ہے اس سے وہاں کے طنز و مزاح نگاروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور جمہوریت میں کیوں کہ ہر چیز بلا تکلف کہی جاتی ہے سوائے یہ کہ کیچڑ نہیں اچھالا جاتا اور اس میں طنز و مزاح نگار کی آزمائش بھی ہے کہ وہ کسی پر کیچڑ نہیں اچھالے اور اپنی بات بھی کہہ جائے جو غم انسان کی زندگی میں ہے اسے اپنے انداز میں مزاح کی پھلجھڑی میں پیش کرے کیوں کہ مزاح نگار غم سے نہیں گھبراتا غم تو اس کے اندر رچ بس گیا ہے اس نے غم کو محسوس کیا ہے اور اسے اپنے انداز سے پیش کر دیا ہے یہ طنز و مزاح نگار پاکستان کے ہوں یا ہندوستان کے سب مصروف عمل ہیں کوئی انشائیہ لکھ رہا ہے کوئی فکاہیہ لکھ رہا ہے اور کوئی کالم نگاری میں مصروف ہے۔ خاص طور پر پاکستان میں کالم نگاری بہت اچھی ہو رہی ہے اگرچہ کالم ہمیشہ زندہ رہنے والے تو نہیں تاہم بعض کالم ایسے ضرور ہیں جو ادب کا جزو بن جائیں گے جیسے نصر اللہ خان صاحب ہیں ان کے کالم بہت خوبصورت ہیں اگرچہ ہندوستان میں بھی کالم لکھے جاتے ہیں لیکن پاکستان میں کالم نگاری کو زیادہ فروغ ملا ہے لیکن ہندوستان کے کالموں میں سیاسی طنز کھل کر کیا گیا ہے ہمارے ہاں بہت سے کالم نگار مزاحیہ ادب میں کالم نگاری کے حوالے سے داخل ہوئے ہیں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں کالم نگاروں کی بہت ضرورت ہے کیونکہ سماج میں جتنی برائیاں ہیں ان کے خلاف وہ جہاد کر رہے ہیں۔"

یوسف ناظم" میں طنز و مزاح لکھنے کا قائل ہوں لیکن اس کی مخالفت یا تائید میں بولنے کا قائل نہیں پھر بھی جب سے میں یہاں آیا ہوں ایک بات جو تکلیف دہ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ادیب اور پاکستان کے ادیب ہم سب کے سب اردو کے ادیب ہیں اردو کو اس طرح تقسیم کیا جا رہا ہے یہ بات بہت کھلتی ہے اور خاص طور پر ظرافت نگار کو زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

میں اس بات کا قائل ہوں کہ طنز و مزاح کوئی تحریک نہیں ہے آپ افسانہ نگار پیدا کر سکتے ہیں شاعر بنا سکتے ہیں لیکن طنز و مزاح نگار بنائے نہیں جا سکتے اس کے لیے طبعی طور پر رجحان کا ہونا ضروری ہے یہ درست ہے کہ کسی نہ کسی کی سرپرستی ضرور ہوتی ہے لیکن جزویات سے دریافت نہیں۔"

حمایت اللہ۔ میں تو صرف اتنا کہوں گا کہ پوری دنیا میں طنز و مزاح کی ایک لہر ہے اور ہمارا عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کا میڈیا طنز و مزاح ہی ہو سکتا ہے ہم کڑوی سے کڑوی بات طنز و مزاح میں کہہ دیتے ہیں جو لوگ سن لیتے ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ کڑوی گولی پر مٹھاس چڑھا دی جسے لوگ قبول کر لیتے ہیں طنز و مزاح صرف ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ مغربی ممالک میں بھی بہت مقبول ہے۔

فیاض احمد فیضی۔ طنز و مزاح کا رشتہ ہمارے سماج سے جڑا ہوا ہے طنز و مزاح نگار ہنسنے پر مجبور کرتا ہے اگرچہ گزشتہ چالیس سال سے طنز و مزاح کو مقبولیت ملی ہے لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں اس کی ذمہ داری بڑھ گئی ہے ہماری زندگی پہلے کی نسبت بہت پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے لیکن ہمارے طنز و مزاح نگاروں کے موضوعات ابھی تک محدود ہیں وہ گھریلو ماحول اور گلیوں تک محدود رہا ہے انھیں چاہیئے کہ موضوعات میں تنوع پیدا کریں ان کا VISION اور وسیع ہو اور وہ تمام دنیا کو اپنے قلم کا نشانہ بنائے اس لیے آج کے دور میں سماجی برائیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھے

کے لیے طنز و مزاح نگار پر زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

طالب خوندمیری۔ طنز و مزاح نگار کو کس انداز سے اپنی تخلیق پیش کرنی چاہیے؟ میرے خیال سے مزاح نگار کو ہندو میتھالوجی کے مطابق نیل کنٹھ کا کردار ادا کرنا چاہیے کہ وہ سماج کا سارا زہر خود پی جائے اور دوسروں میں آبِ حیات یا امرت بانٹے وہ سماج پر یا موجودہ موضوعات پر جو کچھ بھی طنز کرے اس کا طنز میرے خیال میں اس کی اپنی ذات سے شروع ہونا چاہیے کیونکہ سب سے اچھا طنز جو تاثر چھوڑ سکتا ہے وہی ہو سکتا ہے جو اپنی ذات سے شروع ہو شاعر ادیب خواہ وہ سنجیدہ ہوں یا طنز و مزاح کا ادب تخلیق کرتے ہوں ہر دور میں ان کو اپنے حال سے شکایت رہی ہے شاید ہر دور میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس میں برائیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور اچھائیاں کم نظر آتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر دور ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس میں اچھائیاں کم نظر آتی ہیں اور اسی لیئے وہ اچھا ادب تخلیق کر سکتے ہیں کہ وہ کچھ اچھائیوں کے لیے پیام دے سکے جیسا کہ فیضی صاحب نے کہا کہ ہمارا طنز گھریلو ماحول اور گلیوں تک محدود رہا ہے دنیا نے جو سائنس کی ترقی کی ہے اس کی طرف ہماری نگاہیں کم ہی جا رہی ہیں خصوصاً اردو ادب کی میرا اپنا بھی یہ خیال ہے کہ طنز و مزاح کے جو موضوعات ہوں وہ اس دور کی ترقی اور ارتقاء کی طرف ہماری نگاہیں اٹھنی چاہئیں کیونکہ موضوعات کی کمی نہیں ہے ہمیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر دیکھنا چاہیے کہ دنیا میں کون کون سے موضوعات ہمارے لیے دست بستہ کھڑے ہیں۔

شفیقہ فرحت۔ طنز اور مزاح دونوں زبردست ہتھیار ہیں ماحول میں جو بے چینی پیدا ہوئی ہے اس کے اظہار کا یہ بہترین طریقہ ہے اگر اردو ادب کا مطالعہ کریں تو میر کے زمانے سے مزاح نگاری ملتی ہے جو اس زمانے کے مسائل کی بڑی اچھی عکاسی کرتی ہے میر نے سودا نے ہر شاعر نے اپنے حالات کی پرآشوب زندگی کی عکاسی کی ہے اور وہ مزاحیہ اور طنزیہ انداز اختیار کیا ہے جو سد راہ بھی ہو سکتا ہے فسانۂ آزاد میں بھی مزاح کے دل چسپ نمونے ملتے ہیں اور دراصل مزاح بہت پھیلا ہوا ہے اودھ پنچ کو لے لیجیے شوکت تھانوی کو لے لیجیے ہم زمانے میں ہیں اور زمانہ ہمارے اندر ہے کبھی ہم بہت چھوٹے سے ذرے کو لے لیتے ہیں اور کبھی بڑے سے واقعہ کو۔ وہ تو زمانے کے ساتھ چلتا ہے اور طنز نگار پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے ایک افسانہ نگار یا شاعر بھی ماحول کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس کی تحریر سے تکلیف نہیں پہنچتی جب کہ مزاح نگار کو ضرورت سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اس کی تحریر سے تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے دراصل جتنا حساس ادیب ہے جتنی اس کے قلم میں طاقت ہے اتنا ہی وہ کھل کر لکھتا ہے اور اردو زبان کا طنزیہ اور مزاحیہ ادب کسی زبان کے ادب سے کم نہیں ایک قدم یا دو قدم کا فاصلہ فاصلہ نہیں اس لیے اردو کا مزاحیہ ادب کسی دوسری زبان کے ادب سے کم نہیں۔

مصطفےٰ علی بیگ۔ آج کی دنیا میں براہ راست طنز و مزاح مشکل ہے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ نئی نسل فارسی اور عربی آمیز اردو کو پسند نہیں کرتی اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ زبان کو آسان بنایا جائے تاکہ عوام تک مزاح نگاری پہنچائی جائے دراصل ہمارے ادیب اور شاعر بہت مشکل الفاظ استعمال کرتے ہیں خاص طور پر ہندوستان میں اس کا بہت رجحان ہے اس لیے میں چاہوں گا کہ اس میں آسانی پیدا کی جائے۔

ڈاکٹر رشید موسوی۔ محترمہ شفیقہ فرحت نے بات میر سے شروع کی تھی تو میں میرے پہلے دکن کے ادب سے حوالہ دوں گی کہ نظامی کی مثنوی "پدم راؤ قدم راؤ" کی جس میں طنز کے نمونے ملتے ہیں اور خاص طور پر وہ ہے جس میں

عورت کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ طنز و مزاح کی روایت کوئی شمالی ہند سے
ہوئی بلکہ قدیم شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے مثلاً ہاشمی بیجاپوری کی مثنوی شمالی ہند کی شہر آشوب سے
دراصل میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر زمانے میں حساس ادیب اور شاعر نے اپنے ماحول کی ناہمواریوں کے
لیے طنز و مزاح کا سہارا لیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

مجتبیٰ حسین۔ اس نشست میں پچھلے چالیس برس کے طنز و مزاح کا ذکر ہو رہا ہے سب سے پہلا
ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ پہلے طنز و مزاح نگاروں کے سامنے بیرونی اقتدار طنز و مزاح کا موضوع تھا لیکن
بعد یہ ٹارگٹ ختم ہو گیا تو سارے طنز و مزاح نگار جو بیرونی اقتدار کے خلاف تھے اب ان کے پاس وہ موضوع
تھا لہٰذا انھوں نے اپنے آپ پر ہنسنا شروع کر دیا جو بڑے ظرف کی بات ہے میرے خیال میں یہ بڑی مشکل
لیکن ہندوستان اور پاکستان کے طنز و مزاح نگار اس آزمائش سے گزرے ہیں خواہ وہ کنہیا لال کپور ہوں یا
یہ پیدا ہوتا ہے کہ طنز و مزاح کی اس وقت صورتِ حال کیا ہے ؟ کسی زمانے میں "جنگ" میں تین طنز و مزاح
ہوتے تھے جس میں ابراہیم جلیس' ابن انشاء اور شوکت تھانوی کے کالم تھے ان تینوں کا الگ الگ ٹرینڈ تھا
سیاسی' شوکت تھانوی گھریلو اور ابن انشاء کا ایک الگ اپروچ تھا جب کہ یہ کالم ایک ہی روز شائع ہو۔
خیال میں طنز و مزاح کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا عالمی سطح پر صورتِ حال یہ ہے کہ طنز کا یہ پورا دور
تک تلخی کو اپنے اندر سموکے نہیں لکھیں گے آپ اس کا صحیح اظہار نہیں کر سکیں گے رہی یہ بات کہ اب اس وقت
کا مزاح لکھا جا رہا ہے تو آج کے دور میں بھی اچھے طنز نگار موجود ہیں مزاح نگاری میں مشتاق احمد یوسفی' ا
اور رشید احمد صدیقی کا اچھا امتزاج رکھتے ہیں دراصل طنز و مزاح میں ILYTICAL APPROACH ا
ہے اس لیے اب جدیدیت کا رجحان تو ہے شاعری میں بھی مل جائے گا لیکن ABSTRACT کا رجحا
یا افسانے میں ملتا ہے لیکن مزاح نگاری میں یہ ممکن نہیں بہرحال سماج کا طنز و مزاح سے گہرا رشتہ ہے او
کالم نگاری کا تعلق ہے تو مجھے ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کی اس بات سے اختلاف ہے کہ ہندوستان میں کالم نگا
ہے اور صرف پاکستان میں کالم نگاری ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان میں اگرچہ کالم نگاری اتنی نہیں تاہم سبا
بھی شائع ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے مزاح نگاروں کے اسلوب میں بڑا واضح فرق محسوس ہوتا ہے ہندوستان
ہے جب کہ پاکستان میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اظہار کیا جاتا ہے یعنی یہاں کے لکھنے والے علامتوں کا سہارا لیتے ہ

محمد علی صدیقی۔ میرے خیال میں اب تک جو باتیں ہوئی ہیں وہ صرف DEFINATION پر ہو
کوئی دوست یہ بتلائے کہ ہندوستان میں کونسی اہم کتابیں ہندوستان کے رائٹرز نے لکھی ہیں اور جہاں تک
بات ہے تو شاید اس کی کمی نہیں اس میں CE A P S بھی آئی ہے اور سائنس بھی اور میڈیسن بھی آئی ہے
میں گھریلو باتیں نہیں آئیں۔

۔۔۔ یوسف ناظم ۔ ۔ ۔ یہ آپ نے بجا کہا کہ موضوعات کی کمی نہیں اور ہمارے طنز و مزاح نگاروں
کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔

مجتبیٰ حسین۔ جب تک کنہیا لال کپور بڑے شہروں میں رہتے رہے کشمکش میں مبتلا رہے جب موگا میں ؟

[ز]یدوں کی وہ کاٹ ختم ہوگئی۔

نصراللہ خان۔ طنز و مزاح کے سلسلہ میں یہ بات ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آئی کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں [ہیں] یا ایک ہیں مزاحیہ کالم نگار دراصل طنز نگار ہوتا ہے امریکہ میں اس کو SATIRIST کہتے ہیں یہ زمانہ ایسا ہے کہ [اس] میں SATIRE کی بہت ضرورت ہے پاکستان میں بہت عرصے تک مارشل لا صاحبان آتے رہے اس میں زبان [بند]ی بھی ہوئی اور سینسر بھی ہوتا رہا۔ مجھ سے ایک صاحب نے کہا صاحب آپ بتایئے موضوع تو سیاست ہی ہوگا ایک مشکل [یہ] بھی ہوتی ہے کہ نیوز اورینٹڈ NEWS ORIENTED کالم میں مزاح نکالنا خاصا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ اخبار [س]ے باہر نہیں نکل سکتے باہر کی بات کہیں بھی تو اصل موضوع اخبار کی خبر ہی ہے۔

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ کچھ اخلاقی پابندیاں بھی مسلط ہوتی ہیں سب سے بڑی پابندی یہ ہے کہ وہ INFORMATIE کا مذاق نہ اڑائے مثلاً ہمارے ملک کے ایک مزاح نگار نے یہ لکھا تھا کہ جب وہ چلتے [ہیں] تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ٹاپ کر رہے ہیں اب ہنسنے کے لیے تو ہزاروں موقع نکلتے ہیں کیلے کے چھلکے پر [پھ]سلنے سے بھی ہنسی آجاتی ہے دوسری پابندی یہ ہے کہ شخصیت پر آپ حملہ اس طرح نہ کریں کہ وہ ناگوار گزرے اس [کا] بھی آپ کو خیال کرنا پڑے گا لطف کی بات یہ ہے کہ آپ بھی کہہ جائیں دوسرا شخص بھی مسکرا دے مجھ سے کہا گیا آپ [کی]ا لکھتے ہیں میں نے کہا آپ بتایئے کیا لکھوں ایک صاحب نے کہا کہ مچھروں پر لکھئے میں نے کہا مچھر ناراض ہو جائیں گے۔ [چن]انچہ واقعی میں نے یہ کیا کہ جس زمانے میں کالم سنسر ہو جایا کرتے تھے میں نے یہ کیا مراد سب کالم نگار کچھ اور نہیں ملتا تھا تو [بھ]ینس پر لکھنا شروع کر دیا کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم پر لکھا ہے یہ ایک اور دشواری تھی ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھے [مش]ورہ دیا گیا کہ ایسا کالم لکھوں جو ان کے سر سے گزر جائے چنانچہ میں نے ایک ایسا کالم لکھا جس میں اپنے آپ کو موضوع [بن]ا کر لکھا اور وہ کالم واقعی ان کے سر سے گزر گیا اور سینسر نہیں ہوا۔

مجتبیٰ صاحب کی بات صحیح ہے کہ اشاروں اور کنایوں میں بات نہیں بنتی لیکن ہماری مجبوری ہے ہمیں لکھنا ہے [او]ر اشاروں کنایوں میں لکھنا ہے تاکہ قارئین تک پہنچ جائے ہندوستان کے ادیبوں میں، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حالات [ک]ے ساتھ رنگ بدل گیا ہمارا رنگ پہلے جیسا نہیں رہا اور یہ لہر پاکستان میں بھی ہے اور ہندوستان میں بھی مزاحیہ شاعری [ک]ا ہندوستان میں اب تک کیا اثر ہوا؟ ہمارے ہاں بھی مزاحیہ شاعر تھے اور اب بھی ہیں جیسے سید محمد جعفری مرحوم [د]لاور فگار، رئیس امروہوی ہیں۔ یہ سب لوگ طنزیہ اور مزاحیہ اشعار کہتے ہیں جو خاصے اثر کرتے ہیں نثر نگاری میں [ج]و مزاحیہ اور طنزیہ جس قدر مشہور ہوتے ہیں اس قدر شاعری نہیں۔ ہندوستان میں مزاحیہ شاعری کا کیا حال ہے؟

مجتبیٰ حسین۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ہندوستان میں اکبر الٰہ آبادی کے بعد اب تک جگہ خالی ہے مگر ہندوستان [م]یں دو چار نام ایسے ہیں جن کے نام پاکستان کے مزاحیہ شاعروں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں رضا نقوی واہی [او]ر دو چار نام اور بھی ہیں اس کے علاوہ دکنی زبان کو بھی طنز و مزاح کے لیے استعمال کیا گیا اور حیدرآباد طنز و مزاح کا مرکز بن گیا طنز و مزاح کے شعر کہنے کا رواج ہو گیا دکنی شاعر سلیمان خطیب پاکراچی میں اعجاز حسین کھٹا، نذیر وغیرہ دکنی زبان میں شعر کہتے ہیں میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ دکنی زبان میں مزاحیہ شاعری کا معیار بلند ہے۔

نصراللہ خان۔ کیا ہندی سے اردو میں ترجمے بھی ہوتے ہیں؟

مجتبیٰ حسین۔ شگوفہ میں کبھی کبھار ترجمے شائع ہوتے ہیں جو

محمد علی صدیقی ۔ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی جو صورتِ حال ہے اسے سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کے طنز و مزاح میں وہ جان نہیں ہے جو پولیٹیکل پروسیس سے گزر کر ہوتی ہے اور آپ نے جو خوجی مزاح نگاروں کی بات کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حالات میں یکسانیت ہے ان کی زندگی ایک ڈگر پر گزرتی ہے کیا ہندوستان میں ادب کے سماجی پس منظر پر کچھ کام ہو رہا ہے ۔

شفیقہ فرحت ۔ جی ہاں! بھوپال میں ایسا کام ہو رہا ہے ایک صاحب پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر رہے ہیں اس کے علاوہ فرحت اللہ بیگ پر دوبارہ کام ہو رہا ہے ۔

خواجہ حمید الدین شاہد نے بھارت سے آئے ہوئے ادیبوں کو "جنگ فورم" میں مدعو کرنے پر ادارہ جنگ کا شکریہ ادا کیا اور طنز و مزاح کانفرنس کے انعقاد اور اس سلسلہ میں پیش آنے والی تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے اس کی کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

(تلخیص) مطبوعہ "جنگ" مورخہ ۲۴ جون ۸۸ء

فہرستِ مزاحیہ کتب

کتاب	نوعیت	مصنف	قیمت
الف تحاشا	مضامین	نریندر لوتھر	۱۶ روپے
البتہ	"	یوسف ناظم	۱۰ / "
مزاح لطیف	"	رشید قریشی	۲۰ / "
تکلف برطرف	"	مجتبیٰ حسین	۱۴ / "
بہرحال	"	"	۱۰ / "
آدمی نامہ	خاکے	"	۱۲ / "
قطع کلام	مضامین	"	۱۲ / "
بالآخر	"	"	۱۴ / "
چنانچہ	"	مسیح انجم	۱۲ / "
کاغذی ہے پیرہن	"	رشید موسوی	۲۰ / "
ماشاءاللہ	"	حلیمہ فردوس	۱۵ / "
سمن زار	"	خواجہ عبدالغفور	۸ / "
سُنی سنائی	"	لئیق صلاح	۸ / "
حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشو و نما		انیسہ سلطانہ	۲۰ / "
ہنستے ہنستے	مضامین	برق آشیانوی	۱۰ / "
جاپان چلو	(سفرنامہ)	مجتبیٰ حسین	۱۴ روپے
سو ہے وہ بھی آدمی	(خاکے)	"	۱۸ / "
الغرض	(مضامین)	"	۱۵ / "
قصہ مختصر	"	"	۱۲ / "
لن ترانی	"	علیم جہانگیر	۱۲ / "
کیوڑے کا بن	(مجموعہ کلام)	سلیمان خطیب	۱۲ / "

شکیل رضا بنگلوری

انسان تھا پہلے؟

ڈارون کا کہنا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ انسان پہلے کیا تھا اور آنے والے زمانے میں کیا ہوگا۔ موجودہ دور کے انسانوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان دھیرے دھیرے ڈارون کی تھیوری کی طرف ضرور لوٹ رہا ہے۔

ہوسکتا ہے آپ کو ہمارے اس خیال سے اختلاف ہو اور آپ یہ سوال اٹھائیں گے کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی ترقی کو بھول جائے، چاند اور ستاروں کی تسخیر کو بھول جائے۔ ایٹم بم بنانا بھول جائے اجنتا، ایلورا اور تاج محل کی سحر انگیز رعنائیوں کو بھول جائے، دریائے نیل کی روانی اور گنگا جمنا کی جوانی کو بھول جائے۔ وہ کیسے بھول جائے کہ اس نے سیتا اور رضیہ کے آنچلوں کے سائے میں محفلیں سجائی تھیں۔ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنی وضع قطع، رہن سہن، اپنی صدیوں پرانی تہذیب و تمدن اور اپنی تاریخ کو بھلاکر محض کسی فلاسفر کے خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ایک ادنیٰ سی مخلوق کی شکل و صورت اس کی حرکات اور طرز معاشرت کو اپنے گلے لگالے۔

آپ کا کہنا بالکل بجا ہے اور ہم آپ کے کہنے پر کورنش بجالاتے ہیں، کیوں کہ آپ نے بڑے اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ آپ نے یہ سوالات اس لیے اٹھائے ہیں کہ آج کل ہر قدم پر کوئی نہ کوئی سوال اٹھانا لوگوں کی ایک عادت سی بن گئی ہے یا پھر یہ بھی ایک انسانی تہذیب کا حصہ ہے۔ بہرحال آپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان سوالات کو بالکل اٹھا دیجئے۔ کیونکہ اٹھا پٹک والا معاملہ بھی انسانوں نے ہی ایجاد کیا ہے اگر آپ کو اس بات پر بھی اعتراض ہے اور آپ اٹھا پٹک والے معاملہ کو بندروں سے منسوب کرتے ہیں تو پھر آپ ہمیں ذرا یہ بتا دیجئے کہ کیا وجہ ہے کہ آج کل انسانوں نے ہر جگہ اٹھا پٹک شروع کررکھی ہے! اور اگر آپ انسانوں کی اس اٹھا پٹک کو صحیح مانتے ہیں تو پھر مذکورہ بالا ہمارے خیال کی تصدیق خود بخود ہوجاتی ہے کہ انسان دھیرے دھیرے ڈارون کی تھیوری کی طرف بڑھ رہا ہے۔

کیا آپ نے کسی بندر کو دیکھا ہے؟ ہمیں یقین ہے کہ آپ نے کسی نہ کسی بندر کو ضرور دیکھا ہوگا! اس لیے کہ بندر نہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جہاں ہر طرف صبح و شام بندر ہی بندر نظر آتے ہوں وہاں بھلا

نہ دیکھنا کوئی وجہ نہیں رکھتا۔ تو جناب آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس طرح بندر کے ہاتھ کبھی کوئی ناریل مل جائے تو وہ ناریل اٹھائے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگیں مارتا رہتا ہے لیکن اس کی چھلانگوں کے باوجود ناریل، ناریل ہی رہتا ہے شگفتہ نہیں بن جاتا۔ اس لیے وہ اپنی چھلانگوں سے تنگ آکر آخرکار ناریل کو زمین پر ٹپک دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی انسان کسی پر کچھ احسان کرتا ہے تو وہ اپنے اس احسان کو کسی ناریل کی طرح اٹھائے شہر کی گلی کوچوں میں چھلانگیں مارتا رہتا ہے اور کسی چوراہے پر لاکر پٹک دیتا ہے اس طرح انسان کا ایک اور قدم ڈارون کی تھیوری کو تقویت پہنچاتا ہے۔

انسان کا دوسرا قدم اُس وقت اُٹھتا ہے جب وہ ہر صبح آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا ہے آئینہ دیکھتے ہوئے وہ کئی قِسم کے چہرے بناتا ہے۔ کبھی وہ اپنی ناک چڑھاتا ہے تو کبھی کسی اونٹ کی طرح گردن موڑتا ہے۔ کبھی کسی گینڈے کی طرح اپنا بھاڑ سا منہ کھولتا ہے۔

آپ نے اکثر سڑکوں پر کسی بندر نما انسان کو بندر اور بندریا کا کھیل تماشہ دکھاتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ اُس وقت بندر کے ہاتھ میں آئینہ ہوتا ہے، جس میں بندر اپنا چہرہ دیکھ کر کئی قسم کے چہرے بناتا ہے اور اپنے دانت کچ کچانے لگتا ہے، انسان بھی اس وقت اپنے دانت کچ کچاتا ہے۔ جب کسی نے اُسے آئینہ دکھا دیا ہو!

انسان بندروں کا کھیل تماشہ دیکھتے دیکھتے کیا وہ خود بندروں کی طرح کھیلنے نہیں لگا ہے۔ کھیل تماشوں اور فلم کے میدان میں کتنے ایسے اداکار ہیں جو اس ادنیٰ سی مخلوق کی نقالی کرتے ہوئے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں اور پھر ان نقالوں کی نقالی کرنے اور انھیں پردۂ فلم پر دیکھنے کے لیے کتنے انسان سینما گھروں پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کے کاندھوں پر چڑھ کر اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی انھیں ٹوکنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بندروں کی طرح کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔

کھانے کی بات پہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بندر جب کوئی چیز کھاتا ہے تو وہ جلدی جلدی کھانے کی کوشش میں کھاتا کم ہے۔ پھینکتا زیادہ ہے اور جب لوگوں کو کسی دعوت میں مدعو کریں تو وہ بھی کھاتے کم ہیں اور پھینکتے زیادہ ہیں۔ کیوں کہ دعوتوں میں غیروں کا مال ہوتا ہے۔ جہاں مال مفت ملتا ہے وہاں دل بے رحم بن جاتے ہیں۔ ایسے کہتے ہیں مالِ مفت! ــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی دوکان پر کھڑے کیلا کھا رہے ہوں تو اچانک کوئی بندر نمودار ہوتا ہے اور آپ کے ہاتھوں سے کیلا کسی طوطے کی طرح اڑ جاتا ہے۔ اور آپ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ کیا ہوا! اسی طرح راہ چلتی عورتوں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کے گلے کی زنجیر اور منی پرس کون بھلامانس اڑا لے گیا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ہم اور آپ اسکول کے زمانہ میں دو بلیوں کے درمیان ایک روٹی کے سلسلے میں بندر کا انصاف پڑھ چکے ہیں، بندر کا یہ ڈنڈی مار انصاف کیا اس دور کے انسانوں میں رائج نہیں ہوگیا ہے۔ کیا آج کے معاشرے میں بندر کے اس انصاف کا چلن عام نہیں ہوگیا ہے۔ کیا ہمارے سیاست دان ڈنڈی نہیں مار رہے ہیں ــــ؟

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کسی زمانے میں بندروں کی فوج نے لنکا ڈھائی تھی آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہر روز ایک لنکا جلانا انسانوں نے اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے ــــ بہرکیف ڈارون کی تھیوری کی طرف انسان کا آخری قدم اس وقت اٹھتا ہے۔ جب وہ ہپی ازم کو گلے لگا کر جنگلوں کی خاک چھاننے لگتا ہے!

ماسٹر نور
(پاکستان)

لفظ "وغیرہ" کا استعمال ہم اکثر بولنے اور لکھنے میں کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس لفظ سے پرہیز کرتا ہو۔ لفظ "وغیرہ" ہماری روزمرہ کی زندگی اور ادبی کوششوں میں معاون ہے، لیکن آج تک کسی نے اس کی اہمیت پر دو چار لفظ بھی نہیں لکھا۔ دنیا میں جو لفظ ذرا بھی کام کا ہوتا ہے اس کے لئے تو خوب نمک مرچ لگا کر لکھا جاتا ہے لیکن آج تک "وغیرہ" کے لئے صفحۂ قرطاس سادہ ہے۔

انسان جب کوئی لفظ بھول جاتا ہے تو وہ "وغیرہ" سے اپنی بات کی تکمیل کرتا ہے۔ لہٰذا وغیرہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لفظ کا استعمال ہر محفل میں آسانی سے کیا جاتا ہے یعنی علماء کی محفل ہو، یا ادبی جلسہ، پارلیمنٹ ہو یا اسمبلی، لندن ہو یا ہندوستان، ہر جگہ لفظ "وغیرہ" کا چلن ہے۔

"وغیرہ" کو اپنی بے عزتی کی ذرا بھی پروا نہیں رہتی ہے۔ سبھوں کے گھر میں بے دھڑک گھس جاتا ہے اور ... لگاتا ہے۔ کیا تاجر، کیا رنک، کیا عالم، کیا جاہل کسی کے گھر آنے جانے میں جھجک محسوس نہیں کرتا، اور اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا۔ "وغیرہ" کے علاوہ دوسرے لفظوں میں یہ خوبی نہیں ہے۔ "وغیرہ" کو جس کسی نے بھی یاد کیا وہ فوراً حاضر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ "وغیرہ" لوگوں کا اتنا پیارا اور چہیتا ہے۔

دوسروں کی عزت کی حفاظت کرنا "وغیرہ" اپنا فرض اولین سمجھتا ہے۔ ادیبوں کی مدد کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی شخص یا ادیب پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے فوراً ہی لفظ "وغیرہ" ان کی مدد کے لئے دوڑا چلا آتا ہے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرتا ہے۔ جب لوگ اپنی عقلمندی کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اسٹیج پر ان کا گلا سوکھنے لگتا ہے۔ اس وقت "وغیرہ" ہی ان کی مدد کرتا ہے، انہیں حوصلہ دیتا ہے، اور بولنے کے بہت پسینہ آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک حضرت بولنے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن وہ مجمع کی کثیر تعداد دیکھ کر گھبرا گئے۔ "وغیرہ" نے انہیں ہمت دلائی۔ [illegible] تو کہا، "وغیرہ" ان کی مدد کے [illegible] ہمت بندھ گئی اور وہ حضرت بڑی [illegible] ہو گئے اور بات شروع کی۔

"حضرات آپ لوگ گرانی "وغیرہ" سے تو واقف ہوں گے ہی، یعنی اس کی وجہ سے ہر انسان وغیرہ کو پریشانی وغیرہ تو یقیناً ہوتی ہے۔ مگر خیال رہے کہ اس نازک دور میں حیرانی، پریشانی، گرانی وغیرہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دراصل انسان کا مشکلات وغیرہ پر قابو پانا ہی اصل مردانگی وغیرہ ہے" ورنہ مصیبت وغیرہ کے وقت تو ہر انسان کے ہاتھ پاؤں وغیرہ پھول جاتے ہیں یعنی مصیبت وغیرہ، بیماری وغیرہ، یوں کہیئے کہ بلائے ناگہانی وغیرہ بغیر خبر کئے انسان وغیرہ کے سروں پر نازل ہو جاتے ہیں:

"وغیرہ" کی اس بھرمار کثرت سے بے چارے کی آبرو تو بچ گئی لیکن لوگوں نے ان حضرت کے اسم گرامی کا ایک جُز "وغیرہ" بھی بنا دیا، اور اکثر بچے چھیڑنے کی غرض سے ان کو "میاں وغیرہ" پکارنے لگے۔ اس غیر معمولی "وغیرہ" کے لقب سے میاں "وغیرہ" پھول کر کُپّا ہو گئے۔

عام طور سے ایک ادیب اور ناقد میں خاصا دوستانہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ حضرتِ ادیب کی کتابوں پر تنقید کرکے ناقد صاحب اسے شہرت کی بلندیوں پر پہونچا دیتے ہیں۔ اس کی اچھائیوں کو خوب خوب اجاگر کرتے ہیں اور اس طرح کتاب کی مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اگر کسی ادیب اور ناقد کی آپس میں نہ بنے تو پھر حضرتِ ادیب کی جیتے جی موت ہو جاتی ہے۔ اس کی کتابیں گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو جاتی ہیں۔ ناقد کتاب کی اچھائیوں کو نہ اُجاگر کرکے اس کی خامیوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی ادیب کا حضرتِ ناقد سے اختلاف ہو گیا۔ حضرتِ ناقد ہمیشہ اسی تاک میں رہنے لگے کہ کب اِن ادیب کی کسی کتاب پر تنقید کرنے کا موقع ملے گا۔ حسنِ اتفاق سے ایک دن حضرتِ ناقد کی دلی مراد بر آئی۔ انہیں اس ادیب کی ایک کتاب پر تنقید کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے کتاب اُلٹ پلٹ کر دیکھی۔ کہیں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ ہاں ایک آدھ جگہ چھپائی میں نقص نظر آیا۔ انہوں نے وغیرہ کو یاد کیا۔ "وغیرہ" ان کی مدد کے لئے فوراً حاضر ہو گیا۔ انہوں نے وغیرہ کی مدد سے تنقید لکھی۔ تنقید کیا تھی، بس وغیرہ وغیرہ کی گردان تھی!

سچ پوچھئے تو "وغیرہ" پر پہونچتے ہی بگڑی بات سنور جاتی ہے، ادھورا کام پورا ہو جاتا ہے، روٹھے ہوئے مان جاتے ہیں۔ یعنی 'وغیرہ' میں ایک جادو پوشیدہ ہے جو بگڑنے والے کام کو سنوار دیتا ہے۔ ••

روزنامہ جنگ سے

شہزاد منظر
(پاکستان)

طنز و مزاح کانفرنس (کراچی) میں پاک و بھارت کے مزاح نگاروں کی شرکت

پہلا اجلاس

گذشتہ دنوں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کراچی میں طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شیخ الجامعہ ڈاکٹر منظور الدین احمد نے کی۔ مہمان خصوصی ہندوستان کے معروف طنز نگار مجتبیٰ حسین تھے جو ابراہیم جلیس مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں اور پاکستان کے دورے پر پہلی بار آئے ہیں۔ اس کانفرنس میں کراچی اور اسلام آباد کے علاوہ دکن، دہلی، بمبئی اور حیدرآباد (دکن) کے مندوبین نے بھی شرکت کی۔

طنز و مزاح کانفرنس کے انعقاد کی روایت دراصل حیدرآباد (دکن) سے شروع ہوتی ہے جہاں پہلی بار اس نوع کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کا تصور پہلی بار مجتبیٰ حسین کے ذہن میں ۱۹۶۶ء میں آیا اور انہوں نے ہندوستان بھر کے تمام طنز و مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ اس کے بعد ہر سال حیدرآباد میں طنز و مزاح کانفرنس منعقد ہوتی رہی جس میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے ادیبوں کو بھی مدعو کیا جانے لگا ہے۔ پاکستان میں اس نوع کی کانفرنس کے انعقاد کا خیال ایوانِ اردو کے خواجہ حمید الدین سے ہوا اور انور احسن صدیقی کے ذہن میں آیا اور انہوں نے چند ماہ کی تگ و دو کے بعد کانفرنس کا اہتمام کر دیا۔ چند تنظیمی کوتاہیوں کے باوجود اس کانفرنس کو ہر اعتبار سے کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ حاضرین کی غیر معمولی تعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

مجلس استقبالیہ کے صدر آفتاب احمد خان نے اپنے افتتاحی کلمات میں بتایا کہ یوں تو قدیم اردو ادب میں ہجوگوئی کی روایت بہت پرانی ہے لیکن جسے سنجیدہ ظرافت کہتے ہیں اس کی ابتداء اردو کے سب سے بڑے غزل گو اسد اللہ خاں غالب ہی سے ہوتی ہے اس کے بعد داغ اور اکبر کا نام آتا ہے طنز کا ہماری زندگی میں بہت اہم کردار ہے۔ کراچی ایک زمانے میں عروس البلاد کہلاتا تھا لیکن اس شہر پر آج کل آسیب کا سایہ ہے۔ اس لئے یہ شہر عروس الفساد کہلانے لگا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم

میں حسِ مزاح کی بہت کمی واقع ہوئی ہے۔ زندگی میں غم فرد کا مقدر ہے۔ زندگی کی ناکامیوں، محرومیوں اور غموں سے نبرد آزما ہونے کے لئے مزاح کی بہت ضرورت ہے۔ آج کے دور میں جس میں اتنی نفرت اور اتنے تضادات ہیں طنز و مزاح کی بہت ضرورت ہے
صدرِ جلسہ ڈاکٹر منظور الدین احمد نے کہا کہ جو لوگ ہندوستان سے تشریف لائے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس شہر کے سوگوار شہریوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنے میں کامیاب ہوں گے۔ یہ شہر رو رہا ہے، اس شہر کی گلی کوچے میں غم ہی غم نظر آرہا ہے ہر جگہ خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ عجیب خطرناک صورتحال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اگر ہمیں چند مسکراہٹیں دیں اور چند قہقہے بکھیریں تو یقیناً بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس موقع پر نصر اللہ خاں نے اپنے مضمون میں کہا کہ کسی زمانے میں ہنسنا اور رونا سب کو آتا تھا، پھر وہ زمانہ آیا کہ ہنسنے کی جگہ رونے اور رونے کی جگہ ہنسنے لگے۔ اب بھی کبھی کبھی بعض ہنسانے والوں کے ہنسانے پر رونا اور رُلانے پر ہنسی آتی ہے اور پھر وہ زمانہ آیا جب لوگ ہنسنا، ہنسانا بالکل بھول گئے اور رونا ہی رونا باقی رہ گیا۔ اس رونے میں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ رونا بطور جملہ معترضہ شامل ہوتا رہا۔ ان حالات میں غالب ایسے شگفتہ مزاج انسان کو بھی کہنا پڑا کہ "حیراں ہوں کہ دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں، مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں"۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہنسانے اور رُلانے والوں کا کام کچھ لوگوں نے خلقِ خدا کی بھلائی کے لئے اپنے ذمے لے لیا۔ اس طرح ہنسنے اور رُلانے والوں کے دو قبیلے ہو گئے چنانچہ ہمارا اور آپ کا تعلق ہنسانے والے قبیلے سے ہے اور یہ میر صاحب نے کہا تھا کہ "دردو غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا" اس مصرعے کا اطلاق میر صاحب سے زیادہ ہمارے اور آپ جیسے ہنسانے والے پر ہونے لگا کیونکہ میر صاحب تو درد و غم سے درد و غم نکالتے رہے لیکن ہمیں دردو غم کی کشید سے مسکراہٹیں نکالنا پڑیں تاکہ درد و غم کا بھاری پتھر ہمارے اور ہمارے قارئین کے سینے سے ہٹ جائے اور جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس میں خوشی اور ہنسی کی روشنی پھیلے اور ہم میں منزل تک پہنچنے کی اُمنگ اور حوصلہ پیدا ہو۔

نصر اللہ خاں کے مضمون کے ہر پیراگراف پر سامعین نے تالیاں بجا کر داد دی۔ یہی حال اظہر احسن صدیقی کا تھا جن کے مضمون کا عنوان "کسی کا ذہن کسی کی زباں" تھا جس میں انھوں نے دنیائے ادب کے ایسے جعلی ادیبوں اور دانشوروں کا پردہ چاک کیا تھا جو محض اپنی دولت سے ادیب اور دانشور بن جاتے ہیں اور دوسروں کے ذہن اور زبان سے کام چلاتے ہیں۔ مختار زمن کا مضمون سیاست اور سیاست گری کے موضوع پر تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان کی موجودہ سیاسی صورتحال پر بہت ہی خوبصورت طنز تھا۔ اس میں میدان سیاست میں داخل ہونے والے مبتدی سیاست گروں کے لئے ہدایت نامہ پیش کیا گیا تھا کہ وہ سیاست میں کامیابی کے لئے کون کون سے حربے اور طریقے استعمال کر سکتے ہیں۔ محترمہ نسیمہ ترمذی نے بھی قومی ہوائی جہاز کمپنی کے بارے میں قطعی نجی حوالے سے مضمون پڑھا۔

پہلے اجلاس کی سب سے معرکہ آرا شے مہمان خصوصی مجتبیٰ حسین کا خطبہ اور ان کا مضمون "ہماری یہ مکانی دیکھتے جاؤ" تھا۔ مجتبیٰ حسین کا شمار اس وقت ہندوستان کے صفِ اول کے طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ یوں تو ہندوستان میں بڑے بڑے اور اچھے طنز نگار موجود ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کو ان میں ممتاز مقام حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان کے مضامین ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان کی تقریباً ساری تخلیقات ہندی میں چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ

کئی دیگر ہندوستانی زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کے سفر نامے جاپان چلو جاپان چلو کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہوا جسے جاپان کے ادبی حلقوں نے بے حد سراہا۔ انہیں روس، امریکہ، جاپان، فرانس اور کینیڈا سے بھی خاص طور پر مدعو کیا گیا۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے خطبے میں کہا کہ خواجہ حمید الدین شاہد میرے کرم فرما ہیں لیکن ان کا انداز کرم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کرم فرماتے ہیں تو لگتا ہے کہ رحم فرمار ہے ہیں۔ یہی دیکھئے کہ انہوں نے مجھے آج کی محفل کا مہمان خصوصی بنا دیا ہے۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں سب کچھ بن سکتا ہوں لیکن مہمان خصوصی ہرگز نہیں بن سکتا کیونکہ مہمان خصوصی کا اہل بننے کے لئے آدمی میں جس نا اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں بالکل نہیں ہے خدا کے فضل سے بھلا چنگا ہوں۔ اتنا انکسار رکھتے بھی نہیں کہ کسی محفل کا مہمان خصوصی بنا دیا جاؤں۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ اُردو کے ایک ادنیٰ مزاح نگار کی حیثیت سے میرا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ جب تک ہر آدمی کو اس کے حصہ کی سچی مسرتیں اور مسکراہٹیں نہیں مل جاتیں تب تک اس دھرتی پر دائمی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ قدیم وحشی انسان کے قہقہہ سے لیکر آج کے انسان کے قہقہہ تک تہذیب نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے لیکن دور جدید کے تضادات اور کشمکش نے مہذب آدمی کے قہقہہ کے اصل روپ کو بدلنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں جہاں رونا چاہیئے وہاں ہنس دیتے ہیں اور جہاں ہنسنا چاہیئے وہاں رو دیتے ہیں۔ اہمیت صرف ہنسی کی نہیں بلکہ اس بات کی ہے کہ کب ہنسا جائے، کس پر ہنسا جائے کتنا ہنسا جائے اور کیسے ہنسا جائے۔ افراد ہی نہیں قومیں تک ایک دوسرے پر ہنس رہی ہیں اور انہیں خود پتہ نہیں کہ کیوں ہنس رہی ہیں۔ جب تک مہذب انسان کے سچے اور خالص قہقہہ کی بازیافت نہیں ہوتی تب تک یہی ہوتا رہے گا۔ مزاح نگار اس سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ظرافت نگاری کے لئے آدمی کا ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ مضمون کو سامعین نے بے انتہا پسند کیا اور وہ اس کے ایک ایک جملے پر بے ساختہ ہنستے اور تالیاں بجاتے رہے۔ اس مضمون سے ثابت ہوا کہ وہ کتنے قابل مقبول اور بلند مرتبت طنز نگار ہیں اور انہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں اتنی شہرت، عزت اور مقبولیت حاصل ہے وہ بے وجہ نہیں ہے۔ اجلاس کے پہلے روز رات کو ایچی جیم خانہ کلب میں آفتاب احمد خان کی صدارت میں ایک مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ جن بیرونی شعراء نے اپنا مزاحیہ اور طنزیہ کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں طالب خوندمیری (حیدرآباد دکن)، مصطفیٰ علی بیگ حیدرآباد دکن) پروفیسر عنایت علی خان (حیدرآباد سندھ) پروفیسر انور مسعود (اسلام آباد) نیاز سواتی (ایبٹ آباد) عزیز عصمت ذاہری نواب شاہ، اعجاز حسین کھٹا اور ضیاء الاسلام انصاری، مقامی شعراء میں راغب مراد آبادی اور دلاور فگار، خالد عرفان، ضیاء الحق قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرا اجلاس

طنز و مزاح کانفرنس کا دوسرا اجلاس آفتاب احمد خان کی صدارت میں ہوا۔ ۲۷ مئی کو مہمان خصوصی یوسف ناظم تھے۔ اس اجلاس میں سب سے پہلا مقالہ مشہور ناقد اور معلم اور ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد دکن کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے پڑھا کا عنوان "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی صورت حال" تھا۔ انہوں نے کہا کہ ۱۹۶۲ء میں زندہ دلان حیدرآباد کی بنیاد پڑی

جس کے زیر اہتمام ہر سال کانفرنس منعقد کی جاتی ہے اور ماہنامہ "شگوفہ" کے اجراء کے بعد طنز و مزاح نگاری نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے یہ شہر طنز و مزاح نگاروں کی اپنی الگ شناخت کے لئے کوشش کررہا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے حیدرآباد کے مختلف ادوار کے نئے اور پرانے طنز نگاروں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان دنوں ہندوستان میں طنز نگاری کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی منظر عام پر آرہی ہیں۔ اس کا اندازہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے اس میں تین خواتین طنز نگاروں نے بھی حصہ لیا جن کے نام ڈاکٹر حبیب ضیار ڈاکٹر رشید موسوی اور شفیقہ فرحت ہیں۔ شفیقہ فرحت اس سے قبل پاکستان آچکی ہیں اور ایک طنز نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں اور ان کے طنزیہ مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کانفرنس میں انہوں نے "چوہے" کے عنوان سے مضمون سنایا جو بہت پسند کیا گیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد کی خواتین طنز نگاروں نے اپنا نام مردوں جیسا رکھ لیا ہے مثلاً ڈاکٹر حبیب ضیار اور ڈاکٹر رشید موسوی۔ اگر یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ دونوں خواتین ہیں تو صرف نام سے بمشکل ان کے خواتین ہونے کا علم ہوگا۔ اس محفل میں ڈاکٹر رشید موسوی نے 'طنز و مزاح نگاری میں خواتین کا مقام' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں انہوں نے دور قدیم ہو کہ دور جدید تک کی خواتین طنز نگاروں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا لیکن اپنا نام گول کر دیا۔ حالانکہ وہ خود بھی طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتی ہیں اور "کاغذی ہے پیرہن" کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے وہ ایک کالج میں اردو کی پروفیسر ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیار پاکستان میں زیادہ متعارف نہیں ہیں اس لئے کہ ان کے زیادہ تر مضامین ہندوستان کے جرائد میں شائع ہوتے ہیں لیکن وہ اس کانفرنس میں ایک بہت اچھی اور کامیاب طنز نگار کی حیثیت سے منظر عام پر آگئیں اور انہوں نے "بچہ باہر گیا ہے" کے عنوان سے مضمون پڑھا جس میں خلیجی ریاستوں میں کام کرنے والوں کی طرز زندگی پر بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ طنز کیا گیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان تینوں خواتین کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ اس کانفرنس میں ایک اور نوجوان طنز نگار فیاض احمد فیضی سے حاضرین متعارف ہوئے جو بمبئی سے خاص طور پر کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے "پھلوں میں رنگ بھرے" کے عنوان سے بہت ہی خوبصورت مضمون سنایا جس میں معاشرے پر بہت ہی لطیف طنز کیا گیا تھا۔ فیاض احمد فیضی کی نوعمری اور ان کے طنز کی کاٹ کو دیکھ کر حاضرین کو بہت حیرت ہوئی اور انہوں نے ان کے بارے میں بڑی توقعات اور امکانات کا اظہار کیا۔

اس اجلاس میں ایم ایم حسن (اسلام آباد) نے کراچی کے لیکچر اور ذاکر علی خان نے بستہ کانفرنس کے عنوان سے طنزیہ مضمون پڑھا جو اپنی کاٹ اور نشتر زنی کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا۔ ایم ایم حسن کا تعلق محکمۂ پولیس سے ہے جس پر سامعین نے اور بھی حیرت کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی یوسف ناظم کا شمار بھی ہندوستان کے صف اول کے طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ بمبئی سے تشریف لائے تھے لیکن ان کا تعلق بھی سرزمین حیدرآباد (دکن) سے تھا۔ جس سے ثابت ہوا کہ حیدرآباد (دکن) اس وقت ہندوستان میں طنز و مزاح نگاری کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ انہوں نے اس موقع پر "ذرا مسکرائیے" کے عنوان سے طنزیہ مضمون پڑھا جس میں خود نگرانی کے حوالے سے معاشرے پر بہت ہی خوبصورت طنز کیا گیا تھا۔ صدر جلسہ آفتاب احمد خاں نے کانفرنس میں پڑھے جانے والے مضامین اور مقالات کے بلند معیار پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ آخر میں کے ایم سی کامپلکس میں سینیٹر محسن صدیقی کی

صدارت میں شب لطیفہ و شگوفہ منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی ہندوستان سے آئے ہوئے مہمان حمایت اللہ تھے۔

انجمن ترقی اُردو کا استقبالیہ

گزشتہ ہفتے بھی پہلی پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس میں آئے ہوئے ہندوستانی مندوبین کے اعزازات میں استقبا
جلسوں کا سلسلہ جاری رہا اور کراچی کی کئی مشہور ادبی اور ثقافتی انجمنوں نے ان کے اعزاز میں نشستیں منعقد کیں۔ جن میں انجمن ترقی
اُردو پاکستان، ہم عصر اور انجمن تجارت، ملازمت اور زراعت پیشہ خواتین شامل ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے استقبالیے میں ہندوستا
سے آئے ہوئے مہمان مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، مصطفیٰ کمال، شفیقہ فرحت، ڈاکٹر حبیب ضیاء، ڈاکٹر رشید موسوی، فیاض احمد فیضا
اختر بھوپالی، طالب خوندمیری، حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ کے علاوہ لاہور سے آئے ہوئے مشہور نقاد اور شاعر ڈاکٹر وزیر آ
نے بھی شرکت کی۔ جن پاکستانی ادباء نے شرکت کی ان میں صدر انجمن نورالحسن جعفری، ادا جعفری، اسلم فرخی مختار زمن، مشفق خواجہ
نصراللہ خان، خواجہ حمید الدین شاہد، شان الحق حقی، قدرت نقوی، معین الدین عقیل، علی حیدر ملک، جمیل زبیری، تقی حسین خسر
اور راغب شکیب وغیرہ شامل ہیں۔ اس موقع پر انجمن کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجمن کے کتب خانۂ خاص میں موجود
نادر و نایاب کتابوں کی تفصیل بیان کی اور پھر گفتگو کا رخ ہندوستان میں اُردو زبان و ادب کی جانب مڑ گیا۔ گفتگو میں مجتبیٰ حسین
یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور مختار زمن نے حصہ لیا۔

انجمن تجارت، ملازمت اور زراعت پیشہ خواتین

انجمن تجارت، ملازمت اور زراعت پیشہ خواتین کی نشست کی صدارت اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر پروفیسر پریشا
خٹک نے کی۔ اس موقع پر معین قریشی نے اپنا مزاحیہ مضمون "موصوف اور موصوفہ" شفیقہ فرحت نے "ایک تبسم" یوسف ناظم نے
"سواریاں" اور مجتبیٰ حسین نے "ریلوے منتری مسافر بن گئے" سنایا۔ آخر الذکر دونوں مضامین بہت پسند کئے گئے اور خوب دا
و تحسین کی بارش ہوئی ____ "ہم عصر" کی نشست طنز و مزاح کے لئے مخصوص تھی جس کے مہمان خصوصی مجتبیٰ حسین تھے۔ اس محفل
میں ہندوستانی مہمانوں کے علاوہ پاکستانی طنز و مزاح نگاروں نے بھی اپنی تخلیقات سنائیں۔ سب سے پہلے ابھرتے ہوئے مزاح نگا
اور افسانہ نویس مرزا حمید عباس "دیوان غالب کی تقریب رونمائی" کے عنوان سے مضمون پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ مشہور صحافی اور طنز
مختار زمن نے "نقاد" کے عنوان سے مزاحیہ مضمون پڑھا جس میں انہیں خوب داد ملی۔ طنز و مزاح کی اس محفل میں منظر علی خا
نے روشن سبطین کے افسانوں کے مجموعہ "ساحل سمندر اور جزیرے" پر اپنا تنقیدی مقالہ پیش کیا۔ ضیاء الحق قاسمی نے
مزاحیہ قطعات سنائے۔ ہندوستانی مہمانوں میں محترمہ شفیقہ فرحت نے اپنا مضمون "رانگ نمبر"، ڈاکٹر حبیب ضیاء نے اپنا
مضمون "بڑا ڈاکٹر" اور مہمان خصوصی مجتبیٰ حسین نے اپنا مزاحیہ سفرنامہ "یونیسکو کی چھتری" سنایا۔ حسب معمول
مجتبیٰ حسین کا سفرنامہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔

پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس کے مندوبین کو یونی کیرینز کا استقبالیہ

"ہجومِ غم میں اہلِ کراچی کا مسکرانا، اُن کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے" ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

جامعہ کراچی کے متعلقہ فارغ التحصیل طلبہ کی انجمن یونی کیرینز کی مجلسِ منتظمہ کی جانب سے پاک و ہند طنز و مزاح کانفرنس کے غیرملکی مندوبین کے اعزاز میں ایک الوداعیہ استقبالیہ ترتیب دیا گیا۔ جلسہ کی صدارت صدر یونی کیرینز جناب مسعود نقوی نے فرمائی۔ مجلس منتظمہ کی جانب سے ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ایوانِ اُردو کے پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ استقبالیہ سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کے ممتاز مزاحیہ ماہنامہ "شگوفہ" کے مدیر اعلیٰ پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے مندوبین کی جانب سے اہلِ کراچی اور اہلِ پاکستان کا پرتپاک خیر مقدم کرنے پر دلی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری ادبی کاوشوں پر گرم جوشی سے تحسین اور داد دی گئی اور دیوان خانوں سے لے کر بڑے بڑے اجتماعات میں جس ذوق سماعت کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا۔ وہ ہمارے لیے خصوصی تحریک کا باعث بنا ہے۔ ہمارے نثری مضامین کے پسندیدہ جملوں تک پر اس طرح داد دی جاتی رہی، جیسے مشاعروں میں اچھے اشعار پر دی جاتی ہے۔ یہ ہمارے لیے حیرت ناک ہے۔ یہ ایسے ہی شہر میں ہو سکتا ہے جہاں لوگوں کو ادب کا عرفان ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہجومِ غم کے درمیان مزاح لکھنا اور اس کو پسند کرنا اور مسکرانا اعلیٰ ظرفی ہے۔ کراچی کے حالیہ پس منظر میں طنز و مزاح سننے کے لیے اجتماعات میں لوگوں کی بڑی تعداد میں شرکت، اہلِ کراچی، اہلِ پاکستان کی اعلیٰ ظرفی، بلند ہمتی، زندگی اور زندہ دلی کا ایسا ثبوت ہے جس کا نقش ہمارے دلوں پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے آزادی کے بعد بھارت میں طنز و مزاح کے اردو ادب میں ہونے والے کام کا اجمالی جائزہ پیش کیا اور انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد کے خصوصی حوالے سے ۱۹۶۷ء کے بعد ہندوستان میں ہر سال منعقد ہونے والی کُل ہند طنز و مزاح کانفرنسوں اور ۱۹۸۵ء میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کوششوں کی وجہ سے حیدرآباد بھارت میں طنز و مزاح کے مرکز ثقل کی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور اب شہر غزالاں ہی نہیں بلکہ شہرِ زندہ دلان بھی کہلاتا ہے۔ حاضرینِ جلسہ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے بتایا ہندوستان میں یہ خیال ہے کہ وہاں راست طنز کیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں اس کا اظہار علامتوں میں پوشیدہ ہے لیکن وہ خود یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جگہ ایک ہی میڈیا استعمال کیا جارہا ہے۔ نثر و نظم کالموں اور کتابوں اور اخباروں میں کھُل کر لکھا جارہا ہے اور اظہار کے طریقے میں کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ پاکستان میں آزادی اظہار کا گلا دبا دیا گیا ہو۔ پاکستان کا قاری اور سامع باشعور ہے اور اس کا ردِّ عمل فوری ہوتا ہے۔ سامعین کے پُرزور اصرار پر جناب فیاض احمد فیضی نے اپنی ایک شوخ تحریر پڑھ کر سنائی۔ بھارت کے ممتاز مزاحیہ شعراء جناب حمایت اللہ، جناب مرزا مصطفےٰ علی بیگ۔ اور جناب طالب خوندمیری نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں دکنی۔ انگلو اُردو اور مزاحیہ موضوعاتی قطعات اور نظمیں پیش سامعین کیں۔ اختتام پر جنرل سکریٹری پروفیسر کلیم علی خان شیروانی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور مدیر مجلّہ یونی کیرینز جناب اطہر عباس ہاشمی نے مجلّہ کا تازہ شمارہ مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا۔ آخر میں مہمانوں کے ممتاز یونی کیرینز ڈرامہ نویس محترمہ حسینہ معین و دیگر شعراء و ادیبوں و دیگر اراکین مجلس منتظمہ کے ہمراہ گروپ فوٹو لیے گئے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

اگست ۱۹۸۸ء

جلد : ۲۱

شمارہ : ۸

سرورق کی تصویریں : مشاعرہ زندہ دلان بمبئی کے موقع پر لیے گئے گروپ فوٹو۔

دائیں سے بائیں : ( ) مسٹر لکھنوی، میر حیدر علی، راغب مرادآبادی۔ غلام نجم الدین۔ دلاور فگار۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔ طالب خوندمیری۔ جناب محمد قربان (کونسل جنرل پاکستان) ضیاء الحق قاسمی۔ محمد حبیب خاں۔ ڈاکٹر اطہر زیدی۔ زبیر فاروق۔ خالد عرفان خنداں۔ ضمیر جعفری۔ انور مسعود۔

( ) پاگل عادل آبادی۔ غلام نجم الدین۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔ میر حیدر علی۔ دلاور فگار۔ انور مسعود۔ طالب خوندمیری۔ خالد عرفان۔

کتابت : محمود سلیم۔ محمد عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان۔ حیدرآباد۔ ۲

قیمت فی پرچہ : ۲ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ : ۵۰ روپے
عرب ممالک سے : ایک سو پچاس روپے

خط و کتابت کا پتہ :
۱۳۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد
فون آفس : 557716 فون مکان : 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

قاضی جی دبلے (رپورٹ)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

چوُرن (منظومات)

عابد معز (حیدرآباد)

سوال نامہ

انسان کو مختلف سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ کہنا یوں چاہیئے کہ انسانی زندگی مختلف سوالات کے حل کرنے میں گزر جاتی ہے۔ ہر لمحہ کوئی نہ کوئی سوال درپیش رہتا ہے۔ پیدائش کے ساتھ ہی سوال کیا جاتا ہے "بچہ ہے یا بچی"؟ اس سوال سے سوالوں کی ابتداء ہوتی ہے تو انتہا زندگی ختم ہونے کے بعد منکر اور نکیر کے سوالات اور پھر میدانِ حشر میں زندگی کے دوران انجام دیئے گئے کارناموں کے متعلق سوالات پر ختم ہوتی ہے۔ یہ سوالات ہی تو ہیں جو زندگی اور بعد الموت زندگی کے حالات کا رُخ موڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کہ ایک سوال نے میٹرک کے بعد ہمیں سائنس کے بجائے آرٹس میں داخلہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ سوال تھا "آکسیجن زندگی کے لیے کیوں اہم ہے"؟ ایک اور سوال نے ملازمت کیلئے ہمیں نااہل قرار دیا تھا۔ "دریائے نیل کی لمبائی کتنی ہے"؟ مزید ایک سوال نے ہمیں اپنی محبوبہ سے شادی کرنے سے باز رکھا۔ ہم اپنی کلاس فیلو کے عشق میں گرفتار تھے۔ وہ بھی پڑھتی تھی ہم بھی پڑھتے تھے۔ ہمارا رشتہ پہنچنے پر لڑکی کے والد نے سوال کیا تھا "لڑکا کیا کرتا ہے"؟

سوالات دوسروں سے کئے جاتے ہیں۔ سوال کرنے والا مطمئن اور خوش رہتا ہے جب کہ جواب دینے والا پریشان۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ، وہ حضرات خوش رہتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ سوالات کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات سوالات کرنے والے حضرات خود اپنے دام میں آپ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ تب وہ اپنے آپ سے سوالات کرنے لگتے ہیں۔ ایسے سوالات خطرناک ہوتے ہیں ان سے دن کا چین اور رات کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ "میں کون ہوں"؟ انسان جب یہ سوال اپنے آپ سے کرتا ہے تو اس کے وجود میں ایک ہیجان سا بپا ہوتا ہے جو اسی وقت ختم ہوتا ہے جب خود اپنے آپ سے سوال کرنے والا شخص پاگل قرار پاتا ہے یا پھر وہ بہت بڑا فلسفی بن کر اُبھرتا ہے۔ ہمارے محلہ میں ایک شخص رہتا ہے، جس کے پیچھے بچے اور کتے لگے رہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ شخص چند سال قبل بہت جینیس تھا۔ بہت قابل تھا۔ علم معلومات میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لوگوں سے مختلف سوالات کر کے انھیں بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ پھر ہوا یوں کہ یہ شخص دوسروں سے سوالات کرنے کے بجائے خود اپنے آپ سے سوالات کرنے لگا "میں کون ہوں کیا ہوں اور کیوں ہوں"؟

سوالات بے معنی بھی ہوتے ہیں۔ بے معنی سوالات بے ضرر ہوتے ہیں۔ یہ سوالات اکثر جذبات کی رَو میں کئے جاتے ہیں۔ عاشق اور محبوب کے سوالات اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ "آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں"؟ "کیا تم میرے لیے

آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہو؟" عام حالات میں ایسے سوالات سُن کر سوال کرنے والے کی دماغی صحت پر شبہ ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی مخصوص حالات کی وجہ سے بے معنی سوالات بھی اہم ہو جاتے ہیں۔ نہ جانے پہیلیاں ہوتے ہیں۔ ساتھ جینے اور مرنے کے وعدے کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات نہ ملنے پر دل ٹوٹ جائیں۔ آپ نے یہ کہانی تو سُنی یا پڑھی ہو گی: ایک شہزادی نے اعلان کیا تھا کہ وہ صرف ایسے شخص سے شادی کرے گی جو اس کے تین سوالات کے جواب دے سکے۔ اس نے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ غلط جواب دینے والے کی گردن اُڑا دی جائے گی۔ بے معنی سوالات بچے بھی کرتے ہیں: "ڈیڈی جی کہاں سے آتی؟ آپ ایسے کیوں ہیں؟" بے معنی سوالات کرنے والا جوابات کے لیے اصرار کرتا ہے۔ جب کہ جواب دینے والا ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

سوالات قابلیت کا امتحان ہوتے ہیں۔ یہ سوالوں کی عام قسم ہے۔ طالب علموں کے لیے سوالات وبالِ جان ہوتے ہیں۔ آج کل اس قسم کے سوالوں کے نت نئے اقسام ہیں۔ طویل سوالات۔ یہ آزاد قسم کے سوال ہوتے ہیں جس میں جواب دینے کے لیے کوئی بندش نہیں ہوتی۔ جوابات میں کئی صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں۔ ممتحن جواب پڑھ کر نہیں جواب کی طوالت سے گھبرا کر نشانات دیتا ہے۔ چند نمونے کے سوال پیشِ خدمت ہیں۔ اکبر اعظم کے دورِ حکومت کے بارے میں لکھو؟ ملیریا کے تعلق سے جو کچھ معلوم ہو لکھو؟ حیاتیات اور نباتیات میں فرق بتلاؤ؟۔ دوسری قسم کے سوالوں میں جواب دینے والوں کو بکواس کی اجازت نہیں ملتی۔ مختصر سوالات کے مختصر اور واضح جوابات دینا پڑتا ہے۔ ان سوالوں میں جواب دینے والے کی آزادی محدود کر دی جاتی ہے۔ وہ زیادہ آئیں بائیں شائیں نہیں کر سکتا۔ نمونے کے سوال ہیں۔ اکبر اعظم کے دینِ الٰہی کے بارے میں دس سطریں لکھو؟ ملیریا کی وجہ جرثومہ کے بارے میں لکھو؟ حیاتیات اور نباتیات کے درمیان تین اہم فرق بتلاؤ؟ آج کل جو سوالات کئے جاتے ہیں ان میں جواب دینے کی آزادی بالکلیہ ختم کر دی جاتی ہے سوال کے ساتھ جوابات بھی دیئے جاتے ہیں۔ کبھی تین تو کبھی پانچ حل کرنے والے کو صحیح جواب یا صحیح جوابوں میں سے بہترین جواب کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ خالی جگہوں کو پُر کرنا پڑتا ہے سوال صحیح ہے یا غلط ہے بتلانا پڑتا ہے۔ قابلیت بگھارنے کے لیے بندشیں لگائی جائیں تو قابلیت بھی اسی حساب سے سکڑ جاتی ہے۔

ایسے سوالات بھی ہوتے ہیں جن میں سوال سے زیادہ سوال کرنے والے کی اہمیت ہوتی ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سوال کیا ہے کیسے کیا گیا ہے سوالی کو دیکھا جاتا ہے۔ ہاتھ میں کشکول یا دل ہے بعض وقت صرف ہاتھ پھیلے ہوتے ہیں لب خاموش ہوتے ہیں۔ حلیہ بھی ایک جیسا ہوتا ہے بال بکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے چہرہ گرد آلود سمجھ میں نہیں آتا اللہ کے نام پر ہاتھ پھیلا ہوا ہے یا محبوبہ کے لیے بانہیں کھلی ہیں۔

بعض سوالات میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ان میں سے بھی کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ ایسے سوالات عموماً پولس والے تفتیش کے دوران کرتے ہیں یا پھر وکلاء جرح کرتے وقت گواہ کو پریشان کرتے ہیں۔ ان سوالوں کا مقصد حقیقت اگلوانا نہیں ہوتا بلکہ سچائی کو مسخ کر کے اپنے مطلب کا بیان حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے سوالوں کے جوابات دینے سے پہلے سچ بولنے کی قسم بھی کھانی پڑتی ہے۔ شاید زندگی میں یہی منفرد سوالات ہوتے ہیں جن کے جوابوں کے لیے سچ بولنے کی قسم دلائی جاتی ہے۔ یہ احساسات ہے کہ لوگ ان سوالوں کے جوابوں میں سچ کے علاوہ سب کچھ بولتے ہیں۔ ایسے سوالات سے ہمیں بہت خوف آتا ہے۔ احتیاط سے جوابات دینا پڑتا ہے۔ زبان کی معمولی لغزش کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے ہر سوال کو سُن کر سوچ سمجھ کر جواب دینا پڑتا ہے۔ یہ بھی غور کرنا پڑتا ہے کہ سوالی کی نیت کیا ہے وہ اس قسم

کا سوال کیوں کر رہا ہے اور سوال کے جواب میں کیا جاتا ہے اس قسم کے سوالوں سے یہ خیال بھی آتا ہے کہ سوال کرنے والوں کو بھی قسم دی جانی چاہیئے کہ میں ٹھیک سوال کروں گا۔ میرے سوالات کا مقصد سچائی اگلوانا ہے گواہ کو پریشان کرنا نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہے۔

بعض سوال ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب میں خاموشی بہتر ہوتی ہے۔ آج کل زیادہ تر ایسے ہی سوالات کئے جاتے ہیں۔ بیوی کا تقریباً ہر سوال ایسا ہی ہوتا ہے جس میں شوہر کی خاموشی بہترین جواب ہوتی ہے۔ "آپ رات دیر سے کیوں آئے"؟ آپ سچ بولنے سے رہے کہ میں دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ یا مے نوشی میں مصروف تھا۔ خاموشی بہتر ہوتی ہے اصرار کرنے پر ایسے سوالات کا گول مول جواب دیا جاسکتا ہے۔ بعض مرتبہ بلاضرورت جواب میں لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ ہر سوال کا جواب خاموشی نہیں ہوسکتا، بعض سوالوں کے جوابوں میں خاموشی اقرار جرم سمجھی جاتی ہے تو بعض سوالوں کے جواب میں خاموشی خطرناک حالات پیدا کرتی ہے۔

ایسے سوال بھی ہوتے ہیں جن کے جواب ہاں نہیں میں دینا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ جواب دیتے وقت زبان کو تکلیف دی جائے کیوں کہ گردن ہلا کر یا اشاروں سے کام چلایا جاسکتا ہے اس طرح اشاروں کے جواب میں ہر دو کا فائدہ ہے۔ سوال کرنے والا اپنے مطلب کا جواب سمجھتا ہے اور جواب دینے والا اپنے انداز سے۔ جواب دیتا ہے جو کبھی خوش فہمی تو کبھی غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے۔

بعض سوال ایسے ہوتے ہیں جن کے جواب نباتِ خود سوال ہوتے ہیں۔ ایسے سوالات اور جوابی سوالات اکثر فلسفی منطقی اور مقررین حضرات کرتے ہیں۔ بحث مباحثہ میں ایسے ہی سوالات اور سوال نما جوابات کی بھرمار ہوتی ہے۔ نتیجہ صفر نکلتا ہے۔ کئی گھنٹوں کے سوالات، جوابات اور جوابات، سوالات کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ جوں کا توں برقرار ہے اس قسم کے سوالات کے جوابات دینا ایک فن ہے کوئی ماہر ہی اس قسم کے سوالوں کے جوابات دے سکتا ہے یہی ایک مقام ہے جہاں سوال کرنے والے سے زیادہ جواب دینے والے کی اہمیت ہوتی ہے اکثر و بیشتر جیت بھی جواب دینے والے کی ہوتی ہے۔ ایسے ماہر شخص کو ہمارے ایک دوست "حجت الکلیکوی" کہتے ہیں۔

کب، کیوں اور کہاں اور کون، کیسے اور کیا یہ چھ سوال تقریباً ہر سوال کی ماں ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر بھی سوال بنتے ہیں لیکن ان سوالوں کی وہ دھاک نہیں بیٹھتی جیسے کہ ان الفاظ کے استعمال کرنے سے بیٹھتی ہے۔ سوالی الفاظ حرف ک سے شروع ہوتے ہیں اِسی لیے ہمیں ک سے ڈر لگتا ہے۔ سوال کے اندیشہ سے ک کو دیکھتے یا سنتے ہی کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ کاف کا تلفظ بھی غور فرمائیے۔

سوالات جہاں چاہیں اور جب چاہیں اور جتنے چاہیں کئے جاسکتے ہیں لیکن اکثر سوالات کرنے کے مقامات مقرر ہوتے ہیں جیسے امتحان ہال، عدالت، کانفرنس روم، پولس والوں کا کنفیشن روم وغیرہ۔ ان مقامات پر لوگ سوالات کرنے اور سوالات کے جوابات دینے کے لیے تیاری کرکے آتے ہیں۔ سیر تو سوا سیر والا معاملہ ہوتا ہے بعض مرتبہ معمولی سوال و جواب؛ بحث و مباحثہ اور لڑائی جھگڑے کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔

سوال کرنے کے کئی مقاصد ہوتے ہیں۔ سوالات قابلیت کا امتحان ہوتے ہیں، تحقیق، تفتیش اور پریشان کرنے

جاتا ہے۔ پہیلیاں بجھائی جاتی ہیں، کویز بوجھے جاتے ہیں۔ انسانی تجسس کا اظہار بھی مختلف سوالوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بعض سوالات ایسے ہیں جن کے جوابات ابھی تک معلوم نہ ہو سکے۔ لوگ سر جوڑے ان سوالوں کے حل دریافت کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ چند سوال ہیں۔ علم پہلے کہ عقل؟ مرغی سے انڈا یا انڈے سے مرغی؟ الف سے پہلے اور ی کے بعد؟ ادب برائے زندگی یا زندگی برائے ادب؟

سوالات پر مبنی اس مضمون کو ہم اپنے اس سوال پر ختم کرتے ہیں "کیا آپ کو یہ مضمون پسند آیا؟"

ایس۔ ایم۔ معین قریشی
کراچی (پاکستان)

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

چھٹی اہلِ قلم کانفرنس کے پہلے اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی تقریر کرتے ہوئے آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم خان صاحب نے چند نہایت بصیرت افروز باتیں ارشاد فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ اچھا ادب بھوکے پیٹ سے تخلیق ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں علم و ادب کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اور ادیب کو بھوکا رکھا جائے۔ بے شک آپ اس کے فن پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائیں مگر اسے فکرِ معاش سے آزاد کرنا چنداں ضروری نہیں۔ اگر وہ زندگی کی تکلیفوں سے روشناس نہ ہوگا، رنج و غم کا نشانہ نہیں بنے گا تو اس کی تحریر میں درد کیسے پیدا ہوگا، خود نہیں روئے گا تو دوسروں کو کیسے رُلائے گا، جسم نحیف و نزار نہ ہوگا تو تحریر میں نزاکت کیسے پیدا ہوگی۔ گویا سردار صاحب کے خیال میں اعلیٰ درجے کا ادب اُسی وقت لکھا جا سکتا ہے جب ادیب کی حالت یہ ہو کہ ؎

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

اُنھوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ ادیب قوم و ملک کی رہنمائی کرتے ہیں اس عزت افزائی کیلئے ہم ان کے مشکور ہیں ویسے قوم و ملک کی رہنمائی کا دعویٰ تو سیاست دان بھی کرتے ہیں لیکن سردار صاحب نے ان کے لیے یہ نسخۂ کیمیا تجویز کرنے سے بوجوہ احتراز کیا اور صرف اہلِ قلم کو اپنے زرین مشورے سے نوازا۔ سچ ہے ؏

جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

ہم نے سردار صاحب کے ارشادات پر خالی پیٹ تو نہیں البتہ خالی الذہن ہو کر غور کیا اتفاق سے ہمیں اُردو ادب کی ایک مختصر تاریخ مرتب کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ہم نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کریں گے کہ ہمیں تاریخی اعتبار سے ادبِ لطیف اور فاقہ خفیف میں کوئی خاص تعلق نظر نہیں آیا۔ دورِ قدیم کے شاہانِ بیجاپور سے لے کر سلاطینِ اودھ اور [illegible]

تک اور دورِ جدید میں جوش سے فیض تک بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے حالات پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سب کھاتے پیتے تھے۔ کچھ اختلاف ہے تو صرف اس پر کہ ان میں بعض کھاتے زیادہ تھے یا پیتے زیادہ تھے۔ ابنِ انشاء مرحوم نے کسی جگہ لکھا تھا "لکھنؤ کے شاعر اور پنجاب کے شاعر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ لکھنؤ کا شاعر زبان کی صحت کا زیادہ خیال رکھتا ہے اور پنجاب کا شاعر خود اپنی صحت کا۔" پنجابی ہونے کے ناطے انشا جی نے کسرِ نفسی سے کام لیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ میں بھی ایسے حضرات کی کمی نہیں جنھوں نے اپنے فن کے ساتھ تن کی افزائش پر بھی کما حقہ، توجہ دی۔

اس ضمن میں تفصیلات کے لیے کئی دفتر درکار ہوں گے لہٰذا چند مثالوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے امام بخش ناسخ کا نام ذہن میں آتا ہے جو دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تھے اور اپنے شوق (پہلوانی) کے باعث اردو ادب میں "پہلوانِ سخن" کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ اپنی "تاریخ ادب اردو" میں ان کی شاعرانہ عظمت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں "شیخ ناسخ تین چیزوں کے واسطے مشہور ہیں۔ ایک ان کی قادرالکلامی جو ان کی غزلوں سے معلوم ہوتی ہے دوسرے وہ طرز جو انھوں نے ایجاد کیا تیسرے ایک بڑی جماعت شاگردوں کی جن کو وہ اپنے بعد چھوڑ گئے"۔ اب اس قادرالکلام شاعر کی خوراک کا حال مولانا آزاد کی زبانی سنیئے۔ "آبِ حیات" میں لکھتے ہیں "پانچ سیر پختہ شاہجہانی کی خوراک تھی" آگے چل کر ایک راوی کے حوالے سے لکھتے ہیں "مجھے چند مرتبہ ان کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا۔ اس دن نہاری اور نان تافتان بھی بازار سے منگائی تھی۔ پانچ چار پیالوں میں قورمہ، کباب، ایک میں کسی پرندے کا قورمہ تھا۔ شلغم تھے، چقندر تھے ارہر کی دال، دصوئی ماش کی دال تھی اور وہ دسترخوان کا شیر اکیلا تھا مگر سب کو فنا کر دیا۔"

اردو کے ایک اور شاعر سوز (داغ کے والد) کے تن و توش کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں "سواری میں شہسوار اور فنونِ سپہ گری میں ماہر۔ خصوصاً تیر اندازی میں قدر انداز تھے۔ ورزش کرتے تھے۔ اور طاقت خداداد بھی اس قدر تھی کہ ہر ایک شخص ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا۔" تاہم جسمانی قوت کلام کی نزاکت میں حائل نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہی آزاد لکھتے ہیں "ان کی طبع موزوں کے آئینے کو جس طرح صفائی سے جلا کی تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی نے اس میں جوہر پیدا کیا تھا۔"

دُور کیوں جایئے۔ سچ کے تو اقلیم سخن کے بے تاج بادشاہ مرزا غالب بھی نہیں رہے کیوں کہ ظل اللہ کے مصاحب" تھے۔ ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "مجھ کو دیکھو۔ . . . . باتیں کیئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیئے جاتا ہوں"۔ . . . حالی "یادگارِ غالب" میں ان کی غذا کے مینو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں "مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسہل کے دن بھی انھوں نے کھچڑی یا شوربا بھی نہیں کھایا۔ . . . دن کو جو کھانا ان کے لیے گھر سے آتا تھا اس میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں اور دوسرے میں لعاب یا شوربا ایک پیالے میں ایک پھلکے کا چھلکا شوربے میں بھگو کر ہوتا۔ ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی اور ایک پیالی میں دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب

"بس اس سے زیادہ اُن کی خوراک اور کچھ نہ تھی"۔

سرسید احمد خان بھی قوی الجثہ تھے "حالیؔ" حیات جاوید" میں ان کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "رنگ سُرخ و سفید، پیشانی بلند، سر بڑا اور موزوں . . . . جسم بہت فربہ، قد لمبا . . . . تمام اعضاء نہایت قوی اور زبردست، بدن ٹھوس، وزن ساڑھے تین من"۔ اس کے باوجود سرسید کس پایہ کے دانشور اور دانشمند تھے اس کا اعتراف اہلِ مغرب نے بھی کیا ہے چنانچہ کہتا ہے "میرا اپنا خیال ہے کہ ان سے زیادہ بڑے آدمی سے میں کبھی نہیں ملا" سی ایف اینڈ روز کی رائے میں "انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے نمایاں شخصیت سرسید ہی تھے"۔

ذرا اور آگے بڑھیے۔ "نایاب ہیں ہم" میں صادق الخیری، معتوف غم علامہ راشد الخیری کے سراپے کے بارے میں لکھتے ہیں "بدن کسرتی اور ڈیل ڈول بھاری بھرکم تھا . . . آواز شیر کی طرح گرج دار تھی" علامہ کے کھانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دوستوں کے ساتھ آدھی آدھی رات محفلیں رہتیں۔ احباب جہاں نشست ہوتی وہاں کھا لیتے "مگر علامہ موصوف نے کبھی رات کو کھانا باہر نہیں کھایا۔ رات کو واپسی پر بیوی کو کھانا گرم کرنے میں مدد دیتے اور ان کے ساتھ کھاتے تھے"۔ ملّا واحدی کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انھیں دیگ کا سالن بہت مرغوب تھا۔ عبدالرحمٰن چغتائی (جو مصور ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ کار ادیب بھی تھے) کے بارے میں خیری صاحب رقم طراز ہیں "کبھی کھانے کو دیر ہو جاتی تو بازار سے کباب اور روٹی منگا کر اسی پر اکتفا کرتے اور اپنی دُھن میں پھر لگ جاتے" مولانا ماہر القادری کی پُرخوری تو زبان زد خاص و عام ہے۔ مرحوم نہاری کے رسیا تھے اور زمانہ شاہد ہے کہ ان کے طعام کی مقدار کبھی ان کے کلام کے معیار کو متاثر نہ کر سکی۔

دورِ حاضر کے جو اہلِ قلم بفضلِ خدا حیات ہیں ایک نظر ان پر بھی ڈال لیجیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی، سید ضمیر جعفری، قمر جمیل، دلاور فگار، نسیم درانی، عالمتاب تشنہ، امجد اسلام امجد، محمد منشا یاد اور کریم بخش خالد سمیت بے شمار ایسے نام ملیں گے جو عروسِ ادب کی نوک پلک سنوارنے کے ساتھ خود اپنی شخصیت کو بھاری بھرکم بنانے کی طرف سے بھی غافل نہیں۔ مشتاق یوسفی نے کہیں لکھا ہے کہ میں نے کسی بھی عالم کو کبھی نحیف و ناتواں نہیں دیکھا اور اس کی دو وجوہ ہیں یعنی ــ "سادہ غذا اور ورزش سے پرہیز" بس کچھ یہی حال اہلِ قلم حضرات کا بھی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ بندہ بھوکا ہوگا تو وہ فکرِ سخن کرے گا یا فکرِ شکم؟ ہمارے اس نظریے پر صاد اور سردار عبدالقیوم خان صاحب سے مودبانہ اختلاف اہلِ قلم کانفرنس کے دوسرے روز افتتاحی نشست میں جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی کیا تھا۔ اُنھوں نے علامہ اقبال کے حوالے سے بتایا کہ گوئٹے اسی لیے اعلیٰ پایہ کا ادیب بن گیا تھا کہ فکرِ معاش سے آزاد تھا اور اپنے ملک کے محکمۂ تعلیم میں مشیر ہو گیا تھا۔ جنابِ والا! بھوکے کو تو ہر طرف روٹیاں ہی نظر آئیں گی ؎ کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال؟ اسی لیے اردو کے ملی شاعر نظیر اکبرآبادی نے کہا تھا ؎ پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے ÷ یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے

وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے ÷ ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے

نسیم سحر (جدہ)

غزلیں

○

اونٹ بھی کہہ دے اگر صاحب، زرافہ دیکھ کر : داد سب دیتے ہیں بس اس کا قیافہ دیکھ کر
لے گئے تجار تو ساری بچت میرے طفیل : خوش تھا میں تنخواہ میں اتنا اضافہ دیکھ کر
کون برقعے میں ہے، اس کی عمر کیا ہے رنگ کیا : "خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"
نام رکھیں اور کچھ دارالخلافے کا نسیم : سوچتے ہیں اس کو "دارالاختلافہ" دیکھ کر

○

پہلے محفل میں پاندان کھُلے : جا بجا بھر اُگالدان کھُلے
چھتریاں چھٹ گئی ہیں لوگوں کی : اے خدا، اب تو آسمان کھُلے
کیوں دکھاتے ہیں اتنی تنگدلی؟ : لوگ رکھتے ہیں جو مکان کھُلے
شیخ کی خامشی ہی بہتر ہے : جانے کیا کہہ دے جب زبان کھُلے
مرضِ عشق کی دوا بھی ملے : کوئی ایسی یہاں دکان کھُلے
ڈر کے دریا میں لوگ کود گئے : جونہی کشتی کے بادبان کھُلے
وہی ہوتے ہیں کامیاب نسیم : جن کی آنکھیں ہوں بند کان کھُلے

○

پیش دستی نہ ہم سے ہو پائی! : غیر یہ کام کر گئے ہوں گے
کل ہے شادی، وہ مونچھ منڈوانے : جانبِ باربر گئے ہوں گے
اونٹ بھی قیس کی وفات کے بعد : دشت سے کوچ کر گئے ہوں گے
شیخ ہی بھول کر گیارہ بجے : روزہ افطار کر گئے ہوں گے
ہم کو تو اُس نے دور ہی رکھا : غیر اُس کے NEAR گئے ہوں گے
دُور اب بھی مری پہنچ سے ہیں وہ : مجھ سے وہ تیز تر گئے ہوں گے
جب کھُلیں ان کی میک اپ کی تہیں : لوگ ناگاہ ڈر گئے ہوں گے
ہم نے تو جوتیاں گھسائی ہیں! : وہ مگر کار میں گئے ہوں گے
پیار سے اُس نے جب نمک چھڑکا : زخم ناگاہ بھر گئے ہوں گے
یہ دکھوے کی رسم میں اور ہم؟ : ڈاکٹر واکٹر گئے ہوں گے

محمد خورشید نادر
(کامٹی)

معیارِ انتخاب

بخدمت جناب صدر صاحب،
مرکزی انتخابی کمیٹی۔

واضح ہو کہ پارٹی کی مقامی شاخ کے دفتر میں آپ کی طرف سے جاری کردہ مراسلہ موصول ہوا، جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ اگلے عام چناؤ کے لیے اس حلقہ سے ایک امیدوار کے نام کی سفارش مرکزی انتخابی کمیٹی کو بھیجی جائے تاکہ اسے باضابطہ طور پہ پارٹی کا امیدوار نامزد کیا جا سکے۔

حسبِ ہدایت پارٹی کی مقامی شاخ کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا۔ مجلسِ عاملہ کافی بحث وتمحیص اور غور وخوض کے بعد ایک اُمیدوار کے نام کی سفارش کرنے پر متفق ہو گئی ہے۔ مراسلہ میں درج ہدایات کے مطابق مجوزہ ممبر کی ذاتی خصوصیات، اس کے نظریات معروفیات، سماجی خدمات اور دیگر کارہائے نمایاں کی تفصیلی رپورٹ ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

یہ شخص ہمیشہ سفید کھادی میں لپٹا ہوا رہتا ہے سفید کُرتا، سفید چُست پاجامہ، سفید ٹوپی۔ حتّٰی کہ انڈرویر بھی سفید کھادی کا استعمال کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ سفید کھادی کے مسلسل استعمال کے باعث کھادی کی سفیدی اس کے خون میں شامل ہو گئی ہے۔ مگر یہ محض مخالف پارٹیوں کا پروپگینڈہ ہے۔ لمبی لمبی ٹانگیں ہیں، ہمیشہ سر جھکا کے چلتا ہے دُور سے بالکل بگلا نظر آتا ہے۔

ڈیل ڈول کے اعتبار سے بے ڈول ہے۔ توند تھوڑی کی اولتی سے باہر نکل کر نزول (Navel) میں جلی گئی ہے، ایک پیر میں لنگ اور ایک ہاتھ میں ہلکا سا رعشہ ہے، جب باہر نکلتا ہے تو راستہ چلتے لوگ مُڑ مُڑ کر دیکھتے و مُسکراتے ہیں۔ منچلے نوجوان فقرے چست کرتے ہیں، عورتیں منہ میں پلو ٹھونس کر ہنستی ہیں، کتّے بھونکتے ہیں۔ مگر وہ کسی بات کا نوٹس نہیں لیتا، خاموشی سے اپنی راہ چلتا ہے۔ بالکل چکنا گھڑا ہے، اس پر کسی کی کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ یہی تو وہ خوبی ہے جو بڑے بڑے لیڈروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بھی سُنی ان سُنی کر دیتے ہیں اور برابر اپنا کام کئے جاتے ہیں۔

ملنسار اور سوشیل آدمی ہے۔ ہمیشہ ایک خاص ادا سے دونوں ہاتھ جوڑ کر اور انتہائی عاجزی وانکساری سے نمستے کرتا ہے۔ اس کے گھر کے افراد کا بیان ہے کہ وہ اکثر نیند میں بھی ایسا ہی کرتا ہے، لوری بتیسی صاف نظر آتی ہے

بعض دفعہ نیند ہی میں اتنی زور سے نمستے کرتا ہے کہ پڑوسی بھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔

بہت مالدار شخص ہے اور اس کے پاس "بے حساب" دولت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑے لوگوں کی طرح بڑے بزنس کرتا ہے، یعنی اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور دوسرے کالے دھندے بھی کرتا ہے۔ کئی دفعہ اس کے یہاں چھاپہ پڑ چکا ہے مگر ان چھاپوں کا انجام وہی ہوا جو عام طور سے ہوتا ہے۔ یعنی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اور اس کی پوزیشن پہلے سے بھی زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔ چھاپہ ماروں نے چھاپہ مار مار کر اس کی پوزیشن اتنی صاف کر دی ہے کہ وہ اب دودھ کا دُھلا تسلیم کر لیا گیا ہے۔

بظاہر آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہیں اور نہ کوئی کاروباری معروفیت ہے مگر یہ بات سب جانتے ہیں کہ شہر کی کئی شراب کی دوکانیں اس کی ملکیت ہیں، مگر وہ خود وہاں کبھی نہیں جاتا۔ اس کے وفادار ملازمین سارا کاروبار چلاتے ہیں اور یہ گھر بیٹھے فلمی "باس" کی طرح پورے کاروبار کو کنٹرول کرتا ہے۔

گاندھی جی کا سچا بھگت ہے۔ پارٹی کے آفس میں گاندھی جی کی ایک بہت بڑی اور قیمتی تصویر لگی ہوئی ہے۔ یہ تصویر اسی نے اپنے ذاتی خرچ سے بنوائی ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک شاہراہ پر گاندھی جی کا جو مجسمہ نصب ہے اس کے بنوانے اور نصب کرنے کا خرچ بھی اس نے اپنی جیب سے دیا ہے۔ ایسے سچے عقیدت مند ہی اتنی رقم خرچ کر سکتے ہیں، غریب عوام تو صرف ان تصویروں اور مجسموں کی گل پوشی ہی کر سکتے ہیں۔

پارٹی کی مقامی شاخ کو دل کھول کر چندہ دیتا ہے اور کبھی نہیں پوچھتا کہ روپیہ کیا ہوا یا کس مد میں خرچ کیا گیا؟ اسی خوبی کی بناء پر اسے پارٹی کا ممبر بنایا گیا ہے۔ مقامی پارٹی کی طرف سے جو بھی جلسہ ہوتا ہے یا جلوس نکلتا ہے، اس کا بیشتر خرچ یہی برداشت کرتا ہے۔ ایسے ہی افراد کی موجودگی کے باعث ہماری پارٹی زندہ ہے اور اس کا بھرم قائم ہے۔

پارٹی کی میٹنگ میں بڑی پابندی سے حاضر ہوتا ہے، مگر کبھی بحث میں حصہ نہیں لیتا۔ آخری صف میں بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ صرف ووٹنگ کے وقت آنکھیں کھولتا ہے اور سب کے آخر میں ہاتھ اٹھاتا ہے، جس طرف اکثریت ہو یہ بھی ادھر ہی لڑھک جاتا ہے۔

کمیٹی میں کس مسئلہ پر بحث ہوئی اور کس نے کیا کہا، اس سے اِسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کونسی تجویز پاس ہوئی اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا۔ خود اس نے کبھی کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ اور نہ کسی دوسرے کی پیش کردہ کسی تجویز میں ترمیم کی خواہش ظاہر کی۔ پارٹی کے فیصلوں سے اسے ہمیشہ اتفاق رہتا ہے۔ کمیٹی نے جو تجویز پاس کر دی اس نے اس پر صاد کر دیا۔ اس کی اپنی کوئی رائے نہیں، کوئی ذاتی نظریہ یا اصول نہیں۔ جو کمیٹی نے طے کر دیا اس نے بلا پس و پیش منظور کر لیا۔ ہماری پارٹی کو ایسے ہی افراد کی ضرورت ہے جو پارٹی کی مقامی شاخ سے لے کر ہائی کمان تک کے ہر فیصلہ کو بلاچوں وچرا تسلیم کر لیں اور آنکھ بند کر کے اس کی حمایت کریں۔

اچھا اور کامیاب سوشیل ورکر ہے۔ پارٹی کا کوئی ممبر جوا کھیلنے، شراب پی کر دنگا فساد کرنے، فرقہ وارانہ فساد میں حصہ لینے یا اغواء، ڈکیتی اور قتل کے معاملات میں ملوث ہونے کی صورت میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو یہ فوراً اس کی مدد کو پہنچتا ہے، ضمانت لیتا ہے، مقدمہ کے اخراجات برداشت کرتا ہے اور بالآخر اسے باعزت طور پر رہا کرا لیتا ہے۔ افسران کے تبادلے کرانا، امتحانات کے بعد طلباء کے رول نمبر لے کر تنگ و دو کرنا، اپنے حلقہ کے جواریوں اور شرابیوں کو پولس کے چنگل سے چھڑانا وغیرہ اس کے اہم کارنامے ہیں۔

آل راؤنڈر ہے۔ بچوں سے لے کر کرکٹ میچ تک اور قوالی و کرکس سے لے کر مشاعرہ اور دنگل تک ہر معاملہ میں یکساں دلچسپی لیتا ہے، چندہ وصول کرنے میں پیش پیش رہتا ہے مگر چونکہ مصروفیت زیادہ رہتی ہے اس لیے چندہ کا حساب پیش کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ ہمارے ملک میں سوشیل ورک کا جو موجودہ معیار تسلیم کیا جاتا ہے یہ اس معیار پر پورا اُترتا ہے، اور لوگ اس کے اس قسم کے کارناموں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اس میں ایک ایڈیشنل خوبی ایسی ہے جو صرف انتہائی تجربہ کار اور گھاگ قسم کے سیاست دانوں ہی میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں تقریر کرتا ہے، مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ اندازِ بیان دلچسپ ہے اور لہجہ میں مٹھاس ہے مگر باتیں بے حد مبہم اور غیر واضح۔ مختصر یہ کہ اس کی تقریر ایسی ہوتی ہے جیسے ریشم کا لچھا مگر اس طرح اُلجھا ہوا کہ سرا ہاتھ نہیں آتا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد لوگ حیرانی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہیں اور کچھ نہ سمجھنے پر خود کو احمق سمجھتے ہیں۔

عوام سے وعدے کرنے میں اس کا جواب نہیں، مگر اس نے آج تک کوئی وعدہ پورا نہیں کیا۔ لوگوں سے اتنے وعدے کر چکا ہے کہ اب اسے خود یاد نہیں کہ اس نے کس گروپ سے کیا وعدہ کیا ہے؟ اس معاملہ میں اس کی یادداشت عوام کی یادداشت سے بھی کمزور ہے۔

کوئی بات کہہ کر فوراً مکر جانے کی بھی اس میں اچھی صلاحیت ہے۔ ایک دن کوئی بیان دیتا ہے مگر دوسرے دن یہ کہہ کر صاف مکر جاتا ہے کہ اس نے ایسا نہیں کہا تھا، یہ پریس والے ہیں جنھوں نے اس کے بیان کو توڑ مروڑ کر شائع کیا ہے۔

جس جلسہ کی صدارت اسے کرنی ہوتی ہے، اس جلسہ میں وہ کبھی وقتِ مقررہ پر حاضر نہیں ہوتا۔ ہمیشہ غیر معمولی تاخیر سے پہنچتا ہے۔ اسی لیے اس کے صدارت والے جلسہ میں لوگ ایک نیند لے کر آتے ہیں۔ ہمارے قومی لیڈروں نے تاخیر سے پہنچنے کی جو روایت قائم کر رکھی ہے وہ اس کا بہت احترام کرتا ہے اور اس روایت سے بغاوت کو سنگین جرم تصور کرتا ہے۔

مستقل مزاج اور دُھن کا پکا ہے، عارضی ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا۔ اس کی مستقل مزاجی اور بلند ہمتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میونسپل الکشن میں تین بار اس کی ضمانت ضبط ہو چکی ہے مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور اب اسمبلی کے الکشن میں حصہ لینے کا خواہش مند ہے اسے امید ہے کہ اگر اسے ٹکٹ مل گیا تو وہ کامیاب ہو جائے گا۔ اس کا ایسا سوچنا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہماری پارٹی کا ٹکٹ تو کسی بجلی کے کھمبے یا گدھے پر بھی چسپاں کر دیا جائے تو لوگ اسے ووٹ دے دیں گے کیوں کہ ہمارے دیہاتی بھائی، جن کی اکثریت ہے یہ نہیں دیکھتے کہ امیدوار کون ہے اور اس کا ریکارڈ کیسا ہے وہ تو صرف پوسٹر پر ہماری پارٹی کا انتخابی نشان اور اس کے گرد چھپی ہوئی چند بڑے لیڈروں کی تصویریں دیکھ کر ووٹ دے دیتے ہیں۔

ہمارے اس مجوزہ میر کا خیال ہے کہ اگر اسے اسمبلی میں جگہ مل گئی تو وزارت ملنی کچھ مشکل نہیں اور پھر وہاں سے چھلانگ لگا کر مرکز تک پہنچنا بھی کچھ دشوار نہیں کیونکہ جو وزیر صوبائی سطح پر ناکام ہوتا ہے، اسے مرکز میں بلا لیا جاتا ہے۔ ایسے وزراء مرکز میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ احسانات کے بوجھ کے تلے دبے ہوتے ہیں اس لیے جو

ارت بھی ان کے سپرد کر دی جائے، بخوشی قبول کر لیتے ہیں اور جو حکم دیا جائے بجا لاتے ہیں کیوں کہ حکم عدولی
رزشی کی صورت میں انھیں وہیں واپس بھیج دیا جائے گا، جہاں وہ بُری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔
پارٹی میں اس کا کوئی مخالف نہیں ہے، کیوں کہ یہ بظاہر سب سے اچھے تعلقات رکھتا ہے۔ چوں کہ
کا اپنا کوئی گروپ نہیں ہے، اس لیے ہر گروپ اسے اپنا آدمی سمجھتا ہے، ہر گروپ کی مالی امداد کرتا ہے، ان
خفیہ میٹنگوں میں شریک ہوتا ہے اور ہر گروپ کو ایک ہی معاملہ میں مختلف اور متضاد مشورے دیتا ہے۔
کی اس پالیسی سے یہ فائدہ ہے کہ پارٹی میں ہمیشہ گروپ بندی قائم رہتی ہے، اور کوئی گروپ طاقتور
کر پارٹی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اگر اسے ٹکٹ دے دیا گیا تو کوئی گروپ اس کی مخالفت نہیں کرے گا کیوں کہ ہر
وپ یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کا خاص آدمی ہے۔
گروپ سازی اور گروپ شکنی میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ ہماری پارٹی میں جو گروپ بندی ہے
کوئی راز کی بات نہیں۔ پارٹی کے ممبران لباس کی طرح اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ کوئی تعجب خیز
نہیں کیوں کہ چڑھتے سورج کی پوجا ہماری پرانی روایت ہے اور روایت ہی نہیں عبادت بھی ہے۔ چنانچہ
مجوزہ ممبر طاقت ور گروپ کے خیمہ میں بلا پس وپیش داخل ہو جاتا ہے مگر جب اس کے کمزور ہونے کے
ر نظر آئیں تو خیمہ کی طنابیں ٹوٹنے اور میخیں اکھڑنے سے قبل بڑی پھرتی سے باہر آ جاتا ہے اور دوسرے
وپ میں شامل ہو جاتا ہے۔
پارٹی میں نئے خون کی شمولیت کا زبردست حامی ہے اور جب بھی موقع ملتا ہے نیا خون داخل کرنے کی
شش کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ وہ واقعی نوجوانوں کو آگے بڑھنے، ذمہ داریاں سنبھالنے
ر اپنے جوہر دکھانے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ یہ تو محض ایک بہانہ اور چال ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ اس
نے پارٹی کے پرانے اور تجربہ کار لوگوں کو پاؤں جمانے اور پارٹی پر اپنا تسلط قائم رکھنے سے باز رکھنا چاہتا
ہے۔ چنانچہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کھوسٹ اور خرانٹ قسم کے لوگ تقویت حاصل کر رہے ہیں تو وہ فوراً نئے خون
شامل کرنے کی مہم شروع کر دیتا ہے اور انھیں آگے بڑھا کر اور ان کے کندھوں پر بندوق رکھ کر سینئر افراد
نشانہ بناتا ہے اور اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ یہی کھیل آئے دن اعلیٰ سطح پر بھی کھیلا جاتا ہے اس سے اندازہ
جا سکتا ہے کہ وہ سیاستِ حاضرہ سے کتنا باخبر ہے اور پارٹی کے بڑے لیڈروں کی کتنی کامیاب تقلید کر سکتا
ہے۔ مگر اس قسم کے کام وہ درپردہ کرتا ہے اور اس ہوشیاری سے کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا کہ اس مہم میں اس
ہاتھ ہے۔
یہ اسی کی شطرنجی چالوں اور سیاسی ہتھکنڈوں کا کرشمہ ہے کہ مقامی مخالف پارٹیاں کبھی ایک پلیٹ فارم
جمع نہیں ہوتیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے بدظن اور بدگمان رہتی ہیں۔ اگر یہ یکجا ہو جائیں تو ہماری شکست
یقینی ہے مگر اس کی خفیہ چالوں کے باعث اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔
فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں اس کا رویہ اور رول بھی ویسا ہی ہے جیسا پارٹی کے سرکردہ لیڈروں
مخالف پارٹی کے افراد اس پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ شہر میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں، ان کی
پشت پر اس کا ہاتھ ہے۔ وہی اس کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ مالی امداد فراہم کرتا ہے۔ امداد ہی سے مشورہ

تفصیلات طے کی جاتی ہیں اور دوسری فرقہ پرست اور متعصب پارٹیوں سے تعاون طلب کیا جاتا ہے مگر یہ سارے کام وہ اتنی راز داری اور ہوشیاری سے کرتا ہے کہ کسی کو شک تک نہیں ہوتا کہ وہ ان معاملات میں ذاتی طور سے ملوّث ہے۔

فسادات کے دوران میں وہ کبھی سامنے نہیں آتا اور نہ اسے رکوانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب طوفان گزر جاتا ہے تو پھر یہ گرجتا اور برستا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرتا ہے۔ امن کیٹیاں قائم کرتا ہے مرنے والوں اور زخمیوں کے گھر پہنچتا ہے اور اپنی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، ان کی مالی امداد کرتا ہے ذمہ دار افسران کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ زخمیوں کو اسپتال بھجوانے کا بندوبست کرتا ہے، روزانہ ان کی خیریت دریافت کرتا ہے۔ اسپتال کے عملہ کو توجہ سے علاج کرنے کی تاکید کرتا ہے، پولس کو سخت وسست کہتا ہے اور بار بار اپنی اور اپنی پارٹی کی حمایت کا یقین دلاتا ہے۔ اتنا اچھا اور منجھا ہوا اداکار ہے کہ صبر کی تلقین کرتے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آتی۔

اگر فسادات بڑے پیمانے پر ہوں اور معاملہ سنگین صورت اختیار کر جائے تو پھر ایک وفد لے کر اعلیٰ افسران تک جا پہنچتا ہے مگر روانہ ہونے سے قبل انھیں فون کر دیتا ہے کہ اگر دوران گفتگو وہ کچھ تلخ و ترش باتیں کرلے تو وہ بُرا نہ مانیں کیوں کہ محض ایک ڈرامہ ہوگا۔ پھر اس کے بعد ایک جلسۂ عام طلب کر کے فساد کی تمام ذمہ داری مخالف پارٹیوں پر لاد دیتا ہے اور اپنی پارٹی کی بے گناہی ثابت کرتا ہے اور اقلیتی فرقہ کو اپنی پارٹی کی حمایت کا یقین دلاتا ہے اور ان کی جان و مال، عزت و آبرو، زبان اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور بقاء کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کی یہ ڈپلومیسی بڑی کامیاب رہی ہے اور پارٹی پالیسی کے عین مطابق ہے۔

ہماری پارٹی سیکولرزم پر یقین رکھتی ہے اور رات دن اسی کا پروپگینڈہ کرتی ہے، اور اسی کے بل بوتہ پر اب تک قائم بھی ہے مگر اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ ہم کس قسم کے سیکولرزم پر ایمان رکھتے ہیں۔ مخالف پارٹی والے اس سیکولرزم کو "بناسپتی سیکولرزم" کہتے ہیں لیکن ہمارے سیکولرزم کا بھرم اب بھی قائم ہے، اور اس کا جادو اب بھی اپنا کام کر رہا ہے، اسی سیکولرزم کے ذریعہ ہم نے ان کو بھی چونا لگا دیا جو فخر سے کہتے تھے کہ ہمیں ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاسکتا لیکن ہم اپنے اسی نام نہاد سیکولرزم کے سوراخ سے ایک طویل عرصے سے مسلسل ڈس رہے ہیں لیکن اس صفائی اور ہوشیاری سے کہ انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

ہمارا یہ نمائندہ پارٹی کے اسی بناسپتی سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ اور اسی کے مطابق اپنا کام کئے جا رہا ہے اور سو فیصدی کامیاب ہے۔

ہم جس امیدوار کی سفارش کر رہے ہیں، اس کی ڈپلومیسی کا جواب نہیں۔ ہمارے حلقہ میں اُردو جاننے والوں کی کافی تعداد ہے، اور ان کے ووٹ فیصلہ کن ہوتے ہیں، یہ جس پارٹی کو ووٹ دے دیں اس کی کامیابی یقینی ہے۔ چوں کہ اس امیدوار کو اُمید ہے کہ اسے اس بار ٹکٹ مل جائے گا، چنانچہ وہ کچھ عرصہ سے اردو میں دستخط کرنا سیکھ رہا ہے۔ چار دستے کاغذ مشق کی نذر ہو چکے ہیں۔ اور اب وہ اس قابل ہو چکا ہے کہ اردو میں اپنے دستخط کر سکے۔ اردو والے یہ جان کر بہت خوش ہیں اور اس کی اردو دوستی پر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ اور

[illegible]

یہ نفسیاتی حربہ بڑا کامیاب ثابت ہوا ہے۔ یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ اردو والوں کے سامنے کوئی غیر اردو داں اردو میں دستخط کرلے یا اردو کے اشعار پڑھے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں، پچھلے فسادات، ناانصافیوں اور زیادتیوں کو بالکل فراموش کردیتے ہیں اور خوشی خوشی ووٹ دیدیتے ہیں۔

سوشیلزم پر یقین رکھتا ہے اور اسے اس موضوع پر عبور حاصل ہے، چنانچہ ہماری پارٹی کے مجوزہ سوشیلزم پر گھنٹوں تقریر کرتا ہے، مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کس قسم کا سوشیلزم لانا چاہتا ہے۔ اس کی یہ خصوصیت بہت اہم ہے۔ کیوں کہ ہماری پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر بھی اس سوشیلزم کی صحیح تعریف کرنے سے قاصر رہے اور کوئی لیڈر یہ نہ بتاسکا کہ ہماری پارٹی ایک طویل عرصہ سے جس سوشیلزم کے لانے کا وعدہ کرتی رہی ہے، اس میں کتنے فیصد کامیابی ہوئی اور بقیہ کے لیے ابھی اور کتنے عرصہ تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس لیے ہمیں ایسے ہی امیدوار کی ضرورت ہے جو سوشیلزم کی گول مول تعریف کرتا رہے اور اسے جلد از جلد لانے کا بھی وعدہ کرے۔

"غریبی ہٹاؤ" کا جتنا صحیح مطلب اس نے سمجھا ہے، بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا۔ جن افراد نے اس کا صحیح مطلب سمجھ لیا وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ بقیہ افراد تو ابھی تک اس کی تہہ ہی کر رہے ہیں، معنی سمجھنے کے لیے انھیں ایک عمر درکار ہوگی۔ اس امیدوار نے اپنی غریبی کافی حد تک دور کرلی ہے اور اسے یقین ہے کہ اگر اسے ٹکٹ مل گیا تو بقیہ غریبی بھی جلدہی دور ہوجائے گی۔

اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ الکشن میں کامیاب ہوگیا اور اسے وزارت میں شامل کرلیا گیا تو وہ حلف اٹھانے سے قبل پارٹی لیڈر کو اپنا استعفیٰ پیش کردے گا تاکہ وہ جب چاہے اس کا استعفیٰ منظور کرکے اسے اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کردے۔

غریبوں کا بڑا ہمدرد ہے، جب سے اناج مہنگا ہوا ہے اس نے اناج کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف دودھ، گھی، کیک، پھل اور خشک میووں پر گزارا کرتا ہے تاکہ اس کے حصہ کا جو اناج بچے وہ غریبوں کو مل سکے۔ یہی نہیں جب سے قحط پڑا ہے اور جانوروں کے لیے چارہ کی کمی ہوئی ہے، اس نے اپنے جانوروں کو چارہ کھلانا بند کردیا ہے۔ صرف میوے اور پھل کھلاتا ہے اور ان کا دودھ استعمال کرتا ہے۔ ہمارے دیش کے بہت سے لیڈروں نے پہلے بھی ایسا کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔

چوں کہ اسے یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوکر اسمبلی میں پہنچ جائے گا، اس لیے اس نے ایک تجربہ کار شخص کو لازم رکھ لیا ہے، جو اسے صحیح وقت پر ہاتھ اٹھانے، تالیاں بجانے، شیم شیم کے نعرے لگانے، واک آؤٹ کرنے، ڈیسک بجانے، کرسیاں پھینکنے، مائیک پر قبضہ کرنے وغیرہ کی ٹریننگ دے رہا ہے۔ نئے ممبروں کے لیے ایسی ٹریننگ لازمی ہے۔ کیوں کہ کئی بار ایسا ہوچکا ہے کہ ہماری پارٹی کے نئے ممبران نے غلط وقت پر ہاتھ اٹھاکر یا اپنی ہی پارٹی کے کسی وزیر کی تقریر کے دوران شیم شیم، شیم کے نعرے لگاکر پارٹی لیڈر کو شرمندہ کیا ہے۔

اس نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ الکشن میں کامیاب ہوگیا تو پھر اپنے حلقہ میں صرف ۱۵ راگست اور ۲۶ رجنوری کو پرچم کشائی کے لیے حاضر ہوگا۔ بقیہ دنوں میں اپنے حلقہ میں قدم نہیں رکھے گا تاکہ لوگ اس سے ان وعدوں کے بارے میں سوالات نہ کریں جو اس نے اور اس کی پارٹی نے الکشن کے دوران میں کیے تھے۔

جناب عالی! یہ ہیں وہ چند اہم خصوصیات اس مہرکی جس کی سفارش پارٹی کی مقامی شاخ کی مجلس عاملہ

نے کی ہے اور مجھے اختیار دیا ہے کہ میں اپنے طور پر اس کے متعلق تفصیلی رپورٹ آپ کی خدمت میں ارسال کردوں
چنانچہ رپورٹ پیشِ خدمت ہے۔
میں مرکزی انتخابی کمیٹی سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس ممبر کو اس حلقہ سے انتخاب میں حصّہ لینے کے لیے باضابطہ طور سے نامزد کرے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ الکشن میں واضح اکثریت سے کامیاب ہوکر اپنا اور پارٹی کا نام روشن کرے گا کیوں کہ اس میں بیشتر خصوصیات ایسی ہیں جو صرف بڑے لیڈروں ہی میں پائی جاتی ہیں۔

فقط

صدر، مقامی شاخ۔

از طرف مرکزی انتخابی کمیٹی

جنابِ صدر صاحب،
آپ کی ارسال کردہ تفصیلی رپورٹ مرکزی انتخابی کمیٹی کے روبرو پیش کی گئی۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ کمیٹی نے آپ کی سفارش کو قبول کرتے ہوئے مذکورہ ممبر کو آئندہ انتخابات میں حصّہ لینے کے لیے پارٹی کی طرف سے نامزد کرنا منظور کرلیا ہے۔ باضابطہ اعلان ایک دو روز میں کردیا جائے گا۔
آپ جانتے ہیں کہ آپ کے حلقہ کی یہ سیٹ متنازعہ فیہ تھی اور اس کے لیے بہت سے امیدوار میدان میں تھے جو براہ راست ہائی کمان تک پہنچ چکے ہیں۔ چوں کہ صوبائی سطح پر یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا اس لیے مجبوراً مرکزی کمیٹی کو مداخلت کرنی پڑی۔ بہر حال کمیٹی نے اپنا آخری فیصلہ دے دیا ہے اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو اس فیصلہ سے آگاہ کردوں۔
مجھے ذاتی طور پر سخت حیرت ہے کہ آپ کے حلقہ میں اتنا موزوں امیدوار ایک عرصہ سے موجود ہے مگر آپ نے اس سے قبل اس کی سفارش نہیں کی۔ اگر مذکورہ ممبر میں واقعی وہ خصوصیات موجود ہیں، جن کا ذکر آپ نے رپورٹ میں کیا ہے تو، پارٹی کے لیے اس سے بہتر اور موزوں امیدوار کون ہو سکتا ہے؟ پارٹی کو ایسے ہی افراد کی ضرورت ہے۔
براہ کرم مذکورہ ممبر کو اس نامزدگی کی اطلاع دے دی جائے اور اسے ہدایت کی جائے کہ وہ اپنے کاروبار اور سیاسی سرگرمیوں میں محتاط رہے اور پارٹی فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا کرے۔

فقط

صدر، مرکزی انتخابی کمیٹی۔

□□

قلمی معاونین سے التماس:

ہزل

ھذاں دہلوی

بیوفاؤں میں جو وفا سی ہے
زہر ہے وہ مگر دوا سی ہے

لڑ رہے ہیں رقیب آپس میں
چال محبوب کی سیاسی ہے

کرکے انکار اگر ہنسے دلدار
سمجھو انکار میں رضا سی ہے

کیوں نہ چیخوں کہ جام ہے خالی
اور بوتل میں بھی ذرا سی ہے

عمر میری تو کچھ زیادہ نہیں
یوں سمجھ لیجئے ذرا سی ہے

"آدمی اور جانور"

بازغ بہاری (کلکتہ)

شام کو جب گھر میں آئے ہم مڈل اسکول سے
ایک صاحب ملنے آئے شہر آسنسول سے

ہم نے پوچھا نام! تو بولے محمد افتخار!
خیریت پوچھی تو وہ کہنے لگے بے اختیار

آپ ہیں بازغ بہاری! شاعرِ طنز و مزاح
سن بیاسی میں ہوا جن کا ظرافت سے نکاح

مستیٔ طنز و ظرافت جب سے ہے سر پر سوار
شاعری کے فیلڈ میں ہیں آپ شترِ بے مہار،

میری باتوں کا نہ ہرگز آپ جو مانیں بُرا!
آپ کو بازغ بہاری ہے یہ میرا مشورہ

آپ اب صنفِ ظرافت سے تعلق توڑیئے
اور شہنازِ غزل سے اپنا رشتہ جوڑیئے

بڑھ نہیں سکتا ظرافت سے وقارِ شاعری
طنز سے ملتا نہیں ہے کا معیارِ شاعری

اب ہزل گوئی تو اک بازیچۂ اطفال ہے
بھیرویں، ملہار، ٹھمری، شیوۂ قوال ہے

آپ دیکھیں گے غزل کی صنف اپنانے کے بعد
"رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد"

مسئلہ ہو سامنے تو اس کا حل بھی چاہیئے
جب گلا اچھا ہو تو اچھی غزل بھی چاہیئے

دست بستہ پھر تو ہم نے عرض کی اے محترم!
قادرِ مطلق کا ہے انسان پر کیسا کرم

آج بھی نازاں ہے جس پر فطرتِ پروردگار
منفرد ہے آدمی اللہ کا وہ شاہکار

آدمی کو جس نے بخشی ہے متاعِ شاعری
ہے ترنم بھی ودیعت اک اسی اللہ کی

طائرانِ تیرہ شب جب بولتے ہیں تحت میں
پھیل جاتی ہے نحوست کوہسار و دشت میں

بھونکتے ہیں رات کو جب بھی سگانِ کوئے یار
پھر نظر آتا نہیں ہے عاشقوں کو کوئے یار

مست ہو کر جب گدھے کرتے ہیں ڈھیچوں لاکھ
یاد آ جاتی ہے نانی بھوت اور جنات کو

جانور بے عقل انسان مخزنِ عقلِ سلیم
آدمی اور جانور میں ہے یہ تفریقِ عظیم

جانور ہنستا نہیں ہے اور ہنسا سکتا نہیں

انور انصاری (رانچی)

"ہم پیدل چلنے والے"

میری ہابی پیدل چلنا ہے۔ اس میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ انسان بہت حد تک حادثے کی زد سے محفوظ رہتا ہے۔ یوں تو دنیا میں آج کل حادثوں کی کمی نہیں ہے۔ حادثے کسی وقت کہیں بھی بغیر اطلاع دیئے وقوع پذیر ہوسکتے ہیں۔ آئے دن اخباروں میں حادثے کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں کہیں ٹرین کے حادثے کا ذکر ہوتا ہے تو کہیں بس، سڑک یا کار کے حادثے کا جھگڑا یا ہوتا ہے کہیں فضائی حادثے کی خبر ہوتی ہے تو کہیں بم کے پھٹنے کا واویلا ہوتا ہے۔ میں اسی وجہ سے پیدل چلتا ہوں کہ حادثے سے کسی طرح محفوظ رہوں۔ پیدل چلنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ آج کل گرانی کے زمانے میں جہاں اور بہت سی دشواریاں ہیں وہاں یہ آفت بھی کم نہیں کہ بچے کپڑے پھاڑتے ہیں، عورتیں کپڑے کھینچتی ہیں، دھوبی کپڑوں کا آب و رنگ بگاڑتے ہیں، درزی کپڑے چراتے ہیں، دوکاندار قیمتیں بڑھاتے ہیں اور ہم آپ پیدل چلنے پر مجبور ہیں۔

پیدل چلنے کے لیے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ "پاؤں" اور "آنکھیں"۔ یوں تو پاؤں کا مصرف صرف چلنا ہے لیکن کبھی کبھی انسان سر کے بل کھڑے ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ آج کل حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اجازت بھی نہیں ملتی ہے۔ ہزاروں، لاکھوں انسان اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تگ و دو میں زندگی سے نبرد آزما ہیں۔ کبھی کبھی انسان کو مجبوراً پاؤں گھسیٹنا پڑتا ہے اور کبھی حالات کے تحت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ موقع مصلحت دیکھ کر پیدل چلنے میں یہ خاکسار اپنے پاؤں کا استعمال کرتا ہے۔ یہی حال آنکھوں کا ہے۔ قدرت نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں تاکہ ان سے بھرپور کام لے اور دیکھ بھال کر زندگی کی راہ میں چلے مگر ساتھ ہی یہ حکم دیا گیا ہے کہ آدمی سب کو ایک آنکھ سے دیکھے۔ اگر اس حکم پر چلنے کی مشق کی گئی تو پیدل چلنے والوں کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے جا بجا ٹھوکریں کھانا نصیب ہو کیونکہ پیدل چلنے میں مختلف مناظر، مختلف راہ اور مختلف اشخاص سے انسان کو سابقہ پڑتا ہے۔

کچھ لوگ پیدل چلنے ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ پیدل چل کر ہی وہ مدرسہ، اسکول، کالج، آفس اور کبھی کبھی جیل بھی جاتے ہیں۔ حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے پیدل چلنا ضروری بھی ہے۔ اگر انسان پیدل چلنے کی مشق نہ کرے تو زندگی کی دوڑ میں وہ آگے نہیں بڑھ پائے گا۔ اس کی ترقی رُک جائے گی۔ کچھ لوگ تو پیدل چل کر ہی اپنی زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں۔ پیدل چل کر ہی بھیک مانگتے ہیں اور دعاؤں کا خزانہ لٹاتے ہیں۔ پیدل چلنا ان کا پیدائشی حق ہے۔ اگر وہ پیدل نہ چلیں تو موت کا سایہ ان کے سر پر منڈلانے لگے گا۔ پیدل چلنا ان کے لیے آخری جائے پناہ ہے۔

کچھ لوگ آنکھیں بند کرکے پیدل چلنے کی مشق کرتے ہیں۔ ایک بار ایک پیدل سوار بظاہر نابینا لیکن حقیقت میں بینا کسی سے ٹکرا گیا۔ چوٹ بہت آئی۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں، کچھ خفت، کچھ غصّہ، ہاتھ کے اشارے سے ٹکرانے کی وجہ دریافت کی مگر ٹکر مارنے والے کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ٹکر مارنے کی وجہ بتاتے۔ بھاگم دوڑ کی زندگی میں ٹکر مارنے والا سر پہ پاؤں رکھ کر فرار ہوگیا اور حضرتِ نابینا اپنی دکھتی آنکھوں پر اپنا ہی دستِ شفقت پھیرتے رہ گئے۔

میرے ایک کرم فرما کو بہانے تراشنے میں وہ مہارت حاصل ہے جو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر کو بھی نصیب نہیں۔ میرے کرم فرما موقع کی نزاکت دیکھ کر بہانے تراشتے ہیں۔ کبھی موسم کی خرابی کا بہانہ بنائیں گے، کبھی اپنی صحت کی خرابی کا رونا روئیں گے، کبھی زمانہ کی خرابی کا ذکر کریں گے اور کبھی اپنی عاقبت کی خرابی کو کوسیں گے۔ میں نے ایک دن ان کو پیدل چلنے کے لیے آمادہ کیا۔ اور ان سے عرض کیا محترم کرم فرما۔ پیدل چلنے میں بڑا مزہ آتا ہے آہستہ چلنے میں لطف ہے، بازار کی رونق، سج دھج اور دوڑ کو دیکھنے میں مزہ ہے۔ اپنے آپ کو دکھانے میں مزہ ہے۔ غرض کہ پیدل چلنے میں مزہ ہی مزہ ہے۔ میرے کرم فرما کسی طرح پیدل چلنے کے لیے راضی تو ہوئے مگر ایک دو کیلو میٹر کی دوری طے کرنے کے بعد کہنے لگے کہ یار پیدل چلنے میں بڑی دشواری محسوس ہو رہی ہے کیوں کہ میں پیدل چلنے کے آرٹ سے واقف نہیں ہوں۔ پیدل چل کر مجھے وحشت محسوس ہو رہی ہے اور میرا یہ حال ہے ؎

وحشت میں ہر اک نقشہ اُلٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

پڑھے لکھے بے روزگار زیادہ تر پیدل ہی چلتے ہیں، نوکریوں کی تلاش میں آفس کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ تھک جانے کے بعد کسی گندے معمولی ہوٹل میں چائے پی کر تازہ دم ہوتے ہیں اور پیدل ہی منزل کی تلاش میں رواں دواں نکل پڑتے ہیں۔

پیدل چلنے کے فوائد کو دیکھتے ہوئے ان دنوں سیاسی رہنماؤں نے بھی پد یاترا شروع کردی ہے کہ لوگوں سے براہِ راست ملاقات ہو۔ جو حضرات الکشن کی وبا میں مبتلا ہوجاتے ہیں وہ بھی اپنے ووٹر تک پہنچنے کے لیے پیدل ہی سفر کرتے ہیں۔ ان رہنماؤں کے ساتھ اخبار نویس، سینکڑوں بے روزگار بے فکرے، بھیک منگے شریک ہوجاتے ہیں۔ پد یاترا سے سیاسی رہنماؤں کی تبدیلی آب و ہوا ہوجاتی ہے اور مقبولیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

کچھ لوگ کلفت کی گھڑیوں سے نجات پانے کے لیے پیدل چلتے ہیں کچھ شب کی تاریکی سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے پیدل چلتے ہیں۔ کچھ حضرات صبح کی سپیدی کا دلکش اور لازوال منظر دیکھنے کے لیے پیدل چلتے ہیں۔ کچھ حضرات شام کے دھندلکے میں پیدل چل کر اپنے مستقبل کو سنوارتے ہیں۔ کچھ ضعیف العمر حضرات صحت کو برقرار رکھنے کے لیے پیدل چلتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ اپنا سفر آخرت بھی انسان پیدل ہی چلنے والوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر پورا کرتا ہے۔ غرض کہ پیدل چلنے سے انسان کے نت نئے کام انجام پاتے ہیں۔ اِس لیے اِس خاکسار کو پیدل چلنے پر پورا اعتماد ہے۔ اسی اعتماد کی بدولت مئی کے مہینے میں، دن کے ساڑھے بارہ بجے، دھوپ، گرمی، اور لُو کے زور میں بھی اپنے نوکر کو بازار سے سامان لانے کے لیے بھیج دیتا ہوں اور وہ بیچارا، غربت کا مارا منہ سے اُف تک نہیں کرتا۔

پیدل چلنے کی اہمیت اب مسلّم ہو چکی ہے۔ اس لیے لوگوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ پیدل ہی چلا کریں اس سے زندگی میں اُتار چڑھاؤ میں کمی آئے گی اور انسان کو خوشگوار لمحات بھی میسّر آئیں گے!

□□

اقبال ہاشمی
حیدرآباد

ہوگئیں مُنہ زور جب سے بیویاں
شوہروں کی اڑ رہی ہیں دھجیاں

مرغی خانے سازشی جب سے ہوئے
گندے انڈے دے رہی ہیں مُرغیاں

غالبوں نے آم سارے کھالیے
ہم سمیٹے جارہے ہیں گٹھلیاں

شاعری کے نام پر ناشاعرو!
تم نے پیدا کر دیں کتنی ردّیاں

ہم نے ماتحتوں میں اپنے بانٹ دیں
باس نے جو ہم کو دی تھیں گالیاں

سر کڑھائی میں نہیں تو کیا ہوا
رشوتوں میں تر ہیں اپنی انگلیاں

دعوتوں میں ساتھ رکھنا دوستو
ہاضمے کی کھٹّی میٹھی گولیاں

آج کل چوہے بنے ہیں ہاشمی
دے رہے ہیں بلیّوں کو دھمکیاں!

قیسی قمر نگری
(کرنول)

آپ کی چیم الف لام، خدا خیر کرے
سرخیٔ گاف الف لام، خدا خیر کرے

آپ کو چین سے سونے نہیں دے گا شب بھر
یہ مرا لام الف لام، خدا خیر کرے

گھر میں ہر سال نئے فرد کی افزائش کا
ہے انہیں خبط یہ الف لام، خدا خیر کرے

وہ اکیلا ہی مجھے لادکے لے جائے گا
ہے وہ جو میم الف لام، خدا خیر کرے

انتخابات میں زاہد پہ بھی ہے مالِ حرام
آج جو لام الف لام، خدا خیر کرے

سید عباس متقی
حیدرآباد

جب سے ہمیں ہوش آیا ہے، ہم مختلف چیزوں سے بدرجہ اتم آشنا ہوتے بلکہ بزور آزماتے آرہے ہیں۔ ان چیزوں میں روٹی کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ گرانی بھی ہے۔ بچپن میں یہ لفظ ہم اپنے والدین سے سنتے تھے، اب ہمارے بچے ہم سے سن رہے ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی سن رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ان کے بچے ان سے بھی مزید ہی سنیں گے اور گرانی کا یہ سلسلہ تا روز قیامت چلتا ہی رہے گا، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ منہ سے نکلی ہوئی بات پھر منہ میں پہنچ جائے۔ یا کمان سے نکلا ہوا تیر زمانے کی نزاکتوں کے پیش نظر پھر کمان میں چلا آئے، بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ جسم سے نکلی ہوئی جان پھر جسم میں لوٹ آئے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کسی چیز کی قیمت چڑھے اور پھر اتر جائے۔ چڑھنا اور اتر جانا تو محض بندروں، لیڈروں اور فلم اسٹاروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

جب ہم اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم اپنے علاوہ تمام ہی چیزوں کو گراں پاتے ہیں۔ بازار میں جائیے تو اونچے دام اور اونچے بھی اس قدر کہ قیمتوں کو دیکھ کر اپنے ملک کی اونچائی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ ہم ایک دفعہ جوتے خریدنے بازار گئے تاکہ احباب کو اطلاع ہو کہ ہم محض جوتے کھانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ جوتے خریدتے بھی ہیں۔ غرض لالچی داماد کی طرح دوکان، دوکان گھومتے رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو لیکن ہر دوسری دوکان پہلی دوکان سے دو قدم آگے ہی نکلی۔ مختلف جوتوں کو ملاحظہ کیا لیکن ہر جوتا پاؤں ہی میں آتا تھا ہاتھ نہیں۔ مجبوراً ہم محض پاتابے خرید کر خوش ہو لیے کہ ہم بھی "آزاد" ہیں جو چیز پسند آتی ہے خرید لیتے ہیں اور چار لی چپلین نما اپنے جوتوں کو دیکھ کر بہت خوش بھی ہوتے رہے کہ "اولڈ از گولڈ" کا محاورہ ہم پر کس قدر چست ہوتا ہے۔

گرانی صرف بازار تک محدود نہیں بلکہ گھر، مدرسہ، کالج، میکہ، سسرال اور حجامت خانے بھی اس سے خالی نہیں جدھر جائیے گرانی کا منہ دیکھئے اور آنکھوں سے دیکھنے کا ذوق نہ ہو تو زبردستی دکھا دی جاتی ہے۔ ہم جس قدر فیس میں سال بھر پڑھتے بلکہ کھیلتے بھی تھے آج پہلی تاریخ آتے ہی اتنی فیس ادا شدنی ہوتی ہے اور ہم بال بچوں والے سر پیٹنے کے ساتھ ساتھ بال بھی نوچ لیتے ہیں اور اس طرح گرانی نے ہمیں واقعی فارغ البال کر دیا ہے۔

ذخیرہ اندوز، رشوت خور اور کالا روپیہ کمانے والے ہی زیادہ تر گرانی سے خوش ہوتے ہیں کیوں کہ یا قاعدہ گرانی سے ان کی جیب بھی گرانی ہوتی ہے اور جب غریب، افلاس زدہ ووٹ دینے والے مجبوروں سے گرانی کا رونا سنتے ہیں تو یہ لوگ قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی گرانی اگر ہے تو کیا ہوا، تنخواہوں میں بھی تو اضافہ ہوا ہے"

در پھر یہ جملہ کہہ کے پھوہڑپن سے ہنسنے لگتے ہیں۔ اس طرح کی ہنسی ہمیں بہت کھلتی ہے جو غلط بیانی کو ملفوف کر دے۔
ہم بھی اپنے احباب میں "میر ضاحک" کی طرح ہنوز مشہور ہیں مگر جب ہنستے ہیں تو حقیقتاً دل سے ہنستے ہیں خواہ وہ
ہنسی اپنے آپ پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ گرانی کے ساتھ تنخواہوں میں اضافہ ہو رہا ہے مگر چہ نسبت خاک را با عالم
پاک والی بات ہے گرانی "انسانوں" کی آبادی کی طرح بڑھ رہی ہے مگر "تنخواہ" "شیروں" کی آبادی کی طرح اور ہم جیسے
خانگی مدرس جو گرانی کی خاطر مسجد کی امامت بھی کر لیا کرتے ہیں اور مسجد کے تمام ہی مصلیوں کا بشمول صدر و معتمد کے احترام
کرتے ہیں ہڑتال کیا کریں گے۔ نہ مدرسے میں ہڑتال ہو سکتی ہے نہ مسجد میں، چنانچہ یہ ہڑتال بے ہنگامی سے ہو کر رہ
گئے ہیں اور سرکاری ملازمین سے کچھ زیادہ ہی گرانی کے متعلق جانتے ہیں۔

گرانی کا یہ عالم ہے کہ حجام آدھا سر مونڈھ کر پورے پیسے لے لیتا ہے اور اگر ہم اُلٹے استرے کی شکایت کریں
تو ٹھوڑی پکڑ کر تھوڑا سر اوپر اٹھا دیتا ہے اور ہمیں مجبوراً اس کے نرخ کا اشتہار دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ تعجب ہے کہ نرخ
کا اشتہار حجاموں کی دوکانوں میں تک پہنچ گیا مگر مساجد کے ائمہ ہنوز محروم ہیں کہ فقراء کی طرح جو دیا لے لیا کی
راہ پر گامزن ہیں، متوکل جو ٹھہرے۔ اور یہی متوکل جو خدا کو پیارے ہوتے ہیں تو ان کے بال بچے ان کی راہ نہ چل کر
ان کا قرض چکاتے ہیں۔

ایک مدت بعد ہم نمائش گئے تاکہ بڑھتی ہوئی گرانی کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں۔ ایک گلاب کا پودا ہمیں بہت پسند
آیا۔ قیمت معلوم کی تو پتہ چلا کہ اگر ہم خرید لیں تو واقعی ہماری قبر پر چڑھانے کے کام آ سکتا ہے گلاب کے پودے کے
علاوہ ہمیں ایک بندر بھی بہت پسند آیا جو چابی دینے پر ہماری طرح منہ بناتا ہے۔ ولی را ولی می شناسد۔ ہم نے اسے
خرید لینا چاہا مگر جب اس نے قیمت بتائی تو ہم نے اس بندر سے کچھ زیادہ ہی منہ بنایا۔ دوکاندار، پیٹ، منھ
نہ جانے کیا کیا پکڑ کر ہنستا رہا۔ کہنے لگا قبلہ آپ بھی چابی کے بندر سے کم نہیں۔ ہم نے جل کر جواب دیا۔ کیا آپ کو
چابی لگتی ہے؟ یہ سن کر دوکاندار ہم سے بھی زیادہ منہ بنانے لگا اور ہم دوسری دوکان پر پہنچ گئے۔ ہمیں نمائش کے
جھولے بہت پسند ہیں۔ اُوپر جا کر نیچے کی چیزوں کو دیکھنے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ ٹکٹ دریافت کیا۔ محض پانچ چکر
کے تین روپے۔ جھولے میں بیٹھے بغیر ہی چکر آنے لگا۔ ہوٹل میں گئے تو ایک روپیہ میں ایک مرچ، مرچیں نہ لگیں گی۔
"دیکھا تو بھوک مرگئی۔ دودھ گھر کا دودھ جو سستے دام فروخت ہو رہا تھا اس میں پانی کی مقدار کا ہمیں علم نہیں
تاہم لذیذ ضرور تھا مگر قیمت بھینس برابر کہ اگر ہم دودھ نہ پیتے تو گھر میں ایک وقت کا کھانا مزید پک جاتا۔ جب دماغ
گرانی کی الجھنوں میں محصور ہو تو چیزیں مزہ نہیں دیتیں حاضر دماغی کے بغیر لطف اندوزی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اور
دنیا کا یہ عالم ہے کہ کوئی کام حاضر دماغی سے نہیں ہوتا۔ بے لطفی کی شکایت نہ ہو تو پھر کیا ہو۔

ہم پر گرانی کا اس قدر اثر نہیں ہوتا جس قدر ہماری بیگم پر ہوتا ہے۔ ہم گرانی کے طفیل چیزوں کو ارزاں کر دیتے
ہیں، یعنی خریدتے ہی نہیں۔ البتہ بعض وقت جب اپنی لا حد محرومیوں اور بدنصیبیوں پر غور کرتے ہیں تو ایک
چیز خرید لینا چاہتے ہیں اور وہ ہے "موت" مگر چونکہ خودکشی حرام ہے اس لیے اس کے ارزاں ہونے کے باوجود
ہم خریدنے سے محروم رہے۔ بعض وقت ہم سوچتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کونسی چیز سب سے ارزاں ہے سوائے
انسانی عزت کے کوئی چیز ہماری آنکھوں میں نہیں جچتی۔ چنانچہ ہم کچھ خریدنا نہیں چاہتے۔ البتہ بیگم کو کچھ ضروری چیزیں خریدنی
پڑتی ہیں اسی لیے وہ حکومت سے لے کر ہماری شادی تک کو روز ہی صلواتیں سناتی ہیں مگر افسوس کہ ان بیچاری کی

ساری صلواتیں محض ہمارے کانوں سے یا پھر دیواروں سے ٹکرا کر بچوں کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ سستے زمانے میں چیزیں خرید کر اسٹاک کر لیں لیکن کمبخت جب چیزیں سستی ہوتی ہیں تو مہینے کے آخری دن ہوتے ہیں اور جب پہلی آتی ہے تو پہلے کی طرح مہنگی ہو جاتی ہیں۔ ہم تو امیروں کی طرح فریج خرید کر اس میں آنے والے کل بلکہ آنے والی صبح کے لیے ترکاریاں تک اسٹاک کر لینا چاہتے ہیں مگر ریفریجریٹر اس قدر مہنگا واقع ہوا ہے کہ ہم خود کو بیچ کر بھی اسے نہیں خرید سکتے لہٰذا آج تک تازہ ہی ترکاریوں پر گزارہ کرتے ہیں۔

گرانی سب سے زیادہ ہمیں سینما بینی کے وقت محسوس ہوتی ہے۔ ہم پہلے چار آنے دے کر یا قوت محل میں محبوبہ اور لے۔ وی۔ رام کی سبق آموز فلمیں دیکھا کرتے تھے لیکن اب یہ عالم ہے کہ چالیس روپیے دے کر بے تکی، لچر، غیر دلچسپ فلمیں دیکھتے ہیں اور لاحول پڑھ کر باہر نکل جاتے ہیں بسا اوقات تو بس نکل ہی جاتے ہیں۔ اور کچھ تھیٹر والے اس قدر لالچی ہو گئے ہیں کہ تھرڈ کلاس میں بیٹھنے والوں کو "دیکھنے والوں" میں نہیں دیکھنا چاہتے ہمارا خیال ہے کہ اگر گرانی کا یہی حال رہا تو سینما بین اور پردہ سیمین کے درمیان محض اِتنا فاصلہ رہ جائے گا کہ اگر جوشِ محبت سے کوئی مغلوب ہو جائے تو ہیروئن کو چھو بھی سکے گا۔

گرانی کچھ اس درجہ ہم پر غالب ہے کہ ہم مختلف باتوں پر غور کرتے اور گرانی سے بزد آزمائی کے لیے تیار ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہوتا کچھ بھی نہیں۔ مثلاً کبھی ہم سوچتے ہیں کہ کاش ہم سرکاری ملازم ہوتے تو ضرور رشوت لیتے اور گرانی کا مقابلہ کرتے یا کاش ہم کوئی پہلوان قسم کے غنڈے ہوتے لوگوں کو چاقو کی نوک پر لوٹتے اور گرانی کا مردانہ وار مقابلہ کرتے یا کاش ہم لیڈر ہوتے تو ووٹ لے کر عوام کو بے وقوف بنا کر گرانی کا مقابلہ کرتے یا کاش ہم وکیل ہوتے تو جھوٹے مقدمے لے کر جیت کر یا ہار کر گرانی کا مقابلہ کرتے یا کاش ہم تاجر ہوتے تو انکم ٹیکس بچا بچا کر گرانی کا مقابلہ کرتے یا پھر کاش ہم کوئی مشہور و معروف شخصیت کے حامل ہوتے تو چندہ لے لے کر گرانی کا مقابلہ کرتے مگر ہم ایک خانگی مدرسہ میں افلاس زدہ جس کے حلق پر مدام معطلی یا برطرفی کی چھری تیار رہتی ہے۔

کاش ہندوستان میں بہتر حکمران پیدا ہوں جو خود کھانے کی بجائے کھلانے کی سوچیں، خود پہننے کی بجائے پہنانے کی سوچیں جو خود جینے کی بجائے جلانے کی سوچیں۔ جن کی نیت گھر گیر کی بجائے ہندوستان گیر ہو تو شائد ہمارے ملک سے گرانی کا خاتمہ ہو سکے گا۔ اور ہمارا خاتمہ ہونے سے محفوظ رہے گا۔ ☐☐

جمہوریت، سماج واد، سیکولرازم
اتحاد اور سالمیت
امن وامان اور ترقی کے لئے
ہماری مضبوط بنیادیں ہیں۔
davp 88/246

دلیپ سنگھ (دہلی)

دوسرا موقع

کردار

۱. رام لال
۲. پاروتی
۳. گوبند رام گپتا
۴. منشی
۵. مجسٹریٹ
۶. ریٹا

پہلا سین

[رام لال کے گھر کا ایک کمرہ۔ رام لال کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے اس کے سامنے چھوٹے سے ایک ٹیبل پر ڈرائی فروٹ کی ایک پلیٹ ہے۔ اور چائے کا کپ۔ پلیٹ میں سے ڈرائی فروٹ کھا رہا ہے۔ اور چائے پی رہا ہے۔ سامنے تخت پوش پر بیٹھی اس کی بیوی پاروتی سبزی کاٹ رہی ہے۔ بیچ بیچ میں وہ غصّے کی نظر سے رام لال کی طرف دیکھتی ہے۔ پر وہ اس کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام میں معروف ہے]

پاروتی: ایسا بے شرم آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا آرام سے بیٹھا بادام کھا رہا ہے۔ بے اس کو ذرا بھی خیال کر کسی اور کو بھی پوچھ لے۔

رام لال: پاروتی تم تو یوں ہی ناراض ہو رہی ہو۔ میں بادام کوئی خوشی سے کھا رہا ہوں؟

پاروتی: نہ نہ، تمہارے سامنے تو کوئی بندوق لیکر کھڑا ہے۔ اور کہہ رہا ہے۔ کہ رام لال بادام کھا نہیں تو جان سے مار دوں گا۔

رام لال: تم جو چاہو کہہ لو۔ پر میں بادام کھا رہا ہوں دوائی کے طور پر۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کھاؤ تو کھا رہا ہوں۔ تم ہی بتاؤ پہلے کبھی کھائے ہیں میں نے بادام؟

پاروتی: بادام کھانے کے لیے ڈاکٹر نے کہا ہے تمہیں؟

رام لال: اور کیا؟

پاروتی: ہائے میں مرجاؤں اتنی کڑوی دوائی دے دی ہے اُس ظالم نے تمہیں۔

رام لال: اب تم تو خواہ مخواہ ہر بات کا مذاق بنالیتی ہو۔ بھگوان قسم مجھے ڈاکٹر نے کہا ہے۔ کل سے مجھے زکام سا ہو رہا تھا۔ آج سویرے جب میں سیر کرنے کو نکلا تو ڈاکٹر مہتہ سے ملنے چلا گیا۔ میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب کچھ زکام سا ہو گیا ہے" وہ تو بگڑ گیا ایک دم۔ کہنے لگا "کچھ زکام سا کہتے ہو۔ ارے بھائی یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔ اس کا ابھی سے علاج کرو ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے" میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو دے دو کوئی گولی کالی۔ کہنے لگا گولی کی

ضرورت نہیں ہے۔ پاؤ بھر بادام لو۔ اُس میں تھوڑے سے کاجو اور کچھ دانے پستے کے ڈال دو۔ اور یہ سب گرم گرم چائے کے ساتھ کھا جاؤ۔ زکام جاتا رہے گا۔ . . . میں تو پاروتی دوائی کھا رہا ہوں کوئی عیاشی نہیں کر رہا۔

پاروتی: ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے تو کم از کم مجھے بتا کر تو جاتے۔ مجھے بھی تو کل سے زکام ہو رہا ہے۔ میرا بھی پوچھ آتے۔

رام لال: اور تم کیا سمجھتی ہو میں نے نہیں پوچھا؟ ارے بھائی میں تو جب بھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں۔ پورے خاندان کی بیماریوں کا علاج پوچھ کر آتا ہوں۔ اس طرح ایک ہی فیس میں جان چھوٹ جاتی ہے۔

پاروتی: تمہیں پتہ تھا مجھے زکام ہو رہا ہے؟

رام لال: تم نے کل شام کو چھینک ماری تو میں نے سوچا یاد تو تم ہم کو کیا کرو گی۔ زکام ہی ہو رہا ہوگا۔

پاروتی: تو پھر ڈاکٹر نے کیا کہا؟ . . . . تو میں بھی سٹھیائی ہوں نا کہتا کیا تھا؟ یہی کہا ہوگا چائے کے ساتھ بادام کھاؤ . . . یہ ذرا باداموں کی پلیٹ اِدھر کرنا۔

رام لال: نہیں پاروتی تمہیں بادام کھانے کو نہیں کہا۔

پاروتی: تو پھر کیا کہا۔ دیسی گھی کا سیرا کھانے کو کہا تھا؟

رام لال: نہیں۔

پاروتی: تو کیا کوئی گولی دی اُس نے؟

رام لال: نہیں۔

پاروتی: تو پھر کیا کہتا تھا؟

رام لال: کہتا تھا سبزی بناتے وقت پتیلے سے جو بھاپ نکلتی ہے۔ اُسے سونگھو۔ زکام ٹھیک ہو جائیگا۔

پاروتی: میں پتیلے کی بھاپ سونگھوں؟

رام لال: ہاں۔

پاروتی: اور تم بادام کھاؤ۔

رام لال: ہاں۔

پاروتی: زکام تجھے۔ زکام مجھے۔ پھر دوائیں الگ الگ کیوں؟

رام لال: ڈاکٹر کہتا تھا مردانہ اور زنانہ زکام میں فرق ہوتا ہے۔

پاروتی: ڈاکٹر کہتا تھا یا تم کہہ رہے ہو؟

رام لال: میں کیوں کہوں گا؟ مجھے اس میں کیا فائدہ ہے؟

پاروتی: کوئی بات نہیں میں سونگھ لوں گی پتیلے کی بھاپ ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے تو وہ بھی پوچھ لیا تھا؟

رام لال: کیا؟

پاروتی: تمہیں بتایا تو تھا۔ کہ میرا وزن کچھ بڑھ سا رہا ہے۔

رام لال: اچھا تمہارے مٹاپے کا علاج۔

پاروتی: شرم تو نہیں آتی۔ ذرا سا وزن بڑھ گیا ہے۔ اُسے مٹاپا کہہ رہے ہو۔

رام لال: تم بھی تو اچھے خاصے مٹاپے کو ذرا سا وزن بڑھنا کہہ رہی ہو۔ میں نے پوچھا تھا ڈاکٹر سے اس کا علاج۔

پاروتی: سنا ہے آج کل گولیاں نکل آئی ہیں جن کے کھانے سے وزن اپنے آپ کم ہو جاتا ہے۔

رام لال: ڈاکٹر نے ایسی کوئی گولی نہیں دی۔

پاروتی: ڈاکٹر نے کیا کہا؟

رام لال: کہہ رہا تھا۔ نوکرانی نکال دو۔ اور فرش پر پونچھا آپ لگایا کرو۔ وزن اپنے آپ گھٹ جائے گا۔

پاروتی: نوکرانی نکال دوں؟

رام لال: ہاں۔ کہہ رہا تھا۔ جھاڑو دینا۔ پونچھا لگانا۔ بہت اچھی ورزشیں ہیں۔

پاروتی: اچھا مجھے زکام ہو تو میں پتیلے کی بھاپ سونگھوں۔ میرا وزن بڑھے تو فرش پر پونچھا لگاؤں۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے؟

رام لال : پاروتی اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو ڈاکٹر نے کہا ہے۔

پاروتی : ٹھیک ہے۔ اگر مجھے جھاڑو ہی دینا ہے تو اور کہیں دے لوں گی۔ تم سنبھالو اپنا گھر۔ میں چلی۔

رام لال : چلی ؟۔ کہاں چلی ؟

پاروتی : کہیں بھی جاؤں۔ یہاں نہیں رہوں گی ـــ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی سیٹھ کاشی رام کی بہو، کہ جہاں عزت نہ ہو وہاں رہنے سے کیا فائدہ۔

رام لال : چھوڑو پاروتی۔ ایسی باتیں تمہیں شوبھا نہیں دیتیں۔ تم تو اس گھر کی رانی ہو۔

پاروتی : رانیاں گھروں میں جھاڑو نہیں دیتیں۔ پتیلے کی بھاپ نہیں سونگھتیں۔ تم سنبھالو اپنا راج پاٹ میں جا رہی ہوں۔

رام لال : تمہیں شاید یاد نہیں رہا پاروتی، میں تمہیں اِس گھر میں بیاہ کر لایا ہوں۔

پاروتی : میں تم سے طلاق لے رہی ہوں۔

رام لال : کیا ؟۔

پاروتی : طلاق لے رہی ہوں میں۔

رام لال : چھوڑو بھئی سویرے سویرے اس قسم کا مذاق مجھے اچھا نہیں لگتا۔

پاروتی : یہ مذاق نہیں ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔

رام لال : یعنی تم سچ مچ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو ؟

پاروتی : ہاں۔

رام لال : اتنی اچھی خبر اور تم نے مجھے بیزمنہ میٹھا کرائے سُنادی۔ یہ جھوٹ ہے۔ کہ تم مجھے اِس عمر میں اُس قید سے رہائی دے رہی ہو۔ جس میں ہم زندگی بھر کے لیے بندھ گئے تھے۔ جھوٹ ہے نا ؟

پاروتی : کتنی بار کہوں کہ یہ جھوٹ نہیں، سچ ہے۔

رام لال : مجھے یقین نہیں آتا۔

پاروتی : میں سچ کہہ رہی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔

رام لال : بھگوان تمہیں اپنے ترن کو پورا کرنے کی شکتی دے۔

پاروتی : پورا کروں گی۔ میں نے اگر کہا ہے تو پورا کر کے دکھاؤں گی۔

رام لال : میں نے کہا وکیل کوئی اچھا سا کرنا۔ تاکہ کام ہو جائے تمہارا۔

(پاروتی اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

رام لال : میں نے کہا اِسی گلی کے موڑ پر ایک بڑا قابل وکیل ہے گوبند رام گپتا۔ اُس کے ہاں چلی جانا۔ میرا نام لوگی تو فیس میں رعایت کر دے گا۔

پاروتی : (ایک قدم چل کر) ہاں اُسی کے پاس جاؤنگی۔

رام لال : فیس کے پیسے بھی کہ میں دوں ؟

(غصے میں پاروتی باہر نکل جاتی ہے)

رام لال : طلاق دے گی ؟ ایسی قسمت کہاں میری۔ ایسا ہی نصیب والا ہوتا تو اِس سے شادی کیوں ہوتی! طلاق دے گی۔ ایسا بیوقوف اِسے ملے گا کہاں ؟

(ہنستا ہے)

(فیڈ آؤٹ)

دوسرا سین

(گوبند رام گپتا اپنے دفتر میں بیٹھا ہے۔ اُس کے لباس اور کمرے میں پڑے فرنیچر سے پتہ لگتا ہے کہ وہ ایک معمولی وکیل ہے۔ منشی کے ساتھ پاروتی اندر آتی ہے)

منشی : (پاروتی سے) آجائیے۔ آجائیے۔ شرمانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کوئی انوکھا کام نہیں کر رہیں وہ زمانے گئے، جب لوگ طلاق لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اب تو طلاق لینا یا دینا ایک معمولی کام بن گیا ہے۔ سیکڑوں لوگ ہر روز طلاق لے رہے ہیں۔ آپ کا نام اُن لوگوں میں لکھا کر ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ نہیں جی، یہ آپ کی

خوش قسمتی ہے کہ آپ ٹھیک جگہ پہ آگئی ہیں۔ طلاق کے معاملے میں شری گوبند رام گپتا سے بڑا وکیل کم از کم اِس شہر میں تو نہیں ہے۔ یہ گپتا جی کی ہی اِن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہ جن گھروں میں روز تو تو میں میں ہوتی تھی وہاں طلاق کی وجہ سے آج سُکھ اور شانتی کا راج ہے۔ (وکیل سے) گپتا جی پاروتی بہن کا کام کرنا ہے۔ باقی سب کام چھوڑ دیجئے۔

گُپتا : آؤ بہن جی بیٹھ جائیے۔ طلاق چاہیئے آپ کو؟

پاروتی : ہاں۔

گُپتا : کس سے لینا ہے طلاق آپ کو؟

پاروتی : طلاق کس سے لیتے ہیں۔ پتی کے علاوہ بھی کوئی طلاق دے سکتا ہے۔

گُپتا : م م میرا مطلب ہے آپ کے پتی کا نام کیا ہے

پاروتی : شری رام لال۔ آپ شاید انھیں جانتے ہیں۔

گُپتا : میں اگر جانتا بھی ہوں تو سمجھ لیجئے نہیں جانتا۔ اگر مجھے اس کے ساتھ مقدمہ لڑنا ہے تو سمجھ لیجئے وہ آج سے میرا دشمن ہوگیا۔

منشی : اِسے کہتے ہیں اصول کی پابندی اِدھر آپ کا مقدمہ لیا اُدھر آپ کا پتی، اُن کا وکیل، اُن کے دوست یار سب گپتا جی کے دشمن ہو گئے۔

گُپتا : سچ مانیئے بہن جی۔ صرف اصولوں کی اِس پابندی کی وجہ سے آج اِس شہر میں ستّر فیصد لوگوں کے ساتھ میرا بیٹھنا اٹھنا، کھانا پینا بند ہے۔

پاروتی : وکیل صاحب مجھے طلاق چاہیئے اور جلدی چاہیئے میں نے عہد کیا ہے اپنے خاوند کے آگے۔ اب یہ کر کے ہی دکھاؤں گی۔

گُپتا : بہن جی آپ سمجھ لیجئے آپ کی طلاق ہوگئی۔ ہم کل ہی مقدمہ دائر کر دیں گے۔ پہلے آپ کو ملے گی ٹمپریری سیپریشن اور پھر باقاعدہ طلاق مل جائے گی۔

پاروتی : ٹمپریری سیپریشن ملنے میں کوئی چکر تو نہیں ہوگا۔

منشی : کیا بات کر رہی ہو بہن جی؟ گپتا جی کو آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے؟ طلاق دلانا اِن کا خاندانی پیشہ ہے۔ اور ٹمپریری سیپریشن دلانے میں تو اِن کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ معلوم ہے آپ کو کہ شکنتلا کی راجہ دشینت سے ٹمپریری سیپریشن کس نے دلوائی تھی؟ گپتا جی کے پردادا نے۔

گُپتا : وہ تو . . . وہ تو شکنتلا کی اپنی مرضی نہیں تھی ورنہ پردادا جی نے طلاق بھی دلوادی ہوتی۔

پاروتی : مجھے بتایئے طلاق لینے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

گُپتا : اگر آپ ہی کو کرنا ہے تو پھر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ بس فیس دینی ہے۔ ہاں بس اتنا بتا دیجئے۔ کہ آپ کا آپ کے پتی کے ساتھ جھگڑا کیا ہے؟ کیا وہ آپ کو خرچ کرنے کو پیسے نہیں دیتا؟

پاروتی : کیا بات کر رہے ہیں آپ وکیل صاحب؟ تنخواہ رکھوالیتی ہوں پوری کی پوری۔

گُپتا : مار پیٹ کرتا ہے کیا؟

پاروتی : [ہنستی ہے] وہ مجھے مارے گا۔ چڑیا جیسی تو جان ہے اُس میں۔

گُپتا : شراب پیتا ہوگا۔

پاروتی : میرے گھر میں شراب۔ میں نے تو کبھی اُسے دوسرا کپ چائے کا پینے نہیں دیا۔

گُپتا : تو پھر . . . میرا مطلب ہے کوئی دوسری عورت . . .

پاروتی : (ہنستی ہے) وکیل صاحب دوسری عورت اُس کے ساتھ دوستی کرے گی میرے ساتھ اُس کی شادی اِس لیے ہوگئی کہ میں نے شادی

سے پہلے اُسے دیکھا نہیں تھا۔
گپتا : تو پھر طلاق آپ کس بنا پر لینا چاہتی ہیں ؟
منشی : آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے نا بہن جی۔
پاروتی : وجہ آپ ڈھونڈیے۔ آپ فیس کس بات کی لے رہے ہیں۔
منشی : چلو اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ اس چھوٹی سی بات کے لیے کیس تھوڑا ہی چھوڑ دیں گے۔ ہم وجہ ڈھونڈ نکالیں گے۔
گپتا : ایسا کیجیے بہن کہ آپ سب ہم پر چھوڑ دیجیے۔ ہم کل مقدمہ دائر کر دیں گے۔ مقدمہ دائر کرنے کے بعد میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ آپ اُس دن عدالت میں حاضر ہو جانا۔ باقی ہم سنبھال لیں گے۔ فیس جاتے ہوئے منشی جی کو دے جانا۔
پاروتی : کتنی ؟
منشی : آپ چلیئے تو میں آپ کو بتا دوں گا۔ آیئے میرے ساتھ۔ (پاروتی اور منشی باہر چلے جاتے ہیں۔ گپتا انہیں جاتا ہوا دیکھ رہا ہے)
(فیڈ آوٹ)

تیسرا سین

(مجسٹریٹ کی کچہری۔ گپتا۔ منشی اور پاروتی ایک طرف کھڑے ہیں مجسٹریٹ کی کرسی ابھی خالی ہے۔ رام لال اندر آتا ہے)
رام لال : پاروتی یہ تم نے کیا غضب کیا ؟ پگلی میں نے تو مذاق کیا تھا۔ اور تم نے سچ مچ مجھے کچہری میں لا کھڑا کیا۔ آؤ چلو گھر چلیں۔
گپتا : (رام لال اور پاروتی کے بیچ آکر) آپ کو میرے موکل سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں

ہٹو پیچھے۔ کالا کوٹ پہن کر اپنے آپ کو تیس مار خاں مت سمجھو
گپتا : میں نے کہا خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ ہٹ جاؤ یہاں سے۔ اب شریمتی پاروتی پر آپ کا کوئی حق نہیں۔
رام لال : پاروتی اِن بدمعاشوں کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تو فیس کے لالچ میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ تو آجا میرے پاس، چل گھر چلیں۔
منشی : بہن جی کو گھر لے جانے والے تم ہوتے کون ہو؟
رام لال : تم چپ رہو۔ آیا بڑا بہن کا رشتہ دار۔
(مجسٹریٹ اندر آتا ہے)
مجسٹریٹ : (کرسی پر بیٹھ کر) وکیل صاحب یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے ؟
گپتا : اِسے پوچھیئے حضور یہی شور کر رہا ہے۔
مجسٹریٹ : یہ آدمی کون ہے ؟
گپتا : حضور یہ ملزم ہے۔
رام لال : میں کوئی ملزم نہیں ہوں۔ یہ فضول بک رہا ہے۔
مجسٹریٹ : آپ کو جو بھی کہنا ہے۔ اُس کٹہرے میں کھڑے ہو کر کہیئے۔ (رام لال ملزموں کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوتا ہے)
مجسٹریٹ : یہ عورت کون ہے ؟
گپتا : حضور یہ ملزم کی پتنی ہے۔ یہ آپ کی عدالت میں فریاد لے کر آئی ہے۔ کہ اسے طلاق دیا جائے۔
مجسٹریٹ : کیا میں طلاق دے سکتا ہوں ؟
رام لال : حضور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو ضرور دے سکتے ہیں۔
(قہقہہ)
گپتا : حضور آپ نے طلاق دینا نہیں، دلوانا ہے۔
مجسٹریٹ : لیکن کیوں دلوانا ہے ؟
گپتا : حضور یہ آدمی جو آپ کے سامنے کھڑا ہے

یہ آپ کو دکھائی تو انسان دیتا ہے لیکن اس کے اندر جو شیطان چھپا ہوا ہے اُسے دیکھئے۔

رام لال : ارے یار۔ مجسٹریٹ صاحب یہاں انصاف کرنے بیٹھے ہیں۔ کوئی ایکسرے کرنے نہیں بیٹھے۔

مجسٹریٹ : آرڈر آرڈر۔

گپتا : میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ آدمی سماج کے جسم پر ایک پھوڑے کی طرح ہے۔ یہ اپنی بھولی بھالی اور معصوم پتنی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک دوسری عورت کے ساتھ پیار کا ناٹک رچا رہا ہے اپنے آپ کو کنوارا بتا کر اُس عورت کے ساتھ بیاہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ ہی بتایئے حضور کہ یہ بے چاری ایسے پتی کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ جس کے اندر کچھ اور باہر کچھ اور ہے۔ ویسے تو ایسے سماج دشمن کی سزا یہ ہے کہ اُسے چوک میں کھڑا کر کے گولی سے اُڑا دیا جائے لیکن میں شریمتی پاروتی کے وکیل کی حیثیت سے بس اتنی گزارش کروں گا کہ میری موکل کی طلاق کی درخواست منظور کی جائے۔

رام لال : دوسری عورت کے ساتھ میں نے محبت کی ہے؟

گپتا : ہاں۔

رام لال : کمال ہے محبت میں کر رہا ہوں اور مجھے پتہ ہی نہیں۔

مجسٹریٹ : وکیل صاحب

گپتا : حضور یہ آدمی جان بوجھ کر بھولا بن رہا ہے۔ ہمارے پاس اس کی حرکتوں کا ثبوت ہے۔

مجسٹریٹ : کہئے شریمان جی۔ اب بولو؟

رام لال : بولوں گا۔ پہلے اِن سے کہئے۔ ثبوت پیش کریں۔

مجسٹریٹ : ثبوت حاضر کیا جائے۔

(ایک خوبصورت سی لڑکی جس کا نام ریتا ہے۔ عدالت میں آتی ہے)

مجسٹریٹ : آپ کا نام کیا ہے۔ کماری جی؟

ریتا : مس ریتا سر۔

مجسٹریٹ : آپ ملزم کو جانتی ہیں؟

ریتا : ہاں سر۔

پاروتی : (گپتا سے) سرگوشی میں یہ کلموہی کون ہے؟

گپتا : یہ ہماری گواہ ہے، آپ دیکھتی جایئے۔

مجسٹریٹ : آرڈر آرڈر۔ مس ریتا آپ ملزم کو اچھی طرح پہچانتی ہیں۔

ریتا : جی ہاں سر۔ مسٹر لال میرا بوائے فرینڈ ہے۔ اس نے پرامس کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ میرج کرے گا۔

مجسٹریٹ : اچھا؟

ریتا : حضور ہم روز اکٹھے سینما جاتے ہیں۔ ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ پارکوں میں جاتے ہیں۔ ہی از ویری تھنگ فار می سر

پاروتی : وکیل صاحب یہ بال کٹی کیا بک رہی ہے۔

وکیل : (آہستہ سے) آپ دیکھتی جایئے۔ یہ جو کچھ کہہ رہی ہے سب اپنا سکھایا ہوا ہے۔ یہ ہماری گواہ ہے ہماری۔

مجسٹریٹ : آرڈر آرڈر۔ بڑی شرمناک بات ہے۔ کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی بھولی بھالی بیوی کو اس طرح دھوکا دے رہا ہے۔ ایسے آدمی سوسائٹی کے لیے کتنے خطرناک بن رہے ہیں۔ کیوں رام لال یہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ ہے کیا؟ کیا تم واقعی اس کے بوائے فرینڈ ہو؟

رام لال : (اپنے آپ سے) اگر میں اس وقت کہہ دوں

کہ یہ لڑکی سچ بول رہی ہے۔ تو ایک بار رُعب تو پڑ جائے گا سارے شہر میں میرا کہ رام لال ہے کوئی چیز جو اتنی خوبصورت لڑکی سے محبت کر رہا ہے۔ سویرے اخباروں میں میری اور اس کی تصویریں چھپ جائیں گی۔ پاروتی سے بعد میں نپٹ لوں گا۔ پہلے شہر میں اپنا ڈنکا تو بجوالیں۔

مجسٹریٹ : رام لال، ہم اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو تو اس لڑکی کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟

رام لال : حضور عدالت میں کھڑے ہو کر میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ میرا پیار کا رشتہ ہے۔ یہ میری گرل فرینڈ ہے۔

مجسٹریٹ : اس کے ساتھ روز سینما دیکھتے ہو؟

رام لال : تینوں شو حضور۔

مجسٹریٹ : ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہو؟

رام لال : دونوں وقت حضور۔

پاروتی : وکیل صاحب یہ میں کیا سُن رہی ہوں۔ لڑکی تو مان لیا تمہاری سکھی سکھائی بول رہی ہے پر میرا پتی تو آپ کا سکھایا ہوا نہیں ہے۔

گپتا : بہن جی یہ تو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ رام لال ایسا کیوں کہہ رہا ہے۔ پر جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ وہ سب اپنے حق میں جا رہا ہے سمجھ لیجئے ہمارا کام ہوگیا۔

مجسٹریٹ : آرڈر، آرڈر ..... یہ آدمی واقعی بکرے کے روپ میں بھیڑیا ہے۔ یہ آدمی بالکل بے شرم ہے۔ اور .....

پاروتی : حضور مائی باپ۔ میری ایک گزارش ہے۔

گپتا : کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بولنے کے لیے میں جو کھڑا ہوں۔

پاروتی : تمہارے کھڑے رہنے کو میں کیا کروں؟

گپتا : پر آپ تو طلاق لینا چاہتی ہیں!

پاروتی : ہاں لیکن میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ وہ تو بڑھاپے میں عیش کرے اور میں در در کی ٹھوکریں کھاؤں۔ (مجسٹریٹ سے) حضور مائی باپ میری ایک گزارش ہے۔

مجسٹریٹ : آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟

پاروتی : حضور میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ غلطی کرنے والے کو معاف کردینا ایک بہت بڑی بات ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میرے پتی نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ پر میں چاہتی ہوں کہ اُسے پیار محبت سے سیدھے راستے پہ لے آؤں۔

مجسٹریٹ : واہ! کتنے عظیم جذبات ہیں آپ کے۔ لیکن اگر یہ آدمی پھر ٹیڑھے راستے پر جائے تو واپس اسی جگہ پر آجانا۔

پاروتی : ٹھیک ہے حضور پر میرا خیال ہے۔ اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

(پاروتی غصّے سے رام لال کی طرف دیکھتی ہے)

رام لال : (ڈرکر) حضور میری تو گزارش یہ ہے کہ مجھے جیل بھیج دیجئے۔ وہاں میں چکی پیس پیس کر اپنے گناہوں کا ازالہ کردوں گا۔

پاروتی : آپ گھر چلئے اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

(بازو سے پکڑکر رام لال کو باہر لے جاتی ہے)

(پردہ)

□□

کلیم اللہ (حیدرآباد)

جنت سے ایک خط

(روزانہ اخبارات میں برسی کے اشتہارات مع تصاویر شائع کئے جاتے ہیں سب اشتہار ایک جیسے ہوتے ہیں مثلاً آج آپ کو ہم سے بچھڑ کر پورا ایک سال ہوگیا اس دوران آپ ایک لمحہ کے لیے بھی ہم سے جدا نہیں رہے۔ آپ کی یاد آتی رہی سال بھر۔ وغیرہ وغیرہ — فقط سوگوار۔ آپ کی بیوی"۔ سوگواروں کا مقصد شاید یہ ہوتا ہے کہ مرحوم اس اشتہار کو پڑھیں۔ ایسا ہی ایک اشتہار عید کے دن شائع ہوا جنت میں مرحوم شوہر کی نظر سے گزرے تو وہ جواباً اپنی بیوی کو "جنت سے ایک خط" جو لکھے گا تو اس طرح ہوگا)

از جنت

جان (جو چلی گئی) سے پیاری!!

عید مبارک۔ سناؤ کیا حال ہے۔ میں تو بہت مزے میں ہوں۔ بچے کیسے ہیں۔ اسکول چھوڑ کالج میں آگئے ہوں گے۔ تعلیم سے رغبت نہ ہو تو لیڈر بنا دو مستقبل سنور جائے گا۔ جنت کی سب سے اہم و مشہور سڑک سے گزر رہا تھا کہ آج کے اخبار پر نظر پڑی متعجب نہ ہونا۔ جنت میں روزانہ دنیا جہاں کے سارے اخبارات مہیا کئے جاتے ہیں تاکہ جنت کے باسی اپنے اپنے وطن عزیز کا پسندیدہ اخبار حسب عادت فری لے کر پڑھیں (جس طرح شہر کی ایسے ہوٹلوں میں ہوتا ہے)

جانم۔ عید کے دن میں بھی اپنے پسندیدہ اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ یکایک اپنی ہی تصویر نظر سے گزری بڑا تعجب ہوا کہ زمین کے اخبار میں میری تصویر کس لیے شائع ہوئی جب کہ بندے کا زمین سے قطع تعلق ہو چکا ہے۔ خوش فہمی ہوئی کہ کہیں بعد از مرگ مجھے کسی اعزاز سے تو نوازا نہیں گیا کیوں کہ زمین کے باسی مُردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ مرزا غالب کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ غالب مرنے کے بعد بہت فائدے میں رہے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد فرنگیوں نے ان کی پنشن بند کرکے انھیں تنگ دستی پر مجبور کر دیا تھا لیکن غالب کو یقین تھا کہ ان کی فاقہ مستی ضرور ایک دن رنگ لائے گی — مرزا کے مرنے کے سو سال بعد ان کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی اور ان کی مزار سے متصل شاندار یادگار "غالب اکیڈمی" تعمیر کی گئی۔ ان دنوں مرزا صاحب بہت مسرور دکھائی دیتے ہیں کیوں نہ ہو پنشن کی فکر سے بے پرواہ استاد ذوق سے بھی خوب

چھپی رہی ہے۔ لیکن مرزا نوشہ کو افسوس ہے کہ ان کے گھر کی نگہداشت اچھی طرح سے نہیں کی گئی۔ استاد ذوق کو اپنی مزار پر سرکاری بیت الخلاء کی تعمیر کا بہت ملال ہے۔ مرزا کا واقعہ یاد آنے کی وجہ سے میں بھی بہت خوش ہوا کہ چلو اپنا مرنا بھی چیز ہوا۔ آخر دنیا والوں کو معلوم ہوگیا کہ ہم بھی کسی مرزا غالب سے کم نہیں کم از کم شہرت تو مل ہی جائے گی لیکن تصویر کے نیچے کی عبارت پڑھی تو معلوم ہوا کہ میری برسی کا اشتہار ہے جس کے ذریعہ تم مجھ سے مخاطب ہو۔ آج اخبار کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا۔ اخبار کے ذریعہ "برسی" کی اطلاع نہ ہوتی تو میں یہی سمجھتا کہ جنت میں آکر چند ہی دن ہوئے ہیں کاش جنت کی پہلی عید ہم ساتھ مناتے تو عید کی خوشیاں دوبالا ہو جاتیں تمہاری کمی بہت محسوس کر رہا ہوں۔ ؎

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب
عید کے دن جس کو "جنت" میں وطن یاد آیا

یہاں دنوں کا حساب کتاب نہیں رکھا جاتا سوائے اعمال کے کسی اور قسم کا حساب ممنوع ہے۔ پیدائش اور اموات کا صیغہ الگ ہے (بلدیہ کے صیغہ کی طرح نہیں) دنیائے فانی سے میرے کوچ کر جانے کے بعد زمین پر تمہارا دل نہیں لگتا ہوگا (برسی کے اشتہار میں یہی لکھا ہے) اگر ایسا ہے تو یقین مانو میں تم کو بآسانی ویزا روانہ کر سکتا ہوں۔ یہ کسی بیرون ملک مقیم ہندوستانی کا وعدہ نہیں بلکہ جنت کے ایک سچے باسی کا وعدہ ہے۔ ویزا اجرا کرنے والے فرشتہ سے میری اچھی ملاقات ہے۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ میں رشوت دے کر ویزا حاصل کروں گا تو یہ تو یہاں دنیا کی طرح رشوت کا چلن نہیں۔ ہر کام بغیر رشوت کے وقت مقررہ پر ہوجاتا ہے چپراسی کو بخشش دینے کی ضرورت نہیں۔ شرط اتنی ہے کہ آنے والے کے اعمال اچھے ہوں۔ تم ویزا ملنے تک پاسپورٹ کی تیاری شروع کر دو اس کے لیے کسی ٹراویلنگ ایجنٹ کی چکر میں پڑنے کے بجائے ایک نیم حکیم سے ملنا کافی ہے اس کے بعد تمہارا کام ختم باقی وہ بے چارہ خود دیکھ لے گا۔ دنیا کے اکثر لوگ اپنی نیم حکیموں کے جاری کردہ پاسپورٹ لے کر یہاں آتے ہیں "غلط انجکشن" تو ایک بہانہ ہے۔ ہاں تو تم نیم حکیم سے مل کر پاسپورٹ کی کارروائی کر دو اور میں "ایمگریشن" (اقامہ) کی۔ یہاں اقامہ کا قانون اس حد تک سخت ہے کہ "ایمگرینٹ" کے اعمال اچھے ہوں۔ ایکبار ایمگریشن مل جائے تو پھر کسی قسم کے "گرین کارڈ" کی ضرورت نہیں ہمیشہ جنت ہی میں رہنا۔ پاسپورٹ نمبر یا تصویر کا پی بھجوانے کی ضرورت نہیں، قدرتی کمپیوٹر کے ذریعہ ان کی نقول مع اعمال خود بخود یہاں آجاتی ہیں۔ یہاں روپیہ پیسہ کمانے کے ارادے سے ہرگز نہ آنا جنت میں ہر شئے فری سپلائی کی جاتی ہے۔ یہاں روزگار کا مسئلہ ہے اور نہ ہی معاشی بحران۔ نہ بجٹ میں خسارہ کی فکر۔ بس سکون ہی سکون ہے۔

یہاں زندگی مسرتوں کے جھولے میں گزر رہی ہے۔ ہر وہ آسائش میسر ہے جس کا گمان زمین کے باسی نہ کر سکیں گے۔ مسرتوں، شادمانیوں و شادکامیوں کے جلو میں مسلسل دودھ اور شہد کی نہروں سے کام و دہن کی لذتوں سے سیراب ہونے کا عمل جاری و ساری ہے۔ ایسے میں دنیائے فانی کی یاد کس "نیک بخت" کو آئے گی لیکن بھلا ہو تمہاری یاد رفتگاں کا کہ اس اشتہار کے ذریعہ ذہن کے نہاں خانوں سے تمہاری یادوں کے جھروکوں کو پھر سے کھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر للہ کسی ہندوستانی عورت کی طرح اس کا یہ مطلب نہ لینا کہ میں دوبارہ جنت کی حوروں میں دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ اللہ گواہ ہے میں نے آج تک کسی حور پر نظر نہیں ڈالی

تمھیں یہ ہی تمھاری دل لگی تھی جس کی وجہ سے یہاں آنا پڑا۔ جب کبھی انبساط کا نام ذہن سے لحظہ بھر کے لیے
ہی سہی بھلاتا، تمہارا نام نوکِ زبان پر آگیا تو یقین جانو بقول شاعر "جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے" یہ صرف محاورۃً کہہ رہا
جانِ من!! اب یہاں آکر تمہاری دنیا کی جانب نظر کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس طمع ساز زندگی سے
جی اوب سا گیا ہے کہیں اس خیال میں نہ رہنا کہ بابا آدم کی طرح شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کے جرم میں زمین
پر بھیج دیا جاؤں گا۔ ایسا اب ممکن نہیں یہ خیال دل سے نکال دو۔ آنا تو تم ہی کو ہوگا وہ بھی اکیلے کیوں کہ
یہاں پر بہت سارے لوگ کسی نہ کسی حادثہ کی وجہ سے اجتماعی طور پر آجاتے ہیں ورنہ عموماً اکیلے ہی آنا پڑتا ہے۔

دنیا چھوڑنے سے قبل جائیداد ورثہ میں برابر تقسیم کر کے آنا ورنہ ہماری برسی کے موقع پر اپنی اولاد اخبار
میں اشتہار نہیں شائع کرے گی ماسوا اس کے جو بدنامی ہوگی وہ مرے پر سو دُرّے والا معاملہ ہوگا۔ یہاں
آنے کے تعلق سے ایک بات تو میں کہنا بھول گیا کہ دنیا سے جنت کو کوئی فلائیٹ نہیں آتی، راکٹ چاند میں تو
جا سکتا ہے لیکن جنت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہوائی جہاز یہاں پہنچ سکتا تو دنیائے فانی کے سارے امراء اور
روساء چھٹیاں گزارنے جنت چلے آتے اور بعض تو موقع سے فائدہ اُٹھا کر یہاں مستقل سکونت اختیار کر لیتے
یعنی جنت بھی سوئٹزرلینڈ بن جاتی۔ پروردگارِ عالم نے یہاں آنے کے لیے عجیب و غریب سواری مختص کر دی
ہے جو ہر محلے کی "مسجد" سے بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہے اُسی کے ذریعہ چار کے کاندھوں پر یہاں چلے آنا

یہ خط ایک بہت ہی نیک صفت اور قابلِ بھروسہ آدمی کے ذریعہ بھیج رہا ہوں جو زیر زبر کی غلطی (ادی
ٹاپیٹ والی) سے یہاں آگیا تھا لیکن غلطی کا فوراً احساس ہوتے ہی چند ثانیوں میں زمین پر واپس کر دیا گیا۔ موصوف
خط گھر پہ پہنچا دیں گے اُن سے یہاں کے حالات معلوم کرنے کی کوشش مت کرنا اس راز کو راز ہی رہنے
دو۔ پرفیوم، پارچہ، ٹیپ ریکارڈر، تحفے وغیرہ بھجوانے کا رواج نہیں۔ ویسے جنت میں پرفیوم کی بوتلیں نہیں
تیار ہوتیں بلکہ فضاء خود ہمیشہ معطر رہتی ہے۔ اخبار ابھی میرے سامنے رکھا ہوا ہے زمین کے باسی واقعی
اپنے مرحومین سے مخاطبت کا بہت اچھا ذریعہ ڈھونڈ نکالتے ہیں باقی دوسرے بھی اسی طرح اپنی آخرت
سنوار لیں۔ اور نیکیوں میں مزید اضافہ کر لیں یعنی برسی کا اشتہار مع تصویر شائع کر دیں پھر وہ دن دُور نہیں
جب سارے اخبار میں صرف برسی کے اشتہارات کے سوا کچھ نہ ہوگا زیادہ سے زیادہ اتفاقی حادثات،
چاقو زنی، فسادات، آتش زنی، انتقال، زیارت اور چہلم کی خبروں کی گنجائش فراہم کی جائے گی۔

جانم! موجودہ فلمی اشتہارات سے طبیعت اوب سی گئی ہے کئی کئی ہفتوں تک ایک ہی فلم کے
اشتہار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ذرا غور کرو ان فلمی اشتہاروں کے بجائے برسی کے اشتہار کتنے بھلے معلوم ہوں گے
نورانی شکلیں دیکھنے کو ملیں گی۔ اسی بہانے ہمیں بھی ہر سال برسی کے موقع پر اپنی تصویر دیکھنے کو ملے گی اگر ہو سکے تو سال میں
دو مرتبہ برسی منانا جس طرح ہیروئین سالگرہ مناتی ہے۔ آئندہ سال برسی کے دن پورے صفحہ پر ایک عدد جوانی کی تصویر کے ساتھ
اشتہار شائع کروانا جس طرح فلم کی ریلیز یا سلور جوبلی کے وقت ہوتا ہے۔ اس محبت نامہ کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا لوگ یقین نہیں
کریں گے اور دماغی خلل تصور کریں گے۔ مجھے خط تحریر کرتا دیکھ کر آخری تاجدارِ ہندوستان سراج الدین محمد ظفر مندرجہ ذیل شعر
زیرِ لب گنگناتے ہوئے دودھ کی نہر کی جانب چلے گئے ؎

یارانِ رفتگاں کا کھلے حال کس طرح ÷ بھیجا نہیں کسی نے بھی لکھ کر عدم سے خط ۵

امجد علی فیضؔ
گلبرگہ

کوڑا کرکٹ اور ہم

جب بھی کچرے کا ذکر آتا ہے تو ہم اپنے آپ کو سرتا پا کچرا ہی کچرا نظر آنے لگتے ہیں اور ہمارے دماغ پر کیڑے مکوڑے رینگنے لگتے ہیں، کانوں میں مکھیاں بھنبھنانے لگتی ہیں اور ہمارا دل مویشیوں کیلئے چراگاہ کا کام کرنے لگتا ہے۔ ہم یہ سب محض اِس لیے برداشت کرتے آرہے ہیں کہ اب ہم میں کوئی قوتِ صفائی باقی نہ رہی اِسی لیے چپ چاپ اپنے آپ کو کچرا دان سمجھ کر جی رہے ہیں اور اِس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں اگر ہے بھی تو اس آزاد جمہوری ملک میں جب سے عورتوں کو مردوں کی برابری کا حق ملا ہے تب سے ہمیں اُس حق سے محروم کردیا گیا ہے اور شاید اِسی لیے آج کل گھریلو کام مردوں کے سر تھوپ کر عورتیں آزادی سے گھومتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

صاحبو۔ گھبرایئے نہیں ہمارا شمار بھی اُنھیں مردوں میں ہوتا ہے جنھوں نے عورتوں کی کڑوی کسیلی باتوں پر گھریلو صفائی کو ترجیح دی ہے اس مطلقاً بیگم کا دودھ شریک بھائی یعنی کچرا ہماری ذات میں کچھ اس طرح گڈمڈ ہوگیا ہے کہ لاکھ الگ کرنے کے باوجود ہمیں اُس سے چھٹکارا نہیں مل پاتا۔ آپ اسے جتنا ہی دُور کرنا چاہیں یہ اُتنا ہی آپ سے چمٹ جائے گا اِس میں کوئی مقناطیسی قوت کا ہاتھ نہیں بلکہ راست خلاقِ قدرت کار فرما ہے کیونکہ قدرت کو ہمارے خالی سر ہونے کا احساس شدت سے تھا۔

کچرا ہماری ذات سے کچھ اِس قدر قریب ہوتا جارہا ہے کہ ہماری بیوی کو بھی اِن تعلقات پر شک ہورہا ہے (حالانکہ یہ آگ انہی کی لگائی ہوئی ہے) اور ہم بھی قدرے عاجز آچکے ہیں کہ کھڑکی کھولو تو کچرا بند کرو تو کچرا اور دروازہ کھولو تو کچرا ہوا کے تیز جھونکوں سے کالی بلّی کی طرح راستہ کاٹتے ہوئے گذر جائے گا۔ حتیٰ کہ اِس آب و ہوا میں سانس بھی لیں تو ناک کی چھلنی میں کچرا اٹک کر رہ جائے اور چھینک آجائے۔ اگر ناگہانی بھولے بسرے، ناک صاف کریں تو ناک کے دروازوں سے مکڑی کے جالے، مچھروں کے پر، اور خزاں رسیدہ پتوں کے ریزے برآمد ہوں ایسی حالت میں اُس خالقِ دو جہاں سے شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے جس نے ساری دنیا تو بنائی مگر اُس میں کچرا بھر کر ہماری جان خطرہ میں ڈال دی۔ اگر ہمیں اِس ظالم کچرے کے بیچ مظلوم بنا کر پیدا کرنا ہی تھا تو عمل تنفس کے ساتھ کوئی ایسا آلہ بھی فٹ کردیتا جس سے ہم

سانس کے ذریعہ خوشی خوشی کچرے کو بھی اپنے اندر سموتے اور فلٹریشن کے بعد کسی خفیہ راستہ سے اِس نصیحت کے ساتھ بری کر دیتے کہ "میاں باہر جاکر کوئی ایسی ویسی شرارت نہ کرنا جس سے خدائی مخلوق کو کوئی تکلیف پہنچے۔

ہمارا تعلق جتنا کچرے سے ہے اُس سے کہیں زیادہ کمبخت کچرے دان سے ہے ہمیں علی الصبح اس کی سلونی صورت دیکھنے کو ملتی ہے اور ہم ہیں کہ بنا ڈور اس کی جانب کھنچے چلے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ صبح گھر کی صفائی کے بعد کچرے دان کی گود کچرے سے ہری ہو جاتی ہے اور دن بھر کی ہواؤں سے اُس کی پارزیرگی عمل میں آتی ہے جس کی وجہ سے کچرے دان کی گود اُجڑ کر کچرا ہمارے گھر ہم سے گھر داماد بن کر تشریف لے آتا ہے جسے سرِشام اُسی آن بان اور شان کے ساتھ رخصت کرنا پڑتا ہے جس دن اِس کام میں تھوڑی بہت آنا کانی ہوئی اُس دن ہماری رخصتی کی تیاریاں ہماری بیگم کے زیرِ نگرانی شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ پچھلی تعطیل کو ہوا ہوا یوں کہ ہم اُس روز دیر سے اُٹھے اور آنکھوں کو ملتے ہوئے ایک بھرپور انگڑائی لینے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں ہم کچرے میں کمر تک دھنسے ہوئے ہیں سوچنے لگے خدارا یہ خواب ہے یا خواب کی تعبیر، کچرے دان ہے یا دالان۔ آنگن ہے یا میدان۔ بہت دیر تک اس معاملہ پر غور کرتے رہے اور کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہماری خوبصورت نیک دل بیوی نے علی الصبح ہمارا خیر مقدم کچرے سے کیا ہے جسے ہم خواب سمجھ کر برداشت کر چکے تھے۔ ہم نے کچرے کو شاہانہ بے نیازی کے ساتھ اپنے دامن سے الگ کیا اور فقیرانہ بے نیازی کے ساتھ باہر آئے تو محترمہ نے ایک طنزیہ فقرہ ہوا میں اُچھالتے ہوئے یوں گویا ہوئیں "پتہ ہے کتا بھی دُم سے اپنی جگہ صاف رکھتا ہے" صاحبو سچ مانیئے اس روز ہمیں اپنے بے دُم ہونے کا احساس ہوا (ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے) اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق کچرے کو اپنی گود میں لیے چلے کچرے دان کی طرف جھٹ سے کچرے دان میں کچرا پھینکا اور چپ چاپ "HOUSE FULL" کا بورڈ لگا کر واپس آ گئے۔

بات کچرے دانوں کی ہو رہی ہے تو لگے ہاتھوں اور دبے پاؤں یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہمارا ملک ہی ان کی پیداوار کا حامی نہیں بلکہ ہر ملک میں بھی ان کی نسلیں پائی جاتی ہیں مگر فرق صرف اِتنا ہے کہ وہاں ان کے لیے پردوں کا خاص اہتمام ہوتا ہے اور ہمارے ہاں یہ بے چارے بے پردگی کا شکار سرِراہ ہاتھ پسارے ہر خاص و عام کو دعوتِ معانقہ دیتے ہیں "کچرہ دان" کی تاریخ چھیڑ کر ہم "مرغی پہلے یا انڈا" والے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتے کیوں کہ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ "پیڑ لگاؤ دھرتی بچاؤ" نعرہ کے تحت اِنھیں بھی سڑک کی دونوں جانب پھول کے گملوں کی طرح سجا دیا گیا ہے تاکہ یہ اپنے مقررہ حدود میں پنکھڑیاں پھیلائے، خوشبو بکھیر کر ماحول کو خوشگوار بنائے رکھیں اور جس سے ہمارے ذہنوں کی "اوور ہالنگ" بھی ہوتی رہے۔

جب کچرے دان ہمارے جزوی اشتراک سے بھر جاتے ہیں اور کافی دِنوں بعد سڑ جاتے ہیں تو محکمہ بلدیہ کے عملی اشتراک سے شہر کی خالی جگہوں کی خانہ پوری ہوتی ہے۔ اور جب یہی صورتِ حال شہر کے بیچوں بیچ ہو جائے یعنی کچرے دان آبادی کی طرح پھیل کر موضع میں تبدیل ہو جائیں اور کچرا سیلاب

کے پانی کی طرح گھروں میں گھسنے لگے تو سمجھ لیجیے کہ محکمۂ بلدیہ کے ملازمین ہڑتال پر ہیں اور اُن کی مانگیں ہیں کہ " لوگ کچرا زیادہ پھینک رہے ہیں جس سے اُن کی محنت میں اضافہ اور پسینہ میں کمی واقع ہوکر (LOW SWEAT PRESSURE) کا مرض لاحق ہوگیا ہے وہ حکومت سے عوام کو یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ عوام کچرا کم پھینک کر (اور زیادہ کھاکر) اُنھیں اِس موذی مرض (L.S.P) سے چھٹکارا دلانے میں مدد کریں ۔ ہمیں اب یہ فکر لاحق ہورہا ہے کہ وہ دِن دُور نہیں جب ان مزدوروں کی مانگیں پوری ہونگیں اور کچرا پھینکنے پر پابندی عائد کردی جائے گی کہ " کچرا پھینکنا سنگین جُرم ہے اور کچرا پھینکنے والا خطرناک مجُرم جو کوئی شخص رات کے اندھیرے میں یا دن کے اُجالے میں کچرا پھینکتے ہوئے پکڑا جائے تو اُسے سخت سے سخت سزادی جائے گی اور اگر حالات قابو سے باہر ہوجائیں تو فوج کے ذریعہ ہر گھر کی تلاشی لی جائے گی جس کسی کے گھر میں زہریلی ردّی اور دھماکو کچرا پکڑا جائے گا حکومت اُس خاطی، دیش دروہی کو سزائے موت دے گی۔

خُدا کرے وہ دِن ہرگز نہ آئے ! ▫▫

غلام نجم الدین
عجمان، امارات عرب متحدہ

پہلا بین الاقوامی

"مشاعرۂ زندہ دلانِ دبئی ۸۸ء"

دبئی متحدہ امارات کی ایسی ریاست ہے جس نے برصغیر ہند و پاک کے لاکھوں تارکین وطن کو اپنی فراخ آغوش میں پناہ دے کر ایک خوشگوار مستقبل کی راہ ہموار کی۔ اہلیانِ دبئی یوں تو ادبی محفلوں تہذیبی، سماجی اور اصلاحی نشستوں کا اہتمام کرتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا تھا پھر بھی کچھ کمی اور کسر باقی رہ گئی ہے۔ ان محفلوں اور نشستوں کی اہمیت و افادیت اپنی جگہ مسلّم اور یہ کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔ مگر پھر بھی ایک تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔ ہر قسم کی نثری محفلیں تو آئے دن برپا ہوتی تھیں لیکن شعری محفلوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اس کمی کو دُور کرنے کے لیے دبئی کے چند ادب دوستوں نے محفلِ مشاعرہ کے انعقاد کا بیڑہ اُٹھایا اور گزشتہ چند سالوں میں ہند و پاک کے جیّد اُستاد شعراء کرام کو دعوتِ کلام دی گئی جن کو خود اپنے وطن میں سُننا دشوار تھا ان شعرائے کرام کی فہرست طویل ہے۔ جن شعراء کا جشن یا ان کی یادیں بہ تزک و احتشام منائی گئیں اس کی نظیر کہیں ملنا شاید ہی ممکن ہو۔ ان مشاعروں میں "بیادِ فیض" "جشنِ خمار" "جشنِ فراز" "احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار کانفرنس" اور انڈو پاک مشاعرہ قابلِ ذکر ہیں۔ جس طرح دبئی کے محبانِ اردو کے دل فراخ ہیں اسی طرح ان کی فہم و ادراک وسیع اور مذاق اعلیٰ ہے یہی وجہ ہے کہ شعراء کو بھرپور داد بھی حاصل ہوا کرتی ہے شعراء کی عظیم الشان پذیرائی کی جاتی ہے اور وہ اپنے سفر کی تمام صعوبتوں کو فراموش کر کے بھرپور اور والہانہ انداز سے غزل سرا ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ شعراء کرام بار بار دبئی آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

دبئی میں منعقدہ ان مشاعروں کے سرپرستوں میں ایک ہستی کا تعارف کروانا میرا فرض ہے جنھوں نے اردو کی خدمت کا حق ادا کر کے اہلیان دبئی کو ایک ایسی منزل کی طرف گامزن فرمایا جو کسی بھی مفاد سے پاک و صاف تھی۔ میری مراد جناب محمد انیس انصاری سے ہے۔ موصوف اعظم گڑھ ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں پُرخلوص، ادب نواز اور سچے خادم اردو ہیں۔ دبئی میں آج کل جو مشاعرے ہوا کرتے ہیں اس کی خصوصیت اور انفرادیت یہ ہوتی ہے کہ داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ یا نذرانہ نہیں لیا جاتا گوکہ ہزاروں درہم کا خرچ ہوتا ہے مگر چند ایک محبانِ اردو دیارِ غیر میں بھی اپنی اردو سے محبت کے جذبہ کو بروئے کار لا کر ہزاروں پرستارانِ اردو کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ اپنے دلوں کو شاد کرلیں۔ ان چند بے لوث محبانِ اردو میں سرفہرست جو شخصیت اُبھر تی

ہے وہ جناب انیس انصاری کی ہے، موصوف نے مفاد پرست اصحاب کا اس سختی سے محاسبہ کیا کہ وہ لوگ جو ان ادبی محفلوں کو ذریعۂ معاش بنانے کی تدبیریں کرتے تھے نادم ہو گئے اور آج دبئی میں ادبی محفلیں خالص شعراء کرام کی بہبودی اور فلاح اور عوام کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے منعقد ہونے لگیں جس کا سہرا صرف جناب انیس انصاری کے سر جاتا ہے جنھوں نے عملی طور پہ مشاعرہ انڈو پاک منعقد کر کے ثابت کر دیا۔ دبئی کے مشاعرے اِتنے عظیم الشان اور منظم ہوا کرتے ہیں کہ خود اپنے ملک میں بھی ایسا اہتمام ممکن نہیں مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، ادبی تشنگی باقی ہی رہ جاتی ہے یہاں کا یکساں کوئیت کا مشینی انداز کا کام اور نظام العمل جو برسوں گزرنے پر بھی تبدیل نہیں ہوتا اور جس کے آہستہ آہستہ اثرات یہ ہوتے ہیں کہ انسانی دل پژمردہ اور احساسات ماند پڑ جاتے ہیں۔ مشاعرے چند گھنٹوں تک اس المناک احساس سے دور رکھنے کے لیے معاون ثابت ہوئے، مگر روح کو بالیدگی عطا کرنا ان شاعروں کے بس میں نہ تھا بالآخر یہ تجزیہ کیا گیا کہ "مزاح" جو بنی نوع انسان کی فطرت اور روح کا حصہ ہے اور وہ یہاں کے ماحول میں ناپید ہے اس سرزمین پر اس کے فروغ کی بنیاد ڈالی جائے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ اردو ادب کے طنز و مزاح نگاروں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس غرض سے ہندوستان کے شہر حیدرآباد دکن پر نظر پڑنا فطری تھا جو طنز و مزاح کا ایک اہم مرکز بن چکا ہے ہم زندہ دلانِ حیدرآباد کے ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال (مُدیر ماہنامہ شگوفہ) کے تعاون اور مشوروں سے استفادہ حاصل کر کے ہند پاک طنزیہ و مزاحیہ مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جو پاکستان کے معروف طنز و مزاح نگار شاعر جناب دلاور فگار کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے نام معنون کیا گیا چنانچہ پہلا "زندہ دلان مشاعرہ دبئی ۸۸ء" بروز اتوار بتاریخ ۲۶ جون نہایت ہی تزک و اہتمام سے منعقد ہوا۔ ہندوستانی شعراء کرام جناب ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کی سرپرستی میں اور پاکستانی شعراء حضرات جناب دلاور فگار کی سرپرستی اور قیادت میں تشریف لائے تھے

اس مشاعرے کے آغاز سے ہی یہ احساس نمایاں ہونے لگا تھا کہ عرصہ دراز سے جو تشنگی تھی وہ دُور ہو رہی ہے۔ طنز (مذہب، ملت اور علاقے سے بے نیاز)، مزاح (اعلیٰ و شائستہ) اصلاح (کمارسٹ مفید اور شوگر کوٹڈ) اور ظریفانہ اشعار کی برجستگی ــــ یہ وہ نسخۂ کیمیا تھے جن کو برصغیر ہند و پاک کے نامور زندہ دلوں نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں قہقہوں اور ہنسی کا ٹانک بنا کر پلا دیا۔ آج بھی وہ خوشگوار یادیں باقی ہیں اور اہلِ دبئی کے دلوں میں آج بھی فرحت و شادمانی موجزن ہے۔ اس مشاعرے کی دوسری خوبی یہ تھی کہ ایک نہایت ہی جامع دلکش و دیدہ زیب مجلّہ (سوونیر) شائع کیا گیا جو تمام سامعین میں مفت تقسیم کیا گیا۔ ہم جب بھی تھکن اور بار محسوس کریں اس مجلّہ کی ورق گردانی سے ذہنی رد کو نارمل کیا جا سکتا ہے۔ اس عظیم مشاعرے کی جھلکیاں پیش کرنے سے قبل زندہ دلان مشاعرے کے بانیوں اور اہم شخصیتوں کا تذکرہ کرنا اس لیے ضروری تصور کرتا ہوں کہ ان کی کاوشوں ہی کی عطا ہے کہ اہلیانِ دبئی اردو کے ایک ایسے پہلو سے آشنا ہوئے جس کی اس ماحول میں سختی سے ضرورت تھی۔ امارات میں زندہ دلان کے مشاعروں کے بانی جناب میر حیدر علی اور ڈاکٹر اظہر علی زیدی ہیں۔ حیدر علی صاحب کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے اور کوڈاک ڈسٹری بیوٹرز لیا لمیٹڈ (U.A.E.) میں بحیثیت مارکیٹنگ مینجر تائز ہیں۔ موصوف خود تو شعر نہیں کہتے مگر ذوقِ سخن

رکھتے ہیں شعراء کی عزت وقدر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں آپ نہ صرف اردو کے دل دادہ ہیں بلکہ اردو اد
کی سرگرمیوں میں عملی حصّہ لینا آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ برصغیر کے گوشے گوشے سے ان اصحاب کو اکٹھا
کیا کرتے ہیں جو اُردو ادب کے لیے اپنی زندگی وقف کر رہے ہیں۔ ان اصحاب کا جشن تشکر منانا اس
لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ بقائے اردو اور ترقی و ترویج اردو ادب میں خود کو وقف کر چکے ہیں۔
ادبی خدمات کا صِلہ ایک ادیب یا شاعر کے لیے سوائے داد کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بقول جناب ڈاکٹر
ملک زادہ منظور صاحب " اگر ایک بھی صاحب فہم کی آنکھوں میں شاعر کا کلام سن کر ہلکی سی چمک پیدا ہو جائے
تو شاعر کی ادبی تسکین ہو جاتی ہے " یہی حال جناب میر حیدر علی صاحب کا بھی ہے اکثر وہ کہا کرتے ہیں
" اگر ہر سال صرف ایک ہی شاعر یا ادیب کی خدمات کا جشن کر دیا جائے تو یہ میری ادبی تسکین کیلئے کافی ہے "
زندہ دلان مشاعرے کی دوسری اہم شخصیت جناب ڈاکٹر اظہر علی زیدی کی ہے۔ موصوف پاکستان
سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو ادب سے گہری دلچسپی اور بلا کا فہم و ادراک رکھتے ہیں۔ خدمتِ اردو کا جذبہ
کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ شعراء اور ادیبوں کی بے لوث خدمت کا ایسا جذبہ رکھتے ہیں جس کی شاید ہی نظیر
ملے۔ جس طرح پیاسے کو پانی سے تسکین ملتی ہے اسی طرح موصوف کو شعراء اور ادیبوں کی خدمت کرکے تسکین
ملتی ہے۔ اوپر جن مشاعروں کا تذکرہ کرچکا ہوں وہ موصوف ہی کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ الغرض
اب طنز و مزاح ہند و پاک سے نکل کر خلیج میں اپنا قدم رکھ چکا ہے جس کے لیے جناب میر حیدر علی اور ڈاکٹر
اظہر علی زیدی صاحب قابلِ مبارکباد ہیں۔

مشاعرے کے انعقاد سے قبل اس کے نام کا بھی مسئلہ ایک سوال بن چکا تھا مگر شکر گزار ہیں جناب
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال کے جنھوں نے " زندہ دلان " کا نام تجویز فرمایا جو نہ صرف اس مشاعرے کے لیے موزوں تھا
بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انگوٹھی پر نگینہ کا کام کر گیا۔ موصوف نے دبئی میں ایک نشست کی صدارت
میں جو تقریر فرمائی وہ اتنی جامع اور پُر اثر تھی کہ وہ سامعین جو طنز و مزاح کے ادب سے نا واقفیت رکھتے
تھے مبہوت ہو گئے۔ آپ نے فرمایا :

" آج برصغیر علاقائی، قومی اور لسانی جھگڑوں میں اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ وہاں بڑے پیمانہ پر مشاعروں کا اہتمام
کرنا ناممکن تو نہیں لیکن دشوار ضرور ہو گیا ہے۔ خلیج ان جھگڑوں سے اس لیے پاک ہے کہ یہاں پر علاقائی اور لسانی
خلیج نہیں ہے اردو کی شعری و ادبی محفلوں کو آراستہ کرنے کا جو جذبہ اہالیان دبئی رکھتے ہیں وہ قابلِ قدر و ستائش
ہے " طنز و مزاح کے بارے میں آپ نے فرمایا :

" طنز و مزاح کو اردو کے نقادوں نے دوسرا درجہ دے رکھا تھا۔ ان کو وہ مقام حاصل نہ تھا جس کا
وہ مستحق تھا، مگر مسلسل کوششوں و پیہم اعلیٰ خدمات کے فضلات کے بعد یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ طنز و
مزاح اردو ادب کا قابلِ قدر اور لازم و ملزوم جز ہے۔ اردو ادب کے وہ نقاد حضرات جو ماضی میں یہ
تنقیدیں کیا کرتے تھے اب خود اس کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ ادارہ زندہ دلان حیدرآباد دکن گزشتہ ۲۵ برس
سے طنز و مزاح کے ذریعہ اُردو ادب کی جو خدمت کر رہا ہے اس کے سب ہی قائل ہیں " موصوف نے ایک
دلی خواہش کا اظہار فرمایا کہ " پاکستان میں بھی اسی طرز کا کوئی اِدارہ قائم ہو جائے تو برصغیر میں طنز و مزاح

کی سرگرمیوں کو مزید فروغ ہو سکتا ہے"

اگر میں جناب جلیل احمد صاحب جیسی جلیل القدر ہستی کی ادبی خدمات کا اعتراف نہ کروں تو یہی تصور کیا جائے گا کہ میرے اس مضمون میں کمی باقی رہ گئی ہے۔ آپ بے حد ہردل عزیز اور باکمال ہستی ہیں پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور یہاں پر جی اینڈ ایم انٹرنیشنل جیسی معروف کمپنی کے جنرل منیجر ہیں۔ اس قدر اہم عہدے اور اتنی زیادہ ذمہ داریوں کے باوجود اگر اردو زبان و ادب یا اس کی ترقی و ترویج کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالتے ہیں تو یہ اُن کی اردو دوستی و محبت کا بین ثبوت ہے۔ آپ نہ صرف عملی حصہ ادا کرتے ہیں بلکہ ہر طرح کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں، اتنے بڑے اور عالیشان پیمانہ پر مشاعروں کے انعقاد میں آپ کا عملی تعاون دبئی کی تاریخ میں یادگار ہے۔

پہلا بین الاقوامی مُشاعرہ زندہ دِلانِ دُبئی ۸۸ء کی جھلکیاں :

۲۵ جون ۸۸ء کی شب دبئی میں منعقدہ رنگا رنگ اور قہقہوں سے بھرپور مشاعرہ کی نظامت کی ذمہ داری جناب راغب مُرادآبادی جیسی باکمال ہستی کے سپرد کی گئی بقول خود " نظامت کی ذمہ داری ایسی ہی ہے جیسے کسی ادارے کو منظم پیمانہ پر چلانا نہ تو سامعین کی زیادہ سماعت خراشی ہو اور نہ ہی شعراء کے احساسات مجروح ہوں "۔ جناب راغب کی کمپیرنگ بڑی پُرامن اور کامیاب تھی اور بہت پسند کی گئی۔ برجستہ خیالات اور ہلکے لطائف سے سامعین بہت محظوظ ہوتے رہے۔ آپ نے اپنی کارروائی کے آغاز میں سب سے پہلے میزبان شعراء کو دعوتِ سخن دی جس میں دبئی کے جناب ڈاکٹر زبیر فاروقی قابل ذکر ہیں۔ موصوف پیشے سے طب کے ڈاکٹر ہیں دبئی کے عرب باشندے ہونے کے باوجود اردو زبان میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے انوکھے انداز بیان سے فرمایا ؎

ہر ماہ سارے گھر کو لٹاتا ہے ٹیلیفون — بجلی سی بھاری بل کی گراتا ہے ٹیلیفون
مجھ سے کبھی وہ ملنے کا وعدہ بھی تو کرے — جو روز نصف شب کو گھماتا ہے ٹیلیفون
اک مسئلہ عجیب سا لاحق ہے اِن دِنوں — ہر بار اس کا باپ اُٹھاتا ہے ٹیلیفون

زبیر فاروقی کے بعد حیدرآباد دکن سے جناب طالب خوندمیری کو زحمتِ کلام دی گئی :-

اپنی اسکوٹر پہ ہم تھے ایک دوشیزہ کے ساتھ — یہ تو سچا واقعہ ہے کوئی افسانہ نہیں
دندناتے ہم گئے اپنی گلی میں ہی مگر — سر پہ ہلمٹ تھی تو بیگم نے بھی پہچانا نہیں

کراچی کے نوجوان شاعر جناب خالد عرفان۔

کُرسی پہ بیٹھ کر وہ کئی بار سو گئے — موصوف پھر حسین خیالوں میں کھو گئے
اِک ہم جو چپ بنا کے رہے کارپینٹر — وہ کچھ نہیں بنا کے چیئرمین ہو گئے

پاکستان کے ممتاز صحافی و شاعر جناب ضیاء الحق قاسمی :

حج ادا کرنے گیا تھا قوم کا لیڈر کوئی — سنگباری کے لیے شیطان پر جانا پڑا
ایک کنکر پھینکنے پر اک ندا اس نے سنی — تم تو اپنے آدمی تھے تم کو آخر کیا ہوا

ہندوستان کے بزرگ شاعر جناب کشن لال خنداں :

غیر سے جب دو بدو ہونے لگی ، کیسی کیسی گفتگو ہونے لگی ،
بڑھتے بڑھتے بات اتنی بڑھ گئی ، آخ تھو پہ آخ تھو ہونے لگی

پاکستان کے جناب پروفیسر عنایت علی خاں :

خدا کی بندی کچھ تو سوچ دل میں ، اضافہ کی بھی حد ہوتی ہے آخر
گوارہ کیا مرا جینا نہیں ہے ، یہ اپنا گھر ہے کابینہ نہیں ہے

حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر جناب پاگل عادل آبادی جنھوں نے اپنے مخصوص ترنم اور مزاح کے ذریعہ مشاعرہ لوٹ لیا:

سچ میں اور وشواس میں کیا فرق ہے سمجھائیے
باپ سے بیٹے نے پوچھا بات بالکل خاص ہے
ماں تمہاری میری بیوی یہ ہے بیٹے ایک سچ
میں تمہارا باپ ہوں یہ میرا اک وشواس ہے

٭

دفتر سے جب لوٹی بیوی دیکھا بچہ روتا تھا
ڈانٹ کے بولی شوہر سے اک لوری گاتے اچھا تھا
شوہر بولا سُن کر لوری بولے پڑوسی پاگل جی
آپ کی لوری سے تو اچھا بچے کا ہی رونا تھا

پاکستان (راولپنڈی) سے تشریف لائے ہوئے جناب انور مسعود :

بھینس رکھنے کا تکلف ہم سے ہو سکتا نہیں
ہم نے سوکھے دودھ کا ڈبہ جو ہے رکھا ہوا
گھر میں رکھیں غیر محرم کو ملازم کس لیے !
کام کرنے کے لیے "آبا" جو ہے رکھا ہوا !

اسلام آباد کے جناب سرفراز شاہد :

مسلمانوں کی خواہش ہے کہ وہ سب ایک ہو جائیں
مگر ان کو اکٹھا مولوی ہونے نہیں دیتے
بنا رکھا ہے بچے کی ولادت مسئلہ ہم نے
کبھی ہونے پہ خوش ہیں اور کبھی ہونے نہیں دیتے

جناب مشتاق احمد مشرؔ دہلوی :

گئے مسجد میں مسٹر فیضی لیکن کچھ نہیں پایا
اگرچہ سجدۂ پیہم سے اپنے سر کو پھوڑ آئے
خدا کے سامنے سر تو جھکا دیتے تھے وہ لیکن
جھکاتے دل کہاں سے جب اسے جوتوں میں چھوڑ آئے

جناب سید منیر جعفری :

جینے بھی نہیں دیں گے مرنے بھی نہیں دیں گے؟ مختار بھی کرتے ہیں مجبور بھی رکھتے ہیں۔

آخر میں جناب دلاور فگار صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر اور ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے بعد طنز و مزاح کے دریا بہائے۔

حاکم رشوت ستاں فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیرِ رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے دے کے رشوت چھوٹ جا

شعر نازل نہیں ہوتا کبھی لالچ کے بغیر
دل کو امید رقم ہو تو غزل ہوتی ہے
صرف مصرعے سے تو قطعات بھی ممکن ہیں فگار
جان اگر وہسکی و رم ہو تو غزل ہوتی ہے

اس بے مثال اور عظیم مشاعرے کا رات ۲½ بجے اختتام عمل میں آیا :

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

□□

انتظار حسین (لاہور)

مجتبیٰ حسین گزشتہ اور حالیہ

فکاہی کالم مزاحیہ ادب کا حصہ ہیں یا نہیں

مجتبیٰ حسین کا ذکر ہم کریں تو سہی مگر اس میں دقت بہت ہے۔ یوں اس دقت میں ایک خیر کا پہلو بھی ہے۔ ہماری دقت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ ہم نے جن دوستوں کو مجتبیٰ حسین کی آمد کی خبر دی انھیں یہ بھی بتانا پڑا کہ یہ کون سے مجتبیٰ حسین ہیں۔

ہماری وضاحت کے بعد ایک دوست نے اپنے مزید اطمینان کے لیے پوچھا "تو گویا یہ وہ مجتبیٰ حسین نہیں ہیں"۔

"نہیں۔"

"پھر ٹھیک ہے"۔

ایک دوست کو یہ سمجھاتے ہوئے کہ یہ وہ مجتبیٰ حسین نہیں ہیں ہم نے کہا کہ "یہ مزاح نگار مجتبیٰ حسین ہیں"۔

وہ ہنسا "مجتبیٰ حسین اور مزاح؟ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اس کے بعد تم ممتاز حسین کو مزاح نگار بتاؤ گے۔"

وہ تو یہ کہیئے کہ مجتبیٰ حسین کا نام اس طرح سے نہیں نکلا تھا جیسے ممتاز حسین کا نام اپنی تنقید کی دقت کے باوجود نکل گیا تھا۔ اس لیے آج کل کے یارانِ ادب نے ہمارے لیے اس قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا کہ ہمیں سمجھانا پڑتا کہ یہ کون سے مجتبیٰ حسین ہیں۔ بلکہ انھیں تو اپنی طرف سے بتانا پڑتا ہے کہ ایک مجتبیٰ حسین اس سے پہلے بھی گزر چکے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ رفت گزشت ہو گئے۔ مگر جو دوست پاکستان کے پہلے عشرے سے ادب کے ساتھ اُلجھے چلے آ رہے ہیں اُنھوں نے بے شک پچھلے تیس تیس سال سے کبھی گزشتہ مجتبیٰ حسین کو ان کی کسی تحریر کو بھولے سے بھی یاد نہ کیا ہو، مگر حالیہ مجتبیٰ حسین کے ذکر پر انھوں نے اُدبدا کر پوچھا "اچھا مجتبیٰ حسین کس کھوہ سے نکل آئے"۔

جب کوئی نام دہرایا جاتا ہے تو اسی قسم کی دقتیں اور قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ادیب کا نام ابھی فضا میں گونج رہا ہو اور کوئی دوسرا ادیب اسی نام کا پیدا ہو جائے تو ایک قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ادیب گوشۂ گمنامی میں چلا جائے اور پھر اس نام کے ساتھ کوئی دوسرا ادیب سر اٹھائے تو دوسری قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔

ابھی تھوڑے مہینے پہلے کی بات ہے کہ ہمیں ایک ٹیلی فون آیا۔ مانوس سی آواز آئی "میں محمود ہاشمی بول رہا ہوں"۔ پھر رُک کر "دِلّی والا محمود ہاشمی نہیں"۔

ہم نے کہا کہ "حضرت آپ نے کیسے گمان کیا کہ ہم آپ پر دِلّی والے محمود ہاشمی کا شک کریں گے۔
وہ بولے "بھائی وہ محمود ہاشمی آج کل لندن ہی میں ہیں۔ میں بہت مشکل میں ہوں۔ ادبی حلقوں میں تو آج کل انہی کی مشہوری ہے۔"

"کشمیر اُداس ہے" والے محمود ہاشمی تھے۔ جب مسئلہ کشمیر زندہ تھا تو کشمیر سے متعلق رپورتاژوں کی نسبت سے ان کا نام بھی پاکستان کے ادبی حلقوں میں زندہ و تازہ تھا۔ اب دِلّی والے محمود ہاشمی نے نام پایا ہے۔ اور نام سا نام کہ دِلّی سے جو بھی آتا ہے اس سے آپ پوچھیں نہ پوچھیں وہ آپ کو محمود ہاشمی کی خیریت ضرور سناتا ہے۔

خیر ذکر تو مجتبیٰ حسین کا مقصود تھا، ان مجتبیٰ حسین کا جو ہمارے زمانے کے صفِ اول کے مزاح نگار ہیں۔ حیدرآباد دکن کی مٹی ہیں۔ دِلّی میں پائے جاتے ہیں۔ اصل میں وہ ان پچھلی دہائیوں میں اُبھرے اور نامور ہوئے ہیں، جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کا تبادلہ یکسر موقوف تھا۔

چونکہ ادیبوں کا تبادلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے تو ان کے واسطے سے کتابیں اور رسالے بھی کسی نہ کسی صورت اِدھر کے اُدھر پہنچنے لگے ہیں اور اُدھر سے اِدھر آنے لگے ہیں۔ سو مجتبیٰ حسین کا مزاح ادھر اب جا کر پہنچنا شروع ہوا ہے۔ اور اب وہ [illegible] قارئین پر اپنا جادو چلا رہا ہے۔ مگر قصہ یہ ہے کہ ادب میں جو پُرانے ہو جاتے ہیں خواہ لکھنے والے ہوں خواہ [illegible] پڑھنے والے ان کا مطالعہ اور اس کے ساتھ ان کا ادبی شعور عصری ادب کے ساتھ چلتے چلتے کسی موڑ پر آ کر اٹک جاتا ہے۔ پھر ادب کی فضا اور سے اور ہو جاتی ہے اور وہ اسی موڑ پر پھنسے کھڑے رہتے ہیں۔ انہی دنوں کی بات ہے ہم نے سنا ہے کہ لندن سے ایک بزرگ آئے کہ کبھی ادب میں ان کا قدم ہوا کرتا تھا۔ ایک محفل میں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا اور افسوس بھرے لہجے میں بولے کہ شاعری میں راشدؔ اور فیضؔ کے بعد اور ادھر افسانے میں منٹوؔ اور کرشن چندر کے بعد کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

بس اسی قسم کے دوست تھے جنھوں نے مجتبیٰ حسین کے ذکر پر ہمارے لیے مشکلات پیدا کیں۔ ان دوستوں کا ادبی مطالعہ اور ادبی حافظہ کہیں ترقی پسند تحریک کے آخری ایام کے آس پاس آ کر ٹھٹکا ہوا تھا۔

"بس ادب تو اس زمانے میں تھا" ایک دوست کی یادوں نے زور مارا اور شروع ہو گئے "کیا گہما گہمی تھی، کیا زمانہ تھا، کیا لوگ تھے۔"

ایک نوخیز ادیب مبہوت ہو کر یہ سنتا رہا۔ پھر اس نے ہماری طرف دیکھا جیسے ہم سے اس بیان کی تصدیق چاہتا ہو۔ ہم نے پوچھا "تم نے کبھی دِلّی کے کسی پُرانے بزرگ کی باتیں سنی ہیں؟"

"نہیں۔"

"پھر تم اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے۔" اور ہم اسے بتلانے لگے کہ دِلّی کے پُرانے بزرگ دِلّی کو اس طرح یاد کرتے ہیں کہ امی جی کے دن تھے۔ سستے کے زمانے تھے۔ آم گدھوں کے حساب بکتے تھے۔ گدھوں پر لدے آموں کو دیکھ کر بھاؤ تاؤ اس طرح کیا جاتا تھا کہ کتنے ٹکے کا گدھا دیا ہے۔

"گویا ترقی پسند تحریک کے زمانوں میں بھی ادب کی اتنی ہی افراط تھی۔ وہ سب ادیب جو اتنی افراط سے

اب ہم نے ٹھنڈا سانس بھرا "میرے دوست کیا پوچھتے ہو ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ب جو تم ترقی پسند ادیب دیکھتے ہو یہ تو باقیات الصالحات ہیں۔ اور جب ہم نے اس عہد کے نام گنانے شروع کئے تو وہ نوجوان ہر نام پہ حیران ہوا کہ اچھا اس زمانے میں یہ ادیب تھے۔ ایک نام سن کر بہت چونکا۔

"عارف عبدالمتین۔ اچھا تو وہ ترقی پسند ہوا کرتے تھے۔ واقعی؟"

ہم نے کہا "عزیز اگر تم نے عارف عبدالمتین کی ترقی پسندی نہیں دیکھی تو اس دنیا میں آکر کیا دیکھا"

لیجئے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر تو مجتبیٰ حسین کا تھا۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں ایک تو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ براہِ راست مزاح نگار ہیں۔ مطلب یہ کہ صحافت کے راستے میں مزاحیہ ادب کی اقلیم میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ شاید اس کا انھیں احساس بھی ہے۔ پہلے نہیں تھا تو پاکستان آکر ہو گیا۔ باتیں کرتے کرتے کہنے لگے کہ "پاکستان میں ہم نے عجب بات دیکھی"۔

ہم نے عرض کیا کہ پاکستان میں تو بہت سی عجب باتیں دیکھنے والی ہیں۔ آپ نے کون سی عجب بات دیکھی؟

بولے "ہم نے یہ عجب بات دیکھی کہ یہاں اخبار کے کالموں کو بھی مزاحیہ ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور مزاحیہ ادب کو ذکاہی کالم سمجھا جاتا ہے۔ پتہ ہے میرے ساتھ تمہارے کراچی والی طنز و مزاح کانفرنس میں کیا ہوا۔

ہم نے پوچھا "بتاؤ کیا ہوا"

بولے "میں جب اپنا مضمون پڑھ چکا تو ایک صاحب آئے۔ شاید کسی پرچے کے ایڈیٹر تھے۔ کہنے لگے کہ اپنا یہ کالم ہمارے پرچے کے لیے عنایت کر دیجئے۔ میں سٹپٹایا پوچھا کون سا کالم؟۔ یہ تو میرا مضمون ہے۔ اب ان کے سٹپٹانے کی باری تھی"۔

مجتبیٰ حسین کے اس تعجب میں تھوڑا دخل شاید اس بات کا بھی ہے کہ ہندوستان میں کالم نگاری نے زیادہ فروغ ہی نہیں پایا کہ مزاحیہ ادب میں اس کے شامل ہونے نہ ہونے کا سوال اردو اخباروں میں وہاں کالموں کا زیادہ چلن نہیں ہے صحافت کی پرانی روایت کے مطابق ایک اخبار میں ایک ذکاہی کالم کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔

مجتبیٰ حسین بتاتے تھے کہ ہندی اخباروں میں بھی وہاں کالم نگاری کو وہ فروغ نہیں ملا ہے جو پاکستان میں ملا ہے۔ بلکہ ہندی میں تو مزاحیہ ادب بھی واجبی واجبی ہے۔ اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کوئی زبان جب بہت ترقی کر لیتی ہے۔ اظہار کی صورتیں بن سنور جاتی ہیں، تب اس زبان میں مزاح پیدا ہوتا ہے۔

خیر مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں تو کالم نگاری نے وہ فروغ ہی نہیں پایا کہ مزاحیہ ادب کے لیے خطرہ بن جاتی اور کالم نگار مزاح نگاروں کے لیے چیلنج بنتے۔ مجتبیٰ حسین تعجب نہ کریں، شکر کریں کہ ان کے یہاں مزاحیہ ادب کی سرحدیں محفوظ ہیں اور وہ کالم نگاروں کے خوف اور خطرے سے آزاد اپنی مزاح نگاری میں مصروف اور مگن ہیں۔

انیس ناگی کی چائے، ادیب کا کٹھن امتحان ــ!

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

یارانِ ادب کو اب قدرے فرصت ہے۔ پچھلے دنوں تو مہمانوں نے سانس لینے تک کی مہلت نہیں دی۔ ایک مہمان گیا تو دوسرا مہمان۔ دوسرا مہمان گیا تو تیسرا مہمان . . . . اور ایک ایک وقت میں دو دو مہمان . . . . . اور دو دو مہمان ادیب . . . جب ایک وقت میں آجائیں تو اس سے بہت نئے مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ ایسے ادیب ہوں کہ اپنے شہر میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روا دار نہ ہوں۔

بہرحال میزبان سُرخرو رہیں۔ سب مہمان ایک ایک کر کے ساتھ عزت کے رخصت ہو گئے۔ اس موسم کے آخری مہمان مجتبیٰ حسین تھے۔ وہ بھی رخصت ہوئے . . . بلکہ وہ تو بہت ہی عزت سے رخصت ہوئے . . . انھیں تو انیس ناگی نے بھی کچھ نہیں کہا۔

واضح ہو کہ مہمان داری کے اس موسم میں جو ابھی ابھی ختم ہوا ہے انیس ناگی ایک نئے اور منفرد میزبان کی حیثیت سے اُبھرے ہیں بلکہ ایسے منفرد میزبان کہ ان کی دعوت ایک کسوٹی بن گئی کہ جو مہمان اس دعوت کی آزمائش سے کامران گزرے گا وہ چاتر مہمان مانا جائے گا . . . . مگر مہمان جب ادیب ہوں تو چاتر کون نکلتا ہے . . . . ہم نے تو جسے بھی دیکھا سادہ اور غافل ہی پایا۔

اب تک تو اس شہر میں دو ہی شخصیتیں میزبانی کے فرائض انجام دینے میں پیش پیش تھیں۔ کشور ناہید اور ڈاکٹر وزیر آغا . . کشور ناہید کی کیا پوچھتے ہو . . . اس شہر سے کوئی مہمان ادیب ان کی دعوت سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ کوئی مہمان اگر لاہور کے قریب سے بھی گزر جائے تو سمجھو کہ پکڑا گیا . . . . اور لازم نہیں ہے کہ مہمان طے شدہ ادیب ہی ہو . . کسی مہمان پر ادیب ہونے کا شک بھی گزر جائے تو کشور ناہید اس کی دعوت کئے بغیر نہیں چھوڑتیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا طور مختلف ہے . . . ان کا رویہ انتخابی ہے۔ مگر ایک مرتبہ مہمان ان کی نظر انتخاب میں آجائے تو پھر وہ اس کے لیے آنکھیں بچھاتے ہیں . . . .

مگر اس برس مہمانداری کا جو موسم چڑھا اس میں انیس ناگی ایک نرالے میزبان کی حیثیت سے شہر میں نمایاں ہوئے . . . گمان غالب یہی تھا کہ چونکہ وہ مہمان کو اپنے گھر بلا رہے ہیں اس لیے پنجابی زبان کے محاورے کے مطابق ہاتھ ہولا رکھیں گے . . یعنی ویسے تو اپنے انیس ناگی اس شہر میں کھلے پھرتے ہیں . . . جو زد میں آگیا اسے سینگ مار دیا اس معاملہ میں وہ دوست دشمن کو بھی نہیں دیکھتے، اپنا ہو پرایا ہو سامنے آجائے . . . پھر وہ گھائل ہوا ہی ہوا . . . . اہلِ شہر نے بھی بہت شور مچانے کے بعد بالآخر یہ سوچ کر صبر کرلیا ہے کہ ع

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

سچ پوچھئے تو ایک اینگری ینگ مین وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی تو ہو جو بزمِ خویش افلاطونوں کے منہ میں لگام ڈالے . . . انیس ناگی بے شک ینگ مین نہ رہے ہوں مگر غصہ تو انھیں اب بھی اٹھتی جوانی والوں ہی کی طرح آتا ہے۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ ہندوستان سے و نیز لندن سے جو بھی مہمان اس شہر میں آیا اُسے انیس ناگی نے اپنے یہاں

چائے پر بلایا ۔ ۔ ۔ ۔ اِدھر مہمان نے یہ سوچا کر جہاں اتنے کھاتے کھائے ہیں ایک محبت کی چائے بھی سہی ویسے بھی انیس ناگی نے جسے بھی چائے پر بُلایا اِس محبت سے بلایا کہ اس کے لیے انکار ممکن ہی نہیں تھا ۔ اب اسے یہ کیا پتہ تھا کہ وہاں کون سا دام سخت پنہاں ہے ۔ جو وہاں گیا بے خبری میں گیا اور مارا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ چائے محبت سے پلائی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ادب کے معاملے میں انیس ناگی محبت مروت کے بالکل قائل نہیں ۔ ادیب کے سارے لکھے لکھائے کا حساب بے مروت بن کر بے باق کیا اور مہمان کو فارغ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں کسی مہمان کی کوئی تخصیص نہیں ۔ انیس ناگی نے سب مہمانوں کو ایک آنکھ سے دیکھا ۔ سو سب مہمان ان کے گھر سے ایک ہی حال میں واپس آئے ؎

بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

مگر مجتبیٰ حسین وہ تو ہنستے کھیلتے لاہور سے واپس گئے ہیں ۔ ان پر تو آنچ نہیں آئی ۔ جب وہ یہاں پہنچے تھے تو ان کے ہمدردوں کو ان کے متعلق تشویش ہوئی ۔ ۔ ۔ ایک ہمدرد نے دوسرے دن آکر ان سے پوچھا کہ تمہیں انیس ناگی نے چائے پر بُلایا تھا ۔

جواب دیا" نہیں "۔

مرد ہمدرد نے اطمینان کا لمبا سانس لیا" شکر ہے"۔ پھر رازدارانہ لہجہ میں کہا" ذرا ہوشیار رہنا ۔ کسی وقت بھی چائے کے لیے بلاوا آسکتا ہے "۔

مجتبیٰ حسین کچھ کچھ کچھ نہ سمجھے ۔ بات آئی گئی ہوگئی ۔ تیسرے دن وہ دعوت جسے بہرحال ہونا تھا ہوئی یعنی کشور ناہید کے یہاں کی دعوت ۔ انھیں اوقات میں وہ ایک اور دعوت کو نبٹا کر اس دعوت میں پہنچے ۔ پوچھا کس کے یہاں کی دعوت کھا کر آرہے ہیں ۔

بولے" سعادت سعید کے گھر دعوت تھی "۔

دوستوں نے فکرمندانہ لہجہ میں پوچھا" وہاں تو انیس ناگی بھی ہوں گے ۔

" ہاں تھے "۔" پھر کیسی گزری "۔۔۔" اچھی گزری "۔۔۔ دوست چکرائے ۔" انیس ناگی نے آپ سے کچھ نہیں کہا "

" نہیں ۔ ۔ ۔ وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں ۔ بہت اچھی گفتگو رہی "۔۔۔ دوست حیران و پریشان کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔ پھر پوچھا" کل آپ واپس چلے جائیں گے "۔۔۔" جی ہاں "۔۔۔" اچھا آپ بہت خوش قسمت آدمی ہیں "۔۔۔" کیسے "۔

" آپ اس موسم کے پہلے مہمان ہیں جو اس شہر سے خیر و عافیت کے ساتھ واپس جائیں گے "۔۔۔ بعد میں یاروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مجتبیٰ حسین کو اِن کی مزاح نگاری بچالے گئی۔۔۔ ویسے ہم نے یہ دیکھا ہے کہ مزاح نگار انیس ناگی سے خوش رہتے ہیں ۔ یہ باقی خلقت کا معاملہ ہے کہ ؏

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

بہرحال اب اس شہر میں ایک نئے میزبان کے نمودار ہوجانے کی وجہ سے مہمانداری کا نقشہ منقلب ہوگیا ہے ۔ کشور ناہید کی دعوتیں اپنی ساری تڑک بھڑک کے باوجود پس منظر میں چلی گئی ہیں ۔ اس سادہ سی چائے پارٹی نے جو انیس ناگی کی طرف سے دی جاتی ہے اولین اہمیت اختیار کرلی ہے ہر آنے جانے والے مہمان کے لیے یہ چائے پارٹی ایک امتحان کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں جوکھوں ہی جوکھوں ہے جو انیس ناگی کی چائے سے آسان گزر گیا سمجھو کہ اس نے لاہور کو جیت لیا ۔

دوسرے کے خط

(مراسلے)

حضرت راغب مرادآبادی پاکستان کے نامور اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ فی البدیہہ اور برجستہ شعرگوئی میں انھیں ملکہ حاصل ہے!

—— [مدیر] ——

عرض کرتا ہے راغبِ ناچیز سیّدی مصطفےٰ کمال، سلام

نقش ہے، آپ کی محبت کا ورقِ دل پہ، مثلِ ماہِ تمام

آج ہی شام کو "شگوفہ" ملا یہ عنایت، یہ لطف، یہ اکرام

جلد اکیسویں، شمارہ چھٹا جون اٹھاسی، سرخوشی کا جام

حیدرآباد، آبروئے دکن ہے "شگوفہ" کا گلشنِ خوش نام

نظرِ اہلِ علم و دانش میں اس مجلّہ کا ہے بلند مقام

شکر ادا آپ کا کروں کیوں کر سیّد خوش مزاج و خوش ارقام

آپ پر مہرباں رہے دائم کردگارِ لیالی و ایّام

ترو تازہ رہے "شگوفہ" یونہی اے خوشا معتدل ہے اس کا قِوام

جلد اشاعت بھی اس کی ہو دہ چند اور اشاعت کو ہو نصیب دوام

یہ مجلّہ وہ ہے جسے بے شبہ پڑھ کے ہوتے ہیں خوش خواص و عوام

طالبِ خوندمیر صاحب کی نذر ہے گوہرِ سلام و پیام

آپ سے بھی دعا کا طالب ہے سرورِ کائنات کا یہ غلام

جملہ احباب کو سلام و نیاز اور اسی پر ہے خط کا بھی اختتام

طالبِ دعا

راغب مرادآبادی

کراچی ۳۱، جولائی ۱۹۸۸ء

(سلسلہ صفحہ ۵۶ پر)

آپ لوگوں کے پاکستان کے سفر کا حال سُن کر بڑی خوشی ہوئی مبارک ہو۔ بڑا کامیاب سفر رہا۔
رعنا نقوی واہی، پٹنہ

محترمی جناب ڈاکٹر مصطفٰے کمال صاحب
آپ کے خوبصورت خط کا جواب بہت دیر سے دے رہا ہوں آپ جب طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کی غرض سے کراچی آئے تو آپ کا لکھا ہوا خط مجھے ملا۔ بے اندازہ خوشی ہوئی۔ کہاں میں کہاں یہ مقام کا ڈ گوڈ!

پھر حضرت نیاز سواتی صاحب کا خط ملا تو اس سے تصدیق ہوگئی کہ آپ نے مجھے اور میرے پتے کو یاد رکھا۔ حالانکہ میں عدم کی زبان میں سوچ کر کہتا تھا سے

ہمارا پتہ اُن سے مت پوچھئے گا
کہ وہ ہم غریبوں کو کم جانتے ہیں

خواہش کے باوجود آپ سے نہ ملنے آسکا کہ گھر کے حالات ہی ایسے تھے اور پھر ڈاکٹر کی دوسری مصروفیات بھی ہوشربا ہوتی ہیں ہسپتال کی ڈیوٹی اور کلینک بھی (یہ ساری چیزیں کلینک کا ٹیک ہیں)
ڈاکٹر سلیمان عبداللہ، گوجرانوالہ

گزشتہ دنوں پاکستان گیا تو آپ کی کراچی میں آمد کا ذکر سُنا تھا اور کئی خبریں اور رپورٹیں وغیرہ نظر سے گزر رہی تھیں۔ اشتیاق تو بہت تھا آپ سے ملاقات کا مگر آپ کراچی میں تھے اور میں اسلام آباد میں۔ دیکھئے شاید کبھی حیدرآباد دکن آنا ہو تو آپ سے ملاقات بھی ہو جائے۔ استاد صدیقی کے ساتھ پروگرام تو بنا رہا ہوں ہو سکتا ہے اُن دنوں آؤں جب طنز و مزاح کانفرنس ہو۔
نسیم سحر، جدہ

محترم ڈاکٹر مصطفٰے کمال صاحب!
تسلیم و نیاز!
بھائی جان آپ نے میرے حال پر کرم کیا کہ کسی طرح مجتبیٰ نمبر کا دیدار کرایا۔ یہ نمبر ملتے ہی پڑھنے میں مشغول ہوگیا اور ایک ہفتے میں اسے مکمل کر ڈالا۔ حیرت ہے کہ آپ نے اتنا عمدہ صاف ستھرا، بیش قیمت نمبر کیسے نکالا۔ آپ کو مبارکباد اور شگوفہ کے تمام کارکنوں کو میرا تہ دل سے شکریہ پہنچا دیں۔
سعودی عرب جانے کے بعد بھی عابد معز صاحب نے شگوفہ کو فراموش نہیں کیا ہے۔ ان کا انشائیہ "اتفاق کہ زندہ ہیں؟" لا جواب ہے۔ تحریر دلکش اور رواں ہے۔ فیضی صاحب کا ریڈیائی ڈرامہ بھی پسند آیا۔ طالب خوندمیری کا ایک قطعہ بے حد پسند آیا۔ خود پڑھا، گھر والوں کو پڑھ پڑھ کر سُنایا اور جی بھر خوش ہوا۔ دولہا نکاح کے۔ کیا خوب انشائیہ ہے۔
خدا کرے آپ سب لوگ بہ خیر ہوں۔
دُور افتادہ آپ کا بھائی
انوار انصاری، رانچی

مصطفٰے کمال صاحب!
السلام علیکم!
بتاریخ ۸ر اگست ۸۸ء بہ وقت ۶ ساعت شام جب میں دفتر سے بس میں دھکے کھاتا ہوا تھکا ہارا ۵۰ سے زیادہ سیڑھیاں چڑھ کر آپ کے دفتر پہنچا تو آپ کو نادارد پایا۔ نیا شمارہ جولائی ۸۸ء لے کر پچھلے پاؤں پھر اتنی ہی سیڑھیاں اُتر کر واپس ہوا۔ گھر آکر کوفت مٹانے کے لیے جو "شگوفہ" کی ورق گردانی شروع کی تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ مال مصالحہ بھرا ہوا تھا کہ بس مزا آگیا۔ خصوصاً پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس کے بارے میں مواد پڑھ کر آپ کے نہ ملنے کا افسوس جاتا رہا۔ اس میں یوسف ناظم صاحب

کے رپورتاژ نے خصوصیت کے ساتھ مزہ دیا۔ ہمارے دکن میں ایک کہاوت ہے کہ املی کا درخت جتنا پرانا ہوتا ہے اس کی کھٹاس میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے وہی حال ہمارے یوسف ناظم صاحب کا ہے۔ خدا انھیں تا دیر ہمارے درمیان رکھے۔ جس موضوع کو چھوتے ہیں حق ادا کرتے ہیں۔ مجروح سلطانپوری کا وہ مصرعہ یاد آجاتا ہے ؂

میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

کانفرنس کے بارے میں شہزاد منظر کی رپورٹ بیحد معلوماتی رہی۔ مشفق خواجہ صاحب کا کالم بھی (جو وہ خامہ بگوش کے نام سے لکھتے ہیں) مزہ دے گیا۔ اس شمارہ کی کتابت طباعت بھی پچھلے شماروں کے مقابلہ میں اچھی ہے۔

میری کتاب "ذکر رفتگاں" کا اشتہار شائع کرنے کا شکریہ۔ لیکن یہ کیا ——؟ میری کتاب کی قیمت اتنی زیادہ تو نہیں ایک تو اردو کے قارئین پہلے ہی کوئی کتاب خریدنے سے بدکتے ہیں اور زیادہ قیمت درج کرکے آپ انھیں اور ڈرا رہے ہیں۔

رشید الدین، حیدرآباد

جون کے شمارہ میں   کی رباعی "اساس" اور پیمانۂ امروز خوب ہیں اور اس سے زیادہ خوب دلاور صاحب کی "اُمید سے ہے" برمن لکھنوی کی خوب کہا اچھا طنز ہے۔ لیکن ایک بیوی اسے برداشت نہیں کرسکتی۔ اس لیے طنز و مزاح کو ظرافت کی چاشنی سے سنوارنا چاہیے۔ سید ضمیر جعفری کے خیال سے بالکل متفق ہوں کہ "ادب محبوب کے رخساروں کی لوٹ لوٹ کر . . . . اس میں ظالم کی بھی کلائی مروڑنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ شمارہ جولائی ۸۸ ص ۴۳

آتش لکھنادی

جناب ایڈیٹر صاحب! ماہنامہ شگوفہ۔ حیدرآباد

آپ کے بزرگ ساتھی علی صاحب میاں کے انتقال کا پرسہ قبول کیجیے۔ دکن کے ایک مایہ ناز شاعر اور خوش مزاج علی بھائی سے ہم محروم ہوگئے۔ یہاں دبئی میں حیدرآبادیوں کی جانب سے ایک محفل منعقد کی گئی جس میں ختم قرآن اور فاتحہ خوانی کے ساتھ ساتھ علی صاحب میاں کی شخصیت پر روشنی ڈالی گئی۔

سید محمود حیدرآبادی، دبئی

برادرم۔ سلام مسنون۔

آپ پر اب دوسروں کا دورہ پڑ رہا ہے حالیہ دبئی کے دورے نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اب ہم خلیجی حضرات کو مزاح کا خزانہ دے رہے ہیں اور اس طرح حساب برابر ہوگیا ورنہ وہ کل تک فخر سے کہتے تھے کہ ہم ان کو دولت سے نواز رہے ہیں: اس پیٹرو مزاح (پیٹرو ڈالر کے وزن پر) کا ماخذ اور سرچشمہ آپ کی ذات ہے۔ جو مزاح کو ایک تحریک ایک صنف ایک متحرک اور زندہ روایت بنا کر فیض عام پہنچا رہے ہیں۔

رؤف خوشتر، بیدر

اداریہ

دکنی کے سینئر اور نامور شاعر علی صاحب میاں نے جن کی صحت پچھلے کئی مہینوں سے اچھی نہیں تھی ۲ر جولائی ۸ء کی اولین ساعتوں میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نماز جنازہ مسجد ملاکنٹہ معظم جاہی مارکٹ میں پڑھائی گئی۔ اور فین تعلقہ بودھن کے قریب ان کے آبائی قصبہ میں عمل میں آئی۔

علی صاحب میاں کے انتقال سے دکنی میں شعر گوئی کا ایک باب ختم ہوا آزادی سے قبل نذیر دہقانی، اعجاز حسین اور علی صاحب میاں نے دکنی بولی کو پھر ایک بار شعری اظہار کا ذریعہ بنایا۔ دکنی کے وسیلہ سے طنز و مزاح شاعری کو فروغ ہوا۔ علی صاحب میاں کی شاعری میں دکنی محاورہ کے صحیح نمونے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "گھوکرو کے کانٹے" زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔ ادھر عرصہ سے علی صاحب شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ احباب کے اصرار پر وہ مشاعروں میں شریک ہو جایا کرتے تھے۔ اور اپنا منتخب کلام سنایا کرتے تھے۔ جسے سامعین بڑے شوق سے سنتے تھے۔ علی صاحب لطیفہ سنج اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ساری زندگی مجرد رہے۔ زندہ دلان حیدرآباد اور شگوفہ سے انھیں خاص تعلق تھا۔

ملک کے نامور نقاد عمیق حنفی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر نظام الدین مغربی بھی پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔ عمیق حنفی نے اپنی چونکا دینے والی عالمانہ تحریروں کے ذریعہ اردو کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اور مغربی صاحب نے اسلامی تاریخ پر ایسا عبور حاصل کیا تھا جس کی آج کے دور میں نظیر نہیں ملتی۔

ادارہ شگوفہ مرحومین کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو اپنی رحمت سے نوازے!

فکر میموریل سوسائٹی ــــــ ڈی۔ ۵ گل مہر پارک نئی دہلی ۴۹

فکر تونسوی کی پہلی برسی کے موقع پر فکر میموریل سوسائٹی اردو زبان میں طنزیہ، مزاحیہ مضامین کا ایک مقابلہ منعقد کر رہی ہے جس میں صرف ۱۴ سے ۱۸ سال کے بچے حصہ لے سکتے ہیں۔ مضمون ۱۰۰۰ الفاظ سے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیئے۔

عنوانات :-

۱. پیسہ، پیسہ، پیسہ
۲. میں ادیب بنا
۳. بہار سے بھی مہربان کیسے کیسے

مضامین سیکریٹری، فکر میموریل سوسائٹی۔ ڈی۔ ۵ گل مہر پارک، نئی دہلی ۴۹ کو ۱۵ر اگست ۱۹۸۸ء تک پہنچ جانا چاہئیں۔

اوّل، دوم اور سوم آنے والے مضامین کو انعام دیئے جائیں گے۔ تقسیم انعامات کیلئے ۱۱ر ستمبر ۱۹۸۸ء کو دلی میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے گا [illegible]

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ اشاعت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

منیجر اعزازی (بمبئی): فیاض [illegible]

کتابت: محمد سلیم۔ محمد عبدالرؤف
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

قیمت فی پرچہ: ۳ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ: ۴۰ روپے بیرونی ممالک سے: [illegible]

خط و کتابت کا پتہ:
۲۱- [illegible] معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد فون آفس: 557716 مکان 521864

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

بجلی کی بچت

بجلی کی پیداوار میں معاون ہے

■ ٹیوب لائٹ کا استعمال کریں
یہ کم بجلی صرف کرتی اور زیادہ روشنی دیتی ہے۔

□ آئی ایس آئی مارک والے بجلی کے ساز و سامان کا استعمال کریں۔

□ ٹیوب اور بلب کو دھول سے دور رکھیں۔

□ استعمال کے فوراً بعد ریفریجریٹر کا دروازہ بند کر دیجیے۔

■ جب ضرورت نہ ہو بجلی مصنوعات کے تمام سوئچ بند کر دیں۔

■ جب آپ گھر سے باہر جائیں روشنی، پنکھے اور ایئر کنڈیشنر کے سوئچ بند کر دیں۔

جاری کردہ:
محکمۂ بجلی
وزارت توانائی، بھارت سرکار
نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱

davp 88/208

ابراہیم یوسف (بھوپال)

بیماریاں اور عزیز محترم

دو چار دن سے عزیز محترم بے حد پریشان تھے صورت پر کچھ ایسی وحشت طاری تھی جیسے انھیں دنیا کی تباہی اور مستقبل قریب میں قیامت بپا ہونے کا پختہ یقین ہو کبھی آہیں بھرتے اور کبھی آسمان کو یوں تاکتے جیسے قیامت کو ٹالنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے فریاد کر رہے ہوں۔ عزیز محترم سال چھ مہینے میں اس کیفیت سے دو چار ہو جایا کرتے ہیں جس سے ہم بخوبی واقف ہیں ایک دو دن تو ہم ان کی اس کیفیت کو نظر انداز کرتے رہے مگر جب یقین ہو گیا کہ اگر اب ہم اور خاموش رہے تو وہ بے مروتی کا سنگین الزام لگا کر ہمیں قطع تعلقات کا نوٹس دے دیں گے تو ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"نصیب دشمناں۔ کچھ روز سے آپ صحت مند نظر آ رہے ہیں۔"

کچھ دیر تو وہ یوں کھوئی اور اداس نظروں سے ہمیں دیکھتے رہے جیسے ہم نے قیامت کے ٹل جانے کی منحوس خبر سنا دی ہو پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"آپ کی بلا سے۔ جانے کیوں آپ کو ہماری بیماری سے بیر ہے۔"

پھر خاموش ہو کر آسمان کو تاکنے لگے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے اپنی صحت مندی پر فلک ناہنجار کو کوس رہے ہوں۔ ہماری نصف اول نے بعد میں ہمیں بتلایا کہ انھوں نے عزیز محترم کی آنکھوں میں آنسو بھی چھلکتے دیکھے تھے۔

عزیز محترم کو بیماریوں سے عشق اور صحت سے اللہ واسطے کا بیر ہے اور وہ شہر کے ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کی چلتی پھرتی ڈائرکٹری ہیں کہ فلاں ڈاکٹر صبح کس وقت بیدار ہوتا ہے کتنی دیر بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا اور سگریٹ پیتا رہتا ہے کس وقت بستر چھوڑتا ہے ضروریات سے فارغ ہونے میں کتنا وقت صرف کرتا ہے اور ناشتے میں کتنا وقت لگاتا ہے اور کب ڈسپنسری میں آجاتا ہے نہانے کے لیے کون سا صابن استعمال کرتا ہے۔ فلاں حکیم ناشتے میں صرف دلیا لیتا ہے اور فلاں انڈا اور فلاں وید کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔ اس کے علاوہ عزیز محترم ہر ڈاکٹر اور حکیم کی عادات و اطوار سے بھی بخوبی واقف ہیں ابھی پرسوں کی بات ہے ہم سے کہنے لگے "آج ڈاکٹر گپتا کے پاس گیا تھا کم بخت نے معائنہ کیے بغیر ہی نسخہ لکھ دیا

معائنہ بھی نہیں ملا!" ہم نے حیرت سے کہا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"
معائنہ کرتے وقت وہ اپنی ناک نہیں کھجا رہا تھا؟"
نہیں کھجا رہا تھا۔" ہم نے اس اہم نکتہ میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "بھلا ناک کھجانے اور معائنہ کرنے میں کیا علاقہ ہے؟"
ایک نفسیاتی نکتہ ہے۔" عزیز محترم نے اس طرح فرمایا جیسے وہ بیماری ناواقف پر احسان کر رہے ہوں پھر انتہائی مربیانہ
میں لے۔ بھئی جب وہ معائنہ میں دلچسپی لیتا ہے تو ناک کھجایا جاتا ہے۔" یہ سن کر ہم ان کے مشاہدہ
کے قائل ہوگئے۔
عزیز محترم نئی نئی بیماریاں ایجاد کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک روز ہمیں [illegible] پہلے گئے ہیں
ہوگیا کہ ضرور کسی ڈاکٹر یا حکیم کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے ہیں۔ [illegible] کے بعد فرمانے لگے۔
مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ ذرا ایک دانت ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔"
نئی بیماری کی دریافت سے چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ تجسس کی خاطر ہم ساتھ ہو لئے۔ اسپتال پہنچ کر دیکھا کہ دانتوں
ڈاکٹر کے کیبن پر ایک لمبا کیو لگا ہوا ہے۔ اس قدر لمبا کیو دیکھ کر ہم گھبرائے کہ عزیز محترم کا نمبر آتے آتے کم از کم چار گھنٹے کے
جائے گا لیکن وہ بڑے اطمینان سے کیو میں کھڑے ہوگئے۔ مریضوں کی پھرتی دیکھ کر [illegible] رہے تھے۔
ہرہ پر بڑی طمانیت اور شگفتگی تھی۔ اس خوشی کے اسباب کے بارے میں استفسار کرنا فضول [illegible] کیونکہ بعضوں کو
دیکھ کر عزیز محترم کا خوشی ضبط کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ حیرت ضرور تھی کہ ہر مریض کے چہرے سے بے پناہ تکلیف
کا اظہار ہو رہا تھا مگر عزیز محترم کے چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار نہیں تھے۔ خدا خدا کر کے ساڑھے تین گھنٹے کے
عزیز محترم کا نمبر لیا وہ انتہائی وقار کے ساتھ ڈاکٹر کے کیبن میں داخل ہوئے۔ پیچھے پیچھے ہم بھی تھے۔ پہلے تو ڈاکٹر نے
کے چہرے کی شگفتگی کو غور سے دیکھا پھر کرسی پر بٹھلا کر پوچھا
فرمایئے۔ کیا تکلیف ہے؟"
فرمایا۔ "ڈاکٹر صاحب! دائیں جانب کے نچلے جبڑے کی داڑھوں کے پاس کا دانت غذا چبانے میں داڑھوں کے ساتھ
تعاون نہیں کر رہا ہے۔"
اس عجیب و غریب بیماری کو سن کر ڈاکٹر کے اوسان خطا ہوگئے اور اس کا سارا علم دھرے کا دھرا رہ گیا لیکن اس
کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی چہرہ پر سنجیدگی پیدا کر کے بولا۔
پچھلی داڑھوں نے کھائی ہے یا آنتوں نے؟"
آپ نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میرے احساس نے۔" ڈاکٹر فوراً سمجھ گیا کہ اس کا واسطہ کس قسم کے مریض
سے پڑا ہے۔ ڈاکٹر نوجوان تھا اور فطرتاً کچھ مسخرہ بھی تھا سنجیدگی سے بولا۔
احساس سب سے بڑی بیماری ہے۔ اچھا منہ کھولئے۔" عزیز محترم نے منہ کھولا۔ "تھوڑا اور کھولئے۔ تھوڑا اور
کھولنے کی کوشش کیجیے۔ بس تھوڑا اور۔" اب گنجائش ختم ہو چکی تھی۔ "تھوڑا اور کھولنے کی کوشش کیجیے۔" اب عزیز محترم
پسینہ پسینہ ہو چکے تھے۔ فرمانے لگے "ڈاکٹر صاحب! آپ دانت کا معائنہ کر رہے ہیں یا حلق سے جھانک کر پیٹ
کا جائزہ لے رہے ہیں؟"
بہرحال ڈاکٹر نے اتمام حجت کے لیے دانت کو ہلایا ڈلایا کچھ ٹھوک بجا کر دیکھا اور بولا۔ "دانت تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ

میں بول پڑے۔

"خاک بھی ٹھیک ٹھاک نہیں ہے اگر ٹھیک ٹھاک ہوتا تو داڑھوں کے ساتھ تعاون نہ کرتا؟" حضرت شرارتاً نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا اور پرچے پر کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا "کھانے سے پہلے اس سے کلیاں کرلیا کیجیے۔"

"اور کوئی پرہیز وغیرہ؟" عزیز محترم نے سوال کیا۔

"جی ہاں تمام غذا کھائیے کہ اس دانت کو شرارت کا موقع ہی نہ ملے۔" ڈاکٹر نے کہا

پرہیز کے سلسلے میں عزیز محترم کا ایک واقعہ یاد آگیا آپ بھی سن لیجیے۔ ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے غصہ میں آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا "خیریت تو ہے دشمنوں کے مزاج کچھ برہم معلوم ہو رہے ہیں؟" "برہم ہونے کی بات ہی ہے" غصہ اور بے زاری سے فرمایا۔ "حکیم فخر عالم کے یہاں سے آرہا ہوں۔ حضرت کی حرکت ملاحظہ ہو۔ قارورہ میرا دیکھ رہے تھے اور باتیں ایک عورت سے کرکے جا رہے تھے۔ گویا عورت نہیں کوئی محبوبہ ہو۔"

"جی ہاں یہ تو سراسر زیادتی ہے" ہم نے کہا۔ "آپ سے بڑھ کر اسے نہیں سمجھنا چاہیے تھا؟" "پہلے تو ہمیں غور سے دیکھا پھر ہماری بات کو نظرانداز کرکے فرمایا "کچھ نہیں بلکہ نبض دیکھ رہے تھے تو داڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے جب کہ انھیں تین مرتبہ آنکھیں جھپکانا چاہیے تھا کہ یہی ان کا طریقہ ہے۔ بعد میں میں نے پرہیز کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا اب کچھ کھلیے خوب کھائیے۔ اب آپ ہی غور کیجیے اگر کوئی الٹی سیدھی غذا پیٹ میں چلی گئی تو مرض کے بڑھنے کا امکان ہے یا نہیں۔ موت برحق ہے مگر میں کھا کر مرنا نہیں چاہتا۔ بھوکے پیٹ مرنے کو پسند کروں گا۔ مرنے کے بعد کم از کم یہ اطمینان تو رہے گا کہ بدپرہیزی سے نہیں مرا۔"

ہم نے ڈرتے ڈرتے مرض کی نوعیت دریافت کی تو فرمانے لگے۔

"کیا بتاؤں عجیب کیفیت ہے جب رفع حاجت کے لیے جاتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ سانس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی ہے"

ہم نے عرض کیا "یہ تو ایسی کوئی تشویش کی بات نہیں جس کے لیے—"

ہمارا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی بول پڑے "آپ کے لیے نہ ہوگی۔ برادرم سانس ہی زندگی کی علامت ہے۔" پھر اس طرح منہ پھلا کر بیٹھ گئے جیسے حکیم فخر عالم کے ساتھ ہم بھی کسی سازش میں شریک ہوں۔ ہماری نصف اول کا خیال ہے کہ عزیز محترم کے جسم کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرایا جائے تو ان میں غذا کے مقابلہ میں دواؤں کا تناسب زیادہ ہوگا۔ وہ اس دعوے پر بڑی سے بڑی شرط لگانے کو تیار ہیں۔

عزیز محترم بیماریوں کو خدا کا ایک بیش قیمت عطیہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بیماریوں سے اخلاقی، روحانی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور قومی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر وہ ہمیں گھنٹوں لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بیماری سے انسان کا اخلاق بلند ہوتا ہے آج کا انسان جو اخلاقی اعتبار سے پستی کے عمیق غار میں گرتا چلا جا رہا ہے تمام رشتے بکھر چکے ہیں انسان کا پل پل مصروفیت میں گزرتا ہے کسی کی بیماری کا علم ہونے پر محض اخلاق کا مظاہرہ کرنے کے لیے مصروف زندگی میں سے کچھ پل نکال کر عیادت کو جاتا ہے اس طرح بکھرے ہوئے رشتے کسی حد تک استوار ہوتے ہیں اور عیادت کے وقت خیال رکھتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہے ورنہ آج کے دور میں ایسی ویسی باتیں کرنے کا رواج عام ہے۔ آج جب کہ انسان تنہائی کا شکار ہوتے ہیں عیادت کرنے والوں کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ بیماری کے دوران گھر میں [illegible] کی

اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ان کی ناز برداریاں ہونے لگتی ہیں خواہ آدمی دل سے یا دل نخواستہ ہی کیوں نہ ہو۔ انسان رقیق القلب ہو جاتا ہے اور دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ عزیز محترم کا دعویٰ ہے کہ آج جبکہ انسان خدا کو بھولتا جا رہا ہے اور خدا سے بیزاری عام ہے صرف بیماریاں ہی خدا کے وجود کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑا خدا بیزار تکلیف کی شدت میں خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔ خدا کو اور کیا چاہیئے بس یہی کہ اس کا نام لیا جاتا رہے خواہ مجبوری میں ہی سہی۔ اور بیماری میں خدا بھی آپ پر مہربان ہو جاتا ہے، اور اگر آپ میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے تو آپ بیٹھ کر بلکہ لیٹ کے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ صرف فرض پڑھ لیجیے، سنتیں اور نوافل چھوٹ جائیں تو کوئی باز پرس نہیں اگر وضو نہیں کر سکتے تو تیمم سے کام چلا لیجیے نماز قبول ہو جائے گی۔ بھلا یہ رعایتیں صحت مند انسان کو مل سکتی ہیں۔ عزیز محترم کے ان دلائل سے کون کافر ہوگا جو انکار کرے اور بیماریوں کی افادیت پر ایمان نہ لائے۔

عزیز محترم بیماریوں کو قومی یکجہتی کے لیے بے حد ضروری قرار دیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ آج جب کہ ہم بات بات میں ہندو مسلمان کی رٹ لگاتے رہتے ہیں بیماریاں ان کو پاس لانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں علاج کرتے وقت ڈاکٹر نہ تو ہندو دیکھتا ہے نہ مسلمان بس انسان دیکھتا ہے اسی طرح مریض بھی علاج کے لیے ہندو مسلمان ڈاکٹر میں فرق نہیں کرتا اگر تمام فرقہ پرست لیڈر بیمار رہنے لگیں تو قومی یکجہتی کے لیے فضا سازگار ہو سکتی ہے۔

عزیز محترم بیماریوں کو ملکی معیشت کے استحکام کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ اگر بیماریاں نہ ہوں تو ملک کی معیشت لڑکھڑا کر رہ جائے گی ڈاکٹر جو ہزاروں روپے تنخواہ پاتے ہیں اور ہزاروں روپے کی گھر پر پریکٹس کرتے ہیں بیماریاں نہ ہونے سے دانے دانے کو محتاج ہو جائیں گے پھر اسپتالوں کا عملہ ہے دوا فروش ہیں یہ سب بیکار ہو کر حکومت کے لیے مسئلہ بن جائیں گے۔ بیروزگاری پہلے ہی سے اس ملک کا مقدر ہے۔ پھر اصلی اور نقلی دوائیں اور آلات بنانے کے کارخانے ہیں جن میں اربوں روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے ڈیڈ ہو کر رہ جائے گا اور وی آئی پی لوگوں کے بھائی بھتیجے جو ان کارخانوں میں محض خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے ہیں کس مد میں کھپائے جائیں گے اور ان بیچارے اسمگلروں پر کیا بیتے گی جو خدمت خلق کے جذبے سے دواؤں کی اسمگلنگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر کرتے رہتے ہیں۔ عزیز محترم کے یہ دلائل کچھ اس قدر ٹھوس اور ناقابل تردید ہوتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم ان سے بیمار رہنے کے وہ چار گر سیکھ لیں اور ملکی معیشت کے استحکام میں توفیق بھر ہاتھ بٹائیں۔

سال میں مشکل سے نو دس ایسے منحوس دن عزیز محترم کی زندگی میں آتے ہیں جب وہ خود کو بیمار محسوس نہیں کرتے ان دنوں کا وہ باقاعدہ ریکارڈ رکھتے ہیں ایک روز ازراہ دوست نوازی وہ ریکارڈ ہمیں بتلایا۔ باون سالہ زندگی کی ایک سو سترہ دن کا تاریخوار ریکارڈ موجود تھا ان ایک سو سترہ دنوں کو وہ اپنی زندگی میں شامل نہیں کرتے۔ آج کل بھی وہ صحت مندی کے دور سے گزر رہے ہیں اور جب ہم نے ان سے اس کے بارے میں سوال کیا تھا تو پہلے تو وہ برہم ہو گئے تھے کچھ دیر خاموشی سے دیوار کو تکتے رہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "مجھے اپنی صحت مندی کی اتنی فکر نہیں جتنی اس سائیکل رکشا والے کی ہے۔"

"سائیکل رکشا والے کی!" ہم نے حیرت سے کہا "کون سا سائیکل رکشا والا۔ اس پر کون سی افتاد پڑی"

"ہماری صحت مندی کی افتاد۔" غمگین لہجے میں کہا "بیچارہ چار دن سے روز صبح صبح آکر پوچھتا ہے

میاں آج حکیم صاحب کے یہاں چلنا ہے یا ڈاکٹر صاحب کے یہاں۔ اب میاں کچھ بیمار ہوں تو ڈاکٹر یا حکیم کے یہاں جائیں۔ بچارے انکار کرنے پر اس کے چہرے پر ایسی مایوسی چھا جاتی ہے کہ ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ بخدا دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ ہاں بچے والا آدمی ہے ہماری بیماری سے اس کی دال روٹی چل جاتی ہے ان چار دنوں میں بیچارے پر جانے کیا گزر رہی ہوگی۔

اس وقت ان کے چہرے سے سخت تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا اسی وقت ہماری نصف اول نے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلک دیکھی تھی ہم حیرت سے انھیں دیکھنے لگے اور وہ آنکھیں بند کر کے یوں بے حس و حرکت بیٹھ گئے جیسے مراقبہ میں چلے گئے ہوں!!!

▲▲!

شاعر کا ضخیم اقبال نمبر

سرپٹ حیدرآبادی

غزلیں

پارسائی کا کسی کی بھی، بھروسا کتنا
شیخ صاحب کی یہ تسبیح و مصلیٰ کتنا

خام کتنا ہے عقیدہ کوئی، پختہ کتنا
دیکھو کس کر، کوئی جھوٹا ہے تو سچا کتنا

اُسی انداز سے، رفتار پہ رکھو قابو
راستہ دیکھو، ہے اونچا کوئی نیچا کتنا

ہم سے پوچھو، ہمیں ہے تجربہ، ہم جانتے ہیں
ہجر میں میٹھا بھی بن جاتا ہے کڑوا کتنا

کبھی حد میں نہ رہے پاؤں میرے جب پھیلے
شال کتنی ہے میری اور دوشالا کتنا

تہہ نشینی سے مفر کی کوئی صورت نہ ہوئی
میں نے خود اپنے کو موجود پہ آنکا کتنا

سانس تک آتی و جاتی ہے بڑی مشکل سے
دل میں ارمانوں کا گھُس آیا ہے گھیرا کتنا

اپنے عشاق کو وہ جانچ رہے ہیں سرِ بزم
کس کا دل کتنا ہے اور کس کا ہے گردا کتنا

اِس طرف مجنوں تو لیلیٰ کا تھا پختہ عاشق
اُس طرف چاہتی تھی مجنوں کو لیلا کتنا

وعدوں پہ وعدے حسینوں کا مسلسل ہے فریب
دھوکوں پر دھوکوں کا ہے سلسلہ لمبا کتنا

عمر سسرال میں ہوتی ہے بسر دلہن کی
رخصتی ہونے پہ رہ جاتا ہے میکا کتنا

ساٹھ پورے نہ دقیقے ہوں تو ناقص ہے منٹ
ساٹھ پورے نہ منٹ ہوں تو وہ گھنٹا کتنا

واہ واہ کرتے ہیں ناحق میرے اشعار پہ لوگ
شاعری کیا میری چوں چوں کا مربا کتنا

فیصلہ اس کا نہ ہوگا، نہ ہوا ہے سرپٹ
غیر کا کتنا ہے، کتنا میرا، تیرا کتنا

گھپ اندھیرے میں کلام اپنا سنا کر کسی دن
دیکھو سرپٹ کہ اُبھرتا ہے اُجالا کتنا

○

نیاز سواتی (پاکستان)

تم غلط سمجھے ہو چپراسی اُسے گھر لے گیا
وہ جو تھا دفتر کا ہیٹر اُس کو افسر لے گیا

جو مسافر آکے ٹھہرا تھا مرے گھر رات کو
صبحدم وہ ساتھ اپنے میرا بستر لے گیا

میرے سینے میں نہ اُس کو ڈھونڈ لے اسپیشلسٹ!
"دل کہاں ہے پاس میرے دل تو دلبر لے گیا"

تیس پیسوں کی فقط نسوار لانے کے لیے
باس پندرہ میل تک دفتر کی موٹر لے گیا

ڈاکوؤ! کیا ڈھونڈتے ہو میرے گھر کچھ بھی نہیں
گھر میں تھا موجود جو کچھ انکم ٹیکس لے گیا

جس نے مکھن کم لگایا باس کو وہ رہ گیا
وہ ترقی پا گیا جو اک کنستر لے گیا

خاک وہ محفوظ ہوگا سیرِ یورپ سے نیاز!
ساتھ اپنی اہلیہ کو بھی جو شوہر لے گیا

جہاں قدر چغتائی صاحب

ریل کا سفر

ہم سے کہا گیا کہ اسکول میگزین کے لیے ایک مضمون لکھ دیں۔ ہم نے وعدہ تو کرلیا مگر کچھ یہ نہیں آیا کہ مضمون لکھیں تو کس موضوع پر۔ مگر جلد ہی ہمیں ریل گاڑی کا خیال آیا اور یاد آگیا۔ ریل کا سفر۔ ہمارے ملک میں بعض چیزیں پشتوں چلیں تو ابھی بھی باقی ہیں۔ مثلاً حکیم اجمل خاں کے خاندان کا حکیم آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ اتفاق سے کوئی خاندانی وزیراعظم ہو تو کیا کہنے۔ مگر جمہوری دور میں یہ قسم نایاب ہے اگر کہیں ہو تو ملک کا بیڑا پار سمجھنا چاہیے۔ ہمارے دیش میں ابھی باورچیوں کی نسل کے لوگ موجود ہیں جو مغلیہ دور حکومت میں اکبر بادشاہ کو کھانا پکا کر کھلایا کرتے تھے اور تو اور شاہی امام تک موجود ہیں۔ یہ بات الگ رہی کہ امامت اور بادشاہت کے درمیان کوئی تعلق ہے — یہ بات ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ریل کے سفر پر مضمون لکھنے کے معاملے میں ہم باورچی یا شاہی امام سے کم نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے لڑکپن (۱۹۴۸) میں ریل کے سفر پر مضمون لکھا تھا۔ ہمارے والد لڑکپن میں ریل کے سفر پر مضمون لکھ چکے تھے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہم باپ اور بیٹے دونوں نے ریل کا سفر نہیں کیا تھا۔ بس تو ریل کا سفر ایسا موضوع ہے جس پر پچھلے سو سال سے اسکول کے بچے صرف امتحان کے کمرے میں لکھتے چلے آرہے ہیں۔

ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ ریلوے نظام کے اعتبار سے ہندوستان دوسرے نمبر پر ہے۔ مگر آج بھی ریل کے راستوں پر لاکھوں بچے ریل گاڑیوں کو گزرتے دیکھتے ہیں ان کے ماں باپ جب بچے تھے وہ بھی گاڑیاں گزرتی دیکھا کرتے تھے فرق اتنا ہے جب گاڑی میں سات ڈبے ہوتے تھے اب گاڑیاں دس ڈبوں سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ یہ نسلیں صرف ریل گاڑیاں دیکھنے والی ہیں۔ ریل کا سفر کرنے کا اتفاق ان کی زندگی میں پیش آنے والا واقعہ ہے ہی نہیں۔ یہ لوگ مگر یہ بات جانتے ہیں کہ گاڑیاں پہلے دھوئیں سے چلتی تھیں اب ہوا سے چلتی ہیں۔ ریل گاڑی ہمارے ملک میں آمد و رفت کا سب سے سستا ذریعہ ہے دوسری جادو کی بات یہ ہے کہ کرایہ چاہے کتنا ہی بڑھا دیا جائے ریل کا سفر سستا ہی لگے گا۔ ہمیں تو ریل کے سفر کا بڑا ہی شوق مگر شوق پورا بہت ہی کم ہوا۔ بات یہ ہو جاتی ہے کہ ایک کوڑی میں اونٹ مل سکتا ہے مگر ایک کوڑی پاس نہ ہو تو اونٹ نہیں خریدا جا سکتا۔ ہم غلامی کے زمانے والے ہیں جب انگریز ریل گاڑی منافع کمانے کے لیے چلایا کرتے تھے آزادی کے بعد سے ریل گاڑیاں عوام کے فائدے کے لیے چلائی گئی ہیں۔ عوام کو راحت دینے کے لیے سرکار کو چاہیے

کہ ریل سے ٹکٹ دینے کے لیے غلہ کی طرح کنٹرول کی دُکانیں بھی کھولے۔ ورنہ غریب عوام کبھی ریل کا سفر کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔ ہمارے ملک کا بجٹ غریبوں کو سامنے رکھ کر بنایا جاتا ہے مگر فائدہ وہ اٹھاتے ہیں جو غریب نہیں ہوتے۔ ریلوے کے ٹکٹ کنٹرول کی دُکان سے یوں بھی نہیں فروخت ہو سکتے کہ وہ سڑے غلّہ کی طرح فروخت نہیں کیے جا سکتے۔ ہمیں ریل گاڑی میں بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ ندیاں، پہاڑ، کھیت اور درخت یادوں کی طرح پیچھے چھوٹتے ہوئے۔ ہم گاڑی کے ڈبّے میں ترقی کی منزل کی طرف دوڑتے ہوئے۔ ریل کے ڈبّے کے اندر اصلی قومی یکتا کا منظر ہوتا ہے۔ ہم تیسرے درجہ کے ڈبّے کی بات کرتے ہیں جہاں تھرڈ کلاس کا نام سیکنڈ کلاس کر دینے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ماں باپ اپنے کالے کلوٹے بیٹے کا نام چندا رکھ دیں۔

گاڑی میں تیسرے درجہ کے عوام سفر کرتے ہیں۔ ورنہ سُنا ہے اسی گاڑی میں ایسے ڈبے بھی ہوتے ہیں جن میں گرمی میں بیٹھو تو سردی لگنے لگے۔ جاڑے میں سفر کرو تو پسینہ بہنے لگے۔ انجن ایک۔ سارے ڈبّے باہر سے ایک مگر اندر سے سب الگ الگ یہی حال ہمارے دیش کا ہے مرکز ایک مگر صوبے الگ الگ۔ دیکھنے میں پوری ریل گاڑی سی ایک۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں یہ دو پایہ جانور بھی باہر سے ایک۔ اندر سے الگ الگ۔ ریل کے سفر میں ٹکٹ بکتے ہیں کھڑکی پر ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں ہوتی ہیں بچوں کی لمبی ریل گاڑی کی طرح۔ بیٹھو تو راستہ میں ٹکٹ چیک ہوتے ہیں۔ جیب بھرائی کی رسمیں ادا ہوتی ہیں۔ پکڑ دھکڑ مار پیٹ عشق و محبت۔ ریل کے سفر میں یہ سب ہوتا ہے۔ اس لیے ریل کا سفر ضرور کرنا چاہیے ٹکٹ نہ ہو تو بغیر ٹکٹ کرنا چاہیے مگر کرنا چاہیے۔ ایسے جیسے ہم کر چکے ہیں ہماری طرح ہزاروں لوگ روزانہ کرتے ہیں۔ ریلیں قوم کی جائداد ہیں اور عوام اس جائداد کے مالک۔ ریل کے سفر پر مضمون بغیر سفر کیے نہیں لکھا جا سکتا مگر ہمارے اسکولوں میں ریل کے سفر پر مضمون ہر زبان میں برابر لکھے جا رہے ہیں۔
امتحان کے پرچہ میں ریل کا سفر یا تاج محل، آگرہ پر مضمون کا سوال آج ہی نہیں ہمارے لڑکپن سے امتحان کے پرچوں میں آتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم نے ریل کا سفر اور تاج محل کو اس طرح ملا کر یاد کر رکھا تھا۔ جیسے میاں بیوی دونوں ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ دیکھیے تاج محل کی سیر کے لیے ریل کا سفر تو ہوتا ہی ہے۔ ریل کے سفر میں آگرے تو جا ہی سکتے ہیں اور آگرے میں قدرتی طور پر تاج محل ہوتا ہی ہے۔ ابھی دو سال پہلے ہم کو اتفاق ہوا ہائیر سیکنڈری بورڈ کی اردو کی کاپیاں جانچنے کا دوسرا اتفاق یہ کہ امتحان کے پرچے میں وہی ریل کا سفر تھا۔ نصف صدی کے بعد پھر ریل کا سفر ہمارے پیش نظر تھا۔ جی خوش ہو گیا۔ سوچا نئی ۲۱ ویں صدی میں داخل ہونے والی نسل نے بڑے گُل کھلائے ہوں گے۔ ریل کے سفر کا شوق تو دل میں رہتا ہی ہے۔ سفر نہ سہی ریل کے سفر کی کاپیاں دیکھ کر ہی ہمارے آنسو پُنچھ جاتیں گے مگر ہم نے دیکھا کہ ہر کاپی میں ہر طالب علم ریل کے سفر سے لطف اندوز ہو کر آگرے جا رہا ہے۔ ہر گاڑی راستے میں ایک ہی نام کے اسٹیشن پر رکی جب کہ وہ پسنجر گاڑی تھی۔ ہر ایک لڑکے نے پلیٹ فارم پر اُتر کر پوری کھائی جو باسی اور خراب تھی۔ ہر ایک اپنے دوست پرکاش سے ملنے آگرے جا رہا تھا۔ جو تاج محل میں رہتا ہے۔ ہم کو اس تھوک کے حساب کے گھٹے ریل کے سفر کے مضامین دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ہم سیکنڈری بورڈ کے افسر کے پاس گئے اور ریل کے سفر کا حال کہہ سنایا۔ مگر حیرت کا پہاڑ ہمارے سر پر ٹوٹ پڑا جب ہم نے اس ذمہ دار افسر کا جواب سُنا۔ وہ بولا۔ آپ پہلی بار امتحان کی کاپی جانچنے گئے ہیں شاید۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ سب لڑکے ایک ہی ریل گاڑی کے ایک ہی ڈبّے میں بیٹھ کر

آ گر نے گئے ہوں کیا اب اگر سے نہیں جا سکتے۔ گروپ میں سفر کرنے پر طلباء کو ٹکٹ میں خاص رعایت ہوتی ہے آپ جا یئے۔ اور کاپیاں جانچ کر نمبر دیجیے۔ تھوڑے سے عرصہ بعد آپ تجربہ کار ممتحن بن جائیں گے بورڈ میں تجربہ کار ممتحن کی کمی نہیں۔ ایک میڈیم والا ہر میڈیم کی کاپیاں جانچ کر چیک دیتا ہے"۔ ہم افسر کی باتیں سن کر خاموش ہو رہے۔ اور ہم نے بھی کاپیاں جانچ کر ایک سے تجربہ سے فرصت پائی ہم سوچنے لگے زمانہ بدل گیا ہے۔ اسکول اور کالج دراصل ایسے کلب ہیں جہاں تعلیمی باتیں ہوتی ہیں استاد کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایسے 'ریڈی میڈ' جوابات کی کتابیں بازار میں سستے داموں مل جاتی ہیں جو گھر اور امتحان کے کمروں میں مددگار ہوتی ہیں۔ اور جن کی اہمیت استاد سے زیادہ ہے لہذ یہ درست بھی ہے جب ریڈی میڈ کپڑے ہر قسم کے بازار میں ملتے ہوں تو درزی کی دکان کے چکر لگائے جائیں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو ہو رہا ہے وقت کا تقاضہ ہے۔ فوٹو کاپی کا زمانہ ہے۔ ہمارے لڑکپن میں ریل گاڑی کا سفر۔ دہلی سے بمبئی تک ایک ہفتہ میں ہوتا تھا۔ جب ہم تین گھنٹے بیٹھ کر پرچہ حل کیا کرتے تھے۔ ان تیز رفتار سپر فاسٹ ریل گاڑیوں کے ہوتے ہوئے تین گھنٹے کے پرچے طلباء کے لیے دنیا زیادتی اور ناانصافی ہے۔ ہمارے ملک کے بجٹ میں سو میں سے صرف دو روپے ہی تو تعلیم پر صرف کئے جاتے ہیں ان دو روپیوں میں کس قسم کے تعلیم یافتہ لوگ پیدا ہو سکتے ہیں یہ سوچنے کی بات ہے۔ ریل کے سفر پر مضمون اس وقت تک لکھے جاتے رہیں گے جب تک ہمارے ملک میں ریل گاڑی کی آخری پٹری باقی رہے گی۔ اس لیے ریل کے سفر پر مضمون لکھتے وقت گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امتحان میں اس مضمون پر نمبر دینے کا تجربہ بھی کاپیاں جانچنے والوں کے لیے بہت پرانا ہے۔ اگر خط خراب ہو اور جگہ جگہ امتحان کی کاپی پر دھواں دھواں سا اُٹھتا بھی نظر آجائے تو سمجھا جائے گا کہ یہ ریل کے سفر پر لکھا ہوا مضمون ہی ہے۔ ریل کے سفر کی خوبی یہ ہے کہ جہاں چاہو ختم کر دو ہم نے اپنے پہلے ریل کے سفر پر اپنا مضمون تاج محل کی سیڑھیوں پر ختم کر دیا تھا۔ اگر کسی سوال کا جواب یاد نہ آئے اور ہر قسم کے راستے بند ہوں تو ریل کے سفر پر پوری کاپی بھری جا سکتی ہے۔ اپنے گھر۔ محلے شہر کے حال سے لے کر ندیوں، نہروں۔ کھیتوں پیڑ پودوں اور پہاڑوں پر اور ان پر اُگنے والی جھاڑیاں غرض کہ ہر چیز کا ذکر ریل کے سفر میں کیا جا سکتا ہے اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ریل کا سفر۔ ع

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

راغب مرادآبادی
(کراچی)

قطعات

مسز ڈیوڈ ہیں عامل فیملی منصوبہ بندی پہ
مبادا جھرّیاں پڑ جائیں دلِ ناشاد ہو جائے
مگر السیشین کُتیا جو گھر میں پال رکھی ہے
دُعا دیتی ہیں اُس کو صاحبِ اولاد ہو جائے

اخلاق سوز ہے نظرِ اہلِ مشرق میں
تہذیبِ مغربی کا یہی تو قصور ہے
اپنے یہاں حرام ہے، اُن کے یہاں مگر
شادی سے پیشتر ہی ریہرسل ضرور ہے

بجا کہا، حُکماء بھی ہیں محسنِ اُردو
جو ہے ملائکہ کی، وہ زبان لکھتے ہیں
مریض تاکہ ہوں مرعوب ان کے نسخوں سے
بجائے سونف، یہ سب بادیان لکھتے ہیں

نہایت مطمئن تھا جیل میں اک قتل کا ملزم
دھری کی دھری رہ گئیں ساری پولیس والوں کی تدبیریں
بہائی بینفٹ آف ڈاؤٹ میں پاکر کہا جج نے
"جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں"

پیٹ میں اک شاعرِ شہرت گزیدہ کے تھا درد
ڈاکٹر بولا، توقف دو منٹ فرمائیے
اک غزل پہلے سنا دیجے غزل سُن کر کہا
درد تو جاتا رہا ہوگا بس اب گھر جائیے

دوزخ میں ہم جلیں گے، تو اچھا یہی سہی
ہم جلتی ہیں، کب یہ ہمارا کلیم ہے
رشوت کے جو خلاف ہیں لے کاش جانتے
اپنے وطن میں اک یہی اِن ڈور گیم ہے

اُن کی چاندی ہے جو ہیں 'بوٹ کلب' کے ممبر
حق ہے جینے کا انہیں کو یہ جیا کرتے ہیں
ہم تو تسبیح لیے ہاتھ میں ساحل پہ کھڑے
دور سے شربتِ دیدار پیا کرتے ہیں

یوسف ناظم

میں بے حد مصروف ہوں

عُرف اختر الزماں ناصر

اختر الزماں ناصر ساکن اورنگ آباد دکن، غیر ضروری طور پر بے حد شریف آدمی واقع ہوئے ہیں۔ ایک تو اُن کا مزاج ہی شاید شریفانہ ہے دوسرے انھوں نے اس سلسلے میں ریاض بھی بہت کیا ہے اور اس بامشقت ریاض کے نتیجے میں اُن کی طبعی اور اکتسابی شرافت کی شہرت ان کے اپنے محلے کے حدود کو توڑ کر شہر کے دوسرے محلوں میں بھی پہنچ چکی ہے۔ اب تو اس بات کا بھی خدشہ پیدا ہو چلا ہے کہ یہ شہرت، شہر کے حدود اربعہ کی بھی پروا نہیں کرے گی۔ اختر الزماں ناصر کے متعلق یہ بات بھی مشہور ہے کہ شہرت ان کا تعاقب نہیں کرتی یہ اپنی شہرت کے تعاقب میں صبح دم گھر سے نکل پڑتے ہیں کہ کہیں یہ بہت دور نہ نکل جائے۔ یہ اسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور اس کے پیچھے پیچھے شہر کے سبھی محلوں میں بالالتزام روزانہ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ اختر الزماں ناصر چونکہ ہر کام کو معنوی اعتبار سے کم اور لغوی اعتبار سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لیے قدم رنجہ کرنے کے عمل کو بھی باپیادہ ہی پایۂ انجام تک پہنچاتے ہیں۔ گویا شطرنج کے کھلاڑی نہیں ہیں لیکن بساطِ شہر کے ایسے مُہرے ہیں جنھیں پیادہ نہیں پاپیادہ کہنا بلحاظ لغت درست ہوگا۔ اگر یہ کسی دن شہر کے کسی محلے کی گشت پر نہ جا سکیں تو شام تک اس کی بازگشت پورے شہر میں سُنائی دے گی۔ یہ صحیح معنوں میں شہر کی انجانی گلیوں میں بھی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ یہ خود بھی اپنے پلٹے استقلال کے معاملے میں بہت پکے ہیں اور معینہ وقت پر مقررہ جگہوں پر ضرور پائے جاتے ہیں۔ ایسا آدمی جو اپنی زندگی میں ایک دشمن بھی نہ پیدا کر سکے مشکل ہی سے کسی اور ضلع یا تعلقے میں ملے گا۔ اختر الزماں ناصر کئی سال اس شہر سے باہر بھی رہے ہیں۔ وہ جتنے دن باہر رہے شہر قحط الرجال کا شکار رہا۔ ان کی مراجعت سے شہر کی حالت بہتر ہوئی۔ یہ اس سے بھی بہتر ہو سکتی تھی لیکن مشکل یہ ہے کہ اختر الزماں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کسی چیز پر مصروف رہتے ہیں کوئی نہیں بتا سکتا۔ مشہور تو یہ بھی ہے کہ ان کے کوئی ملاقاتی بات میں ان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ وقت ذرا زیادہ ہو گیا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ آدمی ملے ہی نہیں۔ یہ شاید گئے تھے۔ ملاقاتی چونکہ بہت دیر سے نہیں بلکہ بہت دور سے آئے تھے اس لیے ان کے بیٹے نے وفورِ اخلاق میں انھیں بتانا مناسب سمجھا۔ یہاں بھی یہ ابھی دیر سے کہاں تھے آواز دینے پر جاگ گئے لیکن لیٹے لیٹے ہی بلند آواز سے کہا کہ بیٹے سے کہو مصروف ہوں۔ کم شہر کی اتنی بڑی آبادی میں سے ایک شخص بھی ان کے بیٹے کی

سمجھ میں تو آیا کہ مصروفیت کسے کیا معنی ہوتے ہیں ۔ شہر کے دوسرے لوگ بھی رفتہ رفتہ ان کی مصروفیت کا مطلب سمجھ جائیں گے ۔ یہ گھر کے باہر رہتے ہیں تو مصروف رہتے ہیں لیکن گھر کے اُس حصّے میں بھی کیوں نہ ہوں جہاں آدمی تنہا جانے پر مجبور ہے یہ بے حد مصروف ہونے کا اعلان ضرور کرتے ہیں ۔

ان کی مصروفیت کی شہرت ان کی شرافت کی شہرت سے کافی آگے نکل گئی ہے اور اب وہ لوگ بھی جو انھیں نہیں جانتے ہیں یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس شہر میں ایک شخص ہے ۔ جو بے حد مصروف ہے بلکہ اب تو اورنگ آباد کے باشندے یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ شہر کا پتہ پتہ بوٹا بوٹا جانتا ہے کہ اختر الزماں ناصر کچھ کریں یا نہ کریں بے حد مصروف رہتے ہیں ۔ اُن کی مصروفیت اس انصاف کی طرح کی چیز ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انصاف کیا جانا چاہیئے بلکہ اس کا اعلان بھی کیا جانا چاہیئے کہ انصاف کیا گیا ہے ۔ اس روایتی اور شہرہ آفاق انصاف اور اختر الزماں ناصر کی متعلقہ مصروفیت میں بس فرق یہ ہے کہ انصاف تو کبھی کبھی ہو جاتا ہے خواہ غلطی ہی سے کیوں نہ ہو لیکن اختر الزماں کی مصروفیت میں صرف اعلان کا عنصر ہوتا ہے اس کے امکان کا کم ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ یہ کہنے میں مصروف رہتے ہیں کہ میں بے حد مصروف ہوں ۔ یہ تو کئی لوگوں کا چشم دید واقعہ ہے کہ جب بھی بہ دوران گشت و چہل قدمی کوئی شخص انھیں سلام کرتا ہے تو اختر الزماں ناصر کے پاس اس سلام کا جواب وعلیکم السلام نہیں ہوتا فصیح اُردو میں بلند اور اونچی آواز میں یہ ہوتا ہے کہ میں بے حد مصروف ہوں اور ان کے شناسا کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے ۔ شہر میں کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں اختر الزماں سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہو ۔ اختر الزماں ناصر اپنی بے پناہ اور ان دیکھی مصروفیت میں مصافحوں کی مصروفیت کا اضافہ کرنے کے موقف میں نہیں ہیں حالانکہ ان کی اکتسابی شرافت اُنھیں مصافحے کے لیے اکساتی بھی ہے ۔ ان کی مُبیّنہ مصروفیت کی وجہ سے شہر میں اسقاطِ جسم کی وارداتیں اکثر و بیشتر ہوتی ہی رہتی ہیں ۔ ادبی نشستوں میں بھی یہ شریک ہوتے ہیں لیکن کھڑے کھڑے ۔ کہیں اگر یہ بیٹھ بھی جائیں تو پانچ یا زیادہ سے زیادہ سات منٹ کے بعد انھیں یاد آجاتا ہے کہ وہ بے حد مصروف ہیں اور یہاں خواہ مخواہ بیٹھے ہوئے ہیں ۔

اختر الزماں ناصر کو اُن کے صحیح تناظر میں ذہن نشین کرنا مقصود ہو تو اپنے تخیل سے کام لینا چاہیئے ۔ تخیل کی مدد کے بغیر ان کی مصروفیت کا کوئی خاکہ نظروں کے سامنے نہیں آسکتا ۔ دھندلی چیزیں تو خیر دکھائی بھی دیتی ہیں لیکن معدوم چیزوں کو بھلا کیسے دیکھا جا سکتا ہے ۔ بغیر کسی مصروفیت کے مصروف اور وہ بھی بے حد مصروف رہنا بے حد مشکل کام ہے لوگوں کو اس معاملے میں اختر الزماں ناصر سے سبق حاصل کرنا چاہیئے ۔ سُنا ہے وہ کس طرح مصروف رہا جائے کے موضوع کی کلاس کھولنے والے ہیں لیکن فی الحال اُن کی مصروفیت انھیں اس کی اجازت نہیں دے رہی ہے ۔ میرا خیال ہے کلاس کھولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔ جو بھی ان کے نقشِ قدم پر چلے گا خود بہ خود مصروف ہو جائے گا ۔

جہاں تک ان کی علمی اور ادبی قابلیت کا تعلق ہے اسے بھی انھوں نے ایک مخصوص حد میں رکھا ہے اختر الزماں ناصر نے ادب عالیہ کو صرف سونگھا یا چکھا نہیں ہے اس کی باضابطہ خورد و نوش کی ہے ۔ وہ آج بھی جب کچھ لکھتے ہیں ادب عالیہ ہی کی زبان میں لکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اقبال کے اشعار کی تفہیم کرنے لگتے ہیں تو یہ اشعار اور زیادہ مشکل اور ادق ہو جاتے ہیں ۔ اچھے بھلے اور امن پسند سامعین کو کیسے پریشان کیا جاتا ہے یہ فن انھیں آتا ہے

خود بھی شعر کہتے ہیں ۔ برسوں سے کہہ رہے ہیں جب بھی غزل یا قطعہ کہتے ہیں اپنا تخلص ناصر [illegible]

یا دوسرے مصرع میں رکھنا نہیں بھولتے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُن کے کہے ہوئے اشعار اچھے خاصے ہوتے ہیں معقول اور بامعنی۔ شعریت لیے ہوئے۔ اسی لیے شاید انھوں نے اپنا مجموعہ کلام آج تک نہیں چھپوایا۔ پدر اگر نتواند پسر تمام کند کا مشہور مقولہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا۔ انھیں اپنے کلام کی ترتیب، تدوین اور تہذیب کا موقع ہی نہیں ملا۔ ان کا اپنا کلام ان کے لیے دوبارہ فنا دہ تھا (اس میں ان کی افتادِ طبع کا کافی دخل رہا ہے) ۔ ان کے کلام کی عدم دستیابی ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معروف رہے ہیں ورنہ ان کی زبانِ زدِ خاص و عام معروفیت کی تائید میں کوئی اور بات ہے نہیں۔

۱۹۸۳ء سے شہر اور شہر کے اطراف و اکناف میں دوسری سیاسی قیاسی افواہوں کے ساتھ یہ خبر بھی ان کی طرح گشت کر رہی تھی کہ اختر الزماں ناصر ساکن اورنگ آباد دکن کا مجموعہ کلام زیرِ طبع ہے لیکن ۱۹۸۸ء کے وسط تک تو یہ زیرِ ہی رہا طبع نہیں ہو سکا۔ بہرحال وہ خوش نصیب شاعر ہیں کہ اُن کا مجموعۂ کلام چھپے بغیر چار دانگ اورنگ آباد میں اتنا مشہور ہوا۔ اتنی شہرت تو ان مجموعوں کو بھی نہیں ملی جو چھپ کر کہنہ ہو چکے ہیں۔ معروف شاعر اور معروف شاعر کے کلام میں یہی فرق ہوتا ہے ۔۔ اب یعنی ۱۹۸۸ء کے ساتویں مہینے میں یہ خبر آئی ہے کہ اختر الزماں ناصر کا مجموعہ سرحد پار علاقے میں زیرِ شہرت ہے اور شاعرانِ اوراقِ پریشاں کی خیریت دریافت کرنے میں شب و روز لیے حد معروف ہے ۔۔ !

▲▲

غزلیں

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

کبھی ہلمٹ کبھی چپالان پہ رونا آیا　اور کبھی حاکم نادان پہ رونا آیا!
ہر طرف شہر میں بے پردہ نظر آتی ہو　نالیو! اس نئے رجحان پہ رونا آیا!
دستِ بیرون پہ کبھی ہم نے بہائے آنسو　اور کبھی داخلی بحران پہ رونا آیا!
ہم نے جھیلے ہیں کئی طرح کے طوفاں لیکن　چائے کی پیالی کے طوفان پہ رونا آیا!
تندرستی میں ہے مشہور صحافت جسکی　اس کے اخبار کے یرقان پہ رونا آیا!
جس نے کرسی کو بنا رکھا ہے اپنا قبلہ　ایسے سرکاری مسلمان پہ رونا آیا!
آخر ماہ میں ٹپکا ہے جو گھر میں مہماں　کبھی خود پہ کبھی مہمان پہ رونا آیا!

ہاشمی اوروں کے پکوان پہ ہنستے تھے بہت
آج کیوں اپنے ہی پکوان پہ رونا آیا!!

ظہیر الدین ساحر (نرمل)

شاعر اک ایسا بھی دیکھا گیا استادوں میں　ہر جگہ اولڈ غزل اپنی سنانے والا
پھینک کر غصے سے برتن نہ لیں چھوڑ دو بیگم　سوچئے! کیسے کماتا ہے کمانے والا
بیوی ہو جس کی ہمیشہ ہی جھگڑنے والی　کون ہے اس کو سوا رب کے بچانے والا
دیکھ کر مونچھیں سمجھتے ہیں اسے سورما سب　اصل میں ہے وہ نکما ڈھول بجانے والا

خوشامد

حیدر بیابانی

ہر سمت لگا ہے یہاں بازارِ خوشامد　ہر کوئی جہاں میں ہے طلبگارِ خوشامد
ہاریں وہ الکشن میں تو اس بات پہ رو ئیں　ہوگا نہیں برسوں انھیں دیدارِ خوشامد
بن جائے گا سسرال بھی گھر آپ کا اک دن　ہے ساس اگر آپ کی بیمارِ خوشامد
روٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے وظیفے　کچھ یاد نہیں! حیرت ہیں اوتارِ خوشامد

حیدر! ہیں خوشامد کے پرستار سبھی لوگ!
آشنا نہیں تم سے ہی تحفظ بازارِ خوشامد

منظر علیخان
کراچی (پاکستان)

چھپائے نہ بنے

چچا غالب کا دور بھی کیا خوب دور تھا کہ جب ایک خط کو بھی چھپانا مشکل ہوا کرتا تھا اور اگر کسی طور چھپا بھی لیا جاتا تھا تو بعد مرنے کے ضرور برآمد ہوتا تھا اور تنہا نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنے ساتھ ساتھ کچھ حسین تصاویر بھی نامحرموں کے ملاحظے کے لیے نکال لاتا تھا۔ اب ہم نے اور دوسرے میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی خاصی ترقی کی ہے۔ اب حسینوں کے خطوط اور اُن کی تصاویر کس شمار قطار میں ہیں، خود حسینوں کو ہم اب اس طرح غائب کرنے لگے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی برآمد ہونے کا امکان کم ہوتا ہے، ہمارے مرنے کے بعد نہیں، کچھ حسینوں کے وصال کا ذکر مجبوراً کرنا پڑا ہے۔!

بات چھپنے چھپانے کی یوں بھی نکالنی پڑی کہ فی زمانہ جو سامنے ہے اُس کا کوئی گنا سامنے نہیں ہے، میرا مطلب ہے پوشیدہ ہے یا چھپایا ہوا ہے۔ ہاتھی پُرانے زمانے کا جانور ہے (یوں جانور تمام ہی پُرانے زمانے سے متعلق ہیں) لہٰذا چھپانا کم اور دکھانا زیادہ ہے اب سے پہلے لوگ گدڑی میں لعل چھپاکر رکھتے تھے اب لوگ سوٹ پہنتے ہیں اور "لال" ہاتھوں اور سروں پر سجاتے ہیں سوٹ کے اندر لال ہے اور نہ سبز۔ کوئی اور گہرا رنگ ہو تو کہا نہیں جاسکتا۔ وطنِ عزیز میں رنگوں کے بارے میں ویسے بھی کچھ کہنا مشکل ہے ایک تو یہ چڑھتا اُترتا رہتا ہے پھر دُور سے کچھ نظر آتا ہے اور نزدیک سے کچھ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دوسرا مصرعہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۴۲۰ کو دعوتِ عمل دیتا ہے لہٰذا اسے جانے دیں۔ بات رنگوں کی ہو رہی تھی لیکن میری کوشش کے باوجود کچھ بے رنگ سی رہی، شاید اس لیے بھی کہ گرد و پیش میں جتنے بھی رنگ بکھرے ہوئے ہیں وہ کچھ اس شدت سے ایک دوسرے پر سوار ہیں کہ صحیح صورتِ حال کا پتہ چلنا مشکل ہے۔ ایسے میں کچھ لوگ اپنا اصلی رنگ اگر چھپاتے ہیں تو کیا مضائقہ ہے؟

اولادِ آدم بالخصوص مرد و زن، چھپانے سے زیادہ دکھانے میں دلچسپی لیتی رہی ہے حالانکہ چھپانے سے زیادہ دکھانا مشکل کام ہے کچھ اس لیے بھی کہ دکھانے کے لیے، دکھانے کے قابل کسی شے کا پاس میں ہونا ضروری ہے چھپانے کے لیے کسی بھی شے کا پاس میں ہونا کچھ ایسا لازمی نہیں۔ وطنِ عزیز میں کئی بزرگوار ایسے گزرے ہیں کہ قوم کو یہ دکھانے البتہ دکھانے کا فرض نبھاتے رہے تا آنکہ وطن کی مٹی نے خود اُن کو چھپا لیا۔ کچھ جی دار لوگوں نے قوم کی دلجوئی

کی خاطر اسے دکھایا اور ایک عرصہ تک دکھایا لیکن بات سبز باغ سے آگے نہ جا سکی، سبز باغ کا گلابی اور بنفشی پھل جانے کہاں غائب ہوتا رہا۔ بہرحال یہ میرا مسئلہ نہیں . . . بلکہ یہ کسی کا بھی مسئلہ نہیں، پھل ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لیا جائے ایک تو اسے نظر لگ جانے کا ڈر ہوتا ہے دوسرے چھینا جھپٹی میں لوگوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ الگ ہوتا ہے ہاں اپنے اقرباء اگر مزہ چکھ لیں تو مضائقہ نہیں، مساکین تک پھل کا پہنچنا کیا ضروری ہے۔

صاحبو! بات دکھانے اور چھپانے کی ہو رہی تھی جو سبز باغ سے ہوتی ہوئی گلابی اور بنفشی پھل تک جا پہنچی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ بھوکے کو آسمان کا چاند بھی تنوری روٹی کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ سبز باغ دیکھنے والے کے تصور میں لگا ہے گا ہے اگر پھل در آئے تو ایسا باعثِ تعجب بھی نہیں۔ ہاں تو بات تھی چھپانے کی لیکن کیا؟ اس دور میں جب لوگ باگ ہیروئن بڑے سلیقے سے چھپاتے ہیں اور ہیروئن کچھ بھی نہیں چھپاتیں بجز اپنی عمر کے۔ دکھانے اور چھپانے کے بارے میں گفتگو کرنا بڑا مشکل ہے۔

اپنے بھائی شرفو سے جب اس موضوع پر گفتگو کی تو بڑے انکشافات ہوئے، بولے لوگ کیا چھپاتے ہیں اور کیا دکھاتے ہیں اس پر الجھنے سے پہلے یہ دیکھو کہ کیوں چھپاتے ہیں اور کیوں دکھاتے ہیں بلکہ اس کی ابتداء اپنی نصف بہتر سے کرو یعنی یوں کہ یہ سوچو کہ کیوں چھپاتی ہیں اور کیوں دکھاتی ہیں۔ میں نے کہا کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ بھی غور کیا جائے کہ کب یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے دکھانا اور چھپانا۔ بولے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ دکھاتے اور چھپاتے وقت اپنی رسٹ واچ کے بجائے لوگوں کی "واچ" پر نگاہ ہوتی ہے۔ میں نے کہا چلئے یہی سہی اب بتایئے کہ کیوں چھپاتی ہیں؟ بولے اس لیے کہ دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ پوچھا اور کیوں دکھاتی ہیں۔ بولے اس لیے کہ شاید کچھ فائدہ ہو ہی جائے مزید بولے کرنی زمانہ سود و زیاں کی تھیوری سے زیادہ کوئی اور تھیوری عمل کے مرحلے سے نہیں گزری۔

بات کا رُخ چونکہ بھائی شرفو نے "نصف بہتر" کی طرف موڑ دیا تھا لہٰذا مجھے اندیشہ ہوا کہ "بہترین" باتیں کرنے کے شوق میں جانے وہ کن کن نشیب و فراز کی سیر کرنے اور کرانے لگیں۔ لہٰذا میں نے یاد دہانی کرائی کہ چلئے "کیوں" کا فیصلہ تو ہوا، اب یہ بتلایئے کہ کیا چھپاتے ہیں۔ بولے یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ جو دکھانا نہیں چاہتے ہیں وہ چھپاتے ہیں۔ میں نے کہا جب دکھانا ہی نہیں چاہتے تو اس کے حصول کے لیے آخر سر کیوں کھپاتے ہیں۔ بولے اس راز سے پردہ اٹھانا عوام الناس کے مفاد میں نہیں ورنہ تمہیں بتاتا کہ آج کل لوگ جو کچھ شب و روز جمع کرنے میں مصروف ہیں اگر اسے دکھانے لگیں یا اگر پاس پڑوس والے کسی طور انھیں دیکھ لیں تو پھر لوگوں کو خود اپنے چھپنے کے لیے جگہ تلاش کرنا پڑے۔ میں نے کہا بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر مسئلہ کیا ہے! بولے تم غالب کا وہ مشہور مصرعہ پھر سے پڑھو جس میں چھپانے کا ذکر ہے عرض کیا ؎ "کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے"

کہنے لگے اب تم بتاؤ یہ جو تمہاری جیب میں اٹکی ہوئی ہے۔ یہ کیا ہے۔ کہا ایک معمولی سا قلم ہے بولے اس کے علاوہ کیا ہے؟ کہا اور تو کچھ نہیں ہاں بسوں کا ٹکٹ شاید ایک آدھ رہ گیا ہو۔ بولے گھر میں کیا کچھ ہے۔ عرض کیا ایک عدد بیوی چند بچے۔ ان کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں۔ کہنے لگے تم نے کچھ چھپایا تو نہیں۔ میں نے زچ ہو کر کہا آخر چھپاتا بھی کیا۔ جو کچھ ہے آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ بولے تو پھر غالب کا یہ مصرعہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ میں نے آپ کا مطلب کیا ہے بولے جہاں تم کام کرتے ہو وہاں اپنے گرد و پیش پر کبھی نظر ڈالی ہے! عرض کیا ہاں کبھی کبھی

اپنی میز سے آگے بھی دیکھتا تھا۔ بولے تم نے غور کیا ہوگا کہ اکثر میز پہ صورت کچھ یوں ہوتی ہے کہ ؎

"کوئی کر آنکھ بچائے تو دکھائے نہ بنے"

بہرحال اس پر اگر گفتگو چل نکلی تو پھر یہ بھی ترقی پسند شعراء میں ہونے لگا۔ یوں بھی خواتین کو ہماری سوسائٹی کی طرف سے خاصی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ جو چاہیں چھپائیں اور جو چاہیں دکھائیں، نہ ماہ وسال کی قید نہ صبح وشام کی۔ نہ موسموں کی تبدیلی سے کسی قدغن کا اندیشہ! بات پریشان کن جب ہوتی ہے جب مرحلہ بننے وبگڑنے کا آتا ہے کبھی کچھ، اس کچھ" میں بہت کچھ شامل ہے، چھپانے سے بات بنتی نظر آتی ہے اور کبھی سرے سے بگڑ جاتی ہے اب یہ لٹو لگنے اور نظر پھیر کر چلے جانے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس موڈ میں ہے۔

اسی طرح کبھی بات ایک جھلک دکھانے سے بنتی ہے تو کبھی یہی جھلک سارے کئے کرائے پر پانی پھیر ڈالتی ہے۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ دکھانے یا چھپانے کا عمل اتنا اہم نہیں جس قدر اہمیت اس کی ہے کہ کیسے دکھائیں، کب دکھائیں اور کتنا دکھائیں، حسن کی جلوہ نمائی کی اہمیت بجا لیکن دیکھنے والے کے ہوش وحواس کا اندازہ اگر پہلے سے نہ کرلیا جائے تو مثبت نتائج کا حصول قدرے ناممکن ہے۔ میں نے بھائی شرفو کو ٹوکا کہ یہ سب کچھ جو آپ بتا رہے ہیں، وہ میرے لیے بعد از وقت ہے۔ اب ہوش وحواس اتنی قدر رہ گئے ہیں کہ آپ کے سراپا کو چشمہ کی اوٹ سے دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کارخانۂ قدرت میں بھی شاید اب UN-SKILLED کارندے کام پر لگا لیے گئے ہیں۔ لہٰذا میرے لیے حسن کی جلوہ نمائی کے پروگرام سے آگاہ ہونے کا اب بہت زیادہ فائدہ نہیں۔ آنکھوں میں کچھ نہ کچھ دم تو ہے لیکن ساغر ومینا کو بٹھائے رکھنے پر اس قدر اصرار کیوں ہو؟ اظہارِ خیالات کے لیے نثری نظم کہنے والے لڑکے اگر اس پروگرام سے واقف ہوتے رہیں تو گلشن کے کاروبار میں تیزی کا رجحان باقی رہے۔

اب کی بار بھائی شرفو نے مجھے ٹوکا کہ چلو جانے دو۔ دل چھوٹا کیوں کرتے ہو، گلشن میں ہر طرح کے کاروبار کے امکانات ہیں جو کل بھی تھے اور کل بھی رہیں گے۔ ہاں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق مت پوچھو! میں نے کہا ہمارے لیے تو آج ہی کی اہمیت ہے۔ بھائی شرفو بولے ہوگی لیکن گزرے ہوئے کل کے بارے میں گفتگو کرنا آسان ہے کہ بیشتر زبان پکڑنے والے کسی اور کی پکڑ میں آچکے ہیں اور آنے والے کل کے بارے میں اپنے منجم اعظم پروفیسر کوکب سے لے کر اپنے پیر صاحب تک لوگوں کو بتاتے ہی رہتے ہیں۔ اُن میں اگر ایک میرا اور اضافہ ہوا تو کیا ہاں آج جو کچھ چھپایا یا دکھایا جارہا ہے اس کے بارے میں ؎

"جو تمہیں کھل کے دکھاؤں تو دکھائے نہ بنے"

لہٰذا جانے دو!

▲▲

تحریک

بہاء الدین ریاض
(کلکتہ)

تپش دل میں ہوتی نہ گر عشق کی　　نہ رس گھولتی میر کی شاعری
سخنور نہ کہلاتے غالب کبھی　　چراتی نہ دل آن کا گر ڈومنی
محبت میں مومن ہوئے مبتلا　　لکھی تب کہیں ریختی مثنوی
نہ ہوجاتے آوارہ ہرگز مجاز　　محبت اگر ملتی شہناز کی
محبت کا جادو کچھ ایسا چلا　　ثناء اللہ آخر بنے میراجی
تباہ زندگی یوں نہ کرتے فراق　　جو بیوی بدل ہوتی معشوق کی

میں اُپدیش دیتا ہوں اے شاعرو
دھڑلے سے تم بھی محبت کرو

محبت کی دولت جسے مل گئی　　وہ دُنیا کا ہے اک بڑا آدمی
کسی ایک محبوب کے ہو نہ ہو　　وہ گوری ہو کالی ہو یا سانولی
ندی کے کنارے کرد سیر تم　　مہا ندی ہو یا کہ گوداوری
ذہن دُور کی کوڑیاں لائے گا　　جو شاخ محبت رہے گی ہری
غزل آج روکھی سی ہو بھی تو کیا　　سُناؤ گے کل سے غزل چٹ پٹی
جہاں جاؤ محفل میں چھا جاؤ گے　　تمہیں سُننے پبلک چلی آئے گی
پسندیدہ ہوگا قیام اور طعام　　سفر خرچ میں کچھ نہ ہوگی کمی
بچت ہو سفر خرچ میں کچھ اگر　　تو لا دینا بیوی کو ساڑی نئی
جو خوش اپنی بیوی کو تم نے کیا　　نظر وہ نہ آئے گی پھر تک چڑھی
نہ اُلجھن میں گزرے گی عمرِ عزیز　　تمھاری سنبھل جائے گی زندگی

ریاضِ محبت کے مالی بنو!
کسی دن بنو گے بڑے اک کوی

آتش لکھمنیانی (بہار)

کتابِ بغدادی

بی اے لندن ہیں اب بہو گھر میں
اور اُردو ہے اُن کی فریادی
بی بجیلن ہی ان کے بچوں کو
اب پڑھائے کتابِ بغدادی

شاعر اور شاعرہ

ہو جو شاعر کی شاعرہ بیوی
میں بتاؤں کہ حشر کیا ہوگا
روز ہوٹل سے آئے گا کھانا
روز گھر میں مُشاعرہ ہوگا

آج کا بیٹا

اس زمانے میں جب کہ ابّا کو
اپنے بیٹے کی جی حضوری ہے
اور کی قدر بیٹا کیا جانے
جب کہ ابّا ہی کھیر دیکا ہے

انوار انصاری (رانچی)

"کم بولنا دانش مندی کی علامت ہے" ہو سکتا ہے اگلے زمانے میں یہ مقولہ درست رہا ہو مگر زمانہ کی ترقی کے ساتھ اب مزاجِ زمانہ بھی بدل گیا ہے۔ اب تو "کم گو" یا "کم سخن" حضرت ڈھونڈھنے پر خال خال ہی ملیں گے اور اگر ملیں گے بھی تو لوگ انھیں خبطی اور دیوانہ کے القاب سے مخاطب کریں گے۔ "کم بولنا" اب دانش مندی کی پہچان نہیں بیوقوفی کی علامت ہے۔ اب کم بول کر لوگ اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے بلکہ زیادہ بول کر آپ کی عاقبت کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ اسمبلی ہو یا پارلیمنٹ، اسکول ہو یا کالج، سیاسی میٹنگ ہو یا ادبی جلسہ کم بولنے والے کی کہیں عزت نہیں ہے۔ اس کا گذارہ مشکل ہے۔ اس کی اپنی شناخت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا کم بولنا اِن دِنوں پریشانی کو دعوت دینا ہے۔

"کم کھانا صحت کی نشانی ہے"۔ یہ مقولہ ہم بزرگوں کی زبانی عرصہ سے سنتے آئے ہیں مگر اب تو یہ مقولہ بے جان سا لگتا ہے۔ کم کھانا صحت کی نشانی نہیں بلکہ بیماری کی علامت ہے۔ آج کل ہر طرف کم کھانے پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ اناج کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے۔ قدرتی حالات بھی کچھ ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ انسانوں کو یونہی کم کھانا مہیا ہو رہا ہے۔ دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کم کھا کر اپنا گذارہ کر رہی ہے۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اس لیے وہ کم کھانے پر عمل نہیں کر سکتا بلکہ وہ کم کھانے کے ساتھ ہی ساتھ غم کھانے کی کمی پورا کرتا ہے۔

کم کھانے سے انسان کو نیند کم آتی ہے۔ اگلے وقتوں میں کم سونا معرفتِ الٰہی کا وسیلہ ہوتا تھا۔ لوگ عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور خدا کے قرب کو حاصل کرنے کی سعی کرتے تھے مگر آج کل کم سونا پاگل پن یا ضعیفی کی علامت ہے۔ کم سو کر لوگ اب دوسروں کی نیند حرام کرتے ہیں۔ اِن دِنوں شہروں کا ماحول ایسا ہو گیا ہے کہ لوگوں کو آٹومیٹک "کم سونا" نصیب ہوتا ہے۔ آج کل بات بات پر نعرے بازی ہوتی ہے۔ معمولی معمولی تقریب پر لاؤڈ اسپیکر سے تقریب کی کارروائی کا اعلان ہوتا ہے۔ ناچ گانے کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ سربراہ ہاتھاپائی کی آزمائشیں ہوتی ہیں۔ انسانوں کا ہجوم، ٹریفک کی زیادتی، مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ سے اب سونا کہاں نصیب ہوتا ہے لیکن جی بھر کر خالص سونا خالص سونے یعنی گولڈ سے کم نہیں۔ کم سونا آپ انسانوں کی قسمت میں لکھا جا چکا

کم سونکر انسان اب خدا کا قرب تو حاصل نہیں کرسکتا ہے "ہاں کا نکے" (ناچی) اور "بریلی" (ریوں) کے پاگل خانے کے دروازے پر دستک ضرور دے سکتا ہے۔

کم سے چھٹکارا حاصل کرنا آج کی تہذیب اور معاشرت کے لیے پیچیدہ اور سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔ قدم قدم پر اب انسانوں کو کم علم لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اِن سے دامن بچانا مشکل ہے۔ کم علم آپ کو ہر میدان میں نظر آئیں گے۔ کم علم انسان کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کے سامنے اپنی کم علمی کا رونا نہیں روئے گا بلکہ اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کے لیے اپنی کم علمی کا مظاہرہ کرے گا۔ مجھے تو ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے انسان بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتا ہے مگر ڈگریاں حاصل کرتے یا خرید لے کے بعد بھی اکثر حضرات کم علم ہی رہ جاتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کم علموں کی بڑی قدر ہے اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ آج کل کم علم بڑی اور اونچی کرسیوں پر براجمان ہیں۔

"کم عقل" انسانوں سے دامن بچانا بھی محال ہے۔ گھر ہو یا محلہ، دفتر ہو یا دکالت خانہ، سیاست کا رنگین اکھاڑہ ہو یا ادب کا سبزہ زار، ہر جگہ کم عقلوں سے پالا پڑتا ہے۔ کم عقل اپنی ذہانت سے آپ کی عقل کند کر دیتے ہیں۔ گھر میں جب کبھی نوکر سے نوک جھونک ہوتی ہے تو اس کو کم عقل کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے مگر جب بھی نوک جھونک بیگم سے ہو جاتی ہے تو میں یہی کہہ کر اُن کی انا کو مجروح کرتا ہوں کہ عورتیں بڑی ناقص العقل ہوتی ہیں۔ یہ سن کر بیگم چراغ پا ہوتی ہیں اور ان کا درجۂ حرارت کافی بڑھ جاتا ہے۔ زوردار آواز میں جواب دیتی ہیں کہ مرد بھی کچھ کم خود غرض نہیں ہیں۔ اپنا کام نکالنے کے لیے وہ عورتوں کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور کام نکلنے کے بعد عورتوں کو کم عقل کہتے ہیں۔ لعنت ہے ایسے مردوں کی کم عقلی پر۔

کہاں تک انسان کم علم اور کم عقل انسانوں سے اپنا دامن چھڑائے۔ کم ظرف بھی آپ کی اذیت بڑھانے میں کچھ کم نہیں۔ انسان کم ظرفوں سے دور رہنے کی کوشش ضرور کرتا ہے مگر کامیابی اسے نصیب نہیں ہوتی ہے آج کل موجودہ سماج میں کم ظرف ہی کا بول بالا ہے۔ ہر طرف اس کی طوطی بولتی ہے ہر میدان میں اسی کا ڈنکا بجتا ہے ترقی کے زینے پر وہ سوار ہے اور میدانِ سیاست اور صحافت کا میرِ مجاہد بنا بیٹھا ہے۔ اعلیٰ ظرف کی اب قدر و قیمت کہاں۔ اب تو ان کے روپوش ہونے ہی میں عافیت ہے۔

کم ذات اور اعلیٰ ذات کا مسئلہ بھی سنگین اور دردناک ہے۔ ذات پات کی تفریق سے موجودہ سماج گھناؤنے پن کی دلدل میں پھنس رہا ہے۔ انسان جھگڑے میں پڑکر یہ فراموش کر بیٹھا ہے کہ انسانوں کی صرف ایک ذات ہے یعنی انسان۔ مگر کم ذات اور اعلیٰ ذات کے لیڈروں کو اس سے تسکین نہیں ہوتی کچھ انسان کم ذات کے سینے پر مونگ دلتے ہیں اور کچھ اعلیٰ ذات پر کیچڑ اُچھالتے ہیں۔ لہٰذا ذات پات کو گولی ماریئے اور کم عمر سے ملیئے۔

ہر انسان کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو کم عمر ثابت کرے۔ یہ بیماری عورتوں میں زیادہ ہے لیکن میرے مرد بھی ایسے ہیں جو اپنے آپ کو کم عمر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پتہ نہیں زیادہ عمر بتانے سے انسان گھبراتا کیوں ہے۔ میرے ایک دوست ہیں بنرجی صاحب، آڈٹ پارٹی میں اکثر و بیشتر میرے ہمراہ رہتے ہیں۔ ان کا حلیہ کچھ [illegible] کا ہے دیکھنے میں وہ ضعیف اور ناتواں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی پیشانی تنگ ہے، ناک [illegible] کے بال بگلے کے پر کی طرح سفید ہیں مگر بال ڈائی کراتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے بالوں کا

رنگ سرخی مائل سیاہ ہوگیا ہے۔ گال پچکے ہوئے ہیں مگر مصنوعی بتیسی کی وجہ سے گالوں میں اُبھار نمایاں ہوگیا ہے۔ تیز چلنے میں ان کو دشواری ہوتی ہے ان کا حُلیہ دیکھ کر لوگ بنر جی دادا کی اصل عمر دریافت کرتے ہیں بنر جی دادا عمر پوچھنے پر جواب دیتے ہیں کہ میری عمر ابھی بہت کم ہے اگر صحیح عمر لکھوائی جاتی تو دس سال سے زیادہ سروس باقی رہتی۔ غلطی سے میرے ماما نے گاؤں کے اسکول میں عمر زیادہ لکھوائی تھی۔ بنر جی صاحب کا کہنا ہے کہ جس طرح موسیقی اور عورت کی کوئی عمر نہیں ہوتی اسی طرح میں بھی ہمہ وقت جوان ہوں۔ خیر بنر جی صاحب کی باتوں کو جانے دیجیے۔ نہ جانے کم عمر حسینہ پر لوگ کیوں جانِ عزیز چھڑکتے ہیں۔ اب تو سائنس کی ترقی کی وجہ سے یہ حال ہوگیا ہے کہ وقت سے پہلے ہی حسینائیں اپنی دلکشی اور رعنائی کھو بیٹھتی ہیں اس لیے کم عمری کی شادی کے خلاف بھی محاذ بنایا جارہا ہے۔ انسان ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ وہ کم عمر رہے اور موت سے دُور رہے۔

کم نظر بھی کسی سے کم نہیں۔ ہر شے میں ان کو کمی ہی نظر آتی ہے یعنی

کم جتنے ہوئے فاصلے دُنیا کے بظاہر
ذہنوں میں ہم اتنے ہی خلاء دیکھ رہے ہیں

چلئے کم نظری بھی ایک مرضِ لاینحل ہے جو انسانوں کو آگے چل کر تنگ نظر بنا دیتی ہے۔

"کم وزن کیجئے اور اپنی تجارت کو فروغ دیجئے"۔ یہ نیا نعرہ ہے۔ مچھلی بازار ہو یا گوشت کا مارکیٹ، سبزی منڈی ہو یا پنساری کی دُکان، ہر طرف کم وزنی کا بازار گرم ہے۔ بھاؤ کم بتا کر گاہک کو کم وزن سامان دینا ہمارے شہر کی ایک خاصیت ہے۔ کچھ تاجر اسے مستقل فن کی شکل دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کم وزنی کے بل بوتے پر وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں کم وزنی کو روکنے کے لیے اوزان و پیمانہ جات کا ایک الگ محکمہ ہے بلکہ وہ سرکاری شعبہ ہی کیا جس کا کام قانون کے مطابق انجام پائے۔ وہ دن دُور نہیں جب کم وزنی کا جادو سرچڑھ کر اپنا کرشمہ دکھائے گا اور سیدھے سادے انسانوں کی حجامت بنائے گا۔

غرض کہ کہاں تک کم کا رونا رویا جائے۔ اب تو زندگی کے ہر موڑ پر دوست، احباب، رشتہ دار اور پڑوسیوں کے خلوص محبت، رواداری، بھائی چارگی، میل ملاپ میں کمی ہو رہی ہے محبت دن بدن کم ہوتی جارہی ہے۔ انسانوں کے کردار میں بھی کمی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کا قد بھی گھٹ رہا ہے یعنی کم ہو رہا ہے کم کے گرداب میں پھنس کر میں بھی وقت کی قدر و قیمت بھول بیٹھا ہوں۔ میں بھی اپنی کم مائیگی اور کم علمی پر شرمسار ہوں کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنے میں میں نے بھی کوئی کمی نہیں کی ہے۔ △△

میر حسین علی امام
پاکستان

پٹ سے پارٹ ٹائم

"پارٹ ٹائم" انگریزی اور ترقی یافتہ ممالک کا تحفہ ہے جو اب ترقی پذیر ممالک اور اردو میڈیم نے بھی اپنا لیا ہے۔ جس شخص کے پاس ٹائم ہو اور "جاب" نہ ہو، وہ پارٹ ٹائم کرتا ہے۔ جس شخص کے پاس جاب ہو اور ضروریات زیادہ ہوں اور جاب سے گزارا نہ ہو، وہ بھی پارٹ ٹائم کرتا ہے۔ جس شخص کے جاب ہو لیکن اوور ٹائم نہ ہو، وہ شخص بھی پارٹ ٹائم کرتا ہے گویا پارٹ ٹائم پہلے اور فل ٹائم بعد میں!

آج کا عہد مشینی عہد ہے اور مصروفیات کا عذاب ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے ہر شخص روپے بنانے کی ہول ٹائم مشین بنا ہوا ہے۔ کل تک جو سامان تعیشات تھے وہ ضروریات زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب ٹائم کا شکوہ ہر جگہ ہو گیا کہ ٹائم نہیں ملتا ہے۔ ٹائم نہیں ہے لیکن پارٹ ٹائم مسٹ MUST ہو گیا! اور ہر شخص کے پاس ٹائم نہ ہونے کے باوجود وہ پارٹ ٹائم کے چکر میں لگا رہتا ہے۔

کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کچھ فیشن پرستی اور کچھ ضروریات کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ٹیوشن کرتے ہیں۔ پارٹ ٹائم کاروبار میں اسنیک بار اور گولڈ اسپاٹ نے بھی اپنی جگہ مستحکم بنالی ہے اور نوجوان طبقہ شام سے بعد گاہکوں کو خوش آمدید کہتا ہے اور انھیں سروس فراہم کرتا ہے۔ بڑے کاروبار کے جعلی کھاتوں اور چھوٹے کاروبار کے اصلی کھاتوں کے لیے بھی پارٹ ٹائم کا سہارا لیا جاتا ہے اور وظیفہ یاب کلرک اور FRESH گریجویٹ افراد اس سے روزگار حاصل کرتے ہیں۔

عید بقرعید کے موقع پر پارٹ ٹائم سیلز مین شپ کا کاروبار بھی چمک اٹھتا ہے اور جگہ جگہ کھلنے والے جمعہ بازار، منگل بازار، سبزی بازار، عید بازار، وغیرہ بھی نوجوانوں کو پارٹ ٹائم کا نیا کام دے رہے ہیں!

ہم سوچتے ہیں کہ پارٹ ٹائم کی افادیت و اہمیت پر مذاکرے و سمینار کرائے جائیں۔ سفارشات مرتب کی جائیں کہ ہر شخص صرف پارٹ ٹائم کام کرے اور زیادہ کمائے۔ بیچارہ عام پاکستانی فل ٹائم کام کرتا ہے اور کماتا کم ہے جب کہ سرکاری محکموں کے اہلکار، کلرک، اسمگلر، پاسپورٹ و شناختی کارڈ کے ایجنٹ وغیرہ ٹائم کے دوران بھی کماتے ہیں اور ٹائم کے بعد بھی! شاید یہ لوگ آفس اسٹائن کے ٹائم سے آزاد ہیں!

ہمیں امید ہے کہ آئندہ چند پنج سالہ منصوبوں میں معاشی طور پر ہمارے ملک میں نوجوان پارٹ ٹائم بنیاد پر جوتے پالش کرتے، ڈش واشنگ کرتے، کھڑکیاں صاف کرتے، پٹرول بھرنے کے کام خوشدلی اور دل جمعی سے کریں گے اور ہمارا شمار بھی ترقی یافتہ ممالک میں ہونے لگے گا!

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

"کھٹمل"

جتنے حشرات الارض اس زمین پر بستے ہیں ان میں کھٹمل سے زیادہ نالائق مخلوق ہم نے نہیں دیکھی کیونکہ دوسرے پھر بھی زمین پر اِدھر اُدھر بستے ہیں لیکن یہ تو ہمارے بستر ہی میں بستا ہے۔ انسان سے ایسا انس پایا ہے کہ خونِ آدم کے علاوہ دوسری مخلوق کی جانب نظرِ التفات ہی نہیں جب دیکھئے انسان کی بغل میں کبھی کبھی تو ایسے کاٹتا ہے کہ کھجائے نہ بنے۔ ایک مرتبہ ہم خوابِ خرگوش میں تھے کہ اپنی پیٹھ کے اس حصّے پر جہاں آج تک ہماری اُنگلیوں کے قدم نہ پہنچ سکے تھے میاں کھٹمل براجمان ہوئے لیٹے ہی لیٹے ہم نے ہاتھ بڑھائے۔ ہاتھ قدمِ جاناں تک نہ پہنچ سکے۔ نیند اچھی طرح اچاٹ ہو چکی تھی ادنیٰ کھٹمل کے لیے بیگم کو بیدار کرنا بیداد کے مترادف سمجھا۔ دیوار کے سہارے بت بنے بیٹھے رہے۔ ہاتھوں کے بل سارے بدن کو اُٹھایا بٹھایا دو تین بار کی اس سعی لاحاصل سے کھٹمل کا خون ہو گیا کھٹمل کی لاش ہمارے کرتے سے ٹکراتی ہوئی نیچے گر پڑی اور چیونٹیوں نے بڑی دھوم دھام سے اس کا جنازہ نکالا اور ہر دہنِ مود پر یہ مصرع تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ہمارے گھر میں جب بھی کھٹمل بھر جاتے ہیں ہم مع اہل و عیال مہمان چلے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے کپڑوں، بیگم کی ساڑیوں، بچوں کی جھالیوں میں کچھ کھٹمل بھی ہمارے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اک آدھ ہفتہ میں ایک کے اکیس ہو جاتے ہیں اور ہم ان کھٹملوں کو وہاں گویا آباد فرما کر گھر لوٹتے ہیں اور یہاں کے سارے ہی کھٹملوں کو مُردہ پاتے ہیں کہ اتنے میں ایک نیم مُردہ کھٹمل ہمارے حضور یہ محضر پیش کرتا ہے کہ خونِ آدم کی عدم فراہمی کے احتجاج میں سارے کھٹملوں نے اجتماعی آتما ہتیا کر لی ہے۔ ہم یہ محضر پڑھنے بھی نہیں پاتے کہ صاحبِ محضر بھی مرحوم ہو جاتا ہے۔

کھٹمل اگر کاٹتا رہا تو پھر بھی صبر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ کمبخت کاٹتا کم ہے ستاتا زیادہ ہے۔ ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ چوری چوری کوئی کھٹمل رینگ رہا ہے۔ ہم اس کے تعاقب میں دستِ راست کو دوڑاتے ہیں۔ خبر ملتی ہے کہ وہاں سے کہیں اور پہنچ چکا ہے۔ دوسرے ہاتھ کو حکم دیتے ہیں کہ مکرر اطلاع ملتی ہے کہ پیٹھ پر گزر رہا ہے اب کیا کریں ایک ہاتھ کہیں تو دوسرا ہاتھ کہیں پر اب چپ سادھتے اور صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں عجیب کھٹمل ہے مقامات کے انتخاب کا تک سلیقہ نہیں۔ خیر اب ہم اپنی پوری دس اُنگلیوں کی صرف فاعن کی پلٹن کو کھٹمل کی محرومی یا مقتولی میں روانہ کرتے ہیں

اور ہماری فوج بے تحاشا فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتی ہوئی آنکھوں کے سامنے آتی ہے کھٹمل گرفتار ہے اب ہماری اپنی مرضی ہے چاہیں تو عہد دریائے شور کا حکم سنائیں یا اگر چاہیں تو عمر قید کا آرڈر دیں یا اگر چاہیں تو دیوار کی دراڑ میں چنوا دیں اگر مناسب خیال فرمائیں بر سر عام قتل کروائیں۔ چنانچہ ہم دوسرے کھٹملوں کی عبرت کے پیش نظر اسے بھرے بازار میں قتل کر دیتے ہیں۔ خوش بھی ہوتے ہیں کہ ہماری بھی حکومت چل رہی ہے۔

کھٹمل ایک زاہد شب زندہ دار کی طرح شب بیدار واقع ہوا ہے۔ از عشاء تا فجر وہ اپنی کارروائی میں مصروف رہتا ہے بعض کھٹملوں سے تو اچھی خاصی چھینا جھپٹی ہوتی ہے اور اس کھیل میں اکثر ہم ہی چور ہوتے ہیں۔ کہاں کہاں تلاش کرتے ہیں ٹوپی سے پائتابوں میں تک دیکھ لیتے ہیں لیکن ملتا ہے وہ بازو والے کی بغل میں۔

جب بھی ہمارے گھر کھٹمل ہلہ بول دیتے ہیں کیا چھوٹا کیا بڑا ہر شخص ستار بجاتا ہوا نظر آتا ہے۔ نوجوان تو کھڑے کھڑے الیکٹرک گٹار بجا لیتے ہیں یہ اپنے اپنے ذوق کی چیز ہے اور یوں بھی چست ملبوسات کے جنون نے نوجوانوں کو ہر کام کھڑے کھڑے کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم ذرا اولڈ ماڈل آدمی ہیں ستار بجاتے بجاتے طبلہ بھی ادا لیتے ہیں۔ کہ کسی نہ کسی تھاپ پر کھٹمل کا ستیاناس ہو جائے گا لیکن وہ ہیں تھاپ پر پیار رکھتا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ہاں کوئی مہمان آئے ہم نے انھیں اپنی آرام کرسی پیش کر دی جو ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی مزید براں کھٹملوں کا اڈہ بھی۔ نہ جانے کیوں کھٹملوں کو ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہی پسند آتی ہیں چنانچہ سارے محلے میں ہمارے گھر ہی کا انتخاب کرتے ہیں اور سارے گھر میں بیگم زیادہ پریشان رہتی ہیں۔ خیر۔ پہلی کاٹ پر وہ بے چارے ذرا چونکے گویا اندازہ کر رہے ہوں۔ ع

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

جب دوسرا اور تیسرا حملہ ہوا تو وہ آدھی پیالی سادی چائے اسٹول پر رکھ کر فضاء میں بہ تشویش گھورنے لگے اور پھر جب ان کی پتلون میں گھستے ہوئے کھٹمل انھیں بہت بے چین کر دیا تو وہ ایکس کیوزمی کہہ کر حمام میں گھس پڑے تاکہ تنہائی میں دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

ہماری بیگم اکثر کھٹملوں سے نبرد آزما رہتی ہیں وہ اس لیے کہ ہم زیادہ تر گھر پر نہیں رہتے بچپن ہی سے آوارہ ہیں چنانچہ بازار سے خود ہی ٹک ٹونیٹی لے آتی ہیں اور سارے گھر کو کھٹمل مار دوا سے دھو ڈالتی ہیں۔ ایک دفعہ جب وہ مچھروں کے حملے سے ملیریا کی شکار تھیں تو کھٹملوں کی دوا لینے ہم بازار گئے تھے۔ ہم نے جب کھٹمل مار دوا طلب کی تو دکان دار کچھ دیر تک ہمیں مشکوک نگاہوں سے گھورتا رہا۔ ہم نے مسکرا کر اس کے اندیشہ ہائے دور دراز کو معدوم کرنے کی کوشش کی کہ میاں کھٹمل ہو گئے ہیں۔ ایسے شاید ہمارا تبسم خودکشی کرنے والے کا آخری تبسم معلوم ہوا۔ وہ ہمارے قریب آیا دلاسہ کے دو چار بول رسید کئے "ہمت مرداں مدد خدا" کو غلط سلط دھرایا۔ ہم گرچہ ٹیس اردو اشعار صحیح نہیں پڑھتے کھٹمل مار دوا بیچنے والا فارسی مقولہ کیا درست دھرائے گا بہرحال ہم بھی کچھ مغموم سے ہو گئے شاید اپنی حالت پر ہمیں افسوس ہو رہا تھا کہ لوگ اندازے سے لگانے میں اندازے سے آگے بڑھ گئے تھے وہ مکا جانب بڑھا اور فوراً دس کا نوٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا اور یوں گویا ہوا کہ جناب! اس دنیا میں پریشانیوں کے سبھی شکار ہوتے ہیں لیکن حوصلہ رکھیئے۔ جب آپ صدر مدرس ہو جائیں اس وقت یہ لوٹا دیجئے شاید اسے یقین تھا کہ مدرس قرض نہیں لوٹاتا۔

کھٹمل کو ہم شریف النفس بھی جانتے ہیں اس لیے کہ وہ مچھر کی طرح ملیریا نہیں پھیلاتا، جب کاٹتا ہے خون کی اک آدھ بوند پر اکتفا کرلیتا ہے اور بطور یادگار اک آدھ "ددوڑا" چھوڑ جاتا ہے جسے ہم پدما بھوشن کے ایوارڈ کی طرح عزیز رکھتے ہوئے کئی دن تک سہلاتے رہتے ہیں۔

ایک دن ہمارا حجام سر صاف کرنے کے بعد ناخن پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ ہم نے ناخن کوٹلنے سے صاف انکار کر دیا۔ حجام کو بڑی حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا کہ برادر آج کل ہمارے ہاں کھٹمل ہو گئے ہیں۔ ان کی مہربانیوں کے شکریہ کے لیے ناخن کی موجودگی ضروری ہے۔

کھٹملوں میں سب سے زیادہ خطرناک مچھر یلے کھٹمل ہوتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک دُبلے، مدقوق جسامت لیکن کاٹ ایسی کہ آدمی دوانچ اچھل جائے۔ یہ فاقہ زدہ فرد مایہ کھٹمل بالکل اس قیدی کے مانند ہوتے ہیں جو حبس بے جا میں گرفتار ہو اور آزاد ہوتے ہی اندیشہ زنگ آلودگی کے سبب اوزار کو استعمال کرے۔ انسان کی شکل دیکھتے ہی ایسے فریفتہ ہوتے ہیں جیسے کئی دن کے کرفیو کے بعد شرابی کو وسکی کی بڑی بوتل مل گئی ہو اور پھر اس مقام پر جہاں آسانی سے لہو فراہم ہو سکتا ہے اپنی نکیلی سوئی چبھو چبھو کر صبح کر دیتے ہیں یہ مشاق اسمگلروں کی طرح پوشیدہ رہتے ہیں اور ہم مایوس پولیس کی طرح ان کی بازیابی کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال ہم کھٹملوں سے بہت نالاں ہیں دیکھئے نا اس مضمون کو لکھتے لکھتے ہم نے کئی بار ادھر اُدھر بڑی بے صبری سے کھجایا ہے اور کئی کھٹملوں کا خون کیا ہے آپ کو بھی پروانۂ قتل دیتے ہیں کہ جہاں جس وقت آپ کھٹمل کو پائیں اسے قتل کر دیں تاکہ جاگنے والے آرام سے سو سکیں۔!

△△

سید ولی قادری*
(حیدرآباد)

کھڑی دعوت

بفے — (BUFFET)

یہ موسم شادیوں کا ہے، ہیں دن اور رات دعوت کے
کبھی کچھ دوستوں کے اور کبھی اہلِ قرابت کے

نہ تھا کچھ کام دفتر کو میں اِک دن آڑ جاتا تھا
سپیئے مثلوں کے بدلے رقعہ پڑھنے میں گزرتا تھا

زمانہ تھا کہ رقعے چھوٹے اور دعوت بڑی ہوتی
مگر رقعے بڑے ہیں آج کل اور دعوتیں چھوٹی

قریبی دوست کی شادی ہے شرکت بھی ضروری ہے
کریں کیا آج کل قسمت میں پیدی اور کچوری ہے

تلاشی جیب کی جب لی ملے پندرہ نئے پیسے
پڑی یہ فکر ہم کو جائیں دعوت میں تو اب کیسے

چلو گیارہ نمبر کی بس کھڑی ہے چل کے جائیں گے
لگے گی بھوک کھل کے خوب اور جی بھر کے کھائیں گے

بالآخر آگئی منزل جہاں پر ہم کو جانا تھا
سویرے ہی مہورت ہوگئی اب صرف کھانا تھا

جمع تھے لوگ سب ہی کرسیوں پر انتظاری میں
جماہی پر جماہی لے رہے تھے بے قراری میں

یہ کمبخت ملین موقع پر ہی "لیٹاں" بجھ گئے سارے
تو ملنے لگ گئے پھر ہاتھ سب اُمید کے مارے

ہوئی جب روشنی سب پر خوشی کی لہر دوڑائی
کہ جیسے آج سب کی خواہشِ دیرینہ بر آئی

اِشارہ میزباں کرتے ہی سب ایسے بڑھے آگے
کدھر ساتھی کہاں کے دوست سب کو چھوڑ کر بھاگے

کوئی یہ کہہ رہا تھا وہ جگہ ہے ہاتھ دھونے کی
"اجی ہم دھو کے آئے ہیں کہاں ہے میز کھانے کی"

بفے جو تھا تو میوزک چیر کی نوبت نہیں آئی
مگر یاں بھی رکابی ہم کو مشکل سے ہی ہاتھ آئی

جو اِک جا بیٹھ کر کھائیں مزہ کیا آئے کھانے کا
بفے میں چلتے پھرتے خوب موقع ہے ٹکانے کا

تکلف برطرف گھس پٹ کے کھاؤ تو ہی کچھ کھاؤ
وگرنہ آپ پہلے آپ کی چکر میں رہ جاؤ

نہیں شاعر مگر احباب کہتے ہیں سنانے کو
ولی کو مل گیا موقع چلو ہنسنے ہنسانے کو

○

* حیدرآباد کے نامور انجینئر

یوسف ناظم

قلمی دوستی

دوستی چاہے قلمی ہو کہ فلمی، بہرحال دوستی ہے۔ دوستی کی کئی قسمیں ہیں مثلاً کاروباری دوستی، پُرخلوص دوستی، سرسری دوستی، گہری دوستی، عارضی دوستی اور مستقل دوستی وغیرہ وغیرہ۔ عاشقی کی طرح دوستی کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی فارمولے کے تحت ہم نے بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ اپنا مختصر سا تعارف ایک مشہور ماہنامہ "اڈبنگ" کو بغرض اشاعت برائے کالم "قلمی دوستی" ارسال کیا اور بطور خاص یہ لکھا کہ جو بھی بہن بھائی ہمیں خط لکھیں گے ہم اوّلین فرصت میں انھیں جواب سے نوازیں گے۔ تقریباً دو ماہ چالیس دن بعد اس ماہنامے میں ہمارا تعارف شائع ہوا۔ ہم بہت خوش ہوئے اور اُمید سے رہنے لگے کہ ایک ہفتہ کے اندر ہمیں ڈھیر سارے خطوط دنیا کے کونے کونے سے موصول ہوں گے۔ ایک ہفتہ گزر گیا، دو ہفتے گزر گئے، اور مہینہ بھی گزر گیا۔ کوئی خط وصول نہیں ہوا اب ہماری آس کی نیّا ڈوبنے ہی والی تھی کہ ایک خط وصول ہوا ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم نے کپکپاتے ہاتھوں سے اُسے کھولا اور لرزتی آنکھوں سے پڑھا۔ چغند پور کے کسی شاعر صاحب کا خط تھا۔ موصوف قلم طراز تھے کہ ان کی اکلوتی غزل دو سال تیرہ ماہ قبل ماہنامہ "اڈبنگ" میں شائع ہوئی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ رسالہ کہیں کھو گیا۔ اس رسالہ کی گمشدگی کا انھیں اس قدر ملال تھا جیسے ان کی اپنی اکلوتی اولاد کا سانحۂ ارتحال ہوا ہو۔ لہٰذا ہم سے گزارش کی گئی تھی کہ کسی طرح وہ شمارہ موصوف کی خدمت میں ارسال کر کے ادب کی خدمت کا سہرا اپنے سر پر باندھ لیں۔

اس سانحہ کے دو چار دن بعد ایک اور خط ملا جو کسی تھکے ہوئے ادیب کا تھا۔ کسی غیر معقول بات پر اُن کی خوشحالی سے جھڑپ چل گئی تھی۔ بیچارے کافی پریشان تھے۔ لکھا تھا کہ اگر ہم مبلغ سو روپے سکۂ ہند بطور اُدھار بھیج کر موصوف کی مدد فرمائیں تو وہ نقد ہمارے ممنون رہیں گے۔ عنقریب ان کی کسی کہانی پر فلم بنائی جانے والی تھی۔ ہم سے دُعا کی درخواست کی گئی تھی کہ فلم جلد بنے اور انھیں اپنی کہانی کا معاوضہ ملے تاکہ وہ ہمارا قرض لوٹا کر قلمی دوستی کی عزت بڑھا سکیں۔

ہماری جملہ کائنات صرف یہ دو خط تھے اور یہ دو خط جس خلوص اور جذبے کے تحت تحریر کئے گئے تھے اس کی وضاحت کی شاید ضرورت نہیں۔

چونکہ ہم جدت پسند اور جدت طراز واقع ہوئے ہیں، اس لیے کچھ دن بعد ہمارے دماغ میں ایک نئی سکیم نے جنم لیا، ایک اچھوتے خیال کی پیدائش عمل میں آئی۔ اور وہ یہ کہ اب کی بار ہم کسی فرضی لڑکی کے نام سے اسی رسالہ میں اپنا تعارف شائع کرائیں گے اور اس طرح دنیا کے کونے کونے سے بے شمار خطوط پانے کی حسرت پوری کریں گے۔ چنانچہ ہم نے اس دفعہ ماہنامہ "اڈنگ" میں جو تعارف چھپوایا تھا وہ کچھ اس طرح تھا۔

نام : نزاکت النساء حور

عمر : سولہ سال

مشغلے : اچھی اچھی کتابیں پڑھنا۔ غزلیں سننا اور قلمی دوستی کرنا۔

پتہ : نزاکت النساء حور معرفت بھونڈے خان صاحب محلہ فلاں تعلقہ چیاں۔

اس طرح ہماری یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور اس بار تیر ٹھیک نشانہ پر لگا۔ اس فرضی تعارف کے شائع ہونے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر کوئی ساٹھ سے زیادہ خطوط ہمیں موصول ہوئے۔ اس کے بعد رفتار کچھ سست ضرور ہوگئی تاہم ہر روز اوسطاً پانچ خط ملتے رہے۔ اور یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا۔ اس طرح اب ہم جملہ (۱۶۵) خطوط کے مالک تھے۔ جن میں (۱۶۰) خطوط مردانہ تھے اور پانچ زنانہ۔ لیکن زنانہ خطوط پاکر ہمیں کوئی خاص خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ خطوط ضرور لڑکیوں کے تھے لیکن کسی نے پیاری بہن نہیں لکھا تھا تو کسی نے عزیز سہیلی! ایک محترمہ نے تو بیٹی نزاکت لکھ دیا تھا۔ ہمیں بے حد غصہ آیا۔ ہمارا حال ان صاحب کی طرح تھا جنھوں نے ایک صبح اپنے دوست سے کہا تھا کہ رات انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ وہ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے ہیں۔ دوست نے کہا کہ پھر تو خوب لطف اٹھایا ہوگا۔ چڑ کر جواب دیا، کیا خاک لطف اٹھاتا خواب میں تو میں خود لڑکی بنا ہوا تھا۔

البتہ لڑکوں کے خط پڑھ کر ساری کوفت جاتی رہی۔ کیا پیارے پیارے خط تھے۔ خط کیا تھے بن بھرے آم تھے کہ لفظ لفظ سے محبت کا شیرا ٹپکا پڑتا تھا۔ اور ان خطوط کے لکھنے والوں کا شمار یقیناً اپنے اپنے علاقہ کے سڑک چھاپ عاشقوں میں ہوتا تھا۔ سارے خطوط کے متن لکھنا تو دشوار ہے البتہ چند خطوط کے اقتباسات ذیل میں درج کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے:

خط نمبر ۱ : یہ کسی شرافت علی حماقت کا خط تھا۔

ڈیر نزاکت! سلام شوق قبول ہو! ماہنامہ "اڈنگ" میں قلمی دوستی کے کالم میں تمہارا تعارف نظر سے گزرا (گزرا نہیں بلکہ نظر میں جم کر رہ گیا اور بیچاری نظر جاتی رہی) ایسا لگا کہ تم میرے لیے قطعاً اجنبی نہیں ہو بلکہ جنم جنم سے تمہارا میرا رشتہ ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو استوار ہونے سے قبل ہی ٹوٹ جاتا ہے پر بھی اسے دنیا اٹوٹ رشتے کے نام سے یاد کرتی ہے ایک ایسا رشتہ جسے بہن، بھائی، باپ، بیٹی، چچا، بھتیجی، ماموں بھانجی اور بھابی دیور جیسے محرمانہ رشتوں کا الزام نہیں دیا جاسکتا بلکہ اللہ توفیق دے تو

ہیر رانجھا، شیریں فرہاد، رومیو جولیٹ اور لیلیٰ مجنوں جیسے خالص عاشقانہ و شاعرانہ ناموں سے نوازا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تم سے التماس ہے کہ تم آگے بڑھ کر "نزاکت حماقت" کی ایک اور جوڑی دنیائے محبت کو دے کے اس SERIES کا اختتام عمل میں لاؤ۔ جانِ حماقت! تم میری ہو، میری ہی رہو گی۔ لگتا ہے تمہیں صرف اور صرف میرے لیے بنایا گیا ہے تم نہیں تو میں نہیں اور میں نہیں تو . . . . (غرض کہ جہاں پاک) اس سے زیادہ کیا بکواس کروں کہ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلفی کا میں قائل نہیں غالباً آپ کو بھی ناپسند ہوگا دیکھئے ناکتنی ملتی جلتی ہے آپ کی اور میری پسند۔ باقی آئندہ۔ خط کا جواب جلد دیجئے۔ جس طرح سرکاری ملازمین کو تنخواہ کے لیے مہینے کی آخری تاریخ کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے اس سے زیادہ مجھے آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ خدا حافظ۔ فقط

آپ کا/آپ کی

حماقت

خط نمبر ۲: لکھنے والے بگڑ پٹھان پوروی

میری بے حد پیاری اور ناز سے بھی نازک نزاکت! بعد قدم بوسی واضح ہو کہ یہاں ہم سب خیریت سے رہ کر خدا وندِ کریم سے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ دیگر یہ کہ ماہنامہ "اڑنگ" میں آپ کا تعارف پڑھ کر جملہ کوائف سے آگاہی ہوئی۔ عالیجاہ! فدوی جو مشہور شاعر ہے، تادمِ تحریر کنوارا ہے۔ عمر ۱۸ سال پیشہ قلمی دوستی وطن کافی دور حال مقیم پٹھان پور۔ شادی کو نیشنل آبادی کا چکر چل رہا ہے۔ گلاب کی حفاظت کے لیے قدرت نے اگر کانٹے بنائے ہیں تو نزاکت کی حفاظت کے لیے لگتا ہے اس بگڑ کو وجود بخشا گیا ہے۔ اگر آپ اس رشتہ کے لیے راضی ہیں (اور یقیناً ہوں گی بھی کہ اس سے اچھا رشتہ اور ملِ بھی کہاں سکتا ہے) اور خود کو مابہ دولت کے قابل سمجھتی ہیں تو فوراً ہاں کر دیجئے کہ یہ جوڑی خوب سجے گی۔ چونکہ برسات کا موسم قریب ہے، فوراً اثبات میں اس خط کا جواب دیجئے تاکہ برسات سے قبل ہی شادی کی تاریخ مقرر کی جا سکے۔ فقط

جانِ نزاکت

بگڑ

خط نمبر ۳: لکھنے والے خزاں بیکار پوروی

جانِ خزاں، جگ جگ جیو! تم سلامت رہو ہزار برس: ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار —!! بلکہ تمہیں میرے رقیبوں کی بھی عمر لگ جائے (آمین) ناچیز کا تخلص خزاں ہے اور غریب خانہ کا تخلص جنت کدہ ہے۔ اور یہ جنت حور کے بغیر نامکمل ہے۔ اس لیے زحمت نہ ہو تو یہاں قدم رنجہ فرما کر "جنت کدہ" کو واقعی جنت کدہ بنا کر غریب خانہ کو اس کے فعل اور قول میں یکسانیت پیدا کرنے کا موقع فراہم فرمائیں اور اس خزاں کی زندگی میں بہار بن کر چلے آیئے تاکہ ہماری زندگی کے گلشن میں وہ لگا وٹ کہ پھول کھے پھول کھل اٹھیں جن کی مہک سے مشام پڑوس ہی نہیں مشامِ محلہ تک مبتلائے آزار ہو۔ اپنی ایک تازہ نوٹی تحریر جو یہاں ادبی حلقوں میں کافی پسند کی گئی، ارسالِ خدمت ہے، یقیناً آپ کی فشن پرور لگا ہوں سے بھی

اد پسندیدگی حاصل کرے گی۔ فقط پیشگی میں آپکا

خزاں بیکار پوری

خط نمبر ۴ : لکھنے والے سیٹھ رستم نحیف، تونگر

میرے سپنوں کی رانی، خوابوں کی شہزادی اور خیالوں کی ملکہ! تم ہی سوچو کہ تمہارا نام ہی اس قدر خوبصورت ہے تو پھر تم کتنی خوبصورت ہوگی۔ اس خیال نے میری رات کی نیندیں مجھ سے چھین لی ہیں۔ البتہ دن بھر آرام سے سوتا پڑا رہتا ہوں) اور میری اکلوتی آنکھ کو رت جگا عطا کر رکھا ہے۔ نہ کھاتا ہوں پیتا ہوں۔ حالت بہت نازک ہوگئی ہے لگتا ہے وقتِ اخیر آ پہنچا ہے۔ تین دن سے گلوکوس پر ہوں اکثر مایوس ہو گئے ہیں اور گورکن حضرات اُمید سے ہیں۔ اُمید کہ آپ مجھے اپنا کر رتجگا کی جگہ میری آنکھوں کو دن جگا عطا فرمائیں گی۔ فقط۔

رستم نحیف!

خط نمبر ۵ : لکھنے والے زردار خاں فلاں

اے آسمانِ قلمی دوستی کے درخشاں ماہتاب، نزاکت انساء حور صاحبہ! اپنے نام، عمر اور مشاغل کے ساتھ ادنیٰ سے پرستار کا سلام قبول کیجئے! یہ جان کر از حد مسرت ہوئی کہ آپ کو قلمی دوستی کا اعلیٰ ذوق ہے مطلع عرض ہے کہ اس خاکسار کو بھی بچپن سے قلمی دوستی کرنے کا (صرف لڑکیوں سے) بے حد شوق ہے! اس طرح خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے چار۔ کیونکہ پہلے ہی ہمارے ہاتھ دو دفعہ پیلے ہو چکے ہیں اور دونوں ازواج حیات ہیں۔ اس کے باوجود ہمارا تازہ فوٹو ذریعہ ھذا ارسالِ خدمت ہے۔ خامیاں ہوں تو اصلاح کی پوری اجازت ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ہم کسبِ معاش کے سلسلہ میں باہر گاؤں میں مقیم ہیں اللہ نے ہمیں وہ دولت عطا کی ہے کہ لوگ ہمیں اسم بامسمیٰ کہتے ہیں۔ کہئے آپ کی کیا خدمت کروں۔ آپ کے ہاں ٹیپ ریکارڈر تو ہوگا ہی لہٰذا تازہ غزلوں کے چند یاسی CASSETES ارسال کر رہا ہوں۔ گھر سے باہر مت نکلا کرو کہ زمانہ خراب ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے غزلیں سنتی رہو۔ اور اگر خدانخواستہ گھر میں ٹیپ ریکارڈر نہیں ہے تو مطلع کریں وہ بھی ارسال کر دیا جائے گا۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ ہر ہفتہ پابندی سے کم سے کم ایک خط لکھتے رہیں۔ فقط آپکا! فلاں

اِسی طرح کے اور بھی بہت سارے خطوط ہمارے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب نے کچھ کتابیں بھیجیں۔ ایک صاحب نے مالی تعاون سے نوازنا چاہا اور دریافت کیا کہ کتنی رقم بھیجیں۔ ہم نے جواب میں عرض کیا کہ حضور! یہ ماہِ صیام ہے۔ اگر یہی رقم دینی امور میں خرچ کریں تو طرفین کے لیے باعثِ نجات ہوگا۔ ہمیں پیسوں کی کیا ضرورت! آپ سلامت رہیں ہمارے لیے یہی کافی ہے۔ (سر سلامت تو جوتے ہزار) ہمارے اس جواب سے بیچارے کافی متاثر ہوئے اور بڑے ہی فخر سے لکھا کہ اس کم عمری میں ہمارے خیالات کتنے اونچے اور پاکیزہ ہیں اور یہ کہ ان کے والدین بھی ہی نیک خیالات والے ہوئے ہوں گے، ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح شوخ، مزاحیہ، دل پھینک اور سڑک چھاپ عاشقوں کے ڈھیر سارے خطوط ہمارے سامنے رکھے ہوئے ہیں اور ہم یہ شعر گنگناتے رہتے ہیں:

بنا کر حسینوں کا ہم [illegible] تماشائے اہلِ ہوس دیکھتے ہیں

انور سدید (لاہور)

"سدیدیات"
روزنامہ "حریت" لاہور

اہل لاہور نے طنز و مزاح کانفرنس کراچی کا فیض حاصل کیا

پروفیسر حمید الدین شاہد صاحب نے طنز و مزاح کانفرنس کراچی میں منعقد کی لیکن اہل لاہور کو اس کانفرنس کے فیض سے محروم نہیں رکھا۔ یوں سمجھیے کہ ایک بڑی طنز و مزاح کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی ایک چھوٹی طنز و مزاح کانفرنس لاہور میں منعقد کر لی گئی۔ چھوٹی اس لیے کہ اس میں شرکاء کی تعداد کراچی کانفرنس کی بہ نسبت کم تھی نیز اس کانفرنس کو بلا اطلاع منعقد کیا گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لاہور کی طنز و مزاح کانفرنس زمین سے اس وقت خود بخود اُگ آئی جب شگوفہ کے مدیر سید مصطفےٰ کمال نے اور ہندوستان کے منفرد مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے لاہور میں قدم رنجہ فرمایا۔ اور یہ دونوں اصحاب جس محفل میں بھی گئے ایک مزاح کانفرنس خود بخود مرتب ہوتی چلی گئی، گویا لاہور کی طنز و مزاح کانفرنس میں جلسے کی جگہ معین نہیں تھی۔ بلکہ یہ مصطفےٰ کمال اور مجتبیٰ حسین کے ساتھ ہی گھومتی پھرتی رہی اور یہ دونوں جہاں جاتے مجمع اکٹھا ہو جاتا۔ لوگ اس پر کانفرنس کا گمان کرتے۔

لاہور کی طنز و مزاح کانفرنس کا ایک جلسہ ڈاکٹر وحید قریشی کے کمرے میں ہوا۔ اتنے میں مجلس ترقی ادب کے ناظم صاحب تشریف لے آئے، ان کی آمد پر یہ جلسہ ان کے کمرے میں منتقل ہو گیا۔ ہمارے لیے یہ علاقہ ممنوعہ ہے لہٰذا ہم نے ان مجالس میں پڑھے جانے والے لطیفے نہیں سنے۔ ہاں ان لطیفوں پر اُٹھنے والے قہقہوں کی آواز ضرور سنی ہے اور یہ اتنے پرشور تھے کہ ان میں ڈاکٹر وحید قریشی کا قہقہہ دب گیا۔

ایک چھوٹی سی مزاح کانفرنس جاوید طفیل مدیرِ نقوش کے کمرے میں منعقد ہوئی۔ اور مصطفےٰ کمال جب ہمارے کمرے میں تشریف لائے تو گویا ایک تقریب وہاں بھی خود بخود منعقد ہو گئی ہم اسے خوف فساد خلق سے کانفرنس نہیں کہتے ابھی ابھی جناب سے اطلاع ملی ہے کہ ایک رسمی تقریب خورد و نوش شیزان میں بھی منعقد کی گئی۔ لیکن طنز و مزاح کانفرنس کے بجائے تقریب مطالبات بن گئی۔ اس محفل میں گفتگو کچھ اس قسم کی ہوئی کہ شیزان سے تین میل کے فاصلے پر سوئی گیس کی پائپ لائن پھٹ گئی جس کے شعلے پورے لاہور میں دیکھے گئے۔

سید مصطفےٰ کمال سے یہ ہماری پہلی ملاقات تھی، اس سے قبل ہم نے ان کو صرف "شگوفہ" دیکھا تھا اور ان کا نام سنا تھا۔ ملاقات ہوئی تو انھیں جیسا دیکھا تھا ویسا ہی پایا۔ یعنی اوپر سے اخروٹ کی طرح سخت، اندر سے مغز اخروٹ کی طرح

شیریں اور لذیذ، ہم نے انھیں بادام سے دانستہ تشبیہ نہیں دی کیوں کہ بادام اندر سے کبھی کبھی کڑوا بھی نکل آتا ہے لیکن اخروٹ کھوکھلا ہو سکتا ہے۔ اور مصطفےٰ کمال نے جب بتایا کہ وہ ۱۹۶۷ء سے طنز و مزاح کا رسالہ شگوفہ باقاعدگی سے چھاپ رہے ہیں اور دکھی انسانیت میں قہقہے تقسیم کر رہے ہیں، تو وہ ہمیں مصلح قوم نظر آئے۔ جو ذہنی تشنج دور کرکے لوگوں کو مسکرانے کی دعوت دیتا ہے اور گرانباری دفع کر ڈالتا ہے۔

مصطفےٰ کمال کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے ستّرہ سال کے اس عرصے میں نہ صرف شگوفہ شائع کیا، اور اس کے مخصوص نمبر مرتب کئے بلکہ طنز و مزاح لکھنے والوں کی ایک جماعت بھی پیدا کی اور اگر یہ کہا جائے کہ "اودھ پنچ" کے بعد شگوفہ "ایک ایسا مزاحیہ جریدہ ہے، جو نئے لکھنے والوں کے لیے نہ صرف زبان کا کام ہی نہیں دیتا۔ بلکہ ان کے فن کو پروان بھی چڑھاتا ہے۔ اور انھیں طنز و مزاح کی بالائی منزل پر بھی پہنچا دیتا ہے۔ تو یہ بالکل سچ ہوگا۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال لو اس عہد کا منشی سجاد سمجھیے جنھوں نے شگوفہ کے صفحات پر ہماری ملاقات یوسف ناظم، برق آشیانوی، نریندر لوتھر، مسیح انجم شفیقہ فرحت، بھارت چندکھنّہ، پرویز یداللہ مہدی، رشید قریشی، شکیل اعجاز، رحمٰن اکولوی، فیاض افسوس معین اعجاز اور نہ جانے کتنے اور مزاح نگاروں سے کرائی، ہم ان مزاح نگاروں کے نام سے اور ایک آدھ تصنیف سے ہی شناسا تھے لیکن مصطفےٰ کمال سے باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ تو اردو طنز و مزاح کی انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ ہند و پاک کے سب مزاح نگار، اُن کے کارنامے اور ان کی تصنیفات ان کی نوک زبان پر تھیں اور یوں لگتا تھا کہ ابھی ابھی طنز و مزاح پر پی ایچ ڈی کرکے آئے ہیں اور اپنا تھیس حفظ کر رکھا ہے تا کہ امتحان میں ناکام قرار نہ دیئے جائیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب وہ کسی ہندوستانی مزاح نگار کی کتاب کا نام لیتے تو ہمیں اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی پر افسوس ہوتا اور ہم سارا بوجھ ہند و پاک کی حکومتوں پر ڈال دیتے جو کتابوں کے آزادانہ تبادلے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہیں، مصطفےٰ کمال نے یہ تاسف دیکھا تو ایک جملہ ایسا ارشاد کیا کہ ہم غنچۂ نو شگفتہ کی طرح کھل اُٹھے لیکن اس شعر کا دوسرا مصرعہ کہا تو ہم مائل بہ گریہ ہو گئے۔

یہاں پہنچ کر قارئین کرام ہم سے سوال کر سکتے ہیں کہ ہم پہلے ہنسے کیوں اور پھر روئے کیوں؟ جواباً عرض ہے کہ مصطفےٰ کمال صاحب نے فرمایا تھا کہ "میں آپ کے لیے حیدرآبادی مزاح نگاروں کی چند کتابیں لایا ہوں"۔ یہ بات ایسی تھی جس پر غنچۂ دل کھل گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُنھوں نے کہہ دیا کہ میں یہ کتابیں چھوڑ آیا ہوں۔ اسی پر غنچۂ دل کا مرجھانا ضروری تھا۔ لیکن اسے مصطفےٰ کمال کا کمال سمجھیئے کہ انھوں نے ہمیں مرجھانے نہیں دیا بلکہ ہمارے سامنے اپنی کار سے شگوفہ کا طنز و مزاح نمبر (ہندوستانی) نکال کر رکھ دیا اور خود رخصت ہو گئے۔ اب تین دن ہو گئے ہیں، ہم یہ نمبر پڑھ رہے ہیں اور مسلسل قہقہے بار ہیں۔

اب تک ادبی جرائد نے جو طنز و مزاح نمبر شائع کئے ہیں ان میں نقوش، لیل و نہار اور ساقی کے خاص نمبر یادگار ہیں ایک طنز و مزاح نمبر کراچی کے ایک کالج کے ایک رسالے نے بھی شائع کیا تھا جس کی بازگشت دور دور تک سنی گئی تھی۔ لیکن شگوفہ کے طنز و مزاح نمبر کی خاص بات یہ ہے کہ یہ صرف ہندوستانی مزاح نگاروں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ دوسرے صرف نثری مزاح تک محدود رکھا گیا ہے۔ ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کی متعدد دوسری زبانوں کے طنز و مزاح کی ایک کتابیات بھی پیش کر دی گئی ہے طنز و مزاح کے موضوع پر ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر عبدالمغنی سے گفتگو کی ہے اور اسے شگوفہ میں پیش کر دیا ہے۔ ایک سوالنامے پر محمد حسن صاحب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، نثار احمد فاروقی اور شمس الرحمٰن فاروقی سے جوابات حاصل کئے گئے ہیں اور اسے عنوان دیا گیا ہے

لکھتے ہیں تجھ کو اہلِ نظر غائبانہ کیا"۔ یہ واحد شعری پیروڈی ہے جو نثری طنز و مزاح کے اس جریدے میں در آئی ہے آپ اسے مدیر کی مروت قرار دے سکتے ہیں۔

ہم نے یہ اجمال اس لیے پیش کیا ہے کہ آپ مصطفےٰ کمال کی محنت کی داد دے سکیں ہمارا ارادہ آپ کو ان مسرتوں میں شریک کرنا تھا جو مصطفےٰ کمال نے شگوفہ کے اس نمبر کے ذریعہ مفت تقسیم کی ہیں، لیکن جگہ کی قلت مانع ہے لہٰذا اب فقط اس بات پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس پرچے کے مہمان مدیر یوسف ناظم ہیں اور انھوں نے اپنے شوخ و شنگ انداز میں "اداریہ" ہی نہیں لکھا بلکہ" اُردو ظرافت نگاری" کے موضوع پر ایک کتاب بھی شامل اشاعت کی ہے۔ ان کی یہ سب چیزیں قابلِ داد ہیں لیکن خصوصاً باقر مہدی کا خاکہ ہے جس کے چند اقتباسات پیشِ خدمت ہیں ملاحظہ کیجیے کہ یوسف ناظم پھول کی چھڑی سے تلوار کا کام کس طرح لیتے ہیں، وہ تہہ تیغ کرتے ہیں لیکن چیخ نکالنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اب خاکے کا اقتباس پڑھیے۔

باقر مہدی صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے جگر مرادآبادی مرحوم کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرتے سنا تھا، جگر مرادآبادی کے مرنے میں جو کسر باقی رہ گئی تھی باقر مہدی صاحب نے اپنی تقریر سے پوری کر دی، باقر مہدی روایت شکن آدمی ہیں اتنے روایت شکن کہ ان کی پیشانی ہر وقت شکن آلود رہتی ہے۔ یوں بھی نقاد کو تنقید کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیئے چاہے موقع تعزیت کا ہو یا تہنیت کا باقر مہدی صاحب کے متعلق میں نے دو رائیں کبھی نہیں سنیں، پورا ہندوستان یعنی غیر منقسم ہندوستان اس بات پر متفق ہے۔ کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں اس سے زیادہ ظالم ہیں۔ ان کی بے باکی اور سفاکی میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ شامت کا مارا جو بھی ادیب اور شاعر بمبئی آتا ہے باقر مہدی کی مزاج پرسی کے لیے اس کے وطن تک جانے سے گریز نہیں کرتے، اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ کہ ان کے قلم یا زبان سے کسی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہ نکل جائے۔ وہ ادب کے کسی موضوع پر ایک مدلل اور مبسوط مضمون لکھ کر اس کی مخالفت میں دوسرا مدلل مضمون لکھ سکتے ہیں"۔ ۔ ۔ لیجیے ورق تمام ہوا اور اس کے ساتھ ہی ہم باقر مہدی کے ذکرِ خیر پر تمت بالخیر کرتے ہیں۔ ۵

الزماں قمر
(بہار)

مشاعرہ کا انعام

محفلِ شعر و سخن کے ختم ہو جانے کے بعد — کس نمی پرسد کہ بھائی آپ کا کیا ہے حال
نیند سے بوجھل ہیں آنکھیں، بے قرار پیٹ میں — ڈگمگاتے ہیں قدم، بہکی ہوئی ہے سب کی چال
باقیٔ محفل ہوا روپوش، سب کو چھوڑ کر! — کس طرح ایسے میں حل ہو اب کرایہ کا سوال
پڑھ رہا تھا ایک شاعر جو ترنم سے غزل — کوئی لمپٹ لے اُڑا، اُس کی بیاضِ بے مثال
ٹوپی چشمے اور جوتے بھی کئی غائب ہوئے — سب کے سب ہیں فرقتِ اسباب کے غم سے نڈھال
رات کے پچھلے پہر میں روشنی بھی سو گئی — سرد ہے چولہا دلوں کا اور تخیل میں زوال
اُس پہر کا کلہ ہے عالم اور خالی ہے شکم — داد محفل کے سوا معدے میں چاول ہے نہ دال
گرچہ تالی اور نعرے سے بھی خاطر کی گئی — جب نشہ جاتا رہا دیکھے گئے سب خستہ حال
اُس اندھیری رات میں سوجھی سبھوں کو دور کی! — بیٹھ کر غزلیں سنائیں اور شیں اہلِ کمال
اور جب آثار ہوں ظاہر طلوعِ شمس کے — سوئے اسٹیشن چلیں سر پر اٹھائے ہولڈال

اتنی درگت پر جسے ہو شعر خوانی کی ہوس
اے قمر بے دال کا بودم ہے وہ بے قیل و قال

منہ پھٹ ناگپوری

غزل

راہ خستہ، ریل کی پٹری خراب — ہو گئی ہے اب مسافت اِک عذاب
چور اُچکوں کو لکھو عالی جناب — اِس کو کہتے ہیں سیاسی انقلاب
یہ ہیں جن کے پاس، وہ ہیں کامیاب — مال، موٹر، وارڈ بنگلہ اور شباب
سود کے پیسوں سے ہے نذر و نیاز — اللہ اللہ جذبۂ کارِ ثواب
اب اکھاڑہ ہوگا ہر اسکول میں — اب اُگیں گے کارخانوں میں گلاب
منتری کا چانس ہر اک کو ملے — سال میں دو مرتبہ ہو انتخاب
اک سیہ رُو بچہ پیری میں ہوا — نام رکھا میں نے اُس کا آفتاب
میں تجھے ہرگز سکھا دوں گا مگر — پہلے اے شاگرد! مرے پاؤں داب
مال اگر ہوتا تو ہوتے منتری — مفلسی نے کر دیا خانہ خراب

S.E.M. کی بِل گئی پدوی انھیں
ہو گئے منہ پھٹ بھی اب عزت مآب

تمنا مظفرپوری

بیگم کا گھریلو بجٹ

ریڈیائی ڈرامہ

کردار :۔

فیاض ۔ (شوہر)

زینت ۔ (بیوی)

منظر :۔ ڈرائنگ روم اور ایک بیڈ روم پر مشتمل نچلے متوسط طبقے کا مکان۔ ڈرائنگ روم میں ایک طرف کھانے کا ٹیبل لگا ہے ایک طرف بہت ہی معمولی قسم کا صوفہ سیٹ ڈیزائن کی کرسیاں ہیں سامنے دیوار پر فیاض کی شادی کی تصویر ہے جس میں اس کی دلہن بھی ساتھ ہے۔ ایک طرف کونے میں چھوٹے سے ٹیبل پر ٹو۔ ان۔ ون رکھا ہوا ہے۔

(زنجیر کھٹکھٹانے کی آواز)

آواز : کھٹ کھٹ ۔ کھٹ کھٹ ۔

زینت : (دُور سے آواز شاید کچن سے آتی ہے) آرہی ہوں آرہی ہوں۔

آواز : کھٹ کھٹ

زینت : (ڈرائنگ روم میں داخل ہوجاتی ہے) کھولتی ہوں۔ (دروازے کے پاس پہنچ کر) کون؟

آواز : میں فیاض۔

زینت : اوہ آپ (دروازہ کھولتے ہوئے) آج بہت دیر ہوگئی۔ لائیے یہ بریف کیس مجھے دیجئے اور آپ جاکر فریش ہولیں جب تک میں چائے لاتی ہوں۔

فیاض :۔ (بریف کیس بیوی کو دیتے ہوئے) جو حکم سرکار کا۔

(فیاض بغل کے باتھ روم میں داخل ہوجاتا ہے زینت کچن کی طرف چلی جاتی ہے۔ غسل خانے سے فیاض کے گانے کی آواز آتی ہے)

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہانا چاہئیے
ساتھ میں بیگم کو بھی لانا چاہئیے

(سامنے کے دروازے سے زینت ٹرے میں ناشتہ اور چائے لئے آتی ہے اور صوفہ سیٹ کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیتی ہے۔ پھر غسل خانے کے قریب پہنچ کر بولتی ہے)

زینت :۔ کیوں صاحب! آپ آرام کر رہے ہیں یا گانے کی ریکارڈنگ کرا رہے ہیں۔

فیاض :۔ بس آیا ابھی (دروازہ کھول کر باہر نکلتا ہے اور بیوی کے بالکل قریب سامنے کھڑا ہوجاتا ہے

فیاض :۔ ہاں اب فرمائیے کیا حکم ہے آپ کا۔

زینت :۔ چلئے چلئے (ہنستے ہوئے) ناشتہ کیجئے ورنہ چائے ٹھنڈی ہوجائے گی۔

(دونوں چل کر اس صوفے تک آکر ...

فیاض : (ایک پکوڑی اُٹھاتے ہوئے) پہلے یہ گرم گرم پکوڑی میرے ہاتھ سے آپ منہ میں تو لے لیجیے۔

زینت : (نفی میں سر ہلاتے ہوئے) اوں ہوں۔

فیاض : (ضد کرتا ہے) نہیں آپ کو لینی ہی ہوگی پھر میں کھاؤں گا۔

زینت : ٹھیک ہے۔ تو پھر آپ ہی کھلا دیجیے (بیوی منہ کھول کر شوہر کی طرف بڑھا دیتی ہے) اوہوں آ آ۔

فیاض : شاباش۔ یہ ہوئی کام کی بات بلکہ پیار کی بات۔

زینت : (پکوڑی چباتے ہوئے) آج پہلی تاریخ ہے نا۔

فیاض : بالکل۔

زینت : تنخواہ مل گئی۔

فیاض : (منہ میں پکوڑی ڈالتے ہوئے سر ہلاتا ہے) ہاں آں۔

زینت : تو پیسے مجھے دے دیجیے۔ آج سے گھر کے اخراجات میں خود چلاؤں گی۔

فیاض : (گرم گرم پکوڑی سے منہ کو جلنے سے بچاتے ہوئے) یعنی خانہ داری کی مکمل ذمّہ داری آپ لیں گی۔

زینت : ہاں! بات یہ ہے کہ آپ بہت شاہ خرچ ہیں اور مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہے آپ ہیں کہ بجٹ پر دھیان نہیں دیتے۔ اب بے بی کی شادی کی بھی فکر کرنی ہے۔

فیاض : (اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) بالکل بالکل۔

زینت : اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اخراجات میں کمی کر کے بچت کروں گی۔

فیاض : بات تو ٹھیک ہے۔ اور جہاں تک بچت کا سوال ہے بیٹی کی شادی کے لیے مستقل ماہانہ ڈپازٹ کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ بچا کر جمع کر رہا ہوں۔

زینت : کچھ نہ کچھ بچانے سے کام نہیں چلے گا۔ بیٹی کو کنوارا باندھ کر بٹھانے کا ارادہ ہے کیا۔

فیاض : لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ (چائے کی پیالی اُٹھا لیتا ہے) مگر یہ بھی تو سوچو کہ صحت اور تندرستی کے لیے اچھی غذا ضروری ہے۔ اور میں کوئی بے جا خرچ بھی نہیں کرتا۔

زینت : سب ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کے خرچ کرنے کا ڈھنگ ٹھیک نہیں ہے۔

فیاض : (چائے کی جو چسکی لے رہا تھا اسے روک کر) خرچ کرنے کا ڈھنگ نہیں ہے وہ کیسے؟

زینت : آج معاشیات کی پروفیسر بیگم زمانی آئی تھیں۔ باتوں باتوں میں بجٹ کی بات آ گئی۔ انھوں نے گھریلو بجٹ کے متعلق بھی تفصیل سے بتایا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔

فیاض : تو کیا آج تک آپ کی آنکھیں بند تھیں۔

زینت : پھر وہی مذاق! میں اس وقت بہت سنجیدہ باتیں کر رہی ہوں۔

فیاض : بہت اچھا صاحب! ہاں تو انھوں نے کیا کیا بتایا!

زینت : یہی کہ بجٹ بنا کر خرچ کرنے سے گھر کا کاروبار ٹھیک سے چلتا ہے۔ فضول خرچی نہیں ہوتی۔

فیاض : بجٹ پر سختی سے عمل کیا جائے گا تب ہی نا۔

زینت : ہاں۔ بیگم زمانی نے بتایا کہ پڑھے لکھے لوگ بجٹ بنا کر ہی خرچ کرتے ہیں اور خوش حال زندگی بسر کرتے ہیں۔

فیاض : (چائے کی پیالی رکھ کر) بجٹ بنا کر خرچ کرنا اچھی بات ہے۔ مگر آپ یہ اچھی طرح سوچ لیں۔ گھر کی پوری ذمہ داری آپ لے رہی ہیں۔ . . . اور اس میں اکثر و بیشتر آپ کو پریشانی بھی ہوگی۔

زینت : ہاں ہاں! میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے بلکہ اس ماہ کا بجٹ میں نے بنا بھی لیا ہے۔ (آنچل سے پرزہ کھولتے ہوئے) یہ دیکھیے۔

فیاض: واہ! آپ کا یہ بجٹ آنچل سے بندھا ہے! اچھا لائیے۔ دیکھوں تو کیا بجٹ بنایا ہے آپ نے

زینت: [ایک پرزہ شوہر کے حوالے کرتے ہوئے] یہ لیجیے۔

فیاض: [بجٹ پر اک نظر ڈال کر] اچھا صاحب! خرچ کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔

زینت: آپ کی تنخواہ اور بھتّے۔

فیاض: مگر یہ تنخواہ گھر بیٹھے تو نہیں ملے گی۔

زینت: مطلب —!

فیاض: مطلب یہ کہ اس کے لیے مجھے دفتر جانا ہوگا اور جانے آنے کے لیے رکشے کا کرایہ بھی دینا ہوگا۔ لیکن آپ کے بجٹ میں میرے روزانہ کے اخراجات ہی سرے سے غائب ہیں۔

زینت: ارے! [تعجب سے] دیکھوں تو [وہ جھٹ سے شوہر سے کاغذ چھین لیتی ہے اور دیکھتی ہے] ذرا اپنا قلم دیجیے گا!

فیاض: یہ لیجیے قلم

زینت: رکشے کا کرایہ کتنا لگتا ہے۔ دو روپے نا۔

فیاض: چائے وغیرہ کا بھی خرچ ہے اور پھر وقت ناگہانی کے لیے بھی جیب میں پیسے چاہئیں۔

زینت: تین روپے روز رکھ دیتی ہوں منظور ہے۔

فیاض: جیسی آپ کی مرضی۔

زینت: ہاں تو ایک ماہ میں چار پانچ اتوار اور ایک دو دن چھٹی بھی ہوتی ہے۔ اور کسی کسی روز آپ اپنے دوستوں کے اسکوٹر سے بھی آجاتے ہیں۔

فیاض: اور آنے سے پہلے ہوٹل میں چائے ناشتے کا بل بھی ادا کرتے ہیں۔

زینت: آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے!؟

فیاض: یہی کہ اس مد میں بغیر کٹوتی کئے کم از کم سو روپے ماہانہ رکھنا ہوگا۔

زینت: [تعجب سے] سو روپے ماہانہ [قلم اپنے دانتوں تلے دبا لیتی ہے پھر لکھنے لگتی ہے] اچھا چلئے لکھ دیا سو روپے ماہانہ خرچۂ آمد و رفت دفتر۔

فیاض: اس حاتمانہ فیاضی کے لیے شکریہ! ہزار بار شکریہ۔ اب لائیے اپنا بجٹ میں ٹھیک سے دیکھ لوں۔ [فیاض بیوی سے کاغذ لے لیتا ہے] چاول ۲ کلو قیمت ۸ روپے۔ گیہوں ساٹھ کلو۔ قیمت ایک سو بیس روپے۔ چینی ۶ کلو، چائے بچوں کا اسکول فیس [آواز دھیمی ہوتی جاتی ہے] دھوبی، بجلی کا بل یہ اور وہ۔ ہاں... ہاں ٹھیک ہے۔ [قدرے زور سے] بہت خوب، بہت بہتر بجٹ بنایا ہے آپ نے! ارے ہاں منّا کہاں ہے؟

زینت: وہ بے بی کے ساتھ پڑوس میں گیا ہوا ہے۔

فیاض: اس کی کھانسی کا کیا حال ہے؟

زینت: اجی وہ بچارا کھانسی سے بُری طرح پریشان ہے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھلا کر دوا لا دیجیے۔

فیاض: لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مد میں آپنے کوئی خرچ دکھلایا ہی نہیں ہے۔

زینت: اُفوہ —! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخراجات آپ خود کریں۔ [تیوری چڑھا کر] میرے ہاتھ میں پیسے دیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

فیاض: نہیں بیگم —! ایسی بات نہیں۔ دراصل آپ کا یہ بجٹ ناقص ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ میں خانہ داری دینے سے پہلے آپ کا یہ بجٹ ٹھیک کر دوں۔ آمدنی کے لحاظ سے بجٹ بنے۔ کوئی مد باقی نہ رہے تاکہ بعد میں آپ کو پریشانی اور پشیمانی کا سامنا نہ کرنا پڑے لائیے دوسرا کاغذ میں نیا بجٹ بنا دوں۔ پھر آپ شوق سے خانہ داری چلائیے گا۔ [پردہ گرتا ہے]

صبح دس بجے کا وقت ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے تو اُسی ڈرائنگ روم میں فیاض آفس جانے کے لیے تیار کھڑا ہے)

فیاض : کہاں ہو بھئی۔ لنچ بکس جلد دینا۔ اب وقت کم رہ گیا ہے۔

زینت : (کچن سے) لا رہی ہوں۔ ابھی آئی۔ (دروازے سے داخل ہوتی ہے) یہ لیجیے۔ لنچ بکس۔

فیاض : (لنچ بکس لیتے ہوتے) اس میں کیا ہے بیگم! آپ روزانہ ایک ہی قسم کی سوکھی چیز دیدیتی ہیں۔ غرضیکہ میں کسی طرح زہرمار کیا کرتا ہوں بچت ہورہی ہے مگر اب یہ روکھا سوکھا ٹفن میں کھا نہیں پاتا۔ کم از کم غذا تو اچھی کھلائیے ورنہ تندرستی پر اس کا اثر پڑے گا۔ ہوں — آپ اتنی خاموش کیوں ہیں۔ کیا کوئی تکلیف ہے آپ کو۔

زینت : (خوش دلی سے) جی نہیں۔ آپ جائیے دیر ہورہی ہے۔

فیاض : خدا حافظ (فیاض دو تین ہی قدم آگے بڑھتا ہے کہ زینت روکتی ہے)

زینت : سنیے تو۔

فیاض : (رکتے ہوئے) جی! کیا بات ہے؟ میں پہلے ہی محسوس کر رہا تھا کہ آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر خاموش ہو جاتی ہیں۔

زینت : کچھ روپے کی ضرورت ہے۔

فیاض : روپے —؟ (تعجب سے) مگر روپے کہاں سے آئیں گے۔ ابھی تنخواہ میں دس دن ہیں۔

زینت : پاس بک سے نکال لیجیے نا —!

فیاض : پاس بک سے (حیرت سے) بیگم ایک پاس بک میعادی ہے اور سنی کی شادی کے لیے جمع ہے دوسری میں پیسے کہاں! وہ تو تنخواہ جمع کرنے کے لیے تھا جس سے نکال کر خرچ کیا کرتا تھا، اور جو کچھ بچت ہوتی تھی اسے نکال کر میعادی پاس بک میں رکھ دیتا تھا۔ اس بار اس میں جمع ہی نہیں ہوا تو نکالوں گا کیا —؟

زینت : اور کوئی صورت؟

فیاض : آخر آپ کو پیسے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ کیا آپ کا بجٹ فیل ہو گیا۔ آپ تو بچت کرنے والی تھیں نا!

زینت : (اٹک اٹک کر) بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک روز سودا سلف لانے بازار جا رہی تھی ساتھ میں منی کی ماں بھی تھیں۔

فیاض : کون منی کی ماں؟

زینت : بغل والی۔ ان کو ساڑی خریدنی تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ دکان تک چلی گئی کہ بازار بھاؤ دیکھوں۔

فیاض : (تعجب سے) اچھا۔

زینت : ہاں! منی کی ماں نے بہت ہی سستے دام میں بالکل لیٹسٹ ڈیزائن کی ایک ساڑی خریدی۔

فیاض : کتنے میں!

زینت : ایک سو چالیس روپے میں بہت ہی خوبصورت ساڑی تھی۔ مجھے بھی وہ ڈیزائن بہت پسند آیا۔ سوچا آئندہ ملے یا نہیں سو میں نے بھی ایک ساڑی خریدلی۔

فیاض : ایک سو چالیس روپے میں!

زینت : ہاں! منی کی ماں نے بھی زور دیا کہ خریدلو بہن۔ روز روز ایک ہی ساڑی پہن کر بازار نکلتی ہو اچھا نہیں لگتا۔

فیاض : بیگم صاحبہ! آپ کو یاد ہونا چاہیے تھا کہ میں کپڑے اور دوسرے سامان کی خریداری

بولیں اور مجھ پر جو الاؤنس ملتے ہیں اس سے کیا کرتا ہوں ـ خیر چلو ایک سو چالیس روپے میں دیدوں گا۔

زینت : لیکن ـ!

نیاض : اب کیا ہے؟

زینت : اس کے علاوہ اور بھی خرچ ہوگیا ہے۔

فیاض : وہ کیا؟

زینت : آپ نے کئی بار کہا تھا کہ آنکھ کے نیچے سیاہ داغ پڑ رہا ہے۔ مسز راج نے کئی قسم کے کاسمٹیک کا نام بتایا کہ اس سے یہ سیاہی دُور ہوجائے گی۔ اور چہرے کا رنگ بھی نکھر آئے گا۔ لہٰذا کچھ میک اپ کا سامان خرید لیا۔ اس پر پچپن روپے خرچ ہوگئے۔

نیاض : (بیوی کی طرف غور سے دیکھ کر) اچھا! یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔ واقعی آپ کا چہرہ دس سال قبل کی یاد دلاتا ہے (بیوی کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے) اور ہاں لگتا ہے یہ چوڑی بھی آپ نے نئی خریدی ہے۔

زینت : ہاں ـ! مسز منیرہ پرسوں اس ڈیزائن کی چوڑی پہن کر آئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ فلم میں ہیرو اپنے ہاتھوں سے اس ڈیزائن کی چوڑی ہیروئن کو پہناتا ہے۔

نیاض : (مسکراتے ہوئے) تم کو کس ہیرو نے پہنایا؟

زینت : میری خواہش چوڑی لینے کی بالکل نہ تھی۔ لیکن مسز منیرہ نے زبردستی گیارہ روپے میں خریدوادی۔

فیاض : چلئے میری جگہ مسز منیرہ نے کام کردیا۔ اچھا یہ بتایئے کہ اور بھی کوئی خرچ ہے۔

زینت : اسی طرح کچھ اور بھی خرچ ہوگئے ہیں۔ آپ تین سو روپے کا انتظام کردیں تو میرا یہ گھریلو بجٹ پورا ہوجائے گا۔

نیاض : (کچھ سوچتے ہوئے) کس سے قرض لینا ہوگا۔

زینت : اس بار کسی طرح کام چلا دیجئے۔ آئندہ میں باز آئی بجٹ وجٹ سے!!

▲△

راجہ مہدی علیخاں

چوہے کی دُعا

اے خالقِ ہر ارض وسما وقتِ دُعا ہے
بندے پہ ترے آج عجب وقت پڑا ہے
پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تو نے بچایا!
دائم رہا مجھ پر ترے الطاف کا سایا
جب نام ترا لے کے کوئی نقب لگائی
ہر کام کی تدبیر مجھے تو نے سجھائی
سچ تو یہ ہے کتّوں کو سُلا رکھتا ہے تو ہی
میرے لیے دروازہ کھُلا رکھتا ہے تو ہی
انصاف کے پنجے سے مجھے تو نے چھُڑایا
اور دام حوالات میں اوروں کو پھنسایا
دل میں بہت ارمان لئے نکلا ہوں گھر سے
ایسا نہ ہو ناکام میں لوٹوں تیرے در سے
نامی کوئی ڈاکو نہیں چھوٹا سا ہوں اک چور
رحم آتا ہے بندوں پہ بہت دل کا ہوں کمزور
مجھ سے کبھی گاڈریج کے تالے نہیں ٹوٹے
تیری ہی قسم میں نے کبھی بنک نہ لوٹے
چھ سات سو مل جائیں تو بندے کو ہے کافی
وہ چور نہیں ہوں جو کرے وعدہ خلافی
اس چھت پہ کمند اپنی میں پھینکوں گا گھما کر
ہمت دے مجھے آتی کہ چڑھ جاؤں میں فرفر
بسم اللہ! ارے واہ میں میں قربان
کیا خوب لگی ہے کمند! اللہ تیری شان

خرگوشوں کی غزل

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں؟
چونکیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں؟

گھر نہیں، جھونپڑی نہیں، کٹیا نہیں، مکاں نہیں
بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں بھگائے کیوں؟

کان کھڑے نہ کیوں کریں گھاس میں کیوں نہ ہم چھپیں
کھٹکا ذرا بھی ہو اگر کوئی جھجک جائے کیوں؟

آئی سے مار کھا کے بھی خوش کوئی کس طرح رہے
پانی مزے سے کیوں پئے گھاس مزے سے کھائے کیوں

کہتا تھا اک شکاری یہ آئیں گے ہم ضرور یاں
جس کو ہو اپنی جان عزیز بن میں وہ گھر بنائے کیوں

منظور وقار (بنگلور)

نزاکت کا انٹرویو

جب ہم کرانہ دوکان سے پان کی دوکان تک ہر طرح کے کاروبار میں کافی نقصان اٹھاتے اٹھاتے ملاوٹی سمنٹ سے تعمیر شدہ سرکاری عمارت کی طرح بیٹھ گئے تو اپنے آپ کو دوبارہ اوپر اٹھانے کے لیے اچانک وہ قدم اٹھایا جس کو اکثر انقلابی قدم کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کا قدم اٹھانے والا ہر انقلابی (خصوصاً نوجوان) جذبۂ انقلاب کے جوش میں ضرورت سے زیادہ انقلابی باتیں کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ ایسا قدم اٹھانے کے بعد وہ انقلابی باتوں کو بھول کر اپنی بربادی کی داستان سناتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہم آپ کو زیادہ دیر تک سسپنس میں رکھ کر کسی سسپنس فلم کے اختتام کی طرح "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" والا معاملہ ہونے نہیں دینا چاہتے اس لیے ہم آپ پر جلدی واضح کر رہے ہیں کہ ہمارا وہ انقلابی قدم تھا "پیشۂ صحافت" سے وابستگی یعنی ہم آج کل روزنامہ "بجھتا چراغ" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ آپ لوگوں کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ ہمارا یہ روزنامہ "بجھتا چراغ" چار دن میں ایک بار عید کے چاند کی طرح اپنا چہرہ قارئین کو دکھاتا ہے ہمارے اس مشہور (بدنامی کی حد تک) اخبار کی تعداد اشاعت ایک سو کاپی ہے (جبکہ ہم نے لوگوں میں کئی ہزار کاپی مشہور کر رکھا ہے) اُن ایک سو کاپیوں میں سے پچاس کاپیاں دوست و احباب اور رشتہ داروں میں مفت تقسیم ہوتی ہیں باقی پچاس کاپیاں ہمارے دشمن خرید لیتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی نجی زندگی کے تعلق سے بجھتا چراغ میں کوئی خفیہ خبر تو نہیں چھپی۔

ایک دن ہم ہمارے اخبار کے مطالعہ میں غرق ہو کر ہم کاتبوں کی غلطیوں کا حساب لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہمارے کانوں سے وہ آواز ٹکرائی جس کو سن کر ہم اکثر گھبرا جاتے ہیں دراصل وہ آواز ہمارے دوست نما دشمن انسان نما شیطان، نقاد نما نالائق، اُستاد نما اُلّو، شاعر نما سر درد حضرت علامہ پاگل پا کھنڈی کی تھی۔ علامہ ہمارے آفس نما ٹین شیڈ میں داخل ہوتے ہی ہمارے ٹوٹے پھوٹے ٹیبل پر ایک زوردار مکا مار کر بولے "میاں! نفاست حسین لوہا، آج تمہارے اخبار کے لیے وہ زبردست چیز لایا ہوں جس کے شائع ہوتے ہی تمہارا اخبار ہاتھوں ہاتھ خدا نے چاہا تو راتوں رات فروخت ہونے لگے گا۔" ہم نے اپنے حیرت کے پہاڑ کو علامہ کے اوپر ڈھیر کرتے ہوئے پوچھا "علامہ! آج آپ ایسا کون سا نایاب نسخہ اٹھا لائے ہیں جس کے شائع ہوتے ہی لوگ ہمارے دو دمڑی کے اخبار کو بارہ دمڑی کے اخبارات کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ کیا قوتِ باہ میں اضافے کا کوئی نسخہ لکھ لائے ہو؟"

علامہ بولے "میاں لطافت! آج کل کیسی گندی گندی باتیں کرنے لگے ہو۔ میں تو ہمارے شہر کی سب سے خوبصورت کم عمر شاعرہ مس نیلوفر نزاکت کا انٹرویو لایا ہوں" ہم نے ایک بار پھر اپنی حیرت کا ہتھوڑا علامہ کے منہ پر مارتے ہوئے پوچھا۔ علامہ! اس شہر میں ہمیں رہتے ہوئے اتنے برس بیت چکے ہیں کہ لوگ ہمیں اب ادھیڑ عمر آدمی کہنے لگے ہیں مگر ہم ابھی تک نیلوفر نزاکت سے واقف نہ ہوسکے آخر یہ "شاعرانہ بم" اسلامی بم کی طرح ادب کے کس "ریسرچ سنٹر" میں پوشیدہ تھا۔

علامہ اپنی پتلی گردن کو فخر سے پھلاکر کہنے لگے "دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں قرض مانگنے کی عادت ہمارے ملک کے وزیراعظم کی طرح پڑگئی ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے وزیراعظم ورلڈ بنک سے قرض لیتے ہیں اور ہم ہلے احباب کی دنیا میں کسی دوست کو قرض کی ٹوپی پہناکر موقع ملتے ہی ان کی لنگوٹی بھی اتار لیتے ہیں۔ مس نیلوفر نزاکت کے والد جلال الدین شرافت سود بڈی کے دھندے میں اپنی دھاک جمائے ہوئے ہیں ہم ایک دن ان کے مکان پر گئے تو وہاں پر نیلوفر نزاکت کی پرسنل ڈائری پھڑپھڑا رہی تھی ہم نے ورق گردانی کی تو حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹ پڑیں۔ کیونکہ اس ڈائری میں نیلوفر نزاکت کی ایسی زبردست آزاد غزلیں اور نظمیں موجود تھیں جن کے بارے میں ہمیں یقین ہوگیا کہ اگر ڈائری سے آزاد ہوکر وہ غزلیں کہیں اخبارات اور رسائل میں آگئیں تو شعر و ادب کی دنیا میں زلزلہ آسکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ زلزلہ نازل ہوکر شہر کے سینئر شعراء کو نزلہ میں مبتلا کردیتا ہم نے اُس نو لطافت صفت شاعرہ کا فوراً انٹرویو لے لیا۔ ہمیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ کوئی اس معاملہ میں ہم سے بازی نہ لے جائے" ہم علامہ کی مزید کواس نما بحث سننا نہیں چاہتے تھے ویسے بھی ہمارا سر کاتبوں کی غلطیوں کا حساب لگاتے لگاتے مشاعروں میں ناکام ہونے والے جدید شعراء کی دکھی رگ کی طرح دُکھ رہا تھا اس لیے ہم نے علامہ کو ٹالنے کے لیے کہا "ٹھیک ہے علامہ ہم مس نیلوفر نزاکت کا انٹرویو بجھتا چراغ کی اگلی اشاعت میں ضرور شائع کریں گے" ہمارے اس روکھے انداز کو علامہ نے فوراً بھانپ لیا اور ریلوے انجن کی طرح گرم ہوکر چلے گئے۔ اب نیلوفر نزاکت کا انٹرویو ملاحظہ فرمایئے گا جسے پڑھنے کے لیے آپ یقیناً بے چین ہوں گے :-

پاگل : مس نیلوفر نزاکت صاحبہ! آپ کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی ؟

نزاکت : محترم پاگل پاکھنڈی میری پیدائش گلشن نگر ضلع پھلواری میں ہوئی تھی جس وقت تیز ہواؤں کی وجہ سے باغ کے رنگارنگ پھول آپس میں ٹکراکر بغل گیر ہورہے تھے ٹھیک اسی وقت میری ولادت ہوئی تھی یہ بات ہمارے مالی نے ہماری والدہ محترمہ کو بتائی تھی۔

پاگل : آپ کی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے ؟

نزاکت : یوں تو پروفیسروں کی مہربانی سے میں ایم اے گولڈ میڈلسٹ ہوں مگر مجھے ڈگری وگری سے کوئی دلچسپی نہیں میں اپنے آپ کو "پوسٹ گریجویٹ" کے بجائے ایک "شاعرہ" کہلانے میں زیادہ مسرت محسوس کرتی ہوں۔

پاگل : آپ کو شاعری میں کس طرح دلچسپی پیدا ہوئی ؟

نزاکت : یونیورسٹی میں جب میں زیرِ تعلیم تھی اس زمانے میں ایک دل پھینک دولت مند نوجوان کو اپنا دل دے بیٹھی تھی۔ مگر اُس نوجوان نے اپنی جھوٹی محبت اور بے پناہ دولت کا جھانسہ دے کر دھوکا دے دیا

اور اپنی ہی خصلت کی ایک دولت مند دل پھینک لڑکی سے شادی کرلی مجھے جب بھی "دھوکا دہی" کا وہ دن یاد آتا ہے میری آنکھوں سے مرحومہ مینا کماری کے آنسوؤں کی طرح آنسو بہنے لگتے ہیں اور میں اپنے درد کو دنیا کے کونے کونے تک پھیلانے کے لیے ایک غزل لکھ دیتی ہوں اس طرح میں نے آج تک کوئی چار پانچ سو غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔

پاگل : کیا تمہیں علم عروض پر بھی عبور حاصل ہے ؟

نزاکت ، بالکل نہیں ! میں ہمیشہ آزاد غزلیں اور آزاد نظمیں لکھا کرتی ہوں ویسے بھی مشاعروں میں پڑھنے کے لیے پابند شاعری کی کوئی ضرورت نہیں ہاں اچھی آواز کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاگل : گویا کہ آپ کافی آزاد لڑکی معلوم ہوتی ہیں ؟

نزاکت ، "آزاد لڑکی" سے کیا مطلب ! میں آزاد شاعری کرتی ہوں مگر آزاد لڑکی نہیں ہاں یہ تو میری بدقسمتی ہے کہ میں نے ایک بار محبت میں دھوکا کھایا۔ لیکن پھر کسی پر اعتبار نہیں کیا۔

پاگل : معاف کرنا نیلوفر صاحبہ ہمارا مطلب یہ نہیں تھا۔ خیر جانے دو۔ تم اپنی تخلیقات اخبارات اور رسائل میں اشاعت کے لیے ارسال کیوں نہیں کرتیں ؟

نزاکت ، میں اپنی غزلیں نظمیں اشاعت کے لیے کئی بار اخبارات اور رسائل کو روانہ کر چکی ہوں۔ مگر ایڈیٹ صاحبان ہر بار یہ لکھ کر واپس لوٹا دیتے ہیں کہ "آپ کی آزاد غزلیں اور نظمیں اس قدر آزاد ہیں کہ ہمارے کنٹرول سے باہر نظر آتی ہیں اس سے پہلے کہ آپ کا آزاد کلام خود ہمیں صحافت کی دنیا سے ہی آزاد کرادے ہم آپ کے آزاد کلام کو آپ کے پاس واپس لوٹا رہے ہیں کیوں کہ آپ ہی اُسے لگام لگا کر قابو میں لا سکتی ہیں" انٹرویو کے اس حصہ تک مطالعہ کے ساتھ ہی ہمیں یقین ہو گیا کہ اس کی اشاعت سے ہمارا اخبار "بجھتا چراغ" ضرور بھڑک اُٹھے گا۔ چنانچہ ہم نے فوراً مسودہ کاتب کے حوالے کر دیا۔ △△

ڈاکٹر طیب انصاری (گلبرگہ)

۲ منٹ کی خاموشی

عاتق شاہ کی گہری نظر اور زود نویسی کی وجہ سے اُردو ادب کو خاصہ فائدہ پہنچا ہے۔ چنانچہ اب تک ان کے افسانوں اور خاکوں کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۲ منٹ کی خاموشی ان کی گیارہویں تصنیف ہے عاتق شاہ صاحب نظر اور صاحب نظریہ ادیب ہیں چنانچہ ان کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ نقطۂ نظر بھی ہے۔ وہ کہانیاں لکھتے ہیں اور اچھی اور بُری کہانی کا فرق بھی جانتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

"اچھی کہانی وہ ہے جو دلوں کو چھو لے اور پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے۔ اور بُری کہانی وہ ہوتی ہے جس میں سب کچھ ہوتا ہے اگر کچھ نہیں ہوتا ہے تو وہ روح نہیں ہوتی جو کہانی کے پہلو میں چھپے ہوئے دل کو حرکت میں رکھتی ہے۔" اور پھر جو کہانی یا بحیثیت مجموعی کوئی ادب پارہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا وہ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ان کی کہانی "استاد" بہت خوب ہے۔ جدیدیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"نئی بات ــ وہ کہتا۔ مثلاً ڈونگ ڈانگ کے مشہور ادیب تن چاؤ لانگ یسان کو لیجئے۔ ہر کہانی میں وہ ایک نیا خیال پیش کرتا ہے۔ آپ نے اس کی تازہ کہانی میاؤں میاؤں پڑھی ـــ واہ جواب نہیں اس کا ـــ عالمی ادب میں اس کہانی کو رکھا جا سکتا ہے۔ کہتا ہے گھوڑے بھونک رہے تھے۔ کتے ہنہنا رہے تھے۔ شیر مرغوں کی طرح بانگ دے رہے تھے ککڑکوں ــ کوں ــ چیونٹیاں چنگھاڑ رہی تھیں اور ہاتھی بھاگ رہے تھے۔ بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے ہوئے۔"

اور پھر عاتق شاہ سوال کرتے ہیں؟

"علامت نگاری کی کوئی ایسی مثال تو پیش کرے"

اصل میں عاتق شاہ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کے بھی قائل ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تحریروں میں فکر و خیال کی روشنیاں ملتی ہیں۔

حسین بی کی روٹی بظاہر ایک ماما کی کہانی ہے لیکن یہ ایک عام عورت کی علامت ہے جو دوسروں کے لیے تو روٹیاں بناتی ہے لیکن خود اپنے لیے کچھ نہیں کرتی۔ عاتق شاہ کہتے ہیں "لیکن میں نے اس سے کبھی یہ نہیں کہا کہ تو اپنے لیے روٹیاں پکا۔ دوسروں کے لیے پکانا چھوڑ دے۔" اور شاید یہ بات میں نے اس سے کبھی نہیں کہوں گا کیوں کہ اس سچائی سے میرے ہاتھ ہی نہیں جلیں گے۔ بلکہ میرا دل بھی جل جائے گا۔

اللہ حسین بی، کلاوتی جس دن اس سچائی سے واقف ہو جائے گی اس دن ــ اس دن دنیا کے آسمان پر ایک نیا سورج اور چاند چمکے گا۔ اور دونوں دیکھیں گے کہ حسین بی اور کلاوتی بھوکی نہیں ہیں اور ان کے چہروں پر گلاب کے پھول کھل رہے ہیں۔"

عاتق شاہ نے ادب کے آرٹ کو سیکھنے میں کئی بار اپنے ہاتھ جلائے ہیں۔ محض آرٹ برائے آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ آرٹ برائے ضرورت کی خاطر وقت کے اس چیلنج کو قبول کیا تھا۔ ان کی ساری تحریریں جو فٹ پاتھ کی شہزادی، ایک وقت کا کھانا، اندھیری، مائی ڈیر شکنتلا، انڈین کا جو اور خالی ہاتھ وغیرہ کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں ہمارے سماج کے گھناؤنے پہلوؤں پر نشتر زنی ملتی ہے۔ ایک طرح کی جلن اور چبھن ہر ہر سطر میں نمایاں ہے۔ ہماری زندگی کے سماجی مسائل ہوں کہ معاشی مسائل سیاسی حالات ہوں یا اخلاقی اور رومانی گندگیاں ان کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ۲ منٹ کی خاموشی میں عاتق شاہ نے ان سارے مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ صرف اشارے ہی نہیں بلکہ ان گندگیوں سے نفرت کا اظہار بھی ملتا ہے۔

۲ منٹ کی خاموشی میں شامل ان کی کہانی دمڑی کا مرد ہماری جدید اور نام نہاد ترقی پسند سوسائٹی پر گہرا طنز ہے۔ وہ دمڑی کا مرد تھا جو ایک دمڑی کی عورت پر عاشق ہوا اور پھر اس سے شادی ہوئی۔ دونوں ہی اپنی اپنی سوسائٹیوں میں مصروف ہیں۔ ہماری ماڈرن سوسائٹی میں کلبوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جو گندگیاں پل رہی ہیں ان کا اظہار اس کہانی میں ملتا ہے۔ دمڑی کا مرد کہتا ہے: "آخر اس میں برائی کی کیا بات تھی شادی کا فیصلہ تو اس کا اپنا تھا۔ آخر کچھ تو نئی بات ہوتی اور وہ یہ کہ شادی کے چھ مہینے کے اندر اندر وہ ایک لڑکی کا باپ بن گیا۔ چھ مہینے " اور پھر یہ جو لڑکی پیدا ہوئی اس کی خصوصیات عاتق شاہ ہی کے الفاظ میں سنئے۔

"وہ اپنی ماں کی طرح ذہین اور حسین تھی۔ ویسے اس کا قد اس کی طرح اوسط تھا لیکن کھڑی ناک پر وقیع جبیں کی تو روشن بڑی بڑی آنکھیں مسٹر بستہ والا کی تھیں رنگ فرہاد آسمانی کا تھا اور آواز نور محمد کی تھی۔" اور پھر عاتق شاہ کا قلم چوٹ کرتا ہے۔

"وہ ایک کی نہیں سب کی بیٹی تھی۔"

اور اس کہانی کا کلائمکس تو یہ ہے کہ اس لڑکی کا عاشق وہی تھا جو پہلے اس کی ماں سے آنکھ لڑایا کرتا تھا۔ ہماری جدید سوسائٹی میں اس طرح کے واقعات اور حادثات تو روز ہی ہوتے ہیں عاتق شاہ نے دمڑی کا مرد لکھ کر ان ہی واقعات کی روک تھام کا انتظام کیا ہے۔

ایک پیالی چائے، پاس والی گلی اور دو منٹ کی خاموشی میں عاتق شاہ نے سماج کے ایسے ہی اخلاق سوز حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ ۲ منٹ کی خاموشی ان کی ایک اہم کہانی ہے جس میں انھوں نے ایک ایسے مست قلندر کے چہرہ سے نقاب اٹھایا ہے جو نمبر ون کا اسمگلر اور چور ہے لیکن معاشرہ میں ایک لیڈر کی حیثیت سے شہرت رکھتا ہے اور جس کی موت پر سڑکوں پر ہزاروں غم زدہ افراد جمع ہو گئے تھے تاکہ اپنے محبوب رہنما کے جلوس جنازہ میں شرکت کر سکیں۔"

۲ منٹ کی خاموشی محض مسائلی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ادب پارہ بھی ہے جس میں بیان کا انداز اور زبان کی لطافت اور چاشنی موجود ہے۔ منظر نگاری اور تصویر کشی اس کی خصوصیات ہیں۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی ہے ان کی تحریریں ان کے رومانی انداز تحریر کی چغلی کھاتی ہیں۔ ایک حسین اور خوب رو لڑکی کی تصویر کشی ملاحظہ ہو۔

"چھریرا بدن، اونچا قد، کمر کا ہلکا سا خم اور خم کے نیچے ذرا نیچے کولھے اور کولھوں پر جھولتی ہوئی بالوں کی سیاہ چوٹی جیسے ناگن سو رہی ہو اور ہلکی سی آہٹ سے جاگ جائے۔ جاگ کر لہرائے اور لہرا کر ڈس لے۔"

اور پھر دوسری جگہ ملاحظہ کیجیے۔

جسم - جسم - جسم!
گرم گرم - نرم نرم - سخت سخت - لچک کر بل کھا کر سکڑ کر، پگھلنے والا - موم کی طرح!" اس
طرح دل کو گدگدانی والی تحریر "دامنٹ کی خاموشی" میں بکھری ہوئی ہے۔

عاتق شاہ بنیادی طور پر ایک ذہین فنکار ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں ہمارا سماج لچکتا، چہکتا اور کبھی کبھی ہنستا اکثر روتا اور بلکتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ عاتق شاہ کو برائی اور گناہ سے سخت نفرت ہے اور وہ سرمایہ دارانہ نظام کو بری نظر سے دیکھتے ہیں اس لیے اس سماج کے وہ بڑے بے رحم نقاد بھی ہیں۔ یہ بات کل ہی ان کی تحریر میں نمودار نہیں ہوئی ہے بلکہ ابتدائی زمانہ میں جب ان کی تصنیف فٹ پاتھ کی شہزادی ضبطِ تحریر میں آئی تھی اس میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ:

"مظلومیت کی آنکھوں میں سہمے ہوئے آنسو مجھ سے کہتے ہیں کہ تو کہانیاں لکھ۔ وہ کہانیاں جو ہمارے سینوں میں منجمد ہیں۔ ہمارے ان میلے کچیلے چیتھڑوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اور میں لکھتا ہوں" چنانچہ آج بھی وہ لکھ رہے ہیں بلکہ بقول خود "میں لکھتا کہاں ہوں۔ کہانیاں خود اپنے آپ مجھ سے لکھوالیتی ہیں۔ ان چند الفاظ کے ساتھ میں اپنی گیارہویں تصنیف ۔ دومنٹ کی خاموشی کو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ دومنٹ کی خاموشی کی اس اشاعت کے بعد سوگ کا ماحول ختم نہیں ہوتا۔ ہمارے سماج میں برائیاں آج، کل سے زیادہ پرورش پارہی ہیں۔ ان برائیوں کے تدارک تک عاتق شاہ لکھتے رہیں گے۔ ہمیں ان سے ایسی ہی امید ہے۔

{انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کے جلسہ میں ۳۰ رجولائی ۸۸ء کو پڑھا گیا}

ڈاکٹر جاوید وششٹ (فرید آباد)

جانور سے انسان تک

○ مصنف : اندرجیت لال ○ صفحات : ۱۴۱ ○ قیمت : ۴۰ روپے
○ ملنے کا پتہ : سادھنا پبلی کیشنز، ۴۱ ۔ڈی، گل مہر پارک نئی دہلی ــــــ ۴۹

مزاح ذہانت کی کسوٹی ہے۔ برجستگی کا معیار ہے۔ ذہانت اور برجستگی کا جب ملن ہوتا ہے تو مزاح کی پھلجھڑی گل ریز ہو جاتی ہے۔ اِنسان جتنا ذہین ہوگا، اتنا ہی لطیف مزاح اس کے زیرِنگیں ہوگا۔ پڑوسی کا پڑوسی پر اثر ہوتا ہے۔ کیا عجب کہ فکر تونسوی مرحوم کے کچھ مزاحی جراثیم اندرجیت لال میں حلول کر گئے ہوں۔ کیوں کہ فکر ان کے ہم سایہ تھے۔ بہرحال اندرجیت لال ذہین اور حاضر جواب ادیب ہیں اس لیے مزاحیہ امراض کے شکار ہو گئے۔ اور اب مزاح نگار اور انشائیہ نگار کے رُوپ میں اُبھرے ہیں۔ "مسکراہٹ ہی مسکراہٹ" سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس انتخاب میں ان کے پہلے مزاحیے خندہ زن ہیں۔ اور اب "جانور سے انسان تک" میں ان کے ۱۵ مزاحیے و انشائیے شامل ہیں۔

کتاب کے مقدمہ کا عنوان "ادھورا خاکہ، پورا ادیب" ہے۔ مقدمہ کے اختتام پر بریکٹ میں (ایک ممتاز خاکہ نگار کے قلم سے) درج ہے۔ گویا مقدمہ نگار کا نام چھپا کر مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں دل چسپ انداز سے اندرجیت لال کی بدخطی، شگفتہ مزاجی، دبلاپن، مختلف النوع موضوعات پر تصانیف اور باتونی لال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

ابتداء میں "میرا قلم" کے زیرِعنوان مصنف کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ "لوٹا بادشاہ" میں لوٹے اور بچے کی یکجائی تخلیق نسل آدم کی ابتداء و انتہا کا مستحکم موجود ہے۔ بچے کی معصوم شرارتوں نفسیات اور تجسس کے جذبہ کا اظہار بھی پُرلطف ہے۔ "بیجو شاہ" میں پڑوسی سے رسم و راہ اور بیجو شاہ کے عادات و اطوار کا دل چسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ "جانور سے انسان تک" ایک مزاحیے کا عنوان ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:-

"... مگر اس اشرف المخلوقات کی شکل و صورت تو دیکھنا۔ وہ کتّے سے زیادہ شہوت پرست، لومڑی سے زیادہ مکار، سانپ سے زیادہ زہریلا، اونٹ سے زیادہ کینہ پرور، مگرمچھ سے زیادہ قاتل کش، گیدڑ سے زیادہ ضدی، بلی سے زیادہ چور، بکری سے زیادہ بزدل اور بچھو سے زیادہ نیش زن ہے۔"

"محبت کی زبان مسکراہٹ" میں مسکراہٹ کے مختلف رُوپ اور تاثرات کا حسین و جمیل خاکہ ہے۔ "ضمیر کی آواز" مختصر مگر

بات ہے۔ اس میں امریکہ کے "میرزندہ" لوگوں کی دل چسپ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ "گلاب ہی گلاب" میں گلاب کا بین الاقوامی ذکر ہے۔ اس میں یونان و روم سے لے کر ایران و ہندوستان تک گلاب کا "خیابان در خیابان" کر لائے ہیں۔ ڈاکٹر ہرگوبند کھرانہ، میاں افضل، پنڈت نہرو، ذاکر حسین کے گلاب عشق کا بھی پُر لطف ذکر ہے۔

ایرا غیرا" کا تعلق جمہور کا عہد ہوگیا ہے۔ اس جملہ پر اس کا اختتام ہوتا ہے کہ "ایرا غیرا زندہ باد! عام آدمی پائندہ باد!"

"بھول ایک سامیڈی ایک نعمت" میں بھلکڑ لوگوں کے لطیفے قرار دیتے ہیں۔ بھول کے روشن پہلو کو بڑی چابکدستی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ "گھر جوائی" جسے سماج میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، اس کی حالت زار کا پُر لطف بیان ہے۔ خودداری تو بیچارے کی پہلے ہی دن قتل کردی جاتی ہے۔ اس کی حالت پر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی۔ "ناشر بنام شاعر" میں ناشر کا عبرتناک خط شاعر کے نام اس کے مجموعہ کلام "خونِ جگر" کی اشاعت سے معذرت کا اظہار ہے۔ زبان و بیان کا چٹخارہ شاعر و ادیب کا ناشر سے رشتہ ایک مستقل مسئلہ کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ "میں نے کہا جی" میں تکیۂ کلام کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ "واہ رے گدھے" کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ نہ مزاحیہ ہے، نہ انشائیہ یہ محض "گدھائیہ" ہے۔ گدھے نے اردو ادب کو جو محاورے دیئے ہیں، یقیناً اس کا بڑا احسان ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے گدھے کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب ایشیا کے جنگلی گدھے سے جوڑا ہے۔ "غصہ میں ہنسنا" اشہ" کا عنوان شیخ فریدؒ کے ایک دوہے سے ماخوذ ہے۔ اس میں کرودھ یا غصہ کی مختلف حالتوں کا دل چسپ بیان ہے۔

غرض ہر فن مولا اندر جیت لال کا مزاحیہ و انشائیہ ادب بھی قابل دید ہے۔ جو زیرِ نظر کتاب میں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

جلد ۲۱ ★ شمارہ ۱۰ ★ اکتوبر ۱۹۸۸ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کتابت: محمد عبدالرؤف

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد۲

○ قیمت فی پرچہ: چار روپے ۵۰ پیسے ○ زرِسالانہ: ۵۰ روپے ○ عرب ممالک سے ۱۵۰ روپے

○

خط وکتابت کا پتہ

۳۱۔ بیچلرز کواٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ ○ فون آفس: 557716

فون مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

رضا نقوی واہی

اولمپک ۱۹۸۸ء

اولمپک کے کھلاڑی ہاتھ خالی جب وطن آئے
طلائی کیا، نہ کانسے کا بھی تمغہ جیت کر لائے

سبب پوچھا گیا جب ہار کا کپتان صاحب سے
تو چہرے کا پسینہ پونچھ کر رومال سے بولے

ہماری وضعداری کو سمجھتے ہیں جو پسپائی
انھیں مطلق نہیں قومی روایت سے شناسائی

ہماری وضع "قبلہ آپ پہلے" کی جو خوگر ہے
وہی جہد و عمل کے راستے میں اپنی رہبر ہے

سرِ راہِ عمل ترکِ روایت ہم نہیں کرتے
ٹرینیں چھوٹ جاتی ہیں پہ سبقت ہم نہیں کرتے

ہماری وضعداری جب "سودیشی ریل" بنتی ہے
تو قومی زندگی کی انفرادی شان بنتی ہے

کمندیں ڈالتے ہیں دوسرے جب چاند تاروں تک
ہم اپنی وضعداری کو چلاتے ہیں کھٹاروں پہ

ہماری وضعداری میں ہے فرقہ واریت شامل
نہ ہو یہ مشغلہ تو زندگی گذرے بصد مشکل

اولمپک میں ہماری ہار، فتحِ وضعداری ہے
یہ وہ نکتہ ہے منطق کا جو ہر نکتے پہ بھاری ہے

ہمیں منظور تھی جب دوسری ٹیموں کی دلداری
سرِ میداں ہماری ٹیم اگر ہاری تو کیا ہاری

ذرا سی جیت کی خاطر رُخ اُن کا یوں بدل جاتا
ہمیں پیچھے سے دھکے دے کے خود آگے نکل جاتا

یہ خود غرضی، ہماری انکساری کے منافی ہے
انھیں موقع دیا بڑھنے کا بس اتنا ہی کافی ہے

ہمیں سونے کے اک تمغے کا لالچ کیوں بھلا ہوتا
خود اپنی آنکھ میں رُتبہ ہمارا گھٹ گیا ہوتا

خدا رکھے کہ اسمگلر ہمارے باری باری سے
ٹنوں سونا درآمد کر رہے ہیں ہوشیاری سے

اولمپک میں نیا ریکارڈ یوں قائم کیا ہم نے
حریفوں کو خوشی کا موقعِ زرّیں دیا ہم نے

بھلا اپنی روایت کا گلا کیوں کر دبا دیتے
اگر ہم جیتتے تو ساکھ خود اپنی مٹا دیتے

ہماری وضعداری پہ کوئی کف در دہاں کیوں ہو
"سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو"

رضا نقوی واہی

طرحی مشاعرہ

[مصرعِ طرح ـ موج در موج سمندر کا پتہ پاؤ گے]

دوستو آج اولمپک کا مزا پاؤ گے — شعر کی ریس میں شاعر کو کھڑا پاؤ گے

جو بھی محفل میں ہے استاد و عطائی سب کو — بانس پر چڑھنے اُترنے میں جُٹا پاؤ گے

یوں تو منہ اُن کا رہا کرتا ہے ہر دم لٹکا — آج رُخسار پہ سرخیِ آنا پاؤ گے

ہیں گدایانِ سخن داد کے طالب یارو — بزم میں بُت بنے بیٹھو گے تو کیا پاؤ گے

داد و توصیف تو ہے بھیک سخنور کیلئے — اس کرم کے لیے محشر میں جزا پاؤ گے

داد کے پھول ہوں یا طنز و تمسخر کے ہوں خار — ہم کو ہر حال میں خوش تم بخدا پاؤ گے

شعر جب سر سے گذر جائے تو تعریف کرو — یوں سخن فہموں کی فہرست میں جا پاؤ گے

باجماعت تمہیں ہم لوگ دُعائیں دیں گے — ہم سے یوں جبرِ سماعت کا صلہ پاؤ گے

قطعہ

اک عروضی کا یہ کہنا ہے سُنو اہلِ سخن! — جس قدر قافیے شعروں میں کھپا پاؤ گے

کم سے کم اپنے محلّے کے گلی کوچوں میں — اپنی استادی کی تم دھاک جما پاؤ گے

ہو اجازت تو میں ان سے یہی پوچھوں واہی — کھوٹے سکّے کو کھرا کیسے بنا پاؤ گے

بحر و اوزان کے گرداب میں پھنس کر بھائی — خاک تم روحِ تغزل کا پتا پاؤ گے

تم نے سوچا ہے کبھی طرحی نشستوں کے وکیل — بے تُکی قافیہ پیمائی سے کیا پاؤ گے

ایسے شعروں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے — کسی پرچے میں اشاعت نہ کرا پاؤ گے

بس یہی ہوگا کہ ردّی کی دکاں میں جا کر

دو ٹکے سیر پہ یہ مال کھپا پاؤ گے

صدیق سالک
کا ایک یادگار خطبۂ صدارت

[صدر پاکستان ضیاء الحق کے پریس سکریٹری بریگیڈیر صدیق سالک، ان لوگوں میں شامل ہیں جو صدر پاکستان کے ساتھ طیارہ کے حادثہ کا شکار ہوگئے۔ صاحب سیف و صاحب قلم صدیق سالک کا نام پاکستان کے ان فوجی ادیبوں کے ساتھ لیا جاتا ہے، جنھوں نے ادب میں بڑا نام کمایا۔ ضمیر جعفری، شفیق الرحمٰن اور کرنل محمد خاں کی طرح صدیق سالک کی تحریروں میں بلا کی شوخی، ذہانت اور شگفتگی ٹپکتی تھی۔ ان کی کتابیں "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا" "ہمہ یاراں دوزخ" "پریشر کوکر" اور تا دم تحریر شائع ہو چکی ہیں۔ وہ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے ایک نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بڑے مشکل حالات میں میٹرک، بی اے اور ۱۹۵۹ء میں انگریزی سے ایم اے کیا۔ چند سال لکچراری کی۔ حکومت کے صحافتی کاموں میں شریک کار رہے اور پھر فوج میں بحیثیت کپتان پبلک ریلیشنز آفیسر مقرر ہوئے آخری دنوں میں وہ صدر پاکستان کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہتے تھے۔
انتقال سے قبل روزنامہ سویرا کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "میں انشاء اللہ آخری وقت تک اپنے قلم کی نوک سے شہد کے قطرے گراتا رہوں گا تاکہ اس تلخ معاشرے میں کچھ مٹھاس پیدا ہو سکے۔"
اپریل ۱۹۸۷ء میں کراچی کے مشہور ماہنامہ "دوشیزہ" کے رائٹرز ایوارڈ کی محفل میں صدیق سالک نے صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اس خطبہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صدیق سالک کے قلم میں کس بلا کی کاٹ، بے ساختگی بذلہ سنجی اور شگفتگی تھی ——— ادارہ]

میں ادارہ "دوشیزہ" کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے آج کی رنگا رنگ تقریب میں شرکت کی دعوت دی اور اچھے بھلے شریف آدمی کو مہمان خصوصی بنا کر رکھ دیا۔ میں ان خواتین و حضرات کو بھی مبارکباد دیتا ہوں جو آج پہلی اور آخری مرتبہ میرے ہاتھوں سے انعامات پائیں گے۔ یہ انعامات جو آپ تھوڑی دیر بعد دیکھیں گے، بڑے بامعنی ہیں۔ یہ انعام دراصل ایک فن پارہ ہے جس میں ایک قلم کئے ہوئے ہاتھ میں قلم تھما دیا گیا ہے۔ اس سمبل کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اصل کام ہاتھ قلم کرنا ہے وہ کام ہو جائے تو پھر قلمکاروں کے ہاتھوں سے قلم چھیننا ضروری نہیں رہتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ادیب اپنے ہاتھ سے کبھی قلم ترک نہیں کرتا خواہ اس کے ہاتھ قلم ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ پہلی تشریح کے مطابق رخسانہ سہام صاحبہ کا تعلق ایک جابرانہ اور آمرانہ حکومت کے خفیہ حامیوں سے لگتا ہے اور دوسری تشریح کے مطابق وہ آمریت اور جبر کے خلاف جہاد کرنے

والوں میں شامل ہیں۔ میں تو یہ SYMBOLIC PRIZE. دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ دوشیزہ اور اس کے SISTER MAGAZINES۔ حکومت کے حامیوں اور مخالفوں میں بہ یک وقت کیوں اتنے مقبول ہیں۔ میں بھی ایک لکھنے والا ہوں اور آج کے رائٹرز ایوارڈ میں مجھے یہ انعام ملا ہے کہ رخسانہ سہام صاحبہ نے مجھے جسٹس ایم آر کیانی مرحوم کے ساتھ ملا دیا ہے جنھیں لاہور کی ایک ایسی ہی بھرپور محفل میں "لسانِ پاکستان" کا خطاب دیا گیا تھا۔ کاش میں ان کے نقش زندہ کر سکتا۔ وہ تو ننگی حقیقتوں کو نیزے کی انی پر چڑھا کر جابر سلطان کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔ ہم تو چھوٹی چھوٹی سچائیوں کو بھی مصلحتوں کے لفافوں میں ملفوف کرنے والے ہیں۔ شاید رخسانہ بہن کو میری حقیر سی کاوش اس لیے پسند آگئی کہ مبہوت خاموشی کے ماحول میں درد کی ٹیس بھی بعض اوقات نعرہ مستانہ لگتی ہے۔

خواتین و حضرات . . . ! ایک حقیقت جسے میں کسی مصلحت میں لپیٹے بغیر آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ماہنامہ دوشیزہ مجھے باقاعدگی سے ملتا ہے لیکن میں اسے باقاعدگی سے نہیں پڑھتا۔ میں محترم سہام مرزا اور محترمہ رخسانہ مرزا سے ملتا ہوں لیکن انھیں قریب سے نہیں جانتا۔ اس کے باوجود اس نیم زنانہ، نیم مردانہ تقریب میں آگیا ہوں۔ کیوں کہ مجھے دوشیزہ پسند ہے۔ ہر صحت مند مرد کو دوشیزہ پسند ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ اس کی آپا نہ ہو۔ مجھے بھی سہام فیملی کی دوشیزہ پسند ہے لیکن اسے بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔ کیوں کہ اسلام آباد اور کراچی میں بُری نظر سے دیکھنے کے لیے اور بہت کچھ ہے . . . نظر بد دور!

آج اس ہال میں دوشیزہ کے بہت سے لواحقین موجود ہیں۔ کچھ کزنز، کچھ آنٹیاں اور کچھ انکلز۔ آنٹیوں کے متعلق کچھ کہنا تو چیونٹیوں کی یلغار کو دعوت دینا ہے۔ لیکن انکلز کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو اس مقدس رشتے میں ملوث کرنے کی بجائے دوشیزہ کا فین کہلانا پسند فرمائیں گے۔ کیوں کہ میں بھی دوشیزہ کے ایک فین کے طور پر آیا ہوں، اگر مجھے محترم و مکرم انکل کے طور پر بلایا جاتا تو میں سرکاری مصروفیات اور غیر سرکاری عدم فرصت کے سو بہانے تراش لیتا۔

میں حیران ہوں کہ سہام صاحب جیسے جہاندیدہ آدمی نے مجھ جیسے نادیدہ شخص کو یہاں کیوں بُلایا اور وہ بھی مارشل لاء اُٹھنے کے ڈیڑھ سال بعد! اگر ان کی نظر اگلے مارشل لاء پر ہے تو یہ ان کی دوراندیشی کی انتہا ہے کیوں کہ اول تو اگلا مارشل لاء لگنے کا نہیں اور اگر لگے گا تو میں اس وقت تک ریٹائر ہو چکا ہوں گا۔

آج کی میزبانِ خصوصی نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ وہ ادیبوں، شاعروں اور دیگر قلمکاروں کو اتنا خوشحال دیکھنا چاہتی ہیں کہ اس دور کا کوئی غالب قصیدوں کا کشکول لے کر کسی دربار میں نہ جائے۔ اس پر مجھے ایک قصہ یاد آگیا دانائی کے بہت سے قصوں کی طرح یہ قصہ بھی قدیم یونان کا ہے۔ وہاں طویل عرصے کے بعد حکومت بدلی تو نئے بادشاہ نے ملک کے مشہور و معروف داناؤں، دانشوروں اور قلمکاروں کو اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہا۔ اس وقت یونان میں دو فلاسفر اپنی شہرت کی معراج پر تھے بادشاہ کا خصوصی ایلچی ان کے پاس گیا۔ بادشاہ کی خواہش ان تک پہنچائی دربار سے وابستہ گوناگوں مراعات کا نقشہ کھینچا اور بادشاہ کی درخواست قبول کرنے کو کہا۔ ان میں سے ایک فلاسفر مان گیا جب کہ دوسرا فقیری میں شاہی کے مزے لوٹنے کے لیے دانہ و دام سے دور رہا۔

جو فلاسفر دربارِ شاہی پہنچا، اس پر انعام و اکرام کے دروازے کھُل گئے۔ اسے نئی خلعت عطا کی گئی۔

شاہانہ سواری مہیا کی گئی۔ اعلیٰ رہائش فراہم کی گئی۔ خدمت کو سلیقے ہوتے خدام پیش کئے گئے اور یوں وہ ایک نئے رنگ، نئے پیرہن اور نئے آہنگ میں زندگی بسر کرنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اسے اپنے پرانے دوست کا خیال آیا اور وہ اس کا حال پوچھنے اس کے گھر گیا۔ وہ حسب معمول جھونپڑی میں رہائش پذیر تھا۔ صحن میں پھٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھا مطالعہ کر رہا تھا اس نے اپنے دیرینہ دوست اور نئے مصاحب شاہ کو اپنے ساتھ بٹھایا تھوڑی دیر بعد کھانے کا وقت ہوا تو خود بھی ابلی ہوئی موٹی کالی دال کھانے لگا اور وہی ڈش اپنے مہمان کو بھی پیش کی مہمان نے کہا "یار اگر تم بادشاہ سلامت کو خوش رکھنے کا گُر سیکھ لو تو تمہیں جھونپڑی میں رہنے اور پھٹی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر دال کھانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں دوست . . . ! اگر تم چٹائی پر بیٹھ کر دال کھا کر گزر اوقات کرنے کا گُر سیکھ لو تو تمہیں سنہری کمر بند باندھ کر اپنے بادشاہ کے حضور کھڑا رہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

خواتین و حضرات . . . ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء لگا تو مجھے بھی ایک چھوٹا موٹا دانشور سمجھ کر دربار شاہی سے وابستہ کر دیا گیا۔ اس میں میری پسند یا ناپسند کا کوئی دخل نہ تھا کیوں کہ فوج میں کوئی اپنے آپ کو کسی کام کے لیے VOLUNTEER نہیں کرتا۔ عموماً اوپر سے کہا جاتا ہے کہ فلاں جوان فلاں کام کے لیے والنٹیر ہے چنانچہ میں بھی VOLUNTEER کر دیا گیا۔ دربار شاہی میں کئی سال رہا۔ لیکن خلعت ملی نہ شاہانہ سواری، قصر اقتدار میں رہائش گاہ نصیب ہوئی نہ مربعوں، پلاٹوں یا دیگر انعام و اکرام کی بارش ہوئی بلکہ اُلٹا اپنی جیب سے اچکنیں شلواریں اور واسکٹیں سلوانا پڑیں۔ ایک ہی بیوی اور ایک ہی فوجی اردلی شامل مشقت رہا۔ اسلامی مارشل لاء میں پانچوں کی پانچوں نمازیں باقاعدگی سے پڑھنا پڑیں، وہ الگ۔

کچھ عرصے کے بعد میں قصر صدارت سے نکلا تاکہ کٹیا میں بسنے والے دوستوں کی خبر گیری کر سکوں، میں ان کی جھونپڑیوں میں گیا لیکن وہاں کوئی نہ تھا، کوئی سوسائٹی میں چلا گیا تھا، کوئی گلبرگ لاہور میں منتقل ہو گیا تھا اور کوئی اسلام آباد کے خوبصورت شہر میں آباد ہو چکا تھا۔ اب وہ سائیکل اور اسکوٹر ترک کر کے سوزوکی، ٹیوٹا اور ہنڈا کار تک پہنچ گئے تھے اور باہم چندہ اکٹھا کر کے کسی قہوہ خانے میں بیٹھنے والے فور اسٹار ہوٹل میں بیٹھنے لگے تھے۔

جدید پاکستان میں قدیم یونان والی صورتحال نہ تھی، لیکن اس کے باوجود مجموعی طور پر ادیبوں کی طرف معاشرے کا رویہ نہیں بدلا۔ یہاں ڈوکی کے کہاروں کو تو نوٹوں سے لادا جاتا ہے، لیکن قلمکاروں کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ قلم کاروں کی تیشہ کاری سے اگر دودھ کی نہر پھوٹ بھی جائے تو اس سے پبلشر اور ڈسٹری بیوٹر سیراب ہوتے ہیں لیکن قلمکار کے ہونٹ بہشتی کے مشکیزے کی طرح خشک رہتے ہیں۔ اس منظر میں سہام فیملی کا یہ جرات مندانہ کام لائق ستائش ہے کہ انھوں نے ادیبوں کے خشک ہونٹوں میں نہ صرف چوسنی تھمادی ہے بلکہ اس کے نپل پر تھوڑا سا شہد بھی لگا دیا ہے۔ کسی وقت بھی کسی بھی صاحب نصاب کو مستحقین کا خیال آجائے تو غنیمت ہے۔

ادب کے ان دریا دل محسنوں نے تقریب کی صدارت کا بوجھ مجھ پر لادا، تو میں مخمصے میں پڑ گیا کہ ایسی محفل میں کیا کہوں گا؟ ایک دوست سے پوچھا، اس نے کہا کوئی مزاحیہ مضمون پڑھ دینا۔ دوسرے سے پوچھا تو اس نے نیم حقارت کے موڈ میں فرمایا کہ یہ کوئی نیم زنانہ قسم کا فنکشن ہوگا، کوئی نیم رومانی اور نیم نسوانی قسم کی چیز چل جائے گی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں نیم زنانہ نہیں، خالص مردانہ کتابیں لکھتا ہوں۔ مجبوراً میں نے اپنے زبان شناس

دوست سید ضمیر جعفری کی طرف رجوع کیا۔ ان کا فون نمبر گھمایا تو ریسیور بھابی نے اُٹھایا، میں نے پوچھا "ضمیر کہاں ہے۔"

جواب ملا "سویا ہوا ہے۔"

"کب سے؟"

"جب سے اس نے ٹیلی ویژن مشاعرے پڑھنے شروع کئے ہیں۔"

"جگانے کی کوئی صورت ہے؟"

"مشکل ہے ضمیر ایک دفعہ سو جائے تو مشکل سے جاگتا ہے۔"

میں نے کہا "اسے کہئے بریگیڈیر سالک بول رہے ہیں۔"

انھوں نے فرمایا "وہ مارشل لاء کا عادی ہو چکا ہے اب کسی بریگیڈیر ور گیڈیر سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

مجھے سوتے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں نے بھابی سے درخواست کی کہ وہ فون ضمیر کے کان کے پاس لے جائے اور مجھے براہ راست ان سے بات کرنے کا موقع دے۔ بھابی ٹیلیفون کا تار گھسیٹتی ہوئی جو لگائے کے پاس لے گئی۔ میں نے ضمیر کے کان میں کہا۔ "ضمیر بھائی! جاگ جائیے کراچی میں دوشیزہ کا فنکشن ہو رہا ہے"

اُونگھتے اونگھتے پوچھا "کون سی دوشیزہ کا۔"

میں نے کہا "وہی جو آپ کے ساتھ شارجہ گئی تھی۔"

بولے "میرے ساتھ تو شارجہ کئی گئی ہیں، اگر میں ایک ایک کو یاد رکھنے لگوں تو شاعری چھوڑ کر عاشقی نہ کرنے لگوں۔"

میں نے عرض کیا "اچھا اس کو چھوڑیئے، کراچی والے فنکشن کی بات کیجئے۔ وہاں مشاعرہ بھی ہے۔ ایک ہزار روپیہ فیس ہے فی شب قبول ہے؟"

کہنے لگے "وہ کینیڈا والے مشاعرے کا کیا ہوا؟"

عرض کیا "اس مرتبہ انھوں نے اقبال بانو کو بلالیا ہے۔"

ضمیر بھائی نے فون دُور پھینکا اور پھر لمبی تان کر سو گئے اور آخری خبریں آنے تک بیدار نہیں ہوئے۔

میں نے چار و ناچار دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی گذشتہ تقریب کی کارروائی پڑھنا شروع کی جو سہام بھائی نے میری راہنمائی کے لیے بطور خاص بھجوائی تھی۔ اس میں عجیب و غریب قسم کی ترکیبیں اور اشارے تھے، آپ بھی سنیئے۔

"یہ محفل بھینی بھینی خوشبو اور ٹھنڈے ٹھنڈے ماحول میں لپٹی ہوئی تھی۔ آسودہ آسودہ سی تمنائیں، چلبلی چکیلی رومان میں رچی بسی تحریریں، پریم کی چھما چھم، ہونٹوں کی مسکاتی کلیاں، آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام اور انگلیوں کے پوروں سے سرکتے ہوئے گوٹا لگے دوپٹے" وغیرہ۔

میں نے دوشیزہ کی اس روایت کو زندہ رکھنے کے لیے تجرباتی طور پر چند جملے تراشے مثلاً۔

"یہ ایک چھما چھم تقریب ہے جو مہمانوں سے لبالب بھری ہے، اس تقریب کی دلہن ایک دوشیزہ ہے جو بیوٹی پارلر سے بن ٹھن کر آئی ہے۔ اس کے سفید کاغذ پر سیاہ حروف کی اوٹ سے ایک گوری اپنے گھونگھٹ سے گھور رہی ہے اس کے ورق ورق پر ارمانوں کی چاندنی، حسرتوں کی راکھ اور حقیقتوں کی چبھن ہے۔ اسے پڑھ کر کنواریاں رموزِ زندگی سے آگاہ ہوتی ہیں اور بڑی بوڑھیاں اپنے شباب رفتہ کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔"

جب میں یہ لکھ رہا تھا تو میری بیٹی میرے پیچھے کھڑی ہوکر پڑھنے لگی۔ جب تحریر زنانہ مرحلے سے گزر کر شریرانہ ہونے لگی تو اس نے مجھے ٹوک دیا۔ "ابو! یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں؟"

"بیٹی! میں ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، کا دوسرا اسکرپٹ لکھ رہا ہوں۔"

بولی! "لیکن مجھے تو یہ ہمہ یاراں دوزخ کا حصہ دوم معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ پہلے ہم ڈھاکہ ڈوبنے کا اسکرپٹ خود لکھتے ہیں، پھر ہمہ یاراں دوزخ کا باب ہم سے دوسرے لکھواتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ مضمون کراچی میں پڑھنا ہے جہاں پچھلے دنوں اپنوں نے اپنوں کے گلے کاٹ کر اور ایک دوسرے کا پیٹ پھاڑ کر، ایک دوسرے کے گھروں کو جلا کر ۱۹۷۱ء کے ڈھاکہ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ نفرتوں کے بیج بو دیئے تھے، میں نے اسے مزید کچھ بتانے سے گریز کیا کیوں کہ ابھی تک وہ آشوبِ ڈھاکہ سے نہیں نکل سکی۔ میں اسے کسی اور آشوب کی لال جھنڈی نہیں دکھانا چاہتا تھا، میں نے اس کے سامنے مضمون کو نامکمل چھوڑ دیا اور اس کی آخری سطریں یہاں آکر لکھیں جو یہ ہیں۔

مجھے کراچی کی گھما گھمی میں حالیہ فسادات کا کرب دکھائی دیتا ہے۔ آج کی تقریب میں خوشبو کی ہر لہر کے پیچھے درد کی ٹیس محسوس ہوتی ہے، ہر نگین دامن پر خون کے دھبے نظر آتے ہیں اور ہر آستین، آستینِ قاتل معلوم ہوتی ہے۔ . . میں سمجھتا ہوں، اگر ماہنامہ دوشیزہ اور اس کے لاکھوں قاری اور مدلح دلوں کے زہر کو تحلیل کر کے کراچی کے مکینوں کو محبت کے بندھنوں میں باندھ دیں تو میں مان جاؤں گا کہ یہاں واقعی پریم کی چھما چھم ہے، آنکھوں میں محبت کے پیغام ہیں اور یہ چلبلی، رسیلی اور چکیلی محفل محبت کرنے والوں . . . اور نفرتوں کو ڈبونے والوں . . . کی محفل ہے اور اگر نفرتوں کے یہ زہر ختم نہ ہوئے تو بہت جلد مستقبل کا کوئی مصنف یا مورخ ایک اور قومی المیئے کا اسکرپٹ لکھ رہا ہوگا۔

غزل

اسمٰعیل ظریف
(حیدرآباد)

ہر شاعر کا رنگ جُدا ہے — لال ہے کوئی کوئی ہرا ہے
اک بوڑھا جو مجھ سے بڑا ہے — وہ مجھ کو چاچا کہتا ہے
آج کی محفل میں اک شاعر — بیگم سے لڑ کر آیا ہے
محفل میں بلوا کر کوئی — شاعر کا قد ناپ رہا ہے
لڑکا خود کالا ہے لیکن — گورا رشتہ ڈھونڈ رہا ہے
مولانا کو میخانے میں — واعظ نے جاتے دیکھا ہے
بھائی کے دونوں بیٹوں پر — فلمی پریوں کا سایہ ہے
ماں کے قدموں میں ہے جنت — پیر میں باوا کے باٹا ہے
یہ دونوں ہیں میرے پڑوسی — اک چمچی ہے اک چمچہ ہے
کیا کرتے غیروں کی شکایت — اپنوں ہی نے ہاتھ دیا ہے
جانے کیوں صاحب کے گھر میں — آئینہ اوندھا رکھا ہے
کرتا ہے جو کالا دھندا! — اُس کا طوطی بول رہا ہے
راشن کی دوکان پہ بھوکا! — جھولی لیکے کیوں میں کھڑا ہے
اندھوں کی بستی میں جا کر — کوئی چشمے بیچ رہا ہے
جس کی لاٹھی بھینس ہے اُسکی — ایسا ہی ہوتا آیا ہے
گھر کی مُرغی دال برابر — ایسا بھی اکثر ہوتا ہے
تاریکی میں لائٹ کا کھمبا — گویا مُجرم بن کے کھڑا ہے
آٹو والوں سے تو یارو — ٹانگے والا ہی اچھا ہے
لیڈر ہی کے گھر کے بازو — کچرے کا اک ڈھیر پڑا ہے
کتنا چھوٹا ظرف ہے اُس کا — بول بڑا جو بول رہا ہے

دیکھ ظریف اب تو بھی سنبھل جا
اک دیوانہ پیچھے پڑا ہے

قطعات (چوٹے)

لاغر نرملی
(نرمل)

(۱)

کیا بتائیں ہے کیا دل ہمارا
حسرتوں کا ہے دارالخلافہ
عاشقی میں وہ درگت بنی ہے
لوگ کہتے ہیں "خالی لفافہ"

(۲)

لوٹا ڈوپٹی کو شرافت بول رہیں
مسمیریزم کو کرامت بول رہیں
آج کل کے لیڈراں لاغر میاں
دل بدلنے کو سیاست بول رہیں

اسحٰق ایوبی
(حیدرآباد)

کیلنڈر، ڈائری اور جنتری

چاند، تارے اور سورج، بلی، چیتا اور شیر، کتا، لومڑی اور بھیڑیا اپنی اپنی جگہ ایک ہی کنبے کے ارکان ہیں۔ بعینہ کیلنڈر، ڈائری اور جنتری مشترکہ خاندان کے افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں کا وجود تاریخ، ماہ اور سال کے بل بوتے پر قائم ہے۔ میاں سال کی ۱۲ بیویاں ہیں۔ اور ہر بیوی کی گود باری باری سے روزانہ چاند سے بچے سے ہری ہو جاتی ہے۔ چشم بد دور ایک مہینے میں سبھی بیویوں کی گود اٹھائیس[۲۸]، انتیس[۲۹]، تیس[۳۰] یا اکتیس ہنستے کھیلتے پھول سے ہری ہو جاتی ہے۔ اس طرح برس بھر میں اولاد کی تعداد مل ملا کر ۳۶۵ یا ۳۶۶ تک جا پہنچتی ہے۔ جب سے زمین کی تخلیق ہوئی ہے اس وقت سے اب تک ان گنت دن ناقابل شمار مہینے اور بے حد و حساب برس گذر گئے مگر نظام کائنات ہے کہ جوں کا توں قائم و دائم ہے اور انسان کی بے بسی پر خندہ زن ہے۔

سچ پوچھیے تو بغیر کیلنڈر کا گھر برہمچاری آشرم، بنا ڈائری کے جیب کٹا ہوا کنبہ اور بلا تقویم کا کتب خانہ پھیکی سیٹھی بریانی ہوتا ہے۔ آج یہ تینوں چیزیں ہماری روزمرہ زندگی کے لوازم بن چکے ہیں۔

کیلنڈر مانجھے بیٹھی دلہن کے جیسے خانہ نشین اور پاکٹ ڈائری محبوبہ کی طرح دل کے قریب مگر بیوی کی مانند جیب پر قابض ہوتی ہے۔ بے چاری جنتری سینتری، بھیتری بڑھیا کی پوزیشن رکھتی ہے جس کا مصرف گھر، ہمسایہ اور محلے کے لوگوں کو شادی بیاہ، تیج تہوار اور سماجی تقریبات میں صلاح و مشورہ دینا ہے۔

کیلنڈر کے کئی فائدے ہیں۔ بال بچوں اور فرنیچر کے ساتھ ساتھ یہ بھی گھر کی رونق کو دوبالا کرتا ہے۔ عموماً ہر گھٹیا اور بڑھیا کیلنڈروں پر دن، تاریخ اور مہینے کے علاوہ ایک جاذب نظر تصویر اور اشتہار ضرور ہوتا ہے۔ ہم تہوار، دوسرا سنیچر اور عام چھٹیوں کے ساتھ کم سے کم رخصت لے کر زیادہ سے زیادہ لمبی چھٹی منا سکتے ہیں۔ دفتر میں کام کرنے والے افراد یا ان کے ارکان خاندان پیوستہ تعطیلات کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصلحتاً ایک آدھ روز کے لئے بیمار بھی پڑ سکتے ہیں۔ جس دن

ٹیوشن پڑھانے والا ماسٹر نہیں آتا۔ اس روز مائیں کیلنڈر پر چلیپے کا نشان لگا دیتی ہیں تاکہ ٹیوشن فیس دیتے وقت بطور سند کام آئے۔ دودھ کا حساب بھی کیلنڈر پر "قلم زریں رقم" سے لکھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں ہمارے یہاں ہیرا آئیل سپلائی کرنے والے "بڑے میاں" برآمدے کی دیواروں پر بقایا لکھ دیا کرتے تھے بقایا کیا لکھتے تھے کچھ آڑی کھڑی لکیریں کھینچ دیتے تھے۔ ٹیڑھی کو ڈائنوں کی یہ پہیلی صرف وہی بوجھ سکتے تھے۔ ان گنہگار آنکھوں نے بعض شعراء کو بھی ڈیڑھ ڈیڑھ انچ ملبی پنسلوں سے سگریٹ کی ڈبیہ پر اشعار کی تخلیق کرتے دیکھا ہے۔ ہمارے ملک میں پبلک بلڈنگوں، ریلوے اسٹیشنوں، آثار قدیمہ کی بیرونی و اندرونی دیواروں پر پنسل، کوئلے اور رنگ پینٹ سے انتہائی فحش قسم کے خاکے، تصویریں اور فقرے تحریر کئے جاتے ہیں۔ ویسے شہد، دودھ اور گھی کی اصلیت جانچنے کے جدید پیمانے کبھی کبھی غلط بھی ہو سکتے ہیں مگر اس قماش کی باتیں کسی بھی ملک کی تعلیم و تہذیب اور عوامی ذہنیت کو پرکھنے کا باون تولے پاؤ رتی صحیح معیار ہیں۔

کیلنڈر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالے دیوار پر لٹکتا رہتا ہے۔ موقع بے موقع اس کا وجد، ہیجان اور اضطراب یا ہر کی ہلچل یعنی طوفان یا دو باراں کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر بیرونی دنیا میں سکون ہو تو اس پر نحوست، بے حسی اور مُردنی سی چھائی رہتی ہے۔ ویسے ہی جیسے سنسنی خیز خبروں کے بغیر اخبار بیچنے والے ہاکر کا دل بُجھا بُجھا رہتا ہے۔ بعض کیلنڈر، جنتری کا دیوار ایڈیشن ہوتے ہیں ان پر تقویم کی تمام ضروری چیزیں درج ہوتی ہیں مثلاً مختلف علاقوں، فرقوں اور ذاتوں کے اعراس، میلے اور تہوار، مشاہیر کی وفات اور پیدائش کے دن، چاند گہن اور سورج گہن کی ساعتیں، طلوع و غروب آفتاب کے اوقات صوم و صلوٰۃ کا ٹائم ٹیبل، ہندی، اسلامی، انگریزی و فصلی مہینے اور تاریخیں، سیارگان اور بروج کی نقل و حرکت اور مقام وغیرہ وغیرہ۔

درحقیقت اس قسم کے کیلنڈروں سے استفادہ کرنے کے لئے دوربین کا استعمال ضروری ہے۔ مگر یہ تو ایسا ہی ہے جیسے چڑیا کی ننھی سی جان لینے کے واسطے مشین گن کا مورچہ لگا دیا جائے یا پھر پیاسے کو کنویں کے پاس جانا چاہیئے مگر یہاں کنواں سیدھا نہیں الٹا ہے کیونکہ کنواں جھانکنے کے بجائے آپ کی گردن اٹھا کر دیوار پر جراثیم کے سائز والے حروف معہ ہجے کے پڑھنے پڑتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص ایک آدھ گھنٹے تک برابر نظریں جمائے قطب مینار کی سب سے اونچی منزل کو بغیر درد و تکلیف کے دیکھتا رہے۔ اس آسن کے ساتھ "جنتری نما کیلنڈروں" کا دو چار منٹ کا مطالعہ بھی گردن کی رگوں کو برسوں کی ریاضت سے بے نیاز کر دے گا۔ بہترین صورت یہ ہے کہ بروقت ضرورت "دیوار ایڈیشن جنتری" کو آپ چپکے سے اتاریں اور اطمینان قلب کے ساتھ درپیش مسئلے کو حل کرتے رہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ڈپلومیٹ دوسرے ڈپلومیٹ کو شیشے میں اتارنے کے لئے اپنے گھر ڈنر پر بلاتا ہے۔

دیواروں پر لٹکائے جانے والے کیلنڈر سادہ بھی ہوتے ہیں اور رنگین بھی۔ ان کا سائز چھوٹا بھی ہوتا ہے اور بڑا بھی۔ پورے سال کی تاریخیں ایک ہی صفحہ پر بھی ہوتی ہیں اور متعدد صفحات پر بھی۔ ویسے ہی جیسے کہیں

کہیں وسیع و عریض کوٹھی میں صرف میاں بیوی مع ایک عدد کُتّے کے رہتے ہیں اور اس کے برعکس چھوٹی موٹی جھونپڑی میں خانہ بدوشوں کا پورا کا پورا خاندان سکونت پذیر ہوتا ہے۔

کیلنڈر میں عموماً مذہبی پیشواؤں، قومی رہنماؤں، ادبی شخصیتوں، فلمی ستاروں، حسین مورتوں، معصوم بچوں، مختلف جانوروں اور دلکش مناظر کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے کم نمائندگی، شاعروں، ادیبوں اور مصنفین کو دی جاتی ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں مُلّا کی تنخواہ کا اسکیل گھٹیا سے گھٹیا چپراسی سے بھی کم تر ہوتا ہے جوان عورتوں کی تصویریں سب سے زیادہ تعداد میں چھپتی ہیں۔ ان میں شہری، دیہاتی اور پہاڑی۔ ہر جگہ کا "مال" پیش کیا جاتا ہے۔ خوبصورت و نازک اندام عورتیں طرح طرح کے پوز میں دکھائی جاتی ہیں۔ اس قسم کی تصویر کا مقصد "جب ذرا گردن اُٹھائی دیکھ لی" ہوتا ہے۔

زیادہ تر خوبصورت "ٹیبل کیلنڈر" بڑے بڑے عہدیداروں کے حصے میں آتے ہیں جس طرح بعض شاعرات مشاعرہ میں چار چاند لگانے کے لئے بر جے خرچے سے بلائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ٹیبل کیلنڈر بھی صرف دفتروں کی شوبھا بڑھاتے ہیں۔ کئی سستے کیلنڈر ہوتے تو ہیں سال بھر کے لئے مگر وہ بمشکل ایک آدھ مہینہ چلتے ہیں۔ بعض مرتبہ کنکوا اڑنے بھی نہیں پاتا کہ ہوا میں اُس کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں اور بے چارہ بچہ ہاتھ مل کر رہ جاتا ہے۔ کچھ کیلنڈر ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں کہ جن پر مہینے اور تاریخیں غلط چھپ گئیں اور وہ کیلنڈر مارکٹ میں بھی آگئے۔ جب مذہبی، درسی اور تحقیقی کتابیں اغلاط سے پُر ہوسکتی ہیں تو اس معاملے پر افسوس کا اظہار کرنا "اندھے کے آگے روئے اور اپنے دیدے کھوئے" والی بات ہے۔

کچھ کیلنڈروں کے ورق روز یا ماہ بہ ماہ پھاڑ دیئے جاتے ہیں۔ گویا ان اوراق کی حیثیت مفلس کم درجہ اور بے مایہ لوگوں کی ہے، جو کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارنے کے بعد سماج، تاریخ یا جریدۂ عالم پر قلمی تاثرات اور ذاتی مشاہدات کا صحیح صحیح اندراج کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اشاعت کی غرض سے روزنامچے لکھتے ہیں ان کی تحریر میں صداقت اور خلوص کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ جھوٹا حلف اٹھاتے وقت پرانے گنہگاروں کا چہرہ بھی متغیر ہوسکتا ہے۔ ڈائری کا ایک اور مصرف بھی ہے۔ آج کل زیادہ تر شاعر لمبی چوڑی بیاض رکھنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی، پیاری پیاری ڈائریاں بروئے کار لانے لگے ہیں۔ اب حقہ چلم ساتھ ساتھ اُٹھائے پھرنے کا زمانہ تو رہا نہیں۔ اس لئے سگریٹ کا پیکٹ جیب میں رکھنا پڑتا ہے۔ جیب میں اشعار کی ڈائری یا نوٹ بک رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ شاعر اپنا کلام بلاغت نظام بروقت ہر جگہ اور ہر شخص کو سنا سکتا ہے۔

جنتریاں مختصر سی انسائیکلو پیڈیا ہوتی ہیں۔ جن میں "تقویم نما کیلنڈر" کی خصوصیت کے علاوہ ڈاک خانوں اور تار گھروں کے مختلف نرخ نامے، ریلوے ٹائم ٹیبل ملک کی صوبہ واری آبادی اور ریاستی راجدھانیاں، اوزان و پیمانہ جات کی جدولیں پھڑکتی غزلیں، طوالفوں اور بادشاہوں کے گھسے پٹے لطیفے، دقیانوسی کہاوتیں، پیروں، فقیروں اور سادھوؤں کے ٹوٹکے اور چٹکلے محبوب حاکم اور دشمن کو قابو میں کرنے کی پُر اثر دعائیں، سینکڑوں سال سے سینہ بہ سینہ

منتقل ہونے والے نسخہ جات کی دوائیں فال دیکھنے کے متعدد طریقے۔ چاند سورج اور سیاروں کے اچھے برے اثرات، جنم کنڈلیاں، قسمت کا حال اور قومی و بین الاقوامی مسائل سے متعلق پیشین گوئیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ گھونڈے پیر کی قبر پر منت مانگنے والوں کی بعض مرادیں برآتی ہیں۔ جس شخص کی مراد پوری ہوتی ہے وہ تو دل وجان سے گھونڈے پیر کا معتقد بن کر دھوم دھام سے نذر و نیاز چڑھاتا ہے۔ یہی حال پیشین گوئیوں کا ہے۔ کچھ صحیح ثابت ہوتی ہیں اور کچھ غلط۔

عام طور پر کیلنڈر ڈائریاں، تقویمیں ایک سال کے لئے ہوتی ہیں مگر انسان ساٹھ ستر سال تک جی سکتا ہے۔ ہماری زندگی میں خوشی کے لمحے، دکھ کی گھڑیاں اور سپاٹ وقفے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے عرصۂ حیات میں آگے بڑھتے ہیں ویسے ویسے ہماری یادوں کی جھولی تلخ سلوک کے کانٹوں، خدمت خلق کے پھولوں اور بے مقصدیت کے نوکیلے پتھروں سے بوجھل ہوتی جاتی ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے تب ہماری زندگی کا غبارہ پھٹ پڑتا ہے اور یادوں کی یہ جھولی کانٹوں، پھولوں اور پتھروں کے ساتھ ہمارے پیچھے آنے والی نسل کی چندیا پر آگرتی ہے۔ ان کانٹوں کی چبھن تیز پھول کی وار جتنی خوشگوار اور پتھروں کی ضرب جتنی سخت ہوگی اس تناسب سے ہماری یاد عوام و خواص کے دلوں میں باقی رہے گی۔

بعض کیلنڈر مستقل نوعیت رکھتے ہیں صرف ان کی تاریخیں اور مہینے بدلتے رہتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ کیلنڈر دیہاتی گھروں کے آس پاس کی گندی نالیاں ہیں، جہاں کا پانی مٹی میں جذب ہوکر دوبارہ پینے کے کام آتا ہے۔

کیلنڈروں کے ساتھ ساتھ ڈائریوں کا تعلق بھی تاریخوں سے ہے۔ بعض ڈائریاں جیب میں رکھی جاتی ہیں، ان میں ٹیلی فون نمبر پسندیدہ اشعار، ریل گاڑیوں پر ملنے والے نئے نئے واقف کاروں کے پتے، سفرنامہ لکھنے کی غرض سے نوٹ کئے ہوئے الٹے سیدھے پائنٹ، ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی موٹر گاڑیوں کے نمبر اور دنیا بھر کی ایسی ہی الم غلم چیزیں ہوتی ہیں۔ پاکٹ ڈائریوں میں ہلکی یا گہری سیاہی اور کالی، لال اور نیلی یا موٹے اور باریک نوک کی ادھ چھلی پنسلوں سے اندراجات کئے جاتے ہیں۔ سال دو سال کے بعد جب یہ ڈائریاں بیویوں کے ہاتھ لگتی ہیں تو وہ سادہ اوراق پر دھوبیوں، درزیوں اور سبزی والوں کا حساب لکھنا شروع کردیتی ہیں۔ ویسے ہی جیسے شوہر کے پرانے بش شرٹ کو بیویاں جوتے چپل اور سینڈلوں کو قرینے سے سجانے کے کام میں لاتی ہیں۔ کچھ ڈائریاں دفتری اور انتظامی کارگزاریاں قلم بند کرنے کے سلسلے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان روزنامچوں کی صحت اور عدم صحت کا علم رکھنے والے کے علاوہ صرف خدائے واحد کی ذات کو ہوتا ہے۔ چند ڈائریوں میں روزمرہ کی مصروفیت اور آئندہ کے لائحہ عمل درج ہوتے ہیں۔ مثلاً لنچ، ڈنر، ڈانس، پکچر، کلچرل پروگرام، ورائٹی شو، میٹنگ اور مشاعرہ وغیرہ۔ ان میں سے کئی دعوت نامے خوشامد، سفارش یا تحریص سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ایک اور ڈائری ہوتی ہے جسے عرف عام میں روزنامچہ کہتے ہیں۔

— —

ڈاکٹر رضیہ صدیقی
(حیدرآباد)

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے

روزمرہ کی زندگی کے واقعات میں غالب ہی نہیں بلکہ دیگر بڑے شعراء خصوصاً فارسی میں حافظ و سعدی اور اردو میں اقبال اور میر بے اختیار یاد آتے ہیں۔ لیکن غالب کے زیادہ یاد آنے کی وجہ تو تمام تر شخصی ہے۔ والد مرحوم اکثر گھر میں کلام غالب اپنے مخصوص طرز میں موقع بہ موقع پڑھتے یا گنگناتے رہتے تھے۔ اس طرح ایسے وقت سے جبکہ شعر کا لفظی ترنم ہی متاثر کرتا تھا، اشعار غالب تحت الشعور میں مرتسم ہوتے گئے۔ ویسے شعر و ادب کا ذوق ورثہ ہی میں ملا۔ میری خالہ بشیر النساء بیگم بشیر کا کلام بھی بچپن سے کسی نہ کسی طور کانوں میں پڑتا رہا، جو خود غالب اور اقبال سے کافی متاثر تھیں۔ غالب کے کلام کا ایک منفرد اور مخصوص رنگ ہے۔ چنانچہ اسی رنگ میں انیس کا یہ شعر ہے

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے میں انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس طرح کلام غالب کا دھوکہ اکثر ایسے اشعار پر بھی ہوتا ہے جو دوسروں نے اسی رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ بعض حضرات اکثر کلام غالب کا حوالہ دیتے ہیں جس سے ان کی بات زیادہ پُر اثر اور واضح ہوجاتی ہے، جب بھی باذوق بزرگوں کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کو بھی غالب ہر قدم پر یاد آتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں کلام غالب سے ہی کچھ نمونے پیش کرتی ہوں کہ وہ کیوں اور کیسے ہمیں یاد آتا ہے۔ طالب علموں میں ہڑتال اور ساتھ ہی توڑ پھوڑ اور پتھراؤ کا رجحان عام ہے ایسے موقعوں پر مجھے یہ خیال گزرتا ہے کہ غالب نے تو لڑکپن میں مجنوں پر پتھر اُٹھایا تھا کہ انھیں سر یاد آیا۔ اگر ہمارے نوجوان یہ مصرعہ "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" پڑھے ہوتے تو سڑک کے برقی قمقمے، ریلوں اور

بسوں کی کھڑکیاں، دوکانوں کے شوکیس اور راستہ پر کھڑی ہوئی موٹروں کے شیشے اس شدت سے ان کا نشانہ نہ بنتے۔ الکشن کے بعد قومی رہنماؤں اور نیتاؤں کا جو رویہ ہوتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ایسے وقت یہ شعر بہت یاد آتا ہے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

اگر اس شعر سے وہ لوگ سند پکڑیں تو ان کے لئے وجہ تسلی ہو۔

حال ہی میں ایک لکچرر نے غم عشق سے گھبرا کر ریل کے انجن سے تیشے کا کام لے کر خودکشی کرلی۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

غالبؔ نے کہا تھا: "عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا" لیکن مرحوم لکچرر کے حق میں ایسا نہیں تھا بلکہ وہ مجبور اس لئے ہوئے کہ "آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا" اور "حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا" یا یہ خیال آیا "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

[illegible] کبھی خوبیوں کے بزرگ کے انتقال کا تذکرہ ہوتا ہے تو تان اسی پر ٹوٹتی ہے ——
[illegible] کرے عجب آزاد مرد تھا" لیکن یہ ستم ظریفی ہے کہ اس کا مصرعۂ اولیٰ "یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے" کبھی کوئی ایسے موقعوں پر استعمال نہیں کرسکتا!

[illegible] یونیورسٹی میں کچھ ایسی بھی نقاب پوش آتی تھیں جنھیں لیڈیز روم میں بے نقاب دیکھ کر فوراً یہ شعر [illegible]

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

[illegible] دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ ہیں

[illegible] خاتون کو عرصہ سے جانتی ہوں جو رونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی ہیں۔ جب یہ اپنے [illegible] کرتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے "اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا"

[illegible] کے آئے دن کے حادثات کے بعد ریلوں کے بڑے وزیر کا پیام ہمدردی سننے کے بعد بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے۔ "ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!"

دورِ جدید کے ایک پارسا کے بارے میں سننے میں آیا کہ موصوف اہلِ خاندان پر بڑا ظلم ڈھاتے ہیں تو فوراً یاد آیا۔ "بہ میر صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا" ایسے حضرات جب وعظ فرماتے ہیں تو اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں لیکن "چوں بہ خلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند"

بیچارہ مدرس جب طالبانِ علم کے جوابی بیاض دیکھتا ہے تو اس کے لئے غالب نے بہت پہلے آج کل کا اندازہ لگا کر ہی رہبری کر دی ہے کہ " رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھو "

ایم۔اے میں ایک ساتھی طالب نہیں بلکہ خاتون بہت بھاری بھرکم لباس اور متعدد طلائی و نقرئی زیورات میں کالج آتی تھیں اور تھیں بھی خیر سے بھاری بھرکم۔ ہمیشہ دیر سے کلاس میں آتیں۔ ایک بار کسی نے پوچھا " ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا " میں نے ان کے پیروں میں پڑے وزنی کڑوں کی طرف اشارہ کیا کہ یہ باعثِ تاخیر ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ دیر تک نہانے کی عادی ہیں، اس لئے حمام باعثِ تاخیر تھا۔ ہماری کلاس میں ایک چھ فیٹ اونچی لڑکی تھی۔ جب ان سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا تو فوراً یاد آیا ؎

" جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا "

سرکاری دواخانوں میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی لاپرواہی دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ شائد وہ اس کے قائل ہیں کہ " درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا " یا یہ کہ " اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج "

آج کل کی ماڈرن طالبات جو پردے کی سخت خلاف ہیں، اپنی تائید میں غالب کو پیش کرتی ہیں کہ " چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا " لیکن شائد وہ یہ بھول بیٹھی ہیں کہ " دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ " ۔ " دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک "

ہماری ایک ساتھی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے بار بار عنوان اور نگران کار بدلے۔ جب وجہ پوچھی گئی تو ان کی طرف سے میں نے جواب میں کہا " پہچانتی نہیں ابھی راہبر کو یہ "

پیروی میں ماہر ایک صاحب کو جو درجہ سوم کے مستحق تھے جب درجہ اول ملا تو میں نے کہا۔
" گدائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں "

ہماری ایک ساتھی اونچی ایڑی کا سینڈل پہنے بہت تیز چلا کرتی تھیں اور بذاتِ خود تھیں بھی قیامت۔ ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا " لرزے ہے موج مئے تری رفتار دیکھ کر " دوسری پستہ قد صاحبہ سر کے بالوں کو ایک بڑے ٹوکرے کی شکل میں اوپر باندھتی تھیں تاکہ قد اونچا دکھائی دے۔ انھیں دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا

" بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے "

ایک طویل عرصہ کے بعد ایک خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کبھی بہت ہی حسین سمجھی جاتی تھیں لیکن شادی کے بعد پئے در پئے کئی بچے ہو گئے جنھوں نے ماں کا حسن بانٹ لیا۔ ان کو دیکھتے ہی غالبؔ کا یہ مصرعہ فوراً یاد آیا " سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں " اتفاق کی بات کہ ایک لڑکے کو لالہ اور دوسری لڑکی کو گل کی عرفیت دی گئی تھی۔

جامعہ عثمانیہ کا مانوگرام بیس سال کے عرصہ میں کیا سے کیا ہوگیا۔ آرٹس کالج کی سرخ سیڑھیوں کے ان اوپر انگریزی طور پر جو قدیم مانوگرام کندہ ہے اسے دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے کہ گویا وہ غالب کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ شعر "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

کالج میں ہمارے ساتھ ایک باریش پابند شرع بزرگوار تھے جو ساتھیوں کو ہمیشہ نماز کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ ان کے بارے میں یار لوگوں نے غالب کا مصرعہ ذرا سی تحریف کے ساتھ یوں کردیا۔
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں :

خبر ہے کہ امتحانوں کا موجودہ طریقہ بدل دیا جانے والا ہے اور طلباء و طالبات کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی تعلیمی معاملوں میں دی جانے والی ہے۔ یہاں تک کہ پرچوں کی جانچ کے لئے جو "Moderation Board" ہوتا ہے۔ اس میں بھی ان کا نمائندہ رہے گا، کیونکہ ان کا اعتراض ہے۔ ع
"آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا"

ایک درگاہ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی، لیکن مجاور نے دروازے پر روک دیا کہ خواتین کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ فاتحہ پڑھ کر لوٹی تو ایسا محسوس ہوا

"یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں"

ویٹ نام میں لاکھوں امریکی سپاہی مارے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے غالب نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ ؎

"مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بیکسی کی شرم"

جاگیرداری نظام کی ایک زندہ یادگار شخصیت کو جن کی خوش پوشی اور نوابی مشہور تھی۔ خستہ حال سیکل پر تشریف لاتے اور لے جاتے دیکھتی ہوں تو فوراً یہ مصرعہ ذہن میں گونجتا ہے۔ ع

"مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں"

غالب کے اشعار کو بطور تمثیل لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ چند صفحات میں کوئی بھی غالب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں اس مضمون کو غالب کے ہی شعر پر ختم کرتی ہوں۔

"ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے"

--

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک ہی جانب لکھیں۔

ایس۔ ایم۔ حسین قریشی
(کراچی)

پڑیئے "گھر" بیار

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آتش تو تھا یا نہیں تھا، راقم ضرور جوان تھا۔ پورے ناظم آباد میں اس کی ذہانت اور جسامت کا ڈنکا بجتا تھا۔ خود سرا تنا کہ بقول اکبرالہ آبادی ؎

موجِ نصیحت اک طرف دل کی روانی اک طرف
گُل شیخپورہ اک طرف میری جوانی اک طرف

ہماری مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم فٹ بال کے مایۂ ناز کھلاڑی تھے۔ ایک مرتبہ ہماری ٹیم ایک نمائشی ٹورنامنٹ کے فائنل میں تھی کھیل بڑے زور شور سے جاری تھا اور تماشائی گراونڈ میں سنگترے کے چھلکے پھینک پھینک کر (بلکہ مار مار کر) کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے ہم سینٹر فارورڈ کی پوزیشن میں کھیل کر دشمن کے گول پر تابڑ توڑ ناکام حملے کر رہے تھے۔

پھر یہ ہوا کہ اچانک ہمارا سر چکرانے لگا۔ پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ واقعی زمین گھومتی ہے، بلکہ اُس وقت خود ہمارے گرد گھوم رہی تھی۔ ہم لڑکھڑا کر گراؤنڈ بوس ہونے والے تھے کہ ایک ساتھی سہارا دے کر باہر لایا گھر پہنچنے تک جسم میں بخار کی حرارت ہو چلی تھی لیکن بزرگوں کے منع کرنے کے باوجود ہم نے ٹھنڈے پانی سے غسل عرق کیا اور دفع حدت کے لیے پنکھے کے نیچے آکر لیٹ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ بخار کی شدت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا گیا اور تھرمامیٹر اس کی پیمائش سے عاجز نظر آنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب بلوائے گئے۔ اُنھوں نے کئی گھنٹے کا شیڈول مرتب کر کے دوائیں دیں اور شیڈول کے لحاظ سے فیس (بمعہ ٹی اے، ڈی اے) لے کر رخصت ہوئے۔ تاہم مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ والد صاحب کسی دوسرے ڈاکٹر کو مالی فیض پہنچانا چاہتے تھے مگر والدہ کے بے حد اصرار پر ہمیں رات گئے ایک پرائیوٹ ہسپتال کے پرائیوٹ کمرے میں داخل کروادیا گیا جہاں ہنگامی علاج شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موت اور زندگی کے درمیان میچ کا آغاز ہوا لیکن صبح ہونے تک زندگی پائنٹس پر جیت گئی۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ اہل خاندان نے پلنگ کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تسبیح تھی، کسی کے پاس دم کئے ہوئے پانی کی بوتل تھی، کوئی تعویذ پکڑے کھڑا تھا تو کوئی بغیر کسی روحانی آلے کے یونہی اوپر والے سے لَو لگائے ہوئے تھا۔ سب کے چہروں پر پریشانی، تشویش اور تھکن کے آثار تھے لیکن قدر گمنے میں ایک چاند چہرہ ستارہ

آنکھیں ٹاپ کی انجان حسینہ تازگی اور فرحت کے احساس کے ساتھ مُسکرا مسکرا کر دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ ہم تمام افسردہ چہروں کو نظرانداز کر کے اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ٹرے تھی جس میں غالباً ناشتہ تھا۔ البتہ ہمارے لیے ناشتے والی میں زیادہ کشش تھی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خراماں خراماں معطر معطر ہماری جانب بڑھ رہی تھی۔ عیادت کے لیے آنے والے دوسرے لوگ ہٹتے گئے، فاصلے گھٹتے گئے اور ظالم سماج کے بندھن کٹتے گئے۔ چند ہی لمحوں میں جب وہ رُوبرو ہوئی تو یہ عقدہ کھلا کہ نرس تھی اور ہمارے لیے ٹھوک کے حساب سے دوائیں لائی تھی۔

ایسا حسین، مہربان، نوجوان اور فیاض تیماردار دیکھ کر ایک لمحے کے لیے خود پر طیش آیا کہ پہلے کبھی بیمار کیوں نہ پڑے۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس نے بڑے پیار سے اپنا نرم و نازک ہاتھ ہماری کلائی پر رکھ دیا اس نے نبض کی رفتار گننی شروع کی اور اِدھر یہ کیفیت ہوگئی کہ ؂

"اس" نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا ؎ ہاتھ سے میرے میرا دل ہی چلا

اس نے کمال شائستگی سے ایک انجکشن ہمارے بازو میں گھونپ دیا اور ہمیں تکلیف کے بجائے ایک گونہ راحت کا احساس ہوا۔ بعدازاں چند ایک کڑوی گولیاں زیادہ کڑوے مکسچر کے ساتھ ہمیں دی گئیں جنھیں ہم نے اس طرح حلق میں اتار لیا جیسے جلیبیوں کو شہد میں گھول کر نوشِ جاں کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نیند کی وادیوں میں چلے گئے پر حالت یہ رہی کہ ؂

آنکھیں کھولیں بھی بند بھی کیں! ؎ وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

دوپہر کے قریب کسی کے نرم و گرم ہاتھوں کا لمس پیشانی پر محسوس ہوا۔ آنکھ کھلی تو اُسی قبالۂ عالم کو اپنے سے قریب تر پایا۔" اٹھیئے آپ کی دوا کا وقت ہوگیا ہے"، آواز کی شیرینی سے یوں لگا کہ گویا ہندی حسن پیکس نفیس اس کے گلے میں قیام پذیر ہیں۔" لیکن خالی پیٹ نہیں" یہ کہہ کر اس نے سوپ کا پیالہ ہماری طرف بڑھایا جسے ہم نے سقراطی انداز میں حلق سے اتار لیا۔

شام تک طبیعت کچھ کچھ سنبھل چکی تھی۔ گھر والوں کے چہروں کی بشاشت بھی لوٹ آئی۔ . . مگر محض عارضی طور پر۔ رات گئے پھر سانس اکھڑنے لگا اور حالت غیر ہوگئی۔ ایمرجنسی ڈیوٹی کے ڈاکٹر صاحب کی تلاش ہوئی اس لیے کہ ہم "کوما" میں چلے گئے تھے۔ رشتے داروں کے کہنے کے مطابق وہ اتنی تاخیر سے پہنچے تھے کہ اگر کچھ دیر اور نہ آتے تو کوئی ایمرجنسی نہ رہتی اور زندگی کا فل اسٹاپ لگ جاتا۔ پوری رات کباب سیخ کی طرح ہر سو کروٹیں بدلتے گزری۔ صبح وہ پری رُو غالبؔ کے اس شعر کی مجسم تفسیر بنے آپہنچی کہ ؂

لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ؎ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

اس وقت تک کچھ جغادری قسم کے ڈاکٹر بھی آچکے تھے۔ وہ ہمارے علاج کے سلسلے میں باہم صلاح مشورے کرنے لگے۔ انھوں نے ایک نیا شربت تجویز کیا اور ہم کسی کے شربتِ دیدار سے پیاس بجھاتے رہے۔ تاہم دونوں شربتوں نے مل کر دو آتشہ کا کام دیا اور دوپہر تک حالت میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ ہماری محسنہ نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا تھا۔ ہر پانچ دس منٹ بعد ٹمپریچر، نبض وغیرہ چیک کرتی اور دلنشین انداز میں تسلی دیتا۔ جیسے ہی جسم میں بات چیت کی قوت آئی ہم نے نیازمندی سے اس کا نام پوچھا۔

"شگفتہ" اس نے شگفتگی کے ساتھ جواب دیا اور پوچھی "اب آپ کیسے ہیں؟" ہم نے ایسے موقعوں کے لیے مخصوص مرزا نوشہ کا مشہور و معروف شعر (ان کے دیکھے سے جو . . . .) پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے ہمارے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید اسے غالب سے کچھ زیادہ عقیدت نہیں ورنہ شعر تو برمحل تھا۔ تاہم وہ سخن شناس نکلی۔ بولی "ایسا نہ کہیئے، اب آپ کا حال واقعی اچھا ہے۔" پھر اس نے ہمارے جملہ کوائف دریافت کیے بالکل وہی کوائف جو عموماً شادی کے دفتروں میں درج کیے جاتے ہیں یعنی روزگار، آمدنی، مشاغل وغیرہ جو ہم اپنی نحیف آواز میں اُسے بتلاتے رہے۔ بات جب خاندان اور حسب نسب تک پہنچی تو ہم نے پنڈت گلزار دہلوی کا یہ شعر پڑھا ؎

سنتے ہیں عشق نام کے گزرے ہیں اک بزرگ ؛ ہم لوگ بھی فقیر اسی سلسلے کے ہیں!

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یہ شگفتہ سے ہمارا پہلا باقاعدہ مکالمہ تھا۔ پھر تو اس کے ساتھ اس قسم کی گفتگو روز کا معمول بن گئی اب جوں جوں حالت نارمل ہو رہی تھی، گھر والوں کے چہروں پر خوشی کی اور ہمارے چہرے پہ مایوسی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہم ایسے "سازگار" ماحول شفایابی کے لیے ہرگز تیار نہ تھے حضرت داغ نے ایسی ہی سچویشن کے لیے کہا تھا ؎

ڈر گئے نام شفا سن کے یہ خواہش مرگ ؛ منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

ہمیں ہسپتال میں داخل ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ شگفتہ کا بیشتر وقت ہماری تیمار داری پر صرف ہو رہا تھا اگرچہ ہسپتال میں اور مریض بھی تھے (نرسیں بھی تو دوسری کئی ایک تھیں) ایک روز معمول کے مذاکرات کے دوران ہم نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے شجرۂ نسب سے کما حقہٗ آگاہی حاصل کر چکی ہے، اب کچھ اپنے بارے میں بھی ہمارے علم میں اضافہ کرے۔ یہ سننا تھا کہ اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اشکوں کا سیلاب پلکوں کے نازک بند کو توڑ کر باہر نکل پڑا۔ ہم نے تسلی تشفی دے کر خاموش کرایا تو اس نے اپنی دلخراش روداد سنائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس کا گھر تقسیم کے ہنگاموں میں تباہ ہو گیا تھا۔ باپ، بھائی اور کئی ایک عزیز بھی آزادی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ ہجرت کر کے پریشانی کے عالم میں پہلے لاہور اور پھر کراچی پہنچی۔ گھر غریب آباد میں ہے لیکن وہ خود ہاسٹل میں رہتی ہے اور خاندان کی واحد کفیل ہے۔ یہ داستانِ غم سن کر ہمارا نرم و نازک دل تڑپ کر رہ گیا چنانچہ غیر سگالی اور امدادِ باہمی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے اسے پیشکش کی ؎

آؤ مل جل کر علاجِ غمِ دوراں کر لیں ؛ زندگی بھر کے لیے عیش کا ساماں کر لیں

اس نے نظریں جھکا لیں، گویا خاموشی نیم رضا۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ اُس کے خاندان کی کفالت ہمارے ذمہ ہوگی ساتھ ہی اس سے وعدہ لیا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بحیثیت شریکۂ حیات اپنی تمام توجہ اور محبت ہمارے لیے وقف کر دے گی۔ اب ہم دونوں کو اندیشہ تھا کہ ہمارا جذباتی فیصلہ شاید دونوں کے اہلِ خاندان کو فوری طور پر قابلِ قبول نہ ہو لہٰذا اب کچھ خفیہ طور پہ کرنا ہوگا۔ گھر والوں کو بعد میں منا لیں گے۔

تقریباً دو ہفتے بعد ہمیں ڈسچارج سلپ مل گئی۔ طے پایا کہ شگفتہ اُسی دن ملازمت کو خیرباد کہہ دے گی اور وہ [illegible] ہمارا انتظار کرے گی۔ پروگرام کے مطابق ہم کو حیدرآباد

روانہ ہونا تھا جہاں ایک جگری دوست کے تعاون سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔ زندگی کا یہ اہم ترین فیصلہ کرکے ہم گھر آئے۔ دن بھر مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ آدھی رات کے قریب سکون نصیب ہوا۔ اب دھڑکتے دل کے ساتھ ہم نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے ضروری سامان اکٹھا کیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات ہم پر بہت بھاری تھی بالآخر تقریباً ۴ بجے جب تمام گھر والے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، ہم دبے پاؤں چوروں کی طرح اپنا سوٹ کیس سنبھالے گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے دوسرے الفاظ میں یہ ایک "ہٹ اینڈ کلین آپریشن" تھا۔ تقریباً دو گھنٹے ٹیکسی میں بلاوجہ گھومنے کے بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہم ہسپتال پہنچے اور سجنی کے کمرے میں معہ اپنے سوٹ کیس کے وارد ہوئے۔ یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ اطمینان سے ناشتہ تیار کرنے میں معروف تھی۔ جسمانی حلیئے اور سامان کی ترتیب سے بھی قطعاً اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اسے زندگی کے ایک عظیم سفر پر چلنا ہے۔ ہم نے قدرے ترش روئی کے ساتھ کہا "یہاں تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور تم نے ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی؟"

"کیسی تیاری" اس نے زیادہ ترش روئی کے ساتھ سوال کیا۔

"خدا کے لیے شگفتہ مذاق نہ کرو اور سامان فوراً پیک کرو" ہم نے اصرار کیا۔

"مسٹر! مذاق آپ کر رہے ہیں بلکہ مجھے تو آپ کے دماغ میں فتور لگتا ہے؟" وہ روکھے پن سے بولی۔ "میں نے آپ کی تیمارداری ایک فرض شناس نرس کی حیثیت سے کی تھی۔ آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور شدید نفسیاتی ہیجان کے باعث آپ پر ہذیانی کیفیت طاری تھی لہٰذا میرا فرض تھا کہ آپ کی دل جوئی کرتی ورنہ آپ کا بچنا محال تھا۔ . لیکن آج کل جس کی طرف مسکرا کر دیکھو وہ بوریے بستر سمیت چلا آتا ہے"۔

"تو یہ تمہارا دوسرا روپ ہے!" ہم نے دانت پیس کر طنزاً کہا۔

"میرا ایک اور صرف ایک روپ ہے۔ یعنی پیشہ ور نرس اور بس!" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ساتھ ہی تنبیہہ کی۔ "اور سُنیئے مسٹر دس نمبر! احمقوں کی جنت سے باہر نکل کر حقائق کا مقابلہ کرنا سیکھئے"!

"اچھا تو اب میں دس نمبری بھی ہو گیا" ہم نے نہایت لاچار لہجے میں زیرِ لب کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں" اس نے وضاحت کی۔ "دراصل ہم لوگ مریضوں کو ان کے کمرے یا بیڈ کے نمبر سے پہچانتے ہیں"۔

اب اس کے پاس کہنے کے لیے صرف دو الفاظ رہ گئے تھے۔ یعنی "گیٹ آؤٹ" جس کا ہم نے اسے موقع نہیں دیا۔

اور پھر جب ہم منہ لٹکائے قسمت کا ماتم کرتے، اپنا سوٹ کیس سنبھالے، بوجھل قدموں کے ساتھ اُس جفا شعار کے کمرے سے باہر نکل رہے تھے تو دیکھا کہ ایک صاحب ادھیڑ عمر کے سوٹڈ بوٹڈ، گردن اکڑائے منہ میں سگار دبائے، آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے کمرے میں داخل ہوئے اور ان کے دونوں ہاتھوں میں بھاری بھاری سوٹ کیس تھے!!!

▲▽▲

* انیس سلطانہ
(بھوپال)

ریٹائرمنٹ کے بعد

آدمی کا ریٹائر ہونا بذاتِ خود معتبر ہونے کی دلیل ہے۔ جناب پروفیسر صاحب اتنے اعتبار حصیل چکے تھے کہ مزید معتبر ہونے کی ادا انھیں قطعی پسند نہ آئی۔ زندگی بھر کوئی ایسی حرکت نہ کی کہ ان پر حرف گیری کی جاسکے۔ کسی افسر کو ناخوش نہیں کیا، کبھی تعطلی کی نوبت ہی نہ آئی اور کتابوں پر جھکے جھکے گردن جو اٹھائی' بالوں کی سفیدی نے چغلی کھائی اور اب تو ریٹائرمنٹ لیٹر ان کے ہاتھ میں تھا۔

ساری زندگی طالب علم کہہ کہہ کر اپنے کو دھوکہ دیتے بھی رہے اور کھاتے بھی رہے اور جب طالب علموں سے ناتا ٹوٹا تو کتابوں پر گویا کہ تازیانۂ حرم بر او بھی ظلم توڑنا شروع کردیا۔

اب ایک عالم ان کا قدرداں ہے اور وہ علم کے بوجھ تلے (بہ ظاہر انکسار سے) جھکے جارہے ہیں اور یہ ہیں جناب ادیب عالم مروا ریدی صاحب۔ لب و لہجہ میں وہ گھن گرج کہ قیامت بھی مرید ہوجائے۔ چال میں ایک رچی بسی نستعلیقیت' غلط لفظ اور غلط محاورہ بولنے پر جو چور کی سزا وہ مجرم کی۔ حالانکہ ہمیشہ غلط املا اور غلط انشا سے واسطہ رہا' لیکن ذہنی طور پر کبھی اسکے لئے تیار نہیں ہوئے۔ بیوی اَن پڑھ دیہاتی تھیں' بہت کچھ انھیں بھی سنوار لیا تھا۔ لیکن جب وہ کھانا "بنانے لگتیں" یا "وضو بنانا" شروع کردیتیں تو انھیں ذہنی کوفت ہوتی اور ٹوکے بغیر نہ رہتے۔ ایک بار بڑی بیٹی نے خط بھیجا' ہزار تو اس میں غلطیاں تلاش کی گئیں اور بواپسی ڈاک غلطی نامہ ارسال کیا گیا۔ اس کے بعد تو بیچاری نے توبہ ہی کرلی۔

البتہ چھوٹی بٹیا ذرا لاڈلی تھی اور زیادہ سمجھدار بھی واقع ہوئی تھی۔ ہمیشہ ہندی میں خط لکھتی' جسے وہ اپنے چھوٹے بیٹے سے پڑھوا کر سنتے۔ پوتوں' نواسوں سے محبت کرتے' مگر دور دور سے۔ تخلیہ میں البتہ کبھی کبھی ان سے محبت و بے تکلفی کا اظہار ضرور کرتے' لیکن بہو بیٹیوں کے سامنے ہرگز نہ کرتے۔ مبادا کہ بہو بیٹیاں کہیں اپنا گھر بار اور بچے ان پر چھوڑ کر نہ نکل جائیں۔

بلاناغہ، شام کو ٹہلنے نکلتے اور کچھ دوسرے معتبر حضرات کے ساتھ کبھی سیاسی اور کبھی ادبی مسائل پر گفتگو

کرتے۔ یہ بھی ان حضرات کی خوش بختی تھی کہ ایک پیر مرد نے اہل نظر کے ذوق کی تسکین کے لئے کتب فروشی کی دکان کھول رکھی تھی۔ فروشی تو خیر رسماً ہوتی تھی، اور کھولتے بھی وہ خود کہاں تھے ـــ !! صبح سے شام تک مختلف اوقات میں یہی سربرآوردہ حضرات دوکان کو رونق بخشتے تھے۔ ورنہ کب کی بند ہو چکی تھی۔ اگر کوئی شخص غلطی سے کتاب خریدنے پر مصر ہوتا تو اتنی بددلی سے منھ پھیر کر اسے کتاب تھماتے تھے جیسے راہ چلتے سائل کو تکلفاً کچھ تھما دیا جائے۔ لیکن جو شخص روزانہ ان کتابوں پر تبادلۂ خیال کرتا اسے ان کی چائے نوازی کا قائل ہونا ہی پڑتا تھا۔

بہرحال، مطلب دور ہوا جا رہا ہے کیونکہ دکان تھی اردو کی۔ اس میں بھی نہ ناول، نہ افسانے، نہ فلمی رسالے، اس لئے بس کھلی ہی رہتی اور تماشائے اہلِ نظر کرتی۔ کہ ارباب حل و نقد بوجھل بوجھل اصطلاحوں سے کتابوں کے نام تک اتنے رعب دار کر دیتے ہیں جن کو نہ چوروں کا ڈر نہ ساہوکاروں کا۔

خیر تو یہاں علماء کا مجمع ہوتا۔ دو چار کے بیٹھنے کو جگہ، باقی کھڑے رہتے، مفت ادبیات عالم سے استفادہ کرتے۔ بحث کرتے، نکڑ کے پان فروش سے پان لے کر کھاتے اور کھلاتے۔ جو جتنا زیادہ پان کھاتا اتنا ہی دامن داغ دار لئے واپس جاتا۔ مگر نہ پیشانی پر شکن آتا نہ نقد و نظر میں کوتاہی۔

گرما گرمی جب حد سے گذر جاتی تو کبھی آئس کریم یا کولڈ ڈرنک سے بھی شغف فرماتے۔ اور قوم کی سرد مہری نیز بے مہریٔ ایام کا گلہ کرتے جاتے۔

مرواریدی صاحب کے کچھ سرپھرے شاگرد کہیں راہ میں مل جاتے۔ مربیانہ قدر افزائی فرماتے۔ ساتھ لاتے۔ نئی نئی کتابوں کی رونمائی ہوتی۔ اگلی بار مہینوں تک وہ شاگرد نظر نہ آتے۔ مگر اللہ بڑا کارساز ہے، کچھ دوسرے ناتجربہ کار مہیا ہو جاتے۔

ہوتے ہوتے اب تو مہینوں سے نئی کتاب کی رونمائی کا موقع ہی نہیں آیا۔ کتابیں نہ آ رہی ہوں، ایسا بھی نہیں تھا۔ لکھنے والوں کی رفتار سست تھی۔ بازار میں آج کل مزاحیہ و طنزیہ ادب کی بھرمار تھی۔ وہ ایسی فضولیات میں پڑنے والے نہ تھے۔

حکیم شاہنواز درانی سے ادیب عالم کی گاڑھی چھنتی تھی۔ شہ پر شہ ہوتی۔ کبھی کبھی تو شہ مات بھی ہو جاتی۔ لیکن زیادہ تر یہ مات حکیم صاحب کے حصے میں ہی آتی۔ حکیم صاحب اب کوئی صرف نام کے حکیم تو نہ تھے۔ تھوڑے بہت مریض بھی آتے تھے۔ مگر شطرنج کا شوق انھیں لے ڈوبا۔ ہوتے ہوتے دوچار دواؤں کے علاوہ دوکان میں یا تو دواؤں کا اسٹاک ختم ہو گیا یا شربت نزلہ اور خمیرۂ گاؤزباں، اکسیر بن گئے کہ ہر مرض میں دیئے جانے لگے۔ مریض اب بھی آتے تھے، مگر گھنٹوں انتظار کے بعد نسخہ تجویز کیا جاتا، ورنہ چال بگڑ جانے کا خوف تھا۔ ہزاروں کی دوائیں اب صرف سینکڑوں کی رہ گئیں اور شطرنج کا نشہ بڑھتا چلا گیا۔ ہوش تو جب آیا کہ مریضوں نے اپنے بچوں کو انتظار سے گھبرا کر دواؤں کے خالی شیلف میں بٹھانا اور کبھی کبھی خود بھی بیٹھنا

شروع کردیا۔

ایک دن حکیم صاحب نے ارشاد فرمایا کہ پروفیسر صاحب، اتنے داؤ پیچ تو آ ہی گئے ہیں کیوں نہ عملی سیاست میں کودا جائے۔ پروفیسر صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، مگر وہاں تو چشمہ پہلے سے موجود تھا۔ اسی سے کام چلایا۔ سیاست پر بحث مباحثہ اور بات ہے لیکن یہ سیاست ــــ!!

حکیم صاحب کو تھوڑا سا گھما۔ لیکن حکیم صاحب نے انھیں کچھ یوں شیشہ میں اتارا اور ان کی خوش بیانی کی اتنی تعریفیں کیں کہ وہ اپنے کو پارلیمنٹ کا ممبر سمجھنے لگے۔

اب اٹھتے بیٹھتے ریہرسل ہونے لگی۔ الکشن ہونے میں تو ابھی کافی دن تھے۔ کیوں نہ سوشل ورک سے ہی ابتداء کی جائے۔ موصوف کو بیشتر نکاتی پروگرام سے بڑی دلچسپی تھی اور جب تک خود کسی پروگرام پر عمل نہ کرلیتے دوسروں کو اس کی تلقین کیسے کرسکتے تھے۔

چنانچہ ابتدا تو گھر سے ہی کرنا تھی۔ پہلا مرحلہ، تعلیم بالغان کا تھا۔ ملک سے جہالت کو جلد از جلد دور کرنا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے گھر کے نوکر کریم کو ایک سبق دیتے۔ اگلے دن اسے پھر کورا کاغذ پاکر شفقت سے پڑھانے میں معروف ہوجاتے۔

جنگل کٹتے جارہے ہیں، موسمیات اب نارمل ہوتی جارہی ہیں۔ چنانچہ دس بائی دس کے آنگن میں نیم کا درخت اور کریلے کی بیل تو لگا ہی لی کہ مصفی ہیں۔ پھر سوچا کہ باقی اٹھارہ نکات کے لئے بیرون در چلئے۔ پہلا مسئلہ تھا میل جول، محبت اور اتحاد کا۔ انھوں نے خود کبھی کسی سے آدھی بات نہیں کہی اور نہ ان سے کسی نے کہی۔ چنانچہ اپنی ہردلعزیزی کے تحت ایک اینٹی فسادات کمیٹی قائم کی گئی۔

عالم صاحب کی ہمہ دانی کا ایک زمانہ قائل بھی تھا اور قدردان بھی۔ چنانچہ آل انڈیا سطح پر اینٹی فسادات کے جلسہ میں آج تقریر کرنا تھی۔ ایک ہفتہ سے اوسان خطا تھے۔ پھٹے ہوئے کاغذوں سے کمرہ نقش فریادی بنا ہوا تھا۔ تقریر کی کل کسی کل نہ بیٹھتی تھی۔ بوجھل بوجھل الفاظ خود کی سماعت، نیز بصارت پر ضرب لگاتے۔ اٹکھیلیاں کرتے، مگر وہ سادگی جس کے وہ رسیا تھے، ہاتھ نہ آئی۔ یا اللہ کیا کریں۔ ایسی بے چارگی تو کسی جلسہ میں بھی نہ آئی ہوگی۔

وہاں معدودے چند حاضرین کی موجودگی میں پڑھنا، خواہ اخبار کی رپورٹ میں وہ ہزاروں ہوجائیں اور یہاں تو کثرت میں وحدت کی جستجو تھی۔

مرغاریدی صاحب کا عالم خراب تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کریم، مزاح داں بھی تھا اور مصلحت شناس بھی۔ اس نے ایک ترکیب سجھائی۔ "ارے تو ماسٹر صاحب آپ اتنے سارے لوگوں کو دیکھنائی مت۔"

"مگر بھئی کیسے نہ دیکھوں؟ سامنے ہی تو ہوں گے"

"تو حضور میں آپ کا چشمہ رکھے لیتا ہوں ۔"

اور کریم نے ان کا چشمہ رکھ لیا ۔ پروفیسر صاحب مائک پر آئے۔ کرتا، پاجامہ وہ ہمیشہ سے پہنتے تھے آج تو کھادی سے شغف فرمایا تھا۔ ڈائس شمامۃ العنبر سے مہک رہا تھا۔ ایک طرف پنڈت سکھا رام اور دوسری طرف ترکھان سنگھ براجمان تھے۔ اسٹیج خود ہی اینٹی فسادات بنا ہوا تھا۔ لیکن تقریر تو لکھی ہوئی تھی خیر کیا انھیں یاد نہیں۔ انھوں نے سوچا۔ تھوڑا سا کھنکھارے، گلا صاف کیا۔

"حاضرین — یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں کہ ہم یہاں کیوں اکٹھا ہوئے ہیں ؟"

"جی بالکل نہیں —" کسی منچلے نے جواب دیا۔

"آپ لوگ اینٹی کا مطلب جانتے ہیں —؟"

"جی نہیں —" کہیں سے جواب آیا۔

"تو پھر یہاں آپ لوگ کیوں آئے ہیں —؟"

"جی آپ کی تقریر سننے —"

سردار جی نے ٹھوکا دیا۔ "کیا کلاس لے رہے ہیں ؟"

"نہ — نہیں تو . . . . ." سکھا رام نے دھیرے سے پانی کا گلاس ان کے آگے کر دیا۔

"جی تو ابھی تک میں نے آپ کو کیا بتایا ؟"

"پروفیسر صاحب، آپ ترانۂ ہندی سنائیے" کسی نے فرمائش کی۔

اور پروفیسر صاحب نے نہ صرف ترانۂ ہندی سنایا بلکہ نیا شوالہ بھی حاضرین کی خدمت میں پیش کیا۔ مائک پر ان کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ آج سچ مچ نیا شوالہ نے بڑا حوصلہ دیا۔ ہاں یوں کہیے کہ بھگتوں کی پیت نے شکتی بھی دی اور شانتی بھی۔

--

ڈاکٹر جاہل ناگپوری

اک آدمی / اکادمی

"ایکادمی کیا ہے؟"
بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! ہر وہ شخص جس نے دو چار غزلیں کہی ہیں یا ایک دو مضامین لکھے ہیں یا کسی انجمن کی تشکیل کی ہے یا کوئی جلسہ رچایا ہے، یا کوئی مشاعرہ جمایا ہے یا کوئی لائبریری اور بزم ادب چلاتا ہے . . . غرض تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ایکادمی کہتے ہیں طائفہ آسانی کو — سرکاری دولت کو خسروانہ کو — اور جسے یہ مل جائے اُسے تو گویا جنت کا پروانہ مل گیا۔ یعنی جیتے جی جنت کے مزے لیا کرے — !
مثل مشہور ہے کہ مالِ مفت دلِ بے رحم — اور پھر دنیا بھی خدا نے کھانے پینے اور موج کرنے کے لیے بنائی ہے۔ رہ گئی خدمت تو خدمتِ خلق ہو یا خدمتِ زبان و ادب — ؟ کسی طرح نیوز میں رہیئے خود بخود ہوتی چلی جائے گی —
ہمارے محبانِ اُردو بڑے سادہ دل بندے ہیں اور خُدا نے اپنے فضل سے ان پر چالاک حکمرانوں اور شاطر مہربانوں کو مسلط کر دیا ہے۔ روتے ہوئے بچے کو کھلونا چاہیئے نا؟ سو لیجئے ایک شاندار کھلونا حاضر ہے۔
کچھ اہلِ نظر (کہ جنھیں کچھ اور نظر نہیں آتا) یہ سمجھتے ہیں کہ ایکادمی کے قیام سے اُن کی آن میں زبان و ادب پار لگ جائے گی — صد حیف! کبھی پھول کی پتی نے کسی ہیرے کا جگر چاک کیا؟ بچپن سے پڑھتے سنتے آئے اب کہ بوڑھے ہو چلے ہیں نہ ایسی پھول کی پتی دیکھی اور نہ ایسا ہیرا — شاید نصیب اپنا اپنا کا محل ہے — مگر ہم بسر نٹ یا تھیے بھلا کیا جانیں محل کو، محل تو اُن کی میراث ہیں جنھیں موقع ملا۔ جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ہمارے ملک کے موقع شناسوں کی ایک تاریخ بنتی ہے۔ افسوس کہ ابھی تک کسی اکادمی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ موضوع تو بڑا کشادہ ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھنے اور کہنے کی گنجائش ہے۔
اب رہا سوال ایکادمی چیست؟ تو اسے بھی سمجھ لیجئے۔ ایکادمی وہ ادارہ جو اک آدمی کے دستِ تصرف میں ہو۔ اور یہ اک آدمی وہ ہے جس کے لیے اک دمی، بنتی ہے (یعنی بگڑتی بھی ہے اور بگڑ بگڑ کر پھر بنتی ہے)۔
بسا اوقات "اکادمی" سے آدمی" ایک آدمی" بھی بن جاتا ہے یعنی شاعر، ادیب، صحافی اور معلم ہو کر بھی اعزاز و انعام سے سرفراز ہوتا ہے اور اپنی سوسائٹی میں "ایک آدمی" سمجھا جاتا ہے۔
سوسائٹی میں ایک آدمی بننا اور کہلانا ٹیڑھی کھیر ہے مگر بعض اللہ کے بندے سیدھے ہاتھ نہیں تو

اُلٹے ہاتھ سے بھی اسے سیدھی کر لیتے ہیں۔ عموماً یہ لوگ لیموں نچوڑ ہوتے ہیں جن کے لیموؤں کا رس شاعری، گفتگو، محافل، اسٹیج اور تحریر میں ــ غرض ہر فیلڈ میں قطرہ قطرہ نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

آپ تو جانتے ہیں کہ قطرہ قطرہ دریا می شود! چنانچہ لیموں کے قطرے جمع ہو ہو کر سنترے کا رس بن جاتے ہیں۔ آم کا جوس یا گلاب جامن کی چاشنی یا رس گلوں کی مٹھائی، یا مرغے کی ٹانگ یا بکرے کی ران یا بریانی کی قاب۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آدمی 'اک آدمی' بن جائے۔

'اک آدمی' بننے کے بہت سے ذرائع، بہت سے اپائے، بہت سے میدان اور بہت سے قلمدان ہیں لیکن ان میں میدانِ سیاست کو تفوق حاصل ہے۔ یہ ایک طویل و عریض اور کھلا میدان ہے۔ جب جی چاہے اور جہاں سے جی چاہے گھس پڑیئے ــ بس ذرا حوصلہ سلامت رہے۔ سر سلامت تو جوتے ہزار ــ! یعنی اگر آپ کا سر کام کے قابل ہے۔ اس میں پلاننگ کرنے اور سکیمز ہونے کی اہلیت ہے تو ہزاروں جوتے (پہنے ہوئے لوگ) آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ بس آپ ذرا آگے آگے رہیئے زور زور سے نعرے لگائیے۔ لاٹھیاں کھائیے اور ... ہو جائیے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کتنی آسانی سے اوپر آتے ہیں۔ یعنی جنازہ دشمن کے سروں پر!

بدقسمتی سے وہ لوگ جو اہلِ زبان ہیں (یعنی دو گزی چار گزی زبان والے، زمین آسمان ملانے والے، رائی سے پربت اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے والے) بشیتر اردو والے ہیں۔ یہ سبھی اہلِ زبان بھی ہیں اور محبانِ اردو بھی ــ! ان میں 'اعلیٰ پائے' کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، معلموں اور خادموں کی کثرت ہے۔ لہٰذا حکومت نے انھیں اک آدمی بنانے کا زریں فیصلہ کیا۔ اور اب یہ سبھی اکادمی میں جانا چاہتے ہیں۔ کچھ گرگِ باراں دیدہ پہلے جا چکے تھے لیکن اکادمی جیسے ادارے میں گرگ باراں دیدوں کی شمولیت کچھ ٹھیک نہیں چنانچہ سارے میں ہنگامہ ہو گیا۔ وہ ایک آدمی جس کے دستِ شفقت کے نیچے اکادمی کا سر تھا احتجاجی ٹیلی گراموں اور خطوط کی بوچھار سے تنگ آگیا حالانکہ اس نے ریاست کے چھٹے ہوئے افراد سے تخلیل کو تشکیل کا روپ دیا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ تشکیل کو تحلیل کا روپ دینا بھی اشد ضروری ہے ورنہ سیاسی کھلونا کہیں سے ٹوٹ پھوٹ گیا تو سیاسی مفاد نہ سہی، سیاسی امیج اور وہ بھی نہیں تو کم از کم اپنی ذاتی ساکھ اور شخصی وقار پر ضرور حرف آجائے گا۔ مجبوراً بچارے نے اعلان کر دیا کہ ہم بیزار ہی سہی لیکن وہ سارے مشتاق جنھیں اک آدمی کے زمرے میں ہونا یا آنا چاہیئے اپنے نام مع کام یعنی کارنامے یا کارہائے نمایاں سے موصوف کو مطلع کریں۔

ہفتہ بھر سے ریاست میں طوفان آیا ہوا ہے۔ کسان آسمان تکتے ہیں۔ پانی پانی چلاتے ہیں۔ کھیت کھلیان دکھ جھیلے ہیں مگر ندی نالوں میں غرور کی باڑھ آئی ہوئی ہے اور سیلاب کا رُخ راجدھانی کی طرف ہے ــ راجہ جی ذرا سنبھل کر آپ کی گدی تو نہیں لیکن راج دھانی ضرور بہہ سکتی ہے!

مہینوں پیشتر تحلیل کا دھواں اُٹھ کر پوری ریاست پر چھا گیا تھا، ٹائپنگ اور زیراکس مشینوں والوں نے ... کر دیا تھا۔ محکمۂ ڈاک و تار بھی دست بدعا تھا علاوہ ازیں کئی شعبہ جاتِ حیات بھی مناجات میں شامل تھے۔

اس دھوئیں میں پرائمری ٹیچر سے لے کر کالج پرنسپل تک اور تک بندوں سے لے کر اساتذہ کرام تک سبھی ... گئے تھے اور سبھی بھاگ رہے تھے۔ عالموں فاضلوں میں تو نفسی نفسی کا عالم تھا ہاں دو دھائیوں لگاتار زینہ بہ زینہ اموں کی موج ہو گئی تھی مگر پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ تحلیل ہی دھواں ہو گئی اور اب اچانک تشکیل نمایاں

ہی تو ہم نے دیکھا کہ زیادہ تر جلی ہوئی لکڑیاں چولہے میں پڑی ہوئی ہیں۔

— لیکن آپ ٹھہرے پرانے تجربہ کار، آپ پر کون انگلی رکھ سکتا ہے۔ پھر بھی ہم تو یہی کہیں گے کہ ہی دیگ اتارنی ہے تو لکڑیوں کو دھواں پڑنے کی کھلی چھوٹ مت دیجئے۔ خود ٹٹول کر، پرکھ کر اور پہچان کر لگا لیجئے کہ ہاں یہی لکڑی کام کی ہے — تب جا کر اکادمی، اکادمی بن سکے گی ورنہ پھر وہی بات ہو جائے گی۔ اک آدمی" اکادمی۔ !!

▲▲
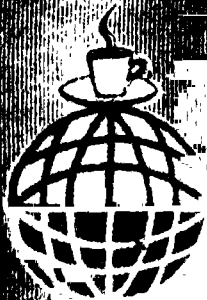
غزلیں

پاگل عادل آبادی

بنک بیلنس اگر نہیں ہوتا آدمی معتبر نہیں ہوتا
خوشنما کوئی کلر نہیں ہوتا خوب میک اپ اگر نہیں ہوتا
کم یہ دردِ جگر نہیں ہوتا آپریشن اگر نہیں ہوتا
شوقِ رمّی کا گر نہیں ہوتا یوں تباہ اپنا گھر نہیں ہوتا
یہ کرشمہ ہے باس کا ورنہ جونیئر سینیئر نہیں ہوتا
جو کرا لیتے حساب بزنس کا وہ میرا پارٹنر نہیں ہوتا
آہیں بھرتا ہوں چیخ کر پھر بھی وہ ہے بہرا اثر نہیں ہوتا
چھوڑ کر یوں نہ بھاگتی جورو تو نکھٹو اگر نہیں ہوتا
منہ وہ دھوتے ہیں روز صابن سے رنگ گورا مگر نہیں ہوتا
جو منسٹر کا ہوتا ہے چمچہ اس کو پولس کا ڈر نہیں ہوتا
دوستو میں بھی چلتا پھرتا تو کاش جورو کا ڈر نہیں ہوتا
ان کی ہر چیز مختصر ہے مگر ناشتہ مختصر نہیں ہوتا
جو پہنچتا ہے وقت پر آفس آفیسر آفیسر نہیں ہوتا!
جس کو چمچہ گری نہیں آتی وہ کبھی معتبر نہیں ہوتا!
لاکھ تم سرجری کرو مسٹر خر کبھی شیر نر نہیں ہوتا!

لوگ کہتے ہیں تیرے پاگل پر
گالیوں کا اثر نہیں ہوتا

◉

لقمان احمد

(عمری کلاں)

اب انقلاب دہر کے آثار ہو گئے
بکرے بھی میرے گاؤں کے خونخوار ہو گئے

دیکھا تجھے نہ تھا تو کوئی بات ہی نہ تھی
دیکھا تجھے تو تیرے طلب گار ہو گئے

کارِ جہاں دراز ہے، یہ سوچ سوچ کر
ہم آدمی تھے کام کے، بیکار ہو گئے

دلیپ سنگھ (دہلی)

جوس کا گلاس

کردار:-

انور۔
سکینہ۔ انور کی بیوی
کھنّہ۔ انور کا دوست
رام لال نگینہ۔ ایک تلاش شاعر
تین چار بے کار سے آدمی۔

پہلا منظر

[انور کے گھر کا ایک کمرہ۔ انور کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے اُس کی بیوی سکینہ سامنے مونڈھے پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی ہے]

انور: سکینہ، سننے والی خبر ہے۔ ایک سوتے ہوئے آدمی کے اوپر سے کوئی رضائی اتار کر لے گیا (ہنستا ہے) یعنی رضائی اتار کر لے گیا۔ اور (پڑھتے ہوئے) اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ . . . بھئی واہ! ایک تو اس بے چارے کی رضائی گئی اور اوپر سے یہ اخبار والے محاورے کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ "کانوں کان خبر نہ ہوئی" یعنی چور جانے سے پہلے اُس کے کان میں کہہ جاتا کہ میں تیری رضائی لے جا رہا ہوں۔

[سکینہ خبر میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی بلکہ غصّے سے اس کی طرف دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ انور اُس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اخبار پڑھتا جاتا ہے]

انور: لیجیے جمیل خاں صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔
سکینہ: کون جمیل خاں صاحب
انور: مجھے کیا پتہ؟
سکینہ: خبر تو تم نے یوں پڑھی جیسے کوئی اپنا تھا۔
انور: بھائی پیسے دے کر اخبار خریدا ہے چوبیس روپے کا بل دیتا ہوں اخبار کا۔ خبر تو ہر ایک پڑھنا پڑتی ہے نا۔ ویسے جمیل خاں صاحب کوئی بڑے آدمی ہی ہوں گے جو اپنے پیچھے اتنا بڑا خلا چھوڑ گئے ہیں۔ سکینہ یار ان کے ہاں افسوس کرنے تو جانا چاہیے۔
سکینہ: کیوں؟ وہ ہمارے کیا لگتے ہیں؟
انور: اسے گھر سے نکلنے کا ایک موقع ہے۔ اسی بہانے ذرا تفریح ہو جائے گی۔ ہمیشہ گھر میں پڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔
سکینہ: کیوں؟ یہاں کون سا تم چکی پیس رہے ہو۔
انور: [ہنستے ہوئے] یہ بھی ٹھیک ہے گھر میں کون سا چکی پیس رہا ہوں۔ پر سکینہ ایک بات بتاؤ یہ چکی پیسنا کیا محاورہ ہوا؟ والد پیسنا کہیں تو کوئی بات بنے۔ چکی چلانا کہیں تو کوئی کہیں گے

کو ٹھیک کیا۔ لیکن مجھے پتا کیا ہوا؟ محاوروں کی آج کل خوب ایسی تیسی ہو رہی ہے۔

سکینہ : محاورے میں تو بناتی نہیں ہوں۔

انور : تمھی تو بیڑا غرق کر رہی ہو۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اپنا کام دوسروں پر مت چھوڑو۔ یہ جو عادت ہے نا کہ اپنا کام دوسروں کو کہہ دیا کہ بھیا ذرا یہ تو کرنا، میں اس کے سخت خلاف ہوں۔ کوئی بات ہے یہ؟ کیا آپ کے اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہیں؟ ان کو ہلاؤ جلاؤ، ان سے کام لو۔۔ بس سکینہ میرا چائے کا کپ پکڑانا ذرا۔

سکینہ : (ہنستی ہوئی چائے کا کپ پکڑاتی ہے) یہ لو لیکن ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔

انور : (شرمندہ ہو کر) یہ بھی ٹھیک ہے۔ تمھیں تو لیکچر دے رہا ہوں اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس بات پر بھی ایک محاورہ ہے۔ لیکن اس وقت ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا۔ کچھ ایسے ہے کہ دیگراں را نصیحت۔۔۔ اور پتہ نہیں آگے کیا ہے۔ اتنا مشکل محاورہ بنانے کا پوچھو کیا فائدہ جو وقت پر یاد ہی نہ آئے۔ ایک بات ماننا پڑے گی سکینہ تمھیں۔ کہ میں اس وقت تمہارا ہی کام کر رہا ہوں دیکھو نا اخبار پڑھ کر سنا رہا ہوں تمہیں۔۔۔۔

ویسے سکینہ تم اخبار خود کیوں نہیں پڑھتی ہو

سکینہ : نگوڑا سارا تو تم پڑھ کر سنا دیتے ہو۔ پڑھنے کو پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔ اور ویسے بھی اخبار میں ہوتا کیا ہے، دنیا بھر کا جھوٹ؟

انور : تو یہ کیا کہہ رہی ہو۔ جھوٹ کیوں لکھیں گے؟ سچ اور جھوٹ کی چھپائی کا ریٹ تو ایک ہی ہے۔ پھر بھلا جھوٹ کیوں لکھیں گے؟ اب تک پڑھ کے جو تمہیں سنایا ہے، بالکل سچ ہے (اخبار کا صفحہ پلٹتا ہے) ہائیں یہ کیا؟

سکینہ : (گھبرا کر) کیا ہوا؟

انور : لکھا ہے "رام لال نگینہ نے بھوک ہڑتال کر دی ہے"

سکینہ : تو اس میں "ہائیں" والی کونسی بات ہے؟ کرتا ہے

انور : بیگم یہ سو فی صدی جھوٹ ہے۔ اپنے نگینہ صاحب کیا بھوک ہڑتال کریں گے؟

سکینہ : یہ نگینہ صاحب کس پارٹی کے لیڈر ہیں؟

انور : لیڈر نہیں ہے بھئی، اپنا یار ہے۔ بیسیوں بار آ اسے گھر پر لایا ہوں اور تمہیں یاد نہیں۔

سکینہ : اچھا وہ تمہارے دوست نگینہ صاحب۔ جن تم کھانا کھلانے کے لیے گھر پر لاتے رہتے ہو!

انور : ہاں بھئی وہی۔ نگینہ صاحب کو تم جانتی ہو کام دھا کچھ کرتے نہیں۔ دن بھر کافی ہاؤس میں بیٹھے رہ ہیں۔ وہاں کچھ شاعر ولا سے اُن کی دوستی ہے اُن کی صحبت میں رہ کر ہلکے پھلکے مزاحیہ شعر کہہ لیتے ہیں۔ شعر سن کر یار لوگ اگر خوش ہو جائیں تو کوئی انھیں کھانا کھلا دیتا ہے کوئی کافی پلا دیتا ہے کبھی کبھار کوئی بہت مہربان ہو جائے تو کرتا پاجامہ بھی سلوا دیتا ہے۔ لیکن نگینہ کے کہتے ہیں اپنی مرضی ہے۔ اور نگینہ بھی ایسا شریف آدمی ہے۔ کہ جو مل گیا اُوپر والے کا شکر کرکے قبول کر لیا۔ مل گیا تو دو لنچ کھا لیا اور نہ ملا تو دو دن فاقہ کر لیا۔ اب تم ہی بتاؤ بیگم کہ ایسا آدمی کیا بھوک ہڑتال کرے گا! کتنا جھوٹ ہوتا ہے ان اخباروں میں۔

سکینہ : ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اخباروں میں سوائے سچ کے کچھ ہوتا ہی نہیں۔

انور : پہلے دو صفحوں سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا لیکن تیسرے صفحے نے گڑبڑ کر دی۔ میرے خیال میں نگینہ کو کل کھانا نہیں ملا ہوگا۔ اخبار کو لکھنا یوں ہوگا کہ نگینہ نے فاقہ کیا اور لکھ دیا کہ اس نے بھوک ہڑتال

سکینہ : اخبار والے کیا فاقے اور بھوک ہڑتال میں فرق نہیں سمجھتے ؟

انور : تو تمہارا مطلب ہے کہ میں نگینہ کو نہیں سمجھتا؟ اس کا وشتہ فاقے سے تو ہو سکتا ہے بھوک ہڑتال سے ہرگز نہیں۔

کھنہ : (باہر سے بولتا ہوا اندر آتا ہے) ارے بھائی انور میاں پڑھا تم نے؟ اپنے نگینہ صاحب نے۔ وہ ہڑتال کر دی

انور : آؤ کھنہ۔ تم نے بھی خبر پڑھ لی۔

کھنہ : پڑھی تبھی تو بھاگا چلا آیا ہوں کہ پتہ کروں یہ کیا چکر ہے۔

انور : دیکھو دوست تمہاری بھابی بھی ہے کہ یہ خبر سچ ہے۔ تم بتاؤ اس میں سچ کی گنجائش ہے کیا؟ تم تو نگینہ کو جانتے ہو اچھی طرح۔

کھنہ : لیکن تم نے پوری خبر پڑھی ؟

انور : جب سرخی ہی غلط ہے تو پوری پڑھنے کا فائدہ؟

کھنہ : پوری پڑھو تو سہی۔

انور : (پڑھتا ہے) کل شام اُردو کے مشہور شاعر (اپنے آپ سے) لیجیے مشہور بھی ہو گئے۔۔۔ (اخبار پڑھتے ہوئے) جناب رام لال نگینہ نے میونسپل کمیٹی کے دفتر کے سامنے بھوک ہڑتال کر دی۔ ایک بیان میں انھوں نے اخبار کے نمائندوں کو بتایا کہ ملک کے نوجوانوں کی بیکاری اُن سے دیکھی نہیں جاتی۔ انھوں نے کہا کہ جب تک ہر نوجوان انجینئر، ایڈووکیٹ، پروفیسر وغیرہ کو ملازمت نہیں ملتی، میں بھوک ہڑتال جاری رکھوں گا۔ چاہے اس میں میری جان چلی جائے (قہقہہ لگا کر) بھئی اس سے بڑا مذاق میں نے اخبار میں آج تک نہیں پڑھا۔

کھنہ : میری آنکھوں میں تو ہنستے ہنستے آنسو آ گئے۔ جس آدمی نے زندگی بھر ایک پیسے کا کام نہیں کیا وہ بھوک ہڑتال کر رہا ہے لوگوں کو ملازمت دلانے کے لیے۔

انور : ذرا جملہ ملاحظہ ہو "جب تک ہر نوجوان کو ملازمت نہیں مل جاتی" یعنی چاہے کوئی نوکری کرنا چاہے یا نہیں، نگینہ صاحب اُسے نوکری دلوا کر چھوڑیں گے۔

کھنہ : اور پھر برخوردار کو یہ معلوم نہیں کہ اگر سرکار نے اُن کی بات مان لی تو خود نگینہ صاحب کو بھی ملازمت کرنا پڑے گی۔ بولتے جس آدمی نے زندگی بھر کام نہیں کیا، وہ اب کیا کرے گا۔

سکینہ : میں نے نگینہ کو ایک بے کار آدمی سمجھ رکھا تھا۔ لیکن [illegible] معلوم ہوا کہ وہ ایک اونچی ہستی ہے۔ دوسروں [illegible] کوئی معمولی بات نہیں۔ لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار ہے۔ ایک طرف اپنے میاں ہیں کہ دن بھر کرسی پر ٹانگیں لٹکائے محاوروں کو آگے پیچھے کرتے رہتے ہیں۔ گھر میں اپنا بیٹا بے کار ہے، یہ نہیں کہ اُس کے لیے کوئی ملازمت تلاش کریں۔

کھنہ : لیکن بھابی۔۔۔۔

سکینہ : آپ لوگ صرف باتیں بنانا جانتے ہیں۔ لیکن نگینہ کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ جو انھوں نے اپنی اولاد کے لیے نہیں کیا وہ نگینہ سارے ہندوستان کے نوجوانوں کے لیے کر کے دکھا رہا ہے۔

انور : دیکھو سکینہ بات کو سمجھا کرو۔

سکینہ : کیا سمجھا کروں؟ ملک میں کیا نوجوان بے کار نہیں ہیں؟

انور : ہیں۔ لیکن کیا وہ نگینہ کی بھوک ہڑتال سے روزگار پر لگ جائیں گے؟ سرکار منصوبے بنا رہی ہے روزگار کے لیے۔۔۔ لیکن میں کہتا ہوں ایک ایسے آدمی کو جس نے زندگی ایک بھیک مانگنے والے شخص کی طرح گذاری ہو، اس کے منہ سے روزگار کا مطالبہ ایک مذاق سا لگتا ہے۔

سکینہ : یہاں تو صرف آپ [illegible] مذاق ہی مذاق کر دیا ہے کچھ لوگ

ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں دوسروں کا درد ہوتا ہے۔ جو ہر دم صرف اپنا نہیں سوچتے، دوسروں کا سوچتے ہیں۔ نگینہ ان ہی میں سے ایک ہے۔ دیکھ لینا سرمایہ کو اپنا مطالبہ منوا کر چھوڑے گا۔

کھنہ : دیکھو بھائی . . .

انور : (بات کاٹتے ہوئے) سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں
یہ نہیں سمجھے گی کیوں کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ نگینہ کیا چیز ہے۔ اگر اخبار میں چھپی ہوئی خبر درست ہے تو پھر وہ اپنا رام لال نگینہ نہیں، کوئی اور ہے جس کو ہم لوگ نہیں جانتے۔ اپنا نگینہ اس دن بھوک ہڑتال کرے گا جب اس کے تمام جاننے والے اُسے کھانا کھلانے سے انکار کر دیں گے۔

کھنہ : چلو انور دیکھ کر آنا چاہیئے۔

انور : ہاں چلو (کرسی کے نیچے دیکھتا ہوا) ارے
اپنا جوتا کہاں چلا گیا۔ (جوتا دیکھ کر) یہ تو پڑا ہے
میں بھی عجیب اُلو ہوں، کیا غلط سلط زبان بولتا رہتا ہوں۔ "جوتا کہاں چلا گیا" بولو بھلا جب تک میں گھر میں ہوں، جوتا کہیں جا سکتا ہے کیا!

(کھنہ اور انور ہنستے ہیں)

دوسرا منظر

(ایک پھٹا ہوا ٹینٹ جس میں نگینہ بیٹھا ہے۔ اس کے پاس ٹینٹ کے تین چار بورڈ لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہے:
"بھوک ہڑتال کا پہلا دن"
"ہر ایک کو نوکری دو ورنہ گدّی چھوڑ دو"
"میری مانگیں پوری کرو"
"رام لال نگینہ، قوم کا سپاہی"
اس کے ارد گرد تین چار بیکار سے آدمی بیٹھے ہیں۔ نگینہ انور اور کھنہ کو دیکھ کر ان لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کرتا ہے)

انور : (اونچی آواز میں) نگینہ یار یہ کیا مسخرہ پن ہے۔

نگینہ (ہاتھ سے اشارہ کر کے بیٹھ کر آہستہ سے) ہر نوجوان کو نوکری دو کیا اس لیے کہ تمہارے لیے روٹی پانی کا انتظام کر سکیں؟ بندہ نواز آپ نے خود کبھی نوکری کی؟ اور پھر آپ کو کس نے کہہ دیا کہ آپ بھارت کے تمام نوجوانوں کے لیڈر ہیں۔

کھنہ : آپ نے کبھی زندگی میں ایک پیسہ کمایا؟

انور : کبھی کما کر خرچ کیا؟

کھنہ : زندگی بھر لوگوں نے آپ کا پیٹ بھرا . . .

انور : کسی نے کھانا دیا . . .

کھنہ : کسی نے کافی پلائی . . .

انور : کسی نے کپڑے سلوا دیے . . .

کھنہ : کسی نے جوتا لے دیا . . .

انور : تو پھر اس بھوک ہڑتال کا مطلب؟

نگینہ : آپ حضرات میری بھی سنیں گے یا اپنی ہی کہتے جائیں گے؟

انور : تو گویا آپ کے پاس بھی کہنے کو کچھ ہے؟

نگینہ : جی ہاں۔ لیکن آپ سنیں بھی تو۔

کھنہ : کہو۔

نگینہ : حضور یہ ٹھیک ہے کہ میں نے آج تک کوئی کام نہیں کیا۔ میرا خرچ دوستوں کی مہربانی سے چل رہا ہے۔ لیکن جناب کیا میرے دوستوں نے کبھی میرے کہنے پر مجھے کچھ خرید کر دیا؟ مجھے جوتا چاہیئے انھوں نے پاجامہ لے دیا۔ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں انھوں نے مجھے سینما دکھا دیا۔

انور : لیکن آپ یہ بتایئے کہ اس کا آپ کی بھوک ہڑتال سے کیا رشتہ؟ آپ سمجھتے ہیں کہ بے روزگاری کا مسئلہ چٹکیوں میں حل کیا جا سکتا ہے؟

نگینہ : میں جانتا ہوں بندہ نواز کہ ایسے نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تو میں نے بھوک ہڑتال کی ہے۔

کھنہ انور : ہم سمجھے نہیں۔

نگینہ : دیکھئے حضور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ بیکاری

کا مسئلہ بھوک ہڑتال سے حل نہیں ہوسکتا۔ لیکن لوگ یہ بھی نہیں چاہیں گے کہ مجھ جیسا معصوم آدمی مفت میں مارا جائے۔ اس لئے ابھی کوئی نہ کوئی سرکاری کرمچاری کوئی لیڈر کوئی رہنما آکر مجھ سے گذارش کرے گا کہ نگینہ صاحب ہم آپ کی مانگوں کو پورا کرانے کی کوشش کریں گے۔ مہربانی کرکے بھوک ہڑتال ختم کردیجئے۔

الوہر : پھر؟
نگینہ : پھر میں مان جاؤں گا۔
کھنڈے : پھر!
نگینہ : پھر وہ مجھے جوس کا ایک گلاس دیں گے جسے پی کر میں بھوک ہڑتال ختم کردوں گا۔
الوہر : لیکن بھائی آپ کی بھوک ہڑتال کا مطلب کیا ہوا؟
نگینہ : ارے یار سیدھی سی تو بات ہے۔ آج میرا جی جوس پینے کو تھا۔ میں جانتا ہوں کہ کسی دوست کو کہوں گا تو وہ پلانے کا نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بھوک ہڑتال ہمیشہ جوس پلا کر ختم کرائی جاتی ہے۔ ہے نا؟
کھنڈے : ہاں بھئی ہوتا تو ایسے ہی ہے۔
نگینہ : تو جناب عالی اسی لیے مجھے بھوک ہڑتال کرنا پڑی۔ اب آپ حضرات جایئے اور مجھے لیڈر کا انتظار کرنے دیجئے۔ جوس لے کر آنے والے لیڈر کا۔
الوہر : تو یہ بات ہے۔
نگینہ : جی ہاں حضور یہی بات ہے۔
الوہر : اور اگر میں آپ کو جوس پلا دوں تو؟
(نگینہ اٹھ کر چپل پہن لیتا ہے)
نگینہ : تو پھر چلئے نیک کام میں دیر کس لیے۔
(تینوں ہنستے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں)
(پردہ)

شعور ملیح آبادی

"وقت کی بلیہاری"

دہر اک اسکرین ہے صاحب
اک نیا روز سین ہے صاحب
جو کہ ایور گرین تھا طبقہ
اب وہ نیور گرین ہے صاحب

اب پسر سرکشوں میں شامل ہے
بد زبانی کی حد میں داخل ہے
باپ بیٹے کے درمیاں باقی
ایک تھوڑی سی حدِ فاصل ہے

دیارِ غم کے نیٹو ہو گئے ہیں
غریبوں کے ریلیٹو ہو گئے ہیں
معیشت میں کبھی جو پازیٹیو تھے
بگڑ کر اب نگیٹو ہو گئے ہیں

ڈاکٹر اور حکیم دل آزار
اس سے بیزار جو بھی ہے نادار
دفتروں میں کلرک اور افسر
بے رقم کام پر نہیں تیار

دھرم اور دین کے یہ کمپیوٹر
درسِ انسانیت کے یہ ٹیوٹر
دے رہے ہیں سبق عداوت کا
ہیں تعصب کے ڈسٹری بیوٹر

جو ہیں صاحب روا ستاتے ہیں
کر کے وعدہ نہیں نبھاتے ہیں
بات کرتے ہیں آسرے والی
کام پھر بھی نہیں بناتے ہیں

جب وہ سولہ سنگار کرتی ہے
ناز و غمزے کے وار کرتی ہے
لاد کر بارِ حسن مردوں پر
دل کی گاڑی اُلار کرتی ہے

ڈاکٹر اور حکیم سب ناکام
کر نہ پایا کوئی علاجِ عوام
تیز اتنا ہوا بدی کا بخار
روحِ انساں کو ہوگیا سرسام

تین شعر

عطاء الرحمن طارق (بمبئی)

یہ کبوتر کو باز کر دے گا
نسخۂ کامیاب حاضر ہے

آج کل کے سنگھار خانوں میں
دست بستہ شباب حاضر ہے

آپ نے اشتہار چھاپا تھا
"بایو ڈاٹا" BIO. DATA جناب حاضر ہے

فرحت زیدی (کلکتہ)

بات ایک رات کی

کلبلاہٹ ہوئی
سرسراہٹ ہوئی
ایک سوزش لئے
سنسناہٹ ہوئی

جسم کی حس بڑھی
ضبط کرنے پہ بھی
تن کے کچھ حصوں میں
سنسنی سی ہوئی

سٹپٹا سا گیا
بوکھلا سا گیا
اک نیا خوف سا
مجھ پہ چھا سا گیا

کوئی ہے؟ کون ہے!
وہم ہے یا کوئی شے
دیکھتے ہیں ذرا!
بس یہی کر کے طے

سانس روکے ہوئے
میں نے آہستہ سے
ایک کروٹ جو لی
اور دیکھا اُسے

جیسے دُرِ عدن
جیسے لعلِ یمن
جیسے اک تخمِ گل
جیسے مشکِ ختن

ہمشکل نشتر تھا وہ
زیبِ بستر تھا وہ
جزوِ مخمل تھا وہ
ایک کھٹمل تھا وہ

افروز عالم
(بہار)

غزل

مُفت خوری میں نام ہے اُن کا
یہی دستور عام ہے اُن کا
خوں لگا کر شہید ہوتے ہیں
کام اوروں کے، نام ہے اُن کا
بن کے شاہد وہ کام آتے ہیں
چائے سگریٹ دام ہے اُن کا
ماہرین تنازعہ ہیں وہ!
"تفیندُوا" ہی تو کام ہے ان کا
پی کے کرتے ہیں شاعری شاید
بہکا بہکا کلام ہے اُن کا!
نصف بہتر کی حکمرانی ہے
ہر مہذب غلام ہے ان کا!
کل بھگایا تھا ڈانٹ کر جن کو
آج کیوں احترام ہے ان کا

1. اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا اپنے تھوک یا بلغم میں خون پاتے ہیں تو آپ پھیپھڑوں کی تپ دق کا شکار ہو سکتے ہیں۔

2. اپنا طبی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔

3. تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے متعینہ مدت تک کھائی جائیں۔

4. پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔

سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی۔ جی۔ ایچ۔ ایس)
وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110002

DAVP 88/347 URDU

سید رحیم الدین توفیق
حیدرآباد

اِمدادِ باہمی

امداد باہمی ایک ایسا چکر ہے جسے چلا کر لوگ ایک دوسرے کی معاشی مدد کرتے ہیں۔ چاہے وہ روپیہ کی شکل میں ہو یا جنس کی۔ اس چکر کو چلانے کے لیے کئی سوسائٹیاں اور ادارے بنائے گئے ہیں کیوں کہ یہ ادارے اس چکر کے لیے ناگزیر ہیں لیکن نہ جانے رشوت عرف بالائی آمدنی کے لین دین کو امداد باہمی کے دائرے سے کیوں باہر رکھا گیا ہے۔ ویسے یہ بجائے خود ایک ادارہ ہے لیکن اسے باقاعدہ تسلیم کیا جاتا ہے رشوت عام طور پر ایک ناپسندیدہ اور معتوب شئے سمجھی جاتی ہے لیکن اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ رشوت لینا اور دینا انسان کا پیدائشی اور بنیادی حق ہے۔ جس کی ضمانت دستورِ ہند میں تو نہیں دی گئی ہے لیکن "دستورِ زندگی" میں فراہم دی گئی ہے یہ دستور برٹش دستور کی طرح اَن لکھا ہے۔ دراصل یہ ایک PRECEDENT ہے۔ رشوت پر اگر تحقیق کی جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کی جڑیں قبل مسیح میں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ اکثر جنگیں (کم از کم ہندوستان میں) رشوت کے زور پر ہی جیتی گئی ہیں۔ غنیم نے رشوت کی کنجی سے قلعوں کے دروازے کھلوا لیے اور بغیر لڑے بھڑے اندر داخل ہو گیا اور بیچارے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ اور ان جیسے حکمران منہ دیکھتے رہ گئے۔ دیکھا جائے تو دانستہ یا نادانستہ ہم سب ہی روزمرہ زندگی میں رشوت دیتے یا لیتے رہتے ہیں بچپن ہی سے اس کی پریکٹس میں رہتے "بیٹے اگر آپ ہمارا یہ کام کر دیں گے تو ہم آپ کو چاکلیٹ دیں گے۔ اگر آپ اپنا ہوم ورک کر لیں گے تو ہم آپ کو آئسکریم کھلائیں گے" "میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کر لو گے تو ہم آپ کو موٹر سائکل دلائیں گے" وغیرہ وغیرہ رشوت کو سب ہی لوگ بُرا نہیں سمجھتے۔ صرف ۰.۵٪ لوگ ہی اسے بُرا سمجھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی جیب سے یہ جاتی ہے۔ باقی لوگ وہی ہیں جو اسے لیتے ہیں۔ جو اس کی پوجا کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ لوگ اس کی مدح میں قصیدے کیوں نہیں لکھتے۔ جب کہ بینگن۔ موز۔ اور کدو جیسی چیزوں کی مدح میں قصیدے لکھے اور پڑھے گئے ہیں۔ افسوس کہ ہم انھیں یہاں دُہرا نہیں سکتے کیوں کہ حیا مانع ہے۔ رشوت دینے والوں کو چھوڑیئے کیا لینے والوں میں بھی کوئی ایسا دل والا نہیں ہے جو اس کی مدح میں قصیدے لکھے یا لکھوائے۔ شائد وہ بدنامی یا اینٹی کرپشن والوں کے ڈر سے خاموش ہے رشوت ہمارے سماج کی رگوں میں "صحت مند" خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کچھ سمجھ دار اور حقیقت پسند لیڈروں نے عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ رشوت خوری اور

کرپشن کو اپنے کلچر کا مزاج سمجھ کر قبول کرلیں اور انھیں خواہ مخواہ تنگ نہ کریں بلکہ خود بھی خوش رہیں اور انھیں بھی خوش رہنے دیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس چیز کو ختم نہیں کیا جا سکتا اسے ختم کرنے کا وعدہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ عوام کو ایسے سبز باغ دکھلانے سے کیا حاصل۔ اگر ہم باہر کے ممالک کا جائزہ لیں تو ہماری آنکھیں کھل جائیں گی وہاں یہ برائیاں ہمارے ملک سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ دراصل اس معاملے میں بھی ہم ترقی پذیر ہی ہیں۔ کبھی کبھی پیچھے رہنا بھی ایک نعمت ہے۔

وہ بھی کیا زمانہ تھا جب اسم نویسی میں ایک خانہ اوپر کی آمدنی کا بھی ہوتا تھا۔ جتنا زرخیز محکمہ ہوتا اوپر کی آمدنی اتنی ہی زیادہ ہوتی مائیں جب اپنے جان پہچان والوں اور رشتہ داروں سے اپنی بیٹی کے پیغام کا ذکر کرتیں تو اوپر کی آمدنی کا فخریہ ذکر کیا جاتا اور تنخواہ کو جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا جاتا۔ اگر کسی اسم نویسی میں مصلحتاً اوپر کی آمدنی کا انکشاف نہیں کیا جاتا تو مشاطہ سے بڑی تشویش سے دریافت کیا جاتا کہ لڑکے کی اوپر کی آمدنی نہیں ہے ؟ کیا لڑکا صوم وصلوٰۃ کا سخت پابند ہے۔ جن خواتین کے شوہر نامدار کسی زرخیز محکمہ میں نہیں ہوتے وہ بیچاریاں زرخیز محکمہ والے حضرات کی گھروالیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں اور شکوہ کرتیں کہ ہمارے میاں کو دیکھو اتنے بڑے عہدہ پر ہیں مگر آج تک زیور کے نام پر سونے کے ایک ماشہ کا تار تک نہیں لائے بڑی تنخواہ لے کر کیا کرنا ہے۔ میرے دیور کو دیکھو ڈیڑھ سو روپلی تنخواہ ہے پھر بھی جورو سر سے پاؤں تک سونے میں پیلی ہے۔ ایسی اُلٹا نی پڑی ہے کہ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ بعض بیبیاں ایسی بھی تھیں جو اس معاملہ میں ڈانواں ڈول تھیں انھیں رشوت بُری بھی لگتی تھی لیکن اس کے جلوے دیکھ کر منہ میں پانی بھی آتا تھا۔ دراصل یہ وہ لڈو ہے جسے صرف نا کھانے والا ہی پچھتاتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسی ہی صاحبہ اپنے ضمیر کو جس میں تھوڑی سی جان باقی تھی کچھ اس طرح سمجھاتیں کہ "ان کے میاں بحساب رشوت تھوڑے سے ہی لیتے ہیں۔ بس آٹے میں نمک کی طرح ذرا "روٹی" کو مزہ دار بنانے کے لیے" یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بغیر نمک کھانا کتنا سٹھیا اور بیلذت ہوتا ہے صحت کے لیے بھی نمک نہایت ضروری چیز ہے۔ نمک کی کمی سے تو آدمی بڈیوں اور جلدی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے ایسے میں کوئی نمک کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ نمک تو بلڈپریشر والے بھی نہیں چھوڑتے۔ تھوڑا بہت استعمال کر ہی لیتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ لوگ اتنے پیار اور سلیقہ سے رشوت لیتے تھے کہ وہ دینے والے کو بوجھ نہیں لگتی تھی اور حکومت بھی زیرِ لب مسکرا کر انجان ہوجاتی تھی۔ لوگ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کرتے تھے لیکن آج وہ پیار کہاں رہا بس نفسا نفسی کا معاملہ ہے لوگ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ہی حلال کر دیتے ہیں۔ ایسی تگڑی رشوت مانگتے ہیں کہ دینے والا بلبلا کر رہ جائے۔ دراصل یہ مہنگائی کا زمانہ ہے عام اشیاء کی طرح رشوت کے بھی دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ رشوت کو ناپسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

رشوت ہمیشہ سے حکومت کی بلیک لسٹ میں رہی ہے اور اس پر کڑی نگرانی بھی ہے مگر چونکہ "ضمانت" پر چھوٹی ہوئی ہے اس لیے خوب چل رہی ہے اور اس کی کاٹی بڑے پیمانہ پر "سرپرستی" بھی ہو رہی ہے۔

کہتے ہیں کہ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خُدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جس کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ جن کے پاس کوئی سفارش نہیں ہوتی یا وہ کسی منسٹر یا افسر کا سالا یا بہنوئی نہیں ہوتا اس کی ناخدا رشوت ہوتی ہے۔ یہ ناخدا ہر ایک کی پہنچ یعنی اس کی جیب میں ہے اور فوراً اس کا بیڑہ پار کرتی ہے۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے

اس ہاتھ لے ۔ رشوت جتنی طاقت ور ہے ۔ اس کا لینے والا اتنا ہی کمزور ہوتا ہے ۔ رشوت کی ہلکی سی مار سے وہ آپ کے قابو میں آجاتا ہے ۔ ہماری عادت ہے کہ ہم بعض بُری چیزوں کے صرف بُرے اور تاریک پہلو ہی دیکھتے ہیں ۔ اس کے اچھے پہلو کو جان بوجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں ہم خیرات دیتے ہیں ۔ محتاجوں کی مدد کرتے ہیں ۔ ہزاروں روپیہ خرچ کرکے مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہیں تو ہماری نظر اپنی جیب سے نکلنے والے روپیہ پر نہیں ہوتی بلکہ ادھار ثواب پر ہوتی ہے ۔ حالانکہ عاقبت کی خبر خدا جانے لیکن رشوت دیتے وقت صرف ہاتھ سے نکلنے والے روپیہ پر ہی نظر رہتی ہے اس سے نکلنے والے کام اور نقد فائدے پر نہیں ہوتی ہے ۔ رشوت دینے سے نہ صرف آپ کا کام نکلتا ہے بلکہ ایک ضرورت مند کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے یہ ایک ایسی خیرات ہے جس سے آپ کو ثواب جاریہ ملتا ہے سوچئے رشوت لینے والا ضرورت مند اس پیسے سے اپنی کتنی ضرورتیں پوری کرے گا ۔ وہ بیٹی یا بہن کی شادی کرے گا ۔ بھائیوں کو پڑھائے گا ۔ بیمار ماں باپ کا علاج کرائے گا ۔ کلر ٹی ۔ وی اور فریج خریدے گا تو جب تک اس کی بہن یا بیٹی اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزارے گی یا جب تک وہ فریج کا ٹھنڈا پانی پیئے گا اور اس میں جمی آئسکریم کھائے گا یا کلر ٹی ۔ وی سے لطف اندوز ہوتا رہے گا اس وقت تک آپ کو ثواب ملتا رہے گا ۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دگنے دام ۔

آج کل اخباروں میں روز ایک دو ایسی خبریں آتی ہیں کہ فلاں انسپکٹر ۔ یا کلکٹر یا تحصیل دار رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے اور انھیں معطل کر دیا گیا ۔ لیکن ایسے انسپکٹروں کلکٹروں اور تحصیلداروں کا حساب کریں تو یہ اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ اگر سماج میں رشوت خوروں کا تناسب ایسا ہی آٹے میں نمک کے برابر ہے تو پھر یہ واویلا کیوں ۔ انھیں نظر انداز کیوں نہیں کیا جاتا ۔ چھان بین سے پتہ چلا کہ یہ چند بدقسمت وہ لوگ ہیں جنھوں نے چالاک بننے کی کوشش کی اور سارا مال اکیلے ہی اکیلے ہڑپ کر گئے ۔ یہاں تو کھاؤ اور کھلاؤ کے اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے ۔ ورنہ سارا گھی ٹیڑھی انگلی سے نکال لیا جاتا ہے ۔

کافی عرصہ تک ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ جو رقم کام سے پہلے یا دوران میں دی جائے وہ رشوت ہے اور بعد میں جو دی جائے وہ محنتانہ ۔ تحفہ یا نذرانہ بطور شکرانہ ہے لیکن ہماری غلط فہمی اس وقت دُور ہوئی جب ایک شخص نے کسی سے کہا کہ آپ کی نوکری پکی سمجھو تقرری کا پروانہ ہاتھ میں آنے کے بعد پیسے دینا ۔ یعنی کبھی کبھار یہ کاروبار بھروسہ پر بھی چلتے ہیں ۔ ورنہ تقرری کا پروانہ ہاتھ میں آنے کے بعد اگر اسے ہاتھ تبا دیا جائے تو وہ بیچارہ کیا کرے گا ۔ ہو سکتا ہے اس کے پاس اس کاٹے کا بھی کوئی منتر ہو ۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومتیں جب کسی غیر قانونی اور ناپسندیدہ کاروبار کو ختم کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں تو وہ اسے قانون کے دائرہ میں لاکر باقاعدہ بنا دیتی ہیں ۔ مثلاً جسم فروشی ۔ اس ہزاروں سال پُرانے اور مقبول عام پیشہ کو جب مکمل طور پر ختم کرنے کی کوشش میں ناکامی ہوئی تو پیشہ ور عورتوں کو لائسنس دے کر اس پیشہ کو باقاعدہ تسلیم کر لیا گیا معلوم نہیں اس پر پروفیشنل ٹیکس لگتا ہے یا نہیں ۔ اسی طرح جب کھلے بازار میں سیمنٹ کی قیمت کم نہیں ہوئی تو حکومت نے لیوی سیمنٹ کی قیمت کھلے بازار کی قیمت کے برابر کر دی اس طرح سفید نکلنے سے کالا اپنے آپ مٹ گیا ۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومت اسی طرح رشوت کو بھی قانون کے دائرے

میں لے آئے کہ محکمہ کی زرخیزی اور فائل کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی فیس اور اس فیس میں چپراسی سے لے کر اُوپچی کرسی تک کا تناسب مقرر کر دے۔ چونکہ یہ زائد آمدنی ہے تنخواہ کے علاوہ تو اسے بھی لاٹری، معمّہ اور ریس کی آمدنی کے زمرہ میں شامل کر کے اس پر انکم ٹیکس اور پروفیشنل ٹیکس لگایا جا سکتا ہے اس سے انکم ٹیکس دہندگان کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جائے گا اور حکومت کی آمدنی بھی بڑھ جائے گی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ گورنمنٹ کو سال میں تین بار ڈی اے بڑھانے سے نجات مل جائے گی۔ کسی چیز کی اچھائی اور برائی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ ہم اسے کس ڈھنگ سے دیکھتے یا اس پر سوچتے ہیں۔

رشوت دینے اور لینے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں۔ ہماری معلومات میں یہ اضافہ ایک آفس میں ہوا اپنے ایک کام کے سلسلہ میں جب ہم متعلقہ کلرک سے ملے تو تھوڑی بہت تکرار کے بعد معاملہ طے ہو گیا اور ہم نے اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کی میز پر رکھ دیئے۔ ہماری اس حرکت سے اس کا چہرہ فق ہو گیا اور اس نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا بھائی صاحب میز کے نیچے سے دیجئے میز کے نیچے سے پیسے دینے لینے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ ہم نے تیزی سے پیسے اُٹھائے اور ہمارا ہاتھ میز کے نیچے پہنچ گیا۔ اس دوران اس کے ساتھی کلرکوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے ہمیں دھمکی دی کہ آپ مجھے رشوت دے رہے ہیں جانتے ہیں رشوت دینا کتنا بڑا جرم ہے۔ آپ مہربانی کر کے چلے جائیے۔ ہم نے اس کی خوشامد کی تو کہنے لگا۔ میں نے کہا نا کہ آج میں مصروف ہوں آپ کل تشریف لائیے۔ ہم یہ سوچتے ہوئے باہر آ گئے کہ آیا اس کے ساتھیوں کو اس کی رشوت خوری کا علم نہیں کیا وہ اسے ایسا ہی دودھ کا دُھلا سمجھتے ہیں۔ اتنے میں چپراسی دوڑتا ہوا ہمارے پیچھے آیا اور کہنے لگا صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ کل ضرور آیئے آپ کا کام ہو جائے گا۔ ہم نے اس کے ہاتھ میں دو روپیہ کا نوٹ رکھ دیا کہ وہ چائے پی لے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں اور کھٹ سے ہمیں سلام کر کے غائب ہو گیا۔ قصّہ مختصر ہمارا مشورہ ہے کہ آپ بھی اپنے لیڈروں کی طرح حقیقت پسند بن جائیے اور اپنے آپ کو قومی دھارے میں لے آئیے۔ کیوں کہ سلسلہ رشوت دراز است! ۵۷۵

محمد یوسف مزکی
(حیدرآباد)

معیاری شادی

نوکری تلاش کرتے کرتے ایک زمانہ گزر گیا لیکن ہمیں کوئی سلیقہ کی نوکری نہیں ملی۔ البتہ اتنا ہوا کہ مختلف جگہوں پر انٹرویو دیتے دیتے اور ہم حال دوستوں کے احوالِ واقعی دریافت کرتے کرتے ہم اتنے بے حال لیکن باتوں میں طاق ہو گئے کہ ہمارے ہمدرد دوستوں کے ایک جھگٹے نے ایک مرتبہ اپنا ایک متفقہ مشترکہ مشورہ ہم پر مسلط کرنا چاہا۔ اُن کا خیال تھا کہ اب ہماری حالت نہایت قابلِ رحم ہو گئی ہے اور عمر میں ہم کافی آگے نکل گئے ہیں۔ لہٰذا اب لے دے کے ہمارے لیے ایک بہترین ملازمت کہیے یا خدمتِ خلق کہ ایک شادی کے پیامات کا دفتر کھول لینا باقی رہ گیا۔ جیسے ہی یہ مشورہ ہم نے سُنا ہمارے اوسان خطا ہونے لگے اور ہم نے بلا تاخیر اُن کے اس مشورہ پر سخت احتجاج کیا۔ ہم نے پوچھا کہ آخر وہ ہمیں سمجھتے کیا ہیں۔ کیا ہمیں بیکاری کا جمعدار سمجھ رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یار دوستوں نے ہمارے احتجاج کو بُری طرح نظر انداز کر دیا اور وہ اپنی ہی رٹ پر قائم رہے۔ ہم موقعہ دیکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ایک ہفتہ تک ہم نے ان ظالموں کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ لیکن اس ایک ہفتہ کے دوران ستمگروں نے کافی گُل کھلائے۔ ایک کمرہ کرایہ پر لیا گیا اور ایک خوشنما رنگین بورڈ "شادی کے پیامات" کا تیار کر کے اُس دفتر نما کمرہ پر آویزاں کیا گیا اور اُس بورڈ کے نیچے دفتر کے مالک کے طور پر جلی حروف میں ہمارا نام لکھا گیا۔

ہم یہ سوچ کر کہ اس ایک ہفتہ میں یار دوست اپنے اس عاملانہ بلکہ ظالمانہ مشورہ کو بھول گئے ہوں گے جیسے ہی اُن کے نرغے میں آئے، اُنھوں نے ہمیں دبوچ کر سیدھے اس نئے نئے دفتر کی کُرسی پر بٹھایا اور اس کاروبار کے کئی فوائد دینی و دنیوی ہمارے سامنے گنوانے لگے لیکن ہم برابر انکار میں سر ہلاتے رہے۔ ایک دوست نے جب اپنا یہ اندازہ ظاہر کیا کہ ماہانہ کم از کم آٹھ ہزار روپے کی آمدنی متوقع ہے تو یکلخت ہمارے بھاگے حواس جاگ اُٹھے۔ ایک تو بے کاری کا عالم اور دوسرے عمر نکل جانے کا خدشہ۔ ایسی صورتحال میں متوقع آمدنی کا اندازہ ہمارے لیے تپتے ریگستان میں سرسبز باغ کے تصور سے کم نہ تھا۔ ہم نے جھٹ فیصلہ کرتے ہوئے ان سب کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اب دفع ہو جائیں اور ہمیں اپنا کاروبار کرنے دیں۔

کاروبار چل نکلا۔ تین مہینوں میں فی مہینہ تقریباً دس ہزار کی آمدنی ہوئی۔ اس دوران کئی کارنامے ہم نے انجام دیئے۔ سیدھی سادی کامیاب شادی کرا دینا آج کا کارنامہ نہیں۔ مجھے تو جانے دیجیے ہمیں کوئی اعـ

نہیں ہے۔ لیکن پست قد لڑکے کی شادی نہایت لمبی لڑکی سے کروائی۔ ایک شدید کالی لڑکی کی شادی نہایت گورے لڑکے سے کرا دی۔ اب آپ یہ مت پوچھیئے کہ یہ سب کارنامے کس طرح انجام دیتے گئے۔ پیسہ — پیسہ سب کچھ کروا دیتا ہے۔

تین مہینوں کے بعد جب ہمارے دفتر نے چوتھے مہینہ میں قدم رکھا تو حالات یکایک عجیب و غریب رُخ اختیار کرنے لگے۔ اب ہمارے دفتر میں نئے لوگوں کی آمد کی بجائے پُرانے لوگ آتے جاتے دکھائی دینے لگے۔ یہ سب لوگ متحیر کر دینے والی خبریں لے کر آنے لگے۔ ایک صاحب نے تو حد ہی کر دی۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی کہا "میں تمہارے خلاف عدالت میں کیس دائر کر دوں گا!" ہم نے پوچھا "خیریت تو ہے"۔ بولے "پچھلے مہینہ فلاں تاریخ کو تم نے جو شادی کروائی تھی وہ لڑکی تین دن سے گھر سے غائب ہے"۔ ہم یہ سُن کر ہکا بکا رہ گئے۔ پوچھا "لڑکی آپ کے گھر سے غائب ہوئی ہے یا میرے گھر سے"؟ بولے "یہ سب نہیں چلے گا"۔ ہم نے پوچھا "آخر ہمارا قصور؟" بولے "قصور! یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ مجھے یہ تمہاری سازش معلوم ہوتی ہے!" ہم نے کہا "آپ کی عقل پر رونے کو بھی جی نہیں چاہ رہا آپ جاییے۔ جو کچھ آپ کو کرنا ہے کیجیئے۔ میں ایسی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں"۔ وہ چلے گئے۔ ہم نے اسی وقت دفتر کو تالا لگایا اور اپنے ایک وکیل دوست کے پاس پہنچے۔ اُن کے سامنے سارا ماجرا من و عن سُنایا۔ اُنھوں نے پیشانی پر ان گنت بل ڈالتے ہوئے کہا "یہ تو کافی گمبھیر صورتحال ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو میرا اندازہ ہے کہ سال میں کم از کم دس مہینے تم جیل کی ہوا کھاتے رہو گے"! ہم نے کہا "بھائی میں یہاں پر آپ سے ایسی روح فرسا معلومات حاصل کرنے نہیں آیا ہوں۔ آپ اس مسئلہ کا حل بتائیے"؟ ہنس کر بولے "لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تم مجھے ماہانہ پندرہ ہزار فیس کے طور پر دیتے رہا کرو تمہارے کیس لڑنے کے لیے۔ باقی سب میں دیکھ لوں گا"۔ ہم نے سر تھام کر کہا "بھلے آدمی! میری ماہانہ جملہ آمدنی بھی اتنی نہیں ہے۔ میں کہاں سے اتنی فیس ادا کر سکوں گا"؟ بولے "تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم سال میں صرف دو مہینے آزاد رہنے کے لیے تیار ہو جاؤ"۔ ہم وہاں سے نکل آئے۔ اب ہماری حالت دیکھنے لائق ہو گئی تھی۔

ہم اسی پریشانی کی حالت میں بیٹھے غور و فکر میں غرق تھے کہ کیا کریں، آخر یہ کس جھنجھٹ میں پھنس گئے ہیں کہ اتنے میں لمبی داڑھی والے ایک بزرگ داخلِ دفتر ہوئے۔ ہم نے ادباً دریافت کیا "مزاجِ گرامی"؟ بولے "سب خیریت ہے"۔ "لڑکی کا رشتہ رجسٹر کروانے آیا تھا"۔ ہم نے کہا "فرمایئے"۔ جھٹ سے پوچھ بیٹھے "شادی شدہ ہو؟" ہم نے کہا "جی نہیں۔ مگر آپ بے تکلف ہو کر تفصیلات بتایئے تاکہ فارم کی خانہ پوری کی جا سکے"۔ ہماری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر پوچھا "کتنا کما لیتے ہو؟" ہم نے جھلا کر کہا "اپنا انٹرویو دینے آئے ہیں یا میرا انٹرویو لینے؟ آخر بات کیا ہے؟" بولے "کچھ بھی ہو۔ تم بتاؤ تو سہی"۔ ہم نے بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے بتایا "فی الحال ماہانہ دس ہزار سے زیادہ کی آمدنی نہیں ہے"۔ بولے "مجھے لڑکا پسند ہے"۔ یہ سن کر ہم بُری طرح بوکھلا گئے۔ پوچھا "کونسا لڑکا"؟ میری جانب اُنگلی اُٹھا کر بولے "یہی جو میرے سامنے ہے"۔ ہم بڑبڑائے "لگتا ہے یہ صاحب دماغی خلل کا شکار ہیں"۔ مُسکرا کر بولے "کیوں میاں۔ مذاق کرتے ہو؟ میں تمہیں دیوانہ دکھائی دیتا ہوں!" "دیوانہ ہونے کی عمر نکل گئی بھائی"! میری ایک بھانجی ہے اُس کے لیے تمہارا ہاتھ مانگنے آیا ہوں"۔ ہم نے کہا "معاف کیجیئے جناب! یہاں میں نے اپنی شادی کے لیے یا لوگوں کا ہاتھ دینے کے لیے دفتر نہیں کھولا ہے!" بولے "میاں گھبراتے کیوں ہو۔ معیاری شادی کی جائے گی!"

ہم نے پوچھا "معیاری شادی؟ معیاری شادی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"۔ حیران ہوتے ہوئے بولے "میاں تم نے خود بورڈ پر لکھا ہے کہ یہاں معیاری شادی طے کروائی جائے گی اور تم خود معیاری کا مطلب نہیں جانتے؟ افسوس ہے تم پر!" ہم نے کہا "یہ سب یار دوستوں کی ستم ظریفیاں ہیں۔ آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ پتہ نہیں اور کیا کیا لکھ کر لگایا ہے ظالموں نے ہم نے تو غور سے نہیں دیکھا بلکہ غور کرنے کا وقت ہی نہیں ملا اب تک"۔ بولے "خیر کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میری بھانجی بڑی اچھی لڑکی ہے پڑھی لکھی ہے۔ ماڈرن ہے۔ اونچی ایڑی والے سینڈل پہنتی ہے۔ اور ہاں! جتنی اونچی ایڑی کی وہ سینڈل پہنتی ہے اتنے ہی اونچے معیار کی شادی کی جائے گی!" ہم حواس باختہ اُن کی باتوں کو سُن رہے تھے۔ ہم نے پوچھا "عجب منطق ہے آپ کی! شادی کے معیار کا سینڈل کی اونچائی سے تقابل کر رہے ہیں؟" بولے "یہی تو فرق ہے ایک تجربہ کار میں اور ایک ناتجربہ کار شخص میں"۔

ہم نے زچ ہو کر کہا "مجھے ابھی شادی کرنا نہیں ہے۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں اور یہ دفتر میں نے خود نہیں کھولا ہے یہ سب یار دوستوں کا کیا دھرا ہے"۔ سختی سے بولے "تمہیں یہ شادی کرنی ہی پڑے گی اور میں بھی یہاں خود نہیں آیا ہوں بلکہ تمہارے دشمنوں نے مجھے یہاں بھجوایا ہے"۔ ہم نے چونک کر پوچھا "دشمنوں نے؟" بولے "ہاں۔۔۔ وہ جو شہر کا ایک قدیم شادیوں کے پیامات کا دفتر ہے اس کے مالک نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ تم غیر شادی شدہ ہو۔ ان کا خیال ہے، اور صحیح بھی ہے، کہ جس شخص کی خود شادی نہیں ہوئی ہو اُسے شادی کروانے کا نہ تو تجربہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اُسے اُس کاروبار کا حق پہنچتا ہے۔ اسی لیے میں تمہارے فائدے کے لیے یہاں آیا ہوں"۔ یہ سُن کر ہمارا خون کھول اُٹھا ہم نے جھلا کر کہا "میرا فائدہ کیسا؟" بولے "تم شادی نہیں کرو گے تو یہ مشہور کر دوں گا کہ اس میدان میں تمہیں کچھ بھی تجربہ نہیں ہے یہاں تک کہ معیاری شادی کا مطلب تک تم نہیں جانتے۔ جان لو کہ تمہارا کاروبار ٹھپ ہوتے دیر نہیں لگے گی"۔

ہم سوچنے لگے خدا خدا کر کے ایک اچھا کاروبار چل نکلا تھا اور یہ شخص ہے کہ ہاتھ دھو کر بڑے عجیب و غریب انداز میں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور بلیک میل کرنے پر اُتر آیا ہے۔ حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ہم نے پُرسکون طریقے پر انھیں ٹالنے کے لیے کہا "دیکھیئے مجھے کچھ وقت دیجئے سوچنے اور تیاری کرنے کے لیے دراصل بات یہ ہے کہ ہماری سرپرستی کے لیے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے"۔

خوش ہوتے ہوئے بولے "یہ تو اور بھی اچھا ہے اس میں پریشان ہونے کی بات ہی کیا ہے۔ میری بھانجی سے شادی کر لو پھر دیکھنا کہ وہ ہر وقت تمہارے آگے پیچھے بلکہ آزو بازو بھی رہا کرے گی اور جہاں تک سرپرستی کا سوال ہے وہ ہماری ذمہ داری ہے۔ میرے خیال میں ماہانہ دس ہزار کی آمدنی ہم سب کے لیے کافی ہے"۔ اب تو ہمارے منہ سے چیخ نکل گئی۔ سنبھل کر کچھ دیر ہم سوچتے رہے۔ پھر ایک ترکیب سوجھی۔ ہم نے کہا "آج ہی سے ہم نے آپکی غلامی قبول کر لی۔ سارا کاروبار آپکے حوالے لیکن شادی ایک مہینہ کے بعد کریں گے۔" وہ بولے "اس کی ضمانت کیا ہوگی" ہم نے معاہدہ کے کاغذات اور رسیدوں پر ان کا اور ان کی بھانجی کا نام لکھ دیا انکی دستخطیں بھی لے لیں۔ اور لگاتار انکے نام سے ڈپازٹ کے نام سے ایک مہینہ تک گاہکوں سے پیسہ بٹورتے رہے۔ جب گاہکوں نے کام نہ بنتے دیکھ کر رقومات کی واپسی کا مطالبہ کیا تو سب کو ایک دن بُلا لیا۔ ان حضرات کو بھی شادی کی تاریخ پکی کرنے کے بہانے بلا بھیجا گاہکوں کا دفتر کے مالک سے تعارف کرا کے ہم جو بھاگے تو مہینہ بھر کی پریشانیاں اور کلفتیں دور ہو چکی تھیں۔ صحیح معنٰی میں آج ہماری خوشی کا دن تھا۔ شادی۔ بلکہ معیاری شادی کا دن تھا۔ ▲▲

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی

جگاؤ اس طرح جذبات لوگو — وصال و ہجر کی ہو بات لوگو
مجھے اُن سے محبت ہو گئی ہے — کہوں کیسے مگر یہ بات لوگو
سبب پوچھو نہ دن میں اونگھنے کا — تڑپنے میں کٹی ہے رات لوگو
کرو اب لیڈروں کی چمچہ گیری — نہیں معیوب اب یہ بات لوگو
اُٹھاؤں کس طرح لطفِ جوانی — یہی ہے اک خلش دن رات لوگو

ہے اک ہلچل مچی بزمی کے دل میں
مگر کس سے کہوں یہ بات لوگو

لیڈر

آپ اپنی نظیر ہیں لیڈر — کتنے مُردہ ضمیر ہیں لیڈر
کیا مٹائیں گے دیش سے غربت — ذہن و دل کے فقیر ہیں لیڈر
کیوں نہ سہلائیں سیٹھ جی تلوہ — لونجی پیتوں کے پیر ہیں لیڈر
اپنے بھاشن میں درد رکھتے ہیں — دَورِ حاضر کے تیر ہیں لیڈر
بیرِ حق سے رہا سدا ان کو — مصلحت کے اسیر ہیں لیڈر
دل کو کرتے ہیں بات سے چھلنی — زہر آلودہ تیر ہیں لیڈر

کیا ہوا شہر میں میاں بزمی
آج گھر میں اسیر ہیں لیڈر

غزل

سراج نرملی

اُدھر ڈھلنے لگا اُنکا شباب آہستہ آہستہ — اِدھر دینے لگے اعضاء جواب آہستہ آہستہ
ہے کیا جلدی؟ پیو، کھاؤ شتاب! آہستہ آہستہ — شراب آہستہ آہستہ، کباب آہستہ آہستہ
پڑھاؤ نا مِنّی ـ اسپیشل اسباق بچوں کو — مکمل کب کرو گے ہاں نصاب آہستہ آہستہ
بہت ڈرتے تھے بیگم سے اور اب ڈرتے ہیں قدرے کم — کچھ آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ
مجھے چاہا، مری دلہن بنی، بچے ہوئے بارہ — ہوا نازل ستمگر کا عتاب آہستہ آہستہ

سراج اب مارکٹ گھر لائبریری اسکول سے غائب
ہوتی جاتی ہے اردو کی کتاب آہستہ آہستہ

یوسف ناظم

خندۂ گل پر ایک عندلیبانہ نظر

میں کب سے اِس سوچ میں غرق تھا کہ آخر اردو ظریفانہ شاعری کو ہوا کیا ہے کہ یہ مائل بہ قلت ہے۔
ظرافت کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر ہونی چاہیئے۔ لیکن اتنی بھی کم نہیں کہ نمک کا ذائقہ کیا اس کا مغالطہ
محسوس ہو۔ اب یہ "خندۂ گل" ہاتھ میں آئی تو پتہ چلا کہ جن لوگوں کے پاس دولتِ دل کی پڑیاں تھیں انہوں
اپنی دوکانیں دیارِ مغرب میں کھول لی ہیں۔ یہ پیامِ مشرق کی ایک جھاگ دار تبسم ہے۔ یہ خندۂ گل، اصل میں مجموعہ
ہے شیخ غلام علی بلبل کاشمیری کا جو کشمیری نژاد ہیں اور عرصہ ہوا کہ وطن سے دور بستیاں جا بسانے والوں میں
نے اپنا نام بھی درج کروالیا۔ رہتے ہیں ہنس لو (HOUNSLOW) میں ہنس لو تو سمجھ میں آیا کہ خندۂ گل
رتنے کے لیے موزوں ترین جگہ ہے لیکن یہ مڈل سیکس کیا چیز ہے۔ (ہمارا علم بہت محدود ہے)۔ اپنے مقدمے
"چونچیں" میں شاعر نے اپنی تخلیق کی شانِ نزول بھی بیان کی ہے۔ اس مقدمے ہی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے
اعر ظریفانہ شاعری کو اپنا مشغلۂ نشاط اور وظیفۂ حیات بنانے میں حق بجانب ہے۔ ظرافت شاعر کی خصوصیت
یا عادت بھی ہے۔ دنیا کی کوئی بات ہو چھوٹی بڑی، معمولی غیر معمولی، اچھی بُری۔ شاعر اس میں سے بلکہ اُس کے
سے (جسے پہلے بھیتر بھی کہا جاتا تھا) ظرافت کا ایک نکتہ ضرور نکال لیتا ہے۔ یہ قطعہ دیکھیے۔

شاعرِ خوش نوا ہوں خندہ بہ لب — سب کو میرا پیام ہے ہنس لو
میں جہاں رہ رہا ہوں لندن میں — اُس علاقے کا نام ہے ہنس لو (HOUNSLOW)

مر کا نام بھی انھوں نے ٹھیک ہی رکھا ہے "آشیانہ"۔ یہ بات بھی پسند آئی کہ غالب کی ترکیب "خندہ ہائے گل"
سے انھوں نے "ہائے" حذف کر دیا۔ واہ میں گو آہ کے حروف موجود ہیں لیکن ان کا اعلان کرنا کیا ضروری ہے
ملص شاعر نے "اقبال کے مصرع سے اخذ کیا ہے بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ لیکن اقبال کے
سے استفادہ کرنے میں شاعر کا بڑا نقصان ہوا۔ آواز تو لی ہی (کیونکہ سبھی شعر بولتے ہوتے ہیں) لیکن
اس کے رنگ بھی کلام میں آگئے۔ (اسے اقبال مندی کی نشانی سمجھنا چاہیئے۔) اس لیے شاعر کی حد تک
یوں ہوگا۔ بلبل ہمہ آواز ہے طاؤس ہمہ رنگ۔

شاعر کو ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا وہ بھی باوردی۔ (سب لکھنے پڑھنے والے لوگ ملٹری میں کیسے چلے جاتے ہیں)۔ امیر خسرو نے جو طرح (یعنی سپاہیانہ) ایجاد کی تھی بلبل نے اسی پر گرہ لگائی اور محاذِ جنگ پر بھی "سلام علیکم" "اڑا جاتا ہوں" کہہ کر ادھر سے اُدھر اُڑتے رہے۔ ضمیر جعفری نے لکھا ہے۔

"بلبل" وہ اگرچہ بہ قامت کہتر سپاہی تھا مگر بہ قیمت بہتر تھا۔ چُست ٹھنک، پھرتیلا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ابھی تک جا پانیوں سے بچا ہوا تھا۔ ہم تو اس کی سپاہیانہ چوکسی اور ضابطہ داری دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وردی ہمیشہ اس کے چہرے کی طرح شفاف اور بے سلوٹ رہی۔ ڈسپلن جیسے اُس کے خون میں رچ گئی تھی۔"
یہ تو ہوا شخص یعنی غلام علی کا ذکر اور شاعر کو انھوں نے دو جملوں میں سمیٹ لیا۔ اُس کی انفرادی خصوصیت میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ مزاح ـــ مزاح کے درمیان بیٹھ کر لکھتا ہے جیسے بلبل شاخِ گل پر بیٹھ کر چہک رہا ہو۔ اور یہ کہ بظاہر وہ شاعری تفریحاً کرتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کی شاعری تفریحی معلوم ہوتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اُس کی شاعری محض تفریحاً نہیں پڑھی جائے گی اور یہ وہ سکہ ہے جو کسی شاعر کو آسانی سے میسر نہیں آتی۔"

ضمیر جعفری کے اس خاکے کے جواب میں (جو شاید پہلے لکھا گیا ہو) شاعر نے کیا عمدہ شعر کہا ہے۔

آ بھی جا دور سے یہ اے سید ضمیر جعفری ؛ اب تو ملتے ہیں کباب و نان انگلستان میں

میں یہاں ضمیر جعفری کے اس بیان کی تائید کروں گا کہ بلبل کی شاعری تفریحی نہیں ہے ورنہ اس شعر کا مطلب تو بظاہر یہ ہوگا کہ ضمیر جعفری صاحب صرف نان کباب کھانے لندن چلے جائیں۔ یہ سوئے ظن ہے جعفری صاحب کے باب میں بلبل کا کاروبار تو اصل میں عشق ہے اور ایسا عشق جس کا تعلق دل سے نہیں ضمیر سے ہے۔

اسی زمین میں بلبل نے ایک تاریخی اور جغرافیائی شعر بھی کہا ہے۔

رفتہ رفتہ ہو گئیں نابود نو آبادیاں ؛ رہ گیا لے دے کے انگلستان' انگلستان میں

اور اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فوجی بلبل کو بقدرِ اشک بلبل بھی 'شوق' نہیں کرتا۔ کہا ہے

ساقیِ افرنگ نے میرے نہ پینے پر کہا ؛ کس لیے آیا ہے اے نادان انگلستان میں

بلبل نے جسے چہکنے سے کوئی نہیں روک سکتا، جواب میں ضرور کہا ہوگا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے ؛ 'وہاں' ساقی نہیں پیدا 'یہاں' بے ذوق ہے صہبا

بلبل نے اپنے آپ کو 'اپنے بال و پر کو' یا 'سر کو' وہاں بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہے اور دوسروں کو بھی خبردار کر دیا ہے۔

سنبھل کر اس کے 'پھسلن زار' کوچوں میں قدم رکھنا ؛ بڑی مہنگی پڑے گی لغزشِ یک گام لندن میں

یہ شیخ غلام علی جنھوں نے کہا ہے 'علی بلبلِ گلشن مصطفےٰ تھے ؛ مجھے یہ شرف ہے غلام علی ہوں' اپنی شاعری میں مولانا بھی ہیں اور مسٹر تو ہیں ہی۔ جو بھی روم میں رہے گا رومن نہ بنے نہ سہی لیکن رہے گا تو انہی کے طور طریقے کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے یہ بلبلِ کشمیر آزاد فضاؤں میں محفوظ تو بہت ہوتا ہے لیکن اس نے خود کو محفوظ بھی رکھا ہے۔ یہ وہی 'ڈسپلن' ہے جس کی طرف سید ضمیر جعفری نے اشارہ کیا ہے۔

لندن میں اسلام بھی پھیلا ہے۔ یہ خبر ہمیں اس شعر کے ذریعہ ملتی ہے۔

عقدِ ثانی کر لیا ہے شیخ نے گوری کے ساتھ ؛ پھیلتا جاتا ہے یوں اسلام لندن شہر میں

یہ تو وہی بات ہوئی کہ

ہم ویش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو ؛ مس زلف دکھاتی ہے کہ اِس لام کو دیکھو

دیا در ہے یہ گوری برصغیر کی گوری سے مختلف ہے! 'ڈالر مر رہا ہے' میں وہ کہتے ہیں۔

بڑا مضبوط شیر نر رہا ہے ؛ یہ میڈم پونڈ کا شوہر رہا ہے
بڑا کہرام ہے واشنگٹن میں ؛ خبر آئی ہے ڈالر مر رہا ہے

میڈم پونڈ کے ذکر پر ہمیں ایذرا پاؤنڈ کی یاد آگئی۔

'بلبل' کے جوہر نظم میں بھی کھلتے ہیں اور غزل میں بھی پونڈ شعر تو دریائے نظم میں بھی کہنا ہے اور تنگنائے غزل میں بھی اختر شیرانی کی دو نظموں کی پیروڈی جتنی دل چسپ ہے اتنی ہی دل چسپ 'اساتذہ' کے اشعار کی تحریف و تحذیف بھی (تصرف بھی کہہ لیجیے)۔ دو چار شعر اس بحرِ ذخار کے بھی دیکھیے۔

یہاں ہر سال وزن [illegible] پڑتا ہے ؛ بڑی مشکل سے ہوتا ہے 'ولایت' میں سمر پیدا

(اچھا ہوا کہ انھوں نے سمر کا اِملا س سے لکھا۔ ث سے نہیں)

چہرہ جنابِ شیخ کا ہے کس عذاب میں ؛ بیوی نے کچھ ملا نہ دیا ہو خضاب میں
یہ بھی اک ٹھمری سے ہرگز کم نہیں ؛ آپ کی گالی بھی گا لی جائے گی!
دخترِ رز پوچھ کچھ کے واسطے لائی گئی ؛ شیخ کے حجرے کے پچھواڑے میں ٹھیرائی گئی

(یہ شیخ، غلام علی بلبل کاشمیری نہیں ہیں)

سرکار میرے عشق کا معیار دیکھنا ؛ لایا ہوں آپ کے لیے میں کار دیکھنا

(غالب نے اسی لیے تو عشق کو خللِ دماغ کہا تھا) میں اور بھی کچھ کہتا لیکن ڈرتا ہوں کیونکہ بلبل نے سمجھا دیا ہے کہ

بلبل کو چونچ مارنے آ تو سوچ کر ؛ تلوار سی ہے اُس کی بھی منقار دیکھنا

غزلوں کے باب میں کئی اقسام کی غزلیں ہیں۔ فروٹی غزل (اچھی خاصی فواکہات کی دوکان ہے) طبی غزل، فوجی غزل ہوش غزل، کڑوی غزل وغیرہ وغیرہ۔ دماغ زرخیز ہو تو یہی ہوتا ہے۔ آدمی خود مٹی کا پتلا ہے یہ مٹی جتنی نم ہوگی اتنی ہی زرخیز بھی ہوگی۔ نمی میں البتہ احتیاط لازمی ہے۔ فوجی غزل میں معشوق کا سراپا اس طرح کا ہوتا ہے۔

تری ابرو کماں، مژگان ناوک، ناک خنجر ہے ؛ تری ہر بات گولی ہے زباں پستول ہے ساقی

محبوب کے اعضائے جسمانی میں 'ناک' ہی ایک چیز رہ گئی تھی جس کی تعریف نہیں کی گئی تھی۔ بلبل نے اسے بھی بجا طور پر منقار بنادیا۔ پتہ نہیں، اس سے پہلے ہمارے شاعروں نے محبوب کے اِس حصۂ جسم پر کیوں توجہ نہیں کی۔ نثر نگاروں سے البتہ اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ ناولوں کی ہیروئین بلکہ ہیروئین کی سہیلیوں کی ناکوں کی بھی تفصیل ناولوں میں ملتی ہے اور ایک عام اندازے کے مطابق یہ سب ناکیں ستواں ہوتی تھیں۔

بلبل کو 'زبان' کا بڑا سہارا ہے۔ اساتذہ کے کلام کے مطالعے نے انھیں وہی فائدہ پہنچایا ہے جو ان کی صحبت سے پہنچ سکتا تھا۔

'خندۂ گل' میں کئی قطعات بھی شامل ہیں اور متعلقہ باب کا عنوان ہے 'کم کلامی'۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ

قطعہ گوئی، کم کلامی کب سے ہوگئی۔ یہ تو پُرکاری کی طرح پُرکلامی ہوئی۔ جبھی تو شاعر نے خود ہی اقبال کا ایک مصرعہ نقل کر دیا ہے ؎ یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے۔

بلبل نے کبھی کسی کو چندہ دیا ہوگا۔ نقصان اٹھایا لیکن اپنے نقصان کی تلافی یوں کرلی۔

"کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند ÷ کوئی دنیا میں ایسا بندہ ہے
لوگ تو ملک بیچ کھاتے ہیں ÷ یہ تو اک انجمن کا چندہ ہے"

دو شعر اور سُنئے۔

ابھی یک شرم سے ہوں پانی پانی ! ÷ "بدستِ نرس" نہلایا گیا ہوں۔ اوی
مرکو مرکو میں تمہیں "مارچ" لاکے دیتا ہوں ÷ "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

بلبل نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا یہ سارا مال (جو اتفاق سے کھرا ہے) کس کی دین ہے۔

جس زعفرانی زار سے نسبت ہے آج تک ÷ خوشبو مرے سخن میں اُسی زعفراں کی ہے

دوسرے مصرعے میں 'ن' اگر غیر ملفوظ ہے تو پرواہ نہیں۔ شاعر نے کہیں کہیں بے نقطہ بھی سنائی ہے "خندۂ گل" کی ترکیب میں غالب نے بھی استہزا کو شامل رکھا ہے۔

ڈیمائی سائز کی ۱۹۲ صفحوں کی یہ خوبصورت کتاب جو اُجلے کاغذ پر ادارہ "نقوش" انارکلی لاہور سے چھپی ہے۔ صرف سرورق کے اعتبار ہی سے دیدہ زیب نہیں ہے بلکہ کتابت، طباعت اور ظرافت کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ مغرب میں ۵ پونڈ کی ہے اور مشرق میں ۴۵ روپے کی۔ مشرق میں خریدنا بہتر ہے۔ ▲▲
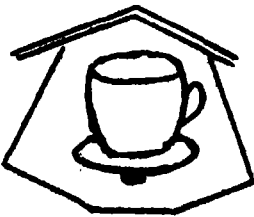
جناب ضمیر جعفری کا خط

مدیر "ظرافت" کراچی کے نام

۱۷ جون ۸۸ء

عزیز مکرم ضیاء الحق قاسمی صاحب

السلام علیکم،

لیجئے آپ اس ابوظہبی کی خوبصورت ساحلی سڑک "کورنش" کو کورنش بجا کر واپس نہ آئے ہوں گے کہ آپ کو میرا یہ خط آپ کی منتظر ڈاک میں چشم براہ ملے گا۔ مراسلت میں ہم اتنی عجلت کرنے والے کہاں کے ہیں مگر آپ نے جس محبت کے ساتھ دوبئی میں ہمارے آب و دانے کا خیال رکھا اور آمد و رفت کی باگ ڈور سنبھالے رکھی اسی کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر واجب تھا۔ بخدا اگر آپ وہاں نہ ہوتے تو ہم عمان گیسٹ ہاؤس کے فلیشنی چھوکرے ڈیوڈ صاحب سے کس زبان میں ناشتہ مانگتے۔ جو "چائے" کو بھی "لٹے" کہتا تھا۔ ڈیوڈ بذاتِ خود کھانے جلنے کی چیز ضرور تھا مگر وہ ہمیں تو کھانا نہیں کھلا سکتا تھا۔

دوبئی اور ابوظہبی میں کل پاک و ہند مزاحیہ و طنزیہ مشاعروں کا انعقاد اردو زبان کی لسانی فتوحات میں ایک "نخلستانِ سفر" کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلند پایہ گویان کا اتنا نمائندہ اجتماع اس سے پہلے میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ اس کارنامے کا سہرا یقیناً سید اظہر زیدی اور ان کے رفقائے کے سر ہے۔ مگر مزاحیہ و طنزیہ شاعری کی رگوں میں جن لوگوں نے بجلی بھری ہے ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ دکن ہندوستان کا "شگوفہ" راولپنڈی میں کرنل محمد خاں اور سلطان رشک کا اردو پنچ اور کراچی سے آپ کا ظرافت سبھی سمت میں اپنی اپنی جگہ سنگ میل ہی تو ہیں۔ ہاں انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد کو اولیت کا شرف حاصل ہے متحدہ عرب امارات کے حالیہ اجتماعات میں اس انجمن کی روح رواں جناب سید مصطفےٰ کمال (مدیر شگوفہ حیدرآباد) اور ان کے رفیق کار (شاعر نغز گو) جناب طالب خوندمیری سے مل کر جی بہت خوش ہوا جبار خلیل کے ہاں رات کی نشستی نشست شعری میں کمال صاحب کا خطبۂ صدارت واقعی کمال کا تھا۔ خطبہ کیا تھا، چھوٹے چھوٹے جملوں میں فکر و خیال کی گویا جل حقل گومتی بہہ رہی تھی۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس طرح ایک کمال سے ہمیں ایک دوسرے کمال یاد آگئے۔ یہ کمال محمود تھے جن سے ہم اور آپ دوبئی میں سفارہ پاکستان کے قنصل جنرل جناب محمد قربان کے عصرانے میں ملے۔ یہ کمال محمود

بھی کمال کے شخص ہیں۔ یہ صاحب دنیا کے دو تہائی سمندروں میں دنیا کی ایک بہت بڑی جہاز ران کمپنی کے نگرانِ اعلیٰ ہیں۔ ان کے لیے "نگران" کا لفظ میں نے اس لیے بھی استعمال کیا کہ بیک وقت چھ سو چھوٹے بڑے بحری جہاز ان کی نگاہ میں تیرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کے جس پہلو نے ان کو میرے لیے ناقابلِ فراموش بنا دیا وہ یہ نہیں کہ چھ سو جہاز ان کے پہلو میں رہتے ہیں، بلکہ وہ یہ پہلو ہے کہ کمال صاحب روزانہ رات کو اپنی ماں کے پاؤں دبا کر سوتے ہیں۔ یوں وہ سوتے بھی تین گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ ان سے مل کر ہمیں اردو زبان کے مایہ ناز مزاح نگار میجر جنرل (ریٹائرڈ) شفیق الرحمٰن یاد آگئے۔ جو رات کو تین گھنٹے سوتے اور دن کو چھ میل دوڑتے ہیں۔

سید اظہر زیدی کے آس پاس جن افراد کی یاد بہت دنوں تک ہمارے ذہن میں روشن رہے گی ان میں زیدی صاحب کے "دستِ راست" محمد حبیب صاحب اور زیدی صاحب کے بالادستِ راس" جناب شیخ علی صاحب کو آسان نہیں۔ حبیب صاحب، انجمن زندہ دلان دوبئی کے کلچرل سکریٹری ہیں اور سچ یہ ہے کہ جس طرح کسی زمانے میں

بنا تھا عیش تجمل حسین خان کے لیے

اسی طرح حبیب صاحب طبعًا اسی منصب کے لیے تخلیق ہوئے ہیں۔ وہ بات کرتے تو مجھے لگتا کہ مردِ مومن جب سر سے پاؤں تک بریشم ہوتا ہے تو ایسی ہی طرح ہوتا ہوگا۔ اور شیخ اشتیاق علی صاحب تو ماشاءاللہ ان کمیاب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی زندگی میں انجمن اور ادارے بن جاتے ہیں۔ ان کے گھر کو دوبئی کا "دُوار" کہنا چاہیئے۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان جیسا "گرم جان" شخص ٹھنڈی آئسکریم کا بین الاقوامی کارخانہ کیوں کر چلا رہا ہے۔ غالب نے سچ کہا تھا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

لو بھئی آپ کا شکریہ کہتے کہتے کچھ حکایت بھی کہہ گئے۔ اچھا خدا حافظ۔

آپ کا اپنا

(سید ضمیر جعفری)

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

اِس شمارہ کی اشاعت کے ساتھ 'شگوفہ' نے اپنی زندگی کے بیس سال مکمل کر لیے!

شگوفہ کے بیس سال کے فائل گواہ ہیں کہ اس رسالہ نے اُردو میقاتی جرائد کی دنیا میں ایک نئی تاریخ بنائی ہے ـــ شگوفہ کی روایت ہے کہ (ہو سکتا ہے کہ آپ اسے روایت شکنی کہیں) یہ رسالہ نا مساعد حالات کے باوجود نہایت پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈیڑھ ماہی (نومبر ۶۸ء تا مئی ۷۳ء) کا دَور ہو یا جون ۷۳ء کے بعد بطور ماہنامہ اشاعت کا مرحلہ ـــ کرفیو کے حالات ہوں یا ریاستی حکومت کے اشتہارات کی مسدودی تمام طرح کے موانعات کے باوجود شگوفہ روایتی پاسداری اور آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر آتا رہا۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ پابندیٔ اشاعت سے شگوفہ کا معیار کبھی متاثر نہیں ہوا جس کا نقادانِ ادب وقتاً فوقتاً اعتراف کرتے رہے ہیں اور طنز و مزاح کے فروغ کے سلسلہ میں "اودھ پنچ" کے کارناموں کے ساتھ شگوفہ کا نام لیا جانے لگا ہے۔ شگوفہ کی وجہ سے بے شمار نئے لکھنے والے طنز و مزاح نگار روشناس ہوئے۔ جن میں سے بعضوں نے اپنی تحریروں سے چونکا دیا۔ پرانے لکھنے والوں نے شگوفہ کی تحریک پر اپنے تخلیقی عمل کو تیز کیا۔ اس طرح بحیثیت مجموعی طنز و مزاح کے سرمایہ میں بیش قیمت اضافہ ہو سکا۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ شگوفہ نے طنز و مزاح اور طنز و مزاح نگاروں کے باوقار مقام کے تعین کے لیے فضاء بنائی، راہ ہموار کی۔ اور تمام تر مشکلات کے باوجود رسالہ کے کردار میں تبدیلی کو گوارا نہیں کیا گیا۔ بیس سال کے اس عرصہ میں کئی مواقع ایسے آئے کہ خوشیوں کی دولت بانٹنے والا یہ ادارہ مایوسیوں کے اندھیروں میں گھر گیا۔ لیکن شگوفہ کے صفحات پر ان اندھیروں کا سایہ پڑنے نہیں دیا گیا۔ کتابت، طباعت، مضامین کی وصولی، اور اشاعت کے مراحل کی دقتوں اور مہنگائی کا کبھی رونا نہیں رویا گیا۔ کہ یہ انداز، کاروانِ طنز و مزاح کے بڑھتے قدموں کو متزلزل کر دیتا۔ مزاح نگاروں نے اس کارواں کے بڑھتے قدموں کا ہمیشہ ساتھ دیا۔ قارئین کرام نے داد و تحسین سے نوازا۔ صحافتی اور ادبی حلقوں نے ستائش کے دو بول سے ہمت بڑھائی۔ ہمیں اُمید ہے کہ مستقبل میں بھی ہمیں اسی طرح کا تعاون حاصل ہوگا۔

شگوفہ کے اس ادبی سفر کو یادگار بنانے کے لیے ادارے نے طے کیا ہے کہ نثر و نظم پر مشتمل ایک بیس سالہ انتخاب شائع کیا جائے۔ اس بار انتخاب کے اس کام کے لیے کسی ادیب، شاعر یا ناقد کی بجائے اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل قاری کو زحمت دی جا رہی ہے چنانچہ جناب سید عبدالقدوس (ایڈوکیٹ) سے درخواست کی گئی ہے کہ اس کام میں معاونت کریں۔ قدوس صاحب ستھرا اور ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کی سماجی و تہذیبی زندگی سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی مدد سے ہمارا نیا پروجکٹ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔ اس سلسلہ میں ساری تفصیلات آئندہ شمارہ تک طے کی جائیں گی۔ قارئین کرام سے بھی درخواست ہے کہ وہ اس ضمن میں ہمیں مفید مشوروں سے نوازیں ـــ!

بجلی کی بچت
بجلی کی پیداوار میں معاون ہے
ٹیوب لائٹ کا استعمال کریں
یہ کم بجلی صرف کرتی اور زیادہ روشنی دیتی ہے۔
آئی ایس آئی مارک والے بجلی کے ساز و سامان کا استعمال کریں۔
ISI
ٹیوب اور بلب کو دھول سے محفوظ رکھیں۔
استعمال کے فوراً بعد ریفریجریٹر کا دروازہ بند کر دیں۔
جب ضرورت نہ ہو بجلی مصنوعات کے تمام سوئچ بند کر دیں۔
جب آپ کمرہ چھوڑ کر جائیں روشنی، پنکھے اور ایر کنڈیشنر کے سوئچ بند کر دیں۔
جاری کردہ:
محکمۂ بجلی
وزارت توانائی، بھارت سرکار
نئی دہلی - 110001
davp 88/204

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

جلد (۲۱)
شمارہ (11)

نومبر ۱۹۸۸ء

ایڈیٹر ـ ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

- مجلسِ ادارت :
  - حمایت اللہ
  - محمد منظور احمد
  - مسیح انجم

- مجلسِ مشاورت :
  - بھارت چند کھنہ
  - نریندر لوتھر
  - یوسف ناظم
  - مجتبیٰ حسین

- منیجر اعزازی (بمبئی) : فیاض احمد فیضی

کتابت : محمد عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان. حیدرآباد
قیمت فی پرچہ : ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرِ سالانہ : ۵۰ روپے، عرب ممالک سے ایک سو پچاس روپے

- خط و کتابت کا پتہ :
۱۳ ریجنل کو آرڈ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد فون آفس : 557716 فون مکان : 521064

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

زندہ دلانِ حیدرآباد

کی سالانہ تقاریب

۲۴ر نومبر ____ ادبی اجلاس بمقام گاندھی بھون تھیٹر
۲۵ر نومبر ____ محفلِ لطیفہ بمقام گاندھی بھون تھیٹر
۲۶ر نومبر ____ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بمقام نمائش میدان

اِس موقع پر شگوفہ کا خصوصی

شائع ہوگا

سرورق خوبصورت دو رنگی

صفحات (۸۰)

قیمت: چھ روپے

شگوفہ

کے بیس سال کی تکمیل پر شعری و نثری انتخاب بہت جلد شائع ہوگا۔!

مرتب: سید عبدالقدوس (ٹیکہ)

کیوں کر کھلا۔

رشید قاضی نے اپنے اِن مضامین کو انشائیوں کا نام دیا ہے۔ یہ انشائیہ بڑا خطرناک لفظ ہے ہمارے یہاں یعنی ہندوستان میں انشائیہ کو مزاحیہ کا بدل سمجھا جاتا ہے (صرف بدل نعم البدل نہیں) یعنی مزاحیہ ہی سمجھا جاتا ہے جب کہ پاکستان میں انشائیہ کا مزاحیہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہاں کے انشائیہ میں اگر مزاح کا عنصر نہ بھی ہو تو وہ انشائیہ ہوگا اور اگر ہو تب بھی انشائیہ۔ مطلب یہ کہ جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ میں اپنی حد تک رشیدہ قاضی صاحبہ کے مضامین کو انصاف کا ترازو سمجھتا ہوں انھوں نے دونوں ملکوں کے انشائیوں کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ "قصہ قاضی کا" پڑھ لیجیے۔ یہ مضمون اس لیے بھی پڑھنا ضروری ہے کہ قاضی کا قصہ لکھا ہی قاضی نے ہے۔ مانا کہ انھوں نے مضمون شروع ہی اس طرح کیا ہے "ناچیز کے نام کے ساتھ قاضی کا دُم چھلا لگا ہے۔ اس لیے قارئین شاید یہ خیال کر بیٹھیں کہ میں آپ بیتی سنانے جا رہی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ بھلا اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ 'چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری'، میں اس جملے کو 'علذ' نہیں سمجھتا بلکہ وہ حلف سمجھتا ہوں جو سچ بولنے کے جرم میں اٹھائی جاتی ہے (حلف عجیب چیز ہے یہ مصرعوں کی طرح اٹھائی بھی جاتی ہے اور لطور نذر لی بھی جاتی ہے) لکھتی ہیں۔

"ان دنوں یہ عالم ہے کہ قاضی کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں نکاح پڑھانے والے قاضی اُبھر آتے ہیں۔ وہ قاضی جو فریقین کا انصاف نہیں کرتے صرف انھیں زوجیت کی ڈوری میں باندھ دیتے ہیں اور پھر اس بھری پُری دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کرنے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بھلے طور ہیں تو ٹھیک ورنہ قاضی صاحبان طلاق کا ڈنڈا یا خلع کی قینچی لے کے موقع واردات پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس قسم کے قاضیوں کا شمار میں آنا محال ہے۔ گلی گلی قاضی فلاں، اور قاضی فلاں ابن فلاں کے بورڈ لٹکے نظر آتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ ہر ایک کے آگے چیف قاضی شہر ضرور درج ہوتا ہے۔ . . . ماضی میں وہ دولت مند قاضی شاذ ہی دیکھنے میں آتے تھے آج ڈھونڈنے پر بھی کوئی کوئی کنگال نہیں ملے گا" ___ اسی مضمون میں قاضیوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی آٹے دال کا بھاؤ بتا دیتی ہیں۔

عرب ہندوستانی مردوں کی طرح دقیانوسی نہیں ہوتے۔ زندگی بھر نبھانے کے قول و قرار سے انھیں سخت وحشت ہوتی ہے۔ جی بھرا۔ قیام کی مدت پوری ہوئی اور قاضی کی مدد سے پیاری دلہن کو دائرۂ نکاح سے باہر ڈھکیل کر یہ جا وہ جا۔ لگتا ہے علامہ اقبال کی نصیحت گرہ میں باندھ لی ہے ؏

"تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا"

خواتین بالعموم دبی زبان سے، سرگوشی کے انداز میں بات کرتی ہیں۔ رشیدہ قاضی نے اسی نہج کو اپنی تحریر میں بھی برقرار رکھا ہے۔ وہ بلند آہنگ قہقہوں کی نہیں، زیرِ لب مسکراہٹ کی قائل ہیں۔ قہقہہ معیوب نہیں ہے لیکن مسکراہٹ بہرحال زیادہ منفعت بخش ہوتی ہے۔ قہقہے اور غلغلے میں قدرے تاملہ دار دکا معاملہ ہے۔ قہقہے میں یوں بھی کئی اعضائے جسمانی کو زحمت دینی پڑتی ہے لطف تو آتا ہے لیکن بس لمحہ بھر کے لیے۔ مسکراہٹ سستی پڑتی ہے یہ صرف لبوں کی جنبش مانگتی ہے اور معاوضے میں دیتا خوش دلی، انبساط اور فرحت نام کی چیزیں پیش کرتی ہے۔ رشیدہ قاضی کے ان انشائیوں کا مقصد بھی فرحت و انبساط کی فضا پیدا کرنا ہے۔ آپ کو بتلاتا نہیں ہے کہ رشمہ سانیاں الیکٹرک کی

انشائیے میں لکھتی ہیں:

"ایک امیدوار کا نشان مرغا تھا۔ بڑے بڑے اصیل مرغ حضرت کے الیکشن آفس میں بندھے تھے۔ آنے جانے والے بہ نظر حسرت انھیں دیکھتے تھے اور بدبداتے تھے سالم ودہن کی آزمائش ہے، الیکشن مہم کے دوران انہی صاحب کا جلوس دیکھا۔ جلوس میں ایک سو ایک بائیسکلیں تھیں۔ ان پر گدی نشین ایک سو ایک مرغے تھے اور انھیں سنبھالنے کے لیے ایک سو ایک ورکر تھے۔ اس شام ہمارے ایک ورکر نے اطلاع دی کہ مرغا جلوس جب اختتام کو پہنچا تو مرغوں کی گنتی ہوئی۔ بہت سے مرغے غائب پائے گئے۔ پوچھ تاچھ پر معلوم ہوا کہ کئی مرغیوں کے پیچھے بھاگ گئے، کئی ورکرز کے پیٹ میں اتر گئے"

کیا تعجب رشیدہ قاضی نے اپنے مجموعے کا نام اسی انشائیے سے حاصل کیا ہو۔ یہ بہرحال طے ہے وہ طاقت پرواز رکھتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے طائرِ خیال کو ابھی ان دیکھی فضاؤں میں اڑنے کی اجازت نہیں دی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے شوقِ نگارش کو باورچی خانے اور کلاس روم سے باہر نکلنے دیا ورنہ یہ پرندہ یوں ہی دم سادھے پڑا رہتا اور زبان حال سے فریاد کرتا۔

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا   کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

رشیدہ قاضی اپنی اس کتاب کے ساتھ ادب کے دارالقضاۃ میں داخل ہو رہی ہیں۔ یہاں بھی قاضیوں کی کمی نہیں۔ گو میں قاضی نہیں صرف قاری ہوں تاہم قاضیانِ ادب کے خود ساختہ نمائندے کی حیثیت سے (گویا خود ساختہ نمائندے کی بھی کوئی حیثیت ہوتی ہے) میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کا مقدمہ مضبوط ہے۔ (میری گواہی البتہ کمزور ہے)

انشائیہ نگاری کے میدان میں کئی خواتین پہلے ہی سے سرگرم سفر ہیں۔ شفیقہ فرحت، سرور جمال، حبیب ضیا، لئیق صلاح، ڈاکٹر رشید موسوی، بانو سرتاج اور حلیمہ فردوس ـــ ان سب کے ساتھ ان کا یہ سفر آرام سے کٹے گا (البتہ دورانِ سفر گفتگو ادب سے متعلق ہو، زیور اور لباس کے بارے میں نہ ہو) اتفاق سے یہ سب خواتین معلمات ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں مزاح کا سبق آموز (ایجوکیٹیو) ہونا مسلّم۔ آفتاب، آمد دلیل آفتاب۔

رشیدہ قاضی نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ پرواز ان کی محنت اور ریاضت کا حاصل ہے۔ تسلیم لیکن منزل حاصل نہیں۔

میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کو مُفرحات کے طور پر استعمال کرنا چاہیے ان میں کسی قسم کی آمیزش "ملاوٹ" کے مترادف ہے۔ میرا اشارہ پیش لفظ، مقدمہ اور تعارف وغیرہ قسم کی اشیاء کی طرف ہے۔ لاحقے، سابقے، پدستے، دوسری اصنافِ ادب کے لیے ضروری ہوں مزاح کے لیے غیر ضروری ہیں۔ زود ہضم غذائیں یونہی استعمال کی جاتی ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پیش لفظ ہے بھی نہیں لیکن چوں کہ ہر تحریر کا عنوان ہوتا ہے اس کا بھی عنوان پیش لفظ لکھ دیا گیا ہے۔ میری یہ تحریر تو صرف اس بات کا اعلان ہے کہ

اس کو بھلا کیا چاہیئے کہنا
صبح جو جاتے اور کے شام

"پرواز" کا پیش لفظ

عنایت علی خان
(حیدرآباد (سندھ) پاکستان)

یہ فیشن کے نئے رنگ ہیں

مرے مُرشد کے اک فرزندِ دلبند — کھڑے فٹ پاتھ پر کھاتے تھے چھولے
کھڑی تھیں ساتھ بیگم ساڑی باندھے — اِدھر سے پیٹ اُدھر سے پیٹھ کھولے
وہ مصنوعی بھنویں آنکھوں پہ جیسے — کمانیں ہوں کڑی تیروں کو تولے
لبوں پر تہہ بہ تہہ سُرخی جمائے — برہنہ بازؤں پر بال کھولے
وہ لپ لپ چھولے کھا رہی تھیں — کہ جیسے پوپلا پستے پپولے
مجھے دیکھا تو وہ حضرت کے فرزند — لیکایک رہ گئے یُوں منہ کو کھولے
شکاری پر نظر پڑتے ہی جیسے — تکیں پرواز سے پہلے ممولے
کوئی اندھا چِت پڑتے ہی جیسے — بچاؤ کے لیے پگڑی ٹٹولے
نظر پھر اپنی بیگم سے بچا کر — مرے نزدیک آتے ہولے ہولے
مری آنکھوں میں استفسار پڑھ کر — وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر یہ بولے

کہ صاحب کیا کریں فیشن یہی ہے!

محلے میں تھی کل شادی کی تقریب — ہر سو روشنی پھیلی ہوئی تھی
سڑک پر تن رہا تھا شامیانہ — اور اک بڑلونگ اُسی میں سج رہی تھی
اِدھر بے باک لڑکوں کا تھا ٹولہ — اُدھر اک لڑکیوں کی صف کھڑی تھی
اِدھر سر پہ بالوں کے گھونسلے تھے — اُدھر زلفِ پریشاں اُڑ رہی تھی
اِدھر یا ہو کے تھے پرجوش نعرے — اُدھر کیفیت اک دھمال کی تھی
اِدھر ڈسکو کے ٹھمکے تھم رہے تھے — اُدھر تالی پہ تالی بج رہی تھی
تھی محوِ رقصِ عُریاں بے حیائی — حیا و شرم منہ ڈھانپے کھڑی تھی
سڑک پر ہو رہا تھا اک تماشہ — اور اک خلقت تماشہ دیکھتی تھی
پھر اس فحش مستی و بے ہودگی کی — بڑی محنت سے ویڈیو بن رہی تھی
دُلہن کے باپ مسجد میں ملے صبح — تو اُن کی شرم سے گردن جھکی تھی
جو پوچھا نظروں ہی نظروں میں میں نے — کہ حضرت رات یہ کیا دل لگی تھی؟
تھی کھسیانی ہنسی ہونٹوں پہ اُن کے — مگر چہرے سے ظاہر بے بسی تھی
[illegible]

ہمارے شہر کے اک معتبر فرد — کہ ہیں اکیسویں درجے کے افسر
ملی ہے صاحبی ورثے میں جن کو — تھے اُن کے قبلہ گاہی بھی کمشنر
مسز بھی صدر "اپوا" شاخ کی ہیں — جو دو فرزند ہیں پڑھتے ہیں باہر
ہیں داماد اُن کے کوٹا ڈائریکٹر — اناؤنسر ہیں دختر نیک اختر
ہے وہ ماحول ان کے گھر کا جس میں — کہا جاتا ہے باورچی کو بٹلر
غرض وہ افسرِ ذی شان و ذی جاہ — صدارت پیشہ و اعزاز پیکر
تھے اک محفل میں مہمانِ خصوصی — بیاں کرتے تھے اوصافِ پیمبر
ہوئے وہ لب کشا کچھ اس ادا سے — کہ جیسے جھڑ رہے ہوں منہ سے گوہر
تھی ایسی روح پرور ان کی تقریر — کھنچا آتا تھا دل سینے سے باہر
انھیں سنتے ہوئے یاد آ رہے تھے — عطاء اللہ بُخاری اور جوہر
عجب اک سحر تھا مجمع پہ طاری — عجب تقریر تھی اللہ اکبر!
ثنائے کبریا سے ابتداء کی — اور اس کے بعد کی مدحِ پیمبر
پس از تقریر ہم نے ان سے پوچھا — جو سرگوشی میں کچھ نزدیک جا کر
بھلا آپ اور یہ اسلام کی بات — یقیں کیسے ہو اس کا یا کلپ پر
جواباً مسکرائے اور بولے! — مرے شانے پہ اپنا سر ٹکا کر

کہ صاحب کیا کریں فیشن یہی ہے!

تنگ غنایت پوری

"بن گیا میں بھی مقدر کے سکندر کی طرح"

سب کی نظروں میں رہا جو تیرے شوہر کی طرح — اس کو سمجھا ہے ترے باپ نے نوکر کی طرح
کل جو کچھوے کی طرح چلتا تھا دھیرے دھیرے — آج اس شخص کی رفتار ہے موٹر کی طرح
ایک بڈھے نے جواں لڑکی سے شادی کر لی — باپ جیسا ہے پتی بیٹی ہے ڈوٹر کی طرح
رنگِ صدرت لئے مائک پہ جو آیا شاعر — سبھا نجک چل دیا اک نظم کو نکچر کی طرح
ایک مصرع بھی تو کہنے کا نہیں اس کو شعور — بانکتا ہے وہ منگا نے کو جو ہر کی طرح
جب سے استاد نے خود کہہ کے غزل دی ہے مجھے — بن گیا میں بھی مقدر کے سکندر کی طرح
ڈالیاں توڑ کے رکھ دی ہیں غزل کی اس نے — مجھ کو لگتا ہے وہ شاعر کسی بندر کی طرح
جوتیاں بیوی کی کھا کھا کے یہ شوہر نے کہا — زندگی سخت ہوتی جاتی ہے پتھر کی طرح

ایک دن ظلم سہا بھی گر جائے گا
تم بھی اے تنگ جو ہو جاؤ گے جوکر کی طرح

منظر علی خان
(پاکستان)

گھنٹی

گھنٹی خود نہیں بجتی اُسے کوئی نہ کوئی بجاتا ضرور ہے۔ اس سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ عموماً اُسے دوسروں کے لیے بجایا جاتا ہے خود اپنے لیے گھنٹی بجاتے آپ نے بجز مندر میں مرادیں مانگنے والوں کے اور کسی کو نہ دیکھا ہوگا۔ یہ مضمون لکھ کر میں بھی آج گھنٹی بجانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ویسے یہ مندر والی گھنٹی نہیں کہ میری کسی مراد کے بر آنے کا امکان ہو۔ ہاں دوسرے اس گھنٹی پر کیا ردِّ عمل ظاہر کرتے ہیں یہ بعد کی باتیں ہیں۔

گھنٹی کیوں بجتی ہے؟ کیسے بجتی ہے اور کون بجاتا ہے!!! ان تمام امور پر غور کرنے سے قبل گھنٹی سے متعلق آپ کو ایک شعر سنانا چاہوں گا۔ اس شعر میں ہو سکتا ہے فنی سقم ہو، ہو سکتا ہے اس شعر کی زبان غیر فصیح ہو اور یہ تو طے ہے کہ ادب میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ لیکن مجھے یہ آج بھی یاد ہے عرصہ قبل جب میں بہت چھوٹا سا بچہ تھا تو میرے محلے میں ایک شاہ صاحب تقریباً روزانہ آتے تھے۔ اُن کے جسم پر ایک بوسیدہ شیروانی ایک بہت میلا اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا پائجامہ اور سر پر ترکی ٹوپی ہوتی تھی۔ جس کا پھندنا میری پیدائش سے قبل غائب ہو چکا تھا۔ وہ ہمارے گھروں کے سامنے بڑے لحن سے صرف ایک شعر پڑھتے تھے اور ردِّ عمل کا انتظار کرتے تھے۔ عموماً ردِ عمل حوصلہ افزا ہوتا اور جلد ظاہر ہوتا تھا۔ شاہ صاحب کی آواز سُننے کے ساتھ ہی ہم بچوں میں سے کسی کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا کہ شاہ صاحب کو دے آئے شعر یوں تھا ہے

کھڑا ہے ریل کا بابو ٹکٹ ہے ہاتھ میں ہے کہ　　بجے ہے دم بہ دم گھنٹی وہی غفلت تمہاری ہے

شاہ صاحب نے یہ شعر خود ہی موزوں کیا تھا یا محکمۂ ریلوے نے ان حضرات سے کہلوایا تھا جو کراچی کر پولس کا ہے فرض مدد آپ کی" قسم کے اشعار موزوں کرنے لگے ہیں، ابھی تحقیق طلب ہے شاید مخدوم مشفق خواجہ اس پر روشنی ڈال سکیں کہ تحقیق ان کا شعبہ ہے۔

چونکہ بچپن کی باتیں عموماً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں لہٰذا ہمیں شاہ صاحب کے اشعار کی گھنٹی بھی یاد رہی پھر اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے گھر کے پڑوس میں ریلوے اسٹیشن تھا جہاں رات اور دن کے مختلف اوقات میں گھنٹی بجائی جاتی تھی۔ مجھے بچپن میں بڑی کھوج رہی کہ گھنٹی کی آواز سن کر ریل چلی آتی ہے یا ریل کی آمد کی آواز سن کر اسٹیشن والے گھنٹی بجاتے ہیں۔ بہر حال جب [illegible] ہوا اور [illegible] میں داخل کیا گیا تو وہاں بھی گھنٹی [illegible]

[illegible] اہم نظر آئی وہ مدرسہ کی گھنٹی تھی جو ویسے تو کئی بار بجتی تھی لیکن اس کی آواز مجھے چار بجے شام بڑی پیاری لگتی تھی۔ مدرسہ چھوٹا اور اسکول آیا تو یہاں بھی گھنٹی پیغامِ راحت لاتی رہی، اسکول سے آگے بڑھا اور کالج آیا پھر بھی گھنٹی سے رشتہ منقطع نہ ہوا چنانچہ گھنٹی میری زندگی میں بڑی حد تک داخل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جب بھی کوئی واقعہ رُونما ہوتا ہے تمیز سے کان گھنٹی کی آواز کا سراغ لگانے لگتے ہیں لیکن شاید گردشِ زمانہ نے گھنٹی کا مزاج بدل دیا، یا اب واقعات رونما ہوتے وقت گھنٹی کی آواز کا سراغ کھو دیتے ہیں کہہ نہیں سکتا۔ اتنا تو پتہ ہے کہ گھنٹی اب بھی بجتی ہے اور چھوٹے سے لے کر بڑے بلکہ بہت بڑے بڑے واقعات اب بھی معرضِ وجود میں آتے رہتے ہیں کہ کائنات کا نظام واقعات کے تسلسل کے گرد ہی گھومتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں گھنٹیوں کی آواز آگے بڑھاؤں ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مضمون میں اُس گھنٹی کا ذکر نہیں ہوگا جو بلی کے گلے میں باندھی جاتی ہے کچھ اس لیے بھی کہ اب بلی اپنے گلے میں خود ہی گھنٹی باندھ کر آتی ہے۔ چوہوں کو زحمت نہیں کرنی پڑتی اور آنے کے بعد کرتی بھی وہی کچھ ہے جس کے تدارک کے لیے گھنٹی کا خیال وضع کیا گیا تھا۔ فی زمانہ گھنٹیوں کی گونج میں بلی چوہے کا کھیل جاری ہے اور زور و شور سے جاری ہے۔

وطنِ عزیز کے پھیلتے پھولتے شہروں میں لوگوں کے پاس ایک دوسرے سے ملنے ملانے کا وقت مشکل سے ہوتا ہے پھر دوسری مشکلات بھی ہیں لہٰذا لوگ ایک دوسرے کی گھنٹی [illegible] بجاتے رہتے ہیں۔ میرا مطلب ٹیلی فون کی گھنٹی سے ہے جو نیک کام دفتر کے اوقات میں بڑی دلجمعی اور پابندی سے ہوتا ہے۔ ایک کے بعد ایک گھنٹی بجتی ہے اور بجتی چلی جاتی ہے۔ درمیان میں اگر کچھ وقفہ میسر آیا تو ایک آدھ کام بھی نبٹا یا جاتا ہے ورنہ گھنٹی آپ ہی آپ بجتی تو پھر خود بجائی جاتی ہے کہ سلسلۂ گفتگو جاری رہے۔ آپ سوچیں گے کہ آٹھوں پہر صرف گھنٹی ہی بجتی ہے تو کام کس پہر ہوتا ہے! قبلہ حقیقت یہ ہے کہ اب جو کچھ ہوتا ہے وہ صرف گھنٹی ہی کے سہارے ہوتا ہے بشرطیکہ گھنٹی کسی "زبردست" نے بجائی ہو! قارئین کرام۔ میں چونکہ ہمیشہ [illegible] زیردست رہا ہوں لہٰذا اس موقع پر مجھے زبردست کی اصطلاح [illegible] سکتی تھی ورنہ اس کارِ خیر میں جملہ شریک ہوشمین میں کچھ ہم پیالہ ہوتے ہیں اور کچھ ہم نوالہ اور کچھ لوگ جن کا راستے [illegible] شریک ہوتے ہیں ان کا ذکر اب اتنا عام بھی نہیں ہے۔ ہاں جانتے سب ہی ہیں۔ بہرحال اپنے دفاتر میں بغیر گھنٹی بجے کسی کام کا ہونا بڑا مشکل ہے۔ اسی لیے اب ہر وہ شخص جسے کوئی کام کرانا ہوتا ہے "صاحب" کے پاس جانے سے قبل کسی ایسے صاحب یا صاحبہ سے رجوع کرتا ہے جس کی گھنٹی کی آواز سے یا تو صاحب مجبور ہو جائیں یا پھر مسحور ہو جائیں ہر کس و ناکس کے لیے یہ کہاں ممکن ہے کہ ایسے صاحب یا صاحبہ کا "انتظام" کر سکے!

ہم مادی دَور میں جینے والے دو جمع دو، چار روٹیاں، کہنے پر مجبور ہیں لہٰذا فون کی گھنٹی سے بات شروع کر کے اپنے دال دلیے کی فکر میں لگ گئے ورنہ گھنٹی کی آواز پر یا اپنے شاعر دوست کے بقول نقرئی گھنٹی جیسی آواز پر کتنے دل دھڑکنا بھول جاتے ہیں یا شاید تیزی سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ دیہات میں رہنے والے اپنے ہم وطنوں سے پوچھیں تو [illegible]۔ علی الصباح ڈھور ڈنگر کے گلے میں ڈالی گئی گھنٹیوں کی آواز آنا شروع ہوتی ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے [illegible] نونہالوں سے پوچھیں کہ جب گلی میں گھومنے والے خوانچہ فروش کی گھنٹی کی آواز انھیں سنائی [illegible] کیسا محسوس کرتے ہیں! گھنٹی اور اس کی آواز سے متعلق کئی اور سہانی سلونی مثالیں ذہن کے

رشتے میں موجود تو ہیں لیکن بُرا ہو اس گھنٹی کا جسے میرے لاکھ انکار کے باوجود میری بیوی نے گھر میں لگا کر چھوڑا
رجس کا بٹن باہر لگا ہے یعنی جسے ہم اگر چاہیں بھی تو گھر سے نکلے بغیر بجا نہیں سکتے یوں اُس پر دوسرے گاہے گاہے
ع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ محلے کے بچے جب کرکٹ کی بال کے پیچھے نہیں بھاگتے تو پھر میرے گھر کی گھنٹی بجا کر
بھاگتے ہیں۔ اب پتہ نہیں انھیں گھنٹی کی آواز بھاگنے پر مجبور کرتی ہے یا میری بیوی کی صلوٰتیں جو اس گھنٹی کی آواز
کے تعاقب میں ضرور ہوتی ہیں بہرحال یہ سلسلہ بھی بُرا نہیں لڑکوں کی ورزش ہوتی رہتی ہے اور میری بیوی کا گلا اس
ابل نہیں رہتا کہ وہ مجھے کچھ سنائیں۔ ربّ العزت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

اللہ ربّ العزت کے نیک بندوں کا کہنا ہے کہ خالق کائنات نے مختلف مواقع اور حالات کے لیے
مختلف گھنٹیاں تخلیق کر رکھی ہیں۔ اسی کے حکم سے اپنے وقت پر بجتی بھی ہیں لیکن اس کی آواز صرف انھیں کانوں
کو سنائی دیتی ہے جو اسے سننے کی توفیق رکھتے ہیں۔ عموماً ان بڑے لوگوں کے کانوں تک اس کی آواز نہیں پہنچتی
جن کے کانوں میں اور کئی اقسام کی گھنٹیوں کی آوازیں پہلے سے گونجتی رہتی ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے
محلے کے شاہ صاحب جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ ؎

بجے ہے دم بدم گھنٹی وہی غفلت تمہاری ہے

اللہ ربّ العزت کی گھنٹی تو ہر سانحے کے رونما ہونے سے پہلے ضرور بجتی ہے کوئی سُننے
والا تو ہو!!!

باذغ بہاری
(کلکتہ)

نہ تہذیب و سیرت نہ گھر دیکھتے ہیں
فقط دُلہنوں کا کلر دیکھتے ہیں

ہے تنخواہ ستر بہتر روپے
موذن کا یہ کیرکٹر دیکھتے ہیں

بہو جب سے آئی ہے گھر میں ہماری
ٹی وی و صوفہ چیئر دیکھتے ہیں

مجت، براتی، طعام ولیمہ
ولادت بھی نٹ پاتھ پر دیکھتے ہیں

جو سکھ ہندو مسلم ہیں دست و گریباں
تو ریگن کو با چشم تر دیکھتے ہیں

جو آئے ہیں بستی میں اک پیر صاحب
ہر اک گھر میں "جن" کا اثر دیکھتے ہیں

ہو فیلڈ سے دُم دبا کر اُڑن چھو
گلی میں اسے شیرِ نر دیکھتے ہیں

جو پڑھتے تھے کل تک نمازِ تہجد
وہ اب ویڈیو رات بھر دیکھتے ہیں

شب و روز باذغ بہاری کو ہم بھی
شراب غزل پی کے ٹر دیکھتے ہیں

جب باغ میں یاروں کی جانب سے جشن منایا جاتا ہے
دے کر مجھے دعوت مُرغا مرا مجھ کو ہی کھلایا جاتا ہے

تقریب میں دسترخوان پہ کیوں اب ایک بھی میٹھا چیز نہیں
باقی تو یہی اک سنت ہے اُس کو بھی مٹایا جاتا ہے

اللہ بخشے دادا میرے کرتے تھے کلّی دارو سے
مَیں ہیرو بن بھی پیتا ہوں تو مجھکو ستایا جاتا ہے

بریانی موٹے چاول کی کھانے کو ملی جو چہلم میں
مُلّا نے کہا اب مُردے کو بھی بُدھو بنایا جاتا ہے

لو بھارت کی تہذیب کہن کو روحانی تسکین ملی
کالج میں ہمارے سکس کا بھی اب پاٹھ پڑھایا جاتا ہے

جب سے میں شاعر بن بیٹھا احباب کی ہر اک محفل سے
لاحول ولا قوت کہہ کر کیوں مجھکو بھگایا جاتا ہے

جب کوئی پڑوسی کرتا ہے جی بھر کے مرمت بیوی کی
تب صلح و صفائی کی خاطر باذغ کو بلایا جاتا ہے

○

صلہ: صدر، امریکہ

جہاں قدر چغتائی (بھوپال)

جلاؤ لڑکیاں

ہندوستان میں ایک مثل مشہور تھی وہ یہ کہ ہر گھر مٹی کا چولھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر ایک گھر کا ایک جیسا حال مگر آج یہ مثل از کار رفتہ ہو چکی ہے کیونکہ اب ہر گھر کی بات الگ ہے۔ کتنا بدل گیا ہے ہندوستان میں گھروں کا حال۔ مگر جب مٹی کے چولھے ہوتے تو اُس میں زیادہ تر لکڑی جلائی جاتی تھی۔ جس کو "ہیزم" کہتے تھے جس کے معنی ہیں جلانے کی سوکھی لکڑی۔ دو پیسے کی دس پندرہ سیر ملتی ہوگی۔ مٹی کے چولھے آج بھی ہیں۔ لکڑی آج بھی جلتی ہے اور جلاؤ لکڑی کہلاتی ہے۔ آج کا جلاؤ لکڑی کا بازار بھاؤ ہر مٹی کے چولھے والے کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں آج کل "جلاؤ لڑکیاں" بہت ہو گئی ہیں جن کے جلنے کی خبریں روزانہ اخبارات میں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ پہلے لکڑیاں بہت جلتی تھیں اب لڑکیاں بہت جلتی ہیں۔ ہماری سرکار نے لکڑیوں پر کنٹرول کر لیا ہے سرکاری ٹالیں جگہ جگہ شہر میں قائم ہیں۔ مگر لڑکیوں کے جلنے پر سرکار قابو نہیں پا سکی ہے۔ ڈھیروں آدمی ایک پکی شاندار عمارت میں بیٹھ گئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو جو بھی جلائے گا سخت سزا پائے گا مگر ہم نے سزا پاتے کسی کو دیکھا نہیں سُنا نہیں۔ کتنے ناز سے پالتے ہیں ماں باپ اپنی بچی کو۔ اس کی پیدائش کے دن سے اپنا پیٹ کاٹ کر اُس کے لیے جہیز کا انتظام شروع کر دیتے ہیں۔ اور شادی کے وقت دولہا کو دلہن کے ساتھ گھر کی ساری پونجی تھما دیتے ہیں مگر دولہا اور اس کے گھر والے دلہن کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ قانون کے سامنے دُلہن سوزی کا تماشہ ہو رہا ہے۔ لڑکی نہ ہوئی دیوالی پر جلنے والی پھلجھڑی ہو گئی۔ ہم آتش بازی کو دیکھنے کے کس قدر شوقین ہیں کہ اپنی بہوؤں اور بیٹیوں کا جلنا اور آتش بازی کا چلنا ایک سمجھتے ہیں۔ میکے میں رہنے والی حوریں۔ پریاں اور الفلا تی دوسرے گھر جا کر جلاؤ لڑکیاں ہو جاتی ہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا۔ کوئی نہیں سوچتا۔ مت دیکھو۔ مت سوچو۔ تم نے لکڑیاں جلاتے وقت بھی نہیں دیکھا تھا نہیں سوچا تھا۔ اب جنگل اُگا رہے ہو۔ لکڑیاں بنا کر درخت جلانے سے قحط اور اکال پڑ گیا۔ لڑکیاں جلا کر کیا پڑے گا۔ کیا ہوگا؟ ہم نہیں جانتے۔ بچوں کے ایک اسکول میں ٹیچر نے سوال کیا بتاؤ مٹی کا تیل اور پیٹرول کس کام آتے ہیں؟ ایک بچے نے جواب دیا۔ مٹی کا تیل اور پیٹرول بڑے کام کی چیزیں ہیں ان سے کاریں۔ ہوائی جہاز [illegible] چلائے جاتے ہیں۔ اسٹو اور دلہنیں جلائی جاتی ہیں۔ بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں بس اتنا کہ اپنی عینک اتار کر گھٹنے پر کاغذ رکھ کر چند سطریں

بجھ دیں۔ ہر جلنے والی دُلہن پر پانی کی بالٹی تو ڈال نہیں سکتے۔ کوئی فائر بریگیڈ بھی دلہن کو بجھانے آج تک وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ لکڑی جل کر کوئلہ بجھنے کوئلہ بجھے راکھ ۔ یہ بات اس لیے ٹھیک ہے کہ لکڑی کے زبان نہیں ہوتی مگر لڑکی کیوں لکڑی کی طرح کوئلہ اور راکھ ہوجاتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے یہ جلنے کا راز ۔ پھر ذہن پیچھے کی طرف بھاگا اور لڑکی مُردہ شوہر کی چتا پر زندہ جلتی نظر آئی۔ اور لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ جیسے اب دیکھ رہے ہیں ۔ زمانہ بدل گیا ہے ۔ آج ساوتی بھی مر چکا ہے اس کی نعش جہیز کی لکڑیوں تلے دبی ہے اور تمنی دبی نعش کے سامنے کھڑی جل رہی ہے۔ لے میری سنتا وے۔ آگ میں جلو نہیں۔ آنچ سے کُندن بن کے نکلو۔ تم نہیں جانتیں عربی زبان میں ناری کا مطلب ہے آگ سے بنی ۔ جیسے فرشتے یا دیوتا جو ہوتے تو ہیں مگر نظر نہیں آتے ۔ انھیں کوئی نہیں مار سکتا۔ کوئی سماج ہو کبھی کسی کے کام نہیں آیا ہم نے سماج کی تاریخ پڑھی ہے تم کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ نہ قانون نہ سماج ۔ اپنے بچنے کا راستہ صرف تم کو نکالنا ہوگا۔ ورنہ جلاؤ لکڑیاں بن کر جلتی رہو گی ۔ تم جانو ۔ !
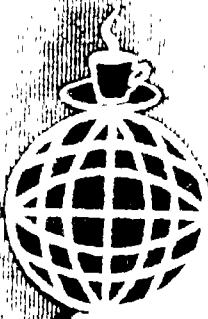
مشکور حسین یاد
(لاہور)

گونگی نظمیں

مشہور و ممتاز ادیب مشکور حسین یاد سے لاہور میں مختصر ملاقات رہی۔ بڑے خلوص سے ملے۔ میں نے ان کے سوانحی حالات میں پڑھا تھا کہ ۴۷ء کے ہنگاموں میں وہ لٹے لٹائے خاندان کے تمام افراد کی قربانی دے کر ہجرت کر گئے تھے۔ محفل میں بار بار ان کے چہرے پر نظر پڑتی رہی جس پر متانت و اعتماد کی گہری تہیں چڑھی ہوئی تھیں ___ ان کی تحریروں کی طرح ___ جن کی زیریں لہر محرومی، یاس، ناکامی، اور حزن و ملال سے عبارت ہے لیکن لہجہ میٹھا، تیکھا اور پُر لطف۔ مشکور حسین یاد کے بعض مضامین شگوفہ میں ڈائجسٹ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء کے درمیان میں اُنھوں نے چند طنزیہ نظمیں بھی لکھی تھیں جو اب "گونگی نظمیں" کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ مشکور حسین یاد نے ان نظموں کے توسط سے حکمران طبقہ، سیاست، اور معاشرہ کی خرابیوں پر اپنے مخصوص انداز میں ضرب لگائی ہے۔ گونگی نظمیں دراصل سماج کی منہ بولتی تصویریں ہیں___
ان تصویروں کا ایک منتخب البم قارئین شگوفہ کے ذوق کی تسکین کے لیے پیش ہے ___ مُدیر

اندھے بہرے گونگے

اپنی چاروں سمت ہیں پھیلے اندھے بہرے گونگے
اتنے کبھی دیکھے نہ سُنے تھے اندھے بہرے گونگے

لکھنے والا کتنے کرب سے یہ تاریخ لکھے گا
ہم ہر نازک وقت پہ ہو گئے اندھے بہرے گونگے

ہم سے بڑھ کر اندھا بہرہ گونگا کیا کوئی ہوگا
ہم نے سر آنکھوں پہ بٹھائے اندھے بہرے گونگے

جب بھی کسی محفل سے اُٹھے دل نے دھائیاں دیں
جمع ہوئے تھے جشن منانے اندھے بہرے گونگے

کیسے کیسے ہمت والے سینہ تان کے نکلے
پلک جھپکتے ہو گئے کیسے اندھے بہرے گونگے

اب تو نیک خیال بھی دل میں یوں وارد ہوتے ہیں
جیسے فلک سے اُتریں فرشتے اندھے بہرے گونگے

مظلوموں کی فریادیں یوں سر ٹکرائیں فضا میں
سارے ارض و سما ہوں جیسے اندھے بہرے گونگے

یادؔ یہ کن لوگوں سے تم نے باندھ لی ہیں اُمیدیں
کیا دیکھیں گے غیر کے سپنے اندھے بہرے گونگے

تعارف

ملو ان سے یہ اپنے ملک کے اہلِ سیاست ہیں
بڑے خوددار، غیرتمند، مردانِ جسارت ہیں
بڑے مخلص ہیں، یہ تصویرِ ایثار و مروّت ہیں
بڑا ہے خاندان ان کا، یہ سرتاپا شرافت ہیں
مگر یارو! نہ ان کی دُم اٹھا کر دیکھنا ہرگز

ملو ان سے یہ اپنے افسرانِ ملک و ملّت ہیں
ہر اک شعبہ کے ماہر ہیں ہر اک فن میں قیامت ہیں
بٹھا دو جس جگہ بھی باعثِ صد خیر و برکت ہیں
بڑا ہے رُعب ان کا صاحبانِ جاہ و حشمت ہیں
مگر یارو! نہ ان کی دُم اٹھا کر دیکھنا ہرگز

ملو ان سے یہ اپنے ملک کے اہلِ صحافت ہیں
تلاشِ حق میں رہتے ہیں صداقت ہی صداقت ہیں
کڑی تنقید کرتے ہیں، بڑے آزاد فطرت ہیں
ذرا لالچ نہیں ان میں کچھ ایسے پاک سیرت ہیں
مگر یارو! نہ ان کی دُم اٹھا کر دیکھنا ہرگز

ملو ان سے یہ دانشور ہیں اپنے شہرِ خوبی کے
خیالات ان کے مانگے کے تو بالکل بھی نہیں ہوتے
ذرا سا بھی نہیں ہے کھوٹ جن میں ہیں یہ وہ سکّے
اُرجنل لکھنے والے ہیں اُرجنل بولنے والے
مگر یارو! نہ ان کی دُم اُٹھا کر دیکھنا ہرگز

ملو ان سے یہ اپنے شہر کے ہیں اک بڑے قاضی
ہمیشہ اپنے اُوپر والے کو رکھتے ہیں یہ راضی
ضرورت آ پڑے تو خوب دکھلاتے ہیں فیاضی
ہے نازاں وقت اُن کے عدل پر کیا حال کیا ماضی
مگر یارو! نہ ان کی دُم اُٹھا کر دیکھنا ہرگز

اولادِ انگریز

میں اک پاکستانی افسر
اولادِ انگریز
انگریزی سے پیار ہے مجھ کو
اُردو سے ہے نفرت
اردو بھی ہے کوئی زباں
جس کو میرا معمولی سا منشی بھی لکھ لیتا ہے
اور نہ لکھنی آئے مجھے
یعنی سخت جلائے مجھے
انگریزی کے کیا کہنے
انگریزی تو میرے بچے
فر فر بولیں
فر فر لکھیں
میں بھی انگریزی میں اُٹھتا بیٹھتا ہوں
انگریزی میں چلتا ہوں
انگریزی میں ٹھہرتا ہوں
روتا بھی انگریزی میں ہوں سوتا بھی انگریزی میں
میرا ملنا جلنا بھی انگریزی ہے
لوگ مری اس بات سے بے حد نالاں ہیں
پھر کیا ہے؟
لوگوں کو میں کب خاطر میں لاتا ہوں
یہ تو کیڑے مکوڑے ہیں
جن کو روند کے چلنے ہی میں لذّت ہے
کوئی مجھے فرعون اگر کہتا ہے کہے
سوچو کیا فرعون کوئی انسان نہ تھا؟
شدّاد کوئی انسان نہ تھا؟
چنگیز کوئی انسان نہ تھا؟

اُسے جینے نہ دو

عزم لے کر جو اُبھرتا ہے اُسے جینے نہ دو
جو اُجالے عام کرتا ہے اسے جینے نہ دو

اس طرح تو سب حقیقت سامنے آجائے گی
جو بھی میداں میں اُترتا ہے اُسے جینے نہ دو

کوئی اچھی بات کرنا بھی تو ہے خطرے کی بات
جو بھی اچھی بات کرتا ہے اُسے جینے نہ دو

ہم ان اپنے مسخ چہروں کو کہاں لے جائینگے
جو کسی صورت سنورتا ہے اسے جینے نہ دو

ہم نکموں اور بے فکروں کو پھر پوچھے گا کون
جو ذرا بھی کام کرتا ہے اُسے جینے نہ دو

اک یہی صورت بچاؤ کی ہے جھوٹوں کے لیے
جو بھی حق کی بات کرتا ہے اُسے جینے نہ دو

ہم سے جو ڈرتا ہے تولا جائے سونے میں اُسے
جو خدا سے صرف ڈرتا ہے اُسے جینے نہ دو

یادؔ شاعر ہی سہی لیکن فضائے شعر میں
وہ تو حق کے رنگ بھرتا ہے اُسے جینے نہ دو

ہمیں کیا

ہر شخص پریشان ہے بسمل ہے ہمیں کیا
ہم تو ہیں سلامت کوئی گھائل ہے ہمیں کیا

من مانی فضاؤں میں ہیں اپنی تو اُڑانیں
اک سانس بھی لینا یہاں مشکل ہے ہمیں کیا

جیتا ہے جیئے کوئی اگر مرتا ہے مر جائے
ہر عیشِ جہاں ہم کو تو حاصل ہے، ہمیں کیا

ہم نے تو کبھی اپنے علاوہ نہیں سوچا
سینے میں ترے دل ہے کہ وہ سِل ہے ہمیں کیا

مدّت سے ہیں ہم صورتِ احوال سے خائف
کیا صورتِ احوال کی مشکل ہے، ہمیں کیا

ہم کرتے ہیں دولت کے لیے ساری تگ و دو
یہ معرکۂ حق ہے کہ باطل ہے، ہمیں کیا

جب چاہیں گے ہم اُڑ کے چلے جائیں گے اُس پار
خطرے میں اگر دامنِ ساحل ہے، ہمیں کیا

ہم یادؔ فقط اپنی حفاظت کے ہیں خواہاں
باقی کوئی مقتول ہے قاتل ہے ہمیں کیا

کرسیاں

ساری
اونچی اونچی
جگہوں پر
گدھ ۔ بیٹھے ہیں
بیٹھے سوچ رہے ہیں
کوئی لاش
نظر آجائے

اور
یہ اس پر لپکیں

ڈاکو

نیچے ڈاکو اوپر ڈاکو
ہو گئے ہم بھی دب کر ڈاکو

ہر جانب یہ دوڑ لگی ہے
دیکھیں کون ہے بہتر ڈاکو

اب کس بات کی فکر کریں ہم
اندر ڈاکو باہر ڈاکو

کس کس کو شاباش کہوگے
رہرو ڈاکو رہبر ڈاکو

اور کسے کہتے ہیں ترقی
کر لئے پیدا گھر گھر ڈاکو

بچوں کے ماں باپ لٹیرے
استادوں کا لشکر ڈاکو

اُلٹی سیدھی خبریں چھاپیں
اخباروں کے اندر ڈاکو

آپس میں نفرت پھیلائیں
گز بھر ڈاڑھی رکھ کر ڈاکو

ناک پلی اور بند بنائیں
ایسے ہیں کاریگر ڈاکو

اپنی کون سنے گا یارو
ہے دفتر کا دفتر ڈاکو

کمرے کے اندر مت جانا
بیٹھا ہے کرسی پر ڈاکو

سینہ تان کچہری آئیں
بھیس وکیلوں کی پھر ڈاکو

کون ہے؟ سب بیمار یہ بولے
"ڈاکٹروں سے اوپر ڈاکو"

دیکھو دکانوں میں بیٹھے ہیں
شہر کے اول نمبر ڈاکو

نیت کے آئینے گدلے
ہر خواہش کا پیکر ڈاکو
جیسی جیسی عمدہ محفل
ویسے ویسے بہتر ڈاکو

یادہ! کسے مانوگے مرشد
ایک سے ایک ہے بڑھ کر ڈاکو

اُلّو بنائیے

جی بھر کے محترم ہمیں اُلّو بنائیے
عادی ہیں اس کے ہم ہمیں اُلّو بنائیے

سر پر ہمارے وعدۂ زریں کا رکھیئے تاج
باعزت و حشم ہمیں اُلّو بنائیے

مغرب میں یہ پرندہ علامت ہے عقل کی
دانش میں ہم ہیں کم، ہمیں اُلّو بنائیے

اُلّو بھی جانور ہے اِدھر ہم بھی جانور
مل بیٹھیں گے بہم ہمیں اُلّو بنائیے

منزل ہمارے ذہن سے ہو جائے تا کہ محو
ہر گام ہر قدم ہمیں اُلّو بنائیے

فرصت ملے ہمیں نہ ذرا غور و فکر کی
اس طرح دم بدم ہمیں اُلّو بنائیے

ہم اپنے اُلّو ہونے پہ کرنے لگیں غرور
اتنا تو کم سے کم ہمیں اُلّو بنائیے

سب سے بڑی یہی تو کمی ہم میں رہ گئی
اُلّو نہیں ہیں ہم، ہمیں اُلّو بنائیے

تاریخ میں ہے ... حسین اُلّوؤں کا باب
[illegible]

اُلّو بنا بنا کے ذرا تھک گئے ہیں آپ
اب ہو کے تازہ دم ہمیں اُلّو بنائیے

"رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ"
حاضر ہیں یاد ہم، ہمیں اُلّو بنائیے

بغیر سوچے بغیر سمجھے

ہم اپنی قسمت بدل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے
ہمارے سب کام چل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

ہم آج کے دل کی لوحِ زریں پہ کونسا حرف لکھ سکیں گے
ہم اپنے گھر سے نکل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

ہمارے جذبات کا یہ آتش فشاں ہمیں ہی جلا رہا ہے
ہم اپنے اندر اُبل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

بجا کہ ہم اعتراف کرتے ہیں بار بار اپنی غفلتوں کا
مگر یہ ہم خون اُگل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

مسرتوں کا تو ذکر ہی کیا ہمارے غم بھی نہیں سلامت
ہم آگ میں اپنی جل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

اسے بناؤ اسے سنوارو اسے سجاؤ اسے نکھارو
یہ تیر نکلے ہیں چل رہے ہیں بغیر سوچے بغیر سمجھے

بہت سا مال آپ نے اکٹھا تو کر لیا یاد یہ بھی رکھنا
[illegible]

اقبال کا سال

اقبال کا سال کیا منایا؟
ہر دم یہ سوال دل میں آیا !

اقبال کا خواب کس نے دیکھا
اقبال کا زخم کس نے کھایا؟

اقبال کے نشۂ خودی میں
کون اپنے لہو میں ہے نہایا؟

اقبال کی روشنی میں چل کر
اقبال کا درد کس نے پایا؟

کیا تیرے بھی دل کی ہر شفق میں
اقبال کا خون جگمگایا؟

اقبال کے غم کی سرزمیں میں
پودا کوئی تو نے بھی لگایا؟

کیا تیری بھی کوئی آرزو ہے
کیا تو نے چراغِ دل جلایا؟

تو نے بھی دکھائی کوئی غیرت
تجھ کو بھی کوئی حجاب آیا؟

گر اس میں سے کچھ نہ کر سکا تو
اقبال کا سال کیا منایا؟

یہ بھی غداری ہے

سامنے ظلم کو ہوتا دیکھیں یہ بھی غداری ہے
حرفِ شکایت لب پہ نہ لائیں یہ بھی غداری ہے

ڈھوروں کے مانند جھکائے سر کو چلتے جائیں
فردا نہ سوچیں، فردا نہ سمجھیں یہ بھی غداری ہے

لمحہ لمحہ ہیرا موتی لمحہ لمحہ سونا
کام کے وقت نکمّے بیٹھیں یہ بھی غداری ہے

اپنے حال میں خوش رہنے کے جرم سے خدا بچائے
آپس کے دکھ درد نہ بانٹیں یہ بھی غداری ہے

خاکِ وطن کا ذرّہ ذرّہ پیاس کے مارے تڑپے
خونِ جگر کو سینت کے رکھیں یہ بھی غداری ہے

چڑھتے ہوئے سورج کی مالا جپنا بحث الگ ہے
اس کو دیکھ کے لرزیں کانپیں یہ بھی غداری ہے

کلیم اللہ
(حیدرآباد)

بس کے آگے بے بس

بس چاہے دہلی کی ہو یا کلکتہ کی بس کا اولین فرض دھواں مہیا کرنا ہے تاکہ شہری بابو سانس لے سکے۔ حیدرآباد دکن کے سیکل رکشاؤں کی طرح کراچی کی بسوں پر بھی شعراء کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے ورنہ اکثر شہروں کی بسوں پر اشتہارات ہی ہوتے ہیں۔ کراچی کی بسوں پر پولس جوانوں کے تعلق سے مندرجہ ذیل جملہ درج کیا جاتا ہے۔

"پپو یار تنگ نہ کر"

دھواں مہیا کرنے کے علاوہ بس کا دوسرا کام شہریوں کو شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لاد کر لیجانا ہے جس جگہ کبھی کبھار غلطی سے بس ٹھہر جاتی ہے اُسے بس اسٹاپ کہتے ہیں۔ ان بس اسٹاپس پر صبح شام اجتماع منعقد کیئے جاتے ہیں جس میں عوام کو صبر و استقلال کی ٹریننگ دی جاتی ہے اس اجتماع کو بس کی قطار بھی کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان قطاروں میں بس کے انتظار کے دوران مذہبی، سیاسی، ادبی و بے ادبی" شائستہ غیر شائستہ، فلمی غیر فلمی اور عشق و عاشقی پر مباحثے ایک معمول ہے لیکن جو نہی بس آتی دکھائی دے تو محفل مباحثہ، میدان حشر کا سماں پیش کرتی ہے بس آتے ہی ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ پہلے بس میں داخل ہو جائے کیوں کہ کل کس نے دیکھا ہے اس جستجو میں بہت سارے لوگ بس کے باب الداخلہ میں پھنس جاتے ہیں۔ اِن میں جو بھی طاقتور ہوگا وہ سب کو ڈھکیل کر اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اندر آنے کے بعد "میوزیکل چیرز" شروع ہوتی ہے۔ ایک خالی نشست کے لیے پانچ چھ آدمی لپکتے ہیں۔

بس کے اندر جتنے مسافر ہوتے ہیں اتنے ہی فٹ بورڈ پر بھی۔ یہ فٹ بورڈ کے یاتری سب کے سب ماہر کرتب باز ہوتے ہیں اِن کی اکثریت پاؤں کی ایک اُنگلی پر یا آدھی پر ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کا کام سفر کے دوران کمالات دکھا کر معزز خواتین کو متاثر کرنا ہوتا ہے اس کے علاوہ بس میں داخل ہونے یا اترنے والی خواتین کو ٹکر مار کر یہ لوگ گوناگوں مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ان عاشق مزاجوں کی وجہ سے جیب کتروں کی چاندی ہی چاندی ہے۔

صاحبو! انسان مختلف ادوار میں مختلف شخصیتوں کا انتظار کرتا چلا آرہا ہے کبھی محبوب کا، کبھی دوست کا، کبھی محسن کا، کبھی ممدوح کا، کبھی ملازم کا، کبھی قاضی کا، کبھی بیوی کا، کبھی ڈاکٹر کا، کبھی اولاد کا لیکن سب

مشغلہ ہوتا ہے انتظار بس کا ہوتا ہے یہ انتظار کھڑے رہ کر کرنا پڑتا ہے۔ شہری بابو کی زندگی بس اسٹاپ سے شروع ہوکر بس اسٹاپ پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بس کسی معجزہ سے بڑھ کر ہوتی ہے اس تڑپ کے دوران اتفاق سے بس آتی نظر آجائے تو عاشقوں کی طرح دوڑنا پڑتا ہے۔ بعض مرتبہ المنتظرین دفتر جانے والی بس کا انتظار پر ملال کرتے کرتے تھک کر بس اسٹاپ پر ہی لعنت بھیج کر مخالف سمت پر واقع بس اسٹاپ پر واپسی کی بس کی قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں تاکہ کم ازکم گھر میں تو غیر حاضری نہ ہونے پائے۔

ہمارے خیال میں بس ایک سواری ہی نہیں بلکہ چلتا پھرتا ہمہ مقصدی ادارہ ہے جس میں داخلہ انٹرنس ٹسٹ کے ذریعہ ہوتا ہے یہ انٹرنس ٹسٹ دنگا مشتی کی شکل میں ہوتا ہے جو مقابل کو پچھاڑ کر اندر داخل ہو جائے وہی خوش نصیب کہلائے۔ بس میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے جھٹکوں کے ذریعہ ثابت قدم رہنے کی مشق کروائی جاتی ہے اس کے بعد بس کے اندر جھٹکے جوابی جھٹکے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان سے بچاؤ کا طریقہ مسافروں کو خود سیکھنا پڑتا ہے۔ پیٹ درد، سر درد، کمر درد، قبض، بدہضمی، اعضا شکنی وغیرہ کا آسان اور قدرتی طریقے سے بس کے سفر کے دوران علاج ہوتا ہے یعنی بس نہ ہوئی بلکہ نیچر کیور ہسپتال ہو گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کسی معاشی بحران کے شکار شخص کو صبح کے اوقات بس میں سوار کروا دیجئے اس کی ذہنی کشمکش جسمانی کشمکش میں تبدیل ہو جائیگی کیوں کہ بس کے اندر داخل ہونے کے بعد دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے اور ہاتھ پاؤں فوراً حرکت میں آجاتے ہیں۔ بس کے اندر ایک الگ دنیا ہوتی ہے جہاں انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر بس کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اسے باہر دیکھنے یا سوچنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھنے والے چند ہی خوش قسمت ہوتے ہیں جو اندر باہر دونوں پر نظر رکھتے ہیں ورنہ اندر پھنسے ہوؤں کو بس کے سفر کے دوران نہ یاد ماضی ستاتا ہے نہ ہی مستقبل کی فکر۔ انھیں تو اپنے حال کا بے حال ہوتا ہوا وجود بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہر دھکے پر وہ ایک نئی دنیا میں چلا جاتا ہے کبھی کسی کی آغوش میں تو کبھی کسی کے قدموں میں۔ واپس اپنی حالت پر آتے ہی دوسرا دھکا پھر وہ سنبھلنے کا ارادہ ترک کرکے بادبانی کشتی کی مانند اپنے آپ کو بلدیہ کی سڑک اور ڈرائیور کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

ایک دفعہ اسکوٹر کی خرابی نے ہم کو کئی سال بعد بس کے سفر کے خطرناک تجربہ سے دوچار کیا بس اسٹاپ پر وارد ہوتے ہی ہم نے آداب بس اسٹاپ دو ہی منٹ میں دوبارہ سیکھ لیے۔ سب مضطرب ہوتے تو ہم بھی مضطرب ہوتے، سب بار بار اپنی دستی گھڑی چھوڑ کر مقابل کی ہوٹل کی دیواری گھڑی پر نظر ڈالتے تو ہم بھی ان کی تقلید کرتے حالانکہ بس اور گھڑی دونوں ہی slow ہو جاتے ہیں۔ لوگ اگر بس کا انتظار کرنے کے بجائے اپنی منزل کی طرف چل پڑیں تو شاید منزل کو جلدی پہنچ جائیں لیکن عادت سے مجبور ہیں۔ ہم سب کے ساتھ ہر بس کا تعاقب کرتے پھر ناکام و نامراد واپس آکر ایک نئی قطار کو جنم دیتے ہیں یہ عمل کئی بار دہرانے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ

گنہگاروں میں شامل ہوں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتا ہوں پر خدا جانے خطا کیا ہے

صاحبو! اس لیے ہم نے تہیہ کر لیا کہ جو بھی بس سب سے پہلے بس اسٹاپ پر آکر رکے گی (چاہے وہ کدھر بھی جائے) ہم اس میں سوار ہو جائیں گے۔ حسن اتفاق کہ ایک بہت ہی بوسیدہ سی بس (جس کا ہر پرزہ بج رہا تھا سوائے ہارن کے) آکر رکی۔ ہم قریب ہی کھڑے تھے کوشش کرکے دروازے تک پہنچے اس کے بعد لوگ اندر داخل ہوتے

ہوتے ریلے میں ہم کو بھی گھسیٹ لائے شرٹ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا بٹن غائب۔ ہم مجنوں (بے صحرا) دکھائی دے رہے تھے۔ اندر آنے کو تو آ گئے لیکن بس میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی بڑی مشکل سے ایک ٹانگ رکھنے کی جگہ دستیاب ہوئی۔ دوسری ٹانگ ہوا میں معلق۔ بس میں پسینہ کی بدبو سے متلی شروع ہو گئی۔ پاس والا سانس چھوڑتا تو ہم سانس لیتے تھے۔ عجیب سا عالم تھا۔ قبر کی سی کیفیت تھی اسی اثنا منکر کی آواز آئی "بول تجھے کدھر جانا ہے؟" ہم نے عرض کی "اس دوزخ سے ہمیں جنت میں ڈال دو" وہی آواز "ایک روپیہ نکالو" ہمیں گھٹن سی محسوس ہونے لگی شاید پاس والے کو احساس ہو گیا ہے کہ اُس کی خارج کی ہوئی سانس پر ہماری زندگی کا انحصار ہے اِس لیے اُس نے اپنا رُخ موڑ لیا۔ حلق خشک دَم گھٹنے لگا۔ آواز نکلنی دشوار ہو گئی اور ہم پر وحشت طاری ہونے لگی۔ ہم چلّا اُٹھے "بس روکو ہمارا دَم گھٹ رہا ہے ہمیں باہر نکلنے دو۔ ہم وعدہ کرتے ہیں ایسا گناہ ہم سے دوبارہ سرزد نہیں ہو گا یہ ہمارا آخری گناہ ہے"۔ دوزخ کے داروغہ کی آواز "ناممکن۔ دنیا میں واپس جانا ناممکن یہاں ون وے ٹرافک ہے یہاں "NO EXIT" ہے نکالو ایک روپیہ ورنہ بس کو پولس اسٹیشن لے جانا پڑے گا" مختلف آوازیں "ایک عذاب بس ہی کیا کم ہے۔ ارے بندہ خدا ایک روپیہ دے کر قصہ ختم کر" ہم نے رازدارانہ لہجہ میں التجا کی "داروغہ جی ہم آپ کو دس روپے دیں گے آپ ہمیں گردن میں ہاتھ دے کر زمین پر ڈھکیل دیں" وہی آواز "ڈیوٹی پر رشوت حرام ہے۔ رینر گاڑی مجبوراً ہڑپ کرنی پڑتی ہے چل جلدی سے ایک روپیہ نکال" مرتا کیا نہیں کرتا ہم نے جونہی جیب سے پیسے نکالنے کے لیے ڈنڈے سے گرفت چھوڑی تو کسی مشاق خلا باز کی مانند خلا بازی کھاتے ہوئے دو چار آدمیوں کو پچھاڑتے ہوئے اپنی دوسری ٹانگ رکھنے کی جگہ فراہم کر لی اور بڑی مشکل سے بٹوہ نکال کر ایک روپیہ داروغہ کو دے کر ٹکٹ حاصل کیا اور بٹوہ واپس جیب میں ٹھونس لیا۔ اُسی لمحہ ایک نازنین نے ہم کو ہنٹر رسید کرتے ہوئے وارننگ دی "اے مسٹر اپنے دونوں پاؤں اُوپر اُٹھاؤ میری ساڑی تمہارے پاؤں کے نیچے ہے" ہم نے عرض کی "محترمہ اگر دونوں پاؤں اُٹھا لیں گے تو ہم گر پڑیں گے" نازنین کے حسن کے چوکیدار نے رعب دار آواز میں دھمکی دی "اپنے پاؤں اُٹھاتا ہے یا چھوڑوں ایک ہاتھ" برق رفتاری سے ہم نے دونوں پاؤں اُوپر اُٹھا لیے اور بس کے ڈنڈے سے لٹک گئے۔ ہر جھٹکے پر جھولے کی مانند جھولتے ہم کو دیکھ کر لوگوں کو بندر کا گمان ہو رہا تھا۔ مرد و خواتین قہقہہ لگاتے۔ اُسی لمحہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور ہم دھڑام سے اُن محترمہ کے پاس نازک پر ٹپک پڑے اُسی اثناء "ٹپ ٹپ" کسی بابو صاحب کے توشہ دان سے دال ٹپکنے لگی۔ دال میں نمک اور مرچ زیادہ تھی۔ دال چکھنے کے بعد ہم اٹھ کھڑے ہوئے شاید اسٹیج آ گیا تھا۔ وہی آواز "نامپلی اسٹیشن" دس پندرہ مسافر اُترے اور اُس سے بھی زیادہ بس میں داخل ہونے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔ ہم نے بھی باہر نکلنے کی کوشش شروع کی کافی جستجو کی لیکن بے سود۔ ایک صاحب دس بچے اور بیوی کے ساتھ بس میں داخل ہو گئے۔ بچوں کے شور سے کان پڑی آواز نہ تھی اسکول کا سا سماں تھا۔ آخر کار دس بچوں کو دس مسافروں نے گود لے لیا تب ذرا سکون میسر ہوا۔ نبض ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ ہم نے غیر ارادی طور پر ایک فربہ خاتون (جو ہمارے سامنے آ کر کھڑی تھیں) کا ہاتھ تھام لیا جو کہ لیڈیز سیٹ پر قابض نوجوان سے محو بحث تھیں ایک سیکل سوار بس کے سامنے آتے ہی زوردار جھٹکا لگا اور ہم دوڑ کر سیٹ ایک مولوی صاحب کو قدم بوسی کرنے لگے۔ مولوی صاحب ابھی دُعا کے لیے منہ کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن محترمہ نے چیخ ماری "ہائے میرا دوپٹہ" اُن کا دوپٹہ سر اوڑھے ہوئے تھے محترمہ نے

دو تین مسافروں کو ڈھکیلتے ہوئے پھرتی اور چابکدستی سے جھک کر اپنا دوپٹہ اٹھایا تو دوپٹہ کے ساتھ ہم کو بھی اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ دوپٹہ اوڑھ ایک دو کو چت کرتی ہوئی باہر نکل گئیں ہم مبہوت سے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ وہی آواز "نیلم پری نعل کھانا" "نیلوفر دواخانہ" جانے کے لیے ایک خاتون اپنے بچے کو گود میں اٹھائے اترنے لگی اسی وقت دوسری عورت اپنے بچے کو سینے سے چپٹائے بس میں چڑھنے لگی۔ چڑھنے اور اترنے میں نہ معلوم کس بات پر دونوں گتھم گتھا ہوگئیں اور نیچے اتر کر بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر باقاعدہ اعلانِ جنگ کر دیا۔ زنانی کشتیاں تو اولمپک کھیلوں میں شامل نہیں ہوتیں لہٰذا ایسے نادر موقع کو کون ہاتھ سے جانے دیتا۔ بے کاروں کی بھیڑ اُن دونوں فری اسٹائل ریسلرز کے اطراف جمع ہوگئی۔ کنڈکٹر منہ میں سیٹی لیے صلح صفائی کروانے کی خاطر بیچ میں کود پڑا خاتون پہلوانوں نے اُسے ریفری سمجھ کر ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا۔ کیا روانی، برجستگی اور حاضر جوابی کہ مرد بھی دانت میں اُنگلی رکھ لیں۔ گیسو بکھر گئے زلفیں اُلجھ گئیں اور دونوں کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ جنگ بندی کی ساری کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ دونوں کو اقوامِ متحدہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اسی لمحہ ایک پولس کانسٹبل کی سیٹی پر طوفان یک دم تھم گیا بادل چھٹ گئے۔ سب دوڑ کر بس میں واپس سوار ہوگئے۔ ایک خاتون نے اپنے بچہ کو گود میں اُٹھایا اور اپنی راہ لی دوسری نے بچہ کو سینے سے چمٹایا اور بس میں داخل ہوگئی بس جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ اس خاتون کا بچہ مسلسل رو رہا تھا اور وہ اول فول بکے جا رہی تھی یکایک وہ عورت دھاڑیں مار کر رونے لگی "میرا بچہ" سب نے اس کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا "کیا ہوا تمہارے بچے کو" جواب ملا "میرا بچہ اُس عورت کے بچہ سے تبدیل ہوگیا" کسی نے پھرتی سے ناڑا کھینچا گھنٹی بجی اور بس رُک گئی۔ اُس خاتون کو بس سے اُتارا گیا لوگ پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔ اسی بہانے ہم کو بھی بس سے باہر نکلنے کا نادر موقع ہاتھ آگیا۔ معلوم نہیں اس عورت کو اس کا بچہ ملا یا نہیں لیکن اس بس کے سفر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی انسان بس کے آگے کتنا بے بس ہے۔!

رؤف خوشتر
(بیدر)

امرود کی جدائی

بوم الدولہ دیوانِ عام سے ہوتے ہوئے دیوانِ طعام میں عین اس وقت داخل ہوئے جب ہم نوالہ نذرِ دہن کر رہے تھے انھوں نے اُچک کر نوالہ ہمارے ہاتھ سے لے کر اپنے منہ میں ٹھونس لیا۔ جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ وہ یار اور اغیار کے نوالے اور سمینار کے مقالے اُڑانے میں دیر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں صحت مند اور میرا ادب صحت مند ہے پھر جیسا کہ دنیا بھر کے مزدوروں کا مہینہ کی پہلی تاریخ کو ایک ہی نعرہ ہوتا ہے "ہماری مانگیں پوری کرو" تو بوم الدولہ کا ہمارے یہاں مہینہ کے دوسرے سنیچر کو یہ نعرہ ہوتا ہے "ہماری ٹانگیں پوری کرو" کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہر ماہ پہلے ہفتہ میں مرغ ہمارے یہاں بانگ دیتا ہے اور دوسرے سنیچر کو ٹانگ دیتا ہے۔ سو بوم الدولہ بڑی پابندی سے دوسرے سنیچر کو حاضر ہوتے ہیں اور ٹانگوں کی دُہائی دیتے ہیں پتہ نہیں ہمارے باورچی کو انھوں نے کونسے دانے کھلاتے ہیں کہ ان کی آواز پر جھٹ مرغ سے بھری پلیٹ لاتا ہے اور ہمارے لیے شوربہ سے لبالب پلیٹ، باورچی کی اِس بوم الدولہ کے تئیں مرغ نوازی پر ہمیں غصہ آیا اور ہم نے سوچا کہ مرغ نہ سہی مرغ کی ٹانگ سہی اور جب چھیننا چاہا تو انھوں نے بڑی آسانی سے مرغ کی ٹانگ گھسیٹ کر اپنے پاس رکھ لی۔ اچھے اچھوں کی ٹانگ گھسیٹنے والے کو مرغ کی ٹانگ گھسیٹنے میں کونسی دقت ہو سکتی ہے ہم نے خون کے گھونٹ کے ساتھ دال کے گھونٹ پیتے ہوئے باورچی سے کہا ؎

وقت آنے پر تجھے بتائیں گے اے خانساماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اُدھر بوم الدولہ بڑے مزے سے مرغ پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اور بیچ بیچ میں گنگنا بھی رہے تھے ہماری ناراضگی اور برہمی کو سمجھتے ہوئے ایک ٹکڑا ہماری طرف پھینکتے ہوئے بولے "اماں! اِس بیچارے باورچی پر کیوں خفا ہو رہے ہو یہ تو پھر بھی غیر ہی ٹھہرا۔ میری اس بیگم کا قصہ سنو جو خیر سے نرس ہے یعنی میری شریکِ حیات ہے ایک دن بڑے پیار سے ہوٹل میں لے گئی اور شاندار آرڈر دے ڈالا جب بل دینے کا وقت آگیا تو مجھے یوں بہلانے لگی ؎

میں بھی ہوں تیری پیا بل بھی ہے تیرا
کیا بھی جا کر سے [illegible] میرا کر لے پھر کسے

وہ تو اچھا ہوا کہ میرے پاس کچھ روپے تھے یوں ہوئی اور بلا ٹل گئی۔ خیر یہ تو بتلاؤ کہ ۱۹۸۸ء کا سب سے
اہم ترین واقعہ کون سا ہے۔

ہم: صدر ریگن اور گورباچوف کی تاریخ ساز ملاقات اور کیا!

بوم الدولہ: میاں تم بھی آ گئے اخبارات، ریڈیو، اور ٹی وی کے جال میں۔ برخوردار خود کو عام بھیڑ بھاڑ سے الگ کرلو تھوڑے
عقل کے ناخن بھی بڑھا لو، ارے اس سال کا سب سے اہم ترین واقعہ ہماری اور بیگم کی ملاقات کا ہے۔

ہم: اچھا ایسا بھی ہوتا ہے مجھے تو یہ آدھا سچ اور آدھا جھوٹ لگ رہا ہے کہیں عجائب گھر کی اُڑان بھر کر
تو نہیں آ رہے ہو۔ معاف کرنا میں تو ٹی وی سیریل کی سی بات کر رہا ہوں کیا کروں ہمارے اعصاب پر
ٹی وی ہے سوار۔

بوم الدولہ: آج اگر گرودت ہوتے تو مسٹر اینڈ مسز ۵۵ کی طرح مسٹر اینڈ مسز ۸۸ فلم بناتے جس میں ہم ہیرو ہوتے
اور ہماری بیگم ہیروئن۔

ہم: اچھا یہ تو بتلاؤ کہ اب کونسی بیگم کے ساتھ ملاپ ہوا ہے کیوں کہ اُدھر امریکہ میں ایلزبتھ ٹیلر اپنا شوہر
بدل رہی ہے اور اِدھر تم بیویاں بدل رہے ہو۔ سُنا ہے کہ ایلزبتھ ٹیلر کو اب ساتویں شوہر کی تلاش
ہے اور یہ بھی سُنا ہے کہ اس کا دل اب یوروپی گیمس سے اُکتا گیا ہے اور اب وہ ایشین گیمس میں
تن من دھن سے دلچسپی لینا چاہتی ہے اب تمہارے پاس بیگموں کا کتنا اسکور ہے۔

بوم الدولہ: ہم ایشیائی کیا کسی سے کم ہیں ۱۹۸۸ء جاتے جاتے چھٹی بیگم دے جارہا ہے اللہ نے چاہا تو ساتویں بیگم
کوئی ایلزبتھ ہی ہوگی۔ میں بین الاقوامی شادیوں، عالمی خوش دامنوں اور بین براعظمی سالیوں
میں یقین رکھتا ہوں میں شادی سے ثابت کردوں گا کہ مشرق اور مغرب جوہری اعتبار سے نہ سہی
ازدواجی طور پر تو مل سکتے ہیں بیگموں کو میں پیار سے دنوں کے ناموں سے یاد کرتا ہوں پیر سے سنیچر
تک تمام دن بیگموں کے لیے الاٹ ہو چکے ہیں اب صرف اتوار کا دن رہ جاتا ہے سو وہ کسی ایلزبتھ
کے لیے مختص ہے۔

ہم: آپ کو تو موسم سرما کی رخصتی سولہ، سولہ آنسو (جس میں دو آنسو آپ کے بعد بقیہ مگر مچھوں یعنی بیگموں
کے ہوتے ہیں) اس لیے رُلاتی ہے کہ یہ موسم اپنے ساتھ پُر شباب سردی لحاف آتش دان، پھل امرود
لیے جاتا ہے کیا یہی سبب ہے کہ آپ موسم سرما کو بادیدۂ نم رخصت کرتے ہیں۔

بوم الدولہ: سچ کہتے ہو میاں بیگموں کے بعد موسموں سے مجھے عشق ہے سوچتا ہوں کہ ہم سب کے باوا آدم کتنے مزے
میں تھے کہ انھوں نے عمر طویل کو سالوں کے حصار میں مقید نہیں کیا تھا انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ
سال کو کس کے نام سے موسوم کریں، کس صدی میں کون سی نام نہاد تحریک چلائیں، انھیں نہ صبح تلی کی فکر
تھی اور نہ دودھ کی، نہ اخبار کی خواہش نہ ٹی وی پروگراموں کا انتظار۔ لے دے کر ایک عدد بیوی تھی
بس گویا ایک ہی چینل پر سارے پروگرام ہوتے تھے۔ خیر ہماری علم و آگہی ہمیں پریشان کر رہی ہے اور ان
کی لاعلمی بے فکری سے عبارت تھی۔

ہم: جی ہاں! ان کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا اب تو ہم سب کلینڈر زدہ ہو کر رہ گئے ہیں کلینڈر کے بغیر ہمارا

کوئی کام ٹھیک دن اور وقت پر نہیں ہوتا صبح سے لے کر شام تک ہر کام اور ہر کام کے لیے ہم کلینڈر کے محتاج ہیں گویا کلینڈر کے پھٹر پھڑاتے کاغذوں سے ہم اپنی زندگی کی قبا میں دنوں، ہفتوں، اور مہینوں کے پیوند لگاتے رہتے ہیں۔

بوم الدولہ امیر لوگ تو بڑی بڑی کمپنیوں، فرموں اور دکانوں سے خوش نما دیدہ زیب کلینڈر ہر سال لاتے ہیں جو ان کے خاموش اور بڑے بڑے کمروں میں یہ مالکوں کی طرح ہر دم منہ لٹکائے ہوئے رہتے ہیں غریب لوگ چوں کہ ایسے بڑھیا کلینڈر حاصل نہیں کر سکتے، اس لیے وہ کائینات کی سب سے بڑی کمپنی، یعنی قدرت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اُسی سے ہر سال ایک کلینڈر تحفہ میں لیتے ہیں" اب یہ اور بات ہے کہ یہ کلینڈر کبھی کالا ہوتا ہے کبھی گورا، کبھی چپٹا ہوتا ہے اور کبھی ناٹا، غریب لوگ بڑی شان سے کہتے ہیں کہ یہ فلاں سال کا کلینڈر ہے۔

بوم الدولہ نے عیسائی دوستوں کے سامنے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ۵۰ سال قبل مسیح بتلائی تھی اور عیسائی دوست ان کے اس انکشاف پر خوش ہوتے تھے۔ وہ تو اپنی ٹوپی کو بھی قبل مسیح کی بتاتے ہیں جو سر بسران تک پہنچی ہے اور جس کو سونگھنے پر انسان تو انسان حیوان بھی غش کھا جاتے ہیں، ایک ٹوپی ہی کیا بوم الدولہ کی ہر چیز قبل مسیح کی معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ خود بھی قبل مسیح یعنی باقیاتِ طوفانِ نوح لگتے ہیں۔

وہ ہر مذہب کا تہوار حلق تک مناتے ہیں اس لیے کہ وہ پیٹ سے ہی سوچتے ہیں دسمبر کے آغاز سے ہی وہ عیسائی دوستوں سے تجدیدِ ملاقات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پُرانی ہیٹ، پُرانی ٹائی اور پُرانا کوٹ پہن کر سگار منہ میں ٹائم اور لائف کے پُرانے میگزین ہاتھوں میں دبائے عیسائی بستیوں کی طرف چل پڑتے ہیں اور دھوم دھام سے کرسمس اور نئے سال کا جشن مناتے ہیں۔

حالانکہ ڈسمبر کی رخصتی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس جشن سے ذرا پہلے ہمارے پاس آکر روتے بسورتے ہوئے ہاتھوں میں موسمِ سرما کا آخری جام (امرود) لیے ایسے گاتے رہتے ہیں جیسے ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں سحری کو جگانے کے لیے مختلف گیت اپنے انداز میں گائے جاتے ہیں بالکل اُسی طرح بوم الدولہ اپنا راگ الاپتے ہیں۔

"الوداع، الوداع اے ماہِ سرما الوداع"

۸۵

غزلیں

محبوب ہاشمی (ناسپور)

دیں گے سزا وہ مجھ کو کڑی دو گھڑی کے بعد
اور ہوگی میری کھاٹ کھڑی دو گھڑی کے بعد

بے ہوش ہو گئی ہیں جو بیگم تو غم نہیں
ہوجائیں گی وہ اٹھ کے کھڑی دو گھڑی کے بعد

بنوا کے لایا تھا میں گھڑی ساز سے مگر
پھر بند ہو گئی ہے گھڑی دو گھڑی کے بعد

چھوٹی سے میں نپٹ ہی رہا تھا کہ سامنے
لڑنے کو آ گئی ہے بڑی دو گھڑی کے بعد

وہ خوش رہے جو بیٹھے تھے رکھ کر گھڑی کو پاس
میں ہوں کہ پی رہا ہوں گھڑی دو گھڑی کے بعد

گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح میں بھی پس نہ جاؤں
پڑ جائے نہ مجھے بھی تڑی دو گھڑی کے بعد

پہلے تو دب گئی تھی پڑوسن کے خوف سے
بڑھ کی بھی جم کے خوب لڑی دو گھڑی کے بعد

میخانہ میں تہے نال ہماری گزر ہی ہوتی
میخانہ کیوں نہ جائیں گھڑی دو گھڑی کے بعد

برسیں گی مجھ پہ جم کے وہ پہلے پھر آنکھوں سے
برسے گی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

دیدار رُوئے یار کی محبوب یہ گھڑی
اے کاش! آئے روز گھڑی دو گھڑی کے بعد

قمر الزماں قمر (رانچی)

مدعا ہم اپنے لب تک لاتے لاتے رہ گئے
گھر سے بس اسٹینڈ تک ہم آتے جاتے رہ گئے

کب ہمیں فرصت ملی کہ آئینہ ہم دیکھتے
عمر بھر اوروں کو آئینہ دکھاتے رہ گئے

تالیاں کیسے بجیں ملتے نہیں جب دونوں ہاتھ
وہ ادھر اور ہم ادھر الفت جتاتے رہ گئے

خاک دھوں ہوتی گئی اپنی تمنائے جنوں
درمیاں لوگوں کے ہم غزلیں سناتے رہ گئے

لوگ سب گنگا نہا کر دھو لئے اپنے گناہ
ہم کہ اپنے دل میں پیچ و تاب کھاتے رہ گئے

بھوکے بچے حسرتوں سے روٹیاں دیکھا کیے
لوگ آنکھیں بند کر کے منہ چلاتے رہ گئے

پوچھئے مت دل کی حالت آج کل کیا ہے قمر
انتظار شوق میں آنکھیں بچھاتے رہ گئے

حضرت غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ

آج تک میرا کہاں دوستو ارمان نکلا
جو بھی نکلا وہ نہایت ہی پشیماں نکلا

بتکدہ میں یہ سمجھتا تھا اکیلا ہے وہ
اس نے جس شخص سے پوچھا وہ مسلماں نکلا

پکڑے جاتے ہیں محبت کے تئیں پہ عاشق
ایک بھی اُن کی وکالت کو نہ انساں نکلا

جیب و دامن نہ سلامت تھے نہ چہرہ ہی درست
لیلیٰ کے گھر سے ہر اک شخص پریشاں نکلا

کچھ اثر ہی نہیں لاحول کے پڑھنے سے قمر
کس قدر ٹیکنیکل اس دور کا شیطاں نکلا

مظہر الزماں خان
— حیدرآباد —

تبصرہ نگار اور تبصرہ نگاری

(آج کے تبصرہ نگاروں کی نذر)

ط. کاف. کا نیا شعری مجموعہ "پیاسے ہرن اور سفید گھاس" زندگی کے پرانے اُفق پر سنہری یادوں کا ایک ایسا ذائقہ ہے جس میں فنکار نے احساس کے سر پر موم بتی رکھ کر برگد کی بلند شاخ کو دیکھنے کی جسارت کی ہے. اور لمس کے صحرا میں لبوں کے خشک جنگل کو سیراب کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی ہے. قیمت ۱۲ روپے
ملنے کا پتہ: حکیم نادیدہ اسٹریٹ، کلکتہ.

— س. م. کا افسانوی مجموعہ "دھوپ کی چاندنی" اُن کے احساس کے جل ترنگ کی بجھتی ہوئی خوشبو ہے جو سائے میں رہتے ہوئے سلطنت سے دور ہے اور اپنے افسانوں میں اس لطیف لمحہ کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بار بار پھسل گئے ہیں لیکن پھسلنے کے باوجود لمحہ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے.

— حمام صابن کے جھاگ میں بلبلوں کی طرح ان گنت جسموں کے رنگ جھلکتے ہیں. جنھیں دیکھ کر جلد مسکرانے لگتی ہے. آج ہی خریدیئے حمام صابن خوابوں کو دھو دھو کر چکنا کر دے گا. ملک کا ہر لیڈر حمام صابن ہی استعمال کرتا ہے بلکہ وہ خود حمام صابن ہے. قیمت صرف ۲ روپے چار آنے.

— "صافی ٹانک" آپ کے جسم کے اندر بہنے والے فاسد خون کو. احساس کی ہلکی ہلکی آنچ سے پکا کر شفاف کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے. تین ماہ کے مسلسل استعمال سے خون اس قدر صاف اور سفید ہو جائے گا کہ آپ پکے سیاست داں بن کر رہ جائیں گے. قیمت صرف اور صرف ۴ روپے، آگے پیچھے کچھ نہیں.

— ن. جعفری کی نظموں کا تازہ منظرنامہ "۵۸ سال پہلے کی باتیں" ابھی ابھی شائع ہو کر دھڑا دھڑ بک رہا ہے. اس میں شاعر نے ماضی کے اُن بھاگتے ہوئے آب دار لمحوں کو پکڑنے کی کوشش اپنی دوربین نگاہوں سے کی ہے (یعنی بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھئے) جو ادب کی آخری چتا میں جل کر احساس کی لکیریں چھوڑ چکے تھے.

— "پاونڈز کریم". جلد کے کھردرے پن کو اپنی گول گول صفات سے کچھ اس طرح صاف کرتی ہے جیسے نئی کونپلیں دھوپ میں جل کر دمک رہی ہوں.

— ڈاکٹر وسیم کی تنقیدی کتاب "ایک کتا کل رات بھونکا تھا" تنقید کی اُن تمام کتابوں پر بہترین جلد بندی کی طرح ہے جن پر صرف ناموں کے چمکیلے حروف [illegible] دکھائی دیتے ہیں جس طرح ہمارے

لیڈر کھدر کے لباس میں نظر آتے ہیں کہ دونوں ہی جلد بند کتاب کی طرح ہیں کھولو تو اندر خالی خالی اوراق۔

—"دھوپ کا کوا" تین دال کے آگ دیتے ہوئے مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں فنکار کا احساس پہلی بارش کی پھلواروں کی طرح محسوس ہوتا ہے تو طبیعت مچل مچل جاتی ہے اور دل شاخِ گل سے لپٹ جانے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے۔

—"زین صابن" کپڑوں کے تمام مسامات میں داخل ہو کر چاندنی کی طرح پھیل جاتا ہے تو کپڑا ایک خوبصورت نغمے کی شکل میں سفر کرنے لگتا ہے۔

—"کیچڑ میں پھنسا ہوا مرغ"

یہ کاف، کاف کی طرح سے آزاد نظموں کا ڈوب ڈوب کر طلوع ہونے والا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں شاعر نے اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اُس وادی کو دریافت کیا ہے جہاں کا سفر ہر شخص کے لیے ممنوع ہے۔ بہرحال کاف کاف کی شاعری اوس کو پی کر جوان ہوتی ہے۔ قیمت ۴۵ روپے۔ ہر کتب فروش سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

—"نیشنل کریم" ہونٹوں پر جمی پپڑیوں کے کھردرے پن کو چھیل چھیل کر صاف کر کے ایسی چکناہٹ پیدا کر دیتی ہے کہ لب پھسل پھسل جاتے ہیں۔ ماہر سیاست دانوں کی طرح اپنے لبوں کو پھسلانے کے لیے آج ہی نیشنل کریم خریدیے جو ہمارے اس ملک میں کثرت سے استعمال ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے لبوں کی کمی نہیں ہے جو ہر وقت ہر لمحہ اور بات بات پر پھسلتے رہتے ہیں۔ قیمت بے حد کم ہے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ ۴ بوتلیں خریدنے پر ایک بوتل فری دی جاتی ہے۔

—"عین جیم" کا تازہ مجموعہ جس کا عنوان "گرم ہوائیں" ہے رومانی شاعری کی انتہا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے ہر زبان کے ادب میں ایسی رومانی شاعری وجود میں آ چکی ہے کہ لفظ رومان کو شرم آنے لگی ہے۔ لیکن یہ مجموعہ ان تمام رومانی مجموعوں سے بہت زیادہ آگے ہے۔ اس لیے شاعر نے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ قاری اس مجموعہ کو رات کے وقت ہی پڑھے کہ دن کے وقت پڑھنے پر الفاظ اور قاری دونوں شرمندہ ہو جائیں گے۔

—"چاند مارگ مہندی" جو سیاہ ہاتھوں کو سُرخ اور سُرخ ہاتھوں کو سیاہ کرتی ہے۔ سیاسی عورتوں کے لیے اس کا استعمال بے حد ضروری ہے کہ ایک مشہور لیڈر کا نسخہ ہے جو برسوں کی محنت و ریاضت اور سینکڑوں کے ہاتھوں اور چہروں کو سیاہ و سُرخ کرنے کے بعد حاصل ہوا ہے لیڈروں کی بیویاں خاص طور پر استعمال کرتی ہیں۔ اگر آپ کو بھی لیڈر کی بیوی بننے کی خواہش ہے تو چاند مارگ مہندی استعمال کیجیے جس میں شوہروں کو ہتھیلیاں بجانے پر مجبور کرنے کا راز پوشیدہ ہے!!

بابو آر کے (داجل پور شہر)

"ہمارا پہلا... انٹرویو"

نوکری سے پہلے انٹرویو اور شادی کے بعد بیوی ان دو چیزوں سے ہم ہمیشہ ہی ڈرتے آئے ہیں۔ ویسے بھی انٹرویو کا نام لیتے ہی اچھے اچھوں کے کلیجے منہ کو آنے لگتے ہیں۔ انٹرویو چاہے شادی کا ہو یا نوکری کا، سیاسی ہو یا ادبی، تمام انٹرویوز میں انٹرویو لینے والے انٹرویو دینے والے کا انجر پنجر ڈھیلے کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اسی لیے تو ہمیں انٹرویو کے چند پل مراحل سے زیادہ مشکل نظر آتے ہیں . . . اپنی زندگی کا پہلا انٹرویو تو ہم سے بھلائے نہیں بھولتا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم گریجویشن کے بعد بی ایڈ کر چکے تھے اور نوکری کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے تھے! اسی دوران ایک دن . . . ہمارے چچا کے مونچھ بردار اور بالوں سے بال بال بچنے والے ہم زلف نے عین سڑک کے بیچوں بیچ ہمیں ڈانٹا مائیٹ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے میاں! یونہی سڑکیں ناپو گے یا کہیں نوکری چاکری بھی کرو گے ؟" ہم نے التجا کی، "کہیں کوئی جگہ ہو تو آپ بتائیں۔ ہم تو کب سے بے چین ہیں۔" اس وقت الا صاحب نے SUN MICA جیسے جھل جھل کرتے اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کے رعب جماتے ہوئے کہا "آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان بھی عجیب ہیں ؟ اخباروں میں ان کے دیکھنے اور پڑھنے کے لیے سوائے فلموں کے اشتہار اور مار دھاڑ کی خبروں کے کچھ ہوتا ہی نہیں" ؟ یہ کہہ کر انھوں نے تازہ اخبار ہمارے منہ پہ دے مارا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار ملاحظہ کیا . . . اور واقعی اس میں ایک قصبہ کی اسکول میں بی ایس سی بی ایڈ ٹیچر کی ویکنسی کا اشتہار چھپا تھا . . . قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ہم نے عرضی دی اور ہمیں انٹرویو کال بھی مل گیا اس کے ملتے ہی انٹرویو کی گھبراہٹ ہم پہ طاری ہو گئی۔ چہرے پہ پریشانی۔ ہاتھ پاؤں میں لرزش اور آنکھوں میں وحشت ہمیں اس حال میں دیکھ کر والدہ نے ممتا کی دہائی دے کر چھاتی پہ پتھر مارتے ہوئے کہا . . . میرے لعل تیرا رنگ [illegible] کیسے ہو گیا ؟ میری آنکھوں کے تارے تیری آنکھیں کیوں پتھرا گئیں ؟ پھر وہ آنسو پیتے ہوئے ہمارے قریب آئیں اپنے ہاتھ کے تھرما میٹر سے ہمارے جسم کا درجۂ حرارت ناپ کر ہانک لگاتے ہوئے بولیں "اجی سنتے ہو، جاؤ ذرا ڈاکٹر کو لے آؤ . . . میرے کلیجہ کی ٹھنڈک بخار میں تپنے لگی ہے . . . الغرض تھوڑی ہی دیر میں والدہ کے واویلا اور آہ و بکا نیز پریشانیوں نے ہمارے گھر میں کھلبلی مچا کے رکھ دی . . . اور ہمارے ابّو مارے گھبراہٹ کے ایک پاؤں میں چپل اور دوسرے میں جوتا ڈالے۔ سر پہ چھتری رکھے اور ہاتھ میں ٹوپی پہنے ڈاکٹر کو لاتے ہی دل لے بیٹھے [illegible]

نے انھیں ڈھارس دی۔ آپ لوگ گھبرائیے مت۔ ہمیں ہوا کچھ نہیں۔ گھر کے سب افراد ہماری جانب متوجہ ہو گئے ہم نے کانپتی آواز اور گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔ دراصل' ہمیں آج انٹرویو کال آیا ہے۔ یہ سُن کر ہماری والدہ دلگیر ہو کر بولیں، ہائے ہائے کیا زمانہ آیا ہے۔ پہلے اناج کا کال آیا پھر پانی کا کال آیا اور . . . اب سوا یہ انٹرویو کال بھی آ مرا؟ ہم نے روہانسے لہجہ میں کہا امی جان یہ انٹرویو کال ہمارے لیے ایک وبال ہے۔ وہ بولیں بیٹا صبر کرو ہمت سے کام لو۔ تو صاحب انٹرویو کال ملتے ہی ہماری زندگی میں ایک اتھل پتھل سی مچ گئی۔ انٹرویو کے پیش نظر شہر کی تمام لائبریریاں یوں سمجھو کر ہمارا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ ہم نے دنیا بھر کی مختلف موضوعات کی کتابیں کھنگال ڈالیں۔ غالب اور اقبال کے دیوان دیوانگی کی حد تک پڑھ ڈالے۔ جنرل نالج اور تاریخ کی چھوٹی بڑی ان گنت کتابوں کو اپنے مطالعہ سے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اہم جنگوں کے دن تاریخ اور وقت ساعت تک معلوم کر لیجیے۔ اسپورٹس کے نام پر کبڈی۔ کھو کھو۔ گلی ڈنڈا بولی بولی اور ڈاب ڈبولی سے لے کر کرکٹ۔ اسکواش نٹ بال، ہاکی اور گولف، بلیرڈ۔ شطرنج تک کے اصول اور ضابطے اپنی عام معلومات کے کوزے میں سمیٹ لیے۔ الغرض انٹرویو کی ان تمام تیاریوں میں پورا ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا اور انٹرویو کی اس تگ و دو میں ہماری شخصیت میں انٹرویو کے پیچ یوں نکل آئے کہ چہرہ انٹرویو حال ہو کے رہ گیا۔ آنکھیں سیاہ حلقوں کے کنوؤں میں اتر گئیں۔ گالوں کے لیے چہرہ پر تلاش و کھوج درکار تھی۔ داڑھی نے ایسے ہاتھ پاؤں نکالے کہ خارزار جھاڑی بھی شرما گئی۔ نیند چین بھی روٹھا اور بھوک پیاس بھی چھوٹی۔ ان دنوں ہماری اس درگت کے متعلق جب کوئی پوچھتا تو ہم نحیف آواز میں آنکھوں میں دم سمیٹ کر کہتے۔ ہمیں انٹرویو کال آیا ہے اور یہ جو آپ ہماری دگرگوں حالت دیکھ رہے ہیں نا تو . . . یہ انٹرویو کی نورانی صفات ہیں۔

بہرحال انٹرویو کی صبح ہم بستر سے اٹھے۔ غسل کیا اور نمازِ فجر کے ساتھ ساتھ صلوۃ الحاجات بھی ادا کی۔ وقفہ وقفہ سے زعفران سے لکھے دعائے گنج العرش کو پانی میں گھول کے پیا۔ پھر تمام مارکس لسٹ، ڈگری اور سرٹیفکٹس وغیرہ اکٹھا کر کے رخت سفر باندھا . . . اور جس وقت ہم کیل کانٹے سے لیس ہو کر انٹرویو کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ ہماری والدہ بھاگی بھاگی آئیں۔ انھوں نے ہمارے سیدھے بازو پہ امام ضامن اور بائیں بازو پہ تعویذ باندھا پھر چٹاچٹ بلائیں لے کر انگلیاں پھوڑیں اور صدقے واری کہہ کر بولیں۔ سیدھی جانب پلٹ کے دیکھتے جا میرے لعل، خدا تجھے کامیاب اور کامران لوٹائے۔ چونکہ ہم انٹرویو کے مقررہ وقت سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل پہنچے تھے اس لیے ہمیں کم از کم اتنا وقت تو مل ہی گیا تھا کہ ہم انٹرویو ہال کا جائزہ لے لیں . . . انٹرویو ہال کی بدحالی نے ہمیں بے حال کر دیا۔ ہال کی دیواریں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ مکڑی کے جالے جھومروں کی طرح جھول رہے تھے۔ اسی ہال کا ایک گوشہ کچرے مٹی کے ڈھیر کو لعل و جواہر کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ ہال کے بیچوں بیچ ایک ٹیبل مع ساڑھے تین پاؤ کا لچر کھڑا تھا اس کے آدھے پاؤں کے لیے دو اینٹوں کو کام میں لایا گیا تھا کرسیاں بھی کسمپرسی کی حالت میں مبتلا تھیں کوئی لولی تھی تو کوئی لنگ کسی کا ٹیکا غائب تھا تو کسی کی چولیں ڈھیلی۔ دیوار پہ ٹنگی بند گھڑی پر بھی بُرا وقت آن پڑا تھا۔ ڈائل کچھ اس انداز سے گھوما تھا کہ تین کی جگہ نو بیٹھا ہوا تھا اور بارہ کی جگہ پر چھ چڑھ دوڑا تھا۔ کانٹے بھی اپنے مقام سے ہجرت کر چکے تھے۔

اور پھر نصف گھنٹہ بعد انٹرویو ہال میں انٹرویو کی گہما گہمی کے آثار پیدا ہو گئے انٹرویو لینے والے

حضرات آئے اور کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ ان حضرات کے ہاؤ بھاؤ سے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمارا انٹرویو لینے کے لیے ہی اس عالمِ آب و گل میں اتارے گئے ہوں۔ ہم اجازت لے کر لرزتے قدموں کے ساتھ انٹرویو ہال میں داخل ہوئے۔ میز کے گرد کرسیوں پہ کل چھ حضرات بیٹھے تھے۔ چھ میں سے کم از کم پانچ حضرات چہرے بشرے سے یقیناً ایسے تھے کہ جن کا انٹرویو لینا ہی انٹرویو کے ساتھ کھلواڑ کے برابر تھا۔ ہم نے رعجھانے والے شیریں انداز میں کہا السلام علیکم۔ وعلیکم السلام کے ساتھ ہر کوئی ہمارے سراپے کو سر سے پاؤں تک یوں گھورنے لگے مانو ہم اس دنیا کے پرانی تھے ہی نہیں۔ ہر چہرہ پہ کرختگی اور سفاکی نمایاں تھی۔ سب نے یک زبان ہو کر تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ بیٹھ جائیے۔ ہم سعادت مندی سے بیٹھ گئے۔ اس وقت ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم ہٹلر، مولینی، چنگیز ہلاکو اور تیمور جیسے تاریخ کے تمام ظالموں کے نرغے میں آ پھنسے ہوں۔ اسی بیچ انٹرویو لینے والے پینل میں سے ایک صاحب نے اپنے سر کی پوٹلی نما پگڑی کا پٹارہ میز پہ رکھا۔ ان کی تقلید میں دوسرے صاحب نے اپنے ہاتھ کا ایک موٹا سا چم چم کرتا ڈنڈا میز پر لٹا دیا۔ تیسرے صاحب تمباکو کی ڈبی نکال کر ہتھیلی پہ چونا تمباکو اور اپنی ہتھیلی کا میل تینوں چیزیں رگڑنے لگے۔ اس طرح سوائے ایک صاحب کے باقی تمام اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مشغول ہو گئے۔ اور . . . . وہ صاحب جو ہمیں قدرے معقول نظر آ رہے تھے ہمارے قیاس میں انھیں اسکول انتظامیہ کا صدر ہونا چاہیئے تھا اور . . . وہ ہوئے بھی۔ خیر صاحب' ان حضرات نے ہمارے سرٹیفکیٹس اور ڈگری کو جتنی تکلیف اور پریشانی سے پڑھا ہے کم از کم اتنی پریشانی تو ہمیں انھیں حاصل کرنے میں بھی نہ ہوئی تھی۔ پگڑی والے صاحب نے پگڑی میز سے اُٹھائی اور سر پہ رکھی پھر وہ مع پگڑی ہم پہ چڑھ دوڑے . . . . تو . . . آپ ہمارے اسکول میں نوکر رہیں گے (انھوں نے نوکر پہ زیادہ زور دیا) ہم نے پھر کہا . . جی ہاں' ڈنڈے والے صاحب نے اپنے ڈنڈے کو میز پہ رول کی طرح گھمایا اور کہا . . . یعنی آپ کھرڑو برادری میں شامل ہونے آئے ہیں؟ ہم نے پھر کہا جی ہاں . . . اس وقت قدرے معقول دکھائی دینے والے صاحب نے ہمیں متوجہ کیا . . . اچھا تو سب سے پہلے آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ڈارون تھیوری کا سب سے زیادہ معترض کون ہے؟ ہم اس تحقیقی سوال پہ کانپ اٹھے۔ ہم نے کپکپاتی آواز میں کہا . . . کتے . . . وہ صاحب کڑک کر بولے سیاق و سباق کے ساتھ سوال کا جواب چاہیئے۔ ہم نے کہا روزِ ازل سے تادمِ انٹرویو روئے زمین کے تمام کتوں کے اخلاق و کردار عادات و خصائل، حضرتِ انسان سے پوری طرح میل کھاتے ہیں اس لیے بجائے کتوں کے بندر کو انسان کا ابتدائی روپ کہنا ہمارے خیال میں کتوں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے بلکہ زیادتی ہے۔ ظلم ہے۔ موضوع سے فائدہ اُٹھا کر تمباکو منہ میں دولتے ہوئے دوسرے صاحب بولے . . . کیوں جی؟ کتے ٹانگ کیوں اُٹھاتے ہیں؟ ہم حیران ہو گئے اس وقت معقول دکھائی دینے والے صاحب نے اپنی نامعقولیت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا، ہاں ہاں جواب دو کتے ٹانگ کیوں اُٹھاتے ہیں؟ بڑا معقول سوال ہے۔ ہم نے طیش میں کہا دیکھیے صاحب تیر، تلوار، بھالا برچھی اور پستول، گن، مشین گن اور اسٹین گن تک ہم اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں اور خواہ مخواہ خون بہاتے ہیں لیکن بیچارہ کتا صرف اپنی ٹانگ اٹھاتا ہے تو ہم اس پہ واویلا مچاتے ہیں . . . ایسا کیوں؟ جواب دیجئے؟ اور ہمارے اس سوال سے انٹرویو ہال کے سارے مدبر حضرات لاجواب ہو گئے . . . تھوڑے توقف کے بعد ایک صاحب نے موضوع سے میل کھاتا ایک اور سوال اچھالا . . . کیوں جی؟ بندر کیوں کھجاتے ہیں؟ اور پھر یہ صاحب بندر کی طرح

کھجا کر اپنے سوال کی وضاحت بھی کرنے لگے۔ ہم اس سوال پر سٹپٹا گئے پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری ہم نے کہا دیکھئے بندر ایک دوسرے کی جوئیں کھاتے ہیں چونکہ جوئیں زندہ ہوتی ہیں اس لیے انھیں پیٹ کے اندر کاٹتی ہیں۔ کھجلی انھیں اندر ہوتی ہے اور یہ بیچارے کھجاتے باہر ہیں۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا کہنے۔۔۔ کیا جواب ہے۔۔۔ الغرض ہماری حاضر جوابی نے داد و تحسین کے فقرے ان حضرات کے ذہنوں سے باہر کھینچ لاتے۔ اب ایک اور سوال نے ہمیں چونکا دیا۔ کیوں جی؟ زمین کی کشش نیوٹن ہی نے معلوم کی نا؟ ہم نے کہا کی ہوگی۔ انھوں نے پھر پوچھا نیوٹن باغ میں کیوں گیا تھا؟ ہم نے برجستہ کہا اسکول سے گتی دے کر۔۔۔ پھر سوال ہوا۔۔۔ اسکول سے اس نے گتی کیوں دی؟ ہم نے کہا اس لیے کہ اسکول کا اسٹاف اور مینجمنٹ دونوں خراب تھے۔۔ پھر وہ بولے۔۔۔ تو۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس اسکول کا اسٹاف اور انتظامیہ اچھا ہوتا تو۔۔۔ پھر کشش ثقل سے ساری دنیا واقف نہ ہوتی ہم نے بجا بالکل صحیح بلکہ ہمارا تو دعویٰ ہے کہ ہر دور میں نیوٹن پیدا کرنے کے لیے تمام اسکولوں کے اسٹاف اور انتظامیہ کو خراب ہونا ہی چاہیئے۔۔۔ ہمارے اس فلسفہ پر سب ہی سر ہلاتے ہوئے متفق ہو گئے۔ ہم ابھی ان سوالات کی بھرمار سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ صدر صاحب نے ایک عجیب سوال پوچھ کر ہماری لٹیا ڈبو دی۔ بولے، اب ہم اسپورٹس کی طرف آتے ہیں ہم نے کہا آئیے۔ بولے۔۔۔ بتلایئے ہونو لولو کا قومی کھیل کونسا؟ ہونولولو سن کر ہی ہم ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ بیٹھے پھر بھی ہم نے حواس مجتمع کر کے کہا۔ ہونولولو کا قومی کھیل گذشتہ زمانے میں لوٹا مالی ہوا کرتا تھا لیکن اب ایک عرصہ سے یہاں سوٹا چھینو قومی کھیل بن گیا ہے۔ بولے سوٹا چھینو یہ کس طرح کھیلا جاتا ہے؟ ہم نے کہا یہ مستطیل نما مثلثی دائرے میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ تمام کھلاڑی خطِ استواء پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ایک کھلاڑی ذو اضعاف اقل سے کام لیتے ہوئے عرض البلد سے طول البلد کی طرف چھلانگتے ہوئے آتا ہے اور پھر سطح مرتفع سے کپڑے کا ایک سوٹا ہاتھ میں لیے نمودار ہوتا ہے اور خطِ استوا پر بیٹھے کھلاڑیوں میں سے کسی ایک کے پیچھے سوٹا چھوڑ دیتا ہے۔۔۔ اور پھر گراؤنڈ کے قطب شمالی سے جب یہ واپس آتا ہے تب اسی سوٹے سے وہ سب کھلاڑیوں کی پٹائی کرتا ہے اور مخالف کھلاڑی سوٹا چھیننے کی کوشش میں اپنا محلِ وقوع بگاڑ لیتے ہیں۔۔۔ ہمارے اس مفصل جواب سے مطمئن ہو کر وہ صاحب بولے اب ہم ہونولولو سے ہوتے ہوئے ادب کی طرف آتے ہیں۔ ہم نے کہا۔ آیئے خوش آمدید۔۔ بولے آپ غالب کو جانتے ہیں؟ ہم نے کہا ہاں۔ بولے غالب شاعر ہی کیوں بنے؟ ہم نے کہا اس لیے کہ انھیں اپنی عاقبت جو خراب کرنی تھی۔ بولے۔۔۔ تو کیا عاقبت خراب کرنے کے اور طریقے نہیں تھے؟ ہم نے کہا تھے اور یقیناً تھے۔ انھوں نے مثال پوچھی۔ ہم نے کہا شعر کہنے سے زیادہ ہماری طرح انٹرویو دے کر بھی وہ اپنی عاقبت آسانی سے خراب کر سکتے تھے۔ اس کے بعد ہم سے فرمائش ہوئی۔ غالب کا کوئی شعر سنایئے۔ ہم نے دریافت کیا تحت میں گا کر۔ سب ایک ساتھ بولے دونوں میں سنا دیجئے باری باری۔ ہم نے شعر پڑھا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور پھر ہم نے اس شعر کو ترنم سے گانا شروع کیا اور جب ہم دودِ چراغِ محفل تک پہنچے کہ اسی بیچ اپانک اچھا ایک نوجوان انٹرویو ہال میں داخل ہوا۔ اور ڈنڈے والے حضرت کو مخاطب کر کے شکایت کی نوبلنہ۔۔

ابھی باولے تم یہاں بیٹھ کر دودھ اور چارہ کرتے رہو . . . اور . . . اُدھر سرپنچ نے چاروں بھینسوں کو گائے
ہاؤس میں ٹھونس دیا اور پہلے کو مارا سو الگ۔ گھر میں گائے کو بچھڑے نے سینگ مارا اور بھوری بھینس کو دودھ نے
بیٹھا تو وہ کود گئی . . . اب تم بولو چندری والوں کو آج دودھ ملے تو کیسے ؟ نوجوان ایک ہی سانس میں سارے
حالات کا دکھڑا سنا بیٹھا۔ ڈنڈے والے صاحب نے کہا . . . اچھا اب تم بیٹھو . . . میں اُدھر سرپنچ سے پھر کے آتا ہوں
اور یہ کہہ کر وہ صاحب ڈنڈے کی قیادت میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے انٹرویو ہال سے نکل گئے۔ اور ان کے
جاتے ہی ہمارا PRESSURE بھی یقیناً کچھ کم ہو گیا۔ ہم نے خوشگوار موڈ میں کہا اگر آپ کہیں تو ہم اس شعر کا
مطلب بھی واضح کر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم شعر کا مطلب بیان کرتے۔ صدر صاحب نے دونوں ہاتھ
جوڑ کر معذرت چاہ لی۔ کہنے لگے . . . نہیں . . . نہیں اس کی اب ضرورت نہیں . . . بالکل نہیں . . . پھر
تھوڑے وقفے کے بعد وہ بولے ہم نے آپ کو پسند کیا اور قبول بھی کر لیا . . . اور اس سے پہلے کہ تقرر کا آرڈر
آپ کے ہاتھ میں دیا جائے ضروری ہے کہ آپ بھی ہمارے اسکول کے بارے میں جان لیں . . . ہم سراپا گوش بن گئے
وہ کہنے لگے۔ دیکھئے ہمارا اسکول NON GRAST BASE پر چلے گا اس لیے تنخواہ کم کم اور کبھی کبھی ہی
ملے گی . . . دوسرے بچوں کو ان کے گھر یا کھیت سے برآمد کر کے اسکول میں لانا ہو گا۔ ہم نے کہا ہمیں یہ بھی منظور
ہے . . . لیکن پہلے آپ ہمیں اسکول کے درشن تو کرا دیجئے۔ پھر یہ صاحب ہمیں اپنے ساتھ دو کمروں والی
ایک عمارت میں لے گئے۔ یہاں ایک کمرے میں جانوروں کا چارا بھرا تھا اور دوسرے میں جانوروں کو باندھنے
کے لیے جا بجا کھونٹے گڑے تھے۔ ہم نے اسکول کی اس عمارت کا ناک پہ ہاتھ رکھ کے معائنہ کیا اور پھر
الٹے پاؤں اس عمارت سے نکل بھاگے۔ ہم نے صدر صاحب سے کہا دیکھئے، پہلے آپ اس عمارت سے جانوروں
کے کھونٹے اکھاڑ لیجیے، پھر اس کے بعد ہم یہاں علم کے جھنڈے گاڑیں گے اور یہ کہہ کر ہم وہاں سے اپنی
خیر مناتے سیدھے بس اسٹانڈ کی جانب لپکے اور جدھر کی بس ملی اس میں بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گئے . . .

اپیل

"سلامت علی مہدی" اُردو کے ایک مشہور صحافی اور ادیب کا نام ہے۔ وہ اردو
کے کئی روزناموں، ہفتہ وار رسائل اور ماہوار جرائد کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں اور متعدد کتابوں کے
مصنف و مؤلف ہیں۔ لیکن اب ان کا قلم خاموش ہے کیوں کہ وہ گذشتہ چھ سال سے دل اور پھیپھڑے
کی موذی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے یہ بیماریاں دن بدن خطرناک ہوتی
جا رہی ہیں۔ ان حالات میں اردو داں حضرات سے یہ اپیل ہے کہ وہ ان کی مالی امداد کریں۔ اور اس
امداد میں تاخیر نہ کریں ــــ مندرجہ ذیل پتہ پر ان کو منی آرڈر بھیجے جا سکتے ہیں:

جناب سلامت علی مہدی ۱8۔ کنگھی والی گلی، لکھنؤ۔ 226003

SALAMAT ALI MEHDI, 18-KANGHI WALI GALI,

LUCKNOW-226003

غزلیں

ظفر کمالی (پٹنہ)

عمر ہے دس سال لیکن عشق کا آزار ہے
درحقیقت باپ سے بیٹا کہیں ہشیار ہے

کس کو فرصت ہے یہاں جو دین کی باتیں کرے
وقتِ شب ہے، سارا گھر ہے اور وی سی آر ہے

بی بلاکن میکسی سے شوق فرمانے لگیں
اب بھلا کیا چیز جمپر اور کیا شلوار ہے

اپنے ہی گھر کی میسر جس کو سرداری نہیں
قوم کا قائد وہ بننے کے لیے تیار ہے

کون بربادی سے اس کو روک سکتا ہے میاں
رہزن جس قافلے کا قافلہ سالار ہے

پیش پابندی سے ہوتا ہے خسارے کا بجٹ
"دیش آگے بڑھ رہا ہے" رات دن پرچار ہے

حضرتِ داماد یوں ہیں سائیکل کے مستری
ان کی فرمائش نہیں کچھ صرف موٹر کار ہے

سرخیاں ہیں قتل کی اغوا زنا بالجبر کی
ایسا لگتا ہے پرانا روز کا اخبار ہے

ایک چپراسی نے بھی کوٹھی یہاں کرلی کھڑی
کیوں کہ دفتر میں وہ صاحب کا "شریکِ کار" ہے

شکیل رضا بنگلوری

اس دن سے ابھی تک دل سولی پہ ہی لٹکا ہے
جب سے انھیں دیکھا ہے یہ ذہن بھی بھٹکا ہے

سج دھج کے وہ نکلے ہیں نتھ ناک میں لٹکی ہے
کاغذ کا حسین زلفوں میں پھول بھی اٹکا ہے

آہستہ چڑھو ورنہ کھا جائے گا یہ منہ کی
یہ رکشا نہیں بیگم معذور سا "جھٹکا" ہے

دارو کے لیے مجھ کو پیسوں کی ضرورت ہے
کیا رہن رکھوں گھر میں بگی ہے نہ مٹکا ہے

چپکے سے چلے آؤ تم رات گئے چھت پہ!
اے جانِ رضاؔ! یاں تو کچھ خوف نہ کھٹکا ہے

محمد ظہیر الدین ساحرؔ (نرمل)

عمر چھوٹی بتانے سے کیا فائدہ!
بال کالے کرانے سے کیا فائدہ

چھوڑ کر سر مرا چین آ تو گیا!
اب یہ مرہم لگانے سے کیا فائدہ

صاف کر کے چکن مجھ سے کہتے ہیں وہ
اس طرح لیٹ آنے سے کیا فائدہ

لوٹ کے مال سے دے کے چندہ ڈھیر
نام جھوٹا کمانے سے کیا فائدہ

سر ہے سجدے میں، دل اور کے مال میں
اس طرح سر جھکانے سے کیا فائدہ

ممتاز مہدی (حیدرآباد)

بیٹھک نامہ

کھڑا ہونا کا ضد "بیٹھنا" ہے۔ بیٹھنا جبلّت میں شامل تو ہے لیکن ایک ہنر بھی ہے کنواریوں کا بیٹھنا، اپنے جسم و جان کا وزن ڈالے بغیر کسی کے سینے پر بیٹھنا، کلرکوں کا اپنے دفتر میں کرسی پر فائلوں سے بھری میز پر اوندھے منہ بے سدھ بیٹھنا۔ یا ستی کے نازک خیال سے بیوہ کا شوہر کی چتا پر بیٹھنا۔

بیٹھنے کا انداز آدمی کی حیثیت کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ جیسے بادشاہ کا بیٹھنا، کمہار کا بیٹھنا، چمار کا بیٹھنا، بڑھئی کا بیٹھنا، سیکل سوار کا سیکل پر بیٹھنا، آٹو ڈرائیور کا آٹو، یا رکشا راں کا رکشا پر بیٹھنا، مہمانِ خصوصی کا اونچی کرسیوں پر شان سے بیٹھنا۔ حیثیت کے علاوہ مختلف محفلوں میں بیٹھنے کے آداب مختلف ہوتے ہیں۔ جیسے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھنا، کسی مقدس مقام پر عبادت کے لیے بیٹھنا، ڈاکٹر کے سامنے بیٹھنا، بے تکلف بیٹھنا، جس محفل میں جگہ کی تنگی ہو جان پہچان والے کی ہمدردی کے نتیجے میں اُس کے ساتھ ایسا بیٹھنا کہ سارے جسم میں تکلیف ہو جائے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ "بیٹھنا" کی ضد یعنی "کھڑا ہونا" پر عمل کیا جائے۔ لیکن آرام طلبی کا مزاج ایسا تقویت پا چکا ہے کہ ٹیڑھے میڑھے سے کوئی جانور بن جائیں لیکن بیٹھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بسوں میں تو سیٹوں کے لیے دھینگا مشتی کی جاتی ہے ان سیٹوں کے ریزرویشن کرنے والے "پیشہ ور ایجنٹ" بھی ہوتے ہیں جو تھوڑی سی فیس میں آپ کا بڑا کام کر دیتے ہیں یعنی بسوں میں لنگوروں کی طرح لٹکنے کے عذاب سے نجات دلا دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ بادشاہوں کو تخت پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ تخت پر بیٹھنا تو اُن کی بدبختی تھی ہی ساتھ ہی ململ کے کرتے یا ہوادار پاجامے میں نہیں بیٹھ سکتے تھے بلکہ بہت سی مصیبتوں اور حماقتوں کو گلے سے بلکہ سر کے اوپر سے ٹخنوں تک لٹکا کر بیٹھنے پر مجبور تھے۔ غنیمت ہے آج کے حکمراں ایسی اذیتوں سے دو چار نہیں اب بیٹھنا ہی نہیں بلکہ دونوں ہاتھوں سے لوٹنا بھی سکون سے انجام پاتا ہے۔ جب لٹیا ڈوبنے پر آئے یا ابتداء ہی سے نحوست گھیر لے تو الگ بات ہے کہ کچھ ضدی لوگ اچھے خاصے بھلے چنگے، بیٹھے بیٹھے الکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنا بیڑہ غرق کر لیتے ہیں۔ ایک نواب صاحب اپنی کوٹھی میں بیٹھے بیٹھے میونسپل انتخابات میں کھڑے ہو گئے اور اس عہد کی لڑائی میں ضمانت بھی جاتی رہی ضدی تو تھے ہی جب بھی سنتے کہ الکشن ہو رہا ہے یہ فقط کھڑے ہو جاتے

چھوٹے سیاست کے ا کھاڑے میں تک جا کھڑے ہوئے تھک کر بیٹھے تو منہ سے نکلا ع

سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا

سیاست میں عروج سے مراد "وزیر" بن بیٹھنا ہے، عمارت سے ہٹنا گویا شرم سے پانی پانی ہوکر گھر بیٹھنا ہے جس کے نتیجے میں وزیر کے پیچھے چیں چیں چاں چاں کو لگ جلتے ہیں۔ مرغیوں کا انڈوں پر بیٹھنا وزیروں کے گھر بیٹھے رہنے کی ضد ہے کہ نتیجے میں چوزے اس دنیائے آب و گل میں قدم رنجہ ہوتے ہیں۔

کالوں کے تالے بیٹھنا، کوئلے کی کان کا بیٹھنا، دوکان، مکان کا بیٹھنا، اگر آندھرا پردیش آپ کے لیے خزانہ ہے تو خزانے پر سانپ کا بیٹھنا یا کسی کا دل بیٹھنا سب میں بڑا فرق ہے۔ تھیٹروں میں بیٹھنا، جلسوں میں بیٹھنا، تفریحی محفلوں میں بیٹھنا تو عام ہے لیکن ڈائس پر بیٹھنا ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوتا اور ڈائس پر بیٹھنا بے حد احتیاط کا متقاضی عمل ہے۔ کپڑے ڈھنگ کے ہیں کہ نہیں، بال ٹھیک جمے ہیں کہ نہیں، چہرے پر غازہ وغیرہ مناسب ہے کہ نہیں۔ غرض احتیاط سے بیٹھنے کے علاوہ حفظ ما تقدم کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ نہیں معلوم ڈائس پر بیٹھے ہوئے حضرات یا کسی ایک ذاتِ شریف کی کسی بھی وقت کی کوئی سی بھی حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑ جائے کہ گندے انڈے برسنے لگیں، چپلیں پھینکی جائیں بعض اوقات تو ڈائس پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کے راستے سے بھاگنا بھی پڑتا ہے بشرطیکہ منتظمین مستعد ہوں۔ اس طرح ڈائس پر بیٹھنا ڈیالسس پر بیٹھنے سے کم نہیں۔

ڈاکٹروں کا بعض اوقات مریض کو بیٹھنے کا مشورہ بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ مجرم کا آخری بار آخری سانس لینے کے لیے الکٹرک کرسی پر بیٹھنا تو بڑا دردناک ہوتا ہے۔ قربانی کا بکرا بن کر بیٹھنا تو صرف اور صرف مردوں کو نصیب ہوتا ہے یہ مسندِ نکاح پر بیٹھنا ہے۔ گھوڑے پر بیٹھ کر نکلنے کے زمانے تو لد گئے۔ اچھی بھلی زندگی گذارتے گذارتے پھانسی کا پھندہ یا صحیح معنوں میں سر سے کفن یعنی سہرہ باندھا مقتل یعنی مسندِ نکاح پہنچ جاتے ہیں۔ فطرت کا تقاضہ ہے کہ جس بات سے منع کیا جائے وہ ضرور کی جائے گی کہا گیا تصویر کشی کے لیے بیٹھنا گناہ ہے، ساری اُمت تصویروں میں ڈوب گئی ہے۔ ہوٹلوں میں بیٹھنا معیوب قرار دیا گیا نتیجہ سامنے ہے، بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اب تو خدا رسیدہ بندے بھی ہوٹلوں میں جا بیٹھے ہیں بلکہ ہوٹلوں کے کاروبار میں ہمہ تن مصروف ہوگئے ہیں۔ ناچ رقص کو دوزخی عمل قرار دیا گیا لیکن ایسی محفلوں میں تھرکتے بیٹھنا لوگ اپنا پیدائشی حق تصور کرنے لگے ہیں۔ نوٹنکیوں کے دور کی طرح اب ویڈیو کی محفلوں میں بیٹھنا تو یوں لگتا ہے گویا ع

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

فی الحال ویڈیو کی محفلوں میں بیٹھے ہوئے حضرات آداب کو ملحوظ رکھے نظر آتے ہیں لیکن یہی حضرات جب دسترخوان پر بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں لہٰذا دسترخوان پر بیٹھنے کے آداب مختلف ہیں۔ یہ دیکھ لینا پڑتا ہے کہ سامنے آزو بازو شرفا ہیں کہ نہیں کسی کی داڑھی شرافت کا سرٹیفکٹ نہیں ہوتی۔ صفا چٹ ضعیفوں میں گھر جانا مناسب ہوتا ہے کہ یہ حضرات کھاتے خوب ہیں لیکن آپ کی تیزی کے آگے کڑک مرغی کی طرح گڑگڑا کر بیٹھ رہتے ہیں۔ مرغ کی ٹانگ کو حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جہاں بفے سسٹم ہو وہاں بھی بیٹھنے کو ترجیح دیجیے۔ پلیٹ اٹھاتے اور ایک کونے میں تیمیانہ صورت بنائے بیٹھ جائیے۔ اشیائے طعام اندوختہ ہمدردی دستر کے نہ ہونے کی وجہ سے آپ ہی آپ چلی آئینگی بے شرمی کا بیٹھنا وہ ہے کہ امتحان میں فیل ہوکر بھی

بیٹھ رہے ہیں تو مرکزی ملازمین ہندی لفٹ میں بیٹھے رہے ہیں [illegible] کے لیے [illegible]
لا حاصل خرچ کر رہی ہے۔ ان سرکاروں کا ایسی اسکیموں سے زیادہ کاس لگت بیٹھنا ہماری نظر میں قابلِ رحم ہے
اتنا ہی قابلِ رحم ہے جتنا کہ کسی طالب علم کا بطورِ سزا مرغ بن کر بیٹھنا ہوتا ہے بے چارے کے آنسو نکل آتے
ہیں کبھی نیچے منے کا پہلے دن مدرسہ میں بیٹھنا بھی رحم کا محتاج ہوتا ہے۔ دورِ طالب علمی کے بعد بے روز گار بیٹھنا
پھر انٹرویو بورڈ کے سامنے بیٹھنا۔ انتخاب تو ہر انٹرویو میں پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے پھر بھی انٹرویو لینے
والے اکڑ کر بیٹھتے ہیں۔ انھیں تو وہ بیٹھنا یاد دلانا چاہیے جس میں گردن سے نیچے کفن باندھ دیا جاتا ہے۔ اب
آپ موت کے فرشتے کو خاموش دیکھتے رہتے ہیں وہ اپنے ہتھیار باری باری اُٹھاتا اور آپ کو تختۂ مشق
بناتا جاتا ہے موت کے فرشتے کے ہاتھ میں انتہائی تیز استرے اور کنگھے ہوتے ہیں۔ جب پانی کا فوارہ آپ کے سر پر
چھوٹتا ہے تو چاہے سارے جسم میں طنز و مزاح کی لہریں دوڑ جائیں آپ مسکرا بھی نہیں سکتے۔ یہ حجام بڑے
ہی سیانے ہوتے ہیں پیسے تو لیتے ہی ہیں نا مَن اور ڈھیر سارے پیارے پیارے بال بھی مالِ غنیمت جان کر
داب لیتے ہیں۔
لیکن رکشا راں کا رکشا پر بیٹھنے کا تصور ہی لرزا دیتا ہے۔ پیروں کی رگیں موٹی موٹی تنی کی تنی رہ جاتی ہیں لوگوں
کو یہ منزلِ مقصود کی طرف لے جاتے ہیں لیکن رکشا انھیں صرف اور صرف موت کی طرف کھینچتا ہے۔ رکشا والا
کے پیٹ کو دیکھیے اور دھنوان سیٹھوں کی توند کو CONVEX اور CON COVE عدسوں کا سا فرق
محسوس ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھانے سے توند اندر چلی جاتی ہے۔ اگر دوبارہ باہر نکالنا
چاہیں تو آلتی پالتی مار کر بیٹھیے اور کھاتے جائیے پھر دیکھیے توند کس طرح آگے کو بھاگنے دوڑنے لگتی ہے۔ توند
آپ سے اور آپ توند سے پریشان حالانکہ توند زیادہ دور تک بھاگی ہوئی ہو تو بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے چائے
کی پیالی کے اسٹانڈ کا کام دیتی ہے۔ چائے خانے عام طور پر بیٹھک کے اڈے کہلاتے ہیں۔ تاش کی بیٹھکوں
میں چھوٹے بڑے کی تمیز جاتی رہتی ہے۔ یہ جواری اپنی بیٹھکوں میں نئے نئے فقرے تراشتے ہوئے زبان وادب
کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کا بیٹھنا تو "ویڈیو بیٹھکوں" کو بھی مات کر دیتا ہے کہ یہ بیٹھک ہفتہ عشرہ
تک جاری رہتی ہے۔ ایسی بیٹھکوں میں بھول کر بھی مت بیٹھیے کہ ایک بار کا بیٹھا پھر نہ اٹھا۔ اس سے زیادہ
عبرت ناک بیٹھک دنیا و ما فیہا سے غفلت والی بیٹھک ہوتی ہے وہ چاہے براؤن شوگر والی ہو کہ
خالص ولایتی شراب والی یہ دین دنیا سے غافل کر دیتی ہے اور اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتی جب تک کہ آپ اس
دنیا سے پیمانہ چھڑا لیں یہ انسانیت کے زوال کی انتہا والی بیٹھک ہے۔ بیٹھنا زوال کی علامت بھی ہے جا رہی
کی ایک میٹھی سلونی پیاری زبان ایسی ہے کہ خود اس کے دانشور، ادیب اور شاعر اس کے مستقبل کے تعلق سے
مایوسی کا اظہار کرتے بیٹھے ہیں لیکن ہمارا یہ پیام ہے کہ مایوسی کے اظہار کے بجائے اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے بیٹھیے
یہی اردو کی سب سے بڑی خدمت ہے!!

مہر حسین علی امام (پاکستان)

مثالی گھر

'مثالی گھر' میں بچوں کے قہقہے، ساس، نندوں اور بیوی کی جھڑپوں، زن و شوہر کے معرکوں کے ساتھ ایک لڑنے والی ساس بھی میسّر نہ ہو تو کیا خاک مزہ آئے گا۔ اسی طرح اگر دو گز لمبی زبان رکھنے والی 'سالی' نہ ہو تب بھی ہمارے خیال میں مثالی گھر نہیں بن سکتا!

ہمارا یہ مضمون پڑھنے سے پہلے آپ یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ یہ مضمون ایک غیر شادی شدہ کا ہے اور مصدقہ و غیر مصدقہ ذرائع سے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی غرض و غایت سے لکھا گیا ہے۔

مثالی گھر کے کئی مراحل ہوتے ہیں: مثالی گھر کی تعمیر کے لیے پرانے وقتوں میں عاشق حضرات تیشہ لیے پھرا کرتے تھے کہ اگر کسی کمبخت نے دودھ کی نہر نکال لانے کو کہہ دیا تو اسی تیشے سے وہ اپنا سر پھوڑ لیں گے — تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسریا۔ لیکن یہ بیسویں صدی ہے صنعتی دور ہے۔ رسم و رواج، تہذیب و اقدار بدل گئے ہیں۔ اب باقاعدہ صحت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ محبوب سے محبت اور مر مر کر جیئے جانے کے وعدے شادی سے پہلے اینجوائمنٹ، اور ٹائم کو پاس کرنے کا ایک طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے یعنی 'مثالی گھر' کی تعمیر کے وقت عاشق کو جہاں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کئی وعدے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً

لڑکا: میں تمہارے لیے چاند ستارے توڑ لاؤں گا۔

لڑکی: ہائے اللہ! سچ!

لڑکا: کیا میں جھوٹ بول لیاں!

لڑکی: میں ان ستاروں کو اپنے دوپٹے کے کناروں پر لگاؤں گی!

لڑکا: کیا تم پاگل ہو گئی ہو۔ تم نے شادی سے پہلے ہی فرمائش شروع کر دی ہے۔ مجھے تم سے قطعاً کوئی عشق نہیں ہے۔ میں ایسا عشق نہیں کر سکتا، جس میں مجھ سے ستارے منگوائے جائیں۔

لڑکی: تم تو سچ مچ کے ناراض ہو گئے۔ اچھا غصہ تھوک دو۔ اب میں تم سے کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔

لڑکا: (زمین پر غصہ تھوکتے ہوئے) لیکن تم نے چاند ستارے لانے کی فرمائش ہی کیوں کی؟

لڑکی: ارے بابا! تم تو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ممی نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی فرمائش کرنے تو گولہ کنا ... والے ستارے نکال لینا تاکہ گھر کی تیاری میں کام آ سکیں۔ موئے آسمان کے چاند ستارے

کسی کام کے نہ چیزیں استعمال کے قابل ہیں اور نہ شو پیس بننے کے قابل!
کیا خیال ہے آپ کا اس واقعہ سے متعلق؟ یہی کہ محبوبہ کی والدہ نہایت زیرک اور عقلمند واقع ہوئی ہیں۔
مثالی گھر کی تعمیر کا دوسرا مرحلہ عشق کے بعد اور شادی سے پہلے کی "ملاقاتوں" پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات ملاحظہ ہو۔

لڑکی: رات کتنی حسین ہے۔ ہر طرف چاندنی ہے۔
لڑکا: (مسکراتے ہوئے) ہر طرف تو نہیں، صرف میرے پاس چاندنی ہے۔ (واضح رہے کہ چاندنی لڑکی کا نام ہے)
لڑکی: ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں۔ . . . مجھے سردی لگ رہی ہے۔
لڑکا: سردی سے تمہیں بخار یا نمونیہ نہ ہو جائے۔
لڑکی: تم ہمیشہ میری خرابیٔ صحت کے لیے بد دعائیں نکالتے ہو۔ ابھی تو میں اپنے ڈیڈی کا کھاتی ہوں۔
لڑکا: اچھی چاندنی! مجھے معاف کرو۔ آؤ گھر چلیں۔ راستے میں گولڈ اسپاٹ کی دکان سے محترمہ چاندنی آئسکریم اور محترم چاند پان والے کے کیبن سے اسپرین کی ٹکیہ کھا کر اپنے اپنے گھر خوش ہو لیتے ہیں۔ دونوں کے گھر والے خوش ہیں۔ لڑکے والوں کا خیال ہے کہ صاحبزادے اب کافی عقلمند ہوتے جا رہے ہیں صرف آئسکریم اور اسپرین کی ٹکیہ سے کام چلا لیا! لڑکی کے والدین بھی خوش ہیں کہ صاحبزادی کے آئسکریم کھانے کا ارمان پورا ہوا ہے۔

اگر محبت کی ملاقاتیں رنگ لاتی ہیں، تب آپ 'مثالی گھر' کے تیسرے مرحلہ کے لیے کوالیفائی کر لیے جاتے ہیں۔
مثالی گھر کا تیسرا مرحلہ بات کا پکا ہونا، منہ کا میٹھا کرنا اور پھر شادی خانہ آبادی ہے۔ جوڑے سلے جا رہے ہیں ٹھکانا نکالا جا رہا ہے۔ اُبٹن، چکسا دلہن کو لگایا جا رہا ہے دولہا صاحب بھی 'مایوں' میں بیٹھے ہیں۔ اگر قاصد کوئی پیغام لے جائے تو کہلوا بھیجتے ہیں کہ ؎

اُن کے پاؤں میں مہندی لگی ہے ٭ وہ آنے جانے کے قابل نہیں ہیں

'مثالی گھر کا چوتھا مرحلہ' نکاح 'ہے۔ یہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ نکاح کے دو بول کے بعد دولہا کے چہرے پر حماقت طاری ہوتی ہے۔ ہر وقت مسکرانے کی ناکام ریہرسل میں لگے رہتے ہیں۔ دلہن کے گھر والوں کے چہروں پر گھڑی کی سوئیاں بارہ بجے کے ہندسوں پر آکر رک جاتی ہیں۔ آج کل، نکاح کی خوشی میں عصرانہ و عشائیہ کھانا واجب اور فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ جاتے جاتے میاں بیوی کو روایتی مبارکباد دے کر لوگ رخصت ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ دولھا میاں کی اگلی زندگی کا خدا ہی حافظ و ناصر ہے۔

نکاح ہوا، حجلۂ عروسی کا منظر ختم ہوا۔ مثالی گھر بنا۔ مثالی گھر میں اب کیا ہوتا ہے دیکھیے۔ پورا سسرال، دلہن بیگم کے آگے پیچھے ہو رہا ہے لیکن محترمہ کا دماغ ہے کہ کسی سے میل نہیں کھاتا۔ ہر وقت میکے کی یاد۔ ہر وقت نت نئے غم نیا دونا میکہ ان کے لیے جنت الفردوس ہے اور سسرال جہنم کا سب سے اہم طبقہ چار دن میکے میں اور چار دن سسرال میں گذر بسر ہو رہی ہے اور شوہر صاحب دو دن انتظار میں اور دو دن آرزو میں گزارتے ہیں۔ میکے والے دریافت کرتے رہتے ہیں ملاتی، تمہیں کس نے سکھائی ہے؟ تو جواب میں دلہن پاشا فرماتی ہیں "میری ساس، نندوں نے ہر دلہن کے دیور نافرمان اور حکم عدولی کرنے والے، منہ پھٹ ہر دولہا کی سالیاں دو گز زبان رکھنے والی۔ میکے میں سسرال کے کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ کھانا ایسا پکتا ہے کہ نمک ہے تو مرچی غائب، شوربہ میں پانی ہے تو بوٹی غائب! میکے والے دلہن بٹیا پر چھائے

ہو رہے ہیں۔ ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں کہ ہاں بیٹی تو کتنی دبلی ہوتی جا رہی ہے۔ ہماری چاندنی کو تو گھن لگ رہا ہے۔ دو وقت کھانا چین سے نہیں ملتا ہے۔ ساس، نندیں عذاب سے کم نہیں ہیں۔

اچھا دوسرا منظر دیکھئے۔ وہاں ساس صاحبہ اور نندیں اڑوس، پڑوس کی لڑکیوں، بالیوں کو جمع کر کے اپنا رونا روتی ہیں۔ اپنا دکھڑا بیان کر رہی ہیں۔ اتنی چاہتوں اور ارمانوں سے دلہن لے آئے اور دلہن صاحبہ نے آتے ہی بیٹے کو ماں سے بدظن کر دیا اور گھر پر راج کرنے لگی ہیں۔ ہمیں خادمائیں سمجھتی ہیں۔

دیکھا آپ نے۔ روز شادیاں ہوں گی روز دلہنیں دستیاب ہوں گی۔ آج کی نند کل دلہن بنے گی۔ کل ساس بنے گی۔ لیکن ہنگامہ ہوتے رہیں گے کیوں کہ کچھ تو خاطر احباب چاہیئے۔ بہر کیف اس کشمکش میں دولہا صاحب نٹ بال کی طرح دونوں ٹیموں کے درمیان لڑھکتے جا رہے ہیں۔ کرکٹ کی طرح کبھی آف اسپین اور کبھی میڈیم پیس بالنگ بھی ہو جاتی ہے ڈوئی، چمچہ، برتن ایک دوسرے پر پھینکے جاتے ہیں اور شوہر صاحب عموماً کیچ آوٹ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کامیابی سے انجیرڈ ہو جاتے ہیں۔ اور جہاں دولہا صاحب انجیرڈ ہوئے۔ گیم ختم اور دونوں ٹیمیں تیمارداری شروع کر دیتی ہیں۔

'مثالی گھر' کا اگلا مرحلہ ہوتا ہے' کیلنڈروں کی اشاعت! پہلے ایڈیشن کی کامیاب اشاعت پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بچہ کا نام تجویز ہوتا ہے۔ خاندان کا ہر فرد چاہتا ہے کہ اس معصوم جان پر اپنی پسند کا نام ٹھونس دے۔ خالہ پھوپی نندیں، بھابیاں، سالیاں۔ ان کے علاوہ ان سب کے معزز مذکر بھی اپنے اپنے پسندیدہ نام استخارہ کے لیے دینے سے باز نہیں آتے۔

پہلے ایڈیشن کو "منو" کہا گیا۔

دوسرے کو چنو۔

تیسرا پپو کہلایا۔

چوتھی اور پانچویں طباعت جنی، پپی کے نام سے مارکٹ میں آئیں۔ ان کے بعد کے ایڈیشن منو دوم، چنو سوم کے نام سے موسوم ہوئے۔ مگر یہ مثالی گھر کہاں ہوا؟ مثالی گھر تو وہ ہے جو "دو یا تین۔ بس!" کے اصول پر کام کرتا ہے۔

□□

منظور وقار
(گلبرگہ)

ایک جاسوسی ناول

نام کتاب : ــــــــــــ کھودا پہاڑ نکلا غدّار
مصنف : ــــــــــــ ابن شقی ایم۔اے
سرورق : ــــــــــــ بھیانک رضوان
ادارہ : ــــــــــــ گھس پھُس دُنیا پبلیکیشنز۔ بے کار آباد
طباعت : ــــــــــــ قومی قبرستان پرنٹنگ پریس۔ بے کار آباد
سنہ اشاعت : ــــــــــــ اکتوبر ۱۹۸۷ء
تعداد اشاعت : ــــــــــــ خفیہ
قیمت : ــــــــــــ دو کوڑی
ملنے کا پتہ : ــــــــــــ ہندوستان کے ہر ڈیوالیہ مارکٹ اسٹال پر کتاب ضرور دستیاب ہوگی۔

نوٹ : کتاب ہٰذا کے جملہ حقوق قارئین کے نام محفوظ ہیں کوئی بھی شخص مصنف یا پبلشر سے تحریری یا زبانی اجازت لیے بغیر ہی اس ناول کو اپنے نام سے شائع کرا کے کسی بھی ریاست کی اردو اکیڈیمی کو انعام کے لیے روانہ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو اس ناول کو پردۂ فلم پر لا کر نیشنل ایوارڈ بھی حاصل کر سکتا ہے۔

مقدمہ ! (بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا !)

"کھودا پہاڑ نکلا غدّار" ابن شقی کی اُن شاہکار ناولوں میں سے ایک ہے جس میں کرنل فریدی عمران کیپٹن حمید اور انسپکٹر جگدیش کے ساتھ ساتھ قاسم بھی موجود ہے گویا ناول نہ ہوئی "ملٹی اسٹار" فلم ہوئی۔ اس ناول میں کیپٹن حمید کی نوک جھونک (جس میں نوک کم جھونک زیادہ ہے) کے ساتھ ساتھ کرنل فریدی کی پُر وقار شخصیت (کتنی پُر وقار ہے ناول پڑھنے کے بعد ہی پتہ چل جائے گا) پوری کہانی پر چھائی ہوئی ہے۔ اس ناول کا خاص کردار "بھیانک بزدل" تو آپ کی نیندیں حرام کر دے گا۔ آج جاسوسی ادب میں ابن شقی کا نام محتاج تعارف نہیں رہا وہ جس تیزی اور جس دلیری سے ابن صفی کی ناولوں کی نقل کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر مرحوم ابن صفی کی روح کو تعجب اور ہمارے ادارے کو مسرت ہو رہی ہے۔

رہی ابن شفق کی تحریروں کی بات، ان کی تحریروں میں بلا کی "شق القلبی" موجود ہے۔ ان کے ناول پڑھ کر کئی ڈرپوک نوجوان اس قدر بہادر اور بے خوف ہوگئے کہ وہ اپنے اپنے محلے کے دادا کہلانے لگے۔ ابن شفق کے ناول کمزور اور بزدل نوجوانوں کے لیے قوتِ مردانگی کا مجرب نسخہ ہیں۔ "کھودا پہاڑ نکلا غدار" کو ابن شفق کے ناقابل فراموش کارناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ معرکتہ الآرا اور سنسنی خیز کہانی اپنے دامن میں قارئین کو بے ہوش کر دینے والے واقعات اور حادثات کے بیش بہا خزانے رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اس ناول کو اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیں گے کہ اُن کے ہاتھوں میں آئندہ راشن کی تھیلی کی جگہ یہی ناول ہوگی۔

(بکواس زمانی)

خوش گوار محفل: کیپٹن حمید قاسم کے گھر اتوار کی چھٹی گزارنے آیا تھا۔ قاسم بھی اپنے بھاری بھرکم جسم کو آرام کرسی میں پھنسائے حمید کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ان دونوں میں کس قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ دونوں مسلسل قہقہے لگا رہے تھے۔ قاسم جب ہنسنے لگتا تو اس کے جسم کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا بحری جہاز طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہے ہنستے ہوئے قاسم نے باورچی خانہ کی جانب دیکھ کر آواز لگائی "وہ میری جانِ جگر ابھی تک چائے کیوں نہیں آئی"؟ "گھر میں شکر نہیں ہے اس لیے خالی ڈبہ میں بچی کچھی شکر کو جھٹک رہی ہوں۔۔۔ کچھ دیر انتظار کرو چائے آجائے گی" قاسم کی بیوی نے باورچی خانے ہی سے اپنا دکھڑا سنا دیا "تمہارے گھر کی حالت اتنی خراب ہے مجھے پتہ نہیں تھا ورنہ میں تمہارے گھر نہیں آتا" کیپٹن حمید نے قاسم پر شرارت بھری نظریں گاڑتے ہوئے کہا، "کیا تمہارے گھر کی حالت خراب ہے تم میری ہتک کرتے ہو میں تمہارا خون پی جاؤں گا" قاسم غصہ سے لال پیلا ہوگیا۔ "اس میں ہتک کی کیا بات ہے مفلسی کسی بھی انسان کو کسی بھی وقت اپنی آغوش میں لے لیتی ہے" حمید نے قاسم کے لال پیلے چہرے پر ایک اور طمانچہ مارا "اے حمید کے بچے میں اگر چاہوں تو گھر کو شکر کا گودام بنا سکتا ہوں مگر مشکل تو یہ ہے کہ پورے شہر میں شکر کا اچانک قال پڑا ہوا ہے"، قاسم اپنے غصے کو پیتے ہوئے بولا "معاف کرنا قاسم مجھے معلوم نہیں تھا کہ بازار میں شکر کا آج کل اتنا شارٹیج ہے کیوں کہ آج کل میرا دھیان خوبصورت لڑکیوں کے شارٹیج کی طرف لگا ہوا ہے کچھ دنوں سے شہر کی خوبصورت لڑکیاں اچانک غائب ہو رہی ہیں" کیپٹن حمید کافی سنجیدہ نظر آنے لگا "پھر تو میری بیوی ابھی تک کیوں نہیں غائب ہوئی۔۔۔۔؟" قاسم نے انتہائی بھولے پن سے پوچھا: حمید کے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکل پڑا۔

ٹرن۔۔۔ٹرن۔۔۔ٹرن ٹیلیفون کی مسلسل آواز نے کرنل فریدی کو آخر جگا ہی دیا اُس نے آنکھ

رات کا ٹیلیفون: ملتے ہوئے بیزاری سے ریسور اُٹھایا۔ آواز آئی "ہلو۔۔۔ ہلو میں ڈی۔آئی۔جی کھنہ بول رہا ہوں"۔ "ہلو کھنہ صاحب میں فریدی ہوں بتایئے اتنی رات گئے ٹیلیفون کرنے کی زحمت آپ نے کیوں اٹھائی"۔۔۔؟ کرنل فریدی! بڑا غضب ہوا ہم نے بھیانک بزدل کو گرفتار کرنے کے لیے انسپکٹر جگدیش کو مقرر کیا تھا مگر ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ بھیانک بزدل کے آدمی انسپکٹر جگدیش کو قتل کر کے اس کی لاش کو کچرے کے ڈبے میں پھینک چکے ہیں" کرنل فریدی نے بڑے ہی اکتا دینے والے انداز میں جواب دیا "میں کیا کروں کھنہ صاحب کسی کا بھی خون ہو جائے تو آپ کو صرف میں ہی یاد آجاتا ہوں۔۔۔ دیکھو میں آج ہی تو ٹیکم گڈھ کی مہم سے آیا ہوں۔۔۔ میرا ارادہ ہے ایک ہفتے تک مکان میں آرام کرنے کا"۔ دوسری طرف سے گرجدار آواز میں ڈی۔آئی۔جی کھنہ بولے "کرنل فریدی اس وقت کوئی بہانہ نہیں چلے گا کل صبح تم پولیس کمشنر آفس آجانا اور ہاں ساتھ میں عمران کو بھی لیتے آنا کیوں کہ آج کل وہ بے کاری میں خلیل خاں کے

فاختہ کچھ زیادہ ہی اڑانے لگا ہے بھولنا نہیں یہ میرا حکم ہے"۔ ہلو ہلو ڈی۔آئی۔جی کھنہ صاحب سنیئے تو . . کرنل فریدی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے ریسیور کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی۔

صبح کرنل فریدی عمران کے ہمراہ کمشنر آفس پہنچا۔ آفس میں ڈی۔آئی۔جی کھنہ کے علاوہ ایس۔پی گنتا، ڈپٹی کمشنر آف پولیس تھپلیا اور شہر کی خاتون میئر سوشیتا بھی موجود تھی اور وہ تمام بھیانک بزدل کے جرائم پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کرنل فریدی اور عمران ... اندر داخل ہوئے تو ڈی۔آئی۔جی کھنہ اشارے سے عمران کو باہر جانے کے لیے کہا عمران آفس کے باہر آکر ایک چپراسی کے قریب بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ ڈی۔آئی۔جی کھنہ کرنل فریدی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے کہنے لگے "کرنل فریدی بھیانک بزدل کے جرائم بڑھتے ہی جارہے ہیں۔ دن دھاڑے بینک ڈکیتی، شکر کا شار ٹیج خوبصورت لڑکیوں کا اغواء ان تمام واقعات میں بھیانک بزدل ہی کا ہاتھ ہے اب تک محکمہ پولیس بھیانک بزدل کو گرفتار کرنے کے چکر میں اپنے ایک درجن پولیس انسپکٹر اور ڈیڑھ درجن حوالداروں کی قربانی دے کر اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بھیانک بزدل کو صرف تم ہی گرفتار کر سکتے ہو؟

کرنل فریدی فخر سے اپنا سینہ پھلاکر بولا "کھنہ صاحب آپ کا اعتماد سر آنکھوں پر آپ اپنا پلان تو بتائیے میں بھیانک بزدل کو آپ کے قدموں میں لاکر پھینک دوں گا" ڈی۔آئی۔جی کھنہ پلان سمجھانے لگے "کرنل فریدی مجھے یقین ہے بھیانک بزدل کا خفیہ اڈا ہوٹل آرلکچو کے نیچے کسی تہہ خانے میں موجود ہوگا تم آج رات ہوٹل آرلکچو میں ایک عرب شیخ کے میک اپ میں جاؤ عمران تمہارے سکریٹری کے بھیس میں ہوگا حمید اور قاسم دولت مند شرابی گاہکوں کے بھیس میں ہوں گے وہ شراب نوش کرتے ہوئے تم دونوں پر نظر رکھیں گے۔ تم ہوٹل منیجر سے لڑکی طلب کروگے مجھے یقین ہے وہ تمہیں اپنے خفیہ عیاشی گاہ تک ضرور لے جائے گا۔ ممکن ہے وہاں تمہاری ملاقات بھیانک بزدل سے ہوجائے اس کے بعد بھیانک بزدل پر تم کیسے قابو پاؤ گے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ایسے موقعوں پر تم اپنی عقل اور ذہانت کے بل بوتے پر ایسے ایسے خطرناک مجرموں کو گرفتار کر چکے ہو جن کو پولیس فورس کے کئی دستے قابو میں نہیں کر سکے تھے"۔ "پوری اُمید رکھیئے ڈی۔آئی۔جی صاحب میں بھیانک بزدل کو جلد ہی گرفتار کرلوں گا۔ کیوں کہ بھیانک بزدل جیسے خطرناک مجرموں کو پکڑنا میرے لیے بکری کا بچہ پکڑنے کے برابر ہے" ڈی۔آئی۔جی کو یقین دلانے کے بعد فریدی ایک کانسٹبل کے انداز میں وہاں پر موجود لوگوں کو سیلوٹ کرکے آفس کے باہر آیا۔ باہر عمران چپراسی کے قریب بیڑی پیتا ہوا ملک میں بڑھتی ہوئی گرانی پر تبصرہ کررہا تھا۔ کرنل فریدی کے آتے ہی اس نے بیڑی بجھائی اور بجھی ہوئی بیڑی کا ٹکڑا جیب میں ڈال کر کھڑا ہوگیا پھر دونوں وہاں سے چلے گئے۔

ہوٹل آرلکچو کی رات : ہوٹل آرلکچو کے گاہکوں کی مستیاں اپنے شباب پر تھیں ہر طرف شراب اور شباب کا دور دورہ تھا ہوٹل کے سنٹرل ہال میں چاروں طرف رنگ برنگی لائٹ کے دائرے تیر رہے تھے آرکسٹرا کی دھن پر نیم برہنہ رقاصہ متحرک رہی تھی تمام گاہکوں کی ہوس بھری نظریں رقاصہ کے سڈول جسم پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ٹیبل پر کرنل فریدی اور عمران بیٹھے ہوئے تھے کرنل فریدی ایک رئیس عرب شیخ کے لباس میں تھا اور عمران کرنل فریدی کا سکریٹری بنا ہوا تھا اُن سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیبل پر حمید اور قاسم شراب کے جام حلق میں اتارتے ہوئے رقاصہ کے جسم کو اس طرح تک رہے تھے جس طرح کتا قصاب کی دوکان پر . . . . لٹکے ہوئے گوشت کو تکتا ہے۔ عمران نے ہوٹل منیجر کو اشارے سے بلاکر اس کے کان میں کہا "ہمارے شیخ دوارن فاتح دد

بولا "ان کو لڑکی چاہیے لڑکی" منیجر اپنے ساتھ . . . . عمران اور فریدی کو مختلف راستوں اور راہداریوں سے گزارتے
ہوئے زمین دوز ہوٹل میں لے گیا۔ کرنل فریدی اور عمران انڈرگراونڈ ہوٹل کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہاں پر غیر ملکی شہر کے
بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار شراب پیتے ہوئے برہنہ لڑکیوں کے جسموں سے کھلے عام کھیل رہے تھے۔ ایک طرف
شراب تیار ہو رہی تھی دوسری طرف افیون گانجہ اور چرس کے پاکٹ تیار ہو رہے تھے ایک طرف شکر کے گودام تھے
جن میں شکر کے ہزاروں بوری موجود تھے۔ کرنل فریدی اور عمران حیرت سے اُن چیزوں کو دیکھ رہے تھے کہ ایک نقاب
پوش آدمی اُن کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور قہقہے لگانے لگا۔ جب وہ خوب ہنس چکا تو بولا "کرنل فریدی میں ہی
بھیانک بزدل ہوں مجھے یقین تھا تم میری تلاش میں ایک دن یہاں ضرور آؤ گے آخر تم چوہے کی طرح میرے پنجرے
میں پھنس ہی گئے۔ آج میں تمہیں اور تمہارے ساتھی کو اس طرح ختم کروں گا کہ تمہاری لاشوں تک کا پتہ تمہارے
ڈی۔ آئی۔ جی کھنہ کو نہیں چلے گا" ابھی بھیانک بزدل کی بات جاری ہی تھی کہ اچانک انڈرگراونڈ ہوٹل کی لائٹ آف
ہوگئی۔ . . کیوں کہ حمید اور قاسم پروگرام کے مطابق مین سوئچ آف کر چکے تھے۔ تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے
کرنل فریدی نے بھیانک بزدل کی کنپٹی پر اپنا پستول رکھ دیا پھر لائٹ آن ہوگئی عمران نے آگے بڑھ کر بھیانک بزدل
کے چہرے پر سے نقاب ہٹایا تو کرنل فریدی اور عمران کے منہ سے چیخ نکل پڑی کیوں کہ بھیانک بزدل دراصل
شہر کا . . . سب سے بڑا رئیس سیٹھ گردھاری لال کوڑی مل تھا جس کے کئی کارخانے اور کپڑے کی ملیں تھیں
جس کا شہر میں بڑا نام تھا اور اس کے تعلقات سرکاری محکمہ کے تمام کلاس ون آفسروں اور منتریوں سے
تھے۔ کرنل فریدی بولا "سیٹھ کوڑی مل جی! اب تمہارا کھیل ختم ہوگیا ہے کیوں کہ میرے ایک اشارے پر پولیس
کے دستے اندر گھس پڑیں گے اور تم اپنے تمام کالے کرتوتوں کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑے جاؤ گے تمہیں
سمگلنگ ناجائز شراب سازی اور بے گناہ انسانوں کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ضرور ملے گی۔"
سیٹھ کوڑی مل جی تھر تھر کانپتے ہوئے کرنل فریدی کے کان میں کچھ کہتا ہے وہی بات کرنل فریدی عمران کے کان
میں کہتا ہے پھر دونوں سیٹھ کوڑی مل کو ہوٹل کے خفیہ راستے سے باہر بھگا کر ہوٹل میں بم پھینک کر باہر آتے
ہیں کرنل فریدی کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جس میں نوٹوں کی گڈیاں بھری تھیں۔ ہوٹل کے باہر نکلتے ہی عمران
ایک پولیس انسپکٹر کو اشارے سے بلا کر حکم دیتا ہے کہ وہ فوراً کرنل فریدی کو گرفتار کرلے۔ انسپکٹر فوراً
کرنل فریدی کے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دیتا ہے۔ کرنل فریدی حیرت سے عمران کی طرف دیکھنے لگتا ہے عمران
اپنے چہرے پر سے وگ نکالتا ہے اصلی چہرہ جب کرنل فریدی کے سامنے آتا ہے تو کرنل فریدی کی آنکھیں
حیرت سے پھٹ جاتی ہیں کیوں کہ نقلی عمران دراصل انسپکٹر جگدیش تھا۔ انسپکٹر جگدیش بولا "کرنل فریدی
تمہارا ساتھی عمران اس وقت ڈی۔ آئی۔ جی کھنہ کے پاس بیٹھا ہوا ہے . . . حمید اپنے فرض سے لاپرواہی اور
عیاشی کے جرم میں جیل میں بند کردیا گیا ہے کیوں کہ وہ قاسم کے ساتھ ہوٹل میں برہنہ رقاصہ کے جسم سے کھیل
رہا تھا۔

صبح کرنل فریدی اور عمران کو ہتھکڑیاں پہنا کر کمشنر آفس لایا گیا۔ کمشنر آفس میں ڈی آئی جی

کمشنر آفس : کھنہ کے علاوہ ایس۔ پی اور ڈپٹی کمشنر بھی موجود تھے ڈی۔ آئی۔ جی کھنہ کرنل فریدی پر
حقارت کی نظر ڈال کر بولے "کرنل فریدی مجھے شک تھا کہ تم غدار ہو کیونکہ تم نے ٹیکم گڑھ کی مہم میں بھی اصل

مجرم سے رشوت لے کر اس کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا مگر ہمارے پاس ثبوت نہیں تھا جس کی بنیاد پر تمہیں گرفتار کر لیا جاتا اس لیے ہم لوگوں نے انسپکٹر جگدیش کی موت کی خبر سُنا کر تمہیں بھیانک بزدل کو گرفتار کرنے کے لیے مقرر کر دیا اُسی دن سے انسپکٹر جگدیش عمران کے حلیہ میں تمہاری ہر حرکت کی انفارمیشن ہمیں دے رہا تھا۔ کرنل فریدی تم نے دولت کے لالچ میں اپنے فرض کو بھول کر ایک خطرناک مجرم کو فرار کر دیا تم نے یہ حرکت کر کے ابن صفی کے تخلیق کردہ اس بہادر کرنل فریدی کو بدنام کر دیا جو کروڑوں روپیہ کو ٹھوکر مار کر مجرموں کو جیل کی سلاخوں میں بند کیا کرتا تھا۔ ڈی۔آئی۔جی کھنہ کی بات پوری ہوتی تو کرنل فریدی عمران کیپٹن حمید اور قاسم کی گردنیں شرم سے جھک گئی تھیں۔!

▲▲

محمد بدیع الزماں
(پھلواری شریف۔ پٹنہ)

طنز و مزاح کے چند زرّیں اقوال

دنیا کی ہر زبان میں "زرّیں اقوال" کا مجموعہ بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ کم از کم انگریزی زبان
ے ایسے مجموعے اس ملک میں عام طور پر بہتوں کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ ہندوستان کے رسالے، خواہ وہ کسی
بان کے ہوں، اکثر مضمون کے آخر میں خوبصورت لکیروں کے درمیان بہت سارے اقوال "زرّیں اقوال" کے عنوان
سے شائع کرتے ہیں۔ یہ اقوال مختصر تو ہوتے ہیں مگر ذہن پر بہت دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس موضوع پر ایک
مضمون پڑھنے یا کئی گھنٹوں کی تقریر سُننے کے بعد بھی ایسا تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ زیادہ تر واعظانہ اور حکیمانہ
وال ہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ "ریڈرس ڈائجسٹ" کے انڈین ایڈیشن میں بھی ہر مضمون کے آخر میں ایسے زرّیں الفاظ ترچھے
ون چھاپے اور حروف میں شائع کئے جاتے ہیں تاکہ قاری کی نظر اس پر ضرور مرکوز ہو۔ یہ اقوال چند لمحوں کے لیے
یں، چند لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ہر انسان کو خیر و شر کی پرکھ اور اپنی اپنی زندگیوں کو مُثبت راہوں کی طرف لے چلنے کی
وتِ غور و فکر دیتے ہیں اس لیے کہ ایسے اقوال کسی کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر نہیں نکلتے بلکہ بہت گہرے
ر وسیع مشاہدے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

نہیں معلوم کیوں اُردو طنز و مزاح نگاروں کے "زرّیں اقوال" اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں کئے گئے حالانکہ
نز ایک طرح کی تنقید ہے۔ شدید، تیز اور بے دردانہ قسم کی تنقید۔ یہ ایک قسم کی عمل جراحی بھی ہے جس میں ہر چیز کے
ے پہلو کو شدت، تیزی، بے دردی اور تلخی سے اس لیے نمایاں کیا جاتا ہے کہ یہ اچھے اور بڑے مقصد کے لیے ہوتی
ہے اور مقصد ہی کی وجہ سے طنز کی تلخی گوارہ بھی کر لی جاتی ہے۔ طنز ظرافت سے الگ چیز ضرور ہے مگر طنز اپنے مقصد
یں اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو پاتا جب تک طنز کے اچھے تیر لگنے پر بھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نہ آجائے ورنہ
SERMON ON THE MOUNT ہی کہا جاتا۔ اگرچہ طنز و مزاح کے "زرّیں اقوال" کا اندازِ بیان واعظانہ
حکیمانہ نہیں مگر مقصد دونوں کا ایک ہے۔ فرق صرف، نوعیت کے لحاظ سے اندازِ بیان کا ہے۔ اور صداقت
ا پہلو دونوں میں نتیجہ کے طور پر مُشترک ہے۔

تو آیئے طنز اور مزاح کے چند زرّیں اقوال سے لُطف لیں اور دیکھیں کہ ان طنز و مزاح نگاروں کے ترکش

سے نکلے کتنے تیروں نے ہماری اپنی ذات، سماج، ملک اور عالمی برادری پر کس طرح وار کیا ہے؟

پنڈت رتن ناتھ سرشار : "ہندوستان کی شادی جیسے گڑیا گڈے کا بیاہ۔ اے سبحان اللہ۔ دلہن جالندھر میں دولہا پشاور میں اور جوڑی بھڑ گئی۔ مرد مکارم نگر میں، عورت الوپ شہر میں اور نکاح ہوگیا ع
خانۂ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

دلہن بیچاری کی کیا طاقت کہ زبان تو ہلا سکے۔ راضی برضا۔ ماں باپ نے جس کے ہاتھ چاہا بیاہ دیا۔ جس کنوئیں میں چاہا دھکیل دیا۔ یا حضرت! ذرا غور تو کیجیے شادی ہے یا رنج و الم کی خانہ آبادی۔ دُلھا دلہن کی رضا مندی مقدم ہے۔ یہ نہیں کہ والدین نے چاہا جس کے کھونٹے میں باندھ دیا۔ روز رنج و الم کی افزائش، تمام عمر کی کاہش، بات بات میں تکرار۔ آئے دن بیزار۔ ایسی شادی پر خدا کی سنوار"۔ ("اودھ پنچ"۔ ۱۲ مارچ ۱۸۷۸ء)

مولانا محمد علی جوہر : "انگریز حدیث نبوی کا یہ ٹکڑہ تو سیکھ گئے ہیں کہ امامت قریش میں ہے، لیکن اسے بھول گئے کہ اذان حبشہ میں ہے"۔ ("۳ دسمبر ۱۹۲۵ء کو "مصر و سوڈان" کے مسئلہ پر دہلی میں تقریر")۔ "صورت حالات کا عذر ایک بہت ہی اچھا بھینٹ کا بکرا ہے، جو تمام گناہوں کا کفارہ ہوجایا کرتا ہے۔ یہ جملہ دراصل ہماری کمزوریوں کا ایک خوشنما طرز بیان ہے"۔ ("ہمدرد"۔ دہلی۔ ۹ فروری ۱۹۲۸ء) "ایک کالی کھال کے انسان کے لیے اگر یہ ممکن نہیں کہ گوری کھال میں گم ہوجائے تو کم از کم اتنا تو کرے کہ گوری کھال والوں کے کپڑوں ہی کے اندر گھس جائے"۔ ("ہمدرد"۔ دہلی۔ ۹ فروری ۱۹۲۸ء) ــــ "نیند کے متوالے وہ لوگ ہیں جو پیر پرستی سے تو بیزار ہیں مگر بادشاہ پرستی کے نشہ میں سرشار ہیں۔ جو قبر پرستی پر لعن طعن کیا کرتے ہیں، مگر قیصر پرستی کے لیے قصائد لکھتے ہیں"۔ ("ہمدرد"۔ دہلی۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء) ــــ "وہ (انگریز) کب کہتے ہیں کہ ہم میں انسانیت ہے؟ بہت زور دیا تو یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے، کہ ہم اولاد آدم ہی نہیں۔ ہم تو بقول ڈارون بندر کی اولاد ہیں"۔ ("ہمدرد"۔ دہلی ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء)۔ "لوگوں کو وہ اخبارات پسند ہیں، جن کا اصول صحافت یہ ہے کہ "ایک پیسہ لوں گا، ایک گالی دوں گا"! یا جن کی آمدنی کا ذریعہ اُن کے گندے اشتہارات ہیں، جن کے پڑھنے ہی سے نہیں بلکہ چھاپنے سے بھی "بہتوں کا بھلا" ہوتا رہتا ہے"۔

رشید احمد صدیقی : "جو لوگ اپنی زندگی اور موت کا پروگرام بنا کر جینا شروع کرتے ہیں وہ عموماً غبی ہوتے ہیں یا اپنی بیویوں پر فخر کرتے ہیں۔ ذہین بیویاں ہمیشہ غبی شوہروں پر فخر کرتی ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ کوئی بیوی آج تک غبی نہیں دیکھی گئی"۔ ("جینے کا سلیقہ")۔ "جب والدین بوڑھے اور اولاد جوان ہوجائے تو والدین کو میدان چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ میدان چاہے خاندان کا ہو چاہے علم و ادب کا، چاہے حکمت و فن کا چاہے اخلاق و مذہب کا۔ بوڑھوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نوجوانوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا تو دُنیا تباہ ہوجائے گی"۔ ("جینے کا سلیقہ")۔ "عاشقی اور فاقہ کشی سے بڑھ کر افزائش نسل کا اور کوئی تیر بہدف نسخہ اشتہاری عطائیوں سے بھی تصنیف نہ ہوسکا۔ فاقہ کشی میں عاشقی اور عبادت کا ایک خاص مقام ہے"۔ ("حق آفریں۔ مرحبا مرحبا") ــــ "اردو تنقید کے جتنے نظریئے کتابوں اور نقاد بازاروں میں ہیں، اُردو میں اُتنے شاعر اور لکھنے والے بھی ہیں یا نہیں آج کل جتنی دوائیں دریافت کی جاچکی ہیں اتنے امراض بھی دریافت کئے جاسکیں گے یا نہیں"۔ ("آج کل کے نقاد") ــــ "اردو میں اور کچھ ہوا یا نہیں عاشقی یا شاعری اس دھوم دھام سے ہوئی ہے کہ بس انقلاب زندہ باد! جس کا بنا ہے ترجمہ "اللہ دے اور بندہ لے" ہے"۔ ("حق آفریں۔ مرحبا مرحبا") "ہندوستان میں جوانی کا انجام دو طریقوں

سے ہوتا ہے، اکثر شفاخانہ میں ورنہ جیل خانہ میں"۔۔۔ "عشاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے"۔۔۔ "انگریزوں کو آئی۔ سی۔ ایس نے خراب کیا، اور عشاق کو شعرا نے"۔۔۔ "جس طرح عدالت کی کمزوری گواہ ہے، اُسی طرح برطانیہ کی کمزوری آئی۔ سی۔ ایس"۔۔۔ "ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے، جو کنگارو کو اپنے بچہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طرح کنگارو کا بچّہ خطرہ کی آہٹ پاکر ماں کی جھونجھ میں بیٹھ جاتا ہے، اُسی طرح ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی پناہ کو ڈھونڈنے میں نہایت آزاد اور کامیاب ہوتا ہے"۔۔۔ "میں احمق نہیں ہوں۔ اِس لیے کہ چندہ دیتا ہوں، خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں۔ ہال میں رقص کرتا ہوں۔"

کنہیا لال کپور : "اپنے وطن میں فحش اشتہارات۔ جو دیواروں پر، درختوں کے تنوں کے ساتھ نوٹس بورڈوں پر جلی قلم میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، کو پڑھ کر ایک غیر ملک کا باشندہ یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ ہندوستان کا بچّہ بچّہ جنسی امراض میں مبتلا ہے"۔ ("اپنے دیس میں سب کچھ ہے پیارے"!)۔۔۔ "فلمی شاعر ادبی شاعر سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ادبی شاعر گیت کہتا ہے۔ فلمی شاعر گیت لکھتا ہے بلکہ اکثر ٹھوکتا ہے۔ جس طرح لوگ دیوار میں کیل ٹھوکتے ہیں"۔ ("فلمی قاعدہ")۔۔۔ "ٹیگور، اقبال، کوہ ہمالیہ اور تاج محل کے علاوہ اپنے وطن میں بہت سی ہستیاں اور اشیاء قابلِ ستائش ہیں۔ مثلاً مچھر، شاعر، عشاق۔ یہ تو وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اپنے وطن میں مچھر زیادہ ہیں یا شاعر۔ مگر بہر حال دونوں کافی تعداد میں ہیں"۔ ("اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"!)

۔۔۔ "آج کل بچّے پیدا ہوکر ڈیڈی بعد میں کہتے ہیں۔ دلیپ کمار کہنا پہلے سیکھ جاتے ہیں۔ ماں کا لفظ زبان پر بعد میں آتا ہے مینا کماری سب سے پہلے آجاتا ہے اور بہت آسانی سے! جو حال گھر کا ہے۔ وہی اسکول کا ہے۔ ایک دفعہ اسکول میں میں نے پوچھا:۔ "بچّو، مشہور مغل بادشاہوں کے نام کیا؟" بولے: "مغلِ اعظم، پکار اور کے آصف" ("فلمی قاعدہ")

۔۔۔ "آج کل شہروں میں گیدڑوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔ اور گیدڑ تو سدا سے کام چور ہے۔ اس لیے شہر کو بھاگتا ہے"۔ ("گیدڑ کی تلاش")۔۔۔ "زندگی دراصل ایک بے رحم غنڈا ہے جو شرفا کا روزِ ازل سے پیچھا کرتی ہے"۔

مشتاق احمد یوسفی : "فاضل مقدمہ نگار کا ایک پیغمبرانہ فرض یہ بھی ہے کہ وہ دلائل و مظاہر سے ثابت کرے کہ اس کتاب مستطاب کے طلوع ہونے کے قبل، ادب کا نقشہ مسدس حالی کے عرب جیسا تھا ؎

"ادب" جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ ایک جزیرہ نما تھا"۔ ("پہلا پتھر")۔۔۔

"حسن اور جوانی سے بہرہ یاب ہونے کا سلیقہ بھی کچھ کچھ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب واہ ایک گہری آہ اور آہ ایک لمبی کراہ میں بدل چکی ہوتی ہے"۔ ("یادش بخیر")۔۔۔ "اپنا مقدمہ بقلم خود لکھنا کارِ ثواب ہے کہ اس طرح دوسرے جھوٹ بولنے سے بچ جاتے ہیں"۔ ("پہلا پتھر")۔۔۔ "بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کی ترتیب کا حساب اپنی یادگار زچگیوں سے لگاتی ہیں"۔ ("پڑیئے گر بیمار")۔۔۔ "ہمارے ہاں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اُسے ہنسنا اور کھانا (پکانا) آتا ہے۔ اس وجہ سے پچھلے سو برس سے یہ فن کوئی ترقی نہ کر سکے"۔ ("یادش بخیر")۔۔۔ "انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے"۔ ("پڑیئے گر بیمار")۔۔۔ "چار پائی ایک ایسی خود کفیل تہذیب کی آخری نشانی ہے جو نئے تقاضوں اور ضرورتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کی قائل نہ تھی"۔

(”چار پائی اور کلچر“)۔ ”جو شخص کبھی اپنے شہر کی بُرائی نہیں کرتا وہ یا تو غیر ملکی جاسوس ہے یا میونسپلٹی کا بڑا آفیسر!“ (”موسمِ کا شہر“)۔ ”گھوڑے اور عورت کی ذات کا اندازہ اُس کی لات اور بات سے کیا جاتا ہے . . . ذات و صفات کی بحث سے قطع نظر یہی کیا کم ہے کہ عورت صرف عورت ہے۔ ورنہ وہ مرد ہو جاتی تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے؟ (”صنفِ لاغر“)۔ ”پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے اُس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے۔“ (”تونے پی ہی نہیں“)۔ ”عقدِ ناگہانی کے بعد کہ جس سے کسی کو مفر نہیں، ہر لڑکی کا بیشتر وقت اپنے وزن اور شوہر سے جنگ کرنے میں گزرتا ہے۔“ (”صنفِ لاغر“)۔

غلام احمد فرقت کاکوروی: ”آپ اگر یہ سمجھتے ہوں کہ اردو اس جنم میں مر جائے گی تو آپ اُس کے دوسرے جنم سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟ ہماری حکومت ایک سیکولر اسٹیٹ ہے۔ ہم آواگون پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر خطرہ کس بات کا ہے۔ آواگون کا اصول ہے کہ اگر پہلے جنم میں کوئی بہت زیادہ تکلیفیں اُٹھاتا ہے تو دوسرے جنم میں وہ پہلے سے زیادہ بہتر شکل میں آتا ہے۔ اِس لیے کیا عجب ہے جو دوسرے جنم میں آپ کی اردو ہندی کی شکل میں آئے۔ جسے ماشاءاللہ ہر طرح کا سکون اور اطمینان حاصل ہے اور جس کی ترقی کے لیے ہماری سرکار ہر سال لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف کرتی ہے۔“ (”خط بنام خوشتر گرامی“ ”بیسویں صدی“ دہلی۔ اپریل ۱۹۷۰ء)۔ ”مجالسِ قانون ساز کی ممبری اب ایک بزنس رہ گئی ہے۔ دس لگاؤ بیس پاؤ!“ (”خط بنام خوشتر گرامی“ ”بیسویں صدی“ دہلی، جون ۱۹۷۰ء)۔ ”ملک کو آزاد ہوئے پچیس سال ہو چکے ہیں . . . سیاسی سوجھ بوجھ کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ملک میں اس وقت چالیس سیاسی جماعتیں ہیں جنھوں نے اپنے لائحہ عمل میں چالیس جُدا جُدا پنجسالہ منصوبے شامل کر رکھے ہیں۔“ (”پچیس سال بعد“)

فکر تونسوی: ”ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کا اپنا کوئی کیریکٹر نہیں ہے۔ چوروں کی طرح اُن کے پاس صرف نیشنل کیریکٹر ہے۔ جسے ثابت کرنے کے لیے وہ سارے ملک میں گھومتے رہتے ہیں۔“ (”میری بھارت یاترا“)۔ ”چین میں اضافہ آبادی کی تشویش ناک صورتِ حالات کے پیشِ نظر . . . شادی کی عمر بڑھا کر پچاس سال کر دی جائے۔ عورتوں کے معاملہ میں ایک سال کی رعایت یعنی ۴۹ سال۔“ (”افواہیں“) ——— ”میں نے ہندوستانی سیاحت کے بعد کچھ اور نتیجے بھی نکالے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان دُنیا کے نقشے پر قائم رہے گا کیوں کہ دوسرے ممالک بھی اِس نقشے پر قائم چلے آ رہے ہیں۔ اِس لیے جب تک یہ دُنیا نیست و نابود نہ ہو جائے گی اُس وقت تک ہندوستان نیست و نابود نہیں ہو سکتا۔ اس خیال کو لے کر ایک ہندوستانی شہری نے بڑے فخر سے کہا تھا ؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری ÷ صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے ÷ باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا

ان اشعار میں شاعر نے صرف دو جھوٹ بولے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس ملک کا کوئی دشمن نہیں رہا ہے۔ صرف ہندوستانی ہی ہندوستان کے دشمن رہے ہیں اور دوسرا جھوٹ یہ ہے کہ یونان کی ریاستیں اور مصر اور روم آج بھی دُنیا میں موجود ہیں . . . ہندوستانی شاعر جھوٹ بولنے کو شاعری کی ایک خاص صفت سمجھتا ہے اور تاریخ اور جغرافیہ سے لاعلمی کو وہ شاعرانہ مبالغے میں چھپا لیتے ہیں۔“ (”میری بھارت یاترا“) ——— ”ہندوستان میں . . .

بجلے مکانات بنائے جاتے ہیں، اُن سے دُگنے بچے ہوجاتے ہیں۔ ۔ ۔ اب بڑے بڑے دیہی اور گھنے جنگلات کو صاف کرایا جائے اور وہاں انسانوں کو آباد کرایا جائے"۔ ("افواہیں")۔

شوکت تھانوی: شوہر بھی ایسے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر آپ اُن سے قیامت خیز میدانی گرمی کا ذکر کریں تو وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوتے کہیں گے کہ "جی ہاں گرمی تو بے شک ہے مگر یہی کیا کم ہے کہ بیوی نہیں ہے (مری گئی ہوئی ہے)۔ چنانچہ محسوس یہ ہو رہا ہے جیسے انگریز چلا گیا ہو اور آزادی مل گئی ہو"۔ ("تہپاڑ تلے") "آرام کرسی خواہ مخواہ بڑا آدمی بنا دیتی ہے۔ ۔ ۔ خدا نے آرام کرسی کو عجیب شرف بخشا ہے کہ خود تو خیر سب کرسیوں سے ممتاز ہوتی ہے لیکن اس پر بیٹھنے والا بھی صدر منتخب نظر آنے لگتا ہے"۔ ("آرام کرسی") — "شادی کے بعد سسرال میں پڑے رہئیے تاکہ کچھ عرصہ کے بعد میکے کی لفظ ہو سکے۔ آج کا کام کل پر ٹالئے اس لیے کہ ممکن ہے کہ کل کا کام پرسوں پر ٹل جائے۔ دوسروں کی بیوی کو اپنی والدہ سمجھیئے تاکہ آپ کی بیوی کو بھی لوگ والدہ سمجھیں"۔ ("اقوال مولانا سریخ") — "جو عورت پیدا ہو کر مرد بننے کے ارمان میں گھلی جاتی ہے۔ ۔ ۔ وہ اپنی جنس کو ایسا معمہ بنائے پھرتی ہے جو نہ سمجھنے کا ہو نہ سمجھانے کا"۔ ("تہپاڑ تلے") — "جینے کا مزہ علی الحساب جینے میں ہے۔ یہ نہیں کہ ہر سال بیٹھے حساب لگا رہے ہیں کہ لیجئے زندگی کا ایک سال اور کم ہوا اور موت ایک سال اور قریب آگئی۔ رہ گئی دوسروں کی سالگرہ، اس کا میں۔ ۔ ۔ اس لیے مخالف ہوں کہ نام ہوتا ہے پارٹی میں جانے کا اور دینا پڑتا ہے وہاں تحفہ۔ پھر تحفہ کے سلسلے میں یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اپنا تحفہ اتنا حقیر نہ ہو کہ دوسروں کے تحفے دیکھ کر خودکشی کو جی چاہنے لگے"۔ ("نمک مرچ") — "ہندوستان میں جیسی اچھی پیداوار وکیلوں کی ہو رہی ہے اگر اتنا ہی غلّہ پیدا ہوتا تو کوئی فاقے نہیں کرتا۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ غلّہ پیدا ہوتا ہے کم اور وکیلوں کی فصل ہوتی اچھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہی سب غلّہ کھا جاتے ہیں"۔ ("وکیل کل کیا ہوگا؟")

علی عباس حسینی: "شطرنج بھی عجیب کھیل ہے۔ ۔ ۔ اس کھیل کے لیے — برعکس نہند نام زنگی کافور! ایک ہوشیار سالار کی سوجھ بوجھ چاہیئے، ایک پُر تدبیر مُدبّر کی ذہانت اور ایک خشک مُفکّر کا دماغ۔ ۔ ۔ شطرنج میں وہ پُختہ بھیجا کھپایا جاتا ہے جو کم از کم چالیس برساتیں کھا چکا ہو اور اس سے سوگنی دھوپ میں سوکھ کر شاخِ مرجاں بن گیا ہو"۔ ("شطرنج باز") — "فلش اور برج ایسے نوجوانوں کا کھیل ہے جن کی جیبیں بھاری ہوں اور جن کے باپ کی تجوری بھری پڑی ہو"۔ ("شطرنج باز")

یوسف ناظم: "غربت لاعلاج مرض ہے۔ اس مرض کا علاج کرنے والے ڈاکٹر اپنی غربت دور کر کے سمجھتے ہیں سب کا بھلا ہوگا"۔

"بیت المال میں سب سے بڑا حصّہ اس شخص کا ہوتا ہے جو اول خویش بعد درویش کا سبق بھولا نہ ہو"۔

— "بمبئی میں ان لوگوں کو پسند نہیں کیا جاتا جو سڑک پر چلتے وقت کوئی چیز نہ کھاتے ہوں۔ یہاں سڑک پر چلتے وقت ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا چاہیئے۔ آدمی معزز دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ لوگ سمجھتے ہیں یہ شخص فاقہ کشی میں مبتلا ہے"۔

"سُر اور تال پر ناچنے کی قید تو زمانہ ہوا برخاست ہوگئی کیوں کہ رقاص اگر سُر اور تال سے منحرف ہے تو رقص رقص نہیں رہتا، پیروڈی کی شکل اختیار کر لیتا ہے"۔

مجتبیٰ حسین: "جب ریس کا سیزن آتا ہے تو اچھا خاصا آدمی بے لگام ہو جاتا ہے"۔ ("دوڑ ایسے گھوڑے نے ہم")

"فساد کے لیے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا ضروری ہے۔ ان دونوں کے اتحاد کے بغیر فساد ہو ہی نہیں سکتا"
(سنڈے ایڈیشن کا مخول)

عطاء اللہ شاہ بخاری پطرس :- "کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے" (کتے)

محمد جمال پاشا :- "اکثر حضرات نہایت اعلیٰ درجہ کی دعوت میں مدعو کر کے، نیکی کر اور دریا میں ڈال کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے آخر میں ہاتھ دھلواتے دھلواتے، جیب سے بیاض نکال کر بلا گھڑی یا مہمان کا چہرہ دیکھے اپنا کلام سنانا شروع کرتے ہیں۔" (ناپسندیدہ لوگ)

خواجہ عبدالغفور :- "بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں کے رہنے والے سمجھتے ہیں کہ جب وہ اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو ان میں سے جو گنہگار اور بدکار ہیں وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت میں جاتے ہیں اور جو نیک اور اچھے لوگ ہیں وہ مرنے پر بھی اسی بمبئی میں رہنا پسند کرتے ہیں کہ ان کو یہ جنت سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے۔" (بمبئی کی بارش)

گوپال متل :- "مولوی عبدالحق نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست سے کہا تھا: "میں مارچ یا اگست میں مرنا پسند کروں گا۔ جنوری میں مولانا محمد علی جوہر کا انتقال ہوا تھا۔ فروری میں غالب بیٹھا ہے۔ اپریل میں اقبال نے وفات پائی۔ مئی، جون، جولائی کی شدید گرمی میں مرنا حماقت ہے۔ ستمبر میں قائداعظم نے پردہ کیا۔ اکتوبر میں لیاقت علی خاں شہید ہو گئے۔ نومبر کے میٹھے جاڑے میں مرنا کور ذوقی ہوگا۔ دسمبر میں حالی چلا گیا۔ اس لیے میں تو مارچ یا اگست میں مروں گا۔" (مغفور مولوی عبدالحق)

جلد (۲۱) ○ شمارہ (۱۲)

سووینیر

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

کنوینر سووینیر کمیٹی : طالب خوندمیری

مجلسِ مشاورت

بھارت چند کھنہ ○ نریندر لوتھر ○ یوسف ناظم ○ مجتبیٰ حسین

مجلسِ ادارت

حمایت اللہ ○ محمد منظور احمد ○ مسیح انجم
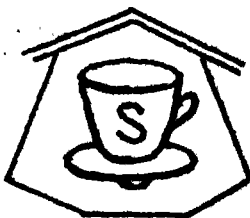
مینیجر اعزازی (بمبئی) فیاض احمد فیضی

سرورق : طالب خوندمیری

کتابت : رؤف خوشنویس

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

فی پرچہ : ۶ روپے ★ زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

بیرونِ ہند سے : (۱۵۰) روپے

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ؛ ۳۱ ـ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱

زندہ دلان حیدرآباد

صدر: جناب نریندر لوتھر
نائب صدر: جناب رشید قریشی
جناب حمایت اللہ
معتمد عمومی: جناب مصطفیٰ علی بیگ
نائب معتمد: جناب بوگس حیدرآبادی
جناب احمد سلطان
اراکین: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
جناب طالب خوندمیری
جناب مسیح انجم
ڈاکٹر حبیب ضیاء
جناب رشید الدین
جناب اسلم فرشوری
جناب یوسف شریف

سالانہ تقاریب

۲۴، ۲۵، ۲۶ نومبر ۱۹۸۸ء
ادبی اجلاس ۲۴ نومبر ۸۸ء گاندھی بھون

صدارت: جناب مجتبیٰ حسین
مضامین: جناب یوسف ناظم
جناب نریندر لوتھر
جناب دلیپ سنگھ
جناب مسیح انجم
جناب پرویز یداللہ مہدی
جناب فیاض احمد فیضی
محترمہ حلیمہ [illegible]
جناب [illegible]
نظامت: جناب یوسف ناظم

محفل لطیفہ

۲۵ نومبر ۸۸ء گاندھی بھون

صدارت: جناب دلیپ سنگھ
لطیفہ گو: نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین
رشید قریشی، مصطفیٰ علی بیگ
حمایت اللہ، محمد سلیمان
موہن پرشاد، طالب خوندمیری
اظہر افسر، رجا سیٹھ
عرفان خوندمیری، ڈاکٹر بیگ احساس
اسلم فرشوری، افشاں جبین
کلیم صدیقی، حامد کمال
منور علی مختصر، دولت رام
بے بی فاریہ سعود، شبیر خاں
کنونیر: ذہانت علی بیگ

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

۲۶ نومبر ۸۸ء نمائش میدان

صدارت: جناب شاہ عالم خاں صاحب
صدر نشین انوار العلوم کالج

شعرائے کرام:-
کشن لال خنداں (دہلی)، پاپولر میرٹھی
شاغر خیامی (دہلی)، خواہ مخواہ (بمبئی)
تنگ عنایت پوری (بہار)، مختار یوسفی (مالیگاؤں)
پاگل عادل آبادی، بیلن نظام آبادی
سراج نرملی، حمایت اللہ، اسمٰعیل ظریف
طالب خوندمیری، سرپٹ حیدرآبادی
مصطفیٰ علی بیگ، احمد سلطان
اشرف خوندمیری، صبغت اللہ بیباک
رشید عبدالسمیع جلیل، اقبال ہاشمی
ان پڑھ بھونگیری، رؤف رحیم
معین امر بمبو، مفلس قاروقی (اکولہ)
کنونیر مشاعرہ:-
بوگس حیدرآبادی۔

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

نواب شاہ عالم خاں صاحب
صدر کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

جناب نریندر لوتھر
صدر زندہ دلانِ حیدرآباد

جناب مجتبیٰ حسین
صدر ادبی اجلاس

جناب یوسف ناظم

جناب دلیپ سنگھ
صدر محفل لطیفہ

عہدہ داران زندہ دلانِ حیدرآباد

جناب رشید قریشی
نائب صدر

جناب حمایت اللہ
نائب صدر

جناب محمد سلیمان
خازن

جناب مصطفیٰ علی بیگ
معتمد عمومی

جناب احمد سلطان
نائب معتمد

جناب بوگس حیدرآبادی
نائب معتمد

جناب وہاب قیصر
کنوینر تنظیمی کمیٹی

جناب صلاح الدین نیرؔ
کنوینر پروگرام کمیٹی

جناب طالب خوندمیری
کنوینر سوونیر کمیٹی

جناب محمد منظور احمد
رکن مجلسِ ادارت شگوفہ

جناب مسیح انجم
رکن مجلس ادارت شگوفہ

ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
کنوینر انتظامی کمیٹی

جناب ذہانت علی بیگ
کنوینر محفل لطیفہ

محترمہ قمر جمالی
کنوینر خواتین کمیٹی

جناب سعادت علی خاں
کنوینر ڈائس کمیٹی

جناب ان پڑھ بھونگیری
کنوینر پبلسٹی کمیٹی

ڈاکٹر حبیب ضیاء
رکن

خواہ مخواہ (بمبئی)

جناب اسلم فرشوری
رکن

جناب یوسف شریف
رکن

فیاض احمد فیضی (بمبئی)

پاگل عادل آبادی

زندہ دلانِ حیدرآباد کا یادگار گروپ فوٹو ـــــــ ۱۹۷۲ء

دائیں سے بائیں: مصطفےٰ کمال، مجتبیٰ حسین، بھارت چند کھنہ، سلیمان خطیب مرحوم، برق آشیانوی مرحوم۔
ایستادہ: احسن علی مرزا مرحوم، مسیح انجم، مصطفیٰ علی بیگ، حمایت اللہ، حیدر صدیقی، ممتاز مرحوم

پرویز یداللہ مہدی

"لوگ بس پھنستے گئے اور مورچہ بنتا گیا"

غالباً اسکول کے نصاب میں آپ نے بھی وہ کہانی پڑھی ہوگی جس میں ایک ننھے سے چوزے کے سر پر پیپل کا پتہ گر پڑتا ہے اور وہ ہڑبڑا کر چیختا ہوا دوڑنے لگتا ہے: "بھاگو بھاگو! آسمان گر رہا ہے!"
چوزے کی ننھی سی جان کے حق میں پیپل کا حقیر پتہ واقعی آسمان کے ٹکڑے سے کم نہیں تھا ۔ برسوں پہلے پڑھی ہوئی یہ کہانی اس روز یک لخت یاد آگئی جب اپنے پڑوسی مسٹر کانچ والا کو سراسیمگی کے عالم میں بے تحاشا دوڑتے ہوئے دیکھا، وہ کہانی والے چوزے کی طرح نہ صرف سر پہ پاؤں رکھ کر دوڑ رہے تھے بلکہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہے تھے موصوف جیسے ہی نزدیک پہنچے ہم نے ان کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا: "کیا بات ہے بھئی؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ دفتر جانے کے لیے نکلے تھے اور اب اچانک واپس گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں وہ بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار، کیا ہوا! کہیں بلوا ہوگیا! دنگا فساد ہوگیا؟ قیامت آگئی! آخر ہوا کیا؟"
مسٹر کانچ والا کانچ کی طرح کھنکتے ہوئے بولے: "تم اپن کو کیا چھوکری لوگ کا مافک ڈرپوک سمجھتا ہے، ارے اپن تو سالا بہت ڈیرنگ باج ہے دنگے بلوے قیامت کسی سے بھی نئیں گھبراتا!"
ہم نے جھنجھلا کر پوچھا۔ "تو پھر ہوا کیا۔!"
بڑبڑا کر بولے۔ "بہت بڑا وبال ہو گیا سالا، مورچہ نکلا ہے بہت بڑا اکھا ٹریفک جام۔ آگے جانے کا کوئی چانس نئیں اس واسطے اپن ریورس گیر میں واپس لوٹتا ہے گھر کی طرف، ابھی اپن کا رستہ چھوڑو۔ چلو چلو۔"
یہ بات نہیں ہے کہ مورچے کا لفظ ہم نے پہلی بار بمبئی میں سنا ہو، اس لفظ سے ہمارے کان پہلے سے آشنا ضرور تھے البتہ اس کے "ساکشات" درشن یہیں ہوئے یوں بھی دوردرشن کے بور پروگراموں کی طرح مختلف قسم کے مورچے بمبئی کی شہری زندگی کا لازمی حصہ ہیں تاہم دوردرشن کے کسی واہیات پروگرام سے آپ اپنا پیچھا ٹی.وی کا سوئچ آف کرکے چھڑا سکتے ہیں لیکن مورچے میں پھنس جانے کے بعد آپ اس سے اپنا پنڈ اس وقت تک نہیں چھڑوا سکتے تاوقتیکہ خود مورچہ آپ کا پیچھا نہ چھوڑ دے اب آپ سے کیا چھپائیں ایک عدد مورچہ ہم اپنے تنِ ناتواں پر جھیل چکے ہیں، ہوا یوں کہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر کھڑے جوں کی رفتار سے رینگتے ہوئے مورچے کے گزرنے کا انتظار کر رہے تھے کہ سے گزرے تو ہم سڑک پار کریں لیکن مورچہ تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا چنانچہ بے چینی

اور اضطراب کے عالم میں جیسے ہی رواں دواں بھیڑ میں تھوڑا سا فاصلہ نظر آیا ہم سے حماقت سرزد ہوگئی اور سڑک پار کرنے کی کوشش میں مورچے میں جا پھنسے، یار لوگوں تے ہمیں اس طرح اپنے مضبوط گھیرے میں لے لیا جیسے فلمی سین میں ویلن کے گرگے بے بس دلا چار ہیروئن کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں، پھر کیا تھا ہمیں بھی مجبوراً زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے مورچے کا ساتھ دینا پڑا گویا بھنڈی بازار سے کالا گھوڑا، یک کہ اس زمانے میں یہی ہر مورچے کی آخری حد ہوا کرتی تھی، مذکورہ مورچہ دھوبی کے گدھے کی پیٹھ پر لدی میلے کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح ہماری پیٹھ پر سوار رہا حالانکہ کئی بار ہم نے رسیاں تڑانے کی کوشش کی لیکن کالا گھوڑا پہنچ کر ہی اس گدھے سے گلو خلاصی ہوئی۔
مورچے کی پانچ کلو میٹر لمبی قید و بند سے رہائی ملتے ہی ہم نے اپنی بغل میں کھڑے ہوئے مورچہ باز سے پوچھا۔ بھائی کم سے کم اس مورچے کی وجہِ تسمیہ تو بتا دیجئے کہ یہ کس خوشی میں نکلا ہے؟" جواب میں بھائی صاحب نے کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "بھائی جان آپ کا سوال بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک اندھا دوسرے اندھے سے راستہ پوچھ رہا ہے، میں کہاں اپنی خوشی سے مورچے میں شامل ہوا تھا، میں بھی آپ ہی کی طرح سڑک پار کرنے کی حماقت میں اس میں پھنس گیا تھا۔!
ہم اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ بمبئی میں آئے دن نکلنے والے مورچوں میں شامل جمِ غفیر کا بڑا حصہ ان غافلوں اور مجبوروں پر مشتمل ہوتا ہے جو سڑک پار کرنے کی حماقت میں غلطی سے مورچے میں پھنس جاتے ہیں، ورنہ سچ پوچھئے تو مورچے کا کھڑاگ صرف ایک ہی شخص پھیلاتا ہے جو کسی سیاسی نیم سیاسی پارٹی کا جھنڈا ہاتھوں میں لئے شہر کے تمام راستے بند کرنے، ٹریفک پر سکتہ طاری کرنے کی نیت سے اکیلا ہی نکل پڑتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مورچے کی غرض و غایت سے بے خبر لوگ جھونک میں آکر جوق در جوق اس میں آ پھنستے ہیں گویا بقول شاعر ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ بس پھنستے گئے اور مورچہ بنتا گیا

ایک عام آدمی کے لئے بمبئی میں رہ کر مورچوں کی زد سے محفوظ رہنا ایسا ہی ہے جیسے گڑ کھانا اور گلگلوں سے پرہیز کرنا یہاں کا ہر مورچہ گڑ اور گلگلے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کر کے گڑ گوبر دونوں کو ایک کر دیتا ہے۔ بمبئی میں ہر ہفتہ عشرہ کے دوران نکلنے والے مورچوں کا اگر سالانہ اوسط نکالا جائے تو اس شہر خرابی و خوبی میں سانس لینے والے ہر ستوا اشخاص کے حصے میں کم از کم ایک عدد مورچہ ضرور آئے گا۔ بمبئی کے بیشتر مورچوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے انعقاد کے لئے کسی خاص وجہ کسی ٹھوس جواز کی قطعی ضرورت نہیں، یہ سارا ہنگامہ محض اس لیے کھڑا کیا جاتا ہے کہ ؎

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت سے ملالیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

بمبئی میں عموماً مورچہ نکالنے سے پہلے دن اور تاریخ کا تعین کرلیا جاتا ہے پھر مورچہ نکالنے کی وجہ تلاش کی جاتی ہے چنانچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مورچہ نکالنے کی معقول وجہ ہاتھ نہیں لگتی اور مورچے کی طے شدہ تاریخ سر پر آجاتی ہے لہٰذا مورچہ پورے زور و شور کے ساتھ نکال دیا جاتا ہے محض اس لیے کہ اگر تاریخ ٹل گئی تو پھر اگلی تاریخ ملنے تک لوگوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائے گا گویا اس قسم کے مورچوں کا مقصد اپنے مسائل سامنے

رکھنا اپنی مانگیں منوانا نہیں ہوتا بلکہ صرف جوش و خروش کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔
مورچہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا جلیل القدر ہو یا قلیل القدر، نعرے بازی کے بغیر ادھورا بلکہ یتیم معلوم ہوتا ہے ویسے بھی جنازے کے جلوس اور مورچے میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے، اس کے علاوہ اپنے ملک کی مٹی اس قدر ریکنی ہے کہ مورچے میں جب تک فلک شگاف نعرے نہ لگائے جائیں ارباب اقتدار کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی چنانچہ مورچہ کمیٹی کے ممبران اس سلسلے میں اپنی اپنی پہنچ اور استطاعت کے مطابق مختلف گریڈ کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ایسے ایسے سماعت خراش، نعرے معرض وجود میں آتے ہیں جنھیں سُن کر عوام پر سستی اور خواص پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے البتہ کبھی کبھار کچھ نعرے بازیاں وقتی طور پر تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہیں مثال کے طور پر کالج کے طلباء کے ایک مورچے میں یہ لطیفہ بھی رونما ہوا جب کچھ پُر جوش طالبات نے اپنے مطالبات کی حمایت میں یہ نسوانی نعرہ لگایا "ہماری مانگیں"۔ تو کچھ شریر طالب علموں نے فوراً ٹکڑا لگایا۔ "سیندور سے بھر دو"
من جملہ دیگر خوبیوں کے مورچے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس پر کسی فردِ واحد یا کسی خاص جماعت کی اجارہ داری بالکل نہیں اُس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ہمارے ہاں سرمایہ داروں، بے کاروں، لاچاروں، ناداروں سے لے کر طوائفوں مخنثوں تک کو مورچے نکالنے کی آزادی میسر ہے تاہم جس مورچے پر عوام اور خواص دونوں کی رال ٹپکتی ہے وہ "فلمی مورچہ" ہے جو اپنی رنگارنگی کے باعث مورچہ کم اور "مورناچ" زیادہ معلوم ہوتا ہے فلمی مورچوں کے علاوہ بمبئی شہر میں جس مورچے کو تاریخی حیثیت حاصل ہے وہ "بیلن مورچہ" ہے۔ جو چند برس پیشتر نکلا تھا یہ ایک ساتھ کئی خصوصیتوں کا حامل تھا ایک تو یہ خالصتاً خواتین کا مورچہ تھا دوسرے اس مورچے میں شامل ہر خاتونِ خانہ اپنے ہاتھ میں بجائے کسی جھنڈے یا پرچم کے بیلن تھامے ہوئے تھی تیسرے یہ کہ یہ خاموش مورچہ تھا یعنی نعرے بازیوں کی آلودگی سے پاک تھا لیکن ہمیں خواتین اور بیلنوں سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ اتنی ساری خواتین اتنی دیر تک یکجا رہیں اور پھر بھی خاموش، یا تو وہ ساری کی ساری خواتین گونگے بہروں کے مختلف اسکولوں سے لائی گئی تھیں یا پھر خواتین کے بھیس میں وہ سارے کے سارے مرد تھے!
اتفاق سے ہمارے ایک شناسا مورچوں پر اچھی خاصی ریسرچ کر چکے ہیں نتیجتاً سیاسی پارٹیوں کی مورچہ بندی مزدوروں کی تالا بندی، صنعت کاروں کی منصوبہ بندی، غرض یہ کہ ہر قسم کی بندی پہ بندے کی نظر کافی گہری ہے اس کے علاوہ مارکسزم، ماؤ زم، کمیونزم، سوشلزم، یہاں تک کہ ہپناٹزم، کے بحرِ ظلمات میں بھی موصوف اپنے مطالعے کے گھوڑے گدھے خچر سبھی دوڑا چکے ہیں البتہ فطری جھکاؤ چونکہ مارکسزم اور ماؤزم کی طرف زیادہ ہے اس لیے مارکس اور ماؤ کے آگے کسی کو بھاؤ ہی نہیں دیتے، مورچے کی ایجاد کا سہرا مارکس اور ماؤ کے سر باندھتے ہیں لیکن ہمیں مارکس ماؤ اور مورچے میں کوئی بات مشترک نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ تینوں ہی اردو قاعدے کے حرف 'میم' سے شروع ہوتے ہیں، مورچہ چونکہ موصوف کا مرغوب ترین موضوع ہے اس لیے جب بھی کسی سے خفا ہوتے ہیں اپنے مرغوب موضوع کی مدد سے مد مقابل کو مصلوب کر دینے کی دھمکی دیتے ہیں، انتہا یہ کہ بیوی سے بھی ناراض ہوتے ہیں تو یہی نسخہ آزمانے کی حماقت کرتے ہیں جس کے جواب میں یہ کراری چوٹ پڑتی ہے۔ "نکالو ہمت ہے تو میرے خلاف مورچہ نکالو" میں بھی جواب میں بیلن مورچہ نکال کر تمہیں روٹی کی طرح

بیل کے رکھ دوں گی ۔!" دھمکی کے جواب میں دھما کا سن کر موصوف کو چُپ لگ جاتی ہے ظاہر ہے بیلن مورچہ کی وجہ سے بمبئی کی گرہست خواتین کو بیلن کے ایک اور مصرف کا عرفان ہوگیا ہے چنانچہ اب بشیتر خواتین مردوں کے خلاف بیلن کو بطور دیلن کے استعمال کرنے لگی ہیں۔

ایک پُرانی کہاوت ہے کہ موت اور گاہک کا کوئی بھروسہ نہیں جانے کب آدھمکے لیکن بمبئی کے ہمہ لسانی ٹکسال میں جہاں بہت سارے محاوروں اور کہاوتوں میں ردّ و بدل اور ترمیم و اضافے ہو چکے ہیں وہیں مذکورہ کہاوت میں سے گاہک غائب ہوچکا ہے اور اس کی جگہ مورچہ نے لے لی ہے یعنی یہ کہاوت یہاں اب اس طرح بولی جاتی ہے کہ بمبئی میں موت اور مورچے کا کوئی بھروسہ نہیں جانے کس راستے سے آکر آپ کی راہ کھوٹی کردے! بلکہ یہاں لوگ موت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ مورچے سے ڈرتے ہیں ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
مورچے کے سبھی اسیر ہوئے

▲▽

پولٹری فارم

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

(آئے دن ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہوکر)

مُرغبانی کے فوائد کا نہیں کوئی شُمار
شغل کا شغل ہے، بیوپار کا اچھا بیوپار

گھر سے بازار تک انڈوں کی فراوانی ہو
کھانے والوں کے لیے مُرغ کی ارزانی ہو

گھر میں بچوں کو حیاتین و پروٹین ملے
اُن کی صحت سے دل و روح کو تسکین ملے

کبھی اپنے دہن و کام کی لذت کے لیے
کبھی آئے ہوئے مہماں کی ضیافت کے لیے

آپ، جب چاہیئے پٹ کھول کے ڈربے کا معاً
کسی مُرغے کی پکڑ لیجئے جھٹ سے گردن

زد میں آئے کبھی چوزہ، کبھی مرغی آئے
کچھ غرض اس سے نہیں، موت کسی کی آئے

ذبح ہوکر اُسے تیسبل کی ہے زینت بننا
جا کے معدے میں حیاتین کی طاقت بننا

اک ذرا دیر کو ڈربے میں اُٹھے گا محشر
مُرغیاں چیخ کے بھاگیں گی اِدھر اور اُدھر

پھڑپھڑاتے ہوئے پر مُرغ اچک جائیں گے
چوزے سہمے ہوئے اک سمت دبک جائیں گے

چند لمحوں میں بدل جائے گا ماحول مگر
اپنے معمول پہ آجائے گا ڈربہ یکسر

ساتھیوں کے نہ بچھڑنے کا کوئی غم ہوگا
مُرغ کی بانگ سے پھر گونجے گی آنگن کی فضا

مرغیاں چین سے بیٹھی ہوئی انڈے دیں گی
پُرسکوں گذرے گی پھر شام و سحر چوزوں کی

اب تو یہ شغل کچھ اس درجہ ہوا ملک میں عام
کہ وہ گجرات و اودھ ہو کہ بہار و آسام

سارے منصوبے ترقی کے پسِ پُشت گئے
مُرغ کے فارم مگر دیش میں ہر سمت کھُلے

مرغِ بسمل کی ادا وجہِ نشاطِ دیدہ
نعمتِ کام و دہن مرغِ مسلّم کا مزہ

جس طرف دیکھئے اِس شوق کو مہمیز ہے آج
مُرغبانی کی مہم تیز، بہت تیز ہے آج

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

ادب اور معاوضہ

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے اپنا پہلا طنزیہ مضمون ۱۹۵۴ میں لکھا تھا۔ یہ مضمون دلی کے ایک موقر رسالے میں شائع ہوگیا۔ شائع ہونے کے دس دن بعد میں اپنے مضمون کا معاوضہ لینے کے لیے رسالے کے دفتر میں جا پہنچا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو وہاں مدیر سمیت چھ سات آدمی موجود تھے۔ جونہی میں نے معاوضے کی درخواست کی، دفتر میں موجود لوگوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ لگایا تو انہی سات آدمیوں نے لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس قہقے میں ساٹھ ستر آدمی شامل ہوں۔ ہنسی جب ذرا تھمی تو مدیر محترم نے مجھے بتایا کہ اُردو میں معاوضے کا رواج نہیں ہے۔ مجھے یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ رواجوں سے بھرپور اس دیش میں یہ رواج رائج ہونے سے کیسے رہ گیا۔ میں نے نہایت سادگی سے پوچھا کہ لوگ پھر لکھتے کیوں ہیں تو کہنے لگے کہ شہرت کی خاطر۔

یوں تو مجھے شہرت حاصل کرنے سے کوئی شکایت نہ تھی لیکن اُس سے زیادہ مجھے اس وقت روٹی کی ضرورت تھی۔ پھر بھی میں نے سوچا شہرت تو حاصل کرو۔ ہوسکتا ہے جب بہت مشہور ہوجاؤں تو لوگ روٹی بھی کھلانے لگیں۔ اتنا تو میں تب بھی جانتا تھا کہ امیر لوگ شہرت یافتہ لوگوں کو دسترخوان سجانے کے کام میں لاتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر اُس رسالے کے دفتر سے نیچے اُترا کہ شاید مجھے دیکھتے ہی قارئین کرام آنکھوں پر بٹھالیں۔ رسالہ جس میں میرا مضمون چھپا تھا میری بغل میں تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا تو آنکھوں پہ بٹھانا تو درکنار مجھے کوئی رکشا میں مفت بٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے ہر وہ حرکت کی جس سے لوگوں کو احساس ہو کہ میں ادیب ہوں لیکن کسی نے اثر قبول نہ کیا۔ مجبوراً مجھے باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ میں ادیب ہوں۔ جس کے جواب میں کسی منچلے نے کہا کہ آپ جیسے سینکڑوں ادیب اس بازار میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ میں جوتیاں چٹخاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

بعد میں میں نے غور و خوض کی تو پتہ چلا کہ اردو کے رسائل کے پڑھے جانے کا عالم یہ ہے کہ اکثر انھیں وہی حضرات پڑھتے ہیں جو ان میں لکھتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی اپنا مضمون پڑھنے کے بعد رسالہ سنبھال کر رکھ دیتے ہیں کیوں کہ زیادہ ورق گردانی کرنے سے رسالے کے پھٹ جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اور ایسی حالت میں یہ مسند نہیں رہتا اور بوقتِ ضرورت کام نہیں آتا۔

ادب کا مسئلہ کچھ اس طرح کا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اس کا چسکہ پڑجاتا ہے۔ اور چسکہ تو آپ جانتے ہیں خطرناک عادت کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اگر کسی بات کو چھپائے رکھیں تو ان کے پیٹ

میں درد اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر کسی ادیب کے پاس لکھنے کو کچھ ہو اور وہ نہ لکھے تو اس کے سارے جسم میں تناؤ سا آجاتا ہے۔ گردن اکڑ جاتی ہے۔ ماتھے کا رقبہ لگتا ہے کہ بڑھ گیا ہے۔ آنکھوں کی حالت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ دیکھ بھی رہی ہوں تو لگتا ہے کہ نہیں دیکھ رہیں۔ ہاتھوں میں ایک عجیب سا رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ادیب چاہتا ہے کہ کسی طرح اُس مواد کو باہر نکالے جو اس کے اندر پنپ رہا ہے۔ تاکہ جسم کے پرزوں میں پھر سے توازن آجائے۔ کئی لوگ تو اِس مواد کو باہر نکالنے کے لیے چائے یا شراب کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ جب یہ مواد باہر نکلتا ہے تو ادیب دوڑتا ہے لوگوں کو بتانے کے لیے کہ بھائی مواد باہر نکل آیا ہے۔

بتانے کی دو صورتیں ہیں ایک زبانی اور دوسرے تحریری۔ زبانی میں مشکل یہ ہے کہ سننے والے بڑے کائیاں ہو گئے ہیں۔ بغیر چائے یا شربت پیئے کوئی آج کل ایک شعر تک سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ایک غزل کو سنانے میں کئی بار دو دو سو روپے کھل جاتے ہیں۔ افسانہ سنانا تو اور بھی مہنگا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اگر افسانہ تجریدی ہو تو خرچہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ سننے والوں کی توجہ سامانِ خورد و نوش کی طرف اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اپنی تخلیقات کی تشہیر کرنے کے لیے دوسرا طریقہ پسند کرتے ہیں، جسے تحریری طریقہ کہتے ہیں یعنی مضمون یا نظم کو کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ اب آپ ہی بتائیے رسالے کا مدیر اُسے معاوضہ کیوں دے گا جب اُسے پتہ ہے کہ ادیب کے پاس چھپنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کیونکہ زبانی سننا کسی کو گوارہ ہی نہیں۔

میری تقریر کو یہاں تک پڑھنے کے بعد شاید آپ کو خیال گذرا ہو کہ رسالوں کے مدیر ادیبوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اُن کی تو کوٹھیاں بن رہی ہیں اور ادیب بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے حضور۔ اُن کی کوٹھیاں بن نہیں رہیں، بک رہی ہیں۔ کسی کے والد بزرگوار کوئی مکان چھوڑ گئے اور مدیر صاحب نے اُسے رسالے پر لگا دیا۔ آپ کو شاید نظر نہ آئے لیکن مجھے تو رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے اکثر مدیر محترم کی اہلیہ محترمہ کی بکی یا گروی رکھی ہوئی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دیتی ہے پریس کے مالکوں کے تقاضے اور اجرت مانگنے والے کاتبوں کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر صورتِ حال یہ ہے تو وہ رسالہ نکالتے کیوں ہیں۔ جیسے دور درشن اور ریڈیو پر ہم نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے، آپ نے بہت ہی اچھا سوال کیا ہے۔ مختصر سا جواب تو اس کا یہ ہے کہ جس طرح ادیب کو لکھنے کا چسکہ پڑ جاتا ہے، ایسے ہی مدیر کو رسالہ نکالنے کا چسکہ پڑ جاتا ہے۔ وہ اگر رسالہ نہ نکالے تو اس کے جسم کے کل پرزوں میں وہی تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جو ادیب کے مواد دبانے سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے شاعر اپنی غزل کے دیر (بلکہ کئی صورتوں میں کسی دوسرے کی غزل کے اوپر بھی) اپنا نام چھپا دیکھ کر ایک عجیب سی راحت محسوس کرتا ہے قریباً وہی راحت مدیر رسالے کے اوپر اپنا نام دیکھ کر محسوس کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادیب نے تو دو چار گھنٹے لگا کر مصرعے جوڑ دیئے لیکن مدیر نے تو رسالے کے ورق جوڑنے میں بچوں کی روٹیاں داؤ پر لگا دیں۔

اگر رسالہ بک رہا ہو تو مدیر محترم اپنے رسالے میں بار بار یہ اعلان کیوں شائع کریں کہ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اس پسندیدہ رسالے کے لیے گاہک فراہم کریں۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے چندہ لے کر ہمیں بھجوائیں۔ یہ اعلان پڑھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ میں ایک امیر گھر کی لڑکی ہوں جس کی شادی ایک غریب سسر کے بیٹے کے ساتھ ہو گئی ہے۔ اب سسر صاحب مجھے بار بار مشورہ دیتے ہیں کہ بیٹی تیرا فرض یہ ہے کہ تو اپنے رشتہ داروں

میں جو امیر گھروں کی لڑکیاں ہیں اُن کو پھانس کر میرے گھر لائے تاکہ ہمارے ہاں دال روٹی چلتی رہے۔

ایک ایسا ہی مدیر ایک بار مجھے ملنے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے میں نے ایک رسالہ نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اِس کا پانچ سال کا چندہ اس تھیلی میں ڈال دیں۔ میں نے کہا میں کیوں ڈالوں؟ کہنے لگے اس لیے کہ یہ ادب کی خدمت ہے۔ میں نے خود آج صبح میں اس تھیلی میں اپنے پانچ سو ڈالے ہیں۔ میں نے کہا حضور یہ تو بالکل ایسے ہے کہ کوئی ڈاکو آکر مجھے کہے کہ بھائی گھر میں جو زیور اور نقدی ہے وہ میرے اس جھولے میں ڈال دو کیوں کہ میں نے خود اپنے زیور اور نقدی اس تھیلے میں ڈال دی ہے۔

میں نے ایک بار اپنے ایک مدیر دوست سے پوچھا تھا کہ آپ لوگ رسالہ نکال کر گھر پھونک کر تماشہ دیکھنے کا شغل کیوں اختیار کرتے ہیں کہنے لگے کہ اور کوئی شغل ہمیں آتا نہیں تو کریں کیا۔

اُن کی بات سن کر مجھے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہمارے گاؤں کے پاس ایک کھلے میدان میں ایک فقیر کی برسی کے موقع پر ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ جہاں علاقے کے تقریباً سارے مرد عورتیں اور بچے اکٹھے ہوتے تھے۔ جھولے لگائے جاتے تھے۔ مٹھائیوں کی دوکانیں سجتی تھیں جہاں جلیبیاں اور بوندی کے لڈو بکثرت بکتے تھے۔ اِس میلے میں طوائفیں گانے سنا کر اور بھانڈ تماشے دکھا کر لوگوں سے داد اور پیسے وصول کرتے تھے۔ بچے کھلونوں کی دوکانوں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اس میلے میں میں نے اپنے گاؤں کے ایک بوڑھے بڑھئی کو دیکھا جو بوری میں اوزار ڈالے آواز لگا رہا تھا۔ "چوہے پکڑنے کے پنجرے مرمت کروالو" میں نے اس کے پاس جاکر پوچھا۔ "بابا لوگ تو اِس میلے میں عیش و عشرت کے لیے آئے ہیں۔ یہاں چوہے پکڑنے کا پنجرہ لے کر کون آیا ہوگا جو اِسے مرمت کروائے گا۔ وہ کہنے لگا بیٹا بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے جو کام آتا ہے میں تو وہی کروں گا نا" اگرچہ ادیب ہونے کے ناطے مجھے مدیروں سے شکایت ہونی چاہیئے کہ وہ مجھے میری تخلیقات کا معاوضہ نہیں دیتے لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اب تک میں نے روٹی کمانے کے کئی اور آسان نسخہ ڈھونڈ لیئے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ میرا ادبی چسکہ پورا کرنے میں میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ البتہ ایک شکایت مجھے ہے اور وہ اُس اعلان سے ہے جو وہ اکثر اپنے رسائل میں شائع کرتے ہیں جس میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ ادیبوں سے درخواست ہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف خوش خط لکھا کریں۔ دو لائنوں کے بیچ خالی جگہ چھوڑا کریں۔ مضمون پہلے کہیں شائع شدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر مضمون ہمارے معیار پر پورا نہیں اُترے گا تو واپس کر دیا جائے گا۔ اگر مضمون واپس چاہیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ساتھ بھیجیئے وغیرہ، مفت کا سودا خریدنا اور اُس پہ اتنے نخرے ! کئی بار مجھے خیال ہوا ہے کہ مدیر کو ساتھ لیکر کسی ساڑھیوں کی دوکان پر لے جاؤں اور وہاں اُن سے یہ جملے کہلواؤں کہ صاحب مجھے اپنی بیوی کے لیے ساڑھی درکار ہے۔ ساڑھی کا ڈیزائن ایسا ہونا چاہیئے جو پہلے کسی نے پہنا نہ ہو۔ کپڑا مضبوط اور رنگ پکا ہونا چاہیئے۔ اگر میری بیوی کو ساڑھی پسند نہ آئی تو آپ کو اپنا آدمی بھیج کر جسے سکوٹر رکشا کا کرایہ آپ دیں گے۔ ساڑھی واپس منگوانی ہوگی۔ اور ساڑھی پسند آجانے کی صورت میں اس کے دام ہرگز نہیں دوں گا۔ اس تقریر کے بعد میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ دوکاندار مدیر صاحب کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ میں اُس سلوک کو اپنی ادبی تخلیقات کا معاوضہ سمجھ کر خوش ہو جاؤں گا۔

ساغرِ خیامی

نوادرات کی دُوکان

○

بولا دوکاندار کہ سرکار دیکھئے
مُغلوں کی آن بان کے آثار دیکھئے

اکبر کی تیغ اور سپر ہے سلیم کی
ہر چیز دستیاب ہے عہدِ قدیم کی

غالب کا جام میر کی ٹوپی کا بانکپن
مومن کا لوٹا حضرتِ سودا کا پیرہن

ایڑی گلاب کی ہے تو پنجہ کنول کا ہے
جوتا مری دوکان پہ حضرت محل کا ہے

چُٹکی میں میری دانت کسی لُوپڑے کا ہے
نیکر بھی دستیاب یہاں ڈوپلے کا ہے

ٹوپی جو میرے سر پہ ہے بانکے پیا کی ہے
چُولی مری دوکان پہ وکٹوریہ کی ہے

لکھا ہوا ہے مرثیہ حالی کے ہاتھ کا
کہتا ہے ماجرا جو جُدائی کی [illegible] کا

اثنائے گفتگو میں جو اِک لنگڑا آگیا
بے ساختہ زبان پہ یہ جملہ آگیا

بے خوف بے ہراس سرِ عام تو بتا
میں نے کہا کہ لنگڑے کے کچھ دام تو لگا

بولا مری دوکان پہ نہ بکواس کیجئے
اہلِ نظر کا آپ ذرا پاس کیجئے

اہلِ نظر لگائیں گے لنگڑے کے دام کیا
بولا مری دوکان پہ لُولے کا کام کیا

جھلّا کے میں یہ بولا رقم کھینچ لیجیو
تیمور لنگ کہہ کے اسے بیچ دیجیو

○

پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست
(حیدرآباد)

علی بھائی

علی صاحب میاں کو ہم صرف علی بھائی کے نام سے جانتے تھے۔ مجھے علی بھائی کا وہ زمانہ یاد ہے جب وہ بڑے صحت مند اور تنومند تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی ان کے بال کھچڑی تھے۔ گویا۔

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

صرف بال کی حد تک ورنہ وہ گورے چٹے تھے، کافی کشیدہ قامت، بھوری آنکھیں۔ شاید کسرتی بدن تھا یا معلوم نہیں قدرتی طور پر مضبوط جسم رکھتے تھے۔ یہ آج سے کوئی چالیس بلکہ پینتالیس سال پرانی بات ہے یعنی پولیس ایکشن سے پہلے کا زمانہ تھا۔ جب حیدرآباد میں شاہی اور جاگیرداری نظام تھا۔ علی بھائی نے اسی نظام کے عروج کے زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں اور وہ پرنس اعظم جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھیں درباداری بھی کرنی پڑی تھی۔ جہاں اس نظام کی وجہ سے مختلف صلاحیتوں کا استحصال ہوتا تھا۔ وہیں اس کی وجہ سے بعض خوابیدہ صلاحیتیں بھی بروئے کار آتی تھیں۔ طلب اور رسد کا اصول زندگی میں ہر جگہ کارفرما رہتا ہے۔ علی بھائی کی مزاحیہ صلاحیت کو بیدار اور باعمل رکھنے میں شاید اس نظام کا بھی ہاتھ رہا ہو۔

علی بھائی کے ساتھ چیتاپور کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ چیتاپور ایک چھوٹا سا تعلقہ تھا واڑی سے پہلے۔ یہ آج کرناٹک اسٹیٹ میں شامل ہے۔ اس زمانے میں نظام اسٹیٹ میں شامل تھا۔ اور پائیگاہ آسماں جاہی یعنی معین الدولہ کی جاگیر میں شامل تھا۔ میرے عبدالقادر نامر مرحوم اسی چیتاپور میں تحصیل دار تھے۔ ان کی وجہ سے یہ چھوٹا سا تعلقہ ہر سال کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد کے شعر و ادب کا مرکز بن جاتا تھا۔ عبدالقادر صاحب کو شعر و ادب سے موروثی دلچسپی تھی۔ ان کے والد مسیح الدین خاں صاحب بڑے بخشی بھی شاعر تھے۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور نامر تخلص کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حضرت تمکین سرمست مرحوم تو معروف شاعر تھے ہی۔ ایک اور بھائی دستگیرالدین نادر نہ صرف شاعر تھے بلکہ اپنے زمانے کے مشہور ڈراما نگار بھی تھے۔ شعر و ادب سے اس خاندانی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ عبدالقادر صاحب نامر جب تک چیتاپور میں تحصیل دار اور پھر تعلقہ دار رہے۔ وہاں حیدرآباد کے سربرآوردہ اور مشہور ادیب اور شاعر جمع ہوتے تھے۔

قصہ یہ تھا کہ چیتاپور کا نام وہاں کے ایک بزرگ چیتا شاہ ولی کے نام پر پڑا تھا۔ جن کا سالانہ عرس منایا جاتا تھا۔ پتہ نہیں پہلے ہی سے عرس کے موقع پر مشاعرہ رکھنے کی روایت چلی آرہی تھی یا نامر صاحب کی وجہ سے مشاعرہ شروع ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ روایت پرانی ہو اور اس کی نوعیت بالکلیہ مقامی ہو لیکن نامر صاحب کی وجہ سے حیدرآباد کے اس زمانے کے تمام اہم

شاعر اور اہلِ قلم عرس کے موقع پر وہاں جمع ہوتے تھے۔ تمکین سرمست صاحب کی وجہ سے علی اختر اختر، شاہد صدیقی، حسرت ترمذی اور مخدوم محی الدین بھی ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ نام صاحب . صاحبزادے اقبال متین کی وجہ سے نظر حیدرآبادی، حسینی شاہد، لطیف ساجد کی شرکت لازمی طور پر ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کے چوٹی کے مزاحیہ شاعر نذیر دہقانی اور علی صاحب میاں بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ یہیں مجھے علی بھائی سے ہر سال ملنے کا موقع ملتا تھا۔

عرس کے موقع پر ایک وسیع اور عریض میدان میں ڈیرے پڑتے تھے۔ اور انھیں میں کئی دن تک ہمارے شاعر اور ادیب فروکش ہوا کرتے تھے۔ علی بھائی کی وجہ سے زندہ دلی کی فضاء چھا جاتی تھی۔ وہ جگ علی بھائی تھے۔ بوڑھے، بچے، جوان سبھی ان کو علی بھائی کہتے تھے۔ وہ تھے بھی ایسے کہ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان اور بچوں میں بچے۔ ہر ایک کا دل موہ لینے کا انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی زنبیلِ مزاح میں ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی جس کو سن کر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ اسپورٹس کے مقابلے ہوں تو علی بھائی اس میں شریک۔ لون پاٹ کھیلا جا رہا ہے تو علی بھائی جس کے ساتھ ہوں اس کی کامیابی یقینی۔ اگر کہیں تاش کھیلا جا رہا ہے تو وہاں بھی علی بھائی موجود۔

بچوں کے لیے تو علی بھائی کے پاس ایسی ایسی چیزیں ہوتیں کہ بچے انھیں ہمیشہ گھیرے رہتے۔ کبھی مٹھی بند کی اور چوں چوں کی ایسی آواز نکالی کہ بچے سمجھتے واقعی ان کی مٹھی میں چڑیا بند ہے۔ ایک بار بڑا مزہ آیا۔ علی بھائی بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر مختلف جانوروں کی آوازیں نکالی جا رہی تھیں۔ کسی نے کتے کے بھونکنے اور غرانے کی آواز نکالی۔ مجمع میں بیٹھے ہوئے علی بھائی جس طرح ... بھاگتے وقت آواز نکالتا ہے، بالکل ویسی ہی آواز نکالنے لگے۔ سارا پنڈال قہقہوں اور تالیوں سے گونجنے لگا۔ بچوں میں بیٹھ کر بعض وقت وہ بے معنی الفاظ اس طرح جمع کرتے کہ بچے ہنستے ہنستے لوٹ لوٹ جاتے۔ ہماری بہن سلطانہ ہیں۔ جب وہ چھوٹی سی تھیں۔ علی بھائی نے تمام بچوں کو ان کے چھیڑنے کے لیے ایسے ہی الفاظ سکھا دیئے۔ ایک ایک انگلی پر کہتے جاتے تھے۔ جیسے چھوٹی انگلی کو پکڑ کر کہتے۔ چنو منو بدنا۔ بیچ کی انگلی پر کہتے سبل نمارا ... کلمے کی انگلی پر کہتے کلمے کی انگلی۔ اور مٹھی بند کر کے انگوٹھے کو کھڑا کر کے کہتے "بڈا حافظ"۔ سب بچے مل کر کہتے، چنو منو بدنا، سلطانہ دی نا بسبل نمارا۔ کلمے کی انگلی بڈا حافظ۔ ایک بار بڑے چھوٹے سب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کتے کا بچہ ان کی کرسی کے قریب سے گزرا۔ فوراً اس کو ہاتھ میں اٹھا لیا ظاہر ہے کہ ان کی اس اچانک حرکت پر سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کتے کے بچے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگے:

"بالکل کتے کے پلّے کے جیسا ہے" سب بے ساختہ ہنسنے لگے۔

علی بھائی کو مشاعرے کے بعد بھی، خاندان کے دوسرے افراد جب تک قیام کرتے انھیں بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دیں۔ وہ خاندان کے ایک فرد جیسے بن گئے تھے ایک مرتبہ پورا خاندان باغ میں جمع تھا۔ درختوں کے نیچے ناشتہ ہو رہا تھا۔ حیدرآبادی ناشتہ تھا یعنی کھچڑی قیمہ، پاپڑ، اچار وغیرہ۔ ابھی علی بھائی نے ناشتہ ختم نہیں کیا تھا کہ چائے آ گئی۔ جنھوں نے ناشتہ ختم کر لیا تھا انھوں نے چائے لے لی۔ کسی نے کہا، علی بھائی، پیٹ میں جا کر کھچڑی قیمہ، چائے سب مل جاتے ہیں۔ ان کو کیوں علاحدہ کھایا جائے"؛ اتنا سننا تھا انھوں نے کھچڑی قیمے میں چائے ملائی اور کھانے لگے۔ سب ہنستے ہوئے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ علی بھائی نے جو دیکھا کہ سب اس بات سے لطف لے رہے ہیں تو انھوں نے دسترخوان پر جتنی چیزیں تھیں جیسے پاپڑ، اچار وغیرہ ملائیں اور مزے لے لے کر کھانے لگے۔ اسی طرح ایک دن

پر سب کھانا کھا رہے تھے۔ ہمارے خالو بھی کھانے میں شریک تھے۔ وہ جب کھانا کھاتے تو پسینہ سے شرابور ہو جاتے اور بار بار تولیے سے پیشانی اور چہرہ پونچھتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پسینے کی بوندیں پھر نکل آتی تھیں۔ علی بھائی غور سے ان کو دیکھ کر کہنے لگے "یہ تو بہت محنت سے کھانا کھاتے ہیں"۔ ہم سب بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو قابو میں رکھ سکے۔

علی بھائی بڑے طاقتور انسان تھے۔ ان کی طاقت کا بھی ایک دن امتحان ہوگیا۔ چیتا پور میں ایک قوی ہیکل آدمی پانی بھرنے پر مامور تھا۔ وہ بہت بڑا گھڑا پانی بھر کر لایا کرتا تھا۔ سب تعجب کرتے تھے کہ اتنا بڑا گھڑا وہ کس طرح اُٹھا لیتا ہے۔ علی بھائی نے کہا اتنا بڑا گھڑا اُٹھا لینا ایسا کون سا کمال ہے۔ سب نے کہا آپ اُٹھایئے تو دیکھیں۔ اس پر انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ گھڑا نیچے رکھ دے۔ علی بھائی نے صرف ایک ہاتھ سے اٹھا کر گھڑا اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ سب محوِ حیرت ہو گئے۔

عبدالقادر صاحب نامؔر کو اپنے افرادِ خاندان کو جمع کرنے اور ان کے ساتھ تفریح کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ تمکین صاحب ان کے چھوٹے بھائی سلطان محی الدین نسیم اور ان کی بہنیں اپنے اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ اس میں شامل رہتے۔ ایسے میں علی بھائی کا ہونا لازمی اور ضروری تھا۔ انھیں کسی نہ کسی طرح سے لایا جاتا تھا۔ ایک تیج واڑی کے ڈاک بنگلے میں جو کھائی سے قریب تھا سب مقیم تھے۔ بکرے ذبح کئے گئے اور طے پایا کہ جو بھی پکوان جانتا ہے اپنی پسند کی کوئی چیز بنائے۔ علی بھائی کب کسی سے پیچھے رہنے والے تھے۔ اُنھوں نے تیتر کا گوشت تیار کیا اور اتنا لذیذ بنایا کہ سب کے پکوان اس کے آگے پھیکے پڑ گئے۔

ڈاک بنگلے کے سامنے سے پتھر لے جانے کے لیے ٹرالی کی پٹریاں گزرتی تھیں جو کھائی میں ختم ہوتی تھیں۔ بنگلے سے کھائی تک مسلسل اتار تھا۔ ہماری بہنیں ٹرالی میں بیٹھ گئیں اور میں ٹرالی کے ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ علی بھائی دور کھڑے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہیں سے پکار کر کہنے لگے "وہاں جا کر گرے تو میرے کو پکار لینا"۔ ٹرالی چلی اس میں لکڑی کا ایک ٹکڑا تھا۔ جو بریک کا کام دیتا تھا۔ ٹرالی میں بیٹھنے کے بعد ہماری بہنوں نے اس کی اہمیت نہیں سمجھی اور اسے پھینک دیا۔ ٹرالی جوں جوں نشیب کی طرف بڑھتی گئی۔ اس کی رفتار میں اضافہ ہونے لگا۔ ٹرالی کو قابو میں رکھنے کی کوئی صورت نہیں تھی؛ نیچے کھائی پچاسوں فٹ گہری تھی۔ جب رفتار تیز ہونے لگی، بہنیں دہشت اور خوف کے مارے چیخنے لگیں۔ علی بھائی نے پہلے ہی سے خطرے کو بھانپ لیا تھا اس لیے وہ ٹرالی کے پیچھے دوڑنے لگے۔ متین بھائی نے جو دیکھا کہ علی بھائی دوڑ رہے ہیں وہ بھی ان کے پیچھے دوڑنے لگے۔ کھائی کے قریب جو ٹرالیاں کھڑی تھیں ان سے ہماری ٹرالی جا ٹکرائی۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا۔ جب ہوش آیا۔ میں ٹرالی میں پڑا ہوا تھا اور سب گہری تشویش کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ علی بھائی نے ٹرالی کو پکڑ لیا تھا چونکہ رفتار تیز تھی وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اگر علی بھائی اسے روکنے کی کوشش نہ کرتے تو شاید اس واقعہ کو لکھنے کے لیے میں آج موجود نہ ہوتا۔

علی بھائی انگلستان بھی گئے تھے۔ نواب اعظم جاہ بہادر کے ساتھ انھوں نے یہ سیر کی تھی۔ انگلستان جانے اور وہاں رہنے کے باوجود اس کے بارے میں کچھ کہتے تھے نہ بتاتے تھے۔ ان کا انداز ہوتا جیسے وہ انگلستان نہیں چیتا پور جا کر آگئے ہوں۔ اگر کوئی سرِ ہی ہو جاتا تو وہاں کی باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی بجائے حیدرآباد سے اس کا تقابل اس طرح کرتے جس سے معلوم ہوتا کہ ہمارا حیدرآباد ہر بات اور ہر چیز میں انگلستان سے بدرجہا اچھا ہے۔ دہلی

البتہ ایک سائیکل اُنھوں نے خریدی تھی اس کی دو خصوصیات تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ عام سائیکلوں سے اُونچی تھی۔ اپنے قد و قامت کی مناسبت سے اُنھوں نے اُونچے فریم والی سیکل خریدی تھی۔ جو حیدرآباد میں اس زمانے میں شاید دستیاب نہیں تھی۔ دوسری غیر معمولی بات یہ تھی کہ اس میں ایک طرح کا گیر سسٹم تھا۔ ان گیروں کے استعمال سے اونچائی پر بھی سیکل چلانے میں دقت نہیں ہوتی تھی۔

بہرحال علی بھائی زندگی اور زندہ دلی کی تصویر تھے۔ ایسے لوگ جو یکساں طور پر بچے سے لے کر بوڑھے تک سب کو خوش رکھ سکیں مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔

□□

اعجاز الدین پاپولر
(میرٹھ)

"نظم"

(اُمیدوار میں بھی ہوں)

میں بیقرار ہوں مدت سے ممبری کیلئے
ٹکٹ مجھے بھی دلادو اسمبلی کے لیے

میں ایک عمر سے ہوں مفلسی کی چادر میں
نہیں ہے روکھی بھی روٹی مرے مقدر میں
مرا سفینہ ہے آلام کے سمندر میں
میں ایک بوجھ ہوں خود اپنی فیملی کے لیے
ٹکٹ مجھے بھی دِلا دو اسمبلی کے لیے

ٹکٹ کے واسطے غیرت بھی بیچ سکتا ہوں
میں خاندان کی عزت بھی بیچ سکتا ہوں
بکے تو اپنی شرافت بھی بیچ سکتا ہوں
مجھے سکون ہے درکار زندگی کے لیے
ٹکٹ مجھے بھی دِلا دو اسمبلی کے لیے

نوازدو صرف مجھے مہربانی فرما کر
میں وعدہ کرتا ہوں اِک ایک سے قسم کھاکر
کہ پانچ سال سے پہلے یہاں کبھی آکر
بنوں گا باعثِ زحمت نہ میں کسی کیلئے
ٹکٹ مجھے بھی دِلادو اسمبلی کے لیے

میں سنگریزے سے گوہر بنادیا جاؤں
میں ایک قطرہ سمندر بنادیا جاؤں
عجب نہیں کہ منسٹر بنادیا جاؤں
میں ہر طرح ہوں مناسب منسٹری کیلئے
ٹکٹ مجھے بھی دِلادو اسمبلی کے لیے

ہر ایک طرح کی تکڑم سے آشنا ہوں میں
جو رہزنوں سے نہیں کم وہ رہنما ہوں میں
ملی جو کرسی تو پھر دیکھنا کہ کیا ہوں میں
ہزار راہیں ملیں گی سُشکر پُری کے لیے
ٹکٹ مجھے بھی دِلادو اسمبلی کے لیے

ہنسو نہ اس پہ کہ اُمیدوار گنجا ہے
کہ سخت میرے خیالات کا شکنجہ ہے
جو چلنے دے نہ کسی کی وہ میرا پنجہ ہے
میں اچھا شخص ہوں ہر اچھے آدمی کیلئے
ٹکٹ مجھے بھی دِلادو اسمبلی کے لیے

ہنر پرست ہوں ہر صاحبِ ہنر کی قسم
فراقؔ و جوشؔ کی اصغرؔ کی اور جگرؔ کی قسم
ہلالؔ و ناظمؔ و شہبازؔ و پاپولرؔ کی قسم
میں کام آؤں گا شاعر برادری کے لیے
ٹکٹ مجھے بھی دِلادو اسمبلی کے لیے

دلیپ سنگھ (نئی دلی)

ہائی کو

[جب سے اردو کے سنجیدہ شاعروں نے جاپان کی صنف شاعری "ہائی کو" سے آگاہی پائی ہے وہ اپنے خیالات کے دھاروں کو ہائی کو کے جامہ میں لپیٹنے کی کوشش میں جُٹ گئے ہیں۔ مزاح اور طنز نگاروں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ طوقِ جاپانی مجھے ہی اپنے گلے میں ڈالنا ہوگا، میں "ہائی کو" کے کچھ نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔]

(۱)

ایک مصرعے کی لٹکتی تین ٹانگیں دیکھ کر
میں نے پوچھا کیا ہوا، کہنے لگا
ہائی کو

(۲)

چاہتا ہوں میرے کہنے پر چلے
کار چلتی ہے مگر
پٹرول سے

(۳)

دوستوں سے مل کے لوٹا
تو بہت حیران تھا۔
جیب میں بٹوا نہ تھا۔

(۴)

وہ رقم جو مجھ کو پہلی کو ملی
آج دسویں ہے
کدھر رخصت ہوئی

(۵)

تیرے والد نے مجھے کوٹھی نہ دی
میں نے منگنی توڑ دی تو بول
دھوکہ کس کی جانب سے ہوا

(۶)

تم سناؤ آٹھ غزلیں
ہم فقط اک ہائی کو؟
"کیا ہی کو"؟

فیاض احمد فیضی
(بمبئی)

اندازِ بیان اور.....

ایک زمانہ تھا جب جھوٹ بولنا گناہ سمجھا جاتا تھا اس لیے لوگ مزے لے لے کر جھوٹ بولتے تھے اور دوسرے گناہوں کی طرح اس فعل سے بھی لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا اور اس کی مجبوریوں میں اضافہ ہوتا گیا گناہ و ثواب کے معنی بھی بدلتے گئے اور ان کے نام بھی اور اب یہ ہوگیا ہے کہ کبھی مجبوری کے تحت، کبھی ڈپلومیسی کے پرچم تلے تو کبھی خوش اخلاقی اور انکسار کی خاطر جھوٹ پر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ آج دنیا میں وہی سخن در بہت اچھا سمجھا جاتا ہے جو ایسا اندازِ بیان اختیار کرے کہ جھوٹ کا پتہ ہی نہ چلے اور بات سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔ اب تلخ نوائی اور سچائی دونوں گناہ ہیں اور شیریں بیانی اور دروغ گوئی دونوں پسندیدہ اور کارگر مشاغل ہیں۔

پٹرول کی سخت مہنگائی کے اس دور میں دُور کیوں جائیں۔ اپنے گھر میں، اپنے بستر میں صبح سویرے آنکھ ہماری کھلتی ہے اور بیگم ٹرے میں چائے اور چہرے پر مسکراہٹ لیے داخل ہوتی ہیں اور جیسے خوشگوار ہوا کا جھونکا سا چلتا ہے۔ اپنی مسکراہٹ کو مزید گہری بناتے ہوئے بیگم فرماتی ہیں "جناب کی خدمت میں چائے حاضر ہے۔ کیا بات ہے آج آپ بہت ہشاش بشاش اور تر و تازہ دکھائی دے رہے ہیں؟" ہم چائے سے زیادہ اس جملے کے طلسم سے پھول جاتے ہیں اور سچ مچ مسکراہٹ ہمارے ہونٹوں پر اور ہماری آنکھوں میں جھلکنے لگتی ہے۔ ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد بیگم گویا ہوتی ہیں "اچھا جلدی سے چائے پی لیجیے اور دوڑ کر دودھ، انڈے اور بریڈ لے آئیے۔ اور ہاں راستہ میں لانڈری سے کپڑے بھی لیتے آئیے گا" ہم مسرور و شاداں جھولا لٹکائے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ بہت دیر بعد جب ناشتہ کا سامان اور دُھلے ہوئے کپڑوں سے لدے پھندے گھر لوٹتے ہیں تب جا کر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ بیگم نے اپنے اندازِ بیان سے ہمارے اندر وہ چستی اور بے قوفی بھر دی تھی جو ملی الصبح ہمیں کبھی نصیب نہ ہوتی تھی۔

آفس جانے کے لیے ہم نے بریف کیس سنبھالا تو دونوں بچے آکر گردن میں جھول گئے۔ بچوں کے وزن سے گردن جھکی تو دونوں نے ہمارے گالوں کو اپنے ہونٹوں سے گیلا کیا، پیار بھری مسکراہٹ سے ہمیں الوداع کہا تو ہم زمانے کے دکھوں کو ایک کے بعد ایک کرکے بھولنے لگے اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب دونوں نے ہم سے اپنے پیار کی قیمتیں

بھی وصول کرلی اور اپنی قیمتی فرمائشوں کی فہرست بھی ہمیں ذہن نشین کرادی۔ گھر سے نکلتے وقت ہماری گردن مزید جھک گئی تھی۔

اور یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا۔ باہر نکلتے ہی اپنے پڑوسی ظریف مرادآبادی سے یوں مڈبھیڑ ہوتی ہے کہ وہ عجلت میں ہمارے سوا ئیں پیر کو اپنے جوتوں سے کچل دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ اور بھی مغموم ہوجاتا ہے اور وہ ساری دنیا کے درد کو اپنے چہرے پر یک جا کرکے "آئی ایم ساری، آئی ایم ویری ساری" کہتے ہوئے غائب ہوجاتے ہیں اور ہم ان کی معذرت کو اپنے درد پر مرہم کی طرح رکھ لیتے ہیں۔ مگر جب تھوڑی دور چل کر پیر میں درد کی ٹیس اٹھنے لگتی ہے تو ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ظریف صاحب یقیناً ساری SORRY بھی تھے اور مغموم بھی مگر اس کی وجہ اور کچھ ہو تو ہو ہماری تکلیف ہرگز نہیں تھی۔ یہ تو خیر ان کا اپنا اندازِ بیان تھا جو انھوں نے گہرے دُکھ کا اظہار کیا ورنہ دل کی گہرائیوں سے تو وہ یہی کہنا چاہتے تھے کہ "اندھے ہوگئے ہو کیا، ایک تو خود دیکھ کر نہیں چلتے اور دوسرے . . . . وغیرہ وغیرہ۔

گھر سے آفس تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنے لوگوں کے مختلف النوع اندازہائے بیان کو جھیلنا پڑتا ہے اور بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے کہ ہر ایک کو اسی کے انداز میں اس طرح جواب دیا جائے جس سے اس کی خواہ مخواہ تسلی ہوتی رہے ورنہ ذرا غفلت ہوئی اور آبگینوں کو ٹھیس لگی۔ اور یہ وہ آبگینے ہیں جو ٹوٹنے کے بعد غائب نہیں ہوجاتے بلکہ پھوٹنے والے آبلوں سے بھی زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں اور ہم آبلہ پا ضرور ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ راہ کو پُرخار دیکھ کر ہمارا جی خوش نہیں ہوتا، شاید اس لیے کہ ہماری تنخواہ اچھی خاصی ہوتے ہوئے بھی ہماری بیوی اور بچوں کی ضرورتوں سے بہت کم ہے۔ شاید اس لیے کہ ہم سوئزرلینڈ کبھی نہیں گئے، کسی بین الاقوامی اسکینڈل میں ہمارا نام شامل نہیں کیا گیا یا شاید اس لیے کہ بندگی میں آزادہ و خودبیں رہنے کی ہم میں تاب نہیں ہے۔

کل ہم نے جیسے ہی اپنا پرانا اسکوٹر بس اسٹاپ کے قریب سے موڑا تو مسز کھنہ نے ہمیں روکنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اُٹھا دیئے کہ ہم سمجھ جائیں کہ جب تک ہم اسکوٹر نہیں روکیں گے وہ اپنے ہاتھ مسکرا کر نہیں چھوڑیں گی۔ جیسے ہی ہم نے ان کے خاموش حکم کی تعمیل کی وہ ایک دم مجسّم مسکراہٹ بن کر کہنے لگیں "بھیا نمستے۔ وہ بھابی جی سے کہیئے گا انھوں نے جو اُون لانے کے لیے کہا تھا وہ دلی سے آگیا ہے۔ میں آج شام کو گھر پے لے آؤں گی۔ اور بچے ٹھیک ٹھاک ہیں؟ سُنا تھا آپ نیا اسکوٹر لینے والے ہیں، بہت بہت مبارک ہو۔"

جی میں آیا کہہ دوں کیوں آپ وقت ضائع کر رہی ہیں۔ سیدھے سیدھے کہیئے آپ کو دیر ہو رہی ہے اور اسکوٹر پر لفٹ چاہیئے آفس تک، اس لیے کہ ان کا آفس میرے راستے میں پڑتا ہے۔ مگر ہم نے ضبط کیا۔ بچوں کی خیریت بتائی۔ کھنہ صاحب کا حال چال پوچھا۔ اون منگوانے کا شکریہ ادا کیا۔ نئے آنے والے اسکوٹر کی مبارکباد کا بھی شکریہ کہہ دیا۔ ہماری جوابی گفتگو ختم ہوتے ہوتے ہمارا اسکوٹر رفتار پکڑ چکا تھا اور مسز کھنہ ہمارے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی مزے سے اسکوٹر کے پچھلے ٹائر کی بد دعائیں نظرانداز کر رہی تھیں۔

ہر اتوار کو یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی کے گھر جاکر ٹیلی وژن دیکھتے ہیں اور دوپہر کو پروگرام ختم ہوتے ہی وہیں لنچ تناول فرماکر اپنے گھر لوٹتے ہیں اور لمبی تان کر سوتے ہیں۔ مگر ہر اتوار سچ مچ کا سنڈے نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم سب ناشتہ کے بعد تیار ہو رہے ہیں کہ آصف صاحب کے ہاں نیا ٹی وی آیا ہے آج ان کے گھر جاکر ان کے [illegible] ٹیلی وژن کی تعریفیں کریں گے۔ اِتنے میں گھنٹی بجتی ہے۔ ہم ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولتے [illegible]

سے آصف صاحب معہ اپنے پانچ بچوں، بیگم اور ساس کے ہمارے گھر میں در آتے ہیں اور آتے ہی بے تکلفی سے ٹی وی آن کر دیتے ہیں "بھئی تمہارا ٹی وی پرانا ہونے کے باوجود شاندار ہے سنا ہے تمہارے گھر آج تک میکنیک نہیں آیا۔ ایک ہمارا ٹی وی ہے کل سے خراب پڑا ہے"۔ ہم یہ تعریف سن کر پگھل جاتے ہیں۔ ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتے ہیں! بیگم باورچی خانہ میں معروف ہو جاتی ہیں"۔

بھلا ہو ٹیلی ویژن کا کہ جہاں اس نے بچے بچے کو فیملی پلاننگ کے نئے نئے طریقوں کی خاطر خواہ معلومات از بر کرادی ہیں اور جوڈو اور کراٹے کے کرتبوں کی نقل کرنا سکھا دیا ہے وہیں اس نے اب دور دراز کے ممالک میں ہو رہے اہم مذاکرات اور فسادات کا آنکھوں دیکھا حال پردے پر پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ پہلے ریڈیو پر صرف سن لیتے تھے کہ دشمن ممالک کے سربراہوں کی آج ملاقات اور بات چیت ہوئی۔ اب دیکھنے کو ملتا ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ملکوں کے سربراہ کیمرے کے سامنے ہاتھ ملاتے ہیں، گلے ملتے ہیں اور لمبے چوڑے صوفے پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ یہ بھی ڈپلومیٹک اندازِ بیان کا ایک حصّہ ہے۔ وہ دونوں خوب جانتے ہیں کہ آج کی کامیاب بات چیت کے بعد کل ایک دوسرے پر بم برسانا ہی ہے آج مسکرانے اور باتیں بنانے کا موقع ملا ہے تو سچ کیوں بولیں؟ یہ ایک تبسم بھی کیسے ملتا ہے۔

انسان نے ستاروں کسے آگے جو جہاں آباد کئے ہیں، جنہیں فائیو اسٹار ہوٹل کہا جاتا ہے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ہر اسٹاف ممبر کے لباس اور ہونٹوں پر ستارے چمکتے صاف نظر آتے ہیں۔ اور یہ تماشا شب و روز ہوتا رہتا ہے ریسپشن کاؤنٹر پر پہنچتے ہیں تو دلفریب خاتون دلآویز مسکراہٹ کی پھوار برساتے ہوئے اس قدر میٹھی آواز میں ہم کلام ہوتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ان سے تھوڑی سی مٹھاس قرض لے کر اپنی بیگم کے حوالے کر دیں۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے ہم نے یہ خیال بیگم پر ظاہر کیا تو فوراً جواب ملا "اگر آپ مجھے گھر میں ہوٹل جیسا آرام صرف آٹھ گھنٹے کے لیے ہی مہیا کر دیں اور میرا جیب خرچ فائیو اسٹار تنخواہ کے برابر کر دیں تو میں اس سے کہیں زیادہ شیریں گفتگو کر سکتی ہوں"۔ ہمیں یہ تلخ جواب سن کر خوشی تو ہوئی لیکن ہم نے سوچا جو لوگ اپنی بیوی کو فائیو اسٹار تنخواہ کے برابر صرف جیب خرچ کے لیے دیتے ہیں، وہ گھر میں اپنی بیوی کے پاس تو رہتے نہیں ہیں، ان کی عمر تو واقعی فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ہی گذرتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً یہی ہے کہ وہاں ہر روز نت نئے اندازِ بیان دیکھنے، سننے اور برتنے کو مل جاتے ہیں، یہ سہولت گھر میں کہاں؟۔

کہتے ہیں کہ دنیا کا کامیاب جھوٹ وہ ہوتا ہے جس میں آدھا سچ شامل ہو۔ جہاں آپ پر دروغ گوئی کا الزام لگا، آپ نے آدھا سچ نکال کر دنیا کے سامنے رکھ دیا اور لوگ آپ کی پرستش کرنے لگے۔ یوں دیکھا جائے تو ہمارے سماجی نظام کی بنیاد ہی یہ آدھا سچ ہے۔ آپسی تعلقات، رشتہ داری، تجارت، لین دین، شعر و ادب خصوصاً مزاح نگاری بھی کچھ سفید جھوٹ کے سہارے زندہ ہیں۔ یہی وہ اندازِ بیان ہے جس کی ہم سب کو ضرورت ہے۔

■■

خواہ مخواہ (بمبئی)
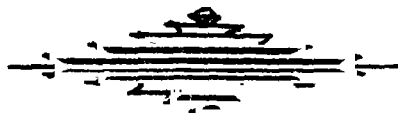
غزل

تصور میں یوں ہم وطن دیکھتے ہیں
بیاباں میں جیسے چمن دیکھتے ہیں

شہر میں بجھی نہ کبھی پیاس جن کی
وہ جنگل میں سیندھی کا بن دیکھتے ہیں

صدارت کی لالچ میں ناکام لیڈر
کوئی بزم یا انجمن دیکھتے ہیں

ادب میں سیاست کا چکر چلا کر
تماشائے اہلِ سخن دیکھتے ہیں

یہ سوداگرانِ ادب بھی عجب ہیں
ہُنر کی بجائے چلن دیکھتے ہیں

تقاضائے فن کی نہیں ان کو پرواہ
یہ تاجر فقط حُسنِ ظن دیکھتے ہیں

ضعیفی میں ہے عقدِ ثانی کی خواہش
پری چہرہ، شعلہ بدن دیکھتے ہیں

لحد میں ہے اک پاؤں اور ایک باہر
کفن ڈھونڈنا تھا دلہن دیکھتے ہیں

جو نازک ہیں اِن کو تلاشِ قوی ہے
جو ہیں سخت وہ گلبدن دیکھتے ہیں

کہیں بڑھ گیا ہو نہ وہ رات کی رات
نہاتے ہی صبح وزن دیکھتے ہیں

کھڑے ہو کے پھر روبرو آئینے کے
وہ شرما کے اپنا بدن دیکھتے ہیں

سمجھتے ہیں خود کو بھی ہم برہنہ جب
غریبوں کے ننگے بدن دیکھتے ہیں

بُرا ہو گرانی کا زیور تو کیا ہم
ذہن اور قلم تک رہن دیکھتے ہیں

مجھے خواہ مخواہ چھیڑتے ہیں وہ اکثر
خیالوں میں جب بھی مگن دیکھتے ہیں

قطعات

ہماری زندگی، گو، رنج اور غم سے عبارت ہے
مگر خوشیوں سے منہ کو موڑ لینا بھی حماقت ہے
ظرافت صرف اک فن ہی نہیں بلکہ سعادت ہے
ہنسا کر غم کسی کے بانٹ لینا بھی عبادت ہے

اٹھائینگی اگر وہ اینٹ تو مارونگا پتھر سے
مدر اِن لا ذرا کہہ دیجئے گا اپنی دختر سے
اسی میں خیریت ہے خواہ مخواہ ٹکرائیں نہ مجھ سے
بدن شیشے کا ہے جن کا وہ ٹکرائیں نہ پتھر سے

صبیح محسن (کراچی)

وادئ پُرخار

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو اگر یہ اندازہ ہوتا کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ ادب کے شعبے میں نمایاں مقام حاصل کرنے کا سب سے مؤثر نسخہ یہ ہوگا کہ دوسروں کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیا جائے، تو شاید وہ شاعری سے تائب ہو کر تذکرہ نویسی پر زیادہ توجہ دیتے اور "گلشنِ بے خار" کی دبلی پتلی سی ایک جلد کے بجائے اس کی کئی عدد صحت مند جلدیں چھوڑ جاتے۔ مولوی محمد حسین آزاد پیش بینی میں شیفتہ سے آگے رہے انھوں نے ادبی شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد کے حالاتِ زندگی اکٹھا کئے اور ان پر اپنی رائے بھی لکھی۔ اس طرح آبِ حیات وجود میں آئی جو آزاد کی ادبی حیثیت کی ایک اہم وجہ بنی۔

آج کل ہمارے یہاں ادب میں سب سے اونچا مقام تنقید نگاروں کو حاصل ہے۔ وہ بھی آزاد کے نسخے پر عمل کرتے ہیں ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ جن کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے انھیں غالب کے مقابلے میں ذوق کی طرح بڑا درجہ دیدیتے ہیں اور جس سے ناراض ہوتے ہیں، مومن کی طرح اپنے تنقیدی مضامین میں اس کا تذکرہ تک نہیں آنے دیتے۔

ہم بھی آخر انسان ہیں۔ ہمارا بھی بڑا دل چاہتا ہے کہ ادب کے حوالے سے اپنے لیے کوئی مقام پیدا کریں لیکن مشکل یہ ہے کہ تنقید نگار ہم بن نہیں سکتے۔ اِس کے لیے طنز و مزاح اور فقرے بازی کی جس اعلیٰ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں موجود نہیں۔ لہٰذا آسان تر راستہ اختیار کرتے ہیں یعنی ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن یہاں بھی ایک مشکل آن پڑی ہے۔ "گلشنِ بے خار" والے شیفتہ کو تو گلستانِ ادب میں کوئی کانٹا نظر ہی نہیں آیا تھا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی پھول دکھائی نہیں دیتا۔ جب ہم ایوانِ ادب میں اپنی پچھلی نظار والی نشست سے دوسروں کو دیکھتے ہیں تو سب کے سب ہماری آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہی نہیں بلکہ بالکل کانٹا ہی لگتے ہیں۔ بہرحال جو ہو سو ہو، اب تو ہم اس وادئ پُرخار میں نکل ہی آئے ہیں۔ گوہرِ مقصود کے حصول کی خاطر خار کو بھی گل کہنا پڑا تو سینے پر پتھر رکھ کر کہہ لیں گے۔ لیجئے گلدستہ حاضر ہے۔

یہ ہیں جناب سلیجہ لالو کھیتری۔ استاد امام بخش ناسخ سے ان کا کوئی نسبی تعلق تو نہیں ہے لیکن ڈیل ڈول

...ہ چال ڈھال سے پورے پہلوان لگتے ہیں۔ اُنھوں نے ایک اَدبی اکھاڑہ بھی کھول رکھا ہے جو ماہنامہ ڈنگر...
...ے نام سے مشہور ہے۔ موصوف اس کے مالک اور مُدیر ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ شاعری اور پہلوانی کے علاوہ استاد ناسخ کے اور کیا مشاغل تھے۔ لیکن جناب کلیجہ کی ...مروفیات کا دائرہ خاصہ وسیع ہے۔ شاعری اور رسالے کا ذکر تو ہم کر چکے۔ ان کا ایک اشاعت گھر بھی ہے اور ...ژوں کی ایک دوکان بھی۔ پہلوانی، ادب اور تجارت کا ایسا حسین اور کامیاب سنگم ہم نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

خالص ادب کی ناقدری اور ڈائجسٹوں کے اس دَور میں اہلِ ادب کو حضرت کلیجہ کا شکر گزار ہونا چاہیے ...وہ ایک خالصتاً ادبی رسالے کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ اُسے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ...ر رہے ہیں۔ لیکن حسد کرنے والے اور شر پھیلانے والے کہاں نہیں ہوتے۔ ایسے ہی بعض فتنہ پردازوں کا کہنا ...ہے کہ موصوف نے ادب میں تجارت یا تجارت میں ادب کو شامل کر دیا ہے۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ ان کے ...رسالے میں چھپنے کے لیے ایک باقاعدہ نرخنامہ ہے۔ مثلاً اگر آپ اپنی غزل شائع کروانا چاہتے ہوں تو پانچ اشعا...ر کی غزل کے لیے دو سالانہ خریدار بنائیے اور دس اشعار تک کے لیے چار۔ چھ صفحے کے افسانے کے لیے ایک ...صفحے کا اشتہار دلوائیے اور اگر اپنی ادبی تخلیقات پر توصیفی مضمون شائع کروانا ہو تو اشتہار بیک کور (BACK COVER) کا ہونا چاہیے۔ جناب کلیجہ نے بعض زندہ ادبی شخصیتوں کے بارے میں خاص نمبر ...بھی شائع کیے ہیں لیکن اس کا نرخ تا حال نہیں معلوم ہو سکا کیونکہ بیان کرنے والوں کا بیان ہے کہ انکم ...والوں کے خوف سے اِسے بہت ہی خفیہ رکھا گیا ہے۔

نرخنامے والی بات درست ہے یا نہیں، ہم کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ البتہ موصوف کی تجارتی ...وجھ بوجھ کے تو ہم بھی قائل ہیں۔ پچھلے برس انھوں نے شاہ کے ایک مصاحب کی کتاب اپنے اشاعت گھر ...سے شائع کی۔ تمام سرکاری اداروں اور کتب خانوں کو پہلے ہی اس کتاب کی خریداری کی ہدایات جاری ہو چکی ...تھیں۔ پانچ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ پھر ان ہی مصاحب کی سفارش پر ملک افرنگ میں منعقد ہونے ...والی ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں سرکاری مندوب کی حیثیت سے شرکت کے بہانے نصف جہان ...کی سیر کی، سو الگ۔

جناب نشتر لوکیوی کے متعلق ہم اتنا تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تعلق صفِ اول سے ہے ...لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ صفِ اول کے نقاد ہیں یا طنز نگار یا مزاح نگار۔ بات یہ ہے کہ ان کی تحریروں ...میں ایک طرف تو دوسرے مصنفین کی تخلیقات کا تذکرہ ملتا ہے اور دوسری طرف ان میں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ ...اتم پائی جاتی ہیں جو ایک اعلیٰ پایہ کی طنزیہ یا مزاحیہ تحریر میں موجود ہونا چاہئیں۔ اسی لیے کبھی تو ہمیں ان پر نقاد ...نگار ہونے کا گمان گزرتا ہے اور کبھی طنز و مزاح نگار ہونے کا شبہ۔ ویسے وہ خود اپنے آپ کو تنقید نگار کہ...لوانا پسند کرتے ہیں، لہٰذا ہم بھی ان کو فی الحال اسی خانے میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ بھی اچھا ہی ہے کہ وہ تنقید نگار کے طور پر خود کو منوائے ہوئے ہیں کیونکہ آج کل کا دور دراصل تنقید ...کا دور ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ ناکام ادیب نقاد بن جاتا ہے۔ خود ادب تخلیق نہیں کر سکتا ...تو دوسروں کی تخلیقات کی تعریف یا تنقیص کر کے ادب کی دنیا میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اب تو...

یہ ہے کہ اگر تنقید نگار اپنا قلم رکھ دے تو شاعر، افسانہ نگار اور انشا پرداز پیدا ہوتے ہی بند ہو جائیں کیونکہ فی زمانہ ادب میں مقام حاصل کرنے کے لیے پہلے کسی نامور نقاد کے مضامین میں اپنے لیے جگہ حاصل کرنا ازحد ضروری ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں، بڑے نامور افسانہ نگار۔ ان کے علامتی افسانوں کے ایک درجن سے زیادہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم نے آج تک ان کا ایک بھی مجموعہ کسی بک اسٹال پر ڈھونڈے سے بھی نہ پایا۔ ایک دن ہم نے ان سے کہا "آپ یقیناً بہت مقبول افسانہ نگار ہیں جب ہی تو آپ کے افسانوں کے مجموعے بازار میں آتے ہی فروخت ہو جاتے ہیں اور ہمیں کبھی بھی دکان پر نظر نہیں آتے"۔

انھوں نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ پھر اطمینان سے بولے "اگر دکانوں پر بھیجے جائیں تو وہاں نظر بھی آئیں"۔ ہم چونکے "کیا مطلب؟"

"ارے بھئی، میرے پاس ملک کے معتبر تنقید نگاروں کی ایک فہرست موجود ہے۔ بس میں اپنے مجموعوں کی اتنی ہی کاپیاں چھپواتا ہوں جتنے نام اس فہرست میں درج ہیں کبھی جی چاہا تو آٹھ دس کاپیاں زیادہ بھی چھپوالیں تاکہ کچھ اور صاحبانِ کرم کو تحفتاً پیش کرسکوں"۔

ہم نے حیرت سے پوچھا "لیکن پھر آپ قاری تک کس طرح پہنچتے ہیں"؟

"قاری" اب وہ چونکے "قاری کا بھلا ادب سے کیا تعلق؟ وہ نہ تو مجھے ڈاکٹر نشتر کی کتاب "مختصر تاریخ ادبِ اردو" میں جگہ دلوا سکتا ہے اور نہ جناب انٹینا کے ادبی کالم "لٹریری راونڈ اباوٹ" میں۔ بھائی میرے! قاری سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی گرہ سے دام خرچ کر کے میری کتاب کی ایک کاپی ہی خرید لے۔ تو پھر مجھے کیا پڑی کہ میں ناحق کاغذ، جلد بندی اور چھپائی پر گھر کا آٹا گیلا کروں"؛

بات کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آچلی تھی۔ ویسے بھی یہ زمانہ اور ہے۔ جب باپ کے بغیر ٹسٹ ٹیوب کے ذریعے بچے پیدا ہو سکتے ہیں تو قاری کے بغیر نقاد کی کرم گستری سے ادیب کیوں نہیں بن سکتے؟

ہمارے یہاں خواتین ادب میں صرف دو حالتوں میں کوئی مقام پاسکتی ہیں۔ یا تو ان خاتون کی تحریر چونکا دینے والی ہو، یا پھر اُن کا چہرہ۔ ہمارے ملک کی نوعمر لیکن نامور ادیبہ، نازنین ناز صاحبہ، خوش قسمت ہیں کہ ان کے یہاں یہ دونوں صفات موجود ہیں۔ اس اعتبار سے ادبی دنیا میں ان کی حیثیت دو آتشہ غزل کی سی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مستورات صرف خواتین کے رسائل پڑھا کرتی تھیں اور اگر ان میں سے کسی کو شوق چرّاتا تھا تو گھر والوں سے چھپ کر کسی اور نام سے ان ہی رسالوں میں "جمیلہ کی آپ بیتی" یا "سگھڑ سکینہ" جیسی معاشرتی و اصلاحی کہانیاں لکھا بھی کرتی تھیں۔ اب دور دوسرا ہے۔ خواتین کے رسالے آج بھی نکلتے ہیں۔ لیکن ان میں لکھنے والے بیشتر مرد ہوتے ہیں جو نسوانی ناموں سے لکھتے ہیں۔ آج کی ادیب خواتین مردوں کے رسالوں میں چھپتی ہیں اور ایسی چیزیں لکھتی ہیں کہ مرد بھی ان کو پڑھ کر شرما جائیں۔

نازنین ناز صاحبہ شعر بھی کہتی ہیں اور افسانے بھی لکھتی ہیں۔ موصوفہ زندگی سے ادب کے گہرے رشتے کی قائل ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں میں حقیقت نگاری کے ایسے نادر نمونے ملتے ہیں کہ جوان تو خیر جوان ہی ہیں، بوڑھوں کا شباب بھی لوٹ آتا ہے۔

موصوفہ طالب علمی کے زمانے سے ہی ادب و ثقافت کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہی ہیں۔ پہلے کالج اور جامعہ کے مباحثوں اور مشاعروں میں شرکت کرتی رہیں۔ پھر ریڈیو کی بزم طلباء میں حصہ لینے لگیں۔ اور جس دن وہ ٹیلی ویژن پر آئیں، اس دن تو گویا فتح و کامرانی نے ان کے قدم چوم لیے۔ کوئی کور ذوق یا کور چشم ہی ہوگا جو اُن کے خوبصورت کلام اور پُرکشش شخصیت سے متاثر نہ ہوا ہو۔ حد تو یہ ہے کہ حضرتِ نشتر لوکیلوی جیسے خشک اکل کھُرے اور ہمیشہ بُخل سے کام لینے والے نقاد نے بھی ان کی تعریف و توصیف میں ۲۷ صفحات کا ایک مضمون سپردِ قلم کر ڈالا ویسے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ادب کا نقاد تو حسن کا متلاشی اور دلدادہ ہوتا ہے، خواہ یہ حسن کلام میں ہو یا صاحبۂ کلام میں۔

پچھلے چند برسوں میں سفرنامہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف بن گیا ہے۔ سفرنامے کو مقبولیت دلانے کا سہرا جناب آبلہ سودائی کے سر ہے۔ کچھ لوگ اس سلسلے میں مستشرق حسین پاپڑ کا نام بھی لیتے ہیں لیکن ہمیں اس سے یوں اختلاف ہے کہ ہماری رائے میں پاپڑ صاحب کی تحریریں سفرنامے کے زمرے میں ہی نہیں آتیں۔ ویسے تو حضرت سودائی بھی کچھ کم نہیں لیکن جناب پاپڑ کی تحریریں تو سراسر افسانہ نگاری بلکہ افسانہ طرازی کا نمونہ لگتی ہیں۔

جناب سودائی نے بڑی دنیا دیکھی ہے ایران، توران کا کیا ذکر کہ جیٹ طیارے کی شکل میں تختِ سلیمانی کے عام ہو جانے کے بعد یہ خطے تو اپنے گھر کے آنگن ہی کا کوئی گوشہ لگنے لگے ہیں، سودائی صاحب کبھی تو جاپان میں گیشاؤں پر تحقیق کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور کبھی لاس اینجلیز کے نائٹ کلبوں اور قمار خانوں میں گھوم گھوم کر مغربی مادہ پرستی کے زیرِ اثر مشرق کی پرانی اقدار کے مٹنے کا نوحہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موصوف مشرق کا سفر کریں یا مغرب کا، قیام ہمیشہ پانچ ستاروں والے ہوٹل ہی میں کرتے ہیں کہ ستاروں کے کھیل نے انھیں اس قابل بنا دیا ہے کہ اپنی گرہ سے ایک دمڑی بھی خرچ کیے بغیر وہ ان بلندیوں پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ بے چارے غالبؔ جن کی تنخواہ میں ساہوکار نصف کا حصے دار بن جایا کرتا تھا سرکار سے اپنی پنشن میں چند روپوں کا اضافہ بھی نہ کروا سکے تھے حالانکہ اس کی خاطر انھوں نے دلی سے کلکتے تک کا سفر بھی کیا اور اس کے اخراجات بھی اپنے پلّے سے ادا کیے۔ اور ایک دور یہ ہے کہ غالبؔ کے معنوی پوتے پڑپوتے سرکار سے نہ صرف اتنی لمبی تنخواہیں پاتے ہیں کہ خود ساہوکار بنے بیٹھے ہیں بلکہ سرکار ہی کے خرچ پر کبھی اس کانفرنس کے بہانے تو کبھی اس سیمینار کے طفیل دُنیا کے چاروں کھونٹ کی سیر کرتے ہیں اور وہ بھی بہ کرّ و فرِ شاہانہ۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا جناب سودائی کے سفرناموں کا۔ موصوف کے سفرنامے ہم بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاتھ میں تو سفر کی لکیر ہی نہیں۔ ناچار سودائی صاحب کے سفرناموں کے ذریعے سے ہی ہم اپنی ناآسودہ حسرتوں کو بالواسطہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ پیرس کے اسٹرپ ٹیز شو STRIP-TEASE SHOW کا حال لکھتے ہیں یا نیویارک کے گرینویچ ویلیج میں کسی باغی حسینہ کے ساتھ اپنے ایڈونچر کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہم خود کو ان کی جگہ تصوّر کر کے تھوڑی دیر کے لیے بڑی فرحت محسوس کرتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ حضرتِ سودائی اس نوعیت کی ہر روداد کے بعد ایک دو پیراگراف ایسے ضرور لکھتے ہیں جن میں مغرب کے معاشرے کے کھوکھلے پن کا ماتم کیا جاتا ہے اور اپنے عزیز ہم وطنوں کو ان کی روش سے دور رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ان پند و نصائح پڑھ کر منہ کا ذائقہ تو ضرور خراب ہو جاتا ہے لیکن پھر ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر وہ اتنا بھی نہ کریں تو انھیں

مصلحِ قوم کون مانے گا؟ علاوہ بریں، یہ بھی تو ہے کہ حضرت سودائی کوئی ہماری طرح کے بے ننگ و نام مقوّا بھی نہیں کہ اپنی ذات کو یوں بے پردہ کردیں۔ ہلکا ہی سا سہی، مگر غلاف تو انھیں بہرصورت چڑھانا ہی پڑے گا۔

جناب سودائی اعلیٰ درجے کے شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ گیت لکھنے میں تو ان کا کوئی ثانی ہی نہیں۔ ان کا ترنم انتہائی کیف آگیں ہے۔ اگرچہ انھوں نے خود کبھی اس کا تذکرہ تو نہیں کیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ انھیں فنِ موسیقی میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ دخل حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت سودائی اِس دَور کے خسرو ہیں۔ ہمارا اشارہ حضرت نظام الدین کی چوکھٹ والے خسرو کی طرف ہے، ایران کے خسرو پرویز کی جانب ہرگز نہیں، گرچہ بعض فتنہ پرداز موصوف کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر ایسا بھی کہتے ہیں۔

تو یہ ہیں وہ چند کانٹے جو ہم نے اپنے دامن کے لیے چُنے ہیں۔ قارئین باتمکین! وادیٔ پُرخار کی پہلی فصل اختتام کو پہنچی۔ اس کی اِشاعت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے اس حقیرِ پُرتقصیر کو ہمت اور زندگی بخشی تو انشاء اللہ اس کی مزید فصلیں بھی ضبطِ تحریر میں لائی جائیں گی۔ درخواست ہے کہ مصنف کے حق میں دُعا فرمائیں۔

□□

غزل

اقبال ہاشمی
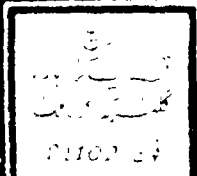
(علامہ اقبال سے معذرت کیساتھ)

کہاں چوروں کو اپنے بس میں کرسکتی ہیں تدبیریں
ہنر ہاتھوں میں پیدا ہو تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس زورِ توہم کا
یہاں طوطے کے کہنے سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ضررِ محکم، جدلِ پیہم، عداوت فتنۂ عالم
فسادِ زندگانی میں سیاست کی ہیں شمشیریں
چھری نے ربط قائم کردیا ہے دست و گردن میں
لہو قصاب کا ٹپکے اگر بکرے کا دل چیریں
مزائیل، آبدوزوں، راکٹوں کی دوڑ ایسٹم بم
سنا ہے ہاشمی یہ امنِ عالم کی ہیں تفسیریں

ضرورتِ رشتہ

مختار یوسفی (مالیگاؤں)

میرے سالے کا کئی شہروں میں کاروبار ہے
تین بھائی پانچ بہنیں والدین اور بھابیاں
ہے سیاست میں بھی اس کی ایک اچھی مارکیٹ
لگ رہا ہے وہ علیجی ملک کا کرتا ہے ٹور
اک جوا خانے کا مالک ہے کماتا خوب ہے
گیت اور سنگیت کا بھی اُس کو بے حد ذوق ہے
دھر لیا جاتا ہے جب بھی وہ کسی کے خون میں
ہے شریف النفس بھی وہ اور اپٹوڈیٹ بھی
اس کی نسبت کے لیے نوخیز لڑکی چاہیئے
فاقہ کرکے رات دن جو خوش ہمیشہ رہ سکے
یہ شرائط ہوں اگر منظور تو دے کر جواب
ریل کے سترہ ٹکٹ بھی ساتھ خط کے بھیج دے
سارے اہلِ خانہ لڑکی دیکھنے کو آئیں گے

خوبصورت خوش مزاج اور کام میں ہشیار ہے
ساتھ ہی رہتے ہیں اس کی ساری بہنوں کے میاں
ہر الیکشن میں کھڑا کرتا ہے اپنا کنڈیڈیٹ
ٹیپ، وی سی آر ٹی وی لے کے آتا ہے ضرور
افیون اور شراب کا بیوپار بھی محبوب ہے
ناچ نوٹنکی کا رسیا اور رمی کا شوق ہے
جھٹ سے پاتا ہے رہائی ایک ٹیلیفون میں
کالے دھندوں کا ہے اک خاصا بڑا اسٹیٹ بھی
نیک سیرت خوبصورت صاف ستھری چاہیئے
ظلم گھر والے کریں بھی تو خوشی سے سہہ سکے
وہ بنائے زندگی کو خوشگوار و کامیاب
اور سب کی میزبانی کا شرف حاصل کرے
تین دن تک غور کرکے فیصلہ فرمائیں گے

اپنا مستقبل بنانے کا جو ہو اُس کو خیال!
وقت کم ہے دیدے منظوری بجائے قیل و قال!

عابد معز (سعودی عرب)

کائنات میں رنگ

انسان پیدا دو قسم کی جنس میں ہوتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بعض مرتبہ تیسری جنس بھی وجود میں لائی جاتی ہے جس کے لیے پیدا کرنے والے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ پسند اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا کے تحت چاہے تو کوئی اپنی جنس بدل لے، شمیم خاں، شمیم النساء یا دِجے کمار، وجے کماری بن جائے لیکن قدرتی طور پر لڑکا ہوتا ہے یا لڑکی ہوتی ہے ماہرین کے خیال میں لڑکا یا لڑکی ہونے کے امکانات ففٹی ففٹی ہوتے ہیں اب اس جنون کا کیا کیجئے کہ ہر اُمید بیوی اور شوہر چاہتے ہیں کہ انھیں لڑکا تولد ہو۔ صرف لڑکا ہو اور لڑکے کے سوا کچھ نہ ہو۔ ویسے کبھی کبھار لڑکی کی بھی تمنا کی جاتی ہے اکثر و بیشتر نصف درجن لڑکوں کے بعد۔

کہتے ہیں "وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" ہمارے خیال میں وجودِ زن خود مرد کے وجود کی مرہونِ منت ہے۔ یہ بات ساری کائنات میں نہ سہی اُس سرزمین پر سچائی ضرور رکھتی ہے جس پر ہمارا وجود ہے۔ ہمارے یہاں لوگ لڑکوں کی آس پر لڑکیاں پیدا کرتے ہیں اور جب لڑکیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو انھیں پالا اور پوسا جاتا ہے تاکہ کائنات میں رنگ بھرا رہے۔ ہم ایسے کئی خاندانوں سے واقف ہیں جہاں لڑکے کی آس پر کائنات میں رنگ بھرنے کے لیے لڑکیوں کی رنگا رنگ فوج تیار ہوئی ہے۔ جب لڑکا تولد ہوا تو گویا دونوں جہاں کی دولت مل گئی، خاندان کا نام روشن کرنے والا آگیا۔ بڑھاپے کا سہارا اور ٹھکانا مل گیا اور فیملی پلاننگ پر عمل شروع ہو گیا لیکن بعض اوقات مردِ مجاہد کا دور دور تک پتہ نہیں رہتا۔ ہم ایک صاحب سے واقف ہیں جنھوں نے لڑکے کی آس پر پہلی بیوی سے چھ لڑکیاں پیدا کیں، دوسری شادی کی اور دوسری بیوی سے بھی پہلی سے کچھ زیادہ ہی لڑکیاں ہوئیں تو تھک ہار کر ایک لڑکا گود لیا جو لاڈ پیار میں اتنا بگڑا کہ گھر چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

لڑکا یا لڑکی کا پیدا ہونا، فی الحال انسان کی مرضی کے تابع نہیں ہے۔ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ میں نہ ہو تو انسان خدا سے رجوع ہوتا ہے۔ دعائیں مانگتا، منتیں مانگتا اور نذر و نیاز کرتا ہے۔ بزرگوں کی مزاروں کی زیارت کرتا ہے۔ خیرات کرتا ہے۔ وظیفہ پڑھتا ہے تعویذ اور گنڈے کے چکر میں پڑتا اور جادو ٹونے کا سہارا لیتا ہے۔ گھر کی بوڑھی عورتیں کچھ طریقے بھی بتلاتی ہیں۔ کہ صبح سویرے کسی لڑکے کی ماں کا منہ دیکھنا چاہیئے۔ لڑکوں کا سایہ پڑنا چاہیئے۔ بعض دن لڑکوں کے لیے مبارک ہوتے ہیں۔ غذا میں صرف نر چیزیں استعمال کرنی چاہئیں۔ داہنے یا بائیں سونا بھی جنس پر اثر

کرتا ہے۔ لڑکیوں کے کچھ مخصوص نام رکھنے کے بعد لڑکا ہوتا ہے سو وہ نام رکھا جاتا ہے۔ حکیم دوائیں کھلاتے ہیں کشتے استعمال کرواتے ہیں۔ جنس مقرر کرنے کے ماہر طبیب بھی پائے جاتے ہیں جو لڑکا پیدا کرنے کے لیے دوا دیتے ہیں۔ لڑکا پیدا کرنے کی محنت اور ریاضت کی فہرست کافی طویل ہے۔ جتنی زیادہ کوشش ہوتی ہے اتنا ہی ناکامی کا دیکھنا پڑتا ہے!

تمام کوششوں کے بعد بھی جب لڑکی ہی تولد ہوتی ہے تو گھر میں ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کو قصور وار گردانتا ہے۔ اُسے ڈراتا، دھمکاتا اور اُس پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اس کا ساتھ چھوڑنے کی وارننگ دیتا ہے۔ لڑکی کی ولادت کی خبر سن کر بیوی اور بیٹی کی صورت نہیں دیکھتا۔ بیوی رو رو کر ہلکان ہوتی ہے۔ ہمارے ایک ایسے ہی لڑکیوں کے باپ دوست اپنی بیوی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور شکایت کی "ڈاکٹر صاحب یہ صرف لڑکیاں پیدا کرتی ہے۔ اس کا علاج کیجئے" ڈاکٹر صاحب نے بتلایا کہ عورت جنس مقرر کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی' یہ مبارک کام مرد انجام دیتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن بیوی انھیں طعنہ دیتی ہے اور وہ گردن نیچی کئے خدا سے شکوہ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

لڑکے کی پیدائش پر دوست احباب پُر زور مبارکباد دیتے ہیں جیسے والد نے بہت بڑا کام کیا ہے جب کہ لڑکی پیدا ہونے پر کہتے ہیں "اللہ کی مرضی' قدرت کے کام میں کون دخل دے سکتا ہے۔ اس مرتبہ لڑکی ہوئی ہے انشاءاللہ آئندہ لڑکا ہوگا"۔ دوسری مرتبہ بھی لڑکی ہونے پر اکثر لوگ مبارکباد نہیں دیتے بلکہ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں "پریشانی کی بات نہیں ہے۔ لڑکا یا لڑکی، کوئی فرق نہیں پڑتا، ہر کوئی اپنی قسمت لے کر آتا ہے۔ تقدیر اچھی ہونی چاہیئے"۔ دوسری لڑکی کے بعد تیسری مرتبہ لڑکے کے لیے باقاعدہ کوشش کی جاتی ہے۔ تیسری مرتبہ بھی لڑکی پیدا ہونے پر احباب پرسہ دینے آتے ہیں۔ ڈھارس بندھاتے ہیں۔ "آج کے دور میں لڑکیاں ہی اچھی ہیں۔ بوڑھاپے میں ماں باپ کا خیال رکھتی ہیں۔ لڑکے اپنی بیگموں کو ساتھ لے کر الگ ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں مثالیں بھی دی جاتی ہیں "فلاں صاحب کے چار لڑکے ہیں۔ چاروں اپنے سسرال میں ہیں۔ بوڑھا اور بوڑھی اکیلے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں" چوتھی مرتبہ لڑکے کی قوی اُمید رہتی ہے۔ دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ تین لڑکیاں ہو چکیں، بس اب لڑکے کی باری ہے۔ لیکن چوتھی مرتبہ بھی لڑکی کی پیدائش پر ہمت' ہمدردی اور دلاسہ دینے والے رفوچکر ہو جاتے ہیں لڑکوں کے ماں باپ ان کے لڑکے کا ہاتھ مفت نہ مانگ بیٹھیں۔ جو بھی ملنے آتا ہے دبے دبے الفاظ میں رائے دیتا ہے کہ بھئی اب بس بھی کیجئے۔ لڑکے کی آس میں کب تک بیوقوفی کرتے رہیں گے۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، صرف دو یا تین ہونی چاہیں۔ آج کل لڑکیاں' لڑکوں کے مقابلے پر اُتر آئی ہیں۔ اس لیڈی ڈاکٹر کی مثال دی جاتی ہے جس نے ڈلیوری کی ہے۔ پانچویں لڑکی تولد ہونے کے بعد سے باضابطہ ماں باپ کی بے وقوفی کے چرچے ہونے لگتے ہیں "عجیب احمق شخص ہے۔ لڑکے کی آس پر اپنی اور اپنی لڑکیوں کی زندگیاں برباد کرتا چلا آ رہا ہے"۔ ویسے آج کل دوسری یا تیسری کے بعد مزید اولاد کی چاہت بہت ہی کم لوگ کرتے ہیں۔ پھر بھی بعض باہمت لوگ لڑکے کی آس جاری رکھتے ہیں۔ چھٹی، ساتویں یا آٹھویں مرتبہ لڑکا ہو جائے تو پھر صاحب اولاد کی ہمت و استقلال اور ثابت قدمی کی داد دی جاتی ہے۔

لڑکے یا لڑکی کی پیدائش سے والدین کی عادات و اطوار بلکہ چال چلن میں بھی فرق آتا ہے۔ لڑکا پیدا ہونے پر والدین کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے کہ ہم نے بہت بڑا تیر مارا ہے۔ اترا کر چلتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا جلنا کم

کر دیتے ہیں کہ جو بھی ہمارے لڑکے کو اپنی فرزندی میں لینا ہو آئے اور ہماری خوشامد کرے۔ ڈھیر سا جہیز دے اور خطیر گھوڑے جوڑے کی رقم بھی دے۔ اس کے برخلاف لڑکی کے باپ کے رویّہ میں نرمی آجاتی ہے۔ دوست احباب سے میل ملاپ بڑھاتے ہیں تاکہ رشتہ داری قائم ہوسکے۔ لوگوں کے دکھ درد میں ہاتھ بٹاتے ہیں تاکہ دوسرے ان کے سر کا بوجھ بٹانے میں مدد دیں۔ محنت سے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں معروف رہتے ہیں۔ لیکن جناب اتنی قربانیوں کے باوجود بھی گھوڑے جوڑے اور جہیز کے لیے کئی لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کوئی بھی لڑکی نہیں چاہتا۔ سائنس کی مدد سے جنس معلوم کر کے لڑکی کی پیدائش سے پیچھا چھڑایا جاتا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو مستقبل میں صرف "لڑکے" ہوں گے۔ جدھر نظر اٹھائیے ادھر لڑکے ہی لڑکے ہوں گے۔ آنکھیں لڑکیوں کو تلاش کرتی رہیں گی لیکن وہ نظر نہیں آئیں گی۔ کائنات کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ ہر کام لڑکے ہی کرتے دکھائی دیں گے۔ کھانا وہ بنائیں گے، گھر کی صفائی وہ کریں گے۔ لڑکیوں کی نزاکتیں ان میں آجائیں گی۔ ایڈز کے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ شاعر کا محبوب نوخیز حسینہ کے بجائے کوئی نوجوان لڑکا ہوگا جس کی مسیں ابھی ابھی بھیگی ہوں گی اس کی بے وفائی پر شاعری ہوگی۔ اس کی شرم و حیا کے تذکرے ہوں۔ شاید لڑکوں کے اس جنون سے ہمارے ملک کی آبادی کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے! لیکن ملک کے مستقبل کا کیا ہوگا؟

کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ لڑکیوں کا یہی مقدر آج سے کئی صدی پہلے دور جہالت میں بھی تھا پھر کیا ہم اپنے آپ کو ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ کہلانے کے لیے حق بجانب ہیں؟

خنداں دہلوی

شب ہی وقتِ وصال ہے پیارے — ایسا کیوں ہے سوال ہے پیارے
کل کا وعدہ تو جان لیوا ہے — کل نہیں ہے یہ کال ہے پیارے
خود ہی کٹنے کو جو چلی آئے — ایسی مرغی حلال ہے پیارے
سر منڈاتے ہی کیوں پڑیں اولے — دل کے شیشے میں بال ہے پیارے
وصل کی بھیک مانگتا ہوں میں ! — ایک شب کا سوال ہے پیارے
دل کی چوری ہوئی سرِ محفل — دِن دھاڑے یہ چال ہے پیارے
کالی لیلیٰ کو ماہ رو کہنا — شاعرانہ خیال ہے پیارے
مال ہو تو ہے مالدار انساں — ورنہ چرخے کی مال ہے پیارے
اب تو خنداں بھی ہو گئے گریاں — عشق کیا ہے وبال ہے پیارے

اُس بھکارن پہ ہے غضب کا حسن
وہ تو گدڑی میں لعل ہے پیارے
پھر بھی اُس کو نہ سر چڑھا خنداں
اُس کی جوتی میں نعل ہے پیارے

غزل

سرپٹ حیدرآبادی

حشر سے پہلے بپا، ہنگامۂ محشر ملا — آج بھی کوئی مسولینی کوئی ہٹلر ملا
راہ گم کردہ، پریشان حال گھن چکر ملا — مرکز و محور سے اپنے جو بشر ہٹ کر ملا
دید کے قابل، عجب میخوار کا منظر ملا — خشک جو دن بھر رہا وہ بعد مغرب تر ملا
تھی کسی کی مُہر جس پر اور نہ کوئی دستخط — قتل سے پہلے مجھے مقتل میں وہ محضر ملا
جا رہی تھی موت کی جانب مجھے لیکر حیات — خیر گذری راستے میں مجھ کو میرا گھر ملا
کوئی آفت ناگہانی آنے والی ہے ضرور — بے بلائے آج وہ خود میرے گھر آ کر ملا
ڈاروِن کی تھیوری نے راہ روکی ہر جگہ — مجھ کو ہر انسان کے ڈھانچے میں اِک بندر ملا
ہو گیا مسحور دنیا ہے دنی کے سحر سے — رہزنی کرنے لگا جو بھی مجھے رہبر ملا
اس کے دونوں پیر ٹخنوں تک ہی باقی رہ گئے — پاؤں چادر سے زیادہ جو بھی پھیلا کر ملا
اُڑ رہا ہے آج بھی صفحات پر تاریخ کے — دہر کو نمرود کے بھیجے میں جو مچھر ملا

عہدِ پیری میں ہے سرپٹ نوجوانی کی نمود
جھاڑ میرا خشک ہو کر مجھ کو پادر ملا

غزلیں

پاگل عادل آبادی

مریضِ غم کو جینے کا سہارا مِل گیا ہوتا
تمہارے پیار کا آلو بخارا مِل گیا ہوتا

اُڑا ہے دِل کا راکٹ آرزو کے آسمانوں میں
نہیں گر چاند تو اِک جھاڑ دتارا مِل گیا ہوتا

نہ مرہم کی نہ پٹّی کی ضرورت دِل کے پھوڑے کو
تمہارے آتشیں لَب کا بھبپارا مِل گیا ہوتا

خُدا نخواستہ شادی میری جو اُن سے ہو جاتی
عجب کیا تھا کھٹارے کو کھٹارا مِل گیا ہوتا

پُرانی بیچ کر سیکل نئی لے لینا اسکوٹر
کِسی مسجد کے چندے کا سہارا مِل گیا ہوتا

کئی بڈّھے بھی تھے تیار ان سے عقدِ ثانی کو
بڑی بی کی یہی ضِد ہے کنوارا مِل گیا ہوتا

نِکل آتے کفن کے ساتھ اپنی قبر سے مُرشد
کِسی بیوہ کا سِگنل یا اشارا مِل گیا ہوتا

بہا دیتے اگر وہ چار آنسو قبر پہ آکر
بے چاری بکریوں کو کچھ تو چارا مِل گیا ہوتا

یقیں مانو نہ بِلتی شام تک بھی پھر ہمیں روٹی
اگر تڑکے ہمیں اُن کا نظارا مِل گیا ہوتا

سبھی کرتے ہیں چندے کی جگالی اِن دِنوں پاگل
اگر منہ مارتے تم بھی تو چارا مِل گیا ہوتا

اَن پڑھ بھونگیری

اپنی محفل میں تو مرشد کو بھی آنے دینگے
وجد آئے تو زنانے میں نہ جانے دینگے

بے دھڑک اُن کو اگر لاری چلانے دینگے
ماں کو ABIDS پہ یونہی اُٹھنے بِلانے دینگے

ساتھ بڈھوں کے اگر چانس ملے ڈِنر پر
وہ چکن لے لیں گے اور ہم کو بٹانے دینگے

آپ بتلائیں ہر اِک روپ کنور کو کب تک
گھوڑے جوڑے کی چتاؤں میں جلانے دینگے

مشورہ یہ ہے کہ داماد وں کو حد میں رکھنا
ورنہ یہ آپ کو بھی گھر میں نہ آنے دینگے

حیدرآباد کی سڑکوں سے گذرنے والو
تم کو اللہ میاں دوزخ میں نہ جلنے دینگے

تو اشاروں سے اگر کام نہ لے اے اَن پڑھ
عقل کے اندھے نہ پھر آنکھ لڑانے دینگے

قطعہ

ہم خوش بہت تھے موسمِ برسات آگیا
دامن میں لیکے پیار کی سوغات آگیا
اَن پڑھ مزے تو میں بھی اُٹھاتا وصال کے
لیکن بخار اُن کو اُسی رات آگیا

اسمٰعیل ظریف (حیدرآباد)

"کمال ہے"

محفل غزل کی گھر میں سجانا کمال ہے
جانا غزل سے داد کا پانا کمال ہے

اب دوستی میں ہاتھ بتانا کمال ہے
آپس میں دوستوں کو لڑانا کمال ہے

ٹیچر ہو یا وکیل ہو یا کوئی ڈاکٹر
محفل میں ان کو گھیر کے لانا کمال ہے

پیدل پُرانے شہر میں پڑھنے مشاعرہ
چل کر سکندرآباد سے آنا کمال ہے

فرصت نہیں تھی عقد میں شرکت نہ کر سکے
بھائی کا پھر بھی چوتھی میں جانا کمال ہے

دیتا ہے بانگ صحن میں آکر پڑوس سے
اس مرغ کو ٹھکانے لگانا کمال ہے

کھٹمل اگر ستائیں تو بستر پہ رات بھر
لیٹے ہوئے ستار بجانا کمال ہے

چھُپ کر اکیلے پینا کوئی بات ہی نہیں
مولانا کو پکڑ کے پلانا کمال ہے

اصلاح خانے اب گلی کوچوں میں ہیں مگر
اپنی حجامت آپ بنانا کمال ہے

تنخواہ پر تو آپ کا حق ہے مگر حضور
اوپر کی یافت کھا کے پچانا کمال ہے

پاکر وظیفہ بیس برس ہو چکے مگر
اس عمر میں بھی گاڑی چلانا کمال ہے

پکچر کو لوگ جاتے ہیں اکثر مگر جناب
بیٹے کے ساتھ باپ کا جانا کمال ہے

محفل میں آکے اُونگھنے لگ جائے گر کوئی
تھوڑی سی اُس کو ناس سُنگھانا کمال ہے

محفل میں صرف چائے کے قائل نہیں ہیں ہم
محفل سے پہلے ہاتھ دُھلانا کمال ہے

طنز و مزاح کھیل نہیں ہے کوئی ظریف
رہتے ہوئے ادب میں ہنسانا کمال ہے

انوار عالم (دھمتری)

غزل

پی کر دارو جب آتے ہیں انکل آدھی رات کے بعد
ہو جاتا ہے گھر کا گھر بھر دنگل آدھی رات کے بعد

میرے تن کا مَن چاہا اُپیوگ کیا ان دونوں نے
مچھر آدھی رات سے پہلے کھٹمل آدھی رات کے بعد

خوابوں میں بھی لولو لگتا ہے۔ جیسے تیرے ڈیڈی بھی
مجھ کو ڈھونڈ رہے ہیں لے کر پسٹل آدھی رات کے بعد

موڈ میں بیٹھے ہم لکھتے تھے۔ بیگم ایسے چلائیں
جیسے بے موسم کوکے ہے کوئل آدھی رات کے بعد

رشید الدین

پرانے کپڑے نئے برتن

ہماری نصف بہتر بھی عام بیویوں سے کچھ الگ نہیں۔ انھیں بھی گھر سجانے اور اسے ساز و سامان سے لاد نے کا بہت شوق ہے۔ لیکن صاحب! یہ شوق یونہی تو پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے نقد نرائن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم بھی عام شوہروں سے کچھ الگ نہیں۔ جو کچھ کماتے ہیں گھر میں لاکر دے دیتے ہیں لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل گرانی کا زمانہ ہے۔ کتنا ہی کماؤ، کافی نہیں ہوتا۔ پہلے زمانے میں سنا ہے ہمارے ہندوستان جنت نشان میں ہر چیز میسر تھی اور ایک آدمی کماتا تھا تو سارا گھر کھاتا تھا جو دس سے کم افراد پر مشتمل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن آج کل تو اس ملک میں کچھ بھی کافی نہیں ہوتا اور دس آدمی کمانے پر بھی ایک گھر اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ اور پھر ستم یہ کہ چیزیں اصلی بھی نہیں ملتیں۔ جو بھی ہے نقلی ہے، ناقص ہے، غیر معیاری ہے۔ ایسے میں کوئی کرے تو کیا کرے!

اس لیے ہماری اہلیہ محترمہ نے یہ ترکیب نکالی کہ تری کاٹ کے پرانے کپڑے دیئے جائیں اور اس کے بدلے پھیری لگانے والی عورتوں سے نئے اسٹین لیس اسٹیل کے برتن خریدے جائیں۔ زمانہ طالب علمی میں درسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک جادوگر نئے چراغ دے کر پرانے چراغ خریدنے کے لیے نکلا تھا اور علاء الدین کی ماں نے اپنا پرانا چراغ (جو اصل میں جادوئی چراغ تھا) جادوگر کو دے کر خوشی خوشی اس سے نیا چراغ خریدا تھا اور علاء الدین نے گھر آکر اپنی ماں کی نادانی پر (جسے وہ دانائی سمجھ رہی تھی) سر پیٹ لیا تھا۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ لیکن منظر بدل گیا ہے اب لوگ الماری میں اپنی اچھی خاصی پتلون نہ پاکر سر پیٹتے ہیں جنھیں عورتیں اپنی دانائی سمجھ کر کپڑے والیوں کو دیتی ہیں اور اپنی دانست میں پرانی چیز کے عوض نئے برتن حاصل کر رہی ہیں۔

آپ نے اپنے شہر میں دیکھا ہوگا کہ صبح ہوتے ہی کچھ عورتیں گھروں سے نکل پڑتی ہیں۔ اُن کے سروں پر اسٹین لیس اسٹیل کے برتنوں کے ٹوکرے ہوتے ہیں اور پیٹھ پر پرانے کپڑوں کی پوٹلیاں۔ سر اور پیٹھ کے علاوہ ان کی گود بھی بھاری ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں ایک عدد چھوٹا بچہ ہوتا ہے۔ یہ عورتیں گلی گلی آوازیں لگاتی پھرتی ہیں اور گھریلو کاموں میں مصروف اچھی خاصی عورتوں کو ورغلاتی ہیں کہ آؤ اور ہم سے سودا کرو۔ سودا بھی کیا خوب ہے پرانے کپڑے کے بدلے نئے برتن۔ ورغلانے والی بھی عورت اور ورغلانے میں جو آجائے سو وہ بھی عورت ایسے میں ہم بے چارے مرد کیا کر سکتے ہیں۔

تو صاحب بات چل رہی تھی اُن عورتوں کی جو نئے برتن دے کر پرانے کپڑے خریدتی ہیں۔ ہماری اہلیہ محترمہ

کی فراخدلی دیکھ کر ان عورتوں کا عالم یہ ہے کہ صبح ہوئی نہیں کہ ہمارے گھر کے اطراف چکر کاٹنے شروع کر دیتی ہیں تاکہ جوں ہی ہم دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلیں، یہ ہمارے گھر کے ورانڈے میں ڈیرہ جمائیں۔ ہماری دختر نیک اختر کی بھی ان عورتوں کو دیکھ کر باچھیں کھل جاتی ہیں یعنی بڑی بی ماشاءاللہ تو چھوٹی بی سبحان اللہ۔ آتے ہی ان عورتوں کو ٹھنڈا پانی پیش کیا جاتا ہے اور ان کی گودیوں میں سسکتے بچوں کو روٹی کے ٹکڑے دے کر بہلایا جاتا ہے (کھلونے نہیں!)

پھر ہماری اہلیہ محترمہ ہمارے کپڑوں کی الماری کی طرف رجوع ہوتی ہیں۔ بے چارے اس بشرٹ کا نمبر آتا ہے جسے سِلائے ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔ پھر نیلی پتلون نکالی جاتی ہے۔ یہ بھی اسی کے ساتھ سلائی گئی تھی۔ ایک سفید شرٹ بھی نکالا جاتا ہے۔ اس کا قصور یہ ہے کہ جلد میلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے بار بار دھونا پڑتا ہے پھر صاحبزادہ کی الماری کی طرف نظر کرم جاتی ہے۔ کھڑی پتلون ان کی دانست میں چھوٹی ہے تو کسی کا رنگ اُڑ جاتا ہے کسی قمیص کی کالر پھٹ جاتی ہے تو کسی کے بٹن ٹوٹ جاتے ہیں۔ کسی کو کچھ نہیں ہوتا تو یہ تاویل پیش کی جاتی ہے کہ پہننے کے بعد یہ جسم پر کچھ جچتی نہیں۔ چنانچہ سارے کپڑے ہینگروں سے نکل نکل کر ان عورتوں کی پوٹلیوں میں چلے جاتے ہیں اور کچھ برتن اسٹین لیس اسٹیل کے پتیلے اور تجلیے کچھ ہی دن میں کالے پڑجانے والے ہمارے باورچی خانے میں منتقل ہو جاتے ہیں اور ہماری اہلیہ محترمہ اور دختر نیک اختر انھیں دیکھ دیکھ کر مارے خوشی کے پھولی نہیں سماتیں۔

یہاں تک تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن ایک بار جو ہم رمضان کی عید کے کپڑوں کی خریدی کے لیے اپنی فیملی کے ساتھ گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلہ پر ایک محترمہ بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ ہم فوراً تاڑ گئے کہ ہو نہ ہو یہ ہی ٹوکری اور پوٹلی والی صاحبہ ہیں۔ ہمارا شبہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب کہ وہ ہماری اہلیہ محترمہ کو کپڑوں کی خریدی میں کچھ مشورے دینے لگیں کہ یہ رنگ ٹھیک رہے گا۔ یہ کپڑا اچھا ہے۔ یہ بوسیدہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ واپسی میں وہ صاحبہ غائب ہوگئیں جس پر ہم نے اپنی اہلیہ سے پوچھا کہ "آپ کی وہ سہیلی کہاں گئیں"۔ اس پر وہ مصنوعی انداز میں چونک کر بولیں "کون سہیلی"؟ ہم نے کہا "وہی جو آپ کو کپڑوں کی خریدی میں مشورے دے رہی تھیں"۔ اس پر تنک کر بولیں "آپ تو بس حد کرتے ہیں۔ وہ میری سہیلی کیوں ہونے لگی۔ وہ بھی ہماری طرح کچھ کپڑے خریدنے آئی تھی۔ اب کچھ مشورہ دے دیا تو کیا برا کیا"۔ یہ سن کر ہمیں خاموش رہتے ہی بنی۔ اسے کہتے ہیں اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ہم نے بھی بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو رمضان کا مہینہ تھا۔ پھر دوسرے عید قریب تھی۔ خواہ مخواہ کی ناچاقی ہو جاتی۔ البتہ ایک چیز ہم ضرور تاڑ گئے کہ ہمارے یہ نئے کپڑے بہت جلد اُس پوٹلی والی کی نذر ہونے والے ہیں۔

مزہ تو اسی وقت آتا ہے جب ہم اپنی ایک پتلون ہینگر سے نکالے سارے گھر میں گھومتے ہیں کہ اس کے ساتھ کا شرٹ کہاں ہے۔ اب شرٹ ہو تو ہمیں کوئی دے۔ وہ تو اسٹین لیس اسٹیل کی ایک عدد کوڑی میں تبدیل ہو جاتا ہے ایسے موقع پر ہماری اہلیہ محترمہ باورچی خانہ میں دال کو اس زور سے بگھار رہی تھیں کہ ہم اس بگھار کی تاب نہ لاکر کوئی بھی شرٹ پہن کر دفتر سدھارتے ہیں۔ اور ہماری اہلیہ تھوڑی دیر بعد باورچی خانہ سے نکل کر ہماری دختر نیک اختر سے پوچھتی ہیں "بیٹا تمہارے بابا آفس چلے گئے"؟ اس وقت دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے پر ایسی خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے جو کسی ڈینٹل کریم کے اشتہار ہی میں نظر آتی ہے۔

اس کامیڈی کا سب سے المناک منظر اس وقت سامنے آیا جب کہ ایک صبح سو کر اُٹھنے پر تمام گھر کو پتہ چلا کہ رات باورچی خانہ کا پیچھے کا دروازہ کھلا ہی رہ گیا تھا اور چور صاحب آکر اسٹین لیس اسٹیل کے ان سارے برتنوں

یہ ہاتھ صاف کر گئے جو برسوں کی کاوش کے بعد بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہمارے ۔۔۔ کپڑے بیچ بیچ کر جمع کیے گئے تھے اس وقت ہمیں وہ منظر یاد آگیا جب دونوں ماں بیٹیاں بڑے فخر و انبساط کے ساتھ قطار میں لگے ان برتنوں کو دکھیا کرتی تھیں جنھیں ہم کبھی دیوان خانے سے اخبار پڑھتے پڑھتے اٹھ کر باورچی خانہ میں گئے۔ دونوں کی صورتیں دیکھنے کے لائق تھیں۔ جیسے ان کی ساری زندگی کی کمائی لٹ گئی ہو۔ انھیں دیکھ کر واقعی ہمیں بھی رحم آگیا اور ہم جو لاپرواہی برتنے پر انھیں ڈانٹنے آئے تھے خود بھی ان کے غم میں شریک ہوگئے۔

بات یہیں تک محدود رہتی تو کچھ نہیں تھا۔ کھانے کی میز پر سب کو چپ چپ دیکھ کر ہماری رگِ پدری پھڑک اٹھی اور ہم نے دفتر جاتے ہوئے دونوں ماں بیٹیوں کو بلا کر کہا "اب جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ یہ پیسے لے جاؤ اور بازار سے دوسرے برتن خرید کر لے آؤ۔" ہماری جانب سے اس فراخ دلی کے مظاہرہ پر دونوں جواباً کچھ کہنے کی بجائے ہمیں ستائشی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ایسے موقع پر کس مرد کو کتنے فخر کا احساس ہوتا ہے یہ وہی جان سکتے ہیں جو مرد ہوں اور کماؤ ہوں۔ ہم نے پیسے اپنی صاحبزادی کے ہاتھ پر رکھے اور دفتر کے لیے روانہ ہوگئے گھر کی سیڑھیاں اترتے اترتے ہمارے کانوں میں ہماری اہلیہ کے یہ الفاظ گونجے جو وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھیں:

"ہم ان پیسوں کے برتن خریدنے کی بجائے کیوں نہ تمہارے بابا اور بھیا کے لیے نئے کپڑے خرید لیں۔ بے چارے باپ بیٹے کئی مہینوں سے نئے کپڑے نہیں بنائے۔"

□□

ڈسکو غزل

تنگ عنایت پوری

[حضرت شکیل بدایونی کی روح سے معذرت کے ساتھ]

کئی بیویوں میں گھر کر یہی کہتا ہے بچارا
"رہا گردشوں میں ہر دم مرے عشق کا ستارا"

مرا عشق بھی ہے ایسا کہ ہو کھیل انڈین کا
"وہ قدم قدم پہ جیتے میں قدم قدم پہ ہارا"

کی جو خودکشی کی کوشش تو وہ جیل کاٹتا ہے
"جسے موت نے نہ پوچھا اسے زندگی نے مارا"

ذرا بھی نہیں ہے عورت بنا گھر جنوائی جب سے
"کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا"

نہ تو بن سکا میں شاعر نہ بنا کسی کا شوہر
"کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارا"

نظر آیا فلمی شاعر تو کی تنگ نے شکایت
"مری شاعری سے موثر تری شاعری کا دھارا"

قطعات

(۱) حسین تاج محل سے بھی فائدہ لیجئے
ٹکٹ لگا کے تماشہ دکھایئے صاحب
نئے زمانہ میں ہو حسن و عشق کا سودا
دفن کے نام پہ جم کر کمایئے صاحب

(۲) استاد کی اولاد ہوں کم میں بھی نہیں ہوں
جو کام نہیں ان سے ہوا میں نے کیا ہے
ہاں بات یہ کچھ اور ہے سبھی نام سے لیکن
ان کا ہی کلام آ کے یہاں پڑھ تو دیا ہے

(۳) ہندی کی ٹانگ توڑیئے اُردو کی توڑیئے
شعر جدید کہئے روایت کو چھوڑیئے
بے ربط نظم لکھ کے پڑھا کیجئے جناب
رشتہ ادب کا آپ بھی ڈسکو سے جوڑیئے

(۴) چلتی ہے تنگ ہند کی استادِ فن گمنام ہے
دیسی گھی بکتا نہیں ہے ڈالڈا کے سامنے
شکر ہے غالب چچا کا دور ہی کچھ اور تھا
اب بھتیجے بس پڑھاتے چچا کے سامنے

جی، ایم، احمد خواہ مخواہ (بمبئی)

عینک

عینک فی زمانہ انسانی شکل وصورت کا لازمی جزو بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی زمانے میں عینک کا استعمال تعلیم یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جس کا شیشہ جتنا موٹا اور دبیز ہوتا اُسے اتنا ہی قابل سمجھا جاتا۔ اب گنڈیری بیچنے والے بھی ایسی عینک استعمال کرنے لگے ہیں جن کے شیشوں پر سوڈے کی بوتل کے پیندے کا گمان ہوتا ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے جو عینک استعمال ہوتی ہے اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دن دہاڑے کھلے بندوں نظر بازی کے بعد بھی خواتین کی غضب ناک نگاہوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے بائی فوکل عینک سے دور اور نزدیک کی چیزوں کو بالترتیب آسانی اور حیرانی سے دیکھا جاتا ہے۔ اکثر خواتین بائی فوکل عینک کے بالائی حصّے سے دوسری خواتین کے شوہروں کو اور نچلے حصّے سے دیگر مَردوں کی بیویوں کو بنظرِ غائر دیکھنے اور پرکھنے کی اتنی ماہر ہوتی ہیں کہ ان کی تفتیش اور تنقید سُننے کے بعد بے عینک خواتین کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے جسے دور کرنے کی غرض سے وہ بھی اپنی آنکھوں پر عینک چڑھا لیتی ہیں۔

ہم بھی ایک عرصے تک عینک کو "کان پکڑ کر ناک پر بٹھانے والی" غیر ضروری شئے سمجھتے رہے۔ اس لیے بھی کہ اس گئی گزری عمر میں بھی ہماری بینائی اتنی صاف تھی کہ نظریں عموماً خوبصورتی کی متلاشی رہتیں اور خصوصاً جب حسین چہروں پر ٹِک جاتیں تو ہٹائے نہ ہٹتیں لیکن جوں جوں ہمارے بڑھاپے پر شباب آتا گیا، بینائی بھی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔

ایک بار یوں ہوا کہ بیگم اپنے دونوں ہاتھ ہلاتی ہمارے قریب آکر کہنے لگیں ــ "سنئے! ذرا سوئی میں دھاگہ پرو دیجئے میری عینک نگوڑی ماری جانے کہاں رہ گئی ہے۔ مجھے سوئی کا سوراخ ہی نظر نہیں آرہا ہے" تبھی ہم پر ایک تلخ حقیقت کا انکشاف ہوا ہم نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا: بیگم! ہمیں سوئی کا سوراخ نظر نہیں آرہا ہے اور مجھے سرے سے سوئی ہی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ اور جب ایکبار دفتر سے تھکے ماندے لوٹے تو اپنے گھر کے دھوکے میں برابر والے پڑوسی کے گھر میں گھس گئے جہاں سے بہ یک بینی و دو گوش مگر خیر سے باعزّت طریقے سے نکالے گئے تب سے ہم نے بھی عینک کا استعمال شروع کردیا ہے تاکہ اپنے اور پرائے گھر میں تمیز کرسکیں اور سوئی میں دھاگہ پرو کر اپنی نصف بہتر کے آڑے وقت میں کام آسکیں۔

بیگم کی عینک بھی ایک عجوبہ ہے کہ وہ اُن کے چہرے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہے ــ کبھی ہم دیر گئے رات گھر پہنچتے تو وہ پہلے دروازہ تو کھول دیتیں لیکن ہمیں باہر ہی ٹھہرا کر عینک ڈھونڈنے نکل جاتیں۔ مل جانے پر

آنکھوں پر چڑھا کر ہمیں دیکھ کر اطمینان کر لیتیں کہ ہم واقعی ہم ہیں تب اندر آنے دیتیں۔

ہمارے ایک ہم جماعت تھے جن کی بصارت بچپن ہی سے کمزور تھی اور کالج تک پہنچتے پہنچتے ان کے چہرے پر لگی آخری نمبر کی عینک سے انھیں تو بہت کم دکھائی دیتا مگر دوسروں کو ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی دکھائی دیتیں (عینک اُن کے چہرے کا اس قدر جزو لاینفک ہو گئی تھی کہ وہ عینک لگائے ہوئے ہی منہ دھوتے)! اس پر طرفہ تماشہ یہ کہ انھیں موٹر چلانا بھی آتا تھا۔ اور جب بھی سرِشام سیر کے لیے نکلتے ہمیں اپنے ساتھ رکھتے تاکہ ہم ان کی کمزور آنکھوں سے نظر نہ آنے والے متوقع حادثوں سے قبل از وقت خبردار کرتے رہیں۔ سیر کے اختتام تک ہماری جان مشکل میں رہتی کہ جب بھی وہ موٹر پر سوار ہوتے تیز رفتاری کا خبط اُن پر سوار ہو جاتا۔ ان کے سبھی دوست احباب ان کی شام کی سیر والی دعوت سے پناہ مانگتے اور آخر میں نزلہ عضوِ ضعیف یعنی ہم پر گرتا۔ ہماری جان تو اس وقت چھوٹی جب خدا خدا کر کے ان کی عینک ٹوٹی۔ مگر سکون و عافیت سے دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ وہ پھر بغیر عینک کے نازل ہو گئے۔ شانِ نزول یہ تھی کہ چل کر دوسری عینک لیں گے۔ ہم چار و ناچار ان کے ساتھ ہو لیے۔ عینک ساز کی دوکان کے قریب پہنچ کر انھوں نے ہم سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور محض انداز سے پر مگر تیر کی طرح سیدھے شوکیس پر رکھے ہوئے انسانی مجسمے کے قریب پہنچ کر اُسے اپنی عینک کا نمبر بتانے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ کاونٹر کلرک نے انھیں دیکھ لیا اور معاملہ فہمی پر اُتر آیا ورنہ وہ اس مجسمے سے جواب نہ پا کر جانے اس کا کیا حشر کر دیتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ خود کو فٹ بال کا بہترین کھلاڑی سمجھتے۔ ہم انھیں ان کا دل رکھنے کو کھیل میں شامل کر لیتے۔ وہ گیند کو محض اندازے سے سونگھ کر ایسا شاٹ لگاتے جو شاذ و نادر ہی گیند کو لگتا۔ اپنی اور مخالف ٹیم کے گول کی سمت کا خیال کئے بغیر اکثر و بیشتر اپنی ٹیم کے گول میں ہی گھسے چلے آتے گول پر جال نہ لگا رہنے کی صورت میں گول کے اندر سے گزر کر باہر نکل جاتے تب ہم انھیں کھینچ کر گراونڈ کے حدود میں لے آتے۔ ہم نے انھیں سوتے میں بھی عینک لگاتے دیکھا۔ پوچھا تو بولے ـــ "عینک نہ لگاؤں تو خواب میں آنے والی لڑکیوں کو کیسے پہچان سکوں گا۔"

دو ماہ قبل کی بات ہے۔ ہمیں فلو نے آگھیرا۔ تین روز تک فریش رہے۔ ڈاکٹر ماجد صاحب روز آتے اور انجکشن دے جاتے چوتھے دن بخار کم ہونے پر ہم بھی اُٹھ بیٹھے۔ ہلکے سے ناشتے کے بعد جی چاہا کہ اخبار دیکھ کر معلوم کریں کہ ہماری ناچار دِلوں کی عدم توجہی سے دنیا کس حد تک بگڑ چکی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی عینک چڑھائی اور اخبار دیکھا تو پیر و ں تلے زمین نکل گئی۔ اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں آپس میں دست و گریباں نظر آنے لگیں۔ چھوٹی سرخیاں سرے سے دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہم یکلخت چلّا اُٹھے "بیگم! غضب ہو گیا یہاں آؤ! فوری آؤ!!" بیگم پریشان ہو کر دوڑی آئیں اور پوچھنے لگیں "خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟ کیوں چلّا رہے ہیں آپ؟" ہم نے گلوگیر آواز میں کہا ـــ "بیگم ـــ! اِن فلو کے جراثیم سے خدا سمجھے! میری بینائی جاتی رہی ـــ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے آپ ڈاکٹر ماجد کو فوری فون کریں۔" ہماری بیگم کی یہ ایک انوکھی صفت ہے کہ وہ انتہائی معمولی اور غیر اہم حادثے پر خود بھی بے حد پریشان ہو جاتی ہیں اور دوسروں کو بھی سراسیمہ کر دیتی ہیں۔ اس کے برعکس سنگین ترین حادثے کو معمولی سمجھ کر ٹال دیا کرتی ہیں۔ میرے شور پانے پر اُنھوں نے بس اِتنا کہا۔ "چلّائیے مت! آپ کی آنکھوں کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ کمزوری کی وجہ سے آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا ہو گا میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو فون کرتی ہوں" ہمیں ان کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا صرف فون ڈائل کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہم اس قدر پریشان تھے کہ چہرے سے عینک اتارنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ مبادا رہی سہی بینائی

نہ چل جائے۔ اتنے میں سال بیل بجی اور ڈاکٹر جاوید تیزی سے اندر آگئے اور بیگم سے مخاطب ہوکر کہنے لگے۔
"مسز احمد! میری عینک کل سے غائب ہے۔ میں یہاں تو نہیں بھولا۔" پھر ہماری طرف دیکھ کر اچھل پڑے۔
"یہ رہی میری عینک۔ یہ آپ کی آنکھوں پر کیا کر رہی ہے۔" جیسے ہی ہم نے ان کی عینک اپنی آنکھوں سے اُتاری ہماری رہی سہی بینائی۔ پھر لوٹ آئی۔

یہاں ہمارے دفتر کے منتظم صاحب کی عینک کا ذکر بے محل نہ ہوگا جسے وہ ہمیشہ اپنی ناک کی پھننگی پر ٹکائے رہتے۔ ماتحتین کو عینک کے اوپر سے دیکھتے پڑھتے اور دفتری کاغذات پر دستخط کرتے وقت عینک کو پیشانی تک اُٹھا لیتے۔ البتہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھتے اور سوتے وقت ان کی عینک ناک کے صحیح مقام پر رہتی۔

۵۷

رشید عبدالسمیع جلیل

غزل

نہ تیری بات میں ہے اور نہ تیرے پیار میں ہے
وہ اک مزہ جو ترے ہاتھ کے بگھار میں ہے

نہاری کلیجے جو کھائے بروز دوشنبہ
چہارشنبہ تک اُس کا اثر ڈکار میں ہے

ہے آرزو نئے پودے کی پھر سے گلشن میں
یہ میرے بس میں نہیں تیرے اختیار میں ہے

بس ایک فرق ہے لطفِ سفر کا اس کے سوا
ڈبل ڈیکر میں وہی ہے جو ٹی۔ ایف۔ آر میں ہے

ہوئی ہے شہر کی تاریخ حاملہ جب سے
ہر اک مکان کا جغرافیہ اچار میں ہے

ہر ایک دَور میں تعلق ضرور ہوتا ہے
مثال سامنے موجود اس دیار میں ہے

اب اور اڈلی و سانبھر کا ذائقہ کب تک
مٹن فرائی و تندور انتظار میں ہے

سناؤ مت مجھے احوال اپنے بچوں کے
میں جانتا ہوں خرابی جو لاڈ پیار میں ہے

یہ اور بات کہ شامل ہے نام شہرہ میں
شمار پھر بھی جلیل اپنا کس شمار میں ہے

(لے ٹے۔ لوٹا موڈس)

شبنم کاروار ی

"ڈگریاں"

پڑھ کے اسکول سے سند پائی
لے کے کالج سے ڈگریاں نکلیں
اب کے پنگھٹ پہ گاؤں کی گوری
لڑکیاں لے کے گگریاں نکلیں

چوہا بلّی

اپنے مالک سے یہ نوکر نے کہا چلّا کے
سیٹھ جی دودھ کے برتن میں گرے دو چوہے
سیٹھ نے چیخ کے فوراً یہ دیا حکم اسے
ایک بلّی کو پکڑ ڈال دے اِس میں پہلے

اسحٰق ایوبی (حیدرآباد)

تعطیل، رخصت اور تہوار

بچوں کو کھیل، مٹھائیاں اور قصّے بہت پسند ہیں۔ اس سے ان کا کردار بنتا بھی ہے، بگڑتا بھی ہے۔ اسی طرح جس طرح پیپر مینٹ میں مٹھاس اور کھٹاس دونوں شیر و شکر ہیں۔ نوجوانوں کو فلمیں، جاسوسی ناول اور معمّے بے حد مرغوب ہیں یہ اُن کی شخصیت کو جہاں بناتے ہیں وہیں بگاڑتے بھی ہیں ویسے ہی جیسے زہر اگر موت کا پیغام ہے تو دوا کا کام بھی دیتا ہے۔ گھر گرہست لوگوں کا محبوب مشغلہ مہنگائی، رشوت ستانی اور ملاوٹ کا جابجا تذکرہ ہے۔ حسینۂ عالم جتنی بڑی قتالہ ہوگی عاشقوں کو اس کے ذکر سے اتنی ہی تسکین ملے گی۔ کھسیانی بلّی کو بھی کھمبا نوچنے سے بڑا سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ہوئیں عوام کے تین زمروں کی مختلف پسندیدہ باتیں مگر دنیا میں ایک ایسی چیز بھی ہے جس سے معصوم بچے، پُرجوش نوجوان اور امورِ خانہ داری کے جنجال میں مبتلا افراد سبھی یکساں طور پر استفادہ کرنے میں انتہائی مسرّت محسوس کرتے ہیں ویسے ہی جیسے دفینہ چاہے امریکہ کو ملے چاہے فقیر کو دونوں طفلانہ حد تک خوش ہوجاتے ہیں۔ عرفِ عام میں اسے تعطیل، رخصت یا تہوار کہتے ہیں کیوں کہ تینوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ یعنی روزمرہ کے کاموں سے سوفی صدی چھٹی — چنیا بیگم ہے تو افیون ہی کا دوسرا نام لیکن اس کے بھی یہ تین روپ ہیں۔ چنڈو خانے کی چلم، مارفیا کے انجکشن اور امساک کی گولیاں۔

بالعموم آپ کو عام تعطیل کا علم پہلے سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ کمرے کا کیلنڈر رات دن آپ کی نظروں کے سامنے رہتا ہے اور سُرخ رنگ کی تاریخیں مہینے بھر کی دیگر تاریخوں میں یوں ہی نمایاں رہتی ہیں جیسے ہیروئن ایکسٹرا لڑکیوں کے جھنڈ میں لیڈر سوشل ورکروں کے گروپ میں اور پلاسٹک کا جھولا کاغذ کی پڑلیوں میں۔ ویسے تعلیمی اداروں، کارخانوں اور دفتروں میں بھی آنے والی چھٹیوں کا پہلے ہی سے چرچا رہتا ہے کیوں کہ تعطیل کے دنوں کے ساتھ رخصت کا پیوند یا رخصت کے ساتھ تعطیل کے دنوں کا استر لگایا جاسکتا ہے۔ پھر بیوی اور بچے بھی بار بار آپ کو آئندہ کی تعطیل کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ جس کے ساتھ چھوٹی بڑی فرمائشیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ یاد دہانی نہیں ہوتی بلکہ بھولا ہوا سبق آپ کو بار بار رٹایا جاتا ہے۔ آپ اپنی فیملی کو پورے ایک سال سے عجائب خانہ، چڑیا گھر یا کوئی تاریخی عمارت دکھلانے کا وعدہ کر رہے ہیں مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ہر موقع پہ آپ کے بال بچے بار بار ہاتھ مسل کر رہ جاتے ہیں۔ یہی [illegible]۔ ساڑی، شلوار، وغیرہ قمیص، دوپٹہ، جوتا، ٹوپی، زیور، گھڑی — الغرض بیسوں چیزیں ہیں جن کی فرمائشوں کا

سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ نہ تو بال بچے ہتھیار ڈالتے ہیں اور نہ آپ۔ یہ گوریلا جنگ ہے جو غیر معینہ مدت تک چلتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے دن گذرتے ہیں ویسے ویسے ان فرمائشوں کا سلسلہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ فرمائشوں کا سود دراصل قیمتوں کا تمدیجی اضافہ ہے جو سال بہ سال ماہ بہ ماہ روز بروز ساعت بہ ساعت بلکہ ثانیہ بہ ثانیہ بلا روک ٹوک از آدم تا ایں دم جاری ہے۔ اشیاء کے دام اسی رفتار سے بڑھتے ہیں جس رفتار سے آدمی کسی زمانے میں سفر کرتا ہے۔ آج ہم ہزاروں میل کی رفتار سے خلاء میں پرواز کرسکتے ہیں پھر قیمتیں کیوں پیچھے رہیں۔

عام تعطیلات دراصل باڈی جنرل اسکور ہیں: جہاں ہر طرح کا مال ہوتا ہے۔ چنانچہ مقررہ چھٹیوں کے علاوہ مذہبی تہوار، قومی جشن، اہم شخصیتوں کی تواریخ پیدائش اور برسی کی چھٹیاں ملتی ہیں بعض مرتبہ عوام اچانک کسی قومی سانحے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یعنی یکایک کوئی بڑا آدمی اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور پھر ملک بھر کے گاؤں قصبوں اور شہروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ ریڈیو، اخبار اور دیگر ذرائع سے اطلاع ملتے ہی دوکانیں، ریستورانیں، دفتر، ٹرینیں اور کارخانے دھڑا دھڑ بند ہونے لگتے ہیں۔ ملک کا بچہ بچہ مجسم رنج والم دکھائی دیتا ہے۔ یہ وقت عوام، قائدین اور حکمران طبقہ — سب کے لیے بے حد آزمائش کا ہوتا ہے۔ پردۂ سیمیں پر ہیرو جتنی بہادری کے کارنامے انجام دے گا، سینما گھر میں اچانک بجلی فیل ہوجانے پر فلمی ناظرین اتنے ہی بے چین ہو اٹھیں گے۔ کچھ یہی صورتِ حال تمام ملکوں کے ہر دلعزیز رہنماؤں کے بلا نوٹس انتقال پُرملال پر پیدا ہو جاتی ہے۔

تعلیمی اداروں اور عدالتوں میں مقررہ لمبی تعطیلات ملتی ہیں۔ یہ زیادہ تر موسمی یا مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں بچوں کی لمبی چھٹیاں ماؤں کے حق میں قید بامشقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تعطیلات جتنی طویل ہوں گی قید کی سزا بھی اتنی ہی بڑی اور کڑی ہوگی۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم زیادہ تر ان ہی دنوں میں گروہ در گروہ لمبے سفر پر نکلتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی بدولت آدمی کو اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ ان زائد از نصاب تجربوں کو تنخواہ کا پیشگی سالانہ اضافہ سمجھنا چاہیے جو غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے عہدیداروں کو ان کے تقرر کے وقت ... ہے۔ سفر کی صعوبتیں آہستہ آہستہ ہماری کھال کو ڈھال بنا دیتی ہیں۔ مختلف علاقوں، مختلف زبانوں ا... ، تہذیبوں کے نمائندگان سے ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات اتنا ہی مسرت آگیں ہوتا ہے جتنی کسی نظریے ... دریافت کسی آلے کی ایجاد یا دوستوں کی گدگدیاں۔

طویل تعطیلات کے دوران میں تعلیمی اداروں میں اُلّو بولنے لگتا ہے ورنہ اس سے پہلے کلاسوں میں سارا دن اساتذہ کا طوطی بولتا تھا۔ ہاں اگر ہر کوئی اپنا کچھ اور کام کر رہے ہوں تو پھر طلبہ کلاس کو نقار خانے میں بدل دیتے ہیں۔ لمبی چھٹیوں میں بچے جی بھر کے کھیلتے ہیں۔ اب جہاں دو بچے مل کر کھیلیں گے وہاں جھگڑا بھی ہوگا غل غپاڑہ بھی مچے گا اور مسابقت کا جذبہ بھی فروغ پائے گا۔ البتہ اولے کی شکل میں بارش فصلوں کو نقصان پہنچاتی ہے جب کہ پانی کے روپ میں وہ ان کی نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

رخصت ہنگامی نوعیت کی بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی بیماریاں مہمانوں کی آمد و رفت قریبی رشتہ داروں کے یہاں شادی و غم سماجی تقریبیں اور مقدس مقامات کی زیارت وغیرہ چند وجوہ ہیں جن کی بنیاد پر رخصت کی ضرورت پڑتی ہے۔ بعض مرتبہ رخصت لی جاتی ہے کسی اور کام کے لیے مگر وجہ بتاتے ہیں کچھ اور۔ مثلاً سالیاں یکایک پروگرام بناتی ہیں مارننگ یا میٹنی شو کا لہٰذا دولہا بھائی بھیج دیتے ہیں رخصت کی ایک عدد درخواست اپنے دفتر میں۔ .

فدوی کو آج صبح سے اسہال کی شکایت ہے ازراہ کرم ایک دن کی رخصت منظور فرمائی جائے۔ بعض مرتبہ معاملہ بہت ہمارے قابو سے باہر ہوجاتا ہے اس لیے کئی بابو لوگ تنخواہ لیتے ہی درد سر یا درد شکم کا عذر کر کے آدھے دن کی رخصت لے لیتے اور فوراً سے پیشتر نو دو گیارہ ہوجاتے ہیں۔ تاکہ وہ دفتر کے پھاٹک پر قرض خواہوں کی گرفت میں نہ آسکیں پھر دوسرے دن مکان پر ادھار سامان سپلائی کرنے والے بھی دھرنا دیکھیں گے انھیں بھی گلو خلاصی حاصل کرنا ہوتا ہے لہٰذا بابو جی کسی رشتہ دار کی فرضی موت کی تعزیت کے سلسلہ میں صبح کاذب کے وقت ہی گھر سے نکل پڑتے ہیں (اللہ جھوٹ نہ بلوائے اور دن تو آپ سات آٹھ بجے سے اِدھر بستر ہی نہیں چھوڑتے) دو روز گذر جائیں تو طوفان قدرے تھم جاتا ہے پھر آدمی تو آدمی جانور بھی محفوظ مقامات سے اس وقت باہر نکلتے ہیں جب طوفان تھم جائے یا اس میں وہ شدت باقی نہ رہے۔

تیوہار آتے ہیں تو سب سے زیادہ خوشی بچوں، بیوپاریوں اور جیب کتروں کو ہوتی ہے۔ تیوہار جتنے اہم ہوں گے تیاریاں بھی اتنی ہی مدت پہلے سے جاری رہیں گی۔ اور تیاریاں جتنی شدومد سے کی جائیں گی مالی پریشانیاں بھی اتنے ہی بڑے پیمانے پر لاحق ہوں گی وہاں ہیں قرض بھی دبے پاؤں خانۂ دل میں ضرور قدم رنجہ فرمائیں گی اور بالآخر سامراجیوں کی طرح مملکت قلب پر بلا شرکت غیرے مکمل طور پر قابض ہوجائیں گے تیوہار دراصل شاہراہ زندگی کی سرائیں ہیں جہاں آدمی تھوڑی تھوڑی دیر آرام کرتا اور پھر تازہ دم ہوکر آگے بڑھتا ہے۔

ایسے ہی کسی مسافر خانے میں اتفاقاً مسٹر تیوہار، مس تعطیل اور مسز رخصت کی ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہوگئی اور تینوں میں اس طرح کی چخ چخ ہونے لگی۔

مسٹر تیوہار۔ میرا اور آدمی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

مس تعطیل:۔ اور میری اور آپ کی دوستی پیکر اور سایہ کی رفاقت ہے یعنی تقریباً پچاس فیصدی ہمراہی اور پچاس فیصدی جدائی، پوچھو وہ کیوں تو سنو! ہر تیوہار چھٹی کا دن ضرور ہوتا ہے لیکن ہر چھٹی کا دن تیوہار نہیں ہوتا ویسے ہی جیسے ہر رانی محل میں رہتی ہے لیکن محل میں رہنے والی ہر عورت رانی نہیں ہوتی۔

مسٹر رخصت:۔ اور ہماری تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہے میں آپ کے ساتھ ہوں نہ آپ کے ساتھ جس طرح الگ الگ سمت میں دوڑنے والی ریل گاڑیوں اور ... آپ کسی نہ کسی جگہ ہو ہی جاتا ویسے ہی میری ملاقات بھی آپ دونوں سے کہیں نہ کہیں ہوجاتی ہے بس علیک سلیک کے بعد میں پھر علیحدہ راستے پر چل پڑتی ہوں، میرا سفر کبھی مختصر ہوتا ہے اور کبھی طویل۔

مس تعطیل:۔ یہاں بھی یہی حال ہے جب میں نے ہوش سنبھالا ہے دور یا قریب کے سفر کا سلسلہ بنا ہوا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ رخت سفر باندھنا نہ پڑے کسی مہینے میں ہفتہ واری چھٹی کے علاوہ مذہبی تیوہار اور قومی جشن وغیرہ کی چھٹی نہ ہو بس اس مہینے میں قیامت آئی سمجھو دفتروں کے کلرک کارخانوں کے مزدور اور زمروں کے سیلز مین ماہ متعلقہ کو جی بھر کے کوس سکتے ہیں۔ مسٹر تیوہار بھئی میرا تو وقت، تاریخ اور مہینہ سب کچھ پہلے سے متعین ہوتا ہے جس کی پابندی لازمی ہے کیلنڈر کے مہینے معصوں کے قالب خانے تھوڑا ہی ہوتے ہیں کہ دو چار عیدیں اِدھر اُدھر سے اُٹھا کر رکھ دیں اس طرح تو ہمارا وقار، ہماری ساکھ ہمارا تقدس سب کچھ مٹی میں مل جائے گا۔

مسز رنجمت :۔ خالی مہینوں میں میں خود اپنی خدمات کی پیش کش رضاکارانہ طور پر کرتی ہوں جسے سبھی لوگ بخوشی قبول کرلیتے ہیں۔ مدرسوں وغیرہ میں جب بھی چھٹیاں ملتی ہیں تو بچوں کے والدین، دفتروں میں مجھے یاد کرتے ہیں اور پھر ہمارا اور مس تعطیل کا بڑے لمبے عرصے تک ساتھ رہتا ہے۔ جب ہم دونوں اکٹھا رہتی ہیں تو ہماری خوب گذرتی ہے۔

مسٹر تیوہار:۔ ہم بھی اِدھر اُدھر سے بھٹکتے تارے مارے پھرتے آپ لوگوں سے گاہے ماہے کہیں نہ کہیں ٹکرا ہی جاتے ہیں۔ بھئی صحیح بات تو یہ ہے کہ ایک آدمی ایک دو آدمی جوڑی تین آدمی ٹولا۔ . . . ▲▼

غزلیں

احمد سلطان
حیدرآباد

فرصت ملے کبھی جو غمِ روزگار سے
ملنے ضرور جائیں گے ہم اپنے یار سے

ڈرتا ہے قید سے نہ رسن سے نہ دار سے
لیڈر کو خوف لگتا ہے دوٹوں کی ہار سے

ملنے کو جائیے تو بگڑ جائیں آپ پر
وابستہ ہو غرض تو بلائیں وہ پیار سے

یہ کیا کہ رعبِ حُسن سے مُرجھا کے رہ گئے
لایا تھا پھول اُن کے لیے اک مزار سے

کھاتے تھے مرغ و ماہی غلامی کے دور میں
آزاد ہو کے کھاتے ہیں روٹی اچار سے

معشوق کی خوشی پہ ہے موسم کا انحصار
نفرت خزاں سے ہے نہ محبت بہار سے

زاہد اٹھا کے ہاتھ دعا مانگتا تھا رات
شادی الٰہی ہو کسی البیلی نار سے

گم ہوگیا ہے چاند یہ کُتے کو ڈھونڈیئے
دی اطلاع یہ لیلیٰ نے مجنوں کو تار سے

گیتا کی بے وفائی پہ آتا ہے یہ خیال
ریٹا کو کیوں نہ مانگ لیں پروردگار سے

احمد بھی بزمِ شعر میں پاتا غزل پہ داد
مکھولکے گر، وہ لاتا دلاور فگار سے

○

جو پاس نہیں اس کو بھلا کیوں نہیں دیتے
خط اُس نے جو لکھے تھے جلا کیوں نہیں دیتے

بلی کو جو نزلہ ہے تو کُتے کو فلو ہے
آئے ہو عیادت کو دُعا کیوں نہیں دیتے

فرہاد نے کھودی تھی کہاں دودھ کی اک نہر
معلوم اگر ہے تو بتا کیوں نہیں دیتے

بچے جو کریں عشق تو ڈنڈے سے خبر لو
ہے جرم محبت تو سزا کیوں نہیں دیتے

کیوں گول پھراتے ہو مجھے راہِ سفر میں
منزل ہے کہاں میری؟ بتا کیوں نہیں دیتے

پتلون کا فیشن ہے زمانے میں حسینو
زُلفوں میں رکھا کیا ہے کٹا کیوں نہیں دیتے

اس بزم میں بیٹھے ہیں سخن فہم جو احمد
تم اپنی غزل اُن کو سُنا کیوں نہیں دیتے

○

بھرپور داد

ایک تھیلا بھرا ہوا لے کر
پہنچے شرفو میاں جو اپنے گھر

پوچھا بیوی نے کیا ہے تھیلے میں
ہاتھ خالی گئے تھے جلسے میں

جھانک کر بولے وہ اِدھر سے اُدھر
پہلی تقریر کا ہے میری اثر

سیدھے جلسے سے گھر کو آیا ہوں
جُوتے چپل سمیٹ لایا ہوں!

رؤف رحیم (حیدرآباد)

زندہ دِل شعراء سے معذرت کیساتھ

چھپ گیا ہے مرا دیوان بکا دے یارب — مول ردّی کے سہی کچھ تو دلا دے یارب (رؤف رحیم)

بال اُگنے کی مجھے کوئی دوا دے یارب — سر ہے چٹیل اُسے کھیت بنا دے یارب (صبغت اللہ بختیار)

اب تو افلاس کے پنجے سے چھڑا دے یارب — مجھ کو داماد منسٹر کا بنا دے یارب (رشید سمیع جلیل)

ایک سرپٹ ہیں ضعیفی میں دُعا کرتے ہیں — مجھ کو محفل میں حسینوں کی بٹھا دے یارب (سرپٹ حیدرآبادی)

میں ضعیفی میں بھی پل پار کیا کرتا ہوں — نوجوانوں میں مرا نام لکھا دے یارب (اسمٰعیل ظریف)

میری حالت پہ مجھے کہتے ہیں پاگل جو بھی — ایسے بھولوں کو تو دیوانہ بنا دے یارب (پاگل عادل آبادی)

بے دھڑک شعر سناؤں گا میں گلی کی طرح — بھاری وہسکی نہیں شکر کی پلا دے یارب (بے دھڑک مدراسی)

کھوکھلا مجھ کو بنایا ہے جو بمبو کی طرح — میرے شعروں کو بھی پبلک میں گھما دے یارب (معین امر بمبو)

جو شگوفہ میں چھپا کرتے ہیں گاہے ماہے — انکو پابندی سے لکھنا بھی سکھا دے یارب (ڈاکٹر مصطفیٰ کمال)

آدھے شعروں کو چُراتا ہے رحیم اب تک بھی
پوری غزلوں کا اُسے چور بنا دے یارب

غزل

شاعری میں اک تماشہ اب وہ دکھلانے کو ہے — مار کر میری غزل محفل پہ چھا جانے کو ہے

سارے الّو کیا کریں گے سوچتا ہوں رات بھر — "تیرگی کا راج اب دنیا سے مٹ جانے کو ہے"

بدنما ہے حسن والوں کی جو ہے آشوبِ چشم — اُن کو دیکھا پیار سے اور آنکھ اب آنے کو ہے

اب ترنم کی روایت بھی پُرانی ہو گئی! — ایک شاعر اپنی غزلیں ساز پہ گانے کو ہے

شاعری میں بھی سیاست گھس گئی ہے آج کل — پارٹی بازی یہاں بھی جال پھیلانے کو ہے

اُردو والو، ایک دھوکہ اور کھا لینا سنو! — پھر حکومت اک نیا اعلان فرمانے کو ہے

ایک نیتا جا رہے ہیں راجدھانی کی طرف — اب گھٹا افلاس کی اس دیش پہ چھانے کو ہے

اہلِ فن سب جا رہے ہیں چھوڑ کر دنیا رحیم
شاعری میں اب تمہاری دال گل جانے کو ہے

رفیع احمد (مالیگاؤں)

چائے (انشائیہ)

قدرت نے ہمیں ہزارہا نعمتیں عطا کی ہیں۔ انھیں میں ایک چائے بھی ہے۔ آپ شاید میری رائے سے متفق نہ ہوں اور ہونا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ جب تمام لوگ کسی بات پر متفق ہو جاتے ہیں تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ چائے چینیوں کی دریافت ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہمیں چینیوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے چائے جیسی نعمت سے دنیا کو روشناس کرایا۔ یہ شاید چائے کا ہی کرشمہ تھا کہ ہزاروں سال پہلے انھوں نے ایک ایسی عظیم دیوار تعمیر کی جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ بہرحال ہم تو چائے کی شان میں قصیدہ خوانی کریں گے کیونکہ چائے ہماری مرغوب مشروب ہے۔ اگر آپ اطمینان سے (جو اس زندگی میں شاید ہی آپ کو میسّر ہو) زندگی کے نشیب و فراز پر غور کریں تو چائے کی اہمیت و افادیت آپ پر واضح ہوتی جائے گی۔

جسم سے سُستی اور کاہلی دُور کرنے میں چائے کا کوئی ثانی نہیں۔ اِدھر آپ نے ایک کپ چائے نوش کی اور اُدھر ساری سُستی اِس طرح غائب ہو گئی جس طرح بجٹ سے پہلے لوازمات زندگی غائب ہو جاتے ہیں۔ جسم میں چستی پیدا ہوگی تو گھنٹوں کا کام آپ نے منٹوں میں کر دکھایا۔ جو مسئلہ بہت پیچیدہ نظر آتا تھا اب آپ نے اسے چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا جسم میں فوری طور پر گرمی اور چُستی پیدا کرنے کے لیے دُنیا میں چائے سے بہتر کوئی ٹانک نہیں۔ ماء اللحم دو آتشہ ہو یا سہ آتشہ چائے کی آتش فشانی کے آگے سب پانی بھرتے ہیں۔ ایک مزدور اور محنت کش کے لیے چائے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کار کیلئے پٹرول۔ کمیونسٹ ممالک کو تو چائے کو قومی مشروب قرار دے دینا چاہیئے۔

چائے نہ ہوتی تو چائے خانے بھی نہ ہوتے۔ ہوٹلوں کے باعث ہی بستی میں رونق اور چہل پہل نظر آتی ہے۔ چائے پینے کی خواہش ہوئی اور ہوٹل جا پہنچے۔ چائے پی، اخبارات کا مطالعہ کیا۔ دوستوں سے گپ شپ بھی ہو گئی۔ ذرا غور کیجئے ایک چائے کی بدولت آپ کو کتنے فوائد حاصل ہوئے۔ آپ کے صرف پچیس یا پچاس پیسے خرچ ہوئے اور اسی میں آپ نے چائے نوش کی۔ کئی روپے کی مالیت کے اخبارات کا مطالعہ بھی کر لیا۔ دوستوں کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے بھی گذار لیے۔ اِسی کو کہتے ہیں آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

اب آپ ایک باریک نکتے پر غور کیجئے۔ ایک شہر میں سینکڑوں ہوٹلیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ہزاروں شہر آباد ہیں۔ اس طرح ہمارے دیش میں لاکھوں ہوٹلیں ہوں گی۔ آپ ان ہوٹلوں میں کام کرنے والے ملازموں کا اندازہ لگائیں تو تعداد یقیناً کروڑوں تک پہنچے گی۔ گویا صرف چائے کی وجہ سے کروڑوں افراد روزگار پا رہے ہیں۔ ہمارے وزراء بے کاری

کے مسئلے کو حل نہ کر سکے لیکن چائے نے اِس سلسلے میں کافی سرگرمی دکھائی ہے۔ لہٰذا اربابِ حکومت کو چائے کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالانا چاہیئے۔

جمہوری طرزِ حکومت نے جمہور کو بہت سے تحائف دیئے۔ انھیں میں ایک گرانی بھی ہے۔ آج ہر ہندوستانی گرانی سے گراں بار ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کے دام آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ایسے پُرآشوب دور میں ملاقاتیوں کی خاطر تواضع کرنا کس قدر دشوار مرحلہ ہے۔ چائے نے اس دشوار مرحلے پر بھی اپنا دستِ تعاون دراز کیا ہے۔ جونہی گھر پر یا دفتر میں کوئی ملاقاتی آیا آپ نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا کیوں کہ بعض اوقات بٹھانے کے لیے بھی جگہ نہیں ہوتی۔ باتیں کرتے کرتے آپ نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ ملاقاتی نے چائے پی اور آپ کو مہمان نوازی کا سرٹیفکٹ دیتا ہوا چلا گیا۔ حاتم طائی کو مہمان نواز بننے کے لیے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے لیکن چائے نے آپ کو بیٹھے بٹھائے مہمان نواز بنا دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ ہمارا قول ہے کہ یہ رشوت کا زمانہ ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہم ہوئے، تم ہوئے، وزیر ہوئے
لے کے رشوت سبھی امیر ہوئے

رشوت وہ کرنسی ہے جو ہر ملک میں رائج ہے۔ اس سرائے فانی میں رشوت کا آغاز کب ہوا؟ اس کی تحقیق کرنے والے کو ہم بذاتِ خود پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کریں گے۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ رشوت کا چلن دُنیا میں زمانۂ قدیم سے ہی رہا ہے۔ اس کے نام بدلتے رہے۔ وہ کبھی زر کہلائی، کبھی زن اور کبھی زمین۔ کہیں وہ شراب کے روپ میں جلوہ گر ہوئی کہیں کباب کے۔ یہ سب رشوت کی مکروہ شکلیں ہیں۔ کبھی وہ میک اپ بدل کر اس طرح پردہ نشیں ہو کر آتی ہے کہ آپ جیسے شرفا بھی اسے سر آنکھوں پر، پلکوں پر بلکہ ہونٹوں پر جگہ دیتے ہیں۔ قصیدہ خوانی، مدح سرائی، خوشامد اور جی حضوری وغیرہ اس کی مہذب شکلیں ہیں۔ فی زمانہ چائے بھی رشوت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ چائے اس دورِ پُرفتن کی ارزاں ترین رشوت ہے۔ زندگی میں پیش آنے والے معمولی مسائل کو آپ اس کی مدد سے حل کر سکتے ہیں۔ کسی مقامی اخبار کا ایڈیٹر آپ کا مخالف ہو تو اس سے آپ کسی ہوٹل میں تنہا ملاقات کیجیے۔ چائے وغیرہ سے خاطر تواضع کیجیے۔ چائے کی گرمی اُس کی ساری سرگرمی پر اسٹے لگا دے گی۔ اگر طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہو اور اپنے کلامِ بے لگام کی اصلاح مقصود ہو تو کسی بزرگ شاعر کو پکڑ لیجیے، اُن کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے بعد انھیں چائے کی پیالی پیش کیجیے۔ پھر دیکھئے وہ آپ کے کلام کی لگام بھی کس دیں گے اور چند اشعار کا اضافہ بھی ہو جائے گا۔ آپ کے اشعار میر و غالب کی یاد دلاتے ہیں لیکن مشاعرے میں کم بخت شعراء داد ہی نہیں دیتے۔ ذرا ان کی خدمت میں چائے کی پیالی اور پان کی گلوری تو پیش کیجیے۔ یہی شعراء آپ کی غزلوں پر سر دھنیں گے۔ داد کی وہ بارش ہوگی کہ آپ نہال ہو اُٹھیں گے۔ احباب آپ کی غزل کے چند اشعار بھی سُننے کے روادار نہیں۔ چائے پلانے کے بعد آپ انھیں پانچ سات غزلیں بآسانی سُنا سکتے ہیں۔ اُن تیر بہدف نسخوں کو آزمانے کے بعد آپ بھی یہ کہہ اُٹھیں گے۔ ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے جہاں میں چائے بنائی

عباس متقی (حیدرآباد)

شادی خانے سے دواخانے تک

۱۹۸۲ء کی بات ہے، موسم ٹھنڈا اور ماحول گرم تھا۔ ایک دن ہم مسجد گئے تاکہ فرض ادا کر کے بھاگ کھڑے ہوں سلام پھیر کر دیکھا کہ ایک کرم فرما ہمارے منتظر ہیں، کہنے لگے مولوی صاحب کل میری سالی کی بچی کی شادی ہے آپ ضرور تشریف لائیے گا۔ رقعہ ہاتھ میں تھمادیا۔ ہم نے رقعہ پر طائرانہ نظر دوڑائی پتہ چلا کہ ماشاء اللہ تناول طعام بھی ہے۔ ہم اکثر ایسی ہی شادیوں میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود شرکت کے لیے مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر رقعہ پر تناول طعام رقم نہیں ہوتا تو بغور اس چھوٹے سے کارڈ کو تلاش کرنے لگتے ہیں جسے عرف عام میں راشن کارڈ کہا جاتا ہے، چونکہ ہم چھوٹے آدمی ہیں اس لیے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مداح بھی۔ بہرحال ہمیں ان کی دعوت پر گویا ترس آگیا اور ہم نے بدقت تمام ان کی دعوت قبول کرلی، لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ ہم اس طرح ستره دست اور اتنی ہی الٹیوں کو قبول فرمارہے ہیں۔

کرفیو نے شادیوں کے اوقات بدل ڈالے تھے بعض دولہوں کے مقدرات بھی، اکثر شادیاں بعد مغرب کی بجائے صبح تا نصف النہار کا شکار ہوگئی تھیں بلکہ محض نصف النہار کا۔ کیوں کہ ہم نے آج تک ناشتہ کئے بغیر صبح کی شادی میں کبھی حاضری نہیں دی اور یوں بھی نوشہ کے نکلنے تک دوپہر تو ہو ہی جاتی ہے اور اس بے چارے کو کیا پتہ کہ گھڑیوں کے ساتھ براتیوں کے بھی بارہ بج رہے ہیں۔ ہم ہندوستانی ہیں۔ دیر آید درست آید پر ایقان رکھتے ہیں۔ نوشہ اگر نو ماہ بعد بھی آئے بہرحال ہم سعادت مندی کے ساتھ منتظر رہیں گے۔ جہیز اور جوڑے کی رقم نے نوشہ کو بہت قیمتی کر دیا ہے عزت و ناموس سے بھی زیادہ۔

شادی میں شرکت کے لیے ہمارے ایک دوست تشریف لے آئے، کہنے لگے کہ شاید شادی وقت پر ہو ہمیں قبل از وقت نکلنا چاہیئے۔ ہم نے لاکھ دلاسہ دیا کہ شادیوں میں گھڑیاں بہت لیٹ چلتی ہیں وہ نہ مانے ہمیں ان کے ساتھ نکل ہی جانا پڑا۔ ہم دونوں جب شادی خانہ پہنچے تو وہاں دولھا تھا نہ براتی البتہ قاضی صاحب اپنی روایتی تھیلی کے ساتھ موجود تھے جو ہمیشہ مصری، بادام سے بھری رہتی ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ دولھا ہوتا ہے تو قاضی نہیں ہوتا اور قاضی ہوتا ہے تو دولھا نہیں ہوتا اور جب دونوں بیک وقت موجود ہوتے ہیں تو بس شادی ہوجاتی ہے۔ دولھے میاں شاید واقعی نوشہ تھے حسب روایت کافی لیٹ پہنچے۔ عقد پڑھا گیا۔ مصری بادام اچھالے گئے۔ ہم نے اپنی سیٹ سے لاکھ اچھل کود کی مگر اچھلتا ہوا اک آدھ بادام بھی ہم تک نہ پہنچ سکا۔ گلے ملے گئے۔ مبارک بادیاں دی گئیں اور پھر سب کی نگاہیں

کسی نے اس ڈانٹ کو چلئے سنا تو کسی نے " اٹھیے " گویا سنا دہی گیا جس کی اشد ضرورت تھی کیونکہ ہم بھی حکام سے کم نہیں کہا کچھ جائے سنتے وہی ہیں جسے اپنے طور پر سمجھ لیتے ہیں۔

چوکی کا کھانا تھا۔ دو قسم کی عمدہ بریانی۔ دو قسم کے میٹھے جس میں کدو کی کھیر سب کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ [illegible] دیکھا تو ماڈرن ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ ہم پہلی " انگ " کی بیٹنگ [illegible] چکے تھے۔ کتنے " رن " بنائے اسے فی الحال مخفی ہی رکھتے ہیں۔ چائے پی کر چادر گھاٹ کے چوراہے پر کھڑے یہ سوچنے لگے کہ اب کہاں جائیں، اسی دن فتح میدان پر ڈاگ شو تھا اور ہم اسے دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ سنا ہے کہ اس شو میں اصیل کتے آتے ہیں اور یوں بھی ہم کنٹری کتوں سے تھوڑا بیزار ہو چکے تھے۔ دل بہلانے کا یہ ایک مشغلہ ہاتھ آیا تھا۔ پان چباتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ پیٹ میں خفیف سا احساس جاگ رہا ہے جیسے کوئی بوڑھا سن بلوغ کو پہنچ رہا ہو۔ ہم نے مکرر غور کیا آیا یہ احساس واقعی کسی آمد کی تمہید ہے یا یوں ہی تفریحی لگل۔ اندازے کے بعد طے یہ پایا گیا کہ پہلے فراغت پھر تفریح۔ گھر کا ارادہ ہوا۔ اب تو معاملہ دگرگوں تھا۔ ہر دو فرلانگ پر حکومت کی عدم دلچسپی پر مضمون لکھنے کو جی چاہتا تھا کہ سرکاری بیت الخلاء راستے میں کیوں نہیں ہیں آمد میں تشدد تھا سیکل دبا کر گھر پہنچے بلکہ سیدھے بیت الخلاء پہنچے۔ کوئی ہماری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہمارے بیت الخلاء میں کوئی نہیں تھا۔ ہم یوں خوش تھے جیسے ہمیں ام۔ ال۔ اے کی سیٹ مل گئی ہو۔ جی چاہتا تھا کہ حضرت داغ کی طرح بیٹھے رہیں۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ٹانگوں میں لرزہ تھا۔ کمر میں خفیف سا درد، آنکھوں میں تاریکی۔ سر میں چکر۔ طرفہ یہ کہ متلی بھی ہو رہی تھی۔ اٹھا نہیں جاتا تھا کچی زچہ کی طرح ہمت کو یکجا کیا پٹ کی لٹکتی ہوئی زنجیر کو سہارا بنائے بدقت تمام ایستادہ ہوئے۔ بیت الخلاء نمائش کا جھولا معلوم ہوتا تھا۔ جب دروازہ لپنے مقام پر پہنچا تو لنگڑاتے لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے اور نکلتے ہی بستر پر دھڑام۔۔۔ ابھی لیٹے ہی تھے کہ ایسا محسوس ہوا گویا معدہ میں جنگ ہو رہی ہے۔ شیر شاہ سوری اور شہنشاہ بابر آپس میں برسر پیکار ہیں، توپ داغے جا رہے ہیں تلواروں کی جھنکاریں زخمیوں کی چیخ و پکار، غرض ادھر پانی پت گرم تھا اور ادھر ہمارا پتہ پانی ہو رہا تھا۔ ایک طویل ابکائی اور ایک ہی اُلٹی کے بعد میوزیکل پروگرام شروع ہو گیا۔ سر میں ستار اور سینہ میں طبلہ بجنے لگا۔ معدہ احمق کے سر کی طرح خالی ہو چکا تھا۔ جب یکے بعد دیگرے پانچ الٹیاں ہو گئیں تو ہم نے اپنے گناہوں کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ رہ رہ کر وہ لطیف گناہ بھی یاد آتے تھے جنھیں ہم غلطی سے چھوڑ بیٹھے تھے یہ بھی یاد آ رہا تھا کہ حیدرآباد میں کئی نئی فلمیں لگی تھیں لیکن افسوس کہ ان کے دیدار سے محروم رہے تھے انھیں خیالات میں ہم گم تھے کہ اچانک پیٹ میں مروڑ سی محسوس ہوئی۔ دھیرے دھیرے درد ہونے لگے۔ بلاوجہ رہ رہ کر دایہ کی صورت آنکھوں میں گھومتی تھی۔ بسا اوقات آدمی عالم حیرانی میں ناممکنات پر بھی غور کرنے لگتا ہے بس یہی فلسفہ اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ جب الٹیاں حد سے تجاوز کر گئیں اور پیٹ کا پانی ختم ہونے لگا تو اک خیال ذہن مجہول میں کوندا کہ ممکن ہے فوڈ پوائزننگ ہو گیا ہو۔۔۔ لہذا دواخانہ (کورنٹین) چلنا چاہیئے۔ اس خیال کے آتے ہی ہمیں یک گونہ سکون محسوس ہوا کیونکہ ایسی صورت میں وہاں فقط ہم اکیلے نہیں ہوں گے بلکہ احباب سے وصال مکرر ہوگا۔ قاضی صاحب بھی ہوں گے۔ دولھے میاں کی موجودگی تو عین ضروری ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اُٹھ بیٹھے گویا ان سب سے بارِ دیگر ملاقات کے شوق نے ہمیں بے تاب کر دیا ہو۔

آٹو میں طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب کورنٹین کی پھاٹک نظر آئی تو کچھ جان میں جان آئی۔ وارڈ بوائے جو پلنگ کے ساتھ ساتھ جیب بھی صاف کر دیتا ہے سنبھال کر اندر لے گیا ڈاکٹر صاحب نے معائنہ فرمایا مختاط بسوالات

کئے۔ کہاں سے آیا۔ کیا کھایا۔ کب کھایا۔ کیا پکا تھا۔ کب پکا تھا۔ کس نے پکایا تھا وغیرہ وغیرہ۔ ہم تو بے دم تھے بلکہ نیم ڈال کے بود م تھے جوابات ہماری امی دے رہی تھیں ہمیں اس وقت اپنی پہلی شادی یاد آگئی۔ سسرال والوں کے سوالات کے جوابات اس وقت بھی ہماری امی نے دیئے تھے اور اس کا خمیازہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ فوراً شریک کر لیا گیا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی ہم نے ملاحظہ کیا کہ مزید لوگ آرہے ہیں گویا ہم نے "ادگھاٹن" کردیا تھا اب سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

بیماری کے اوقات اور اضطرابی حالات لیکن نگاہِ جمال آشنا نے ایک حسینہ تک رسائی حاصل کر ہی لی شاعر جھٹیرے۔ گلاب سا چہرہ، نیلگوں آنکھیں، گداز بانہیں، سبک انگلیاں وہ کوئی نرس تھی جو گلوکوس چڑھانے آرہی تھی۔ اس کی آمد سے قبل ہی ہم نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا، آستین سرکانے دم نہ تھا۔ مخروط انگلیوں کے لمس نے ہماری ڈوبتی ہوئی نبض کو تیز کر دیا آنکھیں کھول کر تبسّم و معصوم انداز میں سرگوشی کی "نرس" اس نے کہا "یس" ہم نے فوراً کہہ دیا "نو" اس نے دلاسہ دیا کہ کوئی بات نہیں جلد صحت ہو جائے گی۔ ہائے کس نزاکت سے اس نے ہمارے ہاتھ کی پھڑکتی ہوئی رگ کو ٹٹولا جیسے کوئی بال جبرئیل میں فلسفۂ عشق ڈھونڈ رہا ہو۔ ہائے کس آہستگی سے اس نے سوئی چبھوئی اور پھر دھیرے دھیرے ہماری رگوں میں گلوکوز دوڑنے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کسی بوڑھے شاعر کو اردو اکیڈمی امداد سے نواز رہی ہے۔

نرس چلی گئی ہم نے اپنی نگاہیں ٹپکتے ہوئے گلوکوس پر مرکوز [illegible] گلوکوس ٹپکتا رہا۔ اور ہم سو گئے جب بیدار ہوئے تو سارا ہال مریضوں سے پُر تھا، سارے ہی مہمان مکرر آچکے [illegible] تھا اور براتی سبھی حاضر تھے، بچے، بوڑھے عورتیں کون تھا جو گلوکوس سے محروم رہا ہو۔ اک جم غفیر مریضان دعوت کی عیادت کو حاضر تھا۔ ہم خداوند قدوس سے دعا کر رہے تھے کہ یا اللہ سب کو صحت دے اور خیر و سلامتی سے مرخص فرما۔ حکومتی سطح پر تاکیدیں ہوئیں ام۔ ایل۔ اے کی آمد آمد رہی۔ غرض کہ صبح تک تین سو مریضوں میں سے دو سو پچاس کو ڈسچارج کرایا گیا۔ آٹھ بجے تک ماباقی سب چلے گئے، پیچھے ہم چونکہ سب سے پہلے آئے تھے اس لیے سب سے آخر میں جانا پڑا۔ دس بجے کے قریب ڈاکٹر ہمارے پاس آیا۔ نبض کو ملاحظہ کیا، آنکھوں کا مطالعہ کیا۔ کہنے لگا آپ بھی جا سکتے ہیں۔ تین دن تک مرچ سے پرہیز کیجئے۔ ہم نے اثبات میں سر ہلایا اور چلتے بنے۔

الحمد للہ آج ہمیں مکمل صحت ہو گئی ہے مرض کا دور دور تک پتہ نہیں لیکن نہ جانے کیوں اس واقعہ کی اک یاد ہمارے دل میں بسی ہوتی ہے جیسے ساحل پر پہنچنے کے بعد بھی کسی مسافر کو سمندر کا تموج یاد ہو۔ ہم نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ آئندہ دعوت میں ہرگز نہیں جائیں گے اور خاص ان دعوتوں میں ہرگز، ہرگز نہیں جائیں گے جہاں "تناول طعام" بھی ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں آج بھی ہم غیر ارادی طور پر رقعہ ہاتھ میں لیتے ہی "تناول طعام" ہی تلاش کرتے ہیں۔

"نمی دانم"....

اشرف خوندمیری

سنو جی اسم من خرمؔ تمارا نام کیا خسانم ذرا سا پیار دیدیو نا تمارا پیار می خواہم
اُنوں نکّو نئیں سمج کو پوچھے می گو ایمی کا والے ذرا سا مجبیگا پی لیئو اگر ہوتے ہئے تمیں دہم
اُنوں سر پیٹ کو بولے نہیں جانم نہیں جانم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم"

یکایک آکو مجبوری کے ٹھیش پو رکیئے بنڈی محبت کا بخار اُترا پیشانی ہوگئی ٹھنڈی
اُنوں سلمے کی اُنگلی کنپٹی پو رکھ کو بول اُٹھے یہ باتاں منجے اُوں ہُوں ہوں ذرا تلگو لو جینڈی
منجے می بھاشا رادُو اَیّو اَیّو اَیّو نا یا ہم !
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم !"

تمیں دیکھا تو یارم دردلِ من پیار می آئد تصور میں تمارا بس حسیں رخسار می آئد
اصل میں می کو ایم آئندی ار تھم ایمی کالیڈو یہ آئد ہور دہ آئد پو منجے انگار می آئد
تمارے سر میں لونی ہور میرے دل میں ہے واتم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم"

می اندم اینتا باگندی منجے اتنا کھوشی وُندی تمارے ہور میرے پیار لو کتّی رُچی وُندی
کمندِ عشق من آزردہ دیدن آکو کاں ٹٹ گئی کہ میری بے کسی وُندی تماری دلبری وُندی
تمارے پیار لو اَیّو ہے میرے پیار لو کارم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم" !

محبت گر قبول اُفتد زہے قسمت بکن یاری مزاجِ عاشقاں در دل خلوص و اُنس و غمخواری
نمی کیا کیا کی بولے سو منجے تو ایمی تلئیڈو کہ ہلّو ہلّو نڑولے محبت کی ہے یہ داری
کبی اسمیں ہے اُلہا سم کبی اسمیں ہے لو راٹم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم"

ہیلو اسکیوزمی مسٹر ہیلو اسکیوزمی لُو میس نمی ڈانم یہ لوراٹم جو تم بولا سو واٹ از دیس
ہمارا کنٹری میں تو یہ سب نیوسنس نئیں ہوتا ہمارا بی تو ڈسے ہم تو منگتا اونلی ون کِس
تمارا ٹاپ یہ اسٹیڈا ہے نہ ان کو ٹیک ہے باٹم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم ؟

محبت سے دھڑکتا دل کوئی خالی مکاں نئیں ہے یہ مسجد ہے یہ مندر ہے مہاجن کی دکاں نئیں ہے
محبت ہندی بھیڑی لنگڑی گلی گنگی ہوتی ہے ارے رے باپ بچاری کے تو ہونٹوں میں بی زباں نئیں ہے
نظر کے تان پورے پو تمیں چھیڑو الاؤ دانم
زبانِ یارِ من تلگو و من تلگو نمی دانم" !

خامہ بگوش

نیکی وہی ہے جو دریا میں ڈال دی جائے

نہ کہ کتاب کی صورت میں شائع کرادی جائے

ابھی مشکل سے ایک مہینہ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ایک روز مسٹر دہلوی کا فون آیا کہ ان کی ایک نئی کتاب شائع ہورہی ہے، اس کے لیے ہم چند سطریں لکھ دیں۔ ہم نے ہنس کر کہا: جہاں آپ نے اپنے لیے پوری کتاب لکھی ہے چند سطریں ہماری طرف سے بھی لکھ لیجیے۔ فرمایا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کی رائے چاہیئے جو آپ ہی دے سکتے ہیں۔ عرض کیا، ہم میں آپ میں اختلاف رائے تو ہے نہیں، ہماری طرف سے آپ جو کچھ لکھیں گے، وہ ہماری رائے کے عین مطابق ہوگا۔ کہنے لگے، ٹیلی فون پر کیا بحث کی جائے، آمنے سامنے بیٹھ کر بات ہوگی۔ مسودہ بھی آپ کو دکھایا جائے گا۔

افسوس کہ وہ خود تو نہیں آئے، اُن کی خبر آگئی — ۱۱ر اکتوبر کے اخباروں سے معلوم ہوا کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ یہ خبر ایسی اچانک تھی کہ یقین نہ آیا۔ لیکن ہمارے یقین نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔

مشتاق احمد چاند عرف مسٹر دہلوی مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں صرف مزاحیہ شاعر سمجھنا ان کے مقام و مرتبہ سے ناانصافی ہے۔ انھوں نے نہایت اہم اور سنجیدہ موضوعات پر شاعری کی ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں بہت سی کام کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ معاشرتی زندگی کی ناہمواریاں ہوں یا سیاسی زندگی کے تضادات، ادبی دنیا کی بے سمتی ہو یا صحافتی دنیا کی بے راہ روی، ان سب خرابیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اسی صورتِ حال کے نوحہ گر تھے۔ یہ نوحہ گری طنز و مزاح کے پیرایے میں تھی تاکہ ان کے خیالات دوسروں تک آسانی سے پہنچ جائیں۔ عجیب نوحہ گر تھا کہ رونے رلانے سے پہلے ہنستا ہنساتا تھا۔

مسٹر دہلوی صرف دوسروں پر ہی وار نہیں کرتے تھے، اگر ان کے طنزیہ تیروں کا ہدف خود ان کی اپنی ذات ہوتی تھی تو بھی وہ کسی قسم کی مروت سے کام نہیں لیتے تھے، یہی نہیں وہ اتنے کشادہ دل تھے کہ اپنے اوپر ہر طرح کی تنقید نہ صرف برداشت کرلیتے تھے بلکہ لکھنے والے کو داد بھی دیتے تھے۔ ورنہ اب تو یہ عالم ہے کہ ہمارے ادیبوں کی سماعت پر تعریف کے سوا دوسری ہر بات گراں گذرتی ہے۔ ہم نے کئی مرتبہ اپنے کالموں میں ان کے بارے میں سخن گستری بھی کی اور سخن سازی بھی، لیکن ان کی پیشانی پر کبھی کوئی شکن نہ آئی۔ جس محبت سے وہ پہلے

دن ملے تھے، اُسی محبت سے وہ آخر تک ملتے رہے۔

مرحوم کی نثری تصانیف علمی و ادبی اعتبار سے خاصی بلند پایہ ہیں۔ بہت سے ادبی اور سماجی مسائل پر انھوں نے فکر انگیز مقالات لکھے ہیں۔ پاکستان کے معاشی مسائل تو ایک مستقل تصنیف "مکالمات سقراط" ماہرینِ معاشیات سے بھی داد حاصل کر چکی ہے۔ چار سال پہلے جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی تو ہم نے اس پر ایک کالم لکھا تھا۔ چونکہ اس کالم میں مرحوم کی بہت سی خوبیوں کا بھی ذکر ہے، اس لیے اس کے کچھ اقتباسات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

مسٹر دہلوی بڑے وضع دار آدمی ہیں۔ ان کی وضعداری کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ۳۰، ۳۵ سال پہلے لکھنے کا جو شوق پیدا ہوا تھا، اسے اب تک نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں۔ ہمیں ان کی مزاحیہ شاعری بے حد پسند ہے۔ ہمیں ہی نہیں اکبر الٰہ آبادی کو بھی بہت پسند ہے" کلیاتِ اکبر" اٹھا کر دیکھ لیجئے، جگہ جگہ مسٹر دہلوی کے رنگ میں شعر ملیں گے۔ مسٹر دہلوی کا پیشہ تجارت ہے اور وہ خاصے خوشحال ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو شاعری سے بہتر کوئی مشغلہ بھی اختیار کر سکتے تھے لیکن انھیں اپنی بہتری کا نہیں ہمیشہ دوسروں کی بہتری کا خیال رہتا ہے ۔۔۔ دوسروں کی بہتری سے مراد دوسروں کی اصلاح۔ مسٹر دہلوی جو کچھ لکھتے ہیں اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھتے ہیں۔ اس لیے ہم ان کے لکھنے کے شوق کو ان کی نیکی سمجھتے ہیں۔ عام لوگ" نیکی کر دریا میں ڈال" پر عمل کرتے ہیں۔ مسٹر دہلوی دریا میں ڈالنے کی بجائے مطبع میں بھیج دیتے ہیں جہاں سے وہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آتی ہے۔

مسٹر دہلوی کی وضعداری کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر چوتھے یا پانچویں سال ایک کتاب ضرور لکھتے ہیں۔ کتاب لکھنا کوئی مشکل کام نہیں کہ یہ کام تو لاغر مراد آبادی اور انجم اعظمی بھی کر لیتے ہیں۔ مسٹر دہلوی کا کارنامہ یہ ہے کہ ان کی ہر کتاب فنِ طباعت کا شاہکار ہوتی ہے۔ وہ کتاب کی تصنیف سے زیادہ کتاب کی ظاہری شان و شوکت پر توجہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی کتاب ادب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ طباعت کی تاریخ میں بھی سنگِ میل ثابت ہوتی ہے۔

مسٹر دہلوی کی تازہ کتاب جس کا نام آپ کو بھی کچھ دیر بعد معلوم ہوگا، طباعت کے اعتبار سے بے مثال ہے جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ نوری نستعلیق میں چھپنے والی پہلی کتاب ہے۔ یہ اتنی دیدہ زیب ہے کہ نوری نستعلیق کے حسن کا بھرپور اندازہ پہلی مرتبہ اس سے ہوتا ہے ۔۔۔ اگر کبھی نوری نستعلیق کی تاریخ لکھی گئی تو اس کتاب کو بطور حوالہ پیش کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی کتاب کا کتابِ حوالہ بن جانا کوئی معمولی بات نہیں۔

مسٹر دہلوی کی وضع داری کا تیسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ جب کوئی کتاب لکھتے ہیں تو اس کے ساتھ دو تین درجن افراد میں بھی لکھنے لکھانے کا شوق پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی ہر کتاب پر متعدد دیباچے ہوتے ہیں جن میں ایک ہی بات کو مختلف انداز سے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ قاری ان دیباچوں کو پڑھ کر اتنا علم حاصل کر لیتا ہے کہ اصل کتاب پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔۔۔

یہ ساری تمہید اس لیے لکھی گئی ہے کہ مسٹر دہلوی کی تازہ ترین کتاب" مکالماتِ سقراط" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ کتاب کے نام سے ہم یہ سمجھے کہ مصنف نے سقراط کی زبان و بیان کی غلطیاں نکالی

ہوں گی کیوں کہ اس سے پہلے موصوف جوش صاحب کی زبان کی غلطیاں نکال چکے ہیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ سقراط نے تو کوئی کتاب ہی نہیں لکھی تھی۔ اس لیے مسٹر دہلوی نے سقراط کی زبان و بیان کی نہیں، خیالات و نظریات کی غلطیوں کی تفصیل پیش کی ہوگی۔ دوسروں کے خیالات و نظریات پر تنقید کرنے میں یہ آسانی ہے کہ نقاد کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی۔ دوسروں کا ہر خیال اور ہر نظریہ خود بہ خود غلط ثابت ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم نے زیر نظر کتاب کا مطالعہ کیا تو معاملہ بالکل مختلف نظر آیا۔ سقراط سے مراد وہ مشہور فلسفی نہیں جسے زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا بلکہ وہ شخص ہے جس کا گزارا چائے کی پیالی اور نہاری پر ہے۔ یعنی مسٹر دہلوی خود سقراط کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ بقول خود وہ اپنے حلقۂ احباب میں سقراط کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ سقراط کو سزا کے طور پر زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو اپنی خوشی سے زہر کا پیالہ پی لیتا تاکہ ایک ہی نام کے دو افراد کی موجودگی غلط فہمیوں کا سبب نہ بنتی۔

مسٹر دہلوی نے اپنے اور سقراط کے درمیان جو مماثلتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت زیادہ بولنا دونوں کی عادت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ دونوں میں لکھنے کے سلسلے میں مماثلت نہیں پائی جاتی، ورنہ ہمیں اصلی سقراط کی بھی بہت سی کتابیں پڑھنی پڑتیں۔

سقراط پر ہمیں رشک آتا ہے کہ اس نے ایک کتاب بھی نہیں لکھی، لیکن اس کا شمار دنیا کے بڑے مفکروں میں ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہمارے بعض ادیب ہیں جو نہایت غور و فکر کے بعد درجنوں کتابیں تصنیف کرتے ہیں اور ان کا شمار مفکروں میں تو کیا جلد سازوں میں بھی نہیں ہوتا۔

"مکالمات سقراط" کا موضوع معاشیات ہے۔ کئی دن تک ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ اس کتاب کو پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ تامل کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر دہلوی شاعر ہیں، اور شعرا ہر موضوع کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو اب تک ان کے روایتی محبوب کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک روز ہم کتاب کی طباعت سے محظوظ ہو رہے تھے کہ نظر اس عبارت پر پڑی۔ "جہاں تک معاشیات سے متعلق ہمارے علم کا سوال ہے تو ہمیں بخوبی علم ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ بے شک ہم تاجر برادری کے فرد ہیں لیکن کماڑی کے پل پر بیٹھ کر سمندری مچھلیوں کا شکار کھیلنے والے کو وہیل مچھلی کے شکار کی باریکیوں کا جتنا علم ہو سکتا ہے اتنا ہی علم ہمیں بھی معاشیات کا ہے"۔

ہم نے سوچا کہ جو شخص اتنی دیانت داری سے اپنے علم کا اعتراف کر رہا ہے، اس کی کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ اس کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کی جا سکے۔ کتاب پڑھی تو نتیجہ یہ نکلا کہ ہم باوجود کوشش کے مسٹر دہلوی کی اس رائے سے متفق نہ ہو سکے کہ ان کا معاشیات کا علم واجبی سا ہے۔ ہمیں یہ کتاب پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس پر کہ مسٹر دہلوی نے خلافِ توقع ایک فکر انگیز کتاب لکھ ڈالی۔ اور خوشی اس پر کہ اب فکر انگیز کتابیں لکھنا بھی کوئی مشکل کام نہیں رہا۔

مسٹر دہلوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے زبان و بیان کی شگفتگی کا ایسا جادو جگایا ہے کہ معمولی قابلیت کا آدمی بھی اس کتاب کو پڑھ کر معاشی مسائل سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ ہماری ہی مثال لیجیے۔ اس کتاب کے مطالعے سے پہلے ملکی معاشیات کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں لیکن اب ہم بہت کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ان مسائل پر جو شخص چاہے ہم سے گفتگو کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم مسٹر دہلوی سے بھی گفتگو کیلئے

تیار ہیں کہ ان کا سارا علم اب ہمارے پاس ہے۔ اگر وہ سقراط ہیں تو ان کی کتاب پڑھ کر ہم بھی بقراط بن چکے ہیں
اس کتاب پر پندرہ اہل علم کے دیباچے ہیں۔ سولہواں خود مصنف نے لکھا ہے۔ ہمارا یہ کالم اس
کتاب کے بارے میں سترھویں تحریر ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کو کم از کم سترہ آدمیوں نے
ضرور پڑھا ہے۔ اردو کی اگر کسی کتاب کو اتنے قاری بھی مل جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا شائع ہونا بیکار
نہیں گیا لیکن ہماری خواہش ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل ہو اور ہر وہ شخص اس
کا مطالعہ کرے جسے ملک کے معاشی مسائل سے دلچسپی ہے۔

امید ہے مسٹر دہلوی آئندہ بھی اس قسم کی کتابیں لکھتے رہیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ
وہ مزاحیہ شاعری ترک کر دیں یہ کام بھی انھیں کرتے رہنا چاہیے کہ ان کی مزاحیہ شاعری نثری نظموں سے
بہرحال بہتر ہوتی ہے۔ ∆∇

فاروق خنجر
(حیدرآباد)

ہمارا دورہ

دورے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دورہ تو وہ ہوتا ہے جو لوگوں پہ پڑتا ہے۔ جسے مرگی کا دورہ کہتے ہیں۔ یہ خطرناک قسم کا ہوتا ہے۔ کیونکہ جس شخص پہ مرگی کا دورہ پڑتا ہے اسے پرانا جوتا یا چپل سنگھایا جاتا ہے جس سے وہ ہوش میں آجاتا ہے اور حسبِ معمول اپنے کاروبار میں لگ جاتا ہے لیکن یہ موقتی علاج ہے۔ خیر چھوڑیئے مرگی کے دورہ کو، اور آگے بڑھیئے۔ کیونکہ آگے کئی دورے پڑے ہوئے ہیں۔ جیسے ہچکی کا دورہ ہنسی کا دورہ، پاگل پن کا دورہ، اداسی کا دورہ، شاعری کا دورہ وغیرہ ــــ ہاں ایک دورہ اور بھی ہوتا ہے جو صرف افسروں کو پڑتا ہے جسے ٹور (TOUR) کہتے ہیں۔

ٹور (TOUR) پر یاد آیا کہ کچھ عرصہ پہلے ہمیں بھی ایک چھوٹا موٹا دورہ پڑا تھا۔ [illegible] کہ ہمارے محلّے کے چند نوجوانوں کے ساتھ ڈسٹرکٹ ملیریا آفیسر سے ملنا تھا۔ جب ہم اس آفس کو پہنچے تو پتہ چلا کہ "صاحب" پر دوروں کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ ہم نے شرارتاً چپراسی سے پوچھا "کیا آپ کے صاحب دوروں کے مریض ہیں؟ چپراسی نے نہایت برہمی سے جواب دیا "آپ پڑھے لکھے نہایت ہی معقول قسم کے انسان معلوم ہوتے ہیں! آپ کو "دورہ" اور "TOUR" کا فرق معلوم ہونا چاہیئے۔ ہمارے صاحب تو آج کل ٹور (TOUR) پر ہیں۔

اب ہمارا یہ حال ہے کہ پہلی قسم کے دورہ کے تصور ہی سے کانپ اُٹھتے ہیں اور دوسری قسم کے دورہ کا شوق بڑھتا جارہا ہے کہ کاش ہم بھی دورے کرتے اور ٹی اے۔ اور ڈی اے کے نام پہ آمدنی میں اضافہ کرتے۔ یوں ہم سرکاری ملازم ہیں۔ لیکن پھر بھی دورہ ہمارے لیے شجرِ ممنوعہ ہی ہے۔ دوروں سے ہمارا تعلق صرف اس حد تک ہی ہے کہ صاحب کے دورہ پر جانے سے پہلے ان کے پروگرام آنے کے بعد ٹور نوٹ ایک بدہیئت فائیل میں نتھی کرتے جائیں۔ اسی لیے دورہ کنندہ عہدیدار ہم سے بہت ہی محبت اور شفقت سے ملتے ہیں۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ دوروں کی تمنا تو دل ہی میں رہی لیکن کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ پھر تو رات دن کھانسنا اور انجکشن لگوالینا ہمارا معمول ہوگیا۔ یہ سلسلہ تقریباً دو تین ماہ چلتا رہا اس اثنا میں اچانک ایک دن دس گیارہ بجے گھر کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولتے ہی کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست جن کا قد پانچ فٹ ہے کھڑے ہوئے ہیں۔ موصوف اداکاری کے نہایت شوقین ہیں لیکن قد کے مختصر ہونے کی وجہ سے آج تک

طنز و مزاح میں دو مقبول [illegible] کو بھی ہدف بنایا ہے. شاعر اور شاعر کی بیوی. ایک نظم سائنسی دوشیزہ میں سائنس کی بھیانک ایجادات بالخصوص ایٹم بم کو ایک دوشیزہ کے پیکر میں مجسم کر دیا ہے. نظم مزاحیہ نہیں لیکن سائنس کے اصلی روپ کو حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کرتی ہے.

انھوں نے اپنے قبیلے یعنی مزاح نگار شاعروں پر بہ کثرت نظمیں لکھ کر خراجِ تحسین پیش کیا ہے. شاید ممدوح حضرات "لمبرا حاجی بگو" کے زریں اصول پر عمل کریں تو جلیل صاحب پر ایک مجموعہ قصائد مدون ہو جائے.

مزاح نگاری کے باب میں وہ نظم کی طرح غزل میں بھی کامیاب ہیں. اس کا ایک اچھا نمونہ یہ غزل ہے.

بیوی سے لڑ کے آج بہت آب دیدہ ہوں
میکے چلی گئی ہے تو برگِ چکیدہ ہوں (ص ۵۴)

کلام میں متعدد اشعار ایسے مل جاتے ہیں جنھیں خاموشی سے پڑھنے کے باوجود تبسم کرنا ہی پڑتا ہے شلاً

ٹانگ لنگڑی ہو تو ایک تیز سواری پکڑیں
پاؤں بھاری ہوں تو رفتار بدل دی جائے (ص ۳۰)

ہم سائے پہ نظر ہے ہماری، مگر جلیل
ہم ہیں شریف آدمی اس کے قیاس میں (ص ۱۰۴)

میں صلاح دوں گا کہ 'ہم سائے' کو بدل کر 'ہمسائی' کر دیا جائے. اور چلتے چلتے صرف یہ عرض کروں گا کہ 'نمی دانم' کا شاعر بہت کچھ جانتا ہے اور ہنسی ہنسی کے پردے میں متعدد کام کی باتیں کہجاتا ہے!

تبصرہ

پروفیسر گیان چند

نمی دانم

آپ غلط سمجھنے رشید عبدالسمیع جلیل ایک فردِ واحد کا نام ہے، عبدالرشید عبدالسمیع عبدالجلیل اینڈ کو کا مخفف نہیں۔ ان کا مجموعہ نمی دانم ان کی عنایت سے ملا۔ ہدیہ میں محض سطورِ ذیل ادا کرنی ہیں۔

میں نے دو لسانی ریختے پر ایک طویل تحقیقی مضمون لکھا تھا۔ نہ می دانستم کہ اس دور میں بھی فارسی اُردو آمیز ریختے لکھے جاتے ہیں۔ کم از کم جلیل صاحب کے قلم سے، دیکھیے ایک سہ لسانی ریختہ یعنی فارسی اردو اور انگریزی کا آمیختہ

تولید میں ایم فل ہوں تقلید میں پی ایچ ڈی ہر ڈگری ہے ترغیبی، اگزام نمی دانم

وہ لوریختوں سے بھی گزر کر جعفر زٹلی کی تقلید کرتے ہیں زٹلی نے کہا تھا ع نہ ہلد نہ ٹلد نہ جنبد زجا۔ جلیل صاحب اسی لہجے میں بولتے ہیں۔

ع سرِ شام ٹہلم گرا مرتا کوٹھی
ع نہ کھینچم، نہ پکڑم کبھی کوئی مچھلی

مزاح نگاری میں دو خدشات رہتے ہیں۔ سب سے بڑا یہ کہ ظرافت کی چاٹ میں عامیانہ مسخرا پن نہ پیدا ہوجائے، دوسرے یہ کہ مسخرے پن سے بچنے کی فرطِ احتیاط میں کلام ثقہ سنجیدہ ہوکر نہ رہ جائے۔ جلیل صاحب کے یہاں یہ نشیب کم سے کم ہے۔ کھینچم اور پکڑم، میں اگر پہلا عیب ہے تو صفحہ ۱۲۶ کی غزل

ع ہر موڑ پہ اب تو نگہ یار گرے ہے
ع شوخ رومانی ہے گو خندہ آزیں نہیں

جلیل صاحب محض مزاح نگار نہیں، وہ طناز بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں دورِ حاضر کا سماج، بالخصوص حیدرآباد کا ماحول سانس لے رہا ہے۔ انھوں نے آندھرا پردیش کی حکومت یعنی تلگو دیشم پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کی نظمیں نئی حکومت نئی کارگزاری، چیف منسٹر، فینانس منسٹر وغیرہ۔ اور اہلِ سیاست سے بھی زیادہ انھوں نے دفتروں کے اہلکاروں کے نکمے پن کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہ خود کسی دفتر میں ملازم ہیں اس لیے دانائے راز کی طرح کئی نظموں میں سرکاری دفتروں کے بخیے ادھیڑے ہیں مثلاً احوالِ واقعی، چلے گئے، ہم اہلکار ہیں، زمانہ ہے کلرکوں کا وغیرہ۔

ایسا نہیں کہ وہ کلرکوں ہی پر شیر ہوتے ہیں، ایک نظم میں انھوں نے "کلکٹر" کی بھی خبر لی ہے انھوں نے اچھے

ہیرو نہیں بن سکے۔ ہم نے معمول کے مطابق کھانستے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے انتہائی خوشی کے عالم میں ایک لفافہ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیا۔ ہم نے لفافہ کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ کوئی معمولی لفافہ نہیں تھا بلکہ سب انسپکٹر اکسائز کی حیثیت سے ہمارے اپائنٹمنٹ کا آرڈر تھا۔ لیکن اتفاق کی بات دیکھئے کہ ہم ان احکام پر کھل کر خوشی کا اظہار بھی نہیں کر سکے کیوں کہ ہم سانس لینے اور کھانسنے کے جس عمل سے دوچار تھے وہ ہم کو اس قسم کی کسی خوشی کے اظہار کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ بہرحال جوں توں کر کے ہم نے ان احکام کو پلنگ کے بازو والی تپائی پر دواؤں کے بیچ رکھ دیا۔ ہمارے دوست نے حسبِ معمول خوشی کا اظہار کیا اور ہماری سانس کے الجھاوے پر دکھ کی اداکاری کے جوہر دکھاتے اور پھر چلتے بنے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ہم اس کھانسی کے دورے سے نجات پاکر پھر سے بھلے چنگے ہو گئے۔ اور گھر سے نکل کر سیدھے کپڑے کی ایک دوکان پر پہنچے۔ دوکاندار نے جو ہم سے کچھ واقف تھا مسکرا کر استقبال کیا اور قسم قسم کے کپڑے ہمارے سامنے پھیلا دیئے۔ ہم نے فوراً اسے روک دیا اور کہا کہ اب ہم کالج الیکشن کے نعرہ لکھنے والے اور سڑکوں پہ پتھر پھینکنے والے طالب علم نہیں رہے اور نہ آفس میں فائیلس کو صبح میں الماری میں سے ٹیبل پر اور پانچ بجنے سے پہلے ٹیبل پر سے الماری میں رکھ دینے والے کلرک بابو! اب ہم وردی پہننے والے افسر بن گئے ہیں اس کے بعد ہم نے بآواز بلند خاکی کپڑے کی فرمائش کی پہلے تو وہ کچھ سمجھ نہیں پایا کہ کل تک جو سرخ دھاریوں والی قمیص کا شوقین تھا اس کو یہ کیسا دورہ پڑا ہے۔ ہم نے اس کو سمجھایا کہ ہمیں یونیفارم کا کپڑا چاہیئے۔ اس نے معصومیت سے پوچھا صاحب آپ اور . . . . ؟ ہم نے قدرے ڈانٹتے ہوئے کہا کیا مطلب؟ شاید تمہیں پتہ نہیں کہ ہم انسپکٹر بن گئے ہیں" وہ مسکرانے لگا۔ پتہ نہیں اس مسکراہٹ میں کون سے معنی پوشیدہ تھے۔ اور ہم اپنی کھڑکھڑ کرتی ہوئی وردی میں ملبوس تصوری ہی تصور میں اپنے سینے کی چوڑائی پر اتراتے مستقبل کی سڑک پر پہلے ہوتے دوروں کے تصور میں سرشار اپنے مقام مخصوصہ — معاف کیجئے مقام تعیناتی پر پہنچے۔ بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب ہمیں اپنے پہلے دورہ پر روانہ ہونا تھا۔ ہم بس اسٹانڈ پر پہنچے اور یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے جہاں دیدہ اور تجربہ کار کانسٹبل نے بس اسٹاپ کی سامنے والی دوکان سے ایک پرانی لیکن قابل استعمال کرسی کا انتظام کر کے ہمیں عوام الناس سے قدرے الگ جگہ پر چھاؤں میں بٹھا دیا۔ اب ہمارے اور ہمارے دوشیزہ دورے کے درمیان چند ہی منٹوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بس آئی — رکی — دروازہ کھلا — ہم اُٹھے — بس میں سے ایک اور شخص برآمد ہوا۔ ہمارے جہاں دیدہ کانسٹبل نے فوراً لپک کر اس کی مزاج پرسی کی اور کشاں کشاں ہماری طرف لے آیا۔ اس شخص نے ہمیں اطلاع دی کہ ایک آدھ گھنٹے کے بعد بڑے صاحب دورہ پر تشریف لا رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا پہلا دورہ ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا اور ہم صاحب کے دورہ کے انتظامات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

پھر ملیں گے اگر خدا لایا (اداریہ)

برصغیر کے ممتاز مزاحیہ شاعر مسٹر دہلوی سے مئی کے مہینے میں کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔ پاک ہند طنز و مزاح کانفرنس کی جانب سے شہر کے ایک شاندار سلب میں ڈنر اور اس کے بعد مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اونچی سوسائٹی کے افراد کی کثرت تھی۔ ان ہی میں اونچے قد اور اونچی آواز والی ایک باوقار شخصیت مسٹر دہلوی کی تھی۔ کسی نے تعارف کروایا۔ بڑی محبت سے ملے ان کی داڑھی اور مونچھ کے بانکپن اور گفتگو کے انداز سے شاعر سے زیادہ ریٹائرڈ کرنل یا جنرل معلوم ہو رہے تھے۔ بوفے ڈنر تھا اپنی اپنی پلیٹوں کو سجا کر ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔ شگوفہ، مزاحیہ شاعری اور مشاعروں کے معیار پر سرسری گفتگو رہی جس سے اندازہ ہوا کہ قدرت نے ظاہری تمکنت کے ساتھ ساتھ نقد و نظر کی اعلیٰ صفات سے بھی انھیں نوازا ہے! انھوں نے اپنے دولت کدہ پر مدعو کیا۔ (ایک بار ان کے گھر کے قریب سے گزر ضرور ہوا۔ ایسی پُرشکوہ عمارت کو دولت کدہ ہی کہا جا سکتا ہے!) لیکن وعدہ کے باوجود یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ جون کے مہینہ میں متحدہ امارات میں منعقدہ مشاعروں میں مسٹر دہلوی بھی شریک تھے۔ یونائیٹڈ کلر فلمس عجمان کے ہاسٹل میں ہم ایک ہفتہ مقیم رہے۔ پاکستان کے ممتاز شاعر جناب عنایت علی خاں اور مسٹر دہلوی ایک ہی کمرہ میں مقیم تھے۔ دونوں میں بڑی نوک جھونک رہتی۔ برادرم عنایت علی خاں صاحب کے خط سے ہی پتہ چلا کہ مسٹر لکھنوی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی گفتگو کا کھرا انداز، کبھی تحت میں اور کبھی مخصوص ترنم میں کلام سنانا ہمیشہ یاد رہے گا آئندہ کبھی شگوفہ کے سالموں میں مسٹر دہلوی کے کلام کا انتخاب پیش کیا جائے گا۔ اس بار خامہ بگوش کا لکھا کلام قارئین کی نذر ہے۔

شگوفہ کا آئندہ شمارہ سالنامہ ہوگا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے دو خصوصی شمارے شائع ہو رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب (۲۴ تا ۲۶ نومبر ۸۸ء) میں سردی کے باوجود ہمیشہ کی طرح باذوق سامعین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوں گے۔ ان تقاریب کے اہتمام کے سلسلہ میں حیدرآباد کی علمی و تہذیبی زندگی کی نمائندہ دلکش شخصیت محترم شاعام خاں صاحب کی خصوصی سرپرستی ہمیں حاصل رہی۔ جس کے لیے ہم سراپا سپاس ہیں۔!

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف ولذت کی انتہا ہے یہ
کشمیری قوام
تیارکنندگان :-
پورن داس رنچھوڑ داس
اینڈ سنس
گلزار حوض. حیدرآباد